Courtesy www.pdfbooksfree.pk
عشق کا شین
PDFBOOKSFREE.PK
حصہ دوم
علیم الحق حقی

مجذوب یوں تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا' جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہو!
اندھیرے میں دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے چار جوان لڑکوں نے اُسے دور سے آتے دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ "لو بھئی......شکار آ گیا۔" اُن میں سے ایک نے کہا۔
"اور کوئی ہندو ہوا تو۔" دوسرا بولا۔
"تو بھی بے وقوف ہے شمو۔ اس وقت کوئی ہندو گھر سے نہیں نکلتا۔ نکلتا ہے تو ہماری طرح گھات لگا کر بیٹھتا ہے۔" تیسرے نے کہا۔
"مگر بڈھا لگتا ہے۔" چھوٹے نے تبصرہ کیا۔
"بس مُسلا ہو۔ ہمیں بڈھے جوان سے کیا لینا دینا۔" پہلا بولا۔
"نہیں جوان ہو تو شکار کا مزہ ہی اور ہے۔"
اتنی دیر میں مجذوب ان کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ چاروں اپنے ہتھیار سنبھالتے اُس کی طرف بڑھے۔ "کہاں جا رہے ہو مہاراج؟" پہلے جوان نے تمسخرانہ لہجے میں پوچھا۔
"ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔" مجذوب نے رکے بغیر کہا۔
"مگر اب تو تم بس قبرستان جاؤ گے۔" دوسرا بولا۔
مجذوب اب ان کے بہت قریب آ چکا تھا۔ وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ اُس کے سر کے بالوں اور بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی میں نام کو بھی سیاہ بال نہیں تھا۔ لیکن اُس کا سلوٹوں سے پاک چہرہ جوان تھا۔ بلکہ اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ اُس کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اور پاجامے سے اگر پیوند نکال دیے جاتے تو شاید کچھ بھی نہ بچتا۔
مگر اُس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ ایک طرف تو ان بڑی بڑی آنکھوں سے روشنی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں دل دہلا دینے والی سرخی تھی۔ "تم قبرستان کا نام کیوں لیتے ہو۔ تمہارا مرگھٹ تو شمشان گھاٹ کہلاتا ہے۔" اُس کی آواز میں گہرائی تھی اور گونج تھی۔ صحراؤں کی گونج!
چاروں جوان الجھ گئے۔ "تو تم مسلمان نہیں ہو؟"
"کیوں نہیں۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔"

"تو پھر تم نے شمشان گھاٹ کیوں کہا؟"

"وہ تو تمہارے لیے کہا تھا۔ تمہیں جانا ہوگا وہاں۔ اور ابھی میرا قبرستان جانے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ابھی تو مجھے ایک اہم کام کرنا ہے۔"

پاگل معلوم ہوتا ہے۔" اُن میں سے ایک بولا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مار دو سالے کو۔"

ان میں دو کے ہاتھ میں خنجر تھے۔ ایک کے پاس بلم تھا اور چوتھا لاٹھی اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ چاروں بیک وقت حرکت میں آئے۔

"تم میرا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتے۔" مجذوب نے کہا اور ایک نظر اُن چاروں پر ڈالی۔

اُن چاروں کو ایسا لگا کہ اُن کے جسم پتھر کے ہو گئے ہیں۔ جو جہاں جس حال میں تھا' ویسا ہی رہ گیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تمہیں شمشان گھاٹ جانا ہے۔" مجذوب نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "دوسروں کو مارتے...... لوگوں کا گھر جلاتے پھرتے ہو نا۔ آج تمہارے گھر میں آگ لگی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے انگلی سے ایک خنجر بردار کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارے گھر میں- یہاں وقت برباد نہ کرتے تو شاید کچھ لوگوں کو بچا لیتے۔ مگر اب تو کسی کو نہیں بچا سکو گے۔ تمہارا تو گھر ہی شمشان گھاٹ بن گیا۔ افسوس...... صد افسوس۔"

وہ اپنی جگہ بے بس کھڑے اسے جاتے دیکھتے رہے۔ وہ اپنی انگلی تک ہلانے کے قابل نہیں تھے البتہ وہ بول سکتے تھے۔ "یہ مُسلا کیا کر گیا ہے ہمیں؟"

"کوئی جادوگر تھا شاید۔"

"اب ہم ٹھیک کیسے ہوں گے؟"

اسی لمحے مجذوب اِن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی جیسے اُن کے جسموں کی بندش کھل گئی۔ "چلو! دوڑ کر پکڑتے ہیں سالے کو۔" بلم بردار نے کہا۔ "نہیں۔ میرے گھر کی چتا کرو۔ میرے گھر چلو۔" وہ بولا جس کی طرف مجذوب نے اشارہ کیا تھا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے' ہے بھگوان...... میرے گھر والوں کی سہائتا کرنا۔"

وہ چاروں مخالف سمت میں چل دیے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ جس گھر کی بات ہو رہی ہے' وہ جل کر خاک ہو چکا ہے۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ کوئی بھی نہیں بچا!

❁......❁......❁

نور بانو سن ہو کر رہ گئی۔ کیا یہ قبولِ اسلام ہے؟ وہ سب کچھ اتنا اچانک اور بغیر متوقع تھا کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کلمہ پڑھتے ہوئے اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ باہر کی تمام روشنی اس کے جسم میں اتر رہی

ہے۔ آسمان اب بھی پہلے کی طرح سیاہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن اُس کے اندر روشنی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اُس کی نگاہیں چندھیا رہی ہیں۔ وہ روشنی اسے اچھی بھی لگ رہی تھی۔ وہ ایسا ناقابلِ بیان سکون محسوس کر رہا تھا' جس کا پہلے کبھی اس نے تصور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ ایسا سکون تھا کہ اسے نیند آنے لگی...... مکمل نیند! وہ اس کی آنکھوں میں بھی تھی اور دماغ پر بھی قبضہ جما رہی تھی۔ اُس کے جسم کے تمام عضلات ڈھیلے ہوتے جا رہے تھے۔ پھر اُسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ گر رہا ہے۔

نور بانو نے اُسے گرتے دیکھا تو اُس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ اُس نے قرآن پاک کرسی پر رکھا اور اُس کی طرف لپکی۔ اوتار سنگھ اس طرح گرا تھا کہ اُس کے سر پر یقیناً شدید چوٹ آئی ہوگی۔

اُس کے پاس پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی۔ وہ کیا کر سکتی ہے اُس کے لئے؟ کچھ بھی نہیں۔ اُسے رگھو کو اور رنجنا کو بلانا ہے۔ لیکن اسے اس حال میں کوٹھے پر اکیلا چھوڑ کر نیچے جانے کو اُس کا دل نہیں مانا۔ وہ ہر احتیاط بھول کر منڈیر کی طرف لپکی۔ رگھو دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے نور بانو کو حیرت ہوئی۔ اتنی تیز آواز نیچے نہیں پہنچی۔ رگھو نے کچھ نہیں سنا؟

"رگھو چاچا...... رگھو چاچا......" اُس نے پکارا۔

رگھو نے حیرت سے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس طرح کون پکار سکتا ہے اسے...... منجھلی بی بی کے سوا مگر وہ تو پردہ کرتی ہیں۔ اُس نے اُوپر دیکھتے ہوئے سوچا...... یہ منجھلی بی بی کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

"کیا بات ہے منجھلی بی بی؟"

"جلدی سے اوپر آؤ۔ چھوٹے ٹھاکر کو کچھ ہو گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی رگھو کو تو جیسے پر لگ گئے۔ مگر اس عالم میں بھی وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا۔

وہ اوپر آیا تو نور بانو نے کہا: "تم انہیں سنبھالو چاچا۔ میں رنجنا دیدی کو جگاتی ہوں۔"

وہ رنجنا کو لے کر اوپر آئی تو رگھو چھوٹے ٹھاکر کا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور بار بار بڑی محبت بھری نرمی سے چھوٹے ٹھاکر کے رخسار تھپ تھپا رہا تھا۔ "کیا ہو گیا مالک؟ آنکھیں کھولو نا مالک......"

رنجنا کے ہاتھ میں پانی کی لٹیا تھی۔ اُس نے چھوٹے ٹھاکر پر پانی کے چھینٹے دیے۔

"انہیں ہوا کیا ہے منجھلی بی بی؟" رگھو نے نور بانو سے پوچھا۔

نور بانو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بتائے۔ "معلوم نہیں۔ میں یہاں قرآن شریف پڑھ رہی تھی کہ یہ اوپر آ گئے۔ کچھ دیر سنتے رہے۔ پھر......" نور بانو کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ جو کچھ ہوا' وہ سب بتانا مناسب بھی ہے یا نہیں۔

یہ تو رگھو کو بھی یاد تھا کہ چھوٹے ٹھاکر اچانک گھر میں چلے گئے تھے۔ "پھر کیا ہوا منجھلی بی بی؟" رگھو نے پوچھا۔

"چھوٹے ٹھاکر کو ہوش آئے گا تو وہی بتاسکیں گے۔" نور بانو نے پہلو تہی کی۔

رنجنا چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر چھینٹے مارے جارہی تھی۔ بالآخر وہ کسمسانے لگا...... اور پھر اٹھ بیٹھا۔ "کیا ہوا؟ یہ میرا چہرہ کیوں بھگودیا تم نے؟"

"آپ...... آپ بے ہوش ہوگئے تھے مالک!" رگھو نے کہا۔

"نہیں...... ایسا سکون ملا تھا کہ میں بے خبر سوگیا۔" اوتار سنگھ بولا۔

"آپ کا سر تو نہیں دُکھ رہا ہے۔ بہت زور سے گرے تھے آپ' چوٹ یقیناً لگی ہوگی؟" نور بانو نے کہا۔ وہ اپنا پردہ بھول ہی گئی تھی۔

اوتار سنگھ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "نہیں کوئی چوٹ نہیں لگی' کوئی تکلیف نہیں' ایسا آرام اور سکون تو مجھے کبھی ملا ہی نہیں تھا۔"

"جو کچھ ہوا تھا' وہ آپ کو یاد ہے؟" نور بانو کو شبہ ہورہا تھا کہ یہ دماغی چوٹ کا معاملہ ہے۔

"وہ سب کچھ تو میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔" اوتار سنگھ نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"آپ جو کچھ پڑھ رہی تھیں' میں وہ پوری طرح سمجھ رہا تھا' پھر میں نے اُس کی تصدیق کے لئے آسمان کو دیکھا۔ اور میں نے ایک نہیں' سات آسمان دیکھے' ہر آسمان الگ رنگ کا تھا' اور کسی میں کوئی بے ربطی نہیں تھی' کہیں کوئی خلل نہیں تھا۔ ہر طرف سے ایک ساخم' ایک سی ہمواری۔ پھر مجھ سے کسی نے کہا...... کیا اس کے بعد بھی تُو کلمہ نہیں پڑھے گا۔ پھر میں نے کلمہ پڑھا اور مجھے لگا کہ میرا وجود بہت روشن' بہت ہی زیادہ روشن ہوگیا ہے۔ مجھے ناقابلِ بیان سکون کا احساس ہورہا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی اور میں سوگیا۔"

سات آسمانوں کے نظارے کا تذکرہ سنتے ہوئے نور بانو کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

ارے...... میں اس شخص کو کتنا حقیر سمجھتی تھی' کافر اور مشرک کہتی تھی اسے' اور اللہ نے اسے کیسا اعزاز عطا فرمایا ہے۔ میں ایمان پر پیدا ہوئی۔ اب تک بلاشبہ ہزاروں بار میں نے یہ آیات پڑھیں۔ ان کا مطلب بھی سمجھتی ہوں اور آسمان کو بھی میں نے یہ سوچ کر نہیں دیکھا کہ یہ اللہ کی کیسی بے مثال تخلیق ہے۔ بے مثال اور بے عیب اور یہ شخص جو مشرک گھرانے میں پیدا ہوا' آج اس نے پہلی بار یہ آیات سنیں' سمجھیں اور آسمان کو اس خیال سے دیکھا تو اللہ نے اسے یہ نظارہ نصیب فرمایا۔

نور بانو کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ "کلمہ پڑھتے ہوئے آپ اپنے ہوش وحواس میں تھے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں اتنے ہوش وحواس میں اس سے پہلے میں کبھی نہیں رہا۔" اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

"کلمہ پڑھنے کا مطلب بھی سمجھتے ہیں آپ؟"

اوتار سنگھ کو ریٹا پارسن کی پارٹی میں اپنی کلاس فیلو نادرہ سے اپنی گفتگو یاد آگئی۔ اُس نے نادرہ سے پوچھا تھا...... کوئی مسلمان کیسے ہوسکتا ہے؟ تو نادرہ نے اسے بتایا تھا کہ آدمی دل کی گہرائیوں

سے ایمان لائے اور کلمہ پڑھے تو وہ مسلمان ہوجاتا ہے۔

اوتار سنگھ کا دل خوشی سے بھر گیا۔ "ہاں...... میں جانتا ہوں۔ میں مسلمان ہوگیا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔"

اُس کی خوشی نے نور بانو کو حیران کردیا۔ وہ بڑی سچی خوشی تھی۔

اوتار سنگھ رگھو کی طرف مڑا۔ "اب تم اور رنجنا آزاد ہو رگھو۔ میرے اور تم لوگوں کے راستے آج الگ ہوگئے۔"

رگھو رونے لگا اور ان کے پیروں پر گر پڑا۔ "یہ ناممکن ہے مالک......"

"میں تم لوگوں کو بہت کچھ دوں گا۔ تم جہاں جی چاہے' چلے جاؤ۔ میں نے وہ دھرم چھوڑ دیا' جو تمہارا ہے۔"

رنجنا بھی رونے لگی۔ وہ بھی اوتار سنگھ کے پیروں میں گر پڑی۔ "ہمارا دھرم تو جیون بھر تمہاری سیوا کرنا ہے مالک۔ اور ہمارا کوئی دھرم نہیں۔"

"ہمیں بھی مسلمان کرلو مالک!" رگھو گڑگڑانے لگا۔

اوتار سنگھ نے سوالیہ نظروں سے نور بانو کو دیکھا۔

"اللہ کی محبت میں' دل کی گہرائیوں سے کوئی ایمان لائے تو مسلمان ہوتا ہے۔ یہ تو صرف آپ کی خوشی کے لئے مسلمان ہورہے ہیں۔" نور بانو نے افسردگی سے کہا۔

"مالک کی محبت بھی تو اوپر والے نے دی ہے۔" رگھو نے تڑپ کر کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ سچا مسلمان بنوں گا۔"

نور بانو کا دل کٹنے لگا۔ "یوں تو آپ کے لئے بھی ضروری ہے کہ کسی دین دار امام کے سامنے کلمہ پڑھیں۔ پھر وہ آپ کا اسلامی نام رکھے۔"

"تو میں ابھی جامع مسجد چلا جاتا ہوں......" اوتار سنگھ نے کہا۔

"میں بھی......" رگھو بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور رنجنا بھی۔

"اس وقت تو مسجد میں کوئی نہیں ہوگا۔"

"تو سحری کے وقت چلے جائیں گے۔"

"آپ نے اعلان کردیا تو میری حفاظت کیا کریں گے؟ آپ تو خود خطرے میں پڑجائیں گے۔" نور بانو کے لہجے میں خدشات تڑپ رہے تھے۔

"ارے حفاظت کرنے والا اللہ ہے۔ اُس کی مرضی ہو تو کوئی بچا نہیں سکتا۔ اور وہ نہ چاہے تو موت آ نہیں سکتی۔" یہ بات ایک نومسلم اُس لڑکی سے کہہ رہا تھا' جو مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور دینی تعلیم بھی حاصل کرتی رہی تھی۔

نور بانو کیلئے وہ شرمندگی کی رات تھی۔ وہ اس پر غور کررہی تھی کہ وہ کیسی مسلمان ہے۔

وہ سب اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہیں سحری کے وقت کا انتظار تھا۔

اچانک نیچے دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں چونکا دیا۔

رگھو منڈیر کی طرف گیا اور باہر جھانکا۔ گلی میں اندھیرا تھا لیکن دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔

''کون ہو تم؟ کیا بات ہے؟'' رگھو نے پکارا۔

نیچے کھڑے شخص نے سر اٹھایا۔ ''دروازہ کھول۔ میں تیرے مالک سے ملنے آیا ہوں بہت دور سے۔ جلدی کر۔''

❋ ❋ ❋

بابا کو اپنے ساتھ اوپر لے کر آتے ہوئے رگھو کو یاد آ گیا کہ اُس نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے۔ ہاں...... یہ وہی ہے اُس نے دل میں کہا۔ جس روز چھوٹے ٹھاکر کا جنم ہوا تھا' اُس روز یہ بابا ٹھاکروں کی گڑھی آیا تھا۔

اُس نے بات کر کے بابا سے یہ بات پوچھ بھی لی۔

''ہاں...... میں وہی ہوں۔''

اوپر پہنچ کر مجذوب نے اوتار سنگھ سے ہاتھ ملایا۔ اوتار سنگھ بھی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی بھولی بسری یاد اُس کے ذہن میں کلبلا رہی تھی لیکن گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ ''کیسے ہو بیٹے؟'' مجذوب نے پوچھا۔

اوتار سنگھ کو یقین تھا کہ اسی آواز اور لہجے میں لفظ بہ لفظ یہی جملہ وہ پہلے بھی کہیں سن چکا ہے۔

''جی...... میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں' کیسے تشریف لائے؟''

''آج تو آنا ہی تھا بیٹے۔ آج تو آپ کو میری ضرورت تھی۔ میں بھی بہت خوش ہوں کہ آج آپ خوش ہیں...... خوش رہنے والی باتوں میں۔''

اور اوتار سنگھ کو یاد آ گیا۔ اُس نے اس بابا کو پہلے بھی ایک بار دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بہت چھوٹا تھا۔ اور یہ اس دن کی بات ہے' جب وہ پہلی بار ویر جی کے گھر جانے کے لئے ماتا اور پتا جی کے ساتھ نکلا تھا۔ ''آپ وہی ہیں نا بابا......؟''

''ہاں۔ میں وہی ہوں۔ تمہیں مبارک باد دینے کے لیے آیا ہوں۔''

نور بانو تجسسانہ انداز میں اُن کی گفتگو سن رہی تھی۔ یہ تو اُسے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والا کوئی بڑا بزرگ ہے۔ حیرت اُسے اس پر ہو رہی تھی کہ وہ چھوٹے ٹھاکر سے اتنے احترام سے بات کر رہا ہے۔ اور پھر مبارک باد کی بات......

''کس بات کی مبارک باد؟'' اوتار سنگھ نے مجذوب سے پوچھا۔

''آج آپ نے خوش رہنے والی سب سے بڑی بات ڈھونڈ لی ہے۔ مبارک ہو۔''

''شکریہ بابا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''اللہ جب کرم فرمائے تو آدمی کے حواسوں پر پڑے پردے ہٹا دیتا ہے۔ پھر آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے' سن لیتا ہے' محسوس کر لیتا ہے اور جان جاتا ہے۔'' مجذوب کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ''آپ بھی تو یہ بات سمجھ سکتے ہیں۔ آج کیا کچھ دکھا دیا آپ کو اللہ نے۔ کیا کچھ سمجھا دیا۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے۔''

نور بانو کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ مجذوب جو کچھ کہہ رہا تھا' وہ اُسے معلوم ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ تو اسے بھی صرف اس لیے معلوم ہو سکا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر نے اُسے بتا دیا تھا۔ حالانکہ سب کچھ اس کے سامنے ہی ہوا تھا۔ مگر چھوٹے ٹھاکر نے کیا دیکھا ہے' یہ تو وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''میری بچی نے ٹھیک کہا۔'' مجذوب نے نور بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو باقاعدہ اسلام قبول کرنا ہو گا۔ اس کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود یہاں چلا آیا ہوں۔ یہ سعادت اللہ نے مجھے نصیب فرمائی ہے۔''

اوتار سنگھ نے کلمہ پڑھا۔

''مبارک ہو۔ اللہ آپ کو ایمان پر زندہ رکھے اور ایمان پر اٹھائے۔'' مجذوب نے کہا۔ اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔ ''میں آپ کا نام عبدالحق تجویز کرتا ہوں۔ اچھا نہ لگے تو بتا دیجئے۔''

اوتار سنگھ کی آنکھیں خواب ناک ہو گئیں۔ ''یہ...... یہ میرا نام ہے...... اتنا سادہ' زبان پر اتنا رواں...... اتنا خوب صورت نام! بابا...... یہ تو نام بہت اپنا لگ رہا ہے۔ جیسے شروع ہی سے میرا یہ نام ہو۔''

''بس تو آج...... اس لمحے سے آپ عبدالحق ہیں۔''

''شکریہ بابا۔''

''پہلے اللہ کا شکر ادا کیجئے۔ پھر بندے کو شکریہ کہیے۔ یہی بندگی ہے۔ اس میں کوتاہی شرک ہے۔ اور یاد رکھیے' اللہ شرک پر کبھی معاف نہیں کرتا۔''

اوتار سنگھ نے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔ ''اے اللہ۔ آپ کا شکر ہے۔''

رگھو آگے بڑھا اور مجذوب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''مجھے بھی مسلمان کر لیجیے بابا...... اور میری پتنی کو بھی۔''

وہ دونوں خود سے کلمہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ مجذوب نے انہیں کلمہ پڑھایا۔ اُس نے ان کے نام محمد زبیر اور رابعہ تجویز کیے۔

اب مجذوب نور بانو کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اِدھر آؤ بیٹی۔''

نور بانو جھجکتی ہوئی اُس کی طرف بڑھی۔ ''تم اللہ کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمہاری آرزو پوری کر دی۔'' مجذوب نے کہا۔

نور بانو کے رخسار دہک اٹھے۔ ''آپ کس آرزو کی بات کر رہے ہیں۔''

"تم چاہتی تھیں کہ تمہارا رمضان مسلمانوں کے درمیان گزرے۔ دیکھ لو اب تم مسلمانوں کے درمیان ہو۔"

نور بانو نے اطمینان کی سانس لی۔ "جی...... بے شک میں نے یہ آرزو کی تھی۔ اللہ کا شکر کہ اُس نے پوری فرمائی۔"

اسی وقت نقاروں کی آواز سنائی دی۔ سحری کا وقت ہو گیا تھا۔ "اب ہم نیچے چلیں گے۔" مجذوب نے کہا۔ "تم سحری کی تیاری کرو۔"

❁ ❁ ❁

سحری نور بانو بنا رہی تھی۔ باقی لوگ اوتار سنگھ کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مجذوب انہیں دین کی باتیں سمجھا رہا تھا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہیں کیا کیا کرنا چاہیے اور کیا کیا نہیں کرنا چاہیے۔

سحری کے بعد مجذوب نے انہیں وضو کرنا سکھایا۔ پھر روزہ رکھنے اور افطار کرنے کی نیت یاد کرائی۔ پھر انہیں نماز سکھائی۔ عبدالحق کو تو دشواری نہیں ہوئی لیکن زبیر اور رابعہ کو چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانا بھی آسان نہیں تھا۔ اُن کے لئے تو وہ بالکل اجنبی زبان تھی۔

مجذوب نے رابعہ کو ہدایت کی کہ وہ نور بانو کے ساتھ نماز پڑھے اور جو نور بانو پڑھے اُسے دہراتی رہے۔ انہوں نے نور بانو سے کہا کہ رابعہ کی خاطر اُسے بہ آواز بلند نماز پڑھنی ہو گی۔

اُن دونوں کے جانے کے بعد مجذوب نے عبدالحق سے دو رکعت نماز سنت پڑھنے کو کہا اور زبیر کو اُس کی تقلید کرنا تھی۔

عبدالحق کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ اُس کے لئے جیسے اہم ترین امتحان تھا۔ اُس کا جسم پسینے میں نہا رہا تھا اور دل جیسے حلق میں دھڑک رہا تھا۔

"نیت کرتا ہوں دو رکعت نماز سنت......"

نیت کرتے ہی اسے ناقابلِ بیان سکون کا احساس ہوا۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور نماز پڑھنے لگا۔ زبیر اُس کا پڑھا ہوا دہرا رہا تھا اور اُس کی تقلید کر رہا تھا۔ عبدالحق نے سلام پھیرا تو مجذوب نے خوش ہو کر کہا: "سبحان اللہ۔ تم نے پہلی نماز ہی کتنی اچھی طرح پڑھی ہے۔"

"یہ سب اللہ کا کرم ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"اب میں سنتیں ادا کر لوں پھر فرض نماز تم میرے پیچھے پڑھنا۔"

وہ بڑی مختصر جماعت تھی۔ ایک امام ایک اقامت پڑھنے والا اور ایک مقتدی۔ لیکن نماز پڑھتے ہوئے عبدالحق کو احساس ہو رہا تھا کہ کمرے میں بے شمار لوگ ہیں۔ کمرے کی فضا میں حدت تھی جیسے وہاں بہت سے لوگ سانس لے رہے ہوں۔

مجذوب نے بہت اچھی دعا کرائی۔ دعا کے بعد عبدالحق کو لگا کہ کمرا بالکل خالی ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ بات مجذوب سے کہہ بھی دی۔

"اللہ کے بھید بے شمار ہیں۔ اللہ ہی جانے۔"

مجذوب نے نور بانو اور رابعہ کو اس کمرے میں بلا لیا۔

"وقت بہت کم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں تمہاری زیادہ سے زیادہ رہنمائی کردوں۔ یاد رکھو اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اللہ نے قرآن نازل فرمایا۔ تم لوگ بہت خوش نصیب ہو کہ اللہ نے نزولِ قرآن کے مہینے کی پہلی شب ہدایت سے سرفراز فرمایا۔ یوں تمہیں قرآن سے خاص نسبت عطا کی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم کی ایک ایک آیت میں ہزار ہزار حکمتیں ہیں۔ اللہ ہی چاہے تو بندہ سمجھے ورنہ یہ ناممکن ہے۔ سو قرآن کو ہدایت کی نیت سے پڑھو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ اُس کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے سے پہلے اللہ سے رہنمائی کی التجا کرو۔ ایک بندے کے شایانِ شان عاجزی کے ساتھ دوسرا ذریعہ ہے حضورﷺ کی سیرتِ پاک۔ حضورﷺ نے پوری زندگی قرآن کے احکام کے تحت گزاری۔ سیرتِ پاک کو پڑھتے رہو اور پیروی کرتے رہو تو سمجھ لو کہ تم قرآن پر عمل کر رہے ہو۔" مجذوب نور بانو کی طرف مڑا۔ "تم پر بڑی ذمے داری ہے بیٹی۔ تم پیدائشی مسلمان ہو۔ انہیں مسلمانوں کے طور طریقوں سے متعارف کراتی رہو۔ اچھا مسلمان بننے میں ان کی مدد کرو۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ اللہ کے ہاں تمہیں اس کا بہت بڑا اجر ملے گا۔ اور ہاں انہیں قرآن پاک بھی تمہیں پڑھانا ہے۔"

"لیکن بابا، میرا پردہ......"

"تم نیت اور ارادہ تو کرو۔ راستہ اللہ بنائے گا۔" مجذوب نے چند لمحے توقف کیا۔ "تم رابعہ کو پڑھاؤ۔ وہ اپنے شوہر کو پڑھائے گی۔ اور ہاں پردے پر مجھے یاد آیا کہ ابھی ایک دن تمہارے درمیان پردہ نہیں رہے گا۔"

وہ سوالیہ نظروں سے مجذوب کو دیکھ رہے تھے۔

"اللہ کو یہ منظور ہے کہ تم یہ مبارک مہینہ پوری آزادی کے ساتھ پاکستان میں گزارو۔"

"لیکن بابا، پاکستان تو ابھی بنا نہیں۔" عبدالحق نے کہا۔

"پاکستان بن گیا ہے۔ یوں کہو ابھی دنیاوی اعلان نہیں ہوا ہے۔ بہر حال تمہیں پاکستان جانا ہے۔ پرسوں صبح تم لوگ روانہ ہو گے۔ سفر کے دوران تم لوگ خود کو ہندو ظاہر کرو گے۔ اس لیے تمہارے درمیان پردہ نہیں ہوگا۔ نور بانو بھی ہندوانہ لباس میں ہو گی۔"

"ہمیں پاکستان میں کہاں جانا ہے؟"

"جہاں کوئی تمہاری راہ تک رہا ہے۔"

"پاکستان میں؟ وہاں میرا انتظار کون کر سکتا ہے؟"

"بھول گئے اپنی اماں کو۔"

عبدالحق تڑپ گیا۔ "اماں! اماں میرا انتظار کر رہی ہیں! اماں موجود ہیں! اللہ کا شکر ہے۔ مگر

وہ ہیں کہاں؟"

"وہیں...... تمہارے گاؤں میں۔"

"لیکن ہمارا گاؤں تو ختم ہو گیا تھا بابا جی۔"

"ٹھاکروں کی گڑھی ریت کے نیچے دفن ہو گئی۔ لیکن اب وہ پھر سے آباد ہو گا...... نئے نام کے ساتھ۔ حمیدہ اُس مدفون گاؤں کی سرحد پر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

عبدالحق کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ "تو بابا جی! میرا گاؤں پاکستان میں ہے؟"

"تمہارا گاؤں پاکستان میں ہی ہو سکتا تھا۔"

عبدالحق کو اللہ نے ایمان عطا فرمایا تھا۔ وہ الجھ رہا تھا۔ "مگر بابا' ہم ہندو بن کر کیوں سفر کریں؟"

"اللہ کا حکم ہے۔ اپنی مصلحت وہ جانے۔ کیا پتا' اس میں تمہارے لئے آزمائش ہو۔"

"آپ ہمارے ساتھ ہوں گے؟"

"نہیں۔ میں تو ابھی واپس جا رہا ہوں۔"

"کہاں۔"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ تمہارے پاس بھی کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ اب آگے ایک اور کام کرنا ہے۔"

وہ سب افسردہ ہو گئے۔ اتنی سی دیر میں بابا انہیں اپنے گھر کا فرد لگنے لگے تھے۔

❁......❁......❁

تو انقلاب ایسے آتا ہے! نور بانو سوچ رہی تھی۔ ایسے کہ ایک لمحے پہلے تک کسی کو علم نہیں ہو پاتا۔ اگر کسی اور نے یہ سب کچھ اسے سنایا ہوتا تو وہ اُسے گھڑی ہوئی کہانی...... کوئی افسانہ قرار دیتی لیکن وہ تو اس انقلاب کی عینی شاہد تھی۔

یہ بات ہی کیسی ناقابلِ یقین تھی کہ وہ کوٹھے پر تلاوت کر رہی تھی اور چھوٹا ٹھاکر اوپر چلا آیا تھا۔ وہ جو اُس سے ڈرتی رہی تھی' وہ تو اسے دھتکار کر بھگا دیتی۔ اور وہ نہ جاتا تو وہ کوٹھے سے کود جاتی لیکن اُس کے آنے کے بعد وہ جیسے اُس کے حکم کی پابند ہو گئی تھی۔ وہ اُس کے حکم پر پڑھ رہی تھی' اُس کے حکم پر توقف کر رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ اسے چھوٹا ٹھاکر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو اُس کے نزدیک آسمان سے اترا ہوا کوئی فرشتہ تھا' جو اُس کی قرأت سننے کے لئے چلا آیا تھا۔

آدمی بھولنا چاہے تو بڑی سے بڑی بات نہایت آسانی سے بھول جاتا ہے۔ بس جتنی بڑی بات ہو' اسے بھولنے کے لیے اتنا ہی طاقت ور جواز ہونا چاہیے۔ نور بانو کے پاس تو طاقت ور ترین جواز تھا۔ وہ اس کے ایمان کا معاملہ تھا۔

مگر اب وہ جواز ختم ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹے سے لمحے نے کتنی آسانی سے چھوٹے ٹھاکر کو

اوتار سنگھ سے عبدالحق بنا دیا تھا۔ اب وہ بھولی ہوئی ہر بات یاد کر سکتی تھی۔ چاہے اس کے نتیجے میں اسے کتنی ہی شرمندگی ہو۔ وہ تو آخرت کی شرمندگی سے ڈرتی تھی۔ دنیا کی شرمندگی تو کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ تو غلطی کی سزا ہے۔ اور اس پر وہ توبہ اور استغفار بھی کر سکتی ہے۔

چنانچہ نور بانو سوچ رہی تھی...... یاد کر رہی تھی۔ حالانکہ یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ تو وہ سب کچھ زبردستی بھولے بیٹھی تھی۔ وہ سب اسے یاد تھا۔ مگر اس نے اسے لاشعور کے نہاں خانے میں دھکیل دیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ...... شروع کہاں سے کرے......؟

اسے اماں کی بات یاد آئی۔ اماں نے کہا تھا۔ تم لوگ میرے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود چھوٹے ٹھاکر کے متعلق بدگمانی کرو تو گناہ گار تو ہو گی نا۔ اور سمجھو گی کہ وہ کارِ ثواب ہے۔ ہوا نا دوہرا نقصان۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارا نقصان کیسے گوارا کر سکتی ہوں۔ اس لیے میں نے اس کا تذکرہ کرنا ہی چھوڑ دیا کہ کم از کم بدگمانی سے تو بچی رہو گی تم۔

اسے یاد آیا...... اس نے اماں سے بدگمانی نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے اصرار کیا تھا کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کے متعلق انہیں بتائیں۔

اب اسے اماں کی کہی ہوئی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ اماں نے کہا تھا۔ چھوٹا ٹھاکر جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ اس پر اللہ کی رحمت ہے۔ وہ بچپن ہی سے ہر بات پر غور کرنے والا تھا۔ سوال بہت کرتا تھا۔ ماں کی موت کے بعد اس نے پوجا چھوڑ دی۔ اس کا یقین ہے کہ کائنات کا نظام چلانے والی ہستی واحد ہے' وہ کہتا ہے' جہاں کئی حکمراں ہوں' وہاں فساد ہوتا ہے۔ نظام نہیں چلتا۔ وہ بڑے خلوص سے' محبت سے اس واحد ہستی کی جستجو کر رہا ہے وہ اس واحد ہستی سے محبت کرنا چاہتا ہے میں سچ کہہ رہی ہوں' اُسے کافر سمجھنا بھی بڑی زیادتی ہے۔

آج اماں کی بات سچ ثابت ہو گئی تھی۔ وہ اس کی تلاوت سن کر ہی تو اوپر آیا تھا۔ اور جو آیات اس نے سنیں' ان کا ترجمہ بھی سنایا۔ پھر اس نے کلمے سے اللہ کے کلام کی سچائی کی گواہی دی۔ اماں نے ٹھیک کہا تھا۔ وہی بدگمانی کرتی تھی۔

اور اس روز اماں نے یہ وجہ بھی بتائی تھی کہ ان کے اصرار کے باوجود وہ کبھی نیچے ان کے گھر کیوں نہیں آیا۔ اماں کا بیٹا بننے کے بعد ان کے گھر کی عزت اس کے گھر کی عزت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ نیچے آئے جائے اور لوگ باتیں بنائیں۔ دوسرے وہ خود کو انسان سمجھتا تھا...... خطا کا پتلا۔ وہ نظر کے بہکنے سے بھی ڈرتا تھا۔ اس نے خود کو آزمائش سے دور رکھا۔ وہ اماں کی اعتباری قائم رکھنا چاہتا تھا۔

اور اب نور بانو اس کا احسان سمجھ سکتی تھی۔ اس نے نیچے نہ آ کر دوسروں پر احسان کیا تھا۔ کون کون آزمائش میں پڑ جاتا۔ نیچے بھی تو خطا کے پتلے ہی رہتے تھے۔ وہاں بھی تو بہکنے والی نظریں تھیں۔

تو یہ ہے وہ شخص جسے اپنی کمزوری کی وجہ سے وہ کافر اور مشرک کہتی رہی۔ جبکہ اس میں

دو اوصاف تھے' جو بہت اچھے مسلمانوں میں ہوتے ہیں۔ اس نے بڑا ظلم کیا...... اس پر بھی اور خود
پر بھی۔ اپنی کمزوری کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس سے لڑ نہیں سکتی
تھی...... اسے دور نہیں کر سکتی تھی۔ سو وہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا کر بیٹھ گئی۔ اور وہ اسے
کافر اور مشرک کہتی رہی۔ اس کی ہر بات' ہر عمل پر شک کرتی رہی۔ اسے مکار اور سازشی سمجھتی رہی۔

مگر اب وہ اپنی کمزوری کے بارے میں سوچ سکتی تھی...... اس سے آنکھیں چار کر سکتی تھی۔
اس کمزوری کے نتیجے میں اس نے چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ جو زیادتی کی تھی' اس پر وہ توبہ کر سکتی تھی۔
بس ضروری یہ تھا کہ وہ اس بارے میں سوچے۔

اس کی کمزوری تھا چھوٹا ٹھاکر...... ٹھاکر اوتار سنگھ!

وہ اس لمحے کو منحوس کہتی تھی' جب اس نے چھوٹے ٹھاکر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس وقت تو وہ
محبت کو جانتی بھی نہیں تھی۔ بس چھوٹے ٹھاکر کو جب اس نے دیکھا تو واضح طور پر اسے ایسا لگا کہ وہ
اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا ہے۔ اگلے ہی لمحے اس نے خود کو یاد دلایا کہ وہ ہندو ہے۔

شروع میں اس نے اس دید کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ پریشانی اس وقت شروع ہوئی' جب
اسے احساس ہوا کہ چھوٹے ٹھاکر کا سراپا اس کی آنکھوں میں نقش ہو گیا ہے۔ وہ کسی وقت بھی اسے
دیکھ سکتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھ سکتی تھی۔ تب اپنے اوپر یہ بے اختیاری اسے بری لگنے لگی۔
ایک کافر کو اس طرح دیکھنا...... یہ تو ایمان خراب کرتا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی۔ لیکن اسے
نگاہوں سے اور دل سے وہ دور نہ کر سکی۔

دل بڑی ظالم بلا کا نام ہے۔ دل چاہتا ہے کہ وہ اسے بار بار دیکھے۔ اور قدم ڈیوڑھی کی
طرف اٹھنے لگتے۔ مگر دل سے تو آدمی لڑ سکتا ہے۔ نور بانو نے اپنے قدموں کو ہر بار ڈیوڑھی میں
پہنچنے سے روک لیا۔ لیکن نگاہوں کا وہ کچھ نہ کر سکی' جن میں چھوٹا ٹھاکر بس گیا تھا۔ وہ کہیں بھی بیٹھی
ہوتی' کچھ بھی کر رہی ہوتی' اچانک اسے چھوٹے ٹھاکر کا خیال آتا اور اس کے ساتھ ہی وہ اسے
اپنے روبرو نظر آنے لگتا۔ اور اسے ہٹانے کا اختیار نہیں تھا۔

اسے احساس ہو گیا کہ یہ محبت ہے۔ اسے چھوٹے ٹھاکر سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے
نزدیک یہ ناپاک محبت تھی۔ وہ اس محبت کو ختم کرنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی۔ اسی جھنجلاہٹ میں وہ اس
محبت پر لعنت بھیجنے لگی۔ اس نے اس پر سوچنا بھی کبھی گوارا نہیں کیا۔ محبت کے لطیف پہلوؤں سے وہ
ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی۔ یوں محبت نفرت کا روپ دھارنے لگی اور نفرت دن بہ دن بڑھنے لگی۔

بس ایک ہی عمل ایسا تھا' جس کے دوران اوتار سنگھ کی شبیہہ مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔ اور وہ
تھا قرآن پاک کی تلاوت۔ یہ احساس ہوا تو وہ کثرت سے قرآن پڑھنے لگی۔ قرآن پڑھتے ہوئے
اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہوتی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی تھی۔ سو اس نے تلاوت
قرآن پاک کو اپنا قلعہ بنا لیا اور اس میں محصور ہو گئی۔

لیکن وہ ہر وقت تو قرآن نہیں پڑھ سکتی تھی۔ خالی وقت میں اسے اوتار سنگھ کی شبیہہ سے لڑنا
پڑتا تھا۔ اور رات کو بستر پر لیٹے ہوئے تو اس کا تصور جیسے مہمیز ہو جاتا تھا۔ بہرحال وہ پوری شدت
سے اس سے لڑتی تھی۔

اپنی اس الجھن میں وہ اس طرح گم تھی کہ اسے گرد و پیش پر دھیان کی فرصت ہی نہیں رہی
تھی۔ پھر بھی اس نے کئی بار دیکھا کہ دو خاص اوقات میں...... صبح کے وقت اور دوپہر کے
وقت...... باجی کے قدم خود بخود ڈیوڑھی کی طرف اٹھتے ہیں۔ یہی نہیں' ڈیوڑھی کی طرف جاتے
ہوئے ان کے قدموں میں جھجک...... اور لڑکھڑاہٹ ہوتی ہے۔ ویسی ہی جیسے اس کے قدموں کی
ہوتی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ خود کو روک لیتی تھی۔ جبکہ باجی کھنچی چلی جاتی ہیں۔ اور ایسے میں اس
کے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔

یہ اس کے لیے دلچسپی کا معاملہ تھا۔ کہیں باجی کے ساتھ بھی وہی تو نہیں ہو رہا ہے' جو میرے
ساتھ ہو چکا ہے۔ یوں اسے ایک ایسا مشغلہ مل گیا' جس میں اس کا دھیان بٹنے گا۔ وہ باجی کو بہت
غور سے دیکھنے لگی۔

چند ہی روز میں اسے احساس ہو گیا کہ باجی میں بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔ عصر سے پہلے وہ
دالان میں تخت پر جا بیٹھتی تھیں۔ پھر عصر کی اذان ہو جاتی' تب بھی وہ وہیں بیٹھی رہتیں۔ یہاں تک
کہ اماں انہیں آواز دیتیں...... حور بانو' عصر نہیں پڑھو گی۔ تب وہ اٹھتیں اور عصر پڑھتیں۔

عصر سے مغرب تک تینوں بہنوں کا لگا بندھا معمول تھا۔ عصر کی نماز کے بعد مغرب تک وہ
قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھیں۔ مگر وہ اب دیکھ رہی تھی کہ تلاوت میں باجی کا دل پہلے کی طرح
نہیں لگتا ہے۔ وہ وضو پر زیادہ دھیان دے رہی تھیں۔

پھر اسکول کی گرمی کی چھٹیاں ہوئیں۔ اوپر والے گاؤں چلے گئے۔ اس نے سکون کی سانس
لی۔ کم از کم وہ قدموں کو روکنے باندھنے کی مشقت سے تو بچ گئی لیکن اس نے دیکھا کہ باجی بہت
بدل گئی ہیں۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہتیں۔ اکثر بیٹھے بیٹھے اداس ہو جاتیں۔

اوپر والے ابھی نہیں آئے تھے کہ اماں نے استانی جی کو ان کی دینی تعلیم پر مامور کر دیا۔
استانی جی نے اپنے لیے عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت منتخب کیا تھا۔ یوں ان کا یہ نیا معمول
شروع ہو گیا۔

پھر اوپر والے لوٹ آئے۔ اس دن باجی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ عصر سے پہلے انہوں
نے سلائیاں اور اون کا گولا لیا اور دلان میں بڑے تخت پر جا بیٹھیں۔

نور بانو وضو کرنے کے لیے نکلی تو پہلی بار اس نے تفصیلی جائزہ لیا۔ اس سے پہلے اس نے
کبھی باجی کے معاملے میں تجسس نہیں کیا تھا۔ وہ بے قدموں دلان کی طرف بڑھی اور ذرا پیچھے ہی
رک گئی۔ وہ باجی کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

باجی کے ہاتھوں میں سلائیاں تھیں' مگر ساکت۔ بلکہ وہ تو سلائیوں کو دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔ ان کی نظریں تو سامنے کوٹھے پر تھیں۔ نور بانو نے ان نظروں کی سمت دیکھا۔ کوٹھے پر جالیوں کے اس پار چھوٹا ٹھاکر بیٹھا ہوا نظر آیا۔

باجی اس کو دیکھ رہی تھیں...... اور ان کی نگاہوں میں عجیب سا والہانہ پن تھا۔

نور بانو کا پہلا تاثر یہ تھا کہ چھوٹا ٹھاکر بھی باجی کو دیکھ رہا ہوگا لیکن چند ہی لمحوں میں اسے احساس ہوگیا کہ اس کا اندازہ غلط ہے۔ چھوٹا ٹھاکر تو کوٹھے پر اِدھر سے اُدھر ٹہلے جا رہا تھا۔ اور اس نے ایک بار بھی دلان کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ ویسے اگر وہ اس طرف دیکھتا تو باجی کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ اور اسے بھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ دونوں اسے دیکھ رہی تھیں۔

پھر نور بانو کو ایک تبدیلی کا احساس ہوا۔ چھوٹے ٹھاکر کے ٹہلنے کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ یہی نہیں' اس کے جسم کا ایک ایک عضو اس کے اندرونی اضطراب کا اظہار کر رہا تھا اور باجی گرد و پیش سے بے خبر' والہانہ نظروں سے اسے تکے جا رہی تھیں۔

نور بانو کی سمجھ میں چھوٹے ٹھاکر کا اضطراب نہیں آیا۔ وہ کوٹھے پر کیوں ٹہل رہا تھا۔ اگر باجی کی وجہ سے ٹہل رہا تھا تو اس نے ان کی طرف دیکھا کیوں نہیں۔ بہر حال یہ تھا کہ باجی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس بات کی بھی تصدیق ہوگئی کہ باجی کے ساتھ بھی وہی ہوا ہے' جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ باجی خود سے لڑ نہیں رہی تھیں۔ بلکہ وہ اس میں خوش تھیں۔

وہ وہیں کھڑی رہتی لیکن اماں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''حور بانو' عصر پڑھ لو۔ استانی جی آتی ہوں گی۔''

حور بانو تو بعد میں گئی۔ پہلے نور بانو دالان سے گزر کر غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

استانی جی کے جانے کے بعد اس نے مغرب پڑھی۔ سلام پھیرا تو پتا چلا کہ باجی پہلے ہی اٹھ چکی ہیں۔ وہ پھر دالان کی طرف گئی۔ باجی وہاں موجود تھیں وہ تخت پر بیٹھی اسی سمت گھور رہی تھیں۔ اس بار انہوں نے سلائیوں اور اون کے گولے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔

نور بانو نے جالیوں کے اس پار دیکھا۔ اوپر اندھیرا ہونے لگا تھا لیکن چھوٹا ٹھاکر ایک ہیولے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اور اب اس کا رخ جالیوں والی دیوار کی طرف نہیں تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ دالان سے اسے دیکھا جا رہا ہے۔

اس سے نور بانو کو ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اس کے اندر کی خود ملامتی کم ہوگئی۔ ملامت کا رخ اب باجی کی طرف ہوگیا تھا۔ کیا باجی نہیں جانتیں کہ وہ کافر ہے' مشرک ہے۔ پھر وہ اس کی طرح خود کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ وہ تو بڑی ہیں۔ زیادہ سمجھ دار ہیں۔

اور کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ چھوٹا ٹھاکر بھی ضرور باجی کو دیکھتا ہوگا۔ یہ خیال آتا تو اسے باجی سے رقابت ہونے لگتی۔ مگر وہ تھوڑی دیر کی بات ہوتی پھر وہ سوچتی' چلو اچھا ہے' میری جان تو

چھوٹی۔ باجی اپنی جانیں۔ اللہ کے آگے جواب بھی خود ہی دیں گی۔

کبھی وہ سوچتی کہ اگر چھوٹا ٹھاکر مسلمان ہوتا...... اور وہ دونوں بہنوں کو دیکھتا تو اس کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوتا۔ وہ باجی سے ہی محبت کرتا۔ باجی ہیں ہی اتنی خوبصورت۔ اور وہ خود اتنی معمولی سی لڑکی ہے۔ اسے تو کوئی دوسری نظر دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔

یہ احساسِ کم تری شروع ہی سے اس کے ساتھ تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ باجی اور گلنار کے سامنے وہ نوکرانی لگتی ہے۔ احساسِ کمتری نے اسے کم آمیز بنا دیا تھا۔ وہ بہنوں میں گھلتی ملتی نہیں تھی۔ زیادہ وقت کتابوں کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔

احساسِ کم تری تو الگ رہا' اسے تو اللہ سے بھی شکایت تھی۔ اماں اور ابا' دونوں ہی بہت خوش شکل اور خوب صورت تھے۔ پھر اللہ نے اسے ایسا کیوں بنایا۔ ایک بار چچا نے ہنس کر کہا تھا۔ ''مجھے تو لگتا ہے بھابی کہ آپ کی یہ بیٹی بدل گئی ہے کہیں۔ یہ آپ کی اور بھائی کی بیٹی تو لگتی ہی نہیں۔''

چند روز بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ وہ بیٹھی مطالعہ کر رہی تھی کہ باجی کمرے میں آ ئیں۔

''نور...... نور اٹھو تو...... کچھ دکھانا ہے تمہیں۔'' ان کے لہجے میں سنسنی آمیز مسرت تھی۔

''کیا ہے باجی؟'' وہ جھنجلا گئی۔

''تم میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''دالان میں۔ اور کہاں لے جا سکتی ہوں میں تمہیں۔''

''میں پڑھ رہی ہوں باجی۔ یہیں بتا دو نا' کیا بات ہے۔''

''بہت عجیب بات ہے بتانے میں مزہ نہیں آئے گا آؤ نا۔'' باجی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگیں۔

وہ بہت جھنجلائی لیکن بہر حال وہ باجی کا بہت لحاظ کرتی تھی' اٹھ گئی۔ باجی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دالان میں لے گئیں۔ ''آؤ...... یہاں بیٹھو۔'' باجی نے اسے تخت پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئیں۔

نور بانو سمجھ تو گئی تھی لیکن ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ لیکن اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کیا آج باجی ہر لحاظ' ہر حجاب ختم کرائیں گی۔ وہ تاسف سے سوچ رہی تھی۔ ''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے باجی۔'' اس نے لہجے میں مایوسی سموتے ہوئے کہا۔

''جو میں دکھانا چاہتی ہوں' وہ یہاں نہیں' اوپر ہے...... کوٹھے پر......''

یہ سن کر نور بانو کا دل حلق میں آ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آج باجی کو خوب سنائے گی۔

''کوٹھے پر؟'' اس نے حیرت سے کہا اور کوٹھے کی سمت دیکھا۔ ''وہاں دو آدمی بیٹھے ہیں۔ مگر اس میں کیا خاص بات ہے؟''

''دیکھنا اتنا ضروری نہیں۔ تم ذرا کان لگا کر سنو۔''

نور بانو نے چند لمحے سماعت پر زور دیا۔ ''ہاں...... پڑھائی ہو رہی ہے۔''

"بالکل ٹھیک۔ مگر یہ سنو کہ کیا پڑھایا جا رہا ہے۔"

نور بانو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "ارے ہاں...... یہ تو عربی پڑھ رہے ہیں۔"

"ہاں"۔ باجی نے کہا۔

مگر ان کا فاتحانہ لہجہ نور بانو کو بہت برا لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں باجی کی خوشی کی کیا بات ہے۔

"مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عربی کیوں پڑھ رہے ہیں۔" باجی کے لہجے میں بناوٹی حیرت تھی۔

"اس میں کیا خاص بات ہے باجی۔ لوگ عربی بھی پڑھتے ہیں اور فارسی بھی۔"

"لیکن ایک ہندو عربی کیوں پڑھنے لگا۔" باجی نے اعتراض کیا۔

نور بانو کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ یہ وہ لمحہ ہے' جب باجی کھل کر سامنے آسکتی ہیں۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کو پہچان لیا تھا۔ مگر اس نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ہندو! یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی۔ ایک مسلمان لڑکا بھی تو رہتا ہے وہاں......"

"وہ تو ہے لیکن اس وقت جو پڑھ رہا ہے' وہ مسلمان لڑکا نہیں' چھوٹا ٹھاکر ہے۔"

نور بانو نے بہت غور سے باجی کو دیکھا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی۔"

باجی چوری ہو گئیں لیکن اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھیں۔ اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ بھی چھوٹے ٹھاکر کو پہچانتی ہے۔ "میں پہچانتی ہوں ان دونوں کو۔" ان کے لہجے میں حجاب تھا۔ "کبھی کبھی اسکول جاتے آتے نظر آتے ہیں دونوں۔ یہ چھوٹا ٹھاکر ہے۔"

اب کے نور بانو کے دل میں رقابت کی جو لہر اٹھی' وہ بے حد تند تھی۔ اس وقت وہ ہر قیمت پر باجی کو تکلیف پہنچانا چاہتی تھی...... انہیں مایوس کرنا چاہتی تھی۔ "لیکن باجی' میں نے سنا ہے کہ ہندو بھی عربی فارسی پڑھتے ہیں۔ دیکھو نا علم تو کسی کی بھی میراث نہیں۔"

اور اسے خوشی ہوئی کہ باجی کو مایوسی ہوئی۔ وہ خاموش ہو کر سوچنے لگیں۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس بات کو غیر معمولی ثابت کرنا چاہتی ہیں اور اس کے حق میں کوئی دلیل ڈھونڈ رہی ہیں لیکن انہیں کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

اس لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ اوپر موجود پڑھانے والے نے اچانک تلاوت شروع کر دی۔ ان کی آواز بھی بہت اچھی تھی اور وہ بڑی خوب صورت قرات کر رہے تھے۔ اور وہ سورہ یٰسین کی تلاوت کر رہے تھے۔

دونوں بہنیں مبہوت ہو کر سن رہی تھیں۔ تلاوت ختم ہو گئی۔ پھر بھی چند لمحے انہیں اِدھر اُدھر کا ہوش نہیں تھا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور باجی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "اب کیا کہتی ہو

نور بانو بات صرف عربی پڑھنے کی نہیں یہ تو قرآن کی تلاوت تھی۔"

نور بانو کو اس کا فاتحانہ لہجہ بہت برا لگا۔ باجی یوں خوش ہو رہی تھیں' جیسے اس میں ان کا کمال ہو لیکن اسے بہر حال اعتراف کرنا پڑا کہ واقعی یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

اس وقت مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ اور کوٹھے پر دونوں افراد اٹھ کھڑے ہوئے۔ پڑھانے والا نورانی چہرے والا باریش ادھیڑ عمر آدمی تھا۔

وہ دونوں بھی وضو کے لیے چل دیں۔

اس روز نور بانو باجی کے بارے میں سوچتی رہی۔ یہ بات طے تھی کہ باجی کو چھوٹے ٹھاکر سے محبت ہو گئی ہے۔ یوں چھوٹے ٹھاکر سے محبت اسے بھی تھی لیکن فرق بہت بڑا تھا۔ وہ اس محبت پر نادم تھی۔ وہ اس محبت سے نفرت کرتی تھی۔ جبکہ باجی اس محبت میں سرشار تھیں' خوش تھیں۔ وہ اس فرق کے اسباب پر غور کرنے لگی۔ اسے خوشی ہوئی کہ وہ باجی سے بہتر ہے۔ وہ ایک مشرک اور کافر سے محبت پر مجبور ہو گئی ہے تو کم از کم اپنی اس مجبوری سے نفرت تو کرتی ہے۔ وہ اپنے محبوب سے نفرت کرنے کی کوشش تو کرتی ہے...... وہ بھی اللہ کی خاطر۔ باجی نے تو خود کو اس محبت کے سپرد کر دیا ہے۔ انہوں نے تو سپردگی اوڑھ لی ہے۔ وہ تاویلیں گھڑتی ہیں۔ جواز ڈھونڈتی ہیں۔ یہ نہیں سوچتیں کہ عربی پڑھنے سے انسان مسلمان نہیں ہو جاتا۔ مشرک اور کافر تو عربوں میں بھی تھے۔ اور عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اور قرآن کی تلاوت سننے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا۔

یوں اپنے موقف پر اس کا یقین اور بڑھ گیا۔

مگر آج ثابت ہو گیا کہ باجی درست تھیں اور وہ غلطی پر تھی۔ لیکن باجی یہ دن دیکھنے کے لیے موجود نہیں تھیں۔ وہ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔ اسے اپنا بہت اچھا گمان رکھنے والی' محبت کرنے والی سیدھی بچی بہن پر اس کو بہت پیار آیا جواب اس دنیا میں نہیں تھی۔ اسے رونا آگیا۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ جسمانی طور پر ہی نہیں' صورت شکل میں ہی نہیں' باطنی طور پر بھی باجی کی ضد تھی۔ اس نے گمان اچھا نہیں رکھا۔ اس نے محبت جیسی خوب صورت چیز کو بھی بدصورت بنا دیا۔ وہ کھل کر اسے برا کہتی رہی۔ اس سے پہلے نہ اس کے بعد' اس نے کبھی کسی ہندو کو برا نہیں کہا تھا۔ مشرک اور کافر تضحیک کرنے کے انداز میں نہیں کہا تھا۔ بری بات یہ تھی کہ وہ اپنی مذمت کرنے سے بچنے کے لیے اسے برا کہتی تھی' اس کی توہین کرتی تھی۔ اللہ اسے معاف کرے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ کافر کو بھی کافر نہ کہو۔ اس لیے کہ نہیں معلوم' کب اللہ کی ہدایت اسے نصیب ہو جائے۔

اس کی نگاہوں میں پھر وہ منظر پھر گیا۔ سماعت میں پھر وہ آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ اور شرمندہ ہو گئی۔ چھوٹا ٹھاکر ایمان پر پیدا نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ اللہ کی روشن دلیل پر ایمان لایا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں کتنی چھوٹی اور حقیر ہے اور الٹا اسے حقیر سمجھتی رہی۔ اس نے اللہ کی مبین اور روشن دلیلیں ہزاروں بار پڑھی تھیں۔ مگر انہیں نہ کبھی اس طرح سمجھا تھا اور نہ ان سے اپنے ایمان کو تازہ

اور مستحکم کیا تھا۔

پھر اچانک اس کے وجود میں اطمینان اور خوشی کی ایک لہر اٹھی۔ اس نے سوچا' اب تو مجھے اس محبت پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تو میں اسے محترم سمجھ کر بھی محبت کر سکتی ہوں۔ اب تو سلیقے سے...... محبت کی طرح محبت کی جا سکتی ہے۔

اندر سے کسی حریص جذبے نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... اب کوئی رکاوٹ بھی نہیں۔ اب وہ تمہیں مل سکتا ہے۔''

اور نور بانو تڑپ گئی۔ وہ پھر رونے لگی۔ بہنیں رکاوٹ نہیں ہوتیں۔ وہ بڑبڑائی۔ بہنوں کو تو اپنے حصے کی بڑی سے بڑی خوشی دی جا سکتی ہے۔ اور میں تو خود اپنی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں...... کیسی ہوں...... میں تو چاند کی بس آرزو کر سکتی ہوں......

اسی وقت رابعہ اس کے پاس آ گئی۔ اس نے نماز کے لیے چند چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر وہ زبیر کو یاد کراتی۔ بے چین' مضطرب اور شرمندہ نور بانو کے لیے اس وقت صرف اس کام میں سچی خوشی اور روحانی سکون تھا۔ وہ رابعہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

❁......❁......❁

عبدالحق نے بہت اہتمام سے وضو کیا۔

اسے یاد تھا' جن دنوں وہ حق کی جستجو کر رہا تھا' اسے قرآن پاک کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ لیکن ہر ایک نے یہ بھی کہا تھا کہ پاک ہوئے بغیر اس کتابِ مقدس کو چھونا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ قرآن پڑھے لیکن دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ مگر آج وہ مبارک دن تھا کہ اس کی یہ آرزو پوری ہونے والی تھی۔

وضو کر کے وہ اٹھا تو اسے خیال آیا کہ اس کے پاس قرآن پاک تو ہے ہی نہیں۔ وہ ابھی بازار چلا جاتا لیکن اس میں دیر لگتی۔ اور یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ بہت بے قرار اور بے تاب ہو رہا تھا۔

اس نے رابعہ کو آواز دی۔ ساتھ ہی اسے حیرت ہوئی...... کیسی عجیب بات ہے کہ وہ زبان پر چڑھا ہوا اس کا پرانا نام بھول چکا ہے۔ اور اس نئے نام سے اسے پکار رہا ہے۔ یہ یقیناً اللہ کی مہربانی ہے اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

رابعہ آئی تو اس نے کہا۔ ''منجھلی بی بی سے کہو کہ مجھے قرآن پاک چاہیے۔''

رابعہ نور بانو کے پاس چلی گئی۔

نور بانو جواب میں بے ساختہ کہنے والی تھی کہ نیچے اسٹور روم میں موجود ہیں۔ وہاں سے لے لیں لیکن وہ ایک لمحہ اس کے لیے طویل ہو گیا۔ اس نے اپنا قرآن پاک جو وہ گزشتہ روز ہی نیچے سے لائی تھی' رابعہ کو دے دیا۔ ''لو...... انہیں دے آؤ۔''

اس ایک لمحے میں نور بانو نے کتنا کچھ سوچ لیا۔ اس کا جی چاہا کہ چھوٹے ٹھاکر کو باجی

کا قرآن پاک دیا جائے۔ مگر اس نے فوراً ہی اس سوچ سے نظریں چرا لیں۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا۔ کیونکہ اوپر اس کے اپنے پاس قرآن پاک ایک ہی تھا۔ مگر اس نے وہی دے دیا۔

''ایسا کیوں کیا۔'' اس کے اندر کسی نے پوچھا۔

''وہ پڑھیں گے تو مجھے بھی ثواب ملے گا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ بات صرف اتنی سی نہیں۔ لیکن وہ اس پر گہرائی میں جا کر سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سوچا میں نیچے سامان لینے جاؤں گی تو اور قرآن پاک بھی لے آؤں گی۔

ادھر قرآن پاک کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے عبدالحق کا دل اس عاشق کی طرح دھڑک رہا تھا' جو پہلی بار اپنے محبوب سے ملنے والا ہو۔

اس نے قرآن پاک لیا' اسے چوما' آنکھوں سے لگایا اور کھولا۔

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ واہ...... اس نے سوچا۔ ہر کام کرنے سے پہلے یہ پڑھ لینا چاہیے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اب اس کے سامنے سورۂ فاتحہ تھی۔ بابا نے کہا تھا کہ اس کی تلاوت کے بغیر کوئی رکعت مکمل نہیں ہو سکتی۔ اور ہر رکعت میں اس کے بعد چھوٹی سورت کی تلاوت کرنی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے پندرہ چھوٹی سورتیں یاد ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ تو بہت مشکل کام ہے۔

اللہ چاہے تو کوئی کام مشکل نہیں۔ اندر سے ایک آواز ابھری۔ دیکھ لو' اس نے تمہیں' زبیر اور رابعہ کو ایمان عطا فرما دیا۔ یہ کوئی آسان کام تھا۔

بے شک، یہ سچ ہے۔ عبدالحق نے کہا اور دل میں اللہ کو پکارا۔ ''میری مدد کیجیے اے اللہ۔ میرا کام آسان کر دیجیے۔ اپنا کلام میرے حافظے پر نقش کر دیجیے۔''

اس نے دوبارہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا اور پہلی آیت کی طرف بڑھا۔ نجانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس پر کائنات کے' زندگی کے تمام راز اور علوم کھلنے والے ہیں۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

تعریف اللہ کے لیے جو رب ہے تمام جہانوں کا......

پہلی ہی آیت نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ ارے...... میں کہتا تھا کہ یہ مربوط نظام کسی ایک ہستی نے قائم کیا ہے' جو بہت زبردست ہے۔ میں تو ایک عالم کی بات کرتا تھا۔ صرف اس دنیا کی۔ وہ تو پہلی ہی آیت میں بتا رہا ہے کہ یہ کائنات بے شمار جہانوں پر مشتمل ہے' جن کا تمہیں علم ہی نہیں ہے۔

اسے اقبال کا مصرعہ یاد آیا......

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اور تعریف اللہ کے لیے ہے!......صرف اللہ کے لیے! کسی اور کے لیے نہیں!......اور ہم جو کسی کی تعریف کرتے ہیں......وہ بہت اچھا انسان ہے......تو یہ نہیں کہنا چاہیے؟

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دماغ میں بے شمار مشینیں ہیں......گراریاں ہیں جو حرکت کر رہی ہیں۔ کوئی بہت بڑا بھید' بہت بڑا راز عیاں ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ تعریف صرف اللہ کے لیے ہے......!

اگلے ہی لمحے وہ تھرا کر رہ گیا......اس پر کپکپی چڑھ گئی۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ ایک دن میں کیا' ایک برس میں' ایک عمر میں بھی نہیں سمجھ آئے گا۔ بابا نے کہا تھا' عاجزی سے پڑھنا' ایک ایک لفظ پر غور کرنا اور اللہ سے رہنمائی طلب کرنا۔ تو یہ عمر بھر کا کام ہے۔ پہلے پڑھنا تو سیکھ لے۔ پھر غور کرنا۔

اسے خیال آیا کہ ابھی تو اسے کم از کم پندرہ سورتیں یاد کرنی ہیں۔ پہلے سورۂ فاتحہ یاد کر لے۔ پھر بابا نے کہا تھا......آخری پارے میں چھوٹی سورتیں ملیں گی۔ وہ پڑھنے لگا۔ ہر آیت پر اس کا دل اٹکتا تھا۔ وہ غور کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ خود کو دھکیل کر آگے بڑھا دیتا تھا۔

بہت مہربان' نہایت رحم والا۔ مالک روز جزا کا۔ تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ دکھا ہمیں راستہ سیدھا۔ راستہ ان کا کہ جن پر تُو نے انعام کیا۔ نہ کہ ان کا جو بھٹکنے والے اور گمراہ ہیں۔

اب وہ یاد کرنے کی غرض سے بار بار پڑھ رہا تھا۔ ایک بات اس نے بہت اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ اسے قرآن پاک سے محبت ہو گئی ہے۔

دہراتے ہوئے اس نے دیکھے بغیر اگلی آیت پڑھی تو اس کے جسم میں خوش گوار سی سنسنی دوڑ گئی......ارے کیا مجھے یاد ہو گیا۔ اس نے جانچنے کے لیے قرآن پاک سے نظریں ہٹائیں اور آگے پڑھنے کی کوشش کی۔ روانی کے ساتھ نہ سہی' مگر اگلی آیت بھی اسے یاد ہو گئی تھی۔ شاید کمی صرف زبان پر رواں ہونے کی تھی۔

چھ سات بار دہرانے کے بعد اس نے خود کو پھر آزمایا۔ اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے سورۂ فاتحہ روانی کے ساتھ یاد ہو چکی تھی۔ یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ عاجزی سے زیر لب بولا۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے۔

اگلے صفحے پر سورۂ بقرہ اسے پکار رہی تھی۔ اس کا دل مچل اٹھا لیکن اس نے خود کو روکا۔ پہلے نماز کے اسباب مکمل کر لوں۔ پھر پڑھوں گا......اور اللہ نے جتنی زندگی دی' اتنا ہی پڑھوں گا۔ اس نے کہا۔ مگر بے صبرا پن ٹھیک نہیں۔

اس نے تیسواں پارہ کھولا۔ شروع میں تو بڑی سورتیں تھیں۔ (اس وقت اس نے بڑی سورتیں دیکھی ہی نہیں تھیں وہ تو بس سورہ فاتحہ سے موازنہ کر رہا تھا) اس نے دیکھا کہ سورتیں

بتدریج چھوٹی ہو رہی تھیں۔ آخر اس نے پیچھے سے یاد کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک گھنٹے بعد اس نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ دن ہی شاید مبارک دن تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اسے سولہ سورتیں یاد ہو گئیں۔ وہ روانی سے یاد ہوئی تھیں۔ مگر پڑھتے ہوئے وہ کبھی کبھی اٹکتا تھا۔ اس نے سوچا' کوئی بات نہیں۔ میں پڑھتا رہوں گا تو روانی سے یاد ہو جائیں گی۔ اور جب نماز میں پڑھوں گا تو اعتماد بھی بڑھ جائے گا۔

اس نے رابعہ کو بلایا۔ "منجھلی بی بی کے ساتھ نیچے جاؤ۔ ان سے کہنا' بہت ضروری اور قیمتی سامان الگ باندھ لیں۔ کل صبح سویرے ہم روانہ ہوں گے۔"

❁ ❁ ❁

اس بار نور بانو نیچے گئی تو جیسے سب کچھ بدل چکا تھا!

اب وہ پچھلی بار والا خوف نہیں تھا۔ نگاہوں میں اس رات کے وہ خوف ناک مناظر نہیں پھر رہے تھے۔ ہاں' ان کی یاد تھی' جو دھیمے انداز میں دکھی کر رہی تھی۔ مگر وہ دکھ نارمل تھا۔ آدمی لوگوں کو کھوتا ہے تو اسے دکھ ہوتا ہے۔ پچھلی بار دکھ تو کم تھا' دہشت زیادہ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی بقا کی طرف سے خوف زدہ اور عدم تحفظ کا شکار تھی۔

صرف دو دن میں یہ تبدیلی آئی تھی۔

اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اسے بہت زیادہ سامان نہیں لینا ہے۔ صرف بہت ضروری چیزیں اور ایسی قیمتی چیزیں لینی ہیں' جو بہت زیادہ جگہ نہ گھیرتی ہوں۔ بنیادی ضرورت کی چیز تو کپڑے تھے......اور اس کی کتابیں۔

اس نے کپڑوں کا صندوق کھولا تو سب سے پہلے اسے وہ کرتے نظر آئے جو اماں نے' باجی نے اور خود اس نے اوتار سنگھ کے لیے کاڑھے تھے۔ پہلی بار وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوئی۔ عبدالحق اب ان تحفوں کا......اور اس کی محبت کا جو ان کرتوں میں چھپی ہوئی تھی' پوری طرح مستحق تھا۔

اس نے کرتوں کو گنا تو حیران ہوئی۔ وہ نو کرتے تھے' ایک کرتا کہاں گیا؟ اس نے پورا صندوق الٹ پلٹ کر دیا۔ مگر دسواں کرتا موجود ہی نہیں تھا۔ پاجامے البتہ دس تھے۔

اس نے ایک ایک کر کے جائزہ لیا اپنا کرتا تو وہ بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ بھول نہیں سکتی تھی اس نے جس کیفیت میں اس کی ترپائی اور کڑھائی کی تھی' وہ بھولنے والی بات ہی نہیں تھی۔ اور وہ کرتا موجود تھا۔

ذرا دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ باجی کا کاڑھا کرتا کم ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کہاں گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا جواب اسے کبھی معلوم نہیں ہوگا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بے کسی کی موت کے بعد وہ کرتا ہی باجی کی آبرو کا پردہ دار بنا تھا۔ اور وہ کرتا خود اس نے منہ پھیرتے ہوئے باجی کے

جسم پر ڈالا تھا' جس کے لیے بڑی چاہت سے باجی نے اسے کاڑھا تھا۔

اس نے وہ کپڑے اسی صندوق میں رکھ دیے' جس میں لے جانے والا سامان رکھنا تھا۔ اس کا کاڑھا ہوا کرُتا سب سے اوپر تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ رابعہ دالان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ محض دوسراہٹ کے لیے آئی تھی۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کیا رکھ رہی ہے۔ اور کیا جوڑ رہی ہے۔

اسے خوشی تھی کہ اسے تنہائی میسر ہے۔ اس نے اس کرُتے کو بڑی محبت سے چھوا۔ اس وقت اس کے چہرے پر جو رنگ تھے' وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی انہیں دیکھے۔ اور وہ اس وقت کو یاد کرنا چاہتی تھی' جب اس نے وہ کرُتا کاڑھا تھا۔ مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس وقت تو اسے جلد از جلد سامان پیک کرنا تھا اس کے بعد افطاری کی تیاری کرنی تھی۔

وہ کپڑوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ پہلے اس نے اپنے عام استعمال کے کپڑے نکالے۔ پھر اچھے کپڑوں کا خیال آیا۔ اماں تھوڑا تھوڑا کر کے تینوں بیٹیوں کی شادی کی تیاری کر رہی تھیں۔ جب جب موقع ہوتا' وہ ایک ایک جوڑا بنا کر اس صندوق میں ڈال دیتیں۔ ہر بیٹی کا انہوں نے الگ صندوق بنا رکھا تھا۔ اس نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے تمام چیزیں نکال لیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ دونوں بہنوں کی کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگائے گی۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ ان کے زیورات نکال لینے چاہئیں۔ پاکستان جا کر وہ کسی ضرورت مند کو دے دے گی۔ اللہ بہنوں کو اجر دے گا۔

اس نے گلنار کے صندوق سے زیورات نکال لیے۔ پھر وہ باجی کے صندوق کی طرف متوجہ ہوئی۔ زیورات نکالتے ہوئے باجی کے ایک کامدانی کے جوڑے پر اس کی نظر جم گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جوڑا نکال کر اپنے سامان میں رکھ لے لیکن وہ ہچکچا رہی تھی۔ مری ہوئی بہن کی کوئی ذاتی چیز لینا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر دل اسے چھوڑنے پر مان ہی نہیں رہا تھا۔ نجانے کیوں وہ جوڑا اسے بہت اہم لگ رہا تھا۔ یہ الگ کہ اس کی اہمیت وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

وہ ہچکچاتی رہی لیکن نہ وہ صندوق کے پاس سے ہٹی' نہ ہی اس نے صندوق بند کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب چیزیں جو وہاں چھوڑ جائے گی' نجانے کس کو ملیں گی۔ ضروری تو نہیں کہ کوئی مستحق ہی ہو۔ پھر یہ ایک جوڑا لینے میں حرج ہی کیا ہے۔

خاص ہچکچاہٹ کے بعد اس نے جوڑا اپنے سامان میں رکھ لیا۔

اماں کی تجوری میں اماں کے زیورات کے علاوہ نقد رقم بھی تھی۔ اس نے وہ تمام چیزیں بھی سامان میں رکھ لیں۔ اب صرف کتابوں کا مرحلہ رہ گیا تھا کتابیں دینی اور علمی تھیں۔ یہ حقیقت اس پر پوری طرح روشن تھی کہ کتابیں وہ عبدالحق کی وجہ سے لے جانا چاہتی ہے۔ اس سے زیادہ عبدالحق کو ان کتابوں کی ضرورت تھی۔

ہر طرف سے مطمئن ہو کر اس نے رابعہ کو آواز دے لی۔

❁ ❁ ❁

عشاء کے بعد وہ سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ دن بھر ان میں سے کسی نے ایک جھپکی بھی نہیں لی تھی اور صبح انہیں سفر کے لیے نکلنا تھا۔

مگر عبدالحق کی آنکھوں میں اب بھی نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسا دن گزارا تھا' جس میں اسے نہ اپنی خبر تھی' نہ گرد و پیش کا احساس تھا۔ بلکہ گزشتہ رات ہی سے اس کی یہ کیفیت تھی۔ اسے سوچنے کی تو فرصت ہی نہیں ملی تھی۔

جو کچھ ہوا تھا' بہت تیزی سے ہوا تھا اور ایک دن میں اتنا کچھ ہو گیا تھا کہ جو برسوں میں بھی نہیں ہوتا۔ برسوں سے جو کچھ سمجھنے اور جاننے کی کوشش کر رہا تھا' وہ اس نے صرف ایک لمحے میں سمجھ لیا تھا اور جان لیا تھا۔ برسوں سے جس چیز کی وہ جستجو کر رہا تھا' وہ صرف ایک لمحہ میں اسے مل گئی تھی۔ اور کیسی سچی چیز تھی وہ کہ اس کا سینہ اس نے روشن کر دیا تھا۔

اسے ایسی خوشی کا احساس ہوا' جو بہت بڑی تھی۔ ایسی خوشی جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا پورا وجود اس خوشی سے بھر گیا...... چھلکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھے اور باہر نکل جائے اور چیخ چیخ کر سب کو...... ہر شخص کو وہ شناسا ہو یا اجنبی' اپنی اس خوشی کے بارے میں بتائے...... ارشمیدس کی طرح' جس نے پانی میں غوطہ لگاتے ہوئے کثافت کا راز سمجھا تو اتنا خوش ہوا کہ میں نے جان لیا...... میں نے سمجھ لیا...... میں نے پا لیا کے نعرے لگاتا ہوا پانی سے نکل آیا تھا اور اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بے لباس ہے۔

لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ وہ اپنی خوشی سے محظوظ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے اندر ہی اندر اس خوشی سے کھیل سکتا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا۔ بابا نے کہا تھا۔ پہلے اللہ کا شکر ادا کیجیے پھر بندے کو شکریہ کہیے۔ اس میں کوتاہی شرک ہے۔ اور اللہ شرک پر کبھی معاف نہیں کرتا۔ وہ اس پر غور کرنے لگا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ اللہ نے اسے بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔ بہت بڑا کرم ہوا ہے اس پر۔ یہ کسی کے بتانے کی بات نہیں تھی۔ یہ احساس تو ان کے وجود کے اندر پہلے ہی موجود تھا۔ مگر اسے لگ رہا تھا کہ بابا کی بات میں سمندر کی سی گہرائی ہے۔ بڑے معنی چھپے ہیں اس میں......

لیکن اس وقت وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ غور نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے اس خیال سے دامن چھڑا لیا۔

اللہ کا شکر تو اسے ادا کرنا تھا...... اور ساری زندگی ادا کرنا تھا۔ وہ دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا رہا۔ پھر اچانک اسے اپنی ایک پرانی...... دیرینہ آرزو یاد آئی۔ برسوں سے وہ سوچتا تھا...... وہ اوپر

والا ہی تو ہے' جس نے زندگی سمیت بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں۔ وہی سب سے زیادہ محبت کا حق دار ہے۔ انسان کو سب سے بڑھ کر اس سے محبت کرنی چاہیے۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اس سے محبت کرے۔ اسی لیے تو وہ اس کی جستجو کر رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ اسے سمجھے گا نہیں' جانے گا نہیں تو محبت کیسے کرے گا۔

اور اب اس نے رحمت فرمائی تھی۔ اس نے اسے اپنا راستہ دکھا دیا تھا۔ اسے خود سے متعارف کرا دیا تھا۔ اب تو وہ اس سے محبت کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اسے بے بسی کا نہایت شدید احساس ہوا۔ اس بے بسی کے دو رخ تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ تعارف تو ہو گیا لیکن وہ ابھی اسے کتنا جانتا ہے...... کچھ بھی نہیں! کچھ بھی نہیں! ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کی عظمت تو ایسی ہے کہ جاننے والے بھی شاید یہ دعویٰ نہ کر سکیں کہ اسے جانتے ہیں۔ پھر یہ تسلی بھی ہوئی کہ اب اسے راستہ تو دکھا دیا گیا ہے۔ اب وہ جاننے کی کوشش کر سکتا ہے اور وہ بھی درست سمت میں اور محبت تو اسے اپنے پیدا کرنے والے سے ہے اور وہ کرتا رہے گا۔

بے بسی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ وہ اس سے محبت کیسے کرے۔ محبت کوئی اظہار کرنے کا...... زبان سے یہ کہتے رہنے کا نام تو ہے نہیں کہ مجھے تم سے محبت ہے یہ سچ ہے کہ محبت کرنے والوں کو دنیا میں بے عمل اور ناکارہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت محبت عملی چیز ہے۔ اس کا اظہار زبان کی بجائے عمل سے ہی اچھا لگتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اللہ سے کیسے محبت کرے۔

بے بسی کے عالم میں اس نے سوچا کہ آدمی اپنے جیسے کسی آدمی سے محبت کرے تو کیا کرتا ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ جو کچھ اسے اچھا لگتا ہو' وہ اسے دے۔ وہ کام کرے جو اسے پسند ہوں۔ وہ کام نہ کرے جو اسے ناپسند ہوں۔ اس کی خوشی میں خوش ہو اس کی ہر مرضی پوری کرے۔

پھر اس نے سوچا کہ اللہ کو کچھ دینے کا تو سوال ہی نہیں۔ سب کچھ اللہ کا ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ دینے والا ہے۔ ہر ضرورت سے پاک اور بے نیاز۔ ہاں وہ کام کیے جائیں' جو اللہ کو پسند ہیں۔ اور وہ کام نہ کیے جائیں جو اسے ناپسند ہوں۔ اللہ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت تیز دوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ابھی تو اسے ہدایت پائے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ اتنا تیز دوڑنے میں کوئی لغزش نہ ہو جائے...... کوئی گمراہی مسلط نہ ہو جائے۔ ابھی تو اسے قرآن پڑھنا ہے...... پڑھتے رہنا ہے اور سمجھنا ہے پھر اس کی سمجھ میں آنے لگے گا۔

بابا نے کہا تھا...... یاد رکھنا' قرآن اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے' جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ اور انسان پر قرآن کے چار حقوق ہیں۔ اسے پڑھو اور سمجھو۔ اور اس پر عمل کرو اور اسے دوسروں تک

پہنچاؤ۔ یہ سفر بہت طویل ہے اور زندگی اسی لیے دی گئی ہے۔

اس نے سوچا' وہ خواہ مخواہ جلد بازی کر رہا ہے۔ برسوں وہ جستجو کرتا رہا ہے...... بھٹکتا رہا ہے۔ اس کی کوشش سے کچھ نہ ہوا۔ اور اللہ نے عنایت کی تو لمحے میں اتنا کچھ ہو گیا۔ اسے بس ترتیب سے قرآن پاک کے چاروں حقوق ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اللہ کو جب منظور ہو گا تو وہ اسے محبت کے آداب سکھا دے گا۔

لیکن اس کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اس کی کیفیت ہیجانی تھی۔ ایسے میں خود کو سوچنے سے روکنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت تو نیند ہی اس کا مسئلہ حل کر سکتی تھی۔ اور نیند اسے آ نہیں رہی تھی۔

ہیجان اس بات کا تھا کہ اس دن کے ایک ایک لمحے میں اس کے لیے ایسی لذت اور سرشاری تھی' جس سے وہ اس سے پہلے ناواقف تھا۔ اور اس لمحے کی لذت تو وہ بھول ہی نہیں سکتا تھا' جب اس نے کلمہ پڑھا تھا۔ اس وقت گرد و پیش ایسی روشنی تھی' جس کا حسن وہ بیان ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ ایسی روشنی اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ارضی روشنی تو تھی ہی نہیں۔ وہ تو کوئی آسمانی چیز تھی۔ اور اس میں کیسی ٹھنڈک اور کیسا سکون تھا۔

وہ روشنی اپنی ٹھنڈک اور سکون سمیت اس کے جسم میں اترنے لگی تھی۔ اور نجانے کیسے اسے یہ قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ اپنے جسم کے اندر جھانک سکتا تھا اور اس نے حیرت سے دیکھا تھا کہ اس کا وجود ویسا ہی روشن ہو گیا تھا' جیسا گرد و پیش تھا۔ بلکہ باہر اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اور اندر روشنی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ نگاہیں چندھیانے لگی تھیں۔ وہی لمحہ تھا' جب اس کا وجود سکون اور طمانیت سے بھر گیا تھا۔ دماغ سے ہر خیال' ہر سوچ مٹ گئی تھی۔ سکون اور طمانیت کے سوا کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ اسے نیند آنے لگی تھی۔ اور اس نیند میں انوکھی ناقابل بیان لذت تھی' جسے وہ اب بھی محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ان لمحوں میں جب اس پر نیند طاری ہو رہی تھی' اس نے اپنے اندر جھانکتے ہوئے اپنے دل کو دیکھا تھا۔ وہ اتنا روشن لگ رہا تھا کہ اس کی طرف دیکھنا محال تھا اور اس روشنی کا کم از کم کوئی زمینی رنگ نہیں تھا۔ وہ رنگ لگ تو رہا تھا لیکن ویسا رنگ [illegible] نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اور اس کے دل سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا اور وہ سو گیا تھا۔

اور جب وہ جاگا تو...... وہ یاد کر رہا تھا۔ اور اسے یاد آ رہا تھا۔ وہ جاگا تو اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت طویل' بہت اچھی اور پرلذت نیند کے بعد بیدار ہوا ہے۔ اس کا دماغ تر و تازہ اور روشن تھا۔ اس کی جسمانی کیفیت بھی یہی تھی۔ یہ بات اس کے لیے بھی ناقابل یقین تھی کہ وہ محض چند لمحے سویا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ یہ حقیقت ہے۔ تو وہ کیسی نیند تھی؟ اور اب اسے نیند نہیں آ رہی تو کیا اس لیے کہ ان لمحوں میں وہ کئی راتوں کی نیند پوری کر چکا ہے؟

وہ وقت یاد کرتے ہوئے اس وقت بھی اس کے رگ وپے میں کیف وانبساط دوڑ رہا تھا۔ بڑی لذت تھی اس یاد میں بھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ شروع سے وہ سب یاد کروں۔

اس نے یاد کرنا شروع کیا......

وہ اپنی لاٹھی اٹھائے گلی میں ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا کہ اس نے وہ آواز سنی......

اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکا۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔ پھر وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارے...... یہ تو میں نے سِوچا ہی نہیں!

❁ ❁ ❁

اپنے کمرے میں نور بانو جاگ رہی تھی!

جو کُرتا اس نے اس وقت کے چھوٹے ٹھاکر کے لیے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا تھا اور سیا تھا' اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کے ایک ایک ٹانکے کو' کڑھائی کیے ہوئے ایک ایک پھول کو بڑی محبت سے سہلا رہی تھی۔ کُرتا کیا تھا' وہ تو اس کے لیے یادوں کا خزانہ تھا...... ایسی یادوں کا خزانہ جو کبھی اس کے لیے ناخوشگوار تھیں۔ مگر اب خوش گوار ہو گئی تھیں۔ اب وہ یاد کر سکتی تھی۔

اس نے جس وقت اماں سے کہا کہ ایک کرتا وہ کاڑھے گی تو اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کرتے چھوٹے ٹھاکر کے لیے کاڑھے جا رہے ہیں۔ وہ تو یہ سمجھی تھی کہ اماں ابھی سے گھر کے لوگوں کے لیے گرمی کا سامان کر رہی ہے۔

اسے یاد تھا کہ جب اماں نے بتایا کہ وہ تمام کُرتے چھوٹے ٹھاکر کے لیے کاڑھے جا رہے ہیں تو وہ کیسے کھسیائی تھی۔ اور باجی نے کیسے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا۔ اتنے کُرتے...... چھوٹے ٹھاکر کے لیے! اور ایک کرتا نور بانو بھی کاڑھے گی۔

وہ اس سے انکار کرنے والی تھی۔ لیکن جانتی تھی کہ اس صورت میں بہنیں اس کا مذاق اڑائیں گی۔ سو اس نے دل پکا کر کے بظاہر بے پروائی سے کہا تھا۔ ''کرتا کاڑھنے میں کیا برائی ہے۔ وہ تو میں ضرور کاڑھوں گی۔''

باجی نے جھٹ سے کہا تھا...... ''اماں' ایک کُرتا میں بھی کاڑھوں گی۔''

اور اماں نے بس ان کی محبت میں اجازت دے دی تھی۔ ورنہ وہ اس کام میں کسی کا ساجھا نہیں چاہتی تھیں۔

اس نے کہہ تو دیا تھا۔ مگر شروع میں اس کا دل ہی نہیں چاہا۔ اس نے سوچا تھا' وہ کرتا کاڑھے گی ہی نہیں۔ اور آخر میں اماں تنگ آ کر اس سے کُرتا واپس لے لیں گی۔

لیکن پھر اس نے باجی کو کُرتا کاڑھتے دیکھا تو اسے کچھ ہونے لگا۔

اس نے دیکھا تھا کہ باجی کُرتے پر کڑھائی کرتی ہیں تو بالکل اکیلے میں...... تنہائی میں۔ اس

وقت جب گھر کے سب لوگ مصروف ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی کسی کتاب کے مطالعے میں کھوئی ہوتی تھی۔ وہ تو اس روز وہ پانی پینے کے لیے نہ اٹھی ہوتی تو اسے بھی پتا نہیں چلتا۔

اٹھی تو وہ پانی پینے کے لئے تھی۔ مگر نجانے کیوں وہ دالان میں چلی گئی۔ وہاں باجی تخت پر بیٹھی کرُتے پر کڑھائی کر رہی تھی اور ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ وہ کھڑی انہیں دیکھتی رہی اور انہیں اُس کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا۔

اور وہ منظر بہت عجیب تھا' خوب صورت تھا۔ باجی کے چہرے پر جیسے دھنک کے تمام رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بار انہوں نے آنکھیں اٹھا کر بھی دیکھا تو ان کی آنکھوں میں وہی رنگ نظر آئے لیکن یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے اُسے بھی نہیں دیکھا جو اُن کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ تو جیسے کچھ اور ہی دیکھ رہی تھیں۔ اور ان کی آنکھوں کی کیفیت' اُن کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ کوئی بہت حسین منظر دیکھ رہی ہیں۔ پھر انہوں نے نظریں جھکائیں اور دوبارہ کرُتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

نور بانو مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ باجی نے اُسے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ دیکھ لیا ہوتا تو وہ وہ کچھ نہیں کرتیں' جو انہوں نے بعد میں کیا۔ نور بانو تو بس سحر زدہ سی انہیں دیکھتی رہی باجی ویسے ہی بہت خوب صورت تھیں۔ مگر اس وقت تو آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور لگ رہی تھیں۔ اور ان کے چہرے پر ایسی پاکیزگی تھی کہ اُس کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔

وہ باجی کو دیکھتی رہی۔ باجی نے کپڑے کو بڑی محبت اور نرمی سے چھوا...... سہلایا۔ پھر ان کے ہونٹ ہلے۔ لیکن آواز سنائی نہیں دی۔ پھر انہوں نے ایک ٹانکا لگایا۔ پھر اُس ٹانکے کو سہلایا۔ اور ان کے ہونٹ دوبارہ ہلے۔

وہ حیرت سے دیکھتی رہی۔ چند لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ سب باجی کا معمول ہے' جسے وہ دہراتی ہیں۔ وہ کپڑے کو سہلاتیں' دھاگے کو سہلاتیں' سوئی کو چومتیں' ٹانکا لگاتیں اور پھر ٹانکے کو سہلاتیں۔

اچانک نور بانو کے اندر شدید غصہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ باجی اُس کرُتے کی ہر چیز کو اپنی محبت سونپ رہی تھیں اور ان کا انداز ایسا تھا' جیسے وہ عبادت کر رہی ہوں۔

اُس کا جی چاہا کہ وہ باجی کو جھنجھوڑ کر رکھ دے لیکن وہ ان سے بدتمیزی نہیں کرنا چاہتی تھی' وہ وہاں سے ہٹ آئی۔

لیکن اب کتاب میں اُس کا دل نہیں لگا۔ اسے رہ رہ کر وہ منظر یاد آ رہا تھا جو اُس نے دالان میں دیکھا تھا۔ اور غصے کے باوجود وہ یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی کہ وہ بے حد خوب صورت منظر تھا...... خوب صورت اور پاکیزہ۔ اور اس میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ اس زمین کا کوئی منظر نہیں

لگ رہا تھا۔ اُس میں کوئی غیر ارضی بات تھی۔

اُس نے سوال کیا محبت اتنی پاکیزہ اور اتنی خوب صورت ہوتی ہے۔ صرف محبت کی بات ہوتی تو اسے اتنی حیرت نہ ہوتی۔ مگر یہ تو ایک کافر ایک مشرک کی محبت تھی' اور وہ محبت اُس کے پاس بھی تھی۔ مگر وہ اُس پر شرمندہ رہتی تھی...... اور اسے یقین تھا کہ اُس کی شرمندگی بجا ہے۔ بلکہ کم ہے۔ تو باجی کو شرمندگی کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟

وہ اپنی اس شرمندگی پر فخر کرتی رہی تھی...... اور باجی کی ڈھٹائی پر انہیں برا سمجھتی رہی تھی۔ مگر وہ منظر دیکھنے کے بعد وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ خوب صورتی اللہ کی عطا ہے...... ہر اچھی چیز کی طرح اللہ نے باجی کو حسین...... بہت حسین بنایا۔ بھی تو اسے شکایت تھی اللہ سے کہ اسے نظر انداز کر دیا۔

مگر اس کرُتے پر کڑھائی کرتے ہوئے باجی جتنی خوب صورت تھیں' اُس سے ہزار گنا خوب صورت لگ رہی تھیں۔ تو یہ بات واضح تھی کہ خوب صورتی میں وہ اضافہ اس محبت کی وجہ سے تھا' جو وہ اس وقت چھوٹے ٹھاکر کے لئے محسوس کر رہی تھیں اور جس کے زیر اثر وہ اس وقت چھوٹے ٹھاکر کے کرُتے پر کڑھائی کر رہی تھیں اور وہ اضافی خوب صورتی بھی اللہ کی عطا تھی۔ وہ شیطان کی دین تو نہیں کہہ سکتی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے بھی اس پر لرزہ چڑھنے لگا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کو باجی کی چھوٹے ٹھاکر سے محبت پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ وہ اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ اس لئے تو انعام کے طور پر باجی کی خوب صورتی بڑھ گئی۔

اس بات نے اسے الجھا دیا۔ اللہ بہت غفور الرحیم ہے' لیکن مشرک کو وہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ پھر یہ عنایت کیسی؟ تو کیا یوں ہے کہ محبت پاکیزہ ہو تو اللہ کے ہاں مقبول ہوتی ہے۔ خواہ کسی مشرک سے کی جائے۔ مگر اس خیال سے وہ لرز کر رہ گئی۔ یہ تو یقینی طور پر فاسد خیال ہے۔ مگر باجی کی ان لمحوں کی خوب صورتی کی وہ چشم دید گواہ ہے۔

اسے ڈر لگنے لگا۔ اُس کی سوچیں گمراہی کی طرف جا رہی تھیں' اُس نے انہیں ذہن سے جھٹک دیا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ وہ اللہ کی خاطر اپنی محبت سے منہ موڑ رہی ہے اور پھر بھی عذاب میں ہے۔ اور باجی اللہ کے لئے بھی اپنی محبت نہیں چھوڑتیں اور پُرسکون اور خوش ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ بس یہ ہے کہ اللہ نے باجی کو ہر معاملے میں نوازا ہے اور اسے نظر انداز کیا ہے۔ باجی کو گناہ پر بھی انعام ملتا ہے۔ اُس نے جل کر سوچا۔

مگر وہ فوراً ہی ڈر گئی۔ یہ اللہ کے بارے میں وہ کیسے سوچ رہی ہے۔ اُس نے دل میں توبہ کی اور سوچا' بس یہ محبت کا کمال ہے۔ ثابت ہو گیا کہ محبت بہت خوب صورت اور طاقت ور جذبہ ہے۔

اس کے بعد اُسے باجی سے شدید رقابت محسوس ہونے لگی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی باجی کا رویہ اپنائے گی۔ چھوٹے ٹھاکر کے معاملے میں اپنی محبت کا گلا نہیں گھونٹے گی۔ چپکے چپکے اُس

سے محبت کرے گی اور اُس کی محبت سے نہیں لڑے گی۔

لیکن عملی طور پر یہ ناممکن ثابت ہوا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر سے محبت تو کرتی تھی۔ مگر اس محبت کو قبول کر لینا' خود کو اُس کے سپرد کر دینا اُس کے لئے ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ کافر تھا۔ مشرک تھا۔ اُس نے باجی کی دلیلوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ مگر بات نہیں بنی۔ کیا ہوا جو وہ عربی سیکھتا ہے۔ کیا ہوا' جو وہ قرآن پاک کی تلاوت سنتا ہے اس کے باوجود ہے تو وہ مشرک ہی۔

بس اُس نے باجی کی ضد میں ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کے لئے کرُتا کاڑھے گی اور اس میں اپنی پوری محبت سمو دے گی۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ ہاں! وہ ترکِ محبت کی کوشش بھی کرتی رہے گی اور اس میں ناکامی پر شرمندہ بھی ہوتی رہے گی۔

تب اُس نے کرُتے پر کڑھائی شروع کی اور بڑی محبت سے کی۔ کرُتے کا ایک ایک ٹانکا' ایک ایک پھول اُس کی محبت کا گواہ تھا۔ پہلی بار اُس نے اپنی دبی ہوئی' کچلی ہوئی محبت کو ابھرنے کا موقع دیا تھا تو وہ پوری شدت سے ابھری تھی۔ اُس محبت کی گرمی' گداز' نزاکت اور سچائی سب اُس کرُتے میں منتقل ہو گئی تھی۔

اماں نے کرتا دیکھا تھا تو بہت خوش ہوئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اُس نے محض مروت میں' بے دلی کے ساتھ کام کیا ہے تو اتنا خوبصورت کام کیا ہے۔ طبیعت سے کرے گی تو کتنا اچھا کرے گی۔ اور اس نے کہا۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں اماں۔ یہ کام تو میں نے محبت سے ہی کیا ہے اور کام محبت سے کیا جائے تو عبادت ہوتا ہے۔“ یہ آخری جملہ کہتے وقت اُس کے تصور میں کرُتا کاڑھتی ہوئی باجی کا سراپا لہرا گیا تھا۔

کرُتا مکمل کرنے کے بعد وہ پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔ وہ اکثر سوچتی اور کڑھتی کہ اُس کا اتنی محبت سے کڑھا ہوا کرُتا ایک مشرک پہنے گا۔ یہ تو بڑی زیادتی ہوگی۔

اور اب اس وقت وہ اسی کرُتے کو بڑی محبت اور فخر سے سہلا رہی تھی۔ اُس کے پاس چھوٹے ٹھاکر کے لئے ایک یہی کرتا تو تھا جو اچھا تھا۔ باقی تو سب کچھ برا ہی تھا۔ بہت برا۔ وہ تو کبھی وقت پڑنے پر اُس کے سامنے محبت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اُسے کیسے بتاتی کہ وہ اسے کیا سمجھتی رہی ہے...... اور وہ بھی اس سے محبت کرنے کے باوجود!

اُس نے کرُتے کو محبت سے چوم لیا۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ کرُتا ایک مومن پہنے گا۔ وہ بڑبڑائی۔

اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ کافر کو کافر اور مشرک کو مشرک نہ کہو۔ اُس کے لئے اللہ سے ایمان کی دعا کرو۔ کون جانے' اللہ کب اسے ہدایت سے نواز دے اور اسے تم سے زیادہ ہدایت یافتہ بنا دے۔

یہ سوچتے ہوئے اُس کا احساسِ کم تری اور بڑھ گیا۔ وہ جسے کافر اور مشرک کہتی تھی' اسے اللہ

نے ایمان عطا فرمایا اور کیسے مبارک وقت میں عطا فرمایا۔ رمضان المبارک کی پہلی شب! اور جس انداز میں ایمان عطا فرمایا' وہ اُس کی عینی شاہد تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے عربی پڑھی تھی اور سمجھتا تھا۔ اُس نے اللہ کی روشن آیات سنیں' سمجھیں' سر اٹھا کر تصدیق کی اور ان کی سند پر ایمان لایا۔ خالص ایمان...... بغیر کسی لالچ کے...... صرف اللہ کے لئے! اور کیسے وہ بزرگ اُس کی مدد کے لئے آیا۔ یقیناً اللہ اُس پر بہت مہربان ہے۔

اور وہ اُس کے سامنے کتنی حقیر' کتنی چھوٹی ہو گئی ہے!

اچانک اسے خیال آیا' اس وقت اماں موجود ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں' اور باجی ہوتیں تو......؟ اُس کا دل کٹنے لگا' ارے...... یہ تو باجی کا حق تھا انہیں کیسا یقین تھا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہے۔ اسی لئے تو وہ اپنی محبت پر بھی شرمندہ نہیں ہوئیں۔ انہوں نے اپنی محبت کو بڑے فخر سے سنبھال کر رکھا۔ لیکن باجی ہوتیں تو میں......؟

اس سے آگے اُس نے خود کو سوچنے سے روک دیا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بڑبڑائی۔ اب باجی نہیں ہیں تو بھی میرے لئے کوئی امکان نہیں ہے۔ میں اس قابل ہوں ہی کہاں۔ صورت شکل بھی اچھی نہیں اور اُس کی تحقیر بھی کرتی رہی ہوں میں۔ بس میں تو یہ کر تا اسے دے سکتی ہوں۔

اب اسے نیند آنے لگی تھی۔

اُس نے سوچا' مجھے باجی کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ محبت کرنا انہی سے تو سیکھ سکتی ہوں میں۔ کچھ ملنے کا امکان ہو نہ ہو' مجھے اب محبت کرنے کا سلیقہ تو سیکھنا چاہئے اور یہ محبت میں نے ارادے سے کب کی ہے یہ تو مجھے زبردستی سونپی گئی ہے۔ مجھے اس سے کیا غرض کہ عبدالحق مجھے کبھی نہیں مل سکیں گے۔ مجھے تو اس توہین کا ازالہ کرنا ہے جو میں محبت کی اور اپنے محبوب کی کرتی رہی ہوں۔ اور باجی کو بھی کوئی ملنے کی امید تو نہیں تھی۔ بس محبت انہیں سونپ دی گئی اور وہ اسے بڑے سلیقے سے' بڑی محبت سے کرتی رہیں۔ باجی یقیناً اندر سے بھی بہت روشن رہی ہوں گی۔ آدمی کے لئے تو بس یہی بہتر ہے کہ جو کچھ بھی اسے دیا جائے' اُس سے بہترین طور پر استفادہ کرنے کی کوشش کرے۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ سو گئی!

❀ ❀ ❀

ہیجان سے تو وہ گزشتہ رات سے ہی دوچار تھا۔ پورے دن جسم میں خوش گوار اور کیف آمیز سنسنی دوڑتی رہی تھی۔ مگر اس وقت وہ ہیجان اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اُسے خیال ہی ایسا آیا تھا!

وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا!

ارے...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ یہی ایک خیال اُس کے ذہن میں اس پرندے کی

طرح چکرا رہا تھا' جو کسی کمرے میں بند ہو گیا ہو اور گھبرا کر پر پھڑپھڑاتا ہوا اڑ رہا ہو۔ لیکن اسے نکلنے کا موقع نہیں مل رہا ہو۔

وہ آواز...... وہ آواز! وہ تو وہی آواز تھی' جو اُس نے پہلی بار سنی تھی تو اسے آواز والی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ آواز' جو بعد میں اُس سے چھن گئی تھی لیکن اُس کی سماعت میں گونجتی رہتی تھی۔ وہ آواز جس نے اُسے دنیا کے حسن سے اور ریٹا پارسن کی خوف ناک ترین ترغیبات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہی آواز تو تھی' جس کی ڈور سے بندھا گزشتہ رات وہ بے اختیار کوٹھے پر کھنچا چلا گیا تھا۔

ہاں...... وہ وہی آواز تھی۔ اور بے اختیاری کے ابتدائی لمحوں میں اسے اس کا احساس بھی ہوا تھا لیکن اس کے بعد وہ اب اس بات کو بھولا رہا تھا۔

وہ بے قرار ہو گیا۔ اُس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ تو وہ لڑکی زندہ ہے...... وہ منجھلی بی بی ہے۔ وہ اُس کا نام نہیں جانتا۔ لیکن وہ زندہ ہے۔

اسے یاد تھا۔ دو لڑکیوں کی تدفین کے موقعے پر اُس نے سوچا تھا کہ شاید وہ آواز والی ان دونوں ہی میں سے کوئی ایک ہے۔ اور اس خیال سے اُس کے دل میں ایسا غم ابھرا تھا کہ زندگی اسے بے معنی لگنے لگی تھی۔

مگر اس وقت......! اس وقت شاید اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی تھی۔

اس خوشی کے سحر سے نکلنے میں اسے کچھ دیر لگی۔ جب وہ سوچنے کے قابل ہوا تو اسے خیال آیا کہ یہ کتنی غیر معمولی بات ہے کہ تقریباً چوبیس گھنٹے بعد اسے یہ احساس ہوا۔ اُسے اس آواز کے بارے میں یاد ہی نہیں آیا۔ یہ کیسی محبت ہے؟ کیا یہ محبت میں کمی کی' اُس کی اہمیت کم ہونے کی یا اہمیت بالکل ختم ہونے کی دلیل ہے؟

آخری بات تو غلط ثابت ہو گئی۔ اندر ابھرنے والی خوشی اتنی بڑی تھی کہ وہ خود اس محبت کی زندگی اور اہمیت کی دلیل تھی۔

عبدالحق تو شروع ہی سے غور کرنے والا' تجزیہ کرنے والا ذہن رکھتا تھا۔ وہ اتنی بڑی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آواز کو سننے کے لمحے سے لے کر آخر تک دہرانے لگا۔

آواز سنتے ہی وہ آواز کی سمت لپکا تھا۔ اُس لمحے اسے احساس تھا کہ یہ وہی آواز ہے' جس کی خاطر اُس نے عربی سیکھی تھی۔ جس نے اسے محبت کرنا سکھایا تھا۔ مگر اُس کے بعد وہ آواز کہیں پیچھے چلی گئی تھی اور اس پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی اور اوپر پہنچتے پہنچتے وہ ایک خاص کیفیت میں آ گیا تھا' جس میں اسے نہ اُس آواز کا خیال تھا اور نہ گرد و پیش تھا۔ اور وہ از خود رفتگی ایسی مکمل تھی کہ وہ اوپر کوٹھے پر پہنچ کر ہی رکا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی ہوش میں ہوتا تو پردہ دار لڑکی کو اوپر دیکھ کر ایک لمحہ بھی وہاں نہ رکتا۔ خاموشی سے نیچے چلا آتا۔ لیکن اُسے تو کسی بات کا احساس ہی نہیں تھا۔

اور اُسے یاد تھا۔ آواز کہیں پیچھے...... بہت پیچھے چلی گئی تھی۔ وہ صرف الفاظ سن رہا تھا۔ اُس وقت وہ ایسی حالتِ ارتکاز میں تھا کہ اُس کے لئے کائنات میں ان لفظوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ اور وہ ایک ایک لفظ کا مطلب صاف اور واضح طور پر سمجھ رہا تھا۔

وہ آیات اسے اب بھی مفہوم سمیت یاد تھیں۔ وہ تو جیسے اُس کے دل پر کندہ ہو گئی تھیں۔ آج ہی جب وہ کوٹھے پر گیا تو اُس نے آسمان کو دیکھا۔ وہ آیات پڑھیں اور آسمان کی طرف انگشتِ شہادت اٹھاتے ہوئے گواہی دی۔ اَشھَدُ اَنْ لَا......

اسے یقین تھا کہ اب زندگی بھر وہ جب بھی آسمان کو دیکھے گا تو یہی کرے گا لیکن شاید اب وہ سات آسمان کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ تو اللہ نے اُس پر رحمت فرمائی تھی...... اسے ایمان عطا فرمانے کے لئے!

تو اُس وقت وہ بس وہ الفاظ سن رہا تھا...... سمجھ رہا تھا اور ان کی تصدیق کر رہا تھا۔ پھر اُس کے اندر کسی نے اسے ڈانٹا تھا...... کیا تو اب بھی کلمہ نہ پڑھے گا۔ تب وہ جھٹکے سے ہوش میں آیا تھا۔ ورنہ تو اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ کلمہ کیا ہوتا ہے...... اور یہ کہ اُسے کلمہ یاد ہے۔

یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے اچانک عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ بالکل ہی اچانک اسے ادراک ہوا تھا کہ اللہ نے اُس رات اس پر صرف یہی عنایت نہیں کی کہ اسے ایمان سے نوازا۔ اللہ نے اس پر ایک اور بڑی رحمت فرمائی۔ ورنہ وہ ساری زندگی ایک بہت بڑی خلش میں مبتلا رہتا۔ اللہ نے عنایت فرمائی کہ ہدایت کے ان لمحوں میں اس آواز کو بیچ سے ہٹا دیا۔

اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ محبت کی کمی نہیں تھی۔ بلکہ اللہ کی رحمت تھی۔ اور اب وہ اُس کی حکمت کو بھی سمجھ سکتا تھا۔

اچھا ہوا کہ آواز درمیان سے ہٹ گئی۔ رابطہ الفاظ بنے...... اللہ کے الفاظ۔ ورنہ وہ اس آواز سے...... آواز والی سے کیسی محبت کرتا تھا۔ اسے ہمیشہ یہ خلش ستاتی کہ اُس نے اس آواز کی وجہ سے...... آواز والی کی محبت میں ایمان قبول کیا۔ ارے وہ تو اس احساس کبھی مٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اس بات کی بڑی اہمیت تھی۔ جب زبیر نے اسلام قبول کرنے کا کہا تو اُسی منجھلی بی بی نے کہا تھا...... یہ تو آپ کی محبت میں ایمان لا رہے ہیں۔ اللہ کی محبت میں دل کی گہرائیوں سے کوئی ایمان لائے تو مسلمان ہوتا ہے۔ تو یہ بات اسے بھی سننی پڑتی۔ اور سننی نہ بھی پڑتی تو اس کا ضمیر تو اسے ہمیشہ ملامت کرتا۔ اپنا ایمان اُس کی نظر میں ہمیشہ مشتبہ رہتا۔ اللہ نے اسے کتنی بڑی خرابی سے بچا لیا۔

اور بات اتنی بچی تھی کہ چوبیس گھنٹے بعد اسے پہلی بار اس آواز کا...... اور آواز والی کا خیال آیا تھا۔

وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگا۔

لیکن چند لمحے بعد سنسنی اُس کے وجود میں موج در موج اٹھی۔ پہلی بار شعوری طور پر اسے

پوری طرح اس بات کا ادراک ہوا، اس بات کی اہمیت اُس پر اجاگر ہوئی کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے نہ صرف اُس کی آواز موجود ہے۔ بلکہ وہ زندہ ہے۔

سینے میں اُس کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ وہ زندہ ہے۔ اُس کے پاس ہے۔ بلکہ وہ اُس کے ساتھ اُس کے گاؤں جا رہی ہے۔ اور اب اُس کے اور اُس کی محبت کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔ اب اللہ نے اُسے ایمان دے دیا ہے۔ اب وہ ہر طرح سے اُس کے قابل ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں۔

لیکن ہو سکتا ہے، وہ مجھے پسند نہ کرے۔ دل میں اچانک ایک وسوسے نے سر اٹھایا۔ یہ محبت تو دل کا سودا ہوتا ہے۔ اچھا ہونا ایک بات ہے اور دوسروں کو اچھا لگنا دوسری بات۔

تو کیا ہوا۔ اُس نے بے پروائی سے سوچا۔ مجھے اس سے کیا۔ محبت کوئی تجارت تو ہے نہیں کہ اُس کی قیمت بھی وصول کی جائے۔ میں کب کہتا ہوں کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرے۔ میرے لئے تو یہ خوشی بہت ہے کہ وہ زندہ سلامت رہے اور خوش رہے۔

باقی رات اس میں گزر گئی۔ وہ پہلی بار آزادانہ اپنی محبت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور اس میں بڑی لذت تھی!

❁ ❁ ❁

نور بانو خواب دیکھ رہی تھی!

یہی گھر تھا۔ مگر بڑی گہما گہمی تھی۔ اماں بھی موجود تھیں، دونوں بہنیں بھی اور چھمن بوا بھی اور گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ یقیناً کوئی تقریب تھی...... بڑی تقریب! مگر اُس کی سمجھ میں تقریب کی نوعیت نہیں آ رہی تھی۔

چھمن بوا اِدھر سے اُدھر بھاگتی پھر رہی تھیں۔ کام بہت تھے اور سب انہی کو نمٹانے تھے۔ نور بانو مہمانوں کو دیکھ رہی تھی۔ مگر ان میں اسے ایک بھی جانا پہچانا چہرہ نظر نہیں آیا۔ ہاں...... یہ ضرور تھا کہ تمام مہمانوں کے چہرے غیر معمولی طور پر روشن تھے۔

چھمن بوا اُس کے پاس سے گزریں تو اُس نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ "چھمن بوا...... میری بات تو سنیں۔"

"کیا ہے بیٹا۔ جلدی سے کہو۔ دیکھتی نہیں ہو کتنا کام ہے۔"

"مجھے یہ تو بتا دیں کہ یہ تقریب کیسی ہے؟"

چھمن بوا نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ "اتنی مصروفیت میں مذاق اچھا نہیں لگتا بیٹا۔ تم ہم سے پوچھ رہی ہو کہ یہ تقریب کیسی ہے؟"

"مذاق نہیں کر رہی ہوں مجھے سچ مچ پتا نہیں ہے۔"

"بس بنو مت۔" یہ کہہ کر بوا نے ہاتھ چھڑایا اور آگے بڑھ گئیں۔

نور بانو حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہ کیسی بات کر رہی ہیں بوا۔ ان کا انداز تو ایسا ہے جیسے مجھے معلوم ہونا چاہئے۔

اتنے میں اماں اُس کی طرف چلی آئیں۔ ''ارے نور بانو...... تو یونہی بیٹھی ہو۔ تیار ہو جاؤ نا۔''

''مگر یہ تو بتائیں اماں کہ یہ کیسی تقریب ہے؟''

اماں نے بھی اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ ''لو...... ہم اتنی دور سے تمہاری تقریب میں شرکت کے لئے آئے ہیں اور تم ہم سے تقریب کے متعلق پوچھ رہی ہو۔''

نور بانو تقریب کو بھول گئی اور اتنی دور سے آنے کے بیان میں الجھ گئی۔ ''کتنی دور سے آئی ہیں آپ؟'' اُس نے معترضانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ تو یہیں رہتی ہیں اماں۔''

''تم بھول گئیں۔ ہم اب یہاں نہیں رہتے۔ ہم سب تو یہاں سے چلے گئے تھے۔''

خواب میں نور بانو کو اُس سانحے کی یاد آئی اور اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''مجھے یاد آ گیا اماں۔ ظالموں نے آپ سب کو مار دیا تھا۔''

''نہیں...... مارا نہیں تھا۔'' اماں مسکرا دیں۔ ''ہم مرے تھوڑا ہی ہیں۔ ہم تو زندہ ہیں۔ شہید کبھی نہیں مرتے۔''

''شہید!'' نور بانو نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں...... ہم نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اللہ اپنی رحمت سے ہمیں یہ مرتبہ عطا فرمائیں گے۔ ہم اس قابل کہاں تھے۔ بس اللہ نے ہم سب کو نواز دیا۔'' اماں نے کہا۔ ''اسی لئے تو ہم سب تمہیں اتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔ یہ تو ہم تمہاری محبت میں یہاں آ گئے۔ ورنہ ہم تو اتنی خوب صورت جگہ رہتے ہیں کہ اُسے چھوڑنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ اتنی نعمتیں ہیں وہاں اللہ کی۔ اور ایسی عزت اور ایسا سکون ہے کہ ہم نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔''

''لیکن اماں، میں تو یہاں اکیلی رہ گئی۔'' نور بانو نے اداس ہو کر کہا۔ ''مجھے بھی ساتھ لے چلیں نا۔''

''بھئی اللہ کی مشیت یہی ہے۔ اس میں بندے کی مرضی تو نہیں چلتی۔''

''آپ وہاں خوش ہیں۔ اور میں یہاں ناخوش بھی ہوں اور اکیلی بھی۔'' نور بانو کے لہجے میں شکایت در آئی۔

''تم یہ ناشکرا پن چھوڑ دو...... یہ ہر وقت ہر بات پر شکایت۔'' اماں کے لہجے میں فہمائش تھی۔ ''اللہ اتنا مہربان ہے تم پر۔ رحمت فرماتا ہے، نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ اور اب تم نہ اکیلی رہو گی نہ ناخوش۔ ہم اسی لئے تو آئے ہیں یہاں۔''

نور بانو کا ذہن پھر اُلجھنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ ''کس لئے؟''

''ارے اس تقریب کے لئے...... اور کس لئے۔'' اماں نے جھنجھلا کر کہا۔

بات پھر وہیں آ کر رک گئی۔ ''اور یہ تقریب کیسی ہے؟ یہ آپ بتا نہیں رہیں۔'' نور بانو بھی جھنجھلا گئی۔

''ارے تمہیں یہ بھی نہیں معلوم۔ آج تمہاری شادی ہو رہی ہے۔'' اماں نے کہا۔ پھر دوسری طرف رخ کر کے پکارا۔ ''اے حور بانو...... گلناز کہاں ہو بھئی۔ کیا کر رہی ہو؟ جلدی سے آؤ نا۔'' وہ پھر نور بانو کی طرف مڑیں۔ ''بس یہ غیر ذمے داری اور سستی ان کی مجھے بہت بری لگتی ہے۔''

نور بانو نے ان کی بات نہیں سنی۔ اُس کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔ اُس کی شادی ہو رہی ہے! مگر کس سے؟

اتنی دیر میں دونوں بہنیں بھی اُس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔ ''جی اماں؟''

''کتنی غیر ذمے داری کی بات ہے۔'' اماں نے انہیں ڈانٹا۔ ''اب یہ کیا خود دلہن بنے گی؟ تم لوگوں کی کوئی ذمے داری نہیں ہے؟''

''تو اماں، اسی کی تو خاطر کر رہے تھے ہم۔'' حور بانو نے کہا۔ ''یہ جوڑا مل ہی نہیں رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ملا ہے...... انہی محترمہ کے صندوق میں سے۔''

نور بانو شرمندہ ہوئی، کھسیا گئی۔ ''مجھے اچھا لگا تھا باجی۔ میں نے سوچا، اب تم تو پہنو گی نہیں۔ اس لئے میں نے رکھ لیا۔''

''اچھا کیا نور۔ یہی تمہارا شادی کا جوڑا ہے۔ چلو، اب تمہیں تیار کرا دیں۔'' حور بانو نے خوش دلی سے کہا۔

''تم لوگ جلدی کرو۔ میں ذرا مہمانوں کو دیکھ لوں۔'' اماں نے کہا اور کمرے سے چلی گئیں۔

اسی لمحے باہر کسی نے کہا: ''ارے...... برات نہیں آئی اب تک؟''

''آ گئی ہے۔ دولہا میاں مسجد گئے ہیں...... شکر کے نفل ادا کرنے۔''

نور بانو اداس ہو گئی۔ تو آج چھوٹے ٹھاکر کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل رہا ہے۔ اُس نے سوچا۔ پھر حیرت سے سوچا، کانٹا نکلنے میں اداسی کیسی۔ مگر اُسے رونا آنے لگا۔

''چلو نور، اب کپڑے بدل لو۔'' حور بانو نے اُس سے کہا۔ ''پھر ہم تمہیں تیار کر دیں تمہارے دولہا کے لئے۔''

''مجھے یہ تو بتا دو کہ میری شادی کس سے ہو رہی ہے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے لہجے میں فریاد تھی۔

''ارے...... تمہیں نہیں معلوم۔ تمہاری شادی عبدالحق سے ہو رہی ہے۔''

''کون عبدالحق؟''

"وہی عبدالحق جنہیں ہم پہلے چھوٹا ٹھا کر کہتے تھے۔"

نور بانو حیران رہ گئی۔ مگر وہ بے حد خوش گوار حیرت تھی۔ پھر اچانک اسے باجی پر ترس آنے لگا۔ "لیکن باجی...... تم تو ان سے......"

حور بانو نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ "کچھ بھی نہیں کہنا۔ ہم جہاں ہیں' وہاں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی لئے تو ہم یہاں تمہیں وداع کرنے آئے ہیں۔"

"لیکن باجی' تمہیں افسوس......"

"بالکل نہیں ہوگا۔" حور بانو نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "ہم جہاں ہیں' وہاں ایسی نعمتیں ہیں' ایسی خوشیاں ہیں' جن کا یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کہا نا کہ اب میرے لئے ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"اور یہ تمہارا جوڑا......"

"یہ ہم نے تمہیں سونپ دیا۔ یہ بھی اور اپنی محبت بھی۔" حور بانو مسکرائی۔ وہ بہت خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ اُس میں سچی خوشی تھی۔ "اب یہ تمہارا نکاح کا جوڑا ہے...... عروسی جوڑا۔"

"کیا میرے لیے نیا عروسی جوڑا نہیں بن سکتا تھا؟" نور بانو کے لہجے میں شکایت تھی۔

"دیکھو...... ایک تو بالکل اچانک ہو رہی ہے تمہاری شادی۔ تیاری کا کوئی موقع ہی نہیں ملا۔ دوسرے تمہیں یہ جوڑا پسند ہے۔ تیسرے تمہیں معلوم نہیں کہ تم اس جوڑے میں کتنی حسین لگو گی۔"

"میں اور حسین!" نور بانو نے حقارت سے کہا۔

"خود دیکھ لینا۔ بس اب کپڑے بدل لو۔"

نور بانو نے کپڑے بدلے۔ باجی اور گلنار اسے تیار کرنے لگیں۔ پھر حور بانو نے اسے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ "لو...... خود دیکھ لو۔" نور بانو نے نظریں اٹھا کر آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ ہے۔ اُسے تو جیسے جادو کے زور سے کسی نے پتھر کا بنا دیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اُس نے پیچھے کھڑی دونوں بہنوں کے عکس کو بھی دیکھا' ان دونوں کے سامنے تو وہ ہمیشہ نوکرانی لگتی تھی۔ لیکن آج وہ دونوں ہی اُس کے سامنے پھیکی لگ رہی تھیں۔

"دیکھا۔ آج تو ہم دونوں بھی تمہاری کنیز لگ رہی ہیں۔" حور بانو نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت باہر کسی نے خوشی سے پکار کر کہا۔ "برات آ گئی۔"

اماں کمرے میں آئیں۔ انہوں نے اسے دیکھا تو خوش ہو کر بلائیں لینے لگیں۔ "میں ہمیشہ فکر کرتی تھی کہ میری یہ بیٹی بہت معمولی شکل وصورت کی ہے۔ اس کا کیا ہوگا۔ میں بہت دعائیں

کرتی تھی تمہارے لئے۔ اللہ نے میری ہر دعا قبول کر لی۔ تم تو ان دونوں سے بڑھ کر حسین لگ رہی ہو۔ اور اللہ نے نصیب بھی اچھے کر دیے۔"

اُس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

اماں نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ "دیکھو نور بانو' میرے عبدالحق کا دل بھی کبھی میلا نہ ہونے دینا۔ اللہ نے تمہیں بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔ اس کی ہمیشہ قدر کرنا۔ اسے خوش رکھنا۔ اسے کبھی کسی شکایت کا موقع نہ دینا۔"

اُسی وقت اسے نقاروں کی آواز سنائی دی اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔

خواب ایسا تھا کہ اُس کا ٹوٹنا اسے برا لگا۔ وہ چاہتی تھی کہ خواب کا سلسلہ وہیں سے جڑ جائے' جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اُس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ مگر اُس سے سویا نہیں گیا۔

وہ لیٹی خواب کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے اپنا سراپا یاد آیا۔ مگر اُس کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے بجائے اُس نے اُس کا احساسِ کمتری اور بڑھا دیا۔ اُس نے سوچا' خواب میں تو کچھ بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا حقیقت سے تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خواب میں تو میری اُس سے شادی بھی ہو گئی' جس سے میں محبت کرتی ہوں جبکہ حقیقت میں یہ ناممکن ہے۔ مجھ جیسی لڑکیوں کے لئے تو خواب ہی ہوتے ہیں۔

لیکن اس خیال سے اسے خوشی ہو رہی تھی کہ خواب میں باجی نے اپنے اس جوڑے کو اُس کا عروسی جوڑا قرار دیا اور اپنی محبت بھی اُسے سونپ دی۔

چند لمحے بعد وہ سحری بنانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ یہ خیال آیا تو اُس کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا کہ آج وہ یہ گھر چھوڑ کر کسی اجنبی جگہ کے لئے روانہ ہو رہی ہے...... اور اسے ہندو عورت کے بھیس میں بے پردہ سفر کرنا ہے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے اس سفر کے بارے میں بہت سوچا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ آسان سفر نہیں ہے۔ متعصب ہندو اور سکھ سفر کرنے والوں پر خاص طور پر گھات لگاتے تھے۔ ان کے پاس اس کی معقول وجہ بھی تھی۔ جو علاقے ہندوستان میں تھے' وہاں سے ہجرت کرنے والے صرف مسلمان ہی تھے۔ اور وہ ان علاقوں کی طرف جا رہے تھے جو پاکستان میں شامل ہوئے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ اپنے گاؤں کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ اس صورت میں وہ مشتبہ قرار پاتا۔ کیونکہ جس گاؤں کا نام ونشان مٹ چکا ہو' وہاں کوئی کیوں جانا چاہے گا۔

رکاوٹیں اپنی جگہ' بہرحال انہیں تو وہاں جانا تھا۔ بابا نے کہا تھا کہ یہ حکم ہے۔ اب حکم ہے تو اسے تعمیل کرنی ہے۔

اُس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ جے پور جائیں گے۔ وہاں سے وہ اونٹ خرید کر ان کے ذریعے سفر کریں گے۔ اسے احساس تھا کہ اپنا گاؤں ڈھونڈنا بھی آسان نہیں ہوگا۔

سفر کی صبح ساتھ لے جانے والے سامان پر بھی بحث ہوئی۔ نور بانو کتابیں نکال کر الگ رکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت ہندوانہ لباس میں تھی اور اس کی وجہ سے خاصی چڑچڑی ہو رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" عبدالحق نے پوچھا۔

"قرآن پاک کے نسخے ہیں اور دینی کتابیں ہیں۔" نور بانو نے جواب دیا۔

"تو یہ آپ الگ کیوں کر رہی ہیں؟"

"ہم ہندوؤں کے بھیس میں سفر کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اپنے سامان میں کیسے رکھ سکتے ہیں؟"

"میں ان کا جائزہ لے سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں؟"

عبدالحق نے کتابوں کا جائزہ لیا اور خوش ہو گیا۔ "یہ نعمت تو ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ مجھے تو ان کی بہت ضرورت ہے۔"

"میں نے بھی سوچ کر نکالی تھیں لیکن انہیں ساتھ رکھنا خطرناک ہوگا۔" نور بانو نے کچھ جھجکتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں یہ سب کتابیں ضرور لے کر جاؤں گا۔"

"مجھلی بی بی ٹھیک کہہ رہی ہیں مالک۔" زبیر بولا۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ "انہیں کپڑوں میں لپیٹ کر رکھ لیں۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

نور بانو نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔"

"ایک ذاتی بات پوچھ سکتا ہوں آپ سے؟" عبدالحق نے اس سے کہا۔

نور بانو پھر جھجکی۔ "جی ضرور۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

نور بانو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چند لمحے جھجکنے کے بعد اُس نے کہا۔ "نور بانو۔"

اوتار سنگھ نے اپنی خوشی چھپانے کے لئے سر جھکا لیا۔ کیسا خوب صورت نام ہے۔ اُس نے دل میں سوچا۔

جے پور جانے کے لئے وہ گاڑی میں بیٹھے۔ سفر شروع ہو گیا۔

مگر دہلی شہر سے نکلتے ہی مسلح ہندوؤں اور سکھوں کے ایک جتھے نے گاڑی رکوا دی۔ انہوں نے تمام مسافروں کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔ اور لوگ بھی گاڑی سے اُتر آئے۔

سوال جواب ہونے لگے۔ کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟ کون ہو؟ نام کیا ہے؟ وہ

پوچھتے اور جس سے مطمئن ہوتے، اسے گاڑی میں بھیج دیتے۔ نور بانو نے گھونگھٹ کاڑھ رکھا تھا۔ لباس بھی ایسا تھا، جیسے نئی نئی شادی ہوئی ہو۔

"میرا نام ٹھاکر اوتار سنگھ ہے۔"

"میں رگھوبیر...... رگھبیر...... چھوٹے ٹھاکر کا سیوک۔ اور یہ میری پتنی ہے...... رنجنا۔"

"اور یہ کون ہے؟"

سوال نور بانو کے بارے میں تھا۔ اور عبدالحق جانتا تھا کہ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ بھی نقصان دہ ثابت ہو گی۔ چنانچہ اس نے سوچے سمجھے بغیر بے ساختہ جواب دیا۔ "یہ میری پتنی ہے...... لاجونتی۔"

گھونگھٹ کے اندر نور بانو کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ دل یوں دھڑکا، جیسے سینے سے نکل آئے گا۔

"اس کا گھونگھٹ تو اٹھاؤ مہاراج۔"

عبدالحق کے تیور بدلنے لگے۔ لاٹھی کی مٹھ پر اُس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ گھونگھٹ کی آڑ میں اُس کی طرف دیکھتی ہوئی نور بانو نے بھانپ لیا کہ معاملہ بگڑنے والا ہے۔ اُس نے جلدی سے گھونگھٹ اٹھا دیا۔

عبدالحق سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ نور بانو نے اسے حیران کر دیا۔ وہ نور بانو کو دیکھتا رہ گیا۔

نور بانو نے گھونگھٹ تو اٹھا دیا تھا لیکن اتنے سارے مردوں کے سامنے پہلی بار بے حجاب ہوئی تھی۔ اُس کی نظریں جھک گئیں۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

"سچ مچ لاج والی ہے مترو۔" روکنے والوں میں سے ایک نے دوسروں سے کہا۔

اب عبدالحق برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ "اپنی حد میں رہو۔" اُس نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم ٹھاکر لوگ جان لیتے زیادہ ہیں، دیتے کم ہیں۔" بولنے والا کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرے نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "ہم اپنے لوگوں کو ستانے کے لئے نہیں نکلے ہیں۔" وہ بولا۔ "ضروری نہیں کہ یہ اپنے ہی لوگ ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مسلمان بچ نکلنے کے لئے ہندوؤں کا روپ بھی دھار لیتے ہیں۔"

"تو اب یہ کیسے پتا چلے گا؟"

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔ الگ لے چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔" اُس نے شیطنت بھرے لہجے میں کہا۔

بات عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن زبیر سمجھ گیا۔ تاہم عبدالحق کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی

ایسی بری بات ہے' جسے قبول کرنے پر وہ مرجانے کو ترجیح دے گا۔ لاٹھی کی مٹھ پر اُس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

زبیر نے دوسرے شخص سے کہا۔ "مہاشے...... آپ ذرا الگ چل کر میری ایک بات سن لیں۔"

"سننا سنانا کیا ہے۔ ہمیں تو دیکھنا ہے۔ کہو تو یہیں دیکھ لیں...... سب کے سامنے۔" پہلے والے نے پھر مداخلت کی۔

زبیر نے اُسے نظرانداز کردیا۔ "میں دھرم کے نام پر بنتی کر رہا ہوں مہاشے۔"

دوسرے شخص نے زبیر کا ہاتھ تھاما اور اُسے ایک طرف لے گیا۔ "اب بولو' کیا بات ہے؟"

"میرا مالک راج پوت ہے' آن کے لیے جان لینا بھی جانتا ہے اور جان دینا بھی۔ آپ کا متران کا اپمان کیے جا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں خون خرابہ ہو جائے گا۔"

"خون خرابہ!" وہ مضحکانہ لہجے میں بولا۔ "تمہارے پاس ہے کیا؟ خون بھی تمہارا ہوگا اور خرابہ بھی۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو مہاشے۔ چھوٹے ٹھاکر کو لٹھیا کا ہنر آتا ہے۔ چالیس پچاس آدمی تو ان کے سامنے ٹھہر بھی نہیں سکتے۔"

اُس کو یقین تو نہیں آیا۔ لیکن بہرحال وہ متاثر ہوا۔ "تو تم کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے جس طرح چاہو' دیکھ لو لیکن چھوٹے ٹھاکر یہ اپمان برداشت نہیں کریں گے۔"

"چلو...... ٹھیک ہے۔"

اسی دوران وہ شرپسند بھی ان کے پاس آ گیا تھا' جس کی وہ تجویز تھی۔ اُس کے ساتھی نے کہا۔ "لالو...... تو اسے دیکھ لے۔"

لالو زبیر کی طرف مڑا۔ "چل...... دھوتی اوپر اٹھا۔"

چند لمحے بعد لالو نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "یہ ہندو ہی ہے۔"

"جاؤ مہاشے' گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

یوں یہ مشکل مرحلہ آسان ہو گیا۔ زبیر کو پتا ہی نہیں تھا کہ اُس نے اپنے مالک کو بہت بڑی مشکل سے بچالیا ہے۔ خود عبدالحق کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ مرحلہ کتنا دشوار تھا۔

❁ ❁ ❁

جے پور سے ان کے اصل سفر کا آغاز ہوا۔ انہوں نے چار اونٹ لئے تھے۔ ایک پر سامان تھا۔ دوسرے پر رابعہ اور نور بانو تھیں۔ عبدالحق اور زبیر باقی دونوں اونٹوں پر تھے۔ عبدالحق کو احساس تھا کہ نور بانو کے لئے وہ بہت تکلیف دہ سفر ہے۔ اُس نے حتی الامکان اُسے آسان کرنے کی کوشش کی تھی۔ رابعہ کو اونٹ کا تجربہ تھا۔ اس لئے نور بانو اُس کے ساتھ تھی۔

صحرا کا سفر اور وہ بھی دن میں...... بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ دھوپ ایسی ہوتی ہے کہ جسم کا پانی ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ سب تو روزے سے تھے۔ ریت دیکھ دیکھ کر ان کے جی اُوب گئے۔

وہ سمت پوچھ کر چلے تھے۔ عبدالحق اپنے گاؤں کا حوالہ تو نہیں دے سکتا تھا۔ تاہم اُس نے سندر پور کے حوالے سے راستہ پوچھا تھا۔ یہ قریب کا وہ گاؤں تھا' جو اُس کی معلومات کے مطابق تباہی سے بچ گیا تھا۔

اب دھوپ کی تیزی ختم ہو رہی تھی اور وہ بتدریج پھیکی ہوتی جا رہی تھی۔ عبدالحق کو تشویش ہونے لگی۔ مسافت کا اسے خوب اندازہ تھا۔ اُس کے خیال میں اب تک انہیں گاؤں پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن وہاں تو کوئی آثار نہیں تھے۔

صحرا میں سورج بہت تیزی سے غروب ہوتا ہے۔ ابھی نظر آ رہا ہے اور ابھی غائب اور ان کی تو زندگی ہی اس صحرا میں گزری تھی۔ زبیر نے عبدالحق سے کہا۔ "مالک سانجھ ہوگئی ہے۔ ہمیں روزہ بھی کھولنا ہے۔"

"ابھی کچھ وقت ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ "دیکھو...... شاید کوئی مناسب جگہ نظر آ جائے۔"

وہ چلتے رہے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد انہیں کچھ فاصلے پر کھجوروں کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ نظر آیا۔ "چلو...... یہاں افطار کریں گے۔" عبدالحق نے خوش ہو کر کہا۔

سب سے زیادہ خوشی نور بانو کو ہوئی تھی۔ اس سفر نے اُس کا برا حال کر دیا تھا۔ اُس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ اُترنے کے بعد وہ اپنے پیروں پر بھی کھڑی ہو سکے گی۔

وہ درختوں کے قریب پہنچے تو انہیں درختوں کے درمیان ایک جھونپڑی نظر آئی۔ "لگتا ہے' ہم یہاں رات بھی گزار سکیں گے۔" عبدالحق نے کہا۔

انہوں نے وہاں پڑاؤ ڈالا۔ اونٹوں کو درختوں سے باندھ دیا گیا۔ نور بانو ریت پر بیٹھ گئی تھی۔ رابعہ سامان اتروانے میں زبیر کی مدد کر رہی تھی۔ عبدالحق یہ دیکھنے کی غرض سے جھونپڑی کی طرف بڑھا کہ وہ آباد ہے یا نہیں۔

اسی وقت جھونپڑی کے اندر سے ایک لرزتی تڑپتی ہوئی آواز ابھری۔ "ارے...... یہ تو میرے چھوٹے ٹھاکر کے قدموں کی چاپ ہے۔ ارے...... کیا میرا چھوٹا ٹھاکر آ گیا...... میرا چھوٹا ٹھاکر...... اے اللہ......"

عبدالحق کے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ وہ قدم اٹھانا بھول گیا۔ اُس کی نظریں جھونپڑی کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ آواز سب نے سنی تھی۔ نور بانو اپنی بے آرامی اور تھکن بھول گئی۔ وہ بھی اٹھ کر جھونپڑی کی

سمت چلی۔

اسی لمحے دروازے سے ایک بوڑھی عورت تیز مگر لڑکھڑاتے قدموں سے نکلی۔ اُس کے استخوانی وجود میں ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ "اے اللہ! تیرا شکر ہے۔ میرا چھوٹا ٹھاکر آ گیا۔ کہاں ہو تم چھوٹے ٹھاکر۔"

عبدالحق اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا۔ وہ سب اُس کے لئے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ سانس لینا بھی بھول گیا تھا۔ اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ مگر کوئی آواز نہیں تھی۔

بوڑھی عورت ہاتھوں سے اِدھر اُدھر ٹٹول رہی تھی۔ "نہیں...... مجھے دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ میرا چھوٹا ٹھاکر یہیں کہیں ہے۔ چھوٹے ٹھاکر' تم بولتے کیوں نہیں۔"

عبدالحق کے ہونٹ پھر لرزے...... مگر بے آواز۔ نور بانو بھی وہیں کھڑی تھی۔

بوڑھی عورت ایک طرف لپکی اور کھجور کے ایک درخت سے ٹکرا کر گر گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا کہ زمین نے جیسے عبدالحق کے پیروں کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ بوڑھی عورت کی طرف جھپٹا جو کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے اسے اٹھایا اور لپٹا لیا۔ پھر وہ دیوانہ وار اُس کی پیشانی چومنے لگا۔ "ہاں اماں' یہ میں ہی ہوں۔ اماں...... چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟"

بوڑھی عورت بڑی بے یقینی سے اُس کے چہرے کو اپنی کانپتی انگلیوں سے چھو رہی تھی۔

"چوٹ...... کون سی چوٹ؟ میں تو ہر دکھ بھول گئی اپنا' چھوٹے ٹھاکر تم آ گئے تو سب کچھ دھل گیا میرے چھوٹے ٹھاکر۔"

"اب تو مجھے ایسے نہ پکارو اماں۔ اب میں عبدالحق ہوں۔" عبدالحق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور حمیدہ ایک دم ساکت ہو گئی۔ عبدالحق کے چہرے پر اُس کا ہاتھ جہاں تھا' وہیں رہ گیا۔ اُس نے یوں سر اٹھایا' جیسے اُس کا چہرہ تک رہی ہو...... یا جیسے اُس کے کہے ہوئے لفظوں کی بازگشت سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اُس نے لرزتی آواز میں کہا۔ "کیا کہا تم نے؟ ذرا پھر سے کہنا پتر۔"

"اماں' اب مجھے کبھی ٹھاکر نہ کہنا۔ اب میرا نام عبدالحق ہے۔"

"تم...... تم مسلمان ہو گئے......؟"

"ہاں اماں۔ الحمدللہ۔ اللہ کا کرم ہے۔"

حمیدہ نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور آنچل پھیلا کر بکھرتی ہوئی آواز میں بولی۔ "اے اللہ شکر ہے تیرا۔ اے اللہ تو نے میرے دودھ کی لاج رکھ لی۔" پھر وہ عبدالحق سے لپٹ گئی اور ایسے رونے لگی جیسے اب کبھی چپ نہیں ہو گی۔

نور بانو بوڑھی عورت کی بات سن کر حیرت سے سن ہو کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بوڑھی عورت نے وہ الفاظ کہے ہیں۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اُس کی سماعت کا وہم ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک بات سوچے جا رہی تھی...... کیا چھوٹے ٹھاکر نے اس مسلمان عورت کا دودھ پیا تھا۔

زبیر کی پکار نے اُس منظر کو تبدیل کر دیا۔ "مالک...... سورج ڈوب گیا ہے۔"

حمیدہ چونکی۔ "ارے...... یہ تو رگھو کی آواز ہے۔"

"رگھو نہیں اماں' اب وہ زبیر ہے۔ اور رنجنا کا نام اب رابعہ ہے۔" عبدالحق نے کہا اور نرمی سے حمیدہ کو خود سے الگ کیا۔ "تم سے بہت باتیں کرنی ہیں اماں۔ مگر افطار کا وقت ہو گیا ہے۔ اور مجھے اذان بھی دینی ہے۔"

چند لمحے بعد اُس مردہ گاؤں کی فضا میں اذان کی آواز گونج رہی تھی' جہاں پہلے کبھی مسجد بھی نہیں تھی۔ جہاں صرف تین مسلمان رہتے تھے۔ اور وہاں اذان دینے کا اعزاز ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے بیٹے عبدالحق کو حاصل ہو رہا تھا۔ جبکہ اسے اسلام قبول کیے صرف تین دن ہوئے تھے۔

* * *

باتیں کرنے کا موقع ملنا آسان نہیں تھا۔ وہ ایسا بے سروسامانی کا عالم تھا کہ انہیں پہلے اس کی فکر کرنی تھی۔ جھونپڑی میں ایک چارپائی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر فی الوقت کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

مغرب اور عشاء کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ عبدالحق نے عشا کی اذان دی۔ نماز کے بعد انہیں سونے کی فکر ہوئی۔ سفر کی تھکان نے نور بانو کو ایسا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے جھوم رہی تھی۔

"مجھلی بی بی چارپائی پر سو جائیں گی۔" رابعہ بولی۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"نہیں' یہ ناممکن ہے۔" نور بانو نے کہا۔ "ہم اندر سونے والے تو فرش پر بھی سو جائیں گے۔ چارپائی باہر والوں کو ملنی چاہئے۔"

ان کی خوش قسمتی تھی کہ رابعہ نے سامان میں بستر بھی رکھ لیا تھا۔ ان کے پاس ایک بڑا بستر بند تھا' جس میں گھر کے لحاف' چادریں اور تکیے تھے۔ یوں ان کا بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ چارپائی باہر لا کر بچھا دی گئی۔ اندر حمیدہ' نور بانو اور رابعہ کے بستر بچھ گئے۔ زبیر نے اپنا بستر کھجور کے درخت کے پاس بچھا لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں عبدالحق اور حمیدہ کے سوا سب لوگ سو گئے۔

عبدالحق حمیدہ کو باہر لے آیا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ خود اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''اب ہم خوب باتیں کریں گے اماں۔''

لیکن حمیدہ دہل گئی۔ ''تم نیچے کیوں بیٹھے ہو چھوٹے......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اچھا ہوا اماں کہ تم نے جملہ پورا نہیں کیا۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''اللہ کا شکر ہے اماں کہ ٹھاکری ختم ہو گئی۔ اب میں تمہارا بیٹا ہوں اور تم میری ماں ہو۔ اور جہاں میں بیٹھا ہوں' وہی میرا مقام ہے۔''

دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کریں۔ ان کی گفتگو ترتیب سے محروم تھی۔ البتہ دونوں کے لئے نقطۂ آغاز ایک ہی تھا۔ وہ لمحہ جب وہ آخری بار ملے تھے...... بچھڑنے کے لئے۔ جب پہلی بار حمیدہ نے ماں بن کر اسے وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پڑھائی مکمل کر کے واپس آئے گا تو وہ اسے ملے گی۔ کس یقین سے کہا تھا اُس نے......اور اس وقت کے اوتار سنگھ نے اس پر ویسا ہی یقین کیا تھا۔

''تم پر کیا گزری اماں؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''مجھ پر کیا گزری؟ کچھ بھی نہیں۔ اللہ کی رحمت تھی۔ گاؤں کے گاؤں مٹ گئے۔ مگر اللہ نے مجھے بچا لیا۔ اور تمہارے جانے کے بعد ذرا دیر بعد ہی آندھی آئی تھی۔ میں تمہاری طرف سے ڈرتی رہی۔ مگر نجانے کیسے دل کو اطمینان ہو گیا کہ تم خیریت سے ہو۔''

''مجھے بھی بس اللہ نے بچا لیا اماں۔ ورنہ میں ریت میں دب رہا تھا۔ سانس بھی نہیں لی جا رہی تھی مجھ سے۔'' عبدالحق کو اب بھی وہ منظر یاد آیا تو اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ ''پر اماں' تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا؟''

''رب کی امانت تھی پتر۔ جب تک رہی' اُس کی مہربانی۔ جب اس کی مرضی ہوئی' واپس لے لی۔ مگر جان بخش دی اس نے...... تمہارے لئے۔ اور اُس کا شکر ہے کہ آج اُس نے یہ دن دکھایا۔ تمہیں مجھ سے ملایا۔''

''پر آنکھوں کو ہوا کیا اماں؟''

''پتر ہونا کیا تھا۔ رب نے کرم کیا۔ جس ریت میں گاؤں کے گاؤں دب گئے' اُس کے سامنے میری کیا بساط تھی۔ بس جیسے وہ ساری کی ساری میری آنکھوں میں بھر گئی۔ نظر تو کچھ نہیں آتا۔ پر اب بھی کبھی کبھی آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے پتر۔''

عبدالحق کو اُس پر پیار آ گیا۔ اُس نے اُس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا۔ کیسی شکر گزار تھیں اماں۔

''تم نے یہاں اکیلے اتنے برس کیسے گزار دیے اماں؟''

''میں کہاں گزار سکتی تھی۔ رب نے گزار دیے۔'' حمیدہ نے شکر گزاری سے کہا۔ ''میں تو پریشان تھی۔ آنکھوں سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ وقت کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ پھر ایک اللہ کا بندہ

میرے پاس آیا۔ بولا...... یہاں کیسے جیو گی۔ چلو تمہیں اللہ کی رحمت کے سائے میں لے چلوں۔ میں نے کہا...... مجھے کسی کا انتظار ہے......اور اس کی امانتیں بھی سنبھالے بیٹھی ہوں۔ وہ بولا...... امانتیں بھی محفوظ ہیں۔ بس تم چلو۔ بہت اصرار سے وہ مجھے یہاں لے آیا۔ کہنے لگا......سر چھپانے کو یہ چھت ہے۔ سونے کے لئے چارپائی۔ کھانے کے لئے کھجوریں۔ اور یہ پانی کا گھڑا بھی رکھا ہے۔ اور کیا چاہیے تمہیں۔ میں نے کہا...... پانی ختم ہو جائے گا تو میں اندھی کہاں پانی ڈھونڈتی پھروں گی۔ وہ ہنس کر بولا...... پانی کبھی ختم نہیں ہو گا۔ بس......اس دن سے میں یہاں ہوں۔ بھوک لگتی ہے تو درختوں کے نیچے ٹپکی ہوئی کھجوریں کھاتی ہوں۔ گھڑے میں پانی کبھی کم نہیں ہوتا۔ اللہ کی مہربانی ہے۔ تمہارا انتظار تھا۔ تم بھی آ گئے۔ اللہ کا شکر ہے۔''

''اور وہ آدمی کہاں گیا؟''

''اس دن کے بعد میں نے کبھی اُس کی آواز بھی نہیں سنی۔''

''تم نے کتنی تکلیف اٹھائی ہے اماں۔''

''کوئی تکلیف نہیں تھی پتر۔ بس وقت کا پتا نہیں چلتا تھا۔ پرندوں کے شور سے صبح اور شام کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اندازے سے نماز پڑھتی تھی۔ پتا نہیں' کتنی غلط نمازیں پڑھی ہوں گی میں نے۔ اللہ معاف کرے۔ اور مہینوں کا تو پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ اب یہی دیکھ لو' مجھے نہیں معلوم تھا کہ رمضان آ گئے ہیں۔ نجانے کتنے روزوں سے محروم رہی میں۔'' وہ رونے لگی۔ ''اور وقت کتنا ہی نہیں تھا۔''

عبدالحق کا دل کٹنے لگا۔ واقعی' وہ کیسی روح فرسا تنہائی ہو گی' جس سے اماں گزری تھیں۔

''مجھے بتاؤ تو' تمہیں گئے کتنے برس ہو گئے؟''

''دو سال ہو گئے اماں۔''

''صرف دو سال۔'' حمیدہ کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور اذیت بھی۔ ''مجھے تو وہ دس بیس سال پرانی بات لگتی ہے۔''

عبدالحق اس بات کو سمجھ سکتا تھا۔

''اچھا پتر' اب تم سو جاؤ۔'' حمیدہ نے کہا اور اندر چلی گئی۔

عبدالحق لیٹ گیا۔ تھکن بہت زیادہ تھی۔ جسم کو آرام ملا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ اس رات کلمہ پڑھنے کے بعد جو اسے نیند آئی تھی تو اُس کے بعد اب تک وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سو سکا تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہ اسے نیند کی کمی کا احساس ستاتا ہو۔ وہ تازہ دم ہی رہتا تھا۔

گھڑی اُس کے پاس تھی۔ سحری کے وقت اُس نے سب کو جگا دیا۔

❁ ❁ ❁

پہلا مرحلہ اس جگہ کو زندگی گزارنے کے قابل بنانا تھا۔ ضروری تھا کہ رہنے کے لئے ایک گھر

بنایا جائے۔ مگر اس سے زیادہ ضروری اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ وہ گھر اپنے گاؤں کی...... اپنی زمین پر بنایا جائے۔

فجر کے بعد عبدالحق زبیر کے ساتھ اس جستجو میں نکلا۔ بظاہر تو وہاں کہیں کوئی نشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر تلاش کرنے پر ایک اونچے ٹیلے کے پیچھے حویلی کے آثار نظر آ گئے۔ آثار کیا' وہ ایک منڈیر سی تھی لیکن ان کی پہچان کے لئے کافی تھی۔ اور وہ آثار بھی اُس ٹیلے کی وجہ سے نمایاں ہوئے تھے۔ وہاں سے ریت نے اُڑ اُڑ کر ٹیلے کی شکل اختیار کی تھی اور جہاں سے ریت اڑی تھی' وہاں چھت کی منڈیر نمایاں ہو گئی تھی۔

اسے دیکھ کر عبدالحق کو ایسی بے قراری ہوئی کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ ہاتھوں سے زمین کھود کر نیچے اُتر جائے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس طرح یہ ممکن نہیں۔

بہرحال حویلی کے حوالے سے پورے گاؤں کا نقشہ ان دونوں کو یاد تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ دونوں حیران رہ گئے۔ اماں کی جھونپڑی عین اس جگہ تھی' جہاں ان کی یادداشت کے مطابق گاؤں کا مرکز تھا۔

عبدالحق نے یہ بات زبیر سے کہی۔ زبیر نے اس کی تائید کی۔ حیرت اس بات کی تھی کہ کھجوروں کا وہ جھنڈ اچانک کہاں سے آ گیا۔ "زبیر...... یہ اللہ کی قدرت ہے۔ اُس کی رحمت ہے۔ ورنہ تو اماں کے بچنے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مالک۔"

"بس...... اب ہمیں شہر چلنا ہے۔"

اس بار وہ جے پور کی مخالف سمت میں گئے۔ راستے میں انہیں کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں ملے۔ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندو بڑی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ گئے تھے اور جو موجود تھے' وہ عافیت میں رہ رہے تھے۔

انہوں نے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ اُن کی ضرورت شہر میں ہی پوری ہو سکتی ہے۔ اور شہر زیادہ دور بھی نہیں ہے۔

اور وہ قریب ترین شہر صادق آباد تھا۔

❀......❀......❀

پہلا دن تو جھونپڑیاں کھڑی کرنے میں گزر گیا۔ دو جھونپڑیاں ان کے اپنے لئے تھیں اور دو راج مزدوروں کے لئے۔ عبدالحق نے حمیدہ سے اُس کی جھونپڑی خالی کرنے کی اجازت لے لی تھی۔

اگلے روز عبدالحق نے راج کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مسجد کے لئے اُس نے اماں کی جھونپڑی والا مقام منتخب کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُس کے اندازے کے مطابق وہ

گاؤں کا وسطی مقام تھا لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اللہ نے ایک بہت بڑی آفت کے دوران اس مقام پر اماں کے لئے اپنی رحمت کا دامن پھیلایا تھا۔

"صاحب...... یہاں مسجد کی ضرورت کہاں ہے؟" راج نے اعتراض کیا۔

عبدالحق نے اسے یوں دیکھا' جیسے اُس کی ناسمجھی پر حیران ہو رہا ہو۔ "کیوں؟ یہاں مسلمان نہیں رہتے؟"

"آپ دو ہی تو آدمی ہیں یہاں۔"

"مگر نماز تو پڑھیں گے۔"

راج شرمندہ ہو گیا۔ "مگر اتنی بڑی مسجد!"

"دیکھو...... انشاء اللہ یہ گاؤں آباد ہو گا۔ میں چاہتا ہوں' یہاں پہلی بنیاد ایک مسجد کی رکھی جائے۔ اور میں بڑی مسجد کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں اس لئے اتنی جگہ چھوڑنا چاہتا ہوں کہ بعد میں ضرورت پڑنے پر توسیع کی جا سکے۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔ مگر مال دور سے آئے گا۔ خرچا بہت ہو گا۔"

"خرچے کی تم پروا مت کرو۔ بس عید سے پہلے کام مکمل ہو جائے۔" عبدالحق نے کہا۔ "اب مکان کے لئے جگہ دیکھ لو۔"

راج پیمائش میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مزدوروں کو مال کے لئے شہر بھیج دیا گیا۔

اذان کی آواز تو ان کی آمد کے ساتھ ہی گونج چکی تھی۔ اب وہاں باجماعت نماز ہونے لگی۔

اگلے روز سے تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا۔

❀......❀......❀

نور بانو کے لئے وہ بالکل نئی اور مختلف زندگی تھی۔ اس نے خواب میں بھی اس زندگی کا تصور نہیں کیا تھا۔ وہ ایک عجیب عالمِ حیرت میں جی رہی تھی۔ پہلی رات تو اسے لگتا تھا کہ وہ سو ہی نہیں سکے گی۔ نیچے فرش پر وہ کبھی سوئی ہی نہیں تھی۔ اب سونا تھا اور وہ بھی اونٹ پر طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد' تھکن اور درد اُس کی ہڈیوں میں سرایت کر گیا تھا۔ اور اسے لگتا تھا کہ اُس کے جسم کا ایک ایک جوڑ الگ ہو گیا ہے۔

لیکن سونے کے لیے لیٹنا تو تھا۔ اور عجیب بات یہ ہوئی کہ لیٹتے ہی وہ سو گئی۔ اور وہ ایسی بے خبر نیند تھی...... ایسی لذت والی نیند کہ رابعہ کے جھنجوڑنے پر بھی سحری میں اُس کی آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔

اُس کے لئے وہ تبدیلی بہت بڑی' بالکل مکمل اور یکسر تھی۔ اُس نے آنکھ کھولنے کے بعد بس گھر کی چار دیواری دیکھی تھی۔ گھر سے باہر کی دنیا کا اُس کے پاس بے حد محدود سا تصور تھا۔ پہلے تو اُس سفر نے ہی اُس کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ احساس الگ تھا کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک

میں چلی آئی ہے۔اللہ کی زمین اتنی بڑی ہے۔اتنی وسیع' یہ تو اُس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

اگلے روز سویرے ہی عبدالحق اور زبیر کہیں چلے گئے۔وہ رابعہ کو قرآن پڑھانے بیٹھ گئی۔ اماں بھی اس کے پاس بیٹھی سن رہی تھیں۔

قرآن پڑھنے کے بعد رابعہ نے کہا۔"آؤ مجھلی بی بی' ذرا باہر چل کر دیکھیں۔"

نور بانو ہچکچا رہی تھی۔دل تو چاہ رہا تھا باہر جانے کو۔

"یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں دیکھنے والا۔چلیں' چادر لپیٹ لیں اچھی طرح۔"

وہ رابعہ کے ساتھ باہر نکل آئی۔

باہر آکر پہلا ردعمل یہ ہوا کہ اُس کا دل گھبرانے لگا۔اپنا وجود اسے بہت چھوٹا' بہت حقیر لگنے لگا۔کھجور کے درختوں کے جھنڈ سے باہر حدِ نظر تک ریت اور آسمان کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔اور وہ منظر اتنا بڑا' اتنا وسیع تھا کہ انسان کی بے بضاعتی کا احساس دلاتا تھا۔

پھر اسے ڈر لگنے لگا...... وہاں وہ بس تین عورتیں ہی تو ہیں۔کوئی آجائے تو۔اُس نے یہ بات رابعہ سے کہہ دی۔

"کوئی نہیں آتا مجھلی بی بی۔آئیں......"

نور بانو کو ایسا لگ رہا تھا کہ اب اسے از سرِ نو زندگی گزارنا سیکھنا ہوگا۔وہ دیکھتی رہی۔رابعہ نے درختوں کے جھنڈ میں ہوا کے رخ سے ہٹ کر مٹی کا بہت خوب صورت چولہا بنایا۔اسے بہت اچھا لگا۔

عبدالحق اور زبیر واپس آئے تو ان کے ساتھ راج مزدور تھے۔اُس کے علاوہ وہ کھانے پینے کا سامان اور جلانے کیلئے لکڑی بھی لائے تھے۔اُن کے آتے ہی نور بانو جھونپڑی میں جا گھسی۔ رابعہ باہر کام میں مصروف رہی۔

ذرا دیر بعد حمیدہ نے پکارا۔"نور بانو...... دھیے...... ذرا عبدالحق کو تو بلالا۔"

"میں کیسے جاؤں اماں۔باہر مرد ہیں۔" نور بانو نے کہا۔

"سن دھیے' میں کوئی پڑھی لکھی نہیں ہوں۔دین کا بھی کچھ علم نہیں ہے مجھے۔پر زندگی کی سمجھ ہے مجھے۔دین پردے کے نام پر عورت کو قید نہیں کرتا۔دین میں آسانی ہے' مشکل نہیں' عورت کے باہر نکلنے پر پابندی نہیں۔پابندی ہے تو بس نفس کے لئے۔عورت کے لئے باہر نکلنے کی پابندی نہیں۔بس وہ اپنی نمائش نہ کرے۔"

نور بانو یہ سب کچھ جانتی تھی۔مگر وہ جس ماحول میں رہی تھی' اُس میں یہ پابندیاں تھیں۔وہ دین کا علم حاصل کرتی رہی تھی۔اس کو علم تھا کہ اسلام کے ابتدائی دور کی عورتیں علم حدیث حاصل بھی کرتی تھیں اور اُس کی تعلیم بھی دیتی تھیں...... اور وہ بھی صرف عورتوں کو نہیں مرد بھی ان سے علم

حاصل کرنے آتے تھے اور اُن سے سند لے کر جاتے تھے۔لیکن وہ جس معاشرے میں رہی تھی' اُس کے یہی تقاضے تھے اور وہ اُس کی عادت بن چکے تھے۔اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔"لیکن اماں' مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"دیکھ بٹی۔تو شہر میں رہتی تھی نا۔یہاں گاؤں کی زندگی کا تجھے کچھ پتا نہیں۔یہاں عورت کی ذمے داری صرف گھر سنبھالنا نہیں۔یہاں کبھی اُسے کھیتوں میں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ڈنگر بھی چرانے پڑتے ہیں۔اب مجھے نہیں معلوم' تجھے یہاں رہنا ہے یا نہیں لیکن آدمی پر خدانخواستہ وقت تو کہیں بھی پڑ سکتا ہے...... گاؤں میں بھی اور شہر میں بھی۔میں چاہتی ہوں' تو اُس کے لئے خود کو بدل لے۔بس چادر میں خود کو اچھی طرح چھپالے۔پھر بھی دل نہ مانے تو اسی چادر سے آدھے چہرے کو بھی چھپالے۔جا...... جا کر عبدالحق کو بلالا۔"

نور بانو نے خود کو چادر میں پہلے ہی لپیٹا ہوا تھا۔اسی چادر کا نقاب بنا کر وہ باہر نکلی۔مگر اُس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔وہ تو دہلی سے یہاں تک کے سفر نے اُس کی جھجک قدرے کم کر دی تھی۔ورنہ شاید وہ بے ہوش ہی ہو جاتی۔

خوش قسمتی سے مرد خاصے فاصلے پر زمین کا جائزہ لے رہے تھے۔رابعہ ایک اور چولہا بنانے میں مصروف تھی۔نور بانو نے اُس سے کہا۔"سنو...... عبدالحق سے کہو کہ اماں انہیں بلا رہی ہیں۔"

رابعہ اٹھ کر اُس طرف چل دی۔

نور بانو سوچنے لگی۔زندگی اس سے تبدیلیوں کا تقاضہ کر رہی ہے۔اور بنیادی چیز زندگی ہی ہے۔مزاج اور معاشرت کی تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔لیکن ناگزیر ہو تو زندگی کی خاطر کرنی پڑتی ہے۔پھر یہاں تو تبدیلی اُسے اچھی لگ رہی تھی۔چند گھنٹوں میں ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ کھلی فضا میں سانس لینا کتنا خوب صورت ہے۔ہر سانس کے ساتھ وجود جیسے روشن ہوا جا رہا تھا۔

اُس نے خود کو سمجھایا کہ حیا آنکھ میں ہوتی ہے' نیت میں ہوتی ہے اور دل کی بے غرضی میں ہوتی ہے اور مستور ہونے میں ہوتی ہے۔حیا خود کو غائب کر لینے میں نہیں ہوتی۔مستور ہونا دنیا سے کٹ جانا نہیں ہوتا۔پردہ ایسا ہو کہ کسی کے لئے ترغیب کا سامان نہ ہو۔

مگر عبدالحق کے معاملہ میں یہ ممکن نہیں تھا۔وہاں اُس کا دل بے غرض نہیں تھا۔وہ اُس سے محبت کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ بھی اُس سے محبت کرے۔لہٰذا اُس کے سامنے جانے کے خیال سے اسے گھبراہٹ ہوتی تھی۔

شام سے پہلے وہ دوسری جھونپڑی میں منتقل ہو گئے۔جہاں اماں کی جھونپڑی تھی' وہاں عبدالحق نے مسجد بنانے کا ارادہ کیا تھا۔نور بانو نے یہ سوچ کر سکون کی سانس لی کہ اب عبدالحق کو کھلے آسمان کے نیچے نہیں سونا پڑے گا۔

مزدوروں کو کام مکمل ہونے تک وہیں رہنا تھا۔ چنانچہ وہاں کھلے آسمان کے نیچے باجماعت نماز ہونے لگی۔ مزدوروں میں دو ایسے تھے' جن کی داڑھی تھی۔ ان میں سے ایک امامت کراتا تھا۔

حمیدہ کے لئے وہ بہت بڑی خوشی تھی۔ ساری عمر وہ اذان کی آواز سننے کو ترستی رہی تھی۔ اُس نے ہمیشہ اندازے سے نماز پڑھی تھی۔ اب پانچوں وقت اذان کی آواز سننا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اور وہ اذان کے فوراً بعد نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی۔ نمازیں اُس کی طویل ہو گئی تھیں۔ سچ یہ تھا کہ پہلے ایسی نماز اُس نے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ آزادی کے ساتھ نماز پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

حمیدہ کو نور بانو کے بارے میں اندازہ ہوا کہ وہ باقاعدہ علمِ دین حاصل کرتی رہی ہے تو اُس نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ویسے بھی اسے یہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ عبدالحق اس لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن اس معاملے میں عورتوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔

❁ ❁ ❁

اس روز حمیدہ نے عبدالحق کو اپنے پاس بلا لیا۔ ''پتر...... میں چاہتی ہوں کہ عید سے پہلے تمہاری امانتیں تمہارے سپرد کر دوں۔''

عبدالحق متجسس ہو گیا۔ اسے یاد تھا' لال آندھی والے دن بھی اماں نے یہی کہا تھا کہ انہیں اس کی امانتوں کی فکر ہے۔ ''اب جلدی کیا ہے اماں۔'' اس نے کہا ''میں آ گیا ہوں نا۔''

''جلدی تو ہے پتر۔ کیا پتا' اب ضرورت پڑ جائے۔''

عبدالحق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''تم مجھے کھجور کے اس درخت کے پاس لے چلو' جو سب سے اونچا ہے۔''

ذرا دیر بعد وہ اس درخت کے پاس کھڑے تھے۔ حمیدہ نے جھک کر درخت کے تنے کو نیچے سے چھوا۔ چند لمحے وہ ٹٹولتی رہی۔ پھر ذرا سا ہٹ کر اُس نے زمین پر نشان لگایا۔ ''یہاں کھودنا ہو گا پتر۔ تمہاری امانت یہیں ہے۔''

''میں مزدور کو بلاتا ہوں۔''

''نا پتر...... کسی کو پتا نہ چلے۔ یہ کام تم لوگ...... زبیر سے لے سکتے ہو' پر خود ہی کر دو تو اچھا ہے۔''

عبدالحق بحث کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ خود ہی اس کام میں لگ گیا۔ اور اسے زیادہ کھودنا نہیں پڑا۔ تھوڑی سی کھدائی کے بعد کدال کسی دھات کی چیز سے ٹکرایا۔ اُس نے مٹی ہٹا کر دیکھا۔ وہ کافی بڑا ایک دیگچہ تھا' جس کے اوپر ڈھکن بھی تھا۔

وہ آواز سنتے ہی حمیدہ کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔ اس سے پہلے اس کے جسم میں تناؤ تھا وہ سوچ رہی تھی کہ وہ چیز یہاں موجود بھی ہو گی یا نہیں۔ ''ہاں...... یہی ہے پتر نکال لو اسے۔'' اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

دیگچہ نکالنے کے لیے اور اِدھر اُدھر کی مٹی ہٹانی پڑی۔ بالآخر اس نے دیگچہ نکال لیا۔ ''اب کیا کروں اماں۔''

''اسے کھول کر دیکھو۔ یہ سب تمہارا ہے۔''

عبدالحق نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈھکنا ہٹایا۔ دیگچے میں ایک بڑی گٹھری تھی۔ ''اس میں گٹھری ہے اماں۔''

''ہاں۔ یہ تمہاری امانت ہے۔'' حمیدہ نے کہا اور آسمان کی طرف سر اٹھاتے ہوئے بولی۔

''تیرا شکر ہے ربا۔ تو نے میرا بوجھ اتار دیا۔''

عبدالحق نے گٹھری کو کھولا۔ گٹھری میں کچھ کاغذات تھے اور دو بڑی بڑی پوٹلیاں تھیں۔ اس نے کاغذات اٹھائے اور ان کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ عدالتی کاغذات تھے ان کی رُو سے جمال دین نے اپنی تمام زمین' اپنا مکان' سب ٹھاکر اوتار سنگھ کے نام کر دیا تھا۔

چند لمحے تو وہ ان کاغذات کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس نے تاریخ دیکھی۔ وہ اس کے لیے ایک اور مقامِ حیرت تھا۔ وہ دستاویزات 1932ء کی تھیں۔ یعنی بات یہ نہیں تھی کہ جمال دین نے اپنی موت سے کچھ پہلے وہ کچھ اس کے نام کیا تھا۔ یہ اس سے بہت پہلے کی بات تھی۔ ''یہ سب کیا ہے اماں۔'' بڑی مشکل سے وہ بولا۔

''سب بتا دوں گی۔ پہلے سب چیزیں دیکھ لو اور بتا دو۔ مجھے تسلی ہو جائے کہ امانت پوری ہے اور تمہیں مل گئی ہے۔''

عبدالحق نے پوٹلیاں کھولیں۔ مگر اس کا دماغ اب بھی کاغذات میں الجھا ہوا تھا۔ چاچا جمال دین نے یہ سب کچھ اس کے نام کیوں کیا۔ انہیں تو یہ سب کچھ ویرجی کے نام کرنا چاہیے تھا۔

اس نے پوٹلیاں کھول کر دیکھا۔ ایک میں نقدی تھی اور دوسری میں سونا اور زیورات۔ رقم بھی بھاری تھی اور سونا بھی کم نہیں تھا۔ وہ تو اچھا خاصا خزانہ تھا۔

اماں...... اس میں نقدی اور زیورات بھی ہیں...... بہت سارے۔''

''یہ سب تمہارا ہے پتر۔ تمہاری امانت تھی میرے پاس۔ رب سے دعا کرتی تھی کہ امانت لوٹائے بغیر مجھے مرنے نہ دینا۔''

عبدالحق نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ''ایسی باتیں نہ کرو اماں۔ اب تمہارے سوا میرا کون

ہے۔" پھر وہ بولا۔ "لیکن اماں! چاچا نے یہ سب میرے نام کیوں کیا ہے انہیں تو ویر جی کے نام کرنا چاہیے تھا۔"

"اس لیے کہ یہ سب کچھ تمہارا ہی تھا۔ ہمارا اس پر کوئی حق نہیں تھا۔"

"کیسے اماں۔ سمجھاؤ تو۔"

تب حمیدہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ کیسے بڑے ٹھاکر نے دودھ کے صلے میں اپنی زمین اور ہر چیز کا نصف انہیں دیا تھا۔ "ہم ٹھاکر جی کو انکار تو نہیں کر سکتے تھے نا۔ وصال دین کے ابا نے کہا...... یہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کا ہے حمیدہ...... ہم سب کچھ چپکے سے اس کے نام کر دیں گے۔ یاد رکھنا حمیدہ...... یہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کی امانت ہے ہمارے پاس۔"

عبدالحق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "لیکن بپا جی نے سب کچھ خوشی سے دیا تھا...... آپ کے احسان کے صلے میں۔"

"ہم نے کوئی احسان نہیں کیا تھا پتر۔ تمہیں پہلی بار دیکھا تو دل میں تمہیں دودھ پلانے کی آرزو پیدا ہوئی تھی۔ اس میں تو میری خوشی تھی۔ اور اسے بھی بھول جاؤ تو بھی وہ بڑے ٹھاکر کے احسان کا صلہ تھا' احسان نہیں۔"

"آپ کس احسان کی بات کر رہی ہیں اماں؟"

"مجھے تو نہیں معلوم۔ وصال دین کے ابا نے بتایا تھا۔" حمیدہ نے کہا اور پھر اسے بتایا کہ کیسے وہ لوگ دوسرے گاؤں میں رہتے تھے اور زمین دار کی نظر جمال دین کی بہن پر تھی۔ اس نے مہاجن کے ذریعے چکر چلایا۔ اور کیسے بڑے ٹھاکر نے وہ قرضہ چکا کر ان کی جان چھڑائی، عزت بچائی۔ پھر اپنے گاؤں میں انہیں زمین دی' عزت دی اور مرتبہ دیا۔

یہ کیسے احسان ماننے والے لوگ ہیں۔ عبدالحق نے سوچا۔ "مگر اماں! مجھے یہ سب لینا اچھا نہیں لگے گا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگے گا؟" حمیدہ نے خفگی سے کہا۔

"بپا جی کی دی ہوئی چیز میں واپس لے رہا ہوں۔ یہ کوئی اچھی بات ہے۔"

"تم واپس کہاں لے رہے ہو۔ یہ تو وصال دین کے ابا نے تمہیں دیا ہے۔ اور وہ اپنے بیٹے سے زیادہ تمہیں چاہتے تھے۔ تم انکار کیسے کر سکتے ہو۔"

عبدالحق کی کیفیت عجیب تھی۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

"پھر مان لو کہ یہ سب میرا ہے۔ اب یہ بتاؤ تمہارے سوا میرا کون ہے۔ تم نہ ہوتے تو میں تو موت کی دعا مانگتی۔ اور پتر' موت تو یہاں بن مانگے مل رہی تھی۔ اللہ نے مجھے بچایا۔ صرف تمہارے لیے۔"

عبدالحق کو دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ یہ سب سچ ہے۔ اماں کا بچ جانا معجزے سے کم نہیں۔ جہاں گاؤں کے گاؤں مٹ گئے' اماں کیسے بچیں۔ اور پھر آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد اتنے برسوں کیسے جیتی رہیں۔ یہ کھجور کے درخت کہاں سے آئے۔ گھڑے میں پانی کبھی ختم نہیں ہوتا تھا۔ کیوں؟ اور اسے یاد تھا' آنے کے بعد تین دن تک اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ گھڑا بھرا ہی رہتا تھا۔ پھر گھڑا خالی ہونے لگا۔ اور اب پانی مسئلہ بن گیا تھا۔

"ٹھیک کہتی ہو اماں۔ میرا بھی تمہارے سوا کون ہے۔"

"بس...... اب تم شادی کر لو۔"

"ارے اماں......"

"سچ کہتی ہوں پتر۔ یہ نور بانو بہت پیاری لڑکی ہے......"

"تم نے تو اماں اسے دیکھا بھی نہیں......"

"کیوں نہیں دیکھا من کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیتی ہوں۔ اور وہ تجھ سے پیار بھی کرتی ہے۔"

ایک لمحے کو عبدالحق کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ پھر اس نے افسردگی سے سوچا' اماں تو میری محبت میں کہہ رہی ہیں۔ ورنہ یہ کہاں ممکن ہے......

اسی وقت باہر سے زبیر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "مالک...... جلدی آئیں۔ پانی نکل آیا۔ مالک پانی......"

عبدالحق نے وہ سب کچھ حمیدہ کے پاس چھوڑا اور باہر لپکا......

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے جب پہلی بار کنویں کی بات کی تو راج نے کہا۔ "صاحب...... یہاں پانی کہاں سے آیا۔ یہاں تو ریت ہی ریت ہے۔"

مگر عبدالحق کو گاؤں کی ندی یاد تھی۔ اس نے کہا "جہاں میں کہوں' وہاں کھدائی کر کے دیکھو۔"

ہر پرانی جگہ کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے پاس ایک ہی حوالہ تھا...... حویلی۔ وہ حویلی کے آثار کے پاس کھڑا ہو کر اندازہ کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کی مطلوبہ جگہ کہاں ہو گی۔ اسی طرح اس نے اماں کے گھر کا اندازہ لگایا تھا۔ وہ اپنے لیے مکان وہیں بنانا چاہتا تھا' جہاں کبھی اماں کا گھر تھا۔ جہاں اس نے چاچا جمال دین اور اس کے ویر جی رہتے تھے۔ اس کے اندر اس بات پر اصرار تھا کہ مکان وہیں بنے۔

لیکن وہیں کیوں؟ اس نے خود حیرت سے سوچا۔ اصولاً تو اسے ریت میں دفن حویلی پر اپنے

نئے گھر کی بنیاد رکھنی چاہیے تھی۔

مگر جواب بھی اُسے اپنے اندر سے فوراً ملا تھا۔ اس لیے کہ گاؤں میں وہی ایک جگہ تو تھی جہاں نماز پڑھی جاتی تھی' قرآن پڑھا جاتا تھا۔ اللہ کا ذکر کیا جاتا تھا۔ اور اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔

اسی طرح اس نے کنویں کی جگہ کا تعین کیا تھا۔ اور اب وہاں سے پانی نکل آیا تھا۔

جہاں کنواں کھودا گیا تھا' وہاں جشن کا سماں تھا۔ تمام مزدور خوشی سے ناچ رہے تھے۔ پانی نکلنے کی خوشی کو صحرا کے باشندوں سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔

"آپ نے ٹھیک کہا تھا صاحب۔" راج نے اس سے کہا۔ "پانی نکلا ہے...... اور وہ بھی میٹھا پانی۔"

عبدالحق نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور بولا۔ "اللہ کا شکر ہے۔"

"بہت مبارک ہو صاحب۔"

"تمہیں بھی مبارک ہو۔ محنت تو تم لوگوں کی ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ "اب یہاں چرخی بھی لگا دینا۔"

❁ ❁ ❁

راج اور مزدور کام مکمل کر کے رخصت ہونے لگے۔ عبدالحق نے انہیں طے شدہ اجرت سے زیادہ دیا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ابھی تم لوگ یہاں اور رکو۔ کام بہت ہے یہاں۔"

راج نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "کام کہاں ہے صاحب؟"

"مجھے یہاں پر مکان بنوانے ہیں۔"

"لوگ تو ہیں ہی نہیں۔ مکان کس کے لیے بنوائیں گے؟"

"لوگ آئیں گے۔ یہ گاؤں آباد ہوگا۔ تھوڑے ہی دن کی بات ہے۔"

راج اس کی فیاضی اور حسن اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ بولا "جب ضرورت ہو صاحب' بلوا لیجیے گا۔"

"اچھا ہے' ابھی کام کر جاؤ۔"

"اب تو عید سر پر ہے صاحب۔ سب لوگ عید گھر کرنا چاہیں گے۔ میری مانو صاحب' آپ لوگ بھی شہر چلو عید کر کے آ جانا۔"

عبدالحق نے ایک لمحے کو سوچا۔ پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ لوگ عید گھر میں کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ ہمارا گھر ہے۔"

"پر صاحب عید کی نماز کے لیے تو آپ کو شہر ہی آنا ہوگا۔ یہاں تو نہیں ہو سکتی نا۔"

ان کے جانے کے بعد عبدالحق حمیدہ کے پاس گیا۔ اتفاق سے حمیدہ نے بھی وہی بات کہی۔ "آج کون سا روزہ ہے پتر۔"

"پچیسواں اماں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ اس نے تمہیں عید سے پہلے رہنے کو گھر بھی دے دیا۔ اب کچھ عید کی فکر بھی کرو۔"

"مجھے بتائیں اماں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"اللہ دے تو عید کے دن بندہ نئے کپڑے پہنے۔ اچھا کھائے پیے۔ اللہ کا شکر ادا کرے۔"

"ٹھیک ہے اماں۔ وہ میں کر لوں گا۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر اس نے عید کی نماز کے بارے میں پوچھا۔

اماں نے بھی وہی کہا جو راج نے کہا تھا۔

اگلا دن یہ حساب لگاتے گزرا کہ انہیں گھر کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ تیسرے دن عبدالحق شہر گیا۔ وہاں ہر زبان پر ایک ہی بات تھی۔ پاکستان بن گیا ہے۔ گزشتہ رات ریڈیو پر اناؤنس ہوا تھا...... اور وہ ریڈیو پاکستان تھا۔

عبدالحق کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ پاکستان ایک خواب تھا' جو جہدِ مسلسل کے نتیجے میں حقیقت میں تبدیل ہو گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ ایک ایک چیز کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ عبدالحق نے ہر چیز کا خیال رکھا ہے۔ کپڑے تو سامنے کی بات تھے۔ وہ چوڑیاں' مہندی' رابعہ کے لیے پائل' اور سب کے لیے زیور بھی لایا تھا۔

"تمہیں ان سب چیزوں کا کیسے خیال آیا پتر؟" اس نے پوچھا۔

عبدالحق نے شرماتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو کچھ بھی نہیں پتا تھا اماں۔ دکان دار سے پوچھا تھا۔" پھر بولا۔ "پر تمہارے لیے چوڑیاں نہیں لایا اماں۔"

"اب اس عمر میں سب کچھ کھو کر چوڑیاں میں کیا پہنوں گی۔"

"ایک بیٹا تو تمہارا زندہ ہے اماں۔"

"اللہ بڑی عمر دے۔ تیرے ہی لیے تو جی رہی ہوں پتر۔"

"تو اماں' تمہارے لیے میں کڑے لایا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں......"

عبدالحق نے اپنے ہاتھ سے سونے کے وہ کڑے اسے پہنا دیے۔ "اب اماں' سب لوگوں کو ان کی چیزیں تم دے دینا۔"

اچانک حمیدہ کو خیال آ گیا۔ "پتر اپنے کپڑے اور جوتے تو تم نے دکھائے نہیں۔"

عبدالحق نے چپ سادھ لی۔

"بولتے کیوں نہیں۔" حمیدہ نے ذرا خفگی سے کہا۔

"وہ.....یاد ہی نہیں رہا اماں۔"

"یاد نہیں رہا یا جان بوجھ کر....."

عبدالحق نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "نہیں اماں، سچ یاد نہیں رہا۔"

"تجھے یاد نہیں رہا.....زبیر کے لیے لیتے ہوئے....."

"سب سے پہلے تو اسی کی چیزیں خریدی تھیں اماں۔ میں نے سوچا، سب کے بعد اپنے لیے لوں گا۔ پھر پاکستان بننے کی خوشی میں سب کچھ بھول گیا۔"

"کل جا کر لانا....."

"اب تو جانا مشکل ہے اماں....."

"تو پھر کوئی نئے کپڑے نہیں پہنے گا۔"

"اچھا اماں، دیکھوں گا۔"

مگر اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ حمیدہ نور بانو اور رابعہ کو ان کی چیزیں دے رہی تھی۔ دبی دبی سسکیوں کی آواز سے وہ چونکی۔ "ارے یہ کون رو رہا ہے؟"

"منجھلی بی بی۔" رابعہ نے جواب دیا۔

"کیوں، کیا بات ہے؟" حمیدہ نے نور بانو کا ہاتھ تھاما اور اسے محبت سے سہلانے لگی۔

محبت کا لمس پا کر نور بانو پھٹ پڑی۔ وہ اس طرح روئی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ حمیدہ اور رابعہ اسے چمکارتی، دلاسے دیتی رہیں۔ "نہ رو، کچھ تو بولو.....کیا بات ہے؟"

ذرا دیر میں نور بانو کا بوجھ ہلکا ہوا۔ "اماں.....باجی.....سب لوگ یاد آ گئے تھے اماں۔" اس نے کہا۔ "اماں ہمیشہ عید کا اہتمام کرتی تھیں۔ میں نئے کپڑے کیسے پہنوں گی اماں....."

"یہ سوچ کر کہ یہ تمہارے لیے وہ لایا ہے، جو تم سے پہلے ماں باپ سے محروم ہو چکا ہے۔ اس میں اس کی خوشی ہے۔"

نور بانو کی کیفیت ایک دم بدل گئی۔ حیا سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ کچھ دیر تو اس سے بولا نہیں گیا۔ "یہ.....یہ.....یہ وہ لائے ہیں۔"

"ہاں۔ اور ہر چیز کا خیال رکھا اس نے۔ بس اپنے لیے کچھ نہیں لایا۔ کہتا ہے، بھول گیا۔ پر میں سمجھتی ہوں۔ اس کا دل چاہتا ہوگا کہ کوئی اور محبت سے اس کی فکر کرے۔ خود اپنے لیے کچھ کرنے میں اتنا مزہ کہاں۔"

نور بانو کو اچانک اس کے وہ کپڑے یاد آ گئے جو اماں نے بڑے اہتمام سے تیار کیے تھے۔

اللہ.....یہ کیسی بات ہے۔ وہ انہیں عید کے موقعے پر ملتے تھے۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "آپ ان کی فکر نہ کریں اماں۔ میں ابھی آئی۔"

نور بانو نے بکس کھولا اور وہ کرتے پاجامے نکالے۔ وہ گیارہ جوڑے تھے۔ باجی کا کاڑھا ہوا کرتا کم تھا۔ اس نے اپنا کاڑھا ہوا کرتا صندوق میں ہی رہنے دیا اور اماں کے تیار کیے ہوئے دس جوڑے نکال کر حمیدہ کے پاس لے گئی۔

حمیدہ نے ٹٹول کر کپڑوں کو دیکھا اور بولی "اتنے کپڑے؟"

"یہ.....یہ اماں نے ان کے لیے بڑی محبت سے تیار کیے تھے۔ اسی لیے میں انہیں چھوڑ نہ سکی۔"

"چلو.....وہ خوش ہو جائے گا۔ اسے بن مانگے مل گیا۔ اللہ کا شکر ہے۔"

تھوڑی دیر بعد حمیدہ نے عبدالحق کو بلا کر وہ کپڑے اسے دیے تو وہ حیران ہو گیا۔ "یہ ماں جی نے بھیجے.....میرے لیے"۔ اس نے بے ساختہ کہا اور کپڑوں کو چومنے لگا۔

"ماں جی!" حمیدہ نے حسرت سے دہرایا۔

عبدالحق اسے ماں جی کے بارے میں بتانے لگا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا، جیسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو۔

❁ ❁ ❁

اگلی صبح فجر کے بعد عبدالحق زبیر کے ساتھ مدفون حویلی کی منڈیر پر کھڑا تھا کہ دور سے اسے غبار سا اٹھتا دکھائی دیا۔ دیکھتے رہنے پر احساس ہوا کہ غبار آگے کی سمت متحرک ہے۔

وہ پاکستان بننے کے بعد کی پہلی صبح تھی۔ انہیں ٹھیک طرح سے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی زمین پاکستان میں شامل ہے بھی یا نہیں۔ بس وہ یہ جانتے تھے کہ بابا نے بتایا تھا کہ وہ پاکستان میں ہے۔

اور اب وہ غبار گواہی دیتا تھا کہ اونٹ پر سوار کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔ اتنے فاصلے سے یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کی تعداد کیا ہے۔

عبدالحق نے زبیر سے کہا۔ "لاٹھیاں لے آؤ۔"

زبیر لپکتے قدموں سے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو لاٹھیاں تھیں۔ اس نے ایک لاٹھی عبدالحق کی طرف بڑھا دی جو اب بھی غبار پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ "یہ جو لوگ بھی ہیں، تین اونٹوں پر سوار ہیں۔" عبدالحق نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔

زبیر نے غبار کی سمت دیکھا۔ اسے تو ایسا کچھ دکھائی نہیں دیا۔

لیکن چند منٹ بعد عبدالحق کی بات کی تصدیق ہو گئی۔

آنے والوں نے انہیں دیکھا تو ان کے چہروں سے خوف جھلکنے لگا۔ تاہم وہ وہاں رکے بغیر نہ رہ سکے۔ عبدالحق اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ ان لوگوں کے چہرے ریت سے اٹے تھے۔ اور وہ نڈھال لگ رہے تھے۔ یہ بات طے تھی کہ انہوں نے رات بھر سفر کیا تھا۔ رات کے وقت صحرا کا سفر بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ وہاں سمتوں کا پتا تو دن میں نہیں چلتا۔ رات میں تو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ آدمی چھوٹے سے دائرے میں سفر کر رہا ہے۔ اور درحقیقت جہاں تھا۔ وہی ہے۔

اب رات بھر سفر کرنے والوں نے صبح ہونے پر دیکھا ہوگا تو چاروں طرف بے نشاں ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا ہوگا۔ اور بھوک پیاس سے ان کا برا حال ہوگا۔ ایسے میں انہیں وہ مکان اور جھونپڑیاں نظر آئی ہوں گی تو ان کے دل میں امید جاگی ہوگی۔ لیکن انہیں ڈر بھی ہوگا۔ بہرحال صحرا میں امید خوف سے بڑی ہوتی ہے۔ کیونکہ صحرا میں بھٹکنے کا مطلب یقینی موت ہوتا ہے۔

وہ لوگ رک تو گئے تھے لیکن انداز ایسا تھا کہ کسی بھی لمحے بھاگ کھڑے ہوں گے۔

"السلام علیکم۔" عبدالحق نے پرتپاک لہجے میں کہا۔

یہ سنتے ہی ان کے چہروں پر جو سکون نظر آیا' وہ حیران کن بالکل نہیں تھا۔ "وعلیکم السلام۔" انہوں نے کہا۔ "یہ جگہ پاکستان میں ہے نا۔"

"الحمدللہ۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" سب سے بڑے نے کہا۔ "ہم لوگ یہاں کچھ دیر رک سکتے ہیں؟"

"کچھ دیر کیا' آپ جب تک چاہیں' یہاں رک سکتے ہیں۔"

"چلو نواز...... اترو۔"

وہ تین مرد تھے اور ان کے ساتھ پانچ عورتیں تھیں۔ جس نے بات کی تھی' اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی' جو یقیناً اس کی ماں تھی۔ دوسرے دو مردوں کے ساتھ دو دو عورتیں تھیں۔ ان میں ایک جوان لڑکی تھی...... سولہ سترہ سال کی۔

بات کرنے والے نے اپنی گود میں اٹھا کر بوڑھی عورت کو اتارا لیکن بوڑھی عورت کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ ریت پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کا حال بہت برا تھا۔ بیٹے نے ریت پر بیٹھتے ہوئے ماں کو سہارا دیا۔ دوسرے لوگ بھی اتر آئے تھے۔

"زبیر...... پانی لاؤ ان لوگوں کے لیے۔" عبدالحق نے زبیر سے کہا۔ زبیر کے جانے کے بعد وہ بڑے لڑکے کی طرف مڑا۔ "خواتین کو وہاں بھیج دیں۔ وہاں میری اماں اور بھابی موجود ہیں۔" اس نے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے تشکر آمیز نظروں سے عبدالحق کو دیکھا' پھر عورتوں سے بولا۔ "جاؤ...... تم لوگ وہاں چلی جاؤ۔"

عورتیں چلی گئیں۔ زبیر پانی لے آیا تھا۔ بوڑھی عورت کو دو گھونٹ پانی دیا گیا۔ اس کے چہرے پر بحالی نظر آنے لگی۔

❀ ❀ ❀

ایک گھنٹے بعد عبدالحق ان کے بارے میں سب جان چکا تھا۔ وہ تینوں بھائی تھے۔ سب سے بڑا نیاز تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں تھی۔ پھر نواز تھا اور سب سے چھوٹا ریاض۔ تینوں شادی شدہ تھے اور ان کی بیویاں بھی ساتھ تھیں...... سب سے کم عمر لڑکی ان کی بہن تھی۔

ان لوگوں کا تعلق اودے پور سے تھا۔ وہ وہاں کے خوش حال لوگوں میں سے تھے لیکن پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اپنے بھرے پُرے گھر سے پاکستان کے لیے نکلتے ہوئے انہوں نے صرف تن کے کپڑے لیے تھے۔

"شہر یہاں سے کتنا دور ہے؟" نیاز نے پوچھا۔

"بارہ پندرہ میل ہوگا۔" عبدالحق نے کہا۔

"یعنی زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

"تو آپ لوگ ابھی جانا چاہتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ جانا تو ہے۔"

عبدالحق سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "کوئی ضروری تو نہیں۔ آپ لوگ یہاں رک سکتے ہیں۔"

"آپ پر بوجھ نہیں بنیں گے۔"

"بھائی بھائی کے لیے بوجھ نہیں ہوتا۔" عبدالحق نے سادگی سے کہا۔ "آپ چاہیں تو یہاں زندگی بھر رہیں۔"

نیاز نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ پھر اس کی نگاہوں سے تشکر جھلکنے لگا۔ "آپ کے خلوص اور محبت نے مجھے خرید لیا ہے لیکن یہاں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم لوگ نہ کاشتکار ہیں' نہ گلہ بان۔ ہم تاجر ہیں۔ ہمارے لیے شہر ہی مناسب رہے گا۔"

"لیکن ابھی شہر میں آپ کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ عورتوں کو لے کر کہاں پھرتے رہیں گے۔ میری مانیں تو عید یہیں کر لیں۔ پھر آپ شہر جا کر حالات دیکھیں۔ بات بن جائے تو آ کر سب کو لے جائیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے لیکن......"

"دیکھیں' یہاں جگہ کی کمی نہیں۔ اللہ کے فضل سے ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ دو مکان ہیں۔ دو جھونپڑیاں بھی ہیں۔ ایک مکان میں آپ لوگ رہ سکتے ہیں۔"

''ہم آپ کا یہ احسان......''

''اس میں احسان کی کوئی بات ہی نہیں۔'' عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔ مگر عبدالحق نے دو مکان یہ سوچ کر بنوائے تھے کہ ایک زبیر اور رابعہ کے لیے ہے۔

شام تک انہیں پوری طرح احساس ہو گیا کہ پاکستان بن چکا ہے۔ شام تک تین اور مہاجر گھرانے وہاں پہنچ گئے۔ وہ سب بہت زیادہ تباہ حال تھے کیونکہ وہ سب پیدل چل کر آئے تھے۔ اور صحرا میں تو سفر ہی آسان نہیں ہوتا۔ کجا یہ کہ پیدل سفر۔

عبدالحق نے انہیں بھی ٹھہرالیا۔

وہاں اسلامی یگانگت اور ایثار کا جو مظاہرہ دیکھنے میں آیا' وہ اس اعتبار سے غیر معمولی نہیں تھا کہ وہ پورے پاکستان کا منظر تھا۔ ہر جگہ یہی کچھ ہو رہا تھا۔ لوگ کھلی باہوں کے ساتھ ہندوستان سے لٹ پٹ کر ہجرت کر کے آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ چودہ سو سال پہلے انصار مدینہ نے جو روایت قائم کی تھی' وہ آج بھی زندہ تھی۔ بلکہ اب اس کا احیا ہو رہا تھا۔

پہلے آنے والوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ بدلی ہوئی صورت حال میں ان کے لیے الگ مکان میں رہنا مناسب نہیں۔ طے یہ پایا کہ دن میں عورتیں ایک گھر میں رہیں گی' کھانا پکانا کریں گی۔ رات کو شادی شدہ لوگ ایک گھر میں رہیں گے۔ غیر شادی شدہ عورتیں دوسرے گھر میں رہیں گی اور غیر شادی شدہ مرد جھونپڑیوں میں شب بسر کریں گے۔

انہوں نے عبدالحق کو مستثنیٰ کرنا چاہا۔ لیکن وہ نہ مانا۔

اگلے روز وہ مردوں کے ساتھ شہر گیا اس نے زبردستی ان کے اور گھر والوں کے لیے عید کی خریداری کی۔ ضرورت کی چیزیں خریدیں۔ پھر انہوں نے اپنی مسجد کے لیے بات کی۔ بالآخر انہیں ایک پیش امام مل گیا۔

اب وہ عید کی نماز اپنی مسجد میں پڑھ سکتے تھے۔

❁ ❁ ❁

عید کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں تیزی سے آباد ہونے لگا عبدالحق نے شہر جا کر پٹواری سے بات کی۔ کاغذات دکھائے۔ لیکن وہ آدھی زمین کے کاغذات تھے...... اس زمین کے جو اس کے پتاجی نے چاچا جمال دین کے نام کی تھی۔ باقی کاغذات حویلی میں ہوں گے' جو ریت کے تلے دفن تھی۔

''بابا...... اس وقت کاغذات کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک زمین پر کسی کا دعویٰ نہیں' آپ قبضہ کر سکتے ہو۔'' پٹواری نے کہا۔

''لیکن میں قبضہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف اپنا حق لینا چاہتا ہوں۔''

''تم عجیب آدمی ہو۔ میں بولتا ہوں' جہاں تک چاہو زمین لے لو۔ تم حساب کتاب میں پڑ رہے ہو۔''

عبدالحق کے اصرار پر پٹواری گاؤں آیا۔ گاؤں میں وہ لوگوں سے ملا تو اور متاثر ہوا۔ لوگ تو اس نوجوان کی پرستش کرتے تھے۔ اس نے ان لوگوں کو گھر بنوا دیے تھے۔ غیر مشروط طور پر انہیں زمین دی تھی اور ہر طرح سے ان کی مدد کی تھی۔

''تم بابا اپنے لیے تو زمین لے نہیں رہے ہو۔ پھر میری بات کیوں نہیں مانتے'' پٹواری نے عبدالحق سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ حد بندی کر دیں۔ اور پہلے ہمارے گاؤں کو نہری پانی بھی ملتا تھا۔ لال آندھی کے بعد وہ رک گیا۔''

''حد بندی میں کر دیتا ہوں پر پانی کے لیے بابا تم کو محکمہ زراعت والوں سے بات کرنی ہو گی۔''

پٹواری نے بہت کھلے دل سے حد بندی کی۔ اس نے وہ زمین بھی شامل کر دی' جس کے کاغذات حویلی میں دفن تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اِدھر اُدھر کی اور زمینیں بھی اس گاؤں میں شامل کر دیں' جن کا کوئی دعوے دار نہیں تھا۔

''اب بابا اس گاؤں کا کوئی نام بھی رکھ دو۔''

''نام؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ پرانا نام تو اب مناسب نہیں۔

''نام کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے کہا۔

نیاز آگے بڑھ آیا وہاں اس وقت گاؤں کے سبھی لوگ موجود تھے۔ ''نام میں بتاتا ہوں۔''

''بولو بابا۔''

''اس گاؤں کا نام ہے حق نگر۔''

عبدالحق کو احتجاج کا موقع بھی نہیں ملا۔ سب لوگ اس نام کی تائید میں بولنے لگے۔

''ٹھیک ہے بابا۔ آج سے یہ حق نگر ہے۔'' پٹواری بولا۔ پھر وہ عبدالحق کی طرف مڑا۔ ''تم بابا کسی دن میرے پاس آ جاؤ میں تمہیں محکمہ زراعت کے ایک افسر سے ملوا دوں گا۔ پانی کی بات کر لینا۔''

''میں آ جاؤں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

❁ ❁ ❁

نیاز عید کے تیسرے دن اپنے بھائی نواز کے ساتھ شہر گیا تھا۔ وہاں جا کر جو انہوں نے جائزہ لیا تو صورت حال کو خاصا مایوس کن پایا۔ ان کے پاس تھوڑی بہت رقم تھی۔ باقی تو سب کچھ وہ پیچھے

ہی چھوڑ آئے تھے۔ انہیں پتا چلا تھا کہ ہندوان کے گھر پر حملے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ عزت کا معاملہ تھا۔ وہ راتوں رات چپکے سے نکل آئے عزت سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں ہوتی۔

دونوں بھائی منہ لٹکائے واپس آ گئے تو عبدالحق سے بات ہوئی۔ ''آپ لوگ کام کیا کرتے ہیں؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''میری تو دکان تھی ریاض میرے پاس ہوتا تھا۔ اور یہ نواز مکان بناتا تھا۔''

عبدالحق کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تب تو بات بن سکتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا مشورہ مانیں گے آپ؟''

''مشورہ کیسا، آپ حکم کریں۔''

''یہ گاؤں آباد ہوتا ہے تو یہاں مکان بھی بنیں گے نواز بھائی کا تو کام ہو گیا۔ اور آپ لوگوں کے لیے میرا مشورہ ہے کہ مویشی پالیں۔''

''مگر ہمیں اس کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔''

''زبیر تجربہ کار ہے۔ آپ اس کے ساتھ مل کر کام کریں۔ تجربہ آپ ہی ہو جائے گا۔''

''ہمارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔''

''اس کی فکر نہ کریں سرمایہ زبیر کا ہو گا۔''

نیاز ہچکچا رہا تھا۔

''شہر میں جگہ بنانے کی نسبت یہ زیادہ آسان ہے۔'' عبدالحق نے اسے سمجھایا۔ ''بکریوں میں برکت بھی ہے۔''

یوں وہ لوگ وہیں رک گئے اور انہوں نے زبیر کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ نواز بھی معروف ہو گیا تھا۔ وہ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں رکے تو شاید اس لیے کہ نیاز کو گاؤں کا نام تجویز کرنا تھا۔

❁ ❁ ❁

عید سے پہلے جو اور گھرانے آئے تھے وہ کاشت کار تھے۔ عبدالحق نے انہیں وہاں رکنے کو کہا تو وہ ہچکچائے۔ ''یہاں پانی تو ہے نہیں۔''

''ہمارے گاؤں میں پانی تھا۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''یہاں فصلیں ہوتی تھیں۔ انشاءاللہ اب بھی ہوں گی۔ انشاءاللہ ہمیں پانی ملے گا۔''

اس کے لہجے میں ایسا یقین تھا کہ وہ لوگ ماننے پر مجبور ہو گئے۔ ویسے بھی وہ انہیں تمام سہولتیں

فراہم کر رہا تھا اور وہ بھی بغیر کسی لالچ کے۔ سر چھپانے کو ٹھکانہ اور پیٹ بھرنے کو کھانا۔ اس ابتری کے عرصے میں یہ بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دربدر پھرنے میں بڑی کٹھنائیاں ہیں۔

عبدالحق شہر گیا اور پٹواری کی وساطت سے محکمہ زراعت و آب پاشی کے افسر سے ملا۔ افسر نے اس کی بات بڑی توجہ اور ہمدردی سے سنی۔ وہ اس سے متاثر بھی نظر آ رہا تھا۔ ''آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں عبدالحق صاحب۔''

''جی...... میں گریجویشن نہیں کر سکا۔ ایف اے پاس ہوں۔'' عبدالحق نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''آپ جیسے لوگوں کی تو سرکاری محکمے میں ضرورت ہے۔''

''فی الحال تو مجھے اپنے گاؤں کی فکر ہے جناب۔''

''بات یہ ہے عبدالحق صاحب کہ اس وقت ہمارے پاس وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایسے میں ہجرت کر کے آنے والوں کے بوجھ نے مسائل میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ آپ کا کیس میں سمجھ گیا ہوں۔ لال آندھی نے نہ صرف نہری رابطہ منقطع کر دیا۔ بلکہ زرعی اراضی کو صحرا میں تبدیل کر دیا ہے۔''

''نہری رابطہ بحال کیسے ہو گا؟''

''موجودہ صورت حال میں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ پانی بلندی سے نشیب کی طرف جاتا ہے نشیب سے بلندی کی طرف نہیں۔ اور آپ کا گاؤں پورے علاقے سے کم از کم بارہ پندرہ فٹ بلند ہو گیا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ؟''

عبدالحق کی سمجھ میں بات آ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب ہمارے پاس ایسے وسائل نہیں کہ ہم ریت میں دبے ہوئے گاؤں کو نکال سکیں۔ اور اس کے بغیر کچھ ہو نہیں سکتا۔''

''اگر میں یہ کام کر لوں تو؟''

''پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن یہ آپ کریں گے کیسے؟''

''کوشش کروں گا۔ اللہ سے امید ہے کہ کامیابی ہو گی۔''

وہ رخصت ہونے لگا تو افسر نے کہا۔ ''میری بات پر غور کیجیے گا۔ ہمارا ملک جس مرحلے سے گزر رہا ہے اسے آپ جیسے پڑھے لکھے جوانوں کی ضرورت ہے۔ ملک کے لیے کچھ کرنے کا ارادہ ہو تو مجھ سے مل لیجیے گا۔''

عبدالحق وہاں سے چلا آیا۔

❁ ❁ ❁

وہ اس پر سوچتا رہا۔ بظاہر یہ کام ناممکن تھا۔ ہزاروں ایکڑ زمین پر سے پندرہ فٹ ریت ہٹانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کے لیے مشینوں اور آلات کی ضرورت تھی۔ اور اس پر بھی اس میں وقت لگتا۔ اور مشینوں اور آلات کی اس میں استطاعت نہیں تھی۔

رقم تو وہ حویلی سے بھی خاصی لایا تھا۔ پھر اماں نے بھی دیے تھے لیکن وہ خرچ بھی تو کھلے دل سے کرتا رہا تھا۔ گاؤں کو آباد کرنے کے لیے اس نے بہت خرچ کیا تھا۔ اب بھی اس کے پاس اچھی خاصی رقم تھی لیکن جو مہم درپیش تھی اس کے لیے تو وہ بہت ہی کم تھی۔ پھر یہ سوچ کر اس کا دل دکھ رہا تھا کہ اب تک کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ ریت کے نیچے سے گاؤں کو نکالنے کا مطلب تھا کہ جو مکان اس نے بنوائے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔ اور گاؤں کے نکلنے کے بعد نئے سرے سے تعمیر ہوگی۔

وہ سوچتا رہا لیکن کوئی حل سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔

اول تو وہ پریشان ہوتا ہی نہیں تھا۔ فکرمند ہوتا تو وہ قرآن پڑھنے بیٹھ جاتا۔ قرآن میں اس کے لیے یہ عجیب تاثیر تھی کہ وہ ہر پریشانی بھول جاتا تھا۔ ایک اور نعمت مسجد کے امام مہر علی تھے۔ وہ ان کے پاس جا بیٹھتا۔

مہر علی بہت سادہ طبع اور دین سے بہت محبت کرنے والے تھے۔ ان کی طبیعت میں بہت نرمی اور حلیمی تھی۔

عبدالحق مہر علی کے پاس چلا گیا۔

"کیا بات ہے پتر۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" مہر علی نے پوچھا۔

عبدالحق نے انہیں پوری روداد سنائی۔ "اور میں نے پانی کا وعدہ کر کے لوگوں کو روکا تھا۔" اس نے آخر میں کہا۔

مہر علی چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ "دیکھو پتر! اللہ کے ہاں نیتیں چلتی ہیں۔ تمہاری نیت اچھی ہے تم نے جو کچھ کیا اور کر رہے ہو بے لوثی کے ساتھ کر رہے ہو۔ اس میں تمہاری کوئی غرض نہیں ہے۔ تو اللہ تمہاری مدد ضرور کرے گا۔"

"مگر کیسے؟ مجھے کوئی امکان نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"یہ امکاں تو ہم عقل والوں کی بات ہے۔ اللہ کے ہاں تو ہونی ہوتی ہے اور ہو جاتی ہے۔ چاہے بعد میں بھی بندوں کی سمجھ میں نہ آئے۔"

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ عمر اس کی کم تھی لیکن کتنا کچھ وہ دیکھ چکا تھا۔ اماں اس کی مثال تھیں۔ جہاں گاؤں کے گاؤں دفن ہو گئے وہاں اماں زندہ رہیں۔ اور وہ کیسے زندہ رہیں۔ کھجور کے وہ درخت اب بھی موجود ہیں۔ جن کے ذریعے سے اللہ نے اماں کو غذا فراہم کی۔ عبدالحق جانتا تھا

کہ وہ درخت اللہ کی قدرت کی نشانی ہیں۔ اس علاقے میں کھجور کم ہی ہوتا ہے۔ آگے سندھ کی طرف بہت ہے اور پھر کھجور کا درخت راتوں رات بڑا نہیں ہوتا۔ مگر اماں کو تو سب کچھ جیسے تیار ملا۔ پینے کے لیے پانی۔ وہ گھڑا جس میں پانی کم نہیں ہوتا تھا۔ تین دن تک تو اللہ کی اس قدرت کا ان سب نے مشاہدہ کیا تھا۔ اب سوچو اماں کے بچنے کا کوئی امکان تھا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ مگر اماں بچ گئیں اور موجود ہیں۔ یہ اللہ کی قدرت ہے۔ واقعی اللہ کے ہاں امکان نہیں ہوتا۔ ہونی ہوتی ہے اور ہو کر رہتی ہے۔

اور وہ خود کیسے بچا تھا۔ لال آندھی آئی تو وہ خود بھی تو اس کی حدوں میں تھا۔ ایک وقت ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی ریت میں زندہ دفن ہو جائے گا۔ اس کے جسم میں ہلنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ ریت اس پر برس رہی تھی۔ اور اب بھی وہ زندہ تھا۔

اتنا کچھ دیکھنے کے بعد بھی وہ امکان کی بات کرتا ہے! سچ ہے انسان پر جب کوئی بحران آتا ہے وہ اللہ کی پچھلی مہربانیاں اور نشانیاں بھول جاتا ہے۔ وہ مایوس ہو جاتا ہے اور اللہ کو پکارنے کی بجائے امکان کی جستجو میں اِدھر اُدھر سر ٹکراتا رہتا ہے۔

عبدالحق پہلے تو شرمندہ ہوا۔ پھر اس کے اندر ایک یقین ابھرا۔ اللہ کے حکم سے گاؤں ریت میں دفن ہوا تو اللہ کی مرضی ہے تو وہ ریت سے نکلے گا بھی۔ آباد بھی ہوگا۔ اور اگر اللہ کی یہ مرضی نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس رات عشا کے بعد وہ ٹہلتا ہوا حویلی کی طرف چلا گیا۔ وہاں وہ اس منڈیر پر بیٹھ گیا۔ دعا میں اس نے اللہ سے گاؤں کے لیے مدد مانگی تھی اور اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔ جیسے اب یہ معاملہ اس کا نہیں رہا ہے۔

حویلی کی چھت کی اس منڈیر پر بیٹھے بیٹھے وہ حویلی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کبھی وہاں کیسی رونق ہوتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بچپن کے منظر پھرنے لگے۔ بابا جی گھوڑا بنے ہوئے ہیں اور وہ ان کی پیٹھ پر سواری کر رہا ہے۔ ماتا جی بابا جی کا پسینے میں نہایا ہوا جسم تولیے سے خشک کر رہی ہیں اماں اسے دودھ کا پیالہ دے رہی ہیں۔

پھر اس نے جمال دین کو دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ گھوڑا بننے کی ذمہ داری چاچا جمال دین نے سنبھال لی تھی۔ اسے اپنا لکڑی کا گھوڑا یاد آیا۔ چاچا جمال دین نے کیسے اسے سجایا تھا۔

اور اسے اپنا کمرا یاد آیا۔ حویلی کا سب سے روشن اور ہوادار کمرا! سچ یہ ہے کہ وہ کمرا اسے بہت عزیز تھا۔ رہنے کی کوئی جگہ کبھی اسے اتنی اچھی نہیں لگی جتنا وہ کمرا لگتا تھا۔ اس کمرے میں کوئی بات تھی۔ اس میں عجیب سا سکون تھا۔ اور وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ کسی محبت کرنے والی مہربان ہستی کی موجودگی کا احساس!

اسے حیرت ہوئی کہ اس کمرے کو وہ کیسے بھولا ہوا تھا۔ اس نے کبھی اسے یاد ہی نہیں کیا۔ اس وقت وہ کمرا یاد آیا تو اس کا دل اس کمرے کے لیے مچلنے لگا۔ اس کا بس چلتا تو ریت ہٹا کر اس کمرے میں پہنچ جاتا۔

وہ خواہش بچکانہ حد تک شدید تھی۔ اس کے زیر اثر اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

اسے حویلی کا آخری حوالہ یاد آیا۔

حویلی کا احاطہ لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ اکثریت اجنبی لاشوں کی تھی۔ پھر اس میں اسے ویرجی کی لاش نظر آئی تھی اور پھر چاچا جمال دین اور کئی جاننے والوں کی لاشیں ملی تھیں۔

اس آخری روز وہ حویلی کے ہال سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ حویلی کے صدر دروازے پر دو لاشیں پڑی تھیں۔ اندر دیوار سے ٹک کر پتاجی بیٹھے تھے۔ وہ زندہ تھے ان کے قریب ہی مولوی برکت علی اور کیدار ناتھ کی لاشیں پڑی تھیں۔

وہ اس منظر کو تازہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یادوں میں وہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتا تھا لیکن ان یادوں سے دامن چھڑانا اس کے بس میں نہیں تھا وہ تو جیسے کسی ٹرانس میں تھا۔

اور اب تو وہ جیسے جیتا جاگتا منظر تھا!

وہ پتاجی کو لپٹائے بیٹھا تھا۔ ان سے بولا نہیں جا رہا تھا لیکن انہیں بہت باتیں کرنی تھیں۔ وقت بہت کم تھا۔ لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے۔ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اور بہت کچھ مبہم تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس وقت اس کا ذہن ٹھیک سے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مگر اب بھی اسے پتاجی کا کہا ہوا ایک ایک لفظ یاد تھا ایک بات طے تھی گاؤں پر جے پور والوں نے حملہ کیا تھا۔

اچانک اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پتاجی کی بات اسے یاد بھی آ گئی اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں نے جڑ کر جیسے مفہوم بھی پا لیا۔

پتاجی نے کہا تھا...... تہ خانے میں جو کچھ ہے' سب تمہارا ہے۔ تم دلی جا کر پڑھو۔ یہاں نہیں رکنا۔

تہ خانہ! سب کچھ!!

اچانک اس کا ذہن جیسے روشن ہو گیا۔ سب کچھ' اس کی سمجھ میں آنے لگا۔ تہ خانے میں تجوری تھی۔ زمین کے کاغذات کے علاوہ وہاں بھاری نقد رقم بھی ہو گی اور شاید سونا بھی۔ اور وہ سب کچھ اس کا تھا۔

یادوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس کھدائی کرا کے گاؤں کو برآمد کرانے کے وسائل نہیں تھے لیکن وہ وسائل حاصل ہو سکتے تھے۔ وہ

وسائل موجود تھے۔ بس انہیں پانے کی کوشش کرنی تھی۔

بس! حویلی کے تہ خانے تک رسائی حاصل کرنی تھی۔ اور اس کے لیے اس کے پاس وسائل موجود تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر وہ حویلی کو برآمد کرانے میں کامیاب ہو گیا تو گاؤں بھی برآمد ہو جائے گا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو اب پہلے کے مقابلے میں خوش تھی۔ اب اسے یہاں آئے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ وہ وہاں اور یہاں کی زندگی کا موازنہ کر سکتی تھی...... تقابلی جائزہ لے سکتی تھی۔ اور خوش وہ یوں تھی کہ اسے یہاں کی زندگی واضح طور پر اچھی لگی تھی۔

یہ ضرور تھا کہ وہاں کی زندگی آسان تھی اور یہاں کی سخت۔ لیکن وہ زندگی بے رنگ بھی تو تھی۔ جبکہ یہاں زندگی میں تمام کے تمام رنگ موجود تھے۔ وہاں ہر چیز میسر تھی۔ یہاں پانی بھی بہت بڑی نعمت تھا۔ وہاں موسم کی سختیاں نہیں تھیں۔ گرمی آئی تو ہلکے کپڑے پہن لیے۔ سردی آئی تو گرم کپڑے پہن لیے۔ یہاں موسم بے رحمی کی حد تک سخت تھا وہاں موسموں سے لطف لیا جاتا تھا۔ یہاں موسم آزمائش تھا۔

نور بانو نے بہت کم وقت میں سمجھ لیا کہ یہ کنوئیں کا فرق ہے۔ وہاں زندگی کا منظر بہت محدود تھا۔ وہاں دنیا چار دیواروں کے درمیان تھی۔ آسمان بے کراں نہیں تھا۔ صحن سے جو آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا تھا' وہی آسمان تھا۔ ہاں کبھی چھت پر چلے گئے تو آسمان دیکھ لیا۔ مگر یہاں کے آسمان کے مقابلے میں تو وہ بھی بہت چھوٹا تھا۔

نور بانو نے سمجھ لیا کہ وہ پنجرے میں قید پرندوں جیسی زندگی تھی۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز میسر تھی۔ کھانا' پینا' کپڑے' کتابیں سب کچھ تھا۔ وہ پڑھتی تھی' سمجھتی تھی۔ اس کے مطابق عمل بھی کرتی تھی لیکن وہ کچھ مشکل نہیں تھا۔ اللہ کے کسی حکم پر عمل کرنا اسے مشکل نہیں لگتا تھا۔ کم از کم اوتار سنگھ سے بلا ارادہ محبت سے پہلے تو صورت حال یہی تھی۔ وہ محبت ہوئی تو پہلی بار اسے احساس ہوا کہ یہ کام آسان نہیں۔ ورنہ وہ سمجھتی تھی کہ اللہ کے احکامات مانتے ہوئے بڑی آسانی سے زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ اور جب اوتار سنگھ کی محبت سے...... اپنے آپ سے لڑنا پڑا' تب بھی وہ صحیح معنوں میں نہیں سمجھ پائی۔ بلکہ وہ اور مغرور ہو گئی۔ وہ باجی کو حقیر سمجھنے لگی جو اپنی خواہش نفس سے لڑنے کی بجائے اس کے سامنے سپر ڈال بیٹھی تھیں۔ اس نے نہیں سمجھا کہ ملامت کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے۔ اور نفس سے لڑنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ زندگی کی ترغیبات سامنے موجود نہ ہوں تو نفس بے معنی ہے۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ جنت کا حصول نہایت آسان ہے۔

اب پردے ہی کو لو۔ وہاں پردے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ چھوٹے ٹھاکر سے پہلے تو وہاں کوئی ایسا تھا ہی نہیں' جس سے پردہ کیا جائے۔ باہر وہ نکلتی نہیں تھیں۔ آکا میاں موجود تھے۔

باہر کے تمام معاملات وہ دیکھتے۔ ضرورت کی ہر چیز پیسوں سے مل جاتی تھی۔ اس وقت تو اس نے کبھی ایسے نہیں سوچا۔ لیکن وہ سوچتی تھی کہ اگر آ کا میاں نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ بھابی نہ ہوتیں تو سودا سلف لانے کے لیے اماں کو بازار جانا پڑتا۔ تب پردہ ان کے لیے آزمائش ہوتا۔ اور اگر اماں بیمار ہو جاتیں تو اسے بازار جانا پڑتا۔ تب اس کی آزمائش ہوتی۔ وہ کیا کرتی۔ مردوں کے سامنے اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلتی۔ مگر دو چار بار جاتی تو اسے سمجھوتہ کرنا آ جاتا۔

یہاں کھلی فضا میں اسے آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔ پہلی بار وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کوئی اسے نہیں روکے گا۔ اب اسے اللہ کی پابندیوں کا خیال رکھنا ہے۔ اب یہ اس کے لیے آزمائش ہے۔ عبدالحق اس کے سامنے چلتا پھرتا ہے۔ وہ اسے کھل کر، نظر بھر کر نہیں دیکھتی لیکن چوری چوری دیکھتی ہے۔ اسے نہیں یاد رہتا کہ اللہ نگاہوں کی چوری سے بھی باخبر ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اب ہوئی نا مشکل۔

پردہ تو یہاں بھی ہوتا تھا۔ اسی کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں آیا کہ اصل میں پردہ کیا ہے۔ یہاں زندگی ایسی تھی کہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ ان کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ گھر کے باہر بہت سے کام عورتوں کو کرنے پڑتے تھے۔ وہ پردہ کرتی تھیں۔ پردے کا اہتمام نہیں کرتی تھیں۔ وہ گھونگھٹ اس طرح نکالتیں کہ ان کا چہرہ چھپ جاتا۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ پردہ برقع پہننے کا نام نہیں ہے۔ برقع پہنے بغیر بھی پردہ کیا جا سکتا ہے۔ پردہ خود کو اس طرح رکھنے اور چلنے پھرنے کا نام ہے کہ کم از کم آپ کے جسم کے حوالے سے کسی شخص کے ذہن میں کوئی سفلہ خیال نہ پیدا ہو۔ کم از کم آپ کی کسی کوتاہی اور بے پروائی کی وجہ سے ایسا نہ ہو۔ سچ یہ ہے کہ اسے چادر برقعے کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگی۔

پھر پہلی بار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہر چیز کے دو رخ ہیں...... ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ ظاہری رخ سے آپ دنیا دکھاوا تو کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی نظر میں اچھے تو بن سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ اس کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے باطن کو صاف کرنا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے ظاہری پردے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اہمیت باطنی پردے کی ہے۔ اگر وہ عبدالحق کے سامنے نہیں آتی لیکن چھپ چھپ کر اسے دیکھتی ہے تو پردہ بے کار ہے۔ اگر وہ برقع اوڑھ کر خود کو نمایاں کرتی ہے تو وہ سزا کی مستحق ہے۔

ان سوچوں کے نتیجے میں اس کے اندر تبدیلیاں آئیں۔ ویسے بھی وہ ایک بالکل مختلف معاشرت میں چلی آئی تھی۔ ایسے میں یا تو آدمی اس نئی معاشرت کو یکسر مسترد کر دیتا ہے۔ یا پھر خود کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کے ذہن میں تو ایک لمحے کے لیے بھی اس معاشرت کو مسترد کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اسے مطابقت تو پیدا کرنی تھی۔ اسے پتا چل رہا

تھا کہ اس کے ذہن میں دین کی تفہیم پیدا ہو رہی ہے۔

وہ یہاں چولی اور گھا گھرے میں آتی تھی، جو یہاں کا خاص لباس تھا۔ اسے حجاب تو آیا تھا لیکن اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ پہلی بار بے پردہ باہر نکلی تھی۔ بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ اسے وہ لباس برا نہیں لگا تھا۔ بلکہ اچھا لگا تھا۔ پھر یہاں اس نے حمیدہ کو اسی لباس میں دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ یہ لباس غیر اسلامی نہیں ہے۔ اور حمیدہ خود کو چادر میں اس طرح لپیٹتی تھی کہ اس کے سامنے برقع بے حیثیت لگتا تھا۔

چنانچہ اس کے بعد اس نے چولی اور گھا گھرا شوق سے پہنا۔ عبدالحق اس کے لیے عید کے کپڑے شہر سے لایا تھا لیکن ساتھ چادر بھی تھی۔ اس نے حمیدہ کی باقاعدہ تقلید شروع کر دی۔

وہ رابعہ کو روز قرآن پڑھاتی تھی اسے اسلامی معاشرت کے بارے میں بتاتی تھی۔ مگر ساتھ ہی وہ باہر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی۔ اس کے علاوہ وہ کھانا بہت شوق سے پکاتی تھی۔ وہ سب اس کے ہاتھ کے کھانے کے عادی ہو گئے۔ خاص طور پر حمیدہ۔ اس نے دلی کے کھانے بھلا کب کھائے تھے۔

ابتدا میں تو اسے عبدالحق سے بہت حجاب آتا تھا۔ پھر چادر لے کر، گھونگٹ نکال کر وہ بلا جھجک اس کے سامنے سے گزرنے لگی۔ ہاں اس کی موجودگی میں چلتے پھرتے اس کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ ان کی لے ہی بدل جاتی تھی...... اور قدموں میں تیزی کے ساتھ لڑکھڑاہٹ بھی آ جاتی تھی۔ مگر وہ سب کچھ بے حد خوش گوار ہوتا تھا۔

پھر اور لوگ آئے اور عبدالحق نے انہیں روک لیا۔ عید بہت اچھی ہو گئی۔ شروع میں تو ایک فیملی کی طرح رہے۔ بعد میں عبدالحق نے ان کے لیے الگ کچے مکان بنوا دیے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں اور سب کی سب بہت خوب صورت تھیں۔

عورتوں میں ایک جبلی حس ہوتی ہے۔ بہت سی باتیں وہ بغیر کہے جان لیتی ہیں۔ نور بانو بھی جان گئی کہ ان میں سے ہر لڑکی عبدالحق میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں تھا۔ عبدالحق تھا ہی ایسا۔ لیکن نور بانو بھڑک گئی۔ اب تک وہ مسابقت سے محفوظ تھی لیکن اب مسابقت درپیش تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پہلی کمزوری تو یہ تھی کہ عبدالحق پر اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ تو یہی جانتی تھی کہ عبدالحق کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں مگر اسے اپنی محبت کی خاطر اسے ان لڑکیوں سے محفوظ رکھنا تھا۔

چادر اوڑھنے کا سلیقہ اس نے حمیدہ سے سیکھ لیا تھا۔ وہ باہر نکلنے لگی۔ چند ہی دنوں میں اس کی جھجک ختم ہو گئی...... وہ چادر کو چہرے پر اس طرح لیتی کہ اس کا چہرہ چھپ جاتا لیکن عبدالحق قریب ہوتا تو جیسے اس کا پلو خود بہ خود سرک جاتا۔ کبھی کوئی لڑکی عبدالحق کے آس پاس ہوتی اور اسے اپنے

وجود کا احساس دلانے کی کوشش کررہی ہوتی تو وہ اسے پکارتی اور کسی کام کا کہہ کر وہاں سے ہٹا دیتی۔ وہاں وہ سب کے لیے بڑی محترم تھی۔ وہ سب اسے ملکہ سمجھتے تھے۔ اس کی بات کی تعمیل کرنا ان پر فرض تھا۔ بلکہ وہ اس پر حیران ہوتیں کہ نور بانو پانی بھرنے کے لیے کنویں پر کیوں جارہی ہے۔ جبکہ وہ اس کام کے لیے حاضر ہیں۔

اس دوران اسے ایک اطمینان ہوگیا۔ عبدالحق خواتین کی موجودگی میں نظریں اٹھانے کا قائل ہی نہیں تھا۔ اور ایک اس میں بڑی بات یہ تھی کہ وہ دیکھتا تو کھل کر دیکھتا۔ کن انکھیوں سے چھپکے چھپکے اسے دیکھنا آتا ہی نہیں تھا۔

کبھی وہ سوچتی کہ یہ سب کچھ وہ کیوں کررہی ہے۔ جبکہ اس کا کوئی امکان بھی نہیں کہ عبدالحق اس کی طرف ملتفت ہوگا۔ لیکن مذہب کی دیوار گر جانے کے بعد اس کے پاس اپنی محبت سے لڑنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ اب وہ اس محبت میں بہنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ بلکہ اب تو اس کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ معاشرت کی یہ تبدیلی بھی اس نے عبدالحق کی محبت میں قبول کی ہے...... یہ سوچ کر وہ اس کے محبوب کی معاشرت ہے۔

پھر اس کے لیے مسابقت کا مسئلہ بھی نہیں رہا۔ عبدالحق گاؤں کی بہتری کی فکر میں ایسا مصروف ہوا کہ اس کی ایک جھلک دیکھنا بھی مسئلہ بن گیا۔ بس دو وقت وہ حمیدہ سے ملنے ضرور آتا تھا۔ صبح سویرے اور رات کو سونے سے پہلے۔

ادھر زبیر نے نیاز کے ساتھ مل کر بکریاں پالیں تو اسے ایک مشغلہ مل گیا۔ رابعہ بکریوں کا خیال رکھتی تھی۔ نور بانو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ بکریاں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ ان کے چارہ بناتی، پانی بھرتی۔ پہلی بار اس نے جانور دیکھتے تھے۔ گائیں تو خیر اسے گندی لگتی تھیں اور وہ ان سے گھبراتی تھی لیکن بکریوں کی طرف اس کا دل کھنچتا تھا۔

پھر پہلی بکری نے بچے دیے تو وہ اس کے لیے بہت خوب صورت دن تھا۔ وہ اتنے خوب صورت، اتنے نرم بچے۔ ان سے تو اسے پہلی نظر میں محبت ہوگئی۔ وہ انہیں اچنبھے سے دیکھتی اور سوچتی...... زندگی ایسی ہوتی ہے، ایسے شروع ہوتی ہے اور اتنی خوبصورت ہوتی ہے۔ بکری کے وہ دونوں بچے اس کے کھلونے بن گئے۔

ان کی رفتار دیکھ دیکھ کر وہ حیران ہوتی۔

"یہ دونوں بچے مجھے چاہئیں آپا۔" اس نے رابعہ سے کہا۔

"تو آپ رکھ لیں منجھلی بی بی۔"

"ایسے نہیں بلکہ باقاعدہ میرے۔ تم زبیر بھائی سے بات کرو میں ان کی قیمت ادا کروں گی۔"

"وہ آپ سے پیسے لیں گے! انہیں منجھلی بی بی...... وہ مجھ پر خفا ہوں گے۔"

لیکن نور بانو نہ مانی۔ پہلی بار اس نے اپنی رقم میں سے کچھ نکالا اور ان بچوں کی قیمت ادا کردی۔

اب وہ بچے اس کے تھے۔

اسے پتا ہی نہیں تھا کہ کھلی آب و ہوا کی یہ صحرائی زندگی اس پر کیا اثرات مرتب کررہی ہے۔

مگر اس دن آئینہ دیکھتے ہوئے اسے تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے عکس کو غور سے دیکھا اور حیران رہ گئی۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہ ہے۔ اس نے غور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اتنی تبدیل ہوچکی ہے۔ وہ سحر زدہ سی اپنے عکس کو دیکھتی رہی۔

اس کی رنگت تو شروع ہی سے سانولی تھی۔ مگر اب اس کی جلد چمک دار اور چکنی ہوگئی تھی۔ اور آنکھیں تو اس کی اپنی لگ ہی نہیں رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں اب صحراؤں کی وسعت اور پنہائیاں تھیں۔ ان میں نجانے کہاں سے گہرائی آگئی تھی۔ اور اس کا استخوانی چہرہ بھر گیا تھا۔ اور خوب صورت لگ رہا تھا۔

آئینے سے نظریں ہٹانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن اب وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ تبدیلی چہرے تک محدود ہے یا وہ جسمانی طور پر بھی تبدیل ہوئی ہے۔ ہاتھوں پر ایک نظر ڈالتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھ گیا تھا لیکن وہ موٹی ہرگز نہیں ہوئی تھی۔

پہلی بار اسے اپنا آپ بہت اچھا لگا۔ پہلی بار وہ بہت گہرائی میں اترے ہوئے اپنے احساسِ کمتری کی قید سے آزاد ہوئی، اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ ہے مگر اب جو کچھ وہ تھی، وہ یہاں آکر بنی تھی۔ یہ یہاں کی آزاد فضاؤں، وسیع زمین اور کھلے آسمان کا کرشمہ تھا۔ یہ باہر نکل کر باہر کے کام کرنے کی وجہ سے تھا کہ اس کے جسم کو صحت مندی اور مضبوطی ملی تھی۔

پہلی بار اس کے دل نے خلوص اور سچائی سے نعرہ لگایا...... پاکستان زندہ باد!

اس روز وہ باہر نکلی تو اس کی چال بدلی ہوئی تھی۔

❀......❀......❀

عبدالحق کے پاس جو کچھ بھی تھا، اس نے وہ سب حویلی میں جھونکنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کا مقصد کم سے کم وقت میں حویلی کے تہ خانے تک پہنچنا تھا۔ اس کے لیے وہ شہر سے مزدور لایا اور دو ٹریکٹر بھی۔

گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ گاؤں میں جو کاشت کار گھرانے تھے، وہ پانی کے امکان کی طرف سے مایوس ہوچکے تھے۔ انہیں عبدالحق سے موہوم سی امید تھی کہ وہ ریت ہٹوائے گا تو نہری نظام بحال ہوگا۔ حالانکہ یہ بہت

مشکل کام تھا لیکن انسان جبلی طور پر پُر امید ہوتا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ معجزہ رُونما ہوگا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ صرف حویلی کو برآمد کرانے کے لیے کھدائی کر رہا ہے تو وہ مایوس ہوگئے۔

وہ سب عبدالحق کے احسان مند تھے۔ بے سروسامانی اور غریب الوطنی کے عالم میں اس نے انہیں وہ سب کچھ دیا تھا' جو کوئی انہیں نہیں دے سکتا تھا۔ جبکہ اسے ان سے کوئی لالچ' کوئی غرض نہیں تھی۔

تو اب وہ اس سے شکایت نہیں کر سکتے تھے وہ اس سے منہ پھیر کر تو نہیں جاسکتے تھے۔ لیکن ان کے لیے نئی مملکت میں اپنے مستقبل کو تلاش کرنا بہت ضروری تھا۔ کیونکہ گاؤں میں پانی نہیں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اور پانی کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔
چنانچہ اپنے گھر والوں کو گاؤں میں چھوڑ کر وہ نئے امکانات کی تلاش میں شہر کی طرف چل دیے۔

گاؤں میں مٹی ہٹانے کا کام بہت تیزی سے شروع ہوا۔ عبدالحق نے بڑے پیمانے پر کام شروع کرایا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے بھی لوگوں کی مایوسی محسوس کرلی تھی اور وہ جلد از جلد گاؤں کے لیے پانی کی فراہمی شروع کرانا چاہتا تھا۔
کام شروع ہوا تو عبدالحق کو ایک اور اہم کام کے لیے فرصت مل گئی۔ وہ اہم کام تھا اماں کی آنکھوں کا علاج۔ شہر میں ایک بڑے ڈاکٹر سے اس نے بات کی تھی۔ بس اسے اب اماں کو وہاں لے جانا تھا۔

حویلی برآمد کرانے کے کام کی دیکھ بھال زبیر بخوبی کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ حویلی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ عبدالحق نے اس عرصے میں اماں کو لے کر شہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔
ڈاکٹر نے حمیدہ کی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کا تجزیہ بے حد حوصلہ افزا تھا۔
''ڈاکٹر صاحب' اماں کی آنکھیں ٹھیک ہوسکتی ہیں نا۔'' عبدالحق نے پوچھا۔ وہ نروس ہورہا تھا۔ اس کے لیے اماں کی آنکھوں کی بڑی اہمیت تھی۔
''انشاءاللہ' ٹھیک ہوجائیں گی۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل ابتدا میں کوتاہی نہ ہوتی تو یہ مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ انہیں آنکھوں کو خوب اچھی طرح دھوتے رہنا چاہیے تھا۔ آنکھیں آپ ہی دھل کر صاف ہوجاتیں۔''
''تو اب آپ کیا تجویز کریں گے؟''
میں ایک دوا لکھ رہا ہوں۔ تین دن تک یہ آنکھوں میں ڈالیں۔ اس کے بعد معائنہ کر کے ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔''

۔ عبدالحق نے اماں کو گاؤں واپس لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ ایک تو وہ انہیں بار بار سفر کی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ اس مسئلے کو حل کر کے ہی واپس جانا چاہتا تھا۔ وہ وہیں مقیم ہوگیا۔
ڈاکٹر نے دن میں تین بار آنکھوں میں دوا ڈالنے کی ہدایت کی تھی۔ لیکن عبدالحق نے پہلی بار ہی دوا ڈالی تو حمیدہ تڑپ کر رہ گئی۔ صابر عورت تھی۔ اس لیے شکایت تو نہیں کی۔ بس اتنا ہی۔
''پتر...... تم مل گئے ہو تو مجھے آنکھوں کی کیا ضرورت ہے۔ اور بینائی چلی جائے تو واپس نہیں آتی۔''
''ایسی بات نہیں ہے اماں۔'' عبدالحق بولا۔ ''ڈاکٹر نے کہا ہے تو انشاءاللہ تم دیکھ سکو گی۔ بس تین دن برداشت کرلو۔''
مگر حمیدہ کی آنکھوں میں تو جیسے آگ لگ گئی تھی۔ آنکھوں کے ڈھیلوں میں درد بھی بہت شدید ہوگیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا' جیسے انہیں کھرچا جارہا ہو۔ لیکن عبدالحق کی محبت میں وہ برداشت کر رہی تھی۔ پھر بھی وہ آنکھوں کو ملے بغیر نہ رہ سکی۔
اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ عبدالحق نے رومال سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔ وہ ٹیالے رنگ کا پانی تھا۔
تیسری صبح ایک عجیب بات ہوئی۔ عبدالحق حمیدہ کی طرف پانی کا گلاس بڑھا رہا تھا کہ حمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر گلاس سے ذرا پیچھے روکا اور لرزتی ہوئی ہیجانی آواز میں بولی۔ ''پتر...... یہ گلاس ہے نا۔''
''ہاں اماں۔''
حمیدہ نے گلاس کو چھوا۔ اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ گلاس تھامنے کی بجائے اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ''...... یہ تمہاری ناک...... یہ ہونٹ...... یہ آنکھیں ہیں۔''
عبدالحق کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''تم دیکھ رہی ہو اماں۔ تمہیں نظر آرہا ہے نا؟'' اس کے لہجے میں یقین اور بے یقینی کا امتزاج تھا۔
''ہاں پتر۔ دھندلا دھندلا سا نظر آرہا ہے مجھے۔''
اب تو یہ کھیل ہوگیا۔ حمیدہ کسی چیز کو چھوتی' اس کا نام بتاتی پھر وہ دونوں خوش ہوتے۔ پھر حمیدہ نے آنکھوں پر زور دیتے ہوئے عبدالحق کو بہت غور سے دیکھا۔ ''ارے پتر...... تو کتنا بڑا ہوگیا۔ کتنا خوبصورت نکلا ہے تو۔ ارے تُو تو پورا مرد بن گیا ہے۔'' اور اس نے عبدالحق کو لپٹا لیا۔
وہ پہلا دن تھا کہ حمیدہ نے شوق سے آنکھوں میں دوا ڈلوائی۔ ویسے تو اب تکلیف پہلے جیسی تھی بھی نہیں۔ لیکن اب اسے یقین تھا کہ اللہ اسے اس کی بینائی واپس دے رہا ہے۔
تین دن پورے ہونے پر عبدالحق اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر بہت خوش ہوا۔ ''مجھے

یقین تھا کہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے' آپریشن کی نوبت نہیں آئے گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"شروع میں بہت تکلیف ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب۔"

"وہ تو ہونی ہی تھی۔ دراصل آپ کی اماں کی آنکھوں میں جو ریت بھر گئی تھی' وہ صاف نہ ہونے کی وجہ سے جم کر سخت ہو گئی۔ ابتدا میں دوا نے اسے نرم کرنے کا کام کیا تو تکلیف ہوئی۔ نرم ہونے کے بعد وہ ریت اکھڑ کر بہنے لگی۔ ہر بار دوا ڈالنے پر مرحلہ آسان ہوا ہوگا۔"

"جی ہاں۔"

"مگر مجھے بس دھندلا دھندلا سا دکھائی دیتا ہے' صاف نہیں۔" حمیدہ نے کہا۔

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ "برسوں کی جمی ہوئی ریت ہے اماں۔ آنکھ صاف ہونے میں وقت لگے گا۔ بس دوا ڈالتی رہیں۔ اور ہاں عرق گلاب بھی ڈالتے رہیں۔ اس سے دکھن کم ہوگی اور آنکھوں کو آرام ملے گا۔"

"آپ معائنہ تو کر لیں ڈاکٹر صاحب۔" عبدالحق نے کہا۔ "دیکھ لیں۔ کیا پتا، آپریشن کی ضرورت ہو۔"

ڈاکٹر نے حمیدہ کی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ "نہیں...... آپریشن کی ضرورت نہیں۔ سیدھا سا معاملہ ہے۔ بس یہ دوا اور عرق گلاب ڈالتے رہیں۔"

"ہمیں یہیں رکنا ہوگا۔" عبدالحق نے پوچھا۔

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ البتہ احتیاط کرنا ہوگی۔ ایک تو یاد رکھیں کہ دوا مسلسل سات دن سے زیادہ نہ ڈالیں۔ سات دن ہو جائیں تو تین چار دن کا وقفہ کر دیں۔ عرق گلاب مگر باقاعدہ ڈالتے رہیں۔ اس کے علاوہ آنکھوں کو تیز چمک سے بچانا ہوگا۔ اس کے لیے رنگین شیشوں کا چشمہ لگائیں۔ ورنہ آنکھوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

عبدالحق اور حمیدہ گاؤں واپس آئے تو بہت خوش تھے۔

❁ ❁ ❁
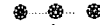
حمیدہ کو سب سے زیادہ اشتیاق نور بانو کو دیکھنے کا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ جیسا اس نے سوچا تھا' وہ اس سے بڑھ کر ہی تھی۔

حمیدہ نے عبدالحق کو منع کر دیا تھا کہ وہ گاؤں میں کسی کو بھی اس کی بینائی کی جزوی بحالی کے بارے میں نہ بتائے۔ لہٰذا نور بانو کو معلوم بھی نہیں تھا کہ حمیدہ اسے دیکھ رہی ہے۔

حمیدہ کو چشمے سے بہت الجھن ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ چشمہ لگانے کی عادی نہیں تھی۔ چشمہ اسے بوجھ لگتا تھا۔ دوسرے چشمہ لگا کر اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ لیکن جب اس

نے دن کی روشنی میں چشمہ اتارا تو گھبرا گئی۔ دن کی روشنی اور وہ بھی صحرائی علاقے میں...... وہ تو صحت مند آنکھوں کے لیے بھی آزمائش بن جاتی ہے۔ وہ تو ایک طرح سے چھلی ہوئی آنکھیں تھیں۔ روشنی اس کی آنکھوں میں بری طرح چبھی اور ایک لمحے کے بعد اسے گھپ اندھیرا نظر آنے لگا۔ وہ ڈر گئی کہ شاید بینائی بحال ہونے سے پہلے وہ پوری طرح اندھی ہو گئی ہے۔ اس نے گھبرا کر دوبارہ چشمہ لگا لیا۔ مگر آنکھوں کی وہی کیفیت تھی۔ اور وہ اپنی حماقت پر پچھتانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس بار چشمہ لگانے پر چشمے کی ایک افادیت اس کی سمجھ میں آئی۔ چشمہ لگانے پر ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہوگا۔ مگر کیونکہ وہ چشمے کو بوجھ سمجھتی تھی' اس لیے یہ احساس اس کے شعور تک نہیں پہنچا تھا لیکن اس بار اس کی سمجھ میں آ گیا۔

چند لمحے بعد اس کا خوف دور ہو گیا۔ کیونکہ اسے پہلے جیسا ہی نظر آ رہا تھا۔ جیسے وہ رات میں سب کچھ دیکھ رہی ہو۔ اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور چشمے پر قانع ہو گئی۔

وہ اس کے لیے بڑا دلچسپ عرصہ تھا۔ اسے ہر طرح کے مشاہدے کا موقع مل رہا تھا۔ خاص طور پر نور بانو کو بہت قریب بٹھا کر وہ اس سے خوب باتیں کرتی اور بڑے غور سے دیکھتی۔ وہ اس سے اس کی دہلی کی زندگی کے بارے میں پوچھتی۔ نور بانو کو ماضی میں جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ماضی میں وہ اذیتیں تھیں' وہ دکھ تھے' جنہیں وہ بھول جانا چاہتی تھی۔ اس نے حمیدہ کو اپنے گھر اور گھر والوں پر گزرنے والے سانحے کے بارے میں بتایا تو مگر بہنوں کی آبروریزی والی تفصیل گول کر گئی۔

حمیدہ کو بھی اندازہ ہو گیا کہ نور بانو اپنے دکھ بھول جانا چاہتی ہے۔ اس نے اس کے ماضی کو کریدنا چھوڑ دیا۔ نور بانو نے جو کچھ اسے بتایا تھا' اس سے وہ اس کے پچھلے رہن سہن کے بارے میں جان گئی تھی۔ اسے احساس تھا کہ یہ لڑکی بہت بڑی تبدیلی سے گزری ہے۔

وہاں اور لڑکیاں بھی تھیں اور وہ سب بنیادی طور پر اسی ماحول کی تھیں لیکن حمیدہ کو عبدالحق کے لیے یہ شہری لڑکی ہی بھائی تھی۔ نجانے اس میں ایسی کیا بات تھی۔

ایک دن حمیدہ نے نور بانو سے پوچھا۔ "یہاں کی زندگی تو تمہیں بہت سخت لگتی ہوگی؟"

"سخت تو ہے اماں' لیکن اتنی سخت بھی نہیں۔ بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ آدمی کو یہ سب کچھ آنا چاہیے۔" نور بانو نے جواب دیا۔

"پھر بھی تمہارا من تو شہر میں زندگی گزارنے کو چاہتا ہوگا۔"

"نہیں اماں۔ یہاں مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں آ کر مجھے لگا ہے کہ میں نے خود کو اب جانا ہے۔ میں تو خود کو جانتی ہی نہیں تھی۔ یہاں کی مصروفیت مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ وہاں خالی پن کا احساس ہوتا تھا۔"

"عبدالحق کو کب سے جانتی ہو؟"

"جی......وہ......جی نہیں......میں کہاں......" نوربانو بری طرح گڑبڑا گئی۔

"تو تم نے اسے پہلے دیکھا ہی نہیں تھا!"

"نن......نہیں......ایک بار دیکھا تھا۔ وہ ہمارے ہاں تو پردہ تھا نا......بہت سخت پردہ۔"

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اُس کے چہرے کے تاثرات وہ نہیں دیکھ سکی۔ کاش......وہ پہلے کی طرح دیکھ سکتی ہوتی۔ اسے محرومی کا احساس ہونے لگا۔ پھر بھی زبان کی لڑکھڑاہٹ بھی بہت کچھ بتا رہی تھی۔ حمیدہ نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکی عبدالحق کو بہت پہلے سے پسند کرتی ہے۔

حمیدہ نے اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کہ حیا کی وجہ سے کہیں اُس لڑکی کے منہ سے ایسی بات نہ نکل جائے جو اِن دونوں کی شادی کے راستے کی رکاوٹ بن جائے۔ اس کے بجائے وہ عبدالحق کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

نوربانو کے لیے وہ من پسند موضوع تھا۔ وہ عبدالحق کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق حویلی کے کام کی نگرانی میں بری طرح مصروف ہو گیا تھا۔ اسے کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ بس ایک بات وہ پوری ذمے داری کے ساتھ یاد رکھتا تھا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں دوا ڈالنا۔

اس شام وہ تھکا ہارا حمیدہ کے پاس پہنچا۔ دوا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو حمیدہ نے کہا۔ "دوا تو میں ڈال چکی ہوں۔"

"خود ڈال لی دوا؟" عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میرے بس کا یہ کہاں ہے۔ نوربانو نے ڈال دی تھی۔ وہ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔"

عبدالحق کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ "چلو ٹھیک ہے اماں۔ میں آج کل بہت مصروف ہوتا ہوں۔ تم ان سے ہی دوا ڈلوا لیا کرو۔"

حمیدہ نے اس وقت چشمہ اتارا ہوا تھا۔ "یہ تم نے اپنا حال کیا کر لیا ہے پتر۔"

"بس اماں، دو چار دن کی بات ہے۔ پھر فرصت مل جائے گی۔"

"تم نے تو خود کو بہت مصروف کر لیا ہے پتر اور میں کہتی ہوں کہ حویلی کو نکالنا اچھا نہیں ہے۔"

عبدالحق بری طرح چونکا۔ "کیوں اماں؟"

"وہ آندھی اللہ کا قہر تھی۔ اور جہاں اللہ کا قہر آئے، اُس جگہ سے دور رہنا اچھا ہوتا ہے۔ میں تو

کہتی ہوں، دبا رہنے دے وہ سب کچھ۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ مگر اُس کا دل نہیں مانا۔ "دیکھو اماں، اب یہ جگہ پاکستان میں ہے اور جب تک ریت نہیں ہٹتی، بے کار ہے۔ جبکہ ہندوستان سے لوگ پاکستان اور اسلام کی محبت میں اپنے گھر، زمین جائیداد چھوڑ کر بے سروسامان چلے آ رہے ہیں۔ تو میں سوچتا ہوں کہ اس پر ان کا حق ہے۔ وہ یہاں آباد ہوں، انہیں زمین ملے، وہ کاشت کاری کریں۔ اچھی زندگی گزاریں۔ میں یہ سب ان لوگوں کے لیے کر رہا ہوں۔"

"تو اس کے لیے تو دبے ہوئے گاؤں نکالنے ہوں گے۔"

"ہاں اماں۔ اور اُس کے لیے بہت پیسہ چاہیے۔ اسی لیے تو میں پہلے حویلی نکال رہا ہوں۔ وہاں سے مجھے پیسہ بھی ملے گا اور زمین کے کاغذات بھی۔ پھر میں یہ دوسرا کام شروع کراؤں گا۔"

"بات تو اچھی ہے پتر۔ پر کام بہت بڑا اور مشکل ہے۔"

"اللہ سے دعا کرتی رہو اماں۔ انشاءاللہ ہو جائے گا۔"

"مجھے تو اب بس تیری شادی کی فکر ہے پتر۔ تو اتنے لمبے بکھیڑوں میں نہ پڑ۔"

"اماں، میں تو بس اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شادی کا کیا ہے۔ وہ بھی ہو جائے گی۔"

"کوئی لڑکی پسند ہے تجھے؟"

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ "ارے نہیں اماں۔ وقت آنے پر تم ہی دیکھ لینا کوئی لڑکی۔"

"میں نے تو پہلے ہی دیکھی ہوئی ہے۔ بس یہ نوربانو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ تجھے کیسی لگتی ہے؟"

"اچھا برا لگنے کی بات نہیں اماں۔ وہ تو ہیں ہی اچھی۔" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن اماں، تم ان کے بارے میں ایسے نہ سوچا کرو۔ میں انہیں اس وعدے پر ساتھ لایا ہوں کہ ان کے رشتے داروں کو تلاش کروں گا اور انہیں ان تک پہنچاؤں گا۔ وہ بس ہمارے ہاں مہمان ہیں اماں۔"

یہ کہتے ہوئے اُس کے لہجے میں ایسی اداسی تھی کہ حمیدہ کا دل کٹنے لگا۔ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اپنی اپنی محبت میں گم ہیں......دوسرے کے دل سے بے خبر۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسرے کی محبت کے قابل نہیں۔ اس نے سوچ لیا کہ انہیں ملانا اُس کا کام ہے۔

❁ ❁ ❁

بالآخر حویلی یوں نمودار ہوئی، جیسے چند برس پہلے وہ سطح زمین پر تھی۔

عبدالحق کو پہلی بار مٹی کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ پہلے وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ مٹی پتھر کو بھی چاٹ جاتی ہے۔ وسیع و عریض حویلی کی تعمیر بڑی مضبوط تھی۔ اپنے زمانے میں اسے دیکھ کر اُس کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ مگر اب وہ ایک کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ چھتیں تو تمام بیٹھ چکی تھیں۔ بیشتر دیواروں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ سے دھکیلو تو ڈھے جائیں۔ یہ بڑی بات تھی کہ چند کمرے اچھی حالت میں تھے۔ ان میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی خواب گاہ اور عبدالحق کا کمرا شامل تھا جو اسے بہت پسند تھا لیکن چھتوں سے وہ بھی محروم ہو گئے تھے۔

وہاں پہلا سب سے بڑا کام ان سینکڑوں ڈھانچوں سے نمٹنا تھا' جو ریت کے نیچے سے برآمد ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر عبدالحق تھرا گیا۔ یہ ہے زندگی اور یہ ہے زندگی کا انجام۔ اُس نے سوچا۔ ان ڈھانچوں کی کوئی شناخت نہیں تھی۔ وہ خود اپنے باپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

ان ڈھانچوں کو اجتماعی طور پر زمین میں دبا دیا گیا۔

عبدالحق نے مزدوروں اور ٹریکٹروں کو واپس نہیں جانے دیا۔ بلکہ انہیں آگے کے کام پر لگا دیا۔ اب تو اسے مزدوروں اور ٹریکٹروں کی تعداد میں اور اضافہ کرنا تھا۔ اپنے گاؤں کو دوبارہ آباد کرنا اُس کا خواب بن گیا تھا۔

اس شام کو وہ بہت خوش خوش حمیدہ کے پاس پہنچا۔ ''اماں...... حویلی پوری طرح نکل آئی ہے۔''

''مبارک ہو پتر۔ اور مجھے لگ رہا ہے کہ اب میں سب کچھ پوری طرح دیکھ سکتی ہوں۔'' حمیدہ نے کہا۔

''اماں...... دیکھنے نہیں چلو گی؟'' اُس کے لہجے میں دبا دبا ہیجان تھا۔

نور بانو کچھ فاصلے پر بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھی۔

حمیدہ اللہ کے قہر کے حوالے سے خوف زدہ تھی لیکن بیٹا خوش تھا تو وہ انکار کیسے کر سکتی تھی۔ بس اسے ڈھارس یہ تھی کہ عبدالحق نے یہ سب کچھ ایک بہت بڑے اور نیک مقصد کے لیے کیا ہے۔

''کیوں نہیں پتر۔ ضرور چلوں گی۔''

''تو آؤ نا اماں۔''

حمیدہ اٹھ کر اُس کے ساتھ چلی۔ نور بانو پر نظر پڑی تو اُس نے کہا۔ ''چل دھیے' تو بھی آجا۔''

نور بانو کچھ جھجکی' کچھ شرمائی۔ مگر حویلی دیکھنے کی اسے آرزو تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ حویلی کو دیکھ کر عبدالحق کے بارے میں کچھ اور جاننے کا موقع ملے گا۔ اس نے حمیدہ کا ہاتھ تھام لیا۔

''رابعہ کہاں ہے؟'' باہر نکل کر عبدالحق نے کہا۔

''یہیں کہیں ہوگی۔ پر زبیر کہاں ہے......؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''زبیر کو تو میں وہاں چھوڑ کر آیا ہوں۔ رابعہ کو لینا ہے۔''

رابعہ جانوروں کے باڑے سے نکلتی دکھائی دی۔ عبدالحق نے اُسے بھی ساتھ لے لیا۔

وہ سب حویلی کے کھنڈر کی طرف بڑھ گئے۔

❁ ❁ ❁

حویلی کی حدود میں وہ چار افراد افراد نہیں رہے' کردار بن گئے۔ انہیں وہاں گزرے ہوئے لمحے اور واقعات یاد آ رہے تھے۔ وہ ایسی تنویمی کیفیت میں تھے کہ بلند آواز میں واقعات کو دہراتے اور انہیں خیال بھی نہ ہوتا کہ ان کی آواز بلند ہے۔ حال سے ان کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ سب اپنے اپنے ماضی میں تھے۔

اور ان میں ایک فرد تماشائی تھا...... جیسے کوئی مبصر ہو۔ اور وہ نور بانو تھی۔ کبھی تو اسے شرمندگی ہوتی کہ وہ مخل ہو رہی ہے لیکن وہاں تو کسی کو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔

احاطے کی طرف بڑھتے ہوئے زبیر نے کہا۔ ''یہیں باہر چھوٹے ٹھاکر کی پیدائش کا جشن منایا جا رہا تھا۔''

''شہر سے ناچنے گانے والیاں آئی ہوئی تھیں۔'' رابعہ بولی۔ ''وصال دین کے ابا نے مجھے بتایا تھا کہ ٹھاکرانی نے بڑے ٹھاکر کو بلایا تھا اور کسی کی ہمت نہیں تھی ان سے کہنے کی۔ تو ان لوگوں نے وصال دین کے ابا سے کہا تھا......''

نور بانو حیرت سے انہیں دیکھ اور سن رہی تھی۔ ان سبھوں کے لہجے خواب ناک تھے۔ لگتا تھا کہ حال سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسے وہ ابھی آیا ہی نہیں ہے۔ وہ عبدالحق کو چھوٹے ٹھاکر کہہ رہے تھے اور عبدالحق کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ اس نے عبدالحق کو دیکھا۔ مگر وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔

نور بانو نے حیرت اور مسرت سے سوچا' اس وقت یہاں ایسی تنہائی ہے کہ وہ اسے جی بھر کر دیکھ سکتی ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ خود عبدالحق کو بھی نہیں۔

''اور وہ بوڑھا بابا اُدھر سے آیا تھا۔'' زبیر اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''وہی بابا' جس نے دہلی میں ہمارے گھر آ کر ہمیں مسلمان کیا۔''

اس بار جیسے نور بانو بھی سحر زدہ ہو گئی۔ اسے دہلی والا بابا لمبے ڈگ بھرتا' آتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

پیٹرومیکس اٹھائے ہوئے زبیر آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ احاطے میں داخل ہوئے تو اس نے کہا۔ ''یہاں بڑے ٹھاکر پنچایت لگاتے تھے۔''

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے پاس حوالہ ہی ایسا تھا۔ یہی تو وہ جگہ تھی' جہاں اس نے ویر جی کی اور چاچا جمال دین کی لاشیں دیکھی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل

پلپل رہا ہے۔ سینہ خالی ہوا جا رہا ہے۔

وہ صدر دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو عبدالحق کا گریہ اور بڑھ گیا۔ یہاں اُس نے مولوی صاحب کی لاش دیکھی تھی اور مرتے ہوئے باپ سے آخری بار بات کی تھی۔ وہ سب کچھ اسے لفظ بہ لفظ یاد تھا اور اس کی سماعت میں گونج رہا تھا' سچ تو یہ ہے کہ حویلی کو برآمد کرانے کا خیال اسے بابا جی کی آخری گفتگو یاد کرتے ہوئے ہی آیا تھا۔

وہ آگے بڑھتے ہی رہے۔ "یہ بڑے ٹھاکر کی بیٹھک ہے۔" زبیر کہہ رہا تھا۔ "دن میں وہ یہیں لوگوں سے ملتے تھے۔"

اب وہ بڑے ٹھاکر کی خواب گاہ کے دروازے پر تھے۔ زبیر سب سے آگے تھا اور نور بانو سب سے پیچھے۔ نور بانو نے عبدالحق کے قدموں کو ٹھٹکتے دیکھا۔ زبیر بھی ایک لمحے کو رکا تھا۔ لیکن حمیدہ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ "آگے چلو......"

زبیر نے پلٹ کر عبدالحق کو دیکھا۔ عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔ زبیر آگے بڑھ گیا۔

نور بانو نے سوچا' یہ کمرا یقیناً عبدالحق کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ تبھی تو اُس کے قدم رکے تھے۔

حمیدہ ایک بے چوکھٹ کے دروازے کے پاس رک گئی۔ "یہ ہے میرے پتر...... میرے چھوٹے ٹھاکر کا کمرا۔" اُس نے چھلکتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ سب اس کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ "یہاں...... کھڑکی کے پاس بستر تھا۔ بستر کے ساتھ پنگھوڑا۔ اس میں چھوٹے ٹھاکر لیٹے تھے۔ یہیں میں نے پہلی بار چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔ اور میں نے پہلی بار اسے گود میں لیا تو وہ دودھ مانگنے لگا......" یہ کہتے ہوئے بوڑھی حمیدہ کے رخسار بھی دہک اٹھے۔ "ٹھاکرانی نے بتایا کہ اُس نے ابھی تک دودھ نہیں پیا ہے۔ وہ مجھ سے دودھ مانگ رہا تھا اور ماں کا دودھ نہیں پی رہا تھا......"

سب اپنے اپنے ماضی کے سحر سے نکل آئے تھے۔ ان کے سامنے ماضی کا ایک ایسا باب کھل رہا تھا' جس سے وہ بے خبر تھے۔

"ایسی ضد کبھی کسی بچے نے نہیں کی ہوگی۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ ڈاکٹر بھی ناکام ہو گئے......"

وہ سب سحر زدہ سے حمیدہ کو تک رہے تھے......

"ایک طرف راجپوتی آن تھی' دوسری طرف بیاہ کے بائیس برس بعد پیدا ہونے والے منتوں مرادوں کے بچے کی جان......"

بائیس برس! نور بانو نے سوچا۔ کتنا چاہتے ہوں گے ان کے ماں باپ انہیں......

"پتا نہیں کیا بات تھی۔ کچھ اللہ کی طرف سے ہی تھا۔ میں چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کے

لیے ایسی تڑپی کہ اپنے وصال دین کو دودھ پلانے سے چڑنے لگی۔ وصال دین کے ابا ڈرتے تھے کہ ٹھاکر جی کو اس تڑپ کا پتا چل گیا تو وہ ہم سب کو مروا دیں گے......"

کیسی پریوں والی کہانی ہے!

"مگر ٹھاکر جی بڑے آدمی تھے۔ جب ان کی سمجھ میں آ گیا تو وہ آدھی رات کو خود چل کر ہمارے گھر آئے۔ حالانکہ وہ کسی کو بھیج کر بلواتے تو میں سر کے بل جاتی میری تو اپنی غرض تھی۔ لیکن وہ خود چل کر آئے...... سوالی بن کر......"

نور بانو کے ذہن میں بڑے ٹھاکر کا خاکہ بن رہا تھا...... بارعب...... آن والے......

"بیٹے کی خاطر انہوں نے پرکھوں کی آن اور اپنے دھرم کو ایک طرف رکھ دیا......"

نور بانو اس باپ کی محبت کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی......

"یہاں مسہری تھی۔ یہاں بیٹھ کر میں نے چھوٹے ٹھاکر کو گود میں لیا۔ وہ بہت کمزور ہو رہا تھا۔ پھر میں نے پہلی بار اسے دودھ پلایا۔ پھر میں یہاں لیٹ کر سو گئی۔ اُس دن سے ٹھاکر جی نے ہمیشہ ہمارا احسان مانا۔ حالانکہ وہ احسان نہیں تھا' محبت تھی۔ ممتا کا احسان سے کیا واسطہ۔ مگر ٹھاکر جی نے ہمیں برابر کا رتبہ دیا۔ اپنا سب کچھ آدھا ہمیں دے دیا۔ وہ مجھے بہن کہتے تھے۔ بہت بڑے آدمی تھے وہ......"

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں یہیں چھوٹے ٹھاکر کو ہر روز دودھ پلاتی تھی۔ ٹھاکرانی پریشان تھیں کہ رات کو میرے گھر جانے کے بعد کیا ہوگا۔ مگر میرا چھوٹا ٹھاکر عقل مند بچہ تھا۔ اس نے رات کو میری ضد کبھی نہیں کی۔ رات کو وہ اپنی ماتا جی کا دودھ پی لیا کرتا تھا۔ یوں کبھی کسی کو پتا نہ چلا......"

وہ اس کمرے سے نکلے۔ باہر ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کے باہر پچھواڑا تھا...... بے حد وسیع و عریض۔ سامنے کہیں کہیں شکستہ دیوار نظر آ رہی تھی۔

"یہاں ٹھاکر جی پہلی بار اپنے بیٹے کے لیے گھوڑا بنے تھے۔" حمیدہ نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ "اور جب چھوٹے ٹھاکر نے کہا کہ اب ویر جی کی باری ہے تو ٹھاکر جی نے وصال دین کو پیٹھ پر بٹھا لیا اور اسے لے کر دوڑنے لگے۔ میں وصال دین پر بہت چیخی۔ پر ٹھاکر جی نے مجھے روک دیا۔ بولے۔ "یہ وصال دین میرے بیٹے اوتار سنگھ کا دوست ہے۔ اس ناتے یہ اس کا حق ہے مجھ پر......"

نور بانو نے تصور میں وہ منظر بھی دیکھا...... کیسے محبت کرنے والے وضع دار لوگ تھے وہ......

"اُس کے بعد وصال دین کے ابا نے ٹھاکر جی کو کبھی چھوٹے ٹھاکر کا گھوڑا بھی نہیں بننے دیا۔"

"کیسے اماں؟" وہ عبدالحق کی آواز تھی۔

حمیدہ نے نظریں اٹھا کر اسے نہیں دیکھا۔ وہ بدستور نگاہوں کے سامنے جیسے کسی غیر مرئی شے کو دیکھ رہی تھی۔ "وہ ہر صبح حویلی آجاتے تھے...... چھوٹے ٹھاکر کو گھوڑا بن کر سیر کراتے......"

عبدالحق کو دھندلا دھندلا سا یاد آرہا تھا...... بہت کچھ...... ایک لکڑی کا گھوڑا...... اور چاچاجی کی باتیں...... وہ کچھ محبت کے بارے میں سمجھا رہے تھے...... طاقت اوقات کی بات کر رہے تھے۔

وہ دوبارہ اندر آئے۔ اب وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی خواب گاہ میں تھے۔

یہ کمرا سب سے بہتر حالت میں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی چھت نہیں گری تھی۔ یہ بات عبدالحق کے لیے حیرت انگیز تھی اور ہر حیرت انگیز بات کو وہ اللہ کا اشارہ کہتا تھا۔ چاہے وہ اشارہ اس کی سمجھ میں نہ آئے۔

وہاں مسہری تھی۔ مسہری پر دو تکیے تھے۔ ہر چیز مٹی میں نہائی ہوئی تھی۔ مگر عبدالحق کی نگاہوں میں پتا جی کی خواب گاہ بھر گئی۔

اور ایک رات یاد آگئی۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں گیا تھا۔ مولوی صاحب اُس کے ساتھ تھے اور وہ اپنی نئی نویلی محبت میں سرشار تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ ہر وقت مولوی صاحب سے عربی پڑھتا رہتا۔ وہ پتا جی کو بھول ہی بیٹھا تھا۔

اُس رات اس نے سوچا تو اسے شرمندگی ہوئی۔ وہ پتا جی کے کمرے میں چلا گیا۔ پتا جی بیٹھے ڈائری میں کچھ لکھ رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر انہوں نے ڈائری ایک طرف رکھ دی۔ اُس نے پوچھا...... "آپ سوئے نہیں پتا جی؟......" انہوں نے کہا...... "نیند تو مجھے کم ہی آتی ہے پتر؟" اور وہ کیسا شرمندہ ہوا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ ماں کی موت کے بعد وہ کتنے اکیلے ہو گئے ہیں۔ اور وہ بھی دہلی چلا گیا ہے۔ اُس نے کبھی پتا جی کی تنہائی کے بارے میں ان کے کرب کے بارے میں نہیں سوچا۔

تب اُس نے پہلی بار پتا جی کے پاؤں دبائے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ سو جائیں گے۔ لیکن وہ پاؤں دباتا رہا اور وہ کروٹیں بدلتے رہے۔

پھر اس رات پہلی بار ٹھاکر ایک عام آدمی بن گیا تھا۔ اُس کے پتا جی نے کہا...... میری ایک خوشی پوری کر دو۔ یہاں میرے ساتھ لیٹ کر سو جاؤ۔

عبدالحق کو اس رات کا ایک ایک لمحہ ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ دونوں کچھ فاصلے پر لیٹ گئے۔ چند لمحے گزرے تو پتا جی نے کہا...... "اویار اوتار سنگھ ساتھ ایسے تو نہیں سوتے۔ مجھ سے لپٹ جانا یار!" اور وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح حیران باپ سے لپٹ گیا تھا۔

تب پتا جی نے اس سے اندر کی باتیں کی تھیں۔ ان کے پتا...... اُس کے دادا نے انہیں اچھا ٹھاکر بننے کی تلقین کی تھی۔ ٹھاکر کو سخت مضبوط اور آن والا ہونا چاہیے...... اور محبت سے دور کیونکہ

محبت آدمی کو کمزور کر دیتی ہے۔ محبت ہو جائے تو اسے چھپا کر رکھو۔ اس کا اظہار مت کرو۔ پتا جی نے کہا تھا...... میں پتا جی کی آگیا کا پالن کرتا رہا۔ لیکن میں اچھا ٹھاکر تھا ہی نہیں۔ میں تمہاری ماتا جی سے بہت پریم کرتا تھا۔ لیکن کبھی اُس پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔ اور اوتار سنگھ تم سے میں نے محبت نہیں کی۔ تم تو میری جان تھے۔ تم میں میری جان تھی۔ پر میں نے تمہیں کبھی بتایا نہیں۔ آج بھی نہیں بتا رہا ہوں۔ ٹھاکر کبھی یہ بات بتایا نہیں کرتے۔

پھر پتا جی نے کہا تھا...... میں تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہیں ٹھاکر بننے کی ضرورت نہیں۔ تم آزاد ہو۔ جو چاہو کر سکتے ہو...... اور کرو۔ یہ کہتے کہتے وہ سو گئے تھے۔

وہ جب تک گاؤں میں رہا اسی طرح لپٹ کر پتا جی کے ساتھ سوتا رہا۔

نور بانو اس دوران عبدالحق کو بہت غور سے دیکھتی رہی تھی۔ وہ حمیدہ کی طرح از خود رفتہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر گہرائی تھی۔ وہ خاموش رہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بہت کچھ کہہ رہے تھے...... بہت کچھ بتا رہے تھے۔

پھر عبدالحق چونکا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نظریں مسہری کے سرہانے رکھے سیف پر جم گئیں۔ وہ سیف کی طرف بڑھا اور اُس نے ہینڈل گھمایا لیکن سیف لاک تھا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد عبدالحق پلٹا۔ اُس نے تکیہ اٹھا کر دیکھا۔ اُس کے نیچے چابی موجود تھی۔ اس نے چابی اٹھالی۔

چابی کے باوجود سیف آسانی سے نہیں کھلا۔ شاید زنگ کا مسئلہ تھا۔

سیف کھلا تو عبدالحق نے زبیر سے پیٹرومیکس لے کر سیف کا جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سیف میں کتابیں تھیں۔ اس نے کتابوں کو باہر نکالا اور مسہری پر رکھنے لگا۔

کتابوں کے ہٹنے کے بعد اُسے نوٹ نظر آئے۔ اس نے نوٹ نکالے۔ خاصی موٹی گڈی تھی۔ ساتھ ہی چابیوں کا ایک گچھا بھی تھا۔ عبدالحق سمجھ گیا کہ یہ چابیاں تہ خانے میں کام آئیں گی۔

وہ نوٹ اور چابیاں نکال ہی رہا تھا کہ نور بانو کی استعجابیہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"یہ...... یہ تو سب دینی کتابیں ہیں...... اسلامی کتابیں!" نور بانو نے کہا۔

اس کی بات نے سب کو چونکا دیا۔ عبدالحق نے مسہری پر بکھری ہوئی کتابوں کو دیکھا۔ اُس نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ سب سے اوپر سیرت پر ایک کتاب تھی۔ قرآن پاک کا ایک مترجم نسخہ بھی اسے نظر آرہا تھا۔

"کیا...... کیا آپ کے والد مسلمان تھے؟" نور بانو نے سنسنی آمیز لہجے میں پوچھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ اپنا حجاب بھی بھول گئی تھی۔

"مم...... مجھے پتا نہیں۔" عبدالحق نے گڑبڑا کر کہا۔ ان کتابوں کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہو رہی تھی اور خوشی بھی۔

"میں نے تو اُن میں بہت ساری باتیں بہت اچھے مسلمانوں والی دیکھی تھیں۔" حمیدہ خوش ہو کر بولی۔

عبدالحق کو بہت خوشی ہوئی۔ کاش ایسا ہی ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔ پھر وہ بولا۔ "اب تہ خانہ اور دیکھنا ہے۔"

وہ دیوار کی طرف بڑھا اور دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ اس کا ہاتھ دیوار سے تھوڑا سا باہر نکلے ہوئے ایک ہینڈل سے ٹکرایا۔ اس نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ کھڑکھڑاہٹ سی ہوئی اور دیوار میں ایک خلا سا نمودار ہوا۔ اُس خلا میں نیچے اترتی ہوئی سیڑھیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

عبدالحق نے خلا کی طرف قدم اٹھایا۔ مگر اسی لمحے زبیر چلایا۔ "نہیں مالک۔ رک جائیں۔" ساتھ ہی وہ اس طرف لپکا۔

عبدالحق پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ زبیر اُس کے پاس چلا آیا۔ "کیا بات ہے زبیر؟"

"پہلے میں جاؤں گا مالک۔" زبیر نے کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"برسوں سے بند پڑا تہ خانہ ہے۔ حویلی تک ریت کے نیچے دفن تھی۔ اندر کی فضا زہریلی ہوگی۔"

"میرے لیے زہریلی ہے تو تمہارے لیے بھی ہوگی۔"

"تو میں فوراً تھوڑا ہی اتروں گا مالک۔ گھٹن کم ہونے کا انتظار کروں گا۔"

عبدالحق کو وہ تاخیر بری لگ رہی تھی۔ مگر زبیر کی بات بھی معقول تھی۔

وہ کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ پھر زبیر پیٹرومیکس ہاتھ میں لیے خلا کی طرف بڑھا۔ عبدالحق نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ "نہیں زبیر...... پہلے میں ہی اتروں گا۔"

"میرے پاس روشنی ہے مالک۔ آگے تو مجھے ہی رہنا ہے۔" زبیر نے دلیل دی۔

"تم ہنڈا مجھے دے دو۔"

حکم ماننے کا عادی زبیر جھجک رہا تھا۔ "یہ مناسب نہیں مالک......" اُس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"خطرہ سب کے لیے برابر ہے......"

"نہیں مالک۔ زبیر کو آگے جانے دیں...... خدا کے لیے۔" عقب سے رابعہ نے مداخلت کی۔

عبدالحق اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ اتنی دیر میں زبیر اُس خلا میں اُتر گیا۔

لیکن زبیر عقلمند تھا۔ وہ ایک دم سے نیچے نہیں اُترا اور اُس نے ایک دم سے گہری سانس بھی نہیں لی۔ چند لمحوں میں اسے احساس ہو گیا کہ فضا میں گھٹن ضرور ہے۔ لیکن زہریلا پن نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ اُس نے منہ اوپر کر کے پکارا۔ "جب تک میں آواز نہ دوں' آپ نیچے نہیں آئیے گا مالک۔"

نور بانو نے جاں نثاری کا ایسا مظاہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آ کا میاں کی وفاداری اور ایثار سے وہ بے خبر تھی۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ انہوں نے کیسے جان دی۔

"نیچے سب ٹھیک ہے نا؟" عبدالحق نے پکارا۔

"جی مالک۔ میں نیچے اتر کر آپ کو آواز دوں گا۔"

عبدالحق خواتین کی طرف مڑا۔ "آپ لوگوں کو نیچے آنے کی ضرورت نہیں۔"

دوسری طرف زبیر نیچے اتر گیا۔ پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد اُس نے عبدالحق کو آواز دی اور خود پیٹرومیکس لے کر سیڑھیوں کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں میں عبدالحق بھی تہ خانے میں اتر آیا۔

تہ خانہ بہت بڑا نہیں تھا۔ وہ ٹھا کر کی خواب گاہ سے کچھ چھوٹا ہی تھا۔ وہاں نو بڑی الماریاں تھیں اور ایک بہت بڑی تجوری تھی۔ چابیوں کا گچھا عبدالحق کے پاس تھا۔

سب سے پہلے اُس نے تجوری کو کھولا۔ تجوری میں موجود رقم دیکھ کر اُس کا دل خوش ہو گیا۔ اُس کو ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ تجوری میں اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر نقد رقم موجود ہے۔ اُس نے نوٹوں کی گڈیاں باہر نکال کر ڈھیر کر دیں۔

تجوری میں کاغذات بھی تھے۔ اُس نے کاغذات بھی نکال لیے۔ کاغذات کا جائزہ لینے کا موقع نہیں تھا۔ اُس نے انہیں بھی نوٹوں کے ساتھ رکھ دیا۔

اب وہ چھوٹی الماری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس الماری میں سونے' زیورات اور ملبوسات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس الماری کو بھی اُس نے خالی کر دیا۔ سونے اور زیورات کو کپڑوں میں لپیٹ کر زبیر نے گٹھڑیاں بنا دیں۔ "میں یہ اوپر پہنچاتا ہوں مالک۔" وہ بولا۔

عبدالحق نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور دوسری الماری کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ بہت بڑی الماری تھی۔ عبدالحق جانتا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ بہ ظاہر تو اب وہ چیزیں کسی کام کی نہیں تھیں لیکن وہ یہاں کچھ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ہر چیز اُس کے باپ دادا' بلکہ پرکھوں کی امانت تھی۔

اُس نے الماری کھولی۔ الماری کیسی' وہ تو پورا اسلحہ خانہ تھا۔ ہر طرح کے ہتھیار وہاں موجود تھے۔ تلواریں' نیزے' بھالے' تیر کمان اور ڈھالیں بھی۔ اور ہر سائز کے طمنچے اور بندوقیں بھی۔ پھر

کارتوس کا ڈھیر بھی تھا۔

ایک لمحے کو عبدالحق نے سوچا کہ یہ سب کچھ اس الماری میں ہی چھوڑ دیا جائے لیکن اُس کا دل نہیں مانا۔ اُس نے ان سب چیزوں کو بھی کپڑوں میں لپیٹنا شروع کر دیا۔

❀ ❀ ❀

سامان اتنا تھا کہ اسے گھر تک پہنچوانے میں مزدوروں کی مدد لینی پڑی۔ عبدالحق نے سوچا تھا کہ مزدوروں کی مدد سے تہ خانے کی چھت تڑوا کر الماریاں اور تجوری بھی اٹھوا لے گا۔ لیکن رات میں کسی وقت ٹھاکر کی خواب گاہ کی چھت بھی بیٹھ گئی۔ جیسے امانت کے وصول کیے جانے کی منتظر تھی۔

نقد رقم، سونا اور زیورات عبدالحق نے حمیدہ کو سونپ دیے۔ زیورات کا جائزہ لیتے ہوئے حمیدہ نے اس پر احتجاج کیا۔ ''پتر...... تو مجھ اندھی پر یہ بوجھ کیوں ڈالتا ہے......'' یہ کہتے کہتے اُس کی نظر اس جڑاؤ ہار پر پڑی۔ اس کے ہیرے آنکھوں کو چکا چوند کیے دے رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''یہ ہار تو میں بہو کو دوں گی پتر۔''

''اللہ کا شکر ادا کرو اماں۔ اب تم اندھی کہاں ہو۔ بہو کے لیے ہار پسند کر رہی ہو۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

حمیدہ کھسیا گئی۔ ''ہاں پتر، اللہ کا شکر ہے۔ واقعی اب تو سب دکھائی دیتا ہے مجھے۔'' پھر وہ بولی۔ ''اب تو تُو خوش ہے نا پتر؟''

''ہاں اماں۔ اب میں انشاء اللہ گاؤں کو آباد کر سکوں گا۔ اور اللہ نے چاہا تو یہاں پہلے سے زیادہ خوش حالی ہوگی۔ اب تو یہ پاک سرزمین پر ہے نا۔''

''بس تو خوش رہ۔''

عبدالحق نکلنے ہی والا تھا کہ نور بانو آ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں ٹھاکر کی کتابیں تھیں۔ ''یہ کتابیں لے لیں آپ۔''

''آپ اپنے پاس رکھیں۔ فرصت سے دیکھوں گا انہیں۔'' عبدالحق نے جاتے ہوئے کہا۔

نور بانو نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اسے تھوڑا سا افسوس ہوا۔ عبدالحق کو صرف نقدی اور زیورات کی فکر تھی۔ باپ کے سیف سے نکلی ہوئی کتابوں کو اُس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

''تو غلط سمجھ رہی ہے دھیئے۔'' حمیدہ نے اُسے چونکا دیا۔

اُس نے چونک کر حمیدہ کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''اسے پیسے کی فکر تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ ہندوستان میں سب کچھ چھوڑ کر آنے والوں کو اس گاؤں میں آباد کرنا چاہتا ہے۔ انھیں خوش حالی دینا چاہتا ہے۔ اسے اپنے لیے کچھ نہیں

چاہیے۔ وہ تو بس دوسروں کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے۔ اس کے سوا اس وقت اسے کچھ بجھائی نہیں دے گا۔''

نور بانو شرمندہ ہو گئی۔

حمیدہ نے ہیروں کا ہار اس کی طرف بڑھایا۔ ''دھیئے...... ذرا یہ پہن کر تو دکھا مجھے۔''

''آپ کو کیا پتا چلے گا اماں؟''

''ارے...... میری آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ سب دکھائی دینے لگا ہے مجھے۔ تو پہن تو سہی۔''

نور بانو نے ہار لے کر دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت، بے حد جگمگاتا ہوا ہار تھا۔ مگر بھاری بہت تھا۔ اس نے سوچا، یہ پہن کر تو میری گردن ہی لٹک جائے گی۔ اُس نے یہ بات حمیدہ سے بھی کہہ دی۔

''کچھ نہیں ہوتا دھیے۔ تو پہن تو سہی۔''

نور بانو نے بڑے اشتیاق سے ہار پہنا۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے جیسی مرگھلی نہیں رہی ہے۔

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''خوب سجا ہے یہ تیرے گلے میں۔ پتا ہے، ٹھاکرانی نے بہت پہلے یہ مجھے دکھایا تھا۔ کہتی تھی، اپنی بہو کے گلے میں ڈالوں گی یہ ہار۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ یہ ہار عبدالحق کی بیوی کے لیے ہے......''

نور بانو کا ہاتھ ہار اتارنے کے لیے حرکت میں آیا تھا۔ مگر حمیدہ کی بات سن کر اُس کے ہاتھ نے ہار کو یوں گلے سے چپکا لیا، جیسے اب اُسے اترنے نہیں دے گا۔ ساتھ ہی اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ لیکن حمیدہ نے دیکھ لیا تھا۔ نور بانو ہار اتارنے لگی تو وہ جلدی سے بولی۔ ''رہنے دے دھیے۔ پہن لے دو چار دن۔ اچھا لگتا ہے تیرے گلے میں۔''

مگر نور بانو نے جلدی سے ہار اتار کر حمیدہ کو دے دیا۔ ''نہیں اماں۔ مجھے پتا ہوتا تو پہنتی ہی نہیں۔ کسی کی چیز جھوٹی کرنے سے کیا فائدہ۔''

''اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کس کے نصیب میں ہے۔ مجھے تو تُو ہی اچھی لگتی ہے اور عبدالحق کو بھی......''

مگر نور بانو اُس کا پورا جملہ نہ سن سکی۔ وہ اس سے پہلے ہی اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

❀ ❀ ❀

صبح عبدالحق حمیدہ کے پاس آیا تو اُس کے چہرے سے دبا دبا ہیجان جھلک رہا تھا۔ نور بانو بھی وہاں بیٹھی تھی۔

''میں شہر جا رہا ہوں اماں۔ کچھ منگوانا ہے؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

"نا پتر۔ مجھے کیا منگوانا ہوگا۔"

"مجھے کچھ منگوانا ہے۔" اچانک نور بانو بولی۔

"جی فرمایئے؟" عبدالحق نے نگاہیں جھکائے جھکائے پوچھا۔

"اون لے آیئے گا میرے لیے۔ سردیاں آ رہی ہیں۔ سویٹر بننے ہیں۔"

"جی لے آؤں گا۔"

"یہ پیسے لے لیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ ضروری ہے۔"

عبدالحق نے نوٹ لے لیے۔ نور بانو وہاں سے چلی گئی۔ عبدالحق چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر بولا۔ "اماں...... ایک بات پوچھنی ہے تم سے۔"

"پوچھو پتر۔"

"وہ اماں...... جب سے میں نے اپنا کمرا دیکھا ہے' بے تاب ہو گیا ہوں۔" عبدالحق اب بھی جھجک رہا تھا۔ "پر اماں' سوچتا ہوں۔ خود غرضی کی بات ہے۔ اللہ کو بری لگے گی۔"

"بات تو بتا پتر۔"

"کل سے میرا دل چاہ رہا ہے اماں کہ اسی جگہ مکان بنواؤں۔ حویلی تو بہت بڑی تھی۔ میں وہاں اپنی ضرورت کے مطابق مکان بنوانا چاہتا ہوں۔ جہاں میرا کمرا تھا' وہیں میرا کمرا ہو۔ ویسا سکون اماں مجھے کبھی کہیں اور نہیں ملا۔"

"نہ تو یہ بری بات ہے پتر اور نہ اس میں خود غرضی ہے۔"

"نہیں اماں۔ میری گاؤں کو آباد کرنے کی جو خواہش تھی' یہ اس سے بھی بڑی خواہش ہے۔ جی چاہتا ہے' پہلے اس پر کام شروع کرا دوں۔ بلکہ میں نے سوچا ہے اماں کہ جہاں حویلی تھی' وہاں ہمارے گھر کے ساتھ اور گاؤں والوں کے بھی گھر ہوں۔"

"اس میں کوئی برائی نہیں پتر۔ بندے پر سب سے پہلا حق تو اس کا اپنا ہوتا ہے۔ تو بے فکر ہو کے یہ کام کر پتر۔ اور اب تو تیرے پاس پیسے کی کمی نہیں۔ دونوں کام ایک ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔"

عبدالحق نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اٹھائے اور انہیں چوم لیا۔ "تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا اماں۔ واقعی دونوں کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں۔"

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "تو اللہ سے کتنا ڈرتا ہے پتر۔"

"کہاں [illegible] اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ ہاں کوشش ضرور

کرتا ہوں۔ یہ تو بنیاد ہے اماں۔ ہدایت ہی ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں' بن دیکھے ایمان لاتے ہیں' آخرت پر یقین رکھتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

"یہ تجھے کس نے بتایا پتر؟"

"قرآن نے۔ یہ سورۂ بقرہ کے پہلے رکوع کی آیات ہیں اماں۔"

حمیدہ ٹھرا کر رہ گئی۔ زندگی بھر وہ قرآن پڑھتی رہی تھی۔ مگر یہ تو اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ پھر اسے عبدالحق پر فخر بھی ہوا اور پیار بھی آیا۔ وہ نومسلم تھا۔ مگر قرآن سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ "تو قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے پتر۔"

"تو اماں' قرآن صرف پڑھنے کے لیے تو نہیں ہے۔ پڑھ کر سمجھنا اور عمل کرنا ضروری ہے۔"

"تو کیسے سمجھ لیتا ہے؟"

"ترجمے والے قرآن بھی ہوتے ہیں اماں۔ اور اللہ کی مہربانی سے میں نے عربی بھی پڑھی ہے۔" عبدالحق کی نگاہوں میں نور بانو کا سراپا لہرا گیا۔ یہ اس پر اس کی محبت کا احسان تھا۔

"تو پتر' خرچ تو سبھی کرتے ہیں۔"

"ایسے نہیں اماں' اللہ نے بتایا ہے کہ مال کہاں کہاں خرچ کرنا چاہیے۔ مختصر سی بات یہ ہے اماں کہ مال اللہ کو خوش کرنے کے لیے خرچ کیا جائے۔ اسی لیے تو میں ڈر رہا تھا۔ اچھا اماں' اب میں چلتا ہوں۔"

وہ کمرے سے نکلا۔ باہر نور بانو کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹھاکر کے سیف سے نکلی ہوئی کتابیں تھیں۔ "سنیے...... مجھے آپ سے اجازت چاہیے۔"

"جی؟" عبدالحق ایک دم مؤدب ہو گیا۔

"یہ آپ کے والد کی کتابیں میں لے لوں؟"

عبدالحق کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔

اس کی کیفیت دیکھ کر نور بانو نے جلدی سے وضاحت کی۔ "میں ٹھیک سے اپنی بات نہیں کہہ سکی شاید۔ میں آپ سے انہیں پڑھنے کی اجازت مانگ رہی ہوں۔ یہ آپ کی امانت ہوں گی میرے پاس۔ جب کہیں گے' واپس دے دوں گی۔"

عبدالحق مسکرایا۔ "جی ضرور۔ کیوں نہیں۔ مجھے تو اپنے کام نمٹانے کے بعد ہی ان کی ضرورت پڑے گی۔ اور میرے کام دیر طلب ہیں۔"

نور بانو نے دل میں سوچا...... یعنی آنکھیں آپ کو دیکھنے کو ترس جائیں گی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "شکریہ۔"

عبدالحق سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

❁ ❁ ❁

محکمہ زراعت کا ڈپٹی ڈائریکٹر عبدالحق سے ملاقات کا کب سے مشتاق تھا۔ پٹواری حسن دین نے جس انداز میں اُس کا غائبانہ تعارف کرایا تھا' وہ غیر معمولی تھا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر عرفان احمد جانتا تھا کہ حسن دین بہت اصول پرست اور سخت آدمی ہے۔ اگر وہ کسی شخص کی اتنی تعریف کرے تو اس شخص کے بہت اچھے ہونے میں شک ہی نہیں کیا جاسکتا۔

مگر وہ عبدالحق سے ملا تو حیران ہوا۔ اس کی توقع کے برعکس وہ بہت کم عمر تھا۔ اس کی عمر بیس اکیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھی لیکن اُس میں بڑوں جیسی متانت اور بردباری تھی۔

''حسن دین نے مجھے بتایا کہ آپ اپنے خرچ پر ریت ہٹوانے کا کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' عرفان احمد نے کہا۔

''جی ہاں۔ الحمدللہ...... اللہ نے مجھے اس قابل بنادیا ہے۔'' عبدالحق نے منکسرانہ انداز میں کہا۔

''ہم نے طے کرلیا ہے کہ جتنی زمین بھی آپ برآمد کرائیں گے' وہ آپ کی ہوگی۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ زمین تو اللہ کی ہے اور ضرورت مندوں کے لیے ہے۔''

''وہ آپ جانیں۔ ہماری طرف سے تو وہ تمام زمین آپ کی ہوگی۔ یہ ایک طرح سے میری...... ہم سب کی طرف سے...... اس نوزائیدہ ملک کی طرف سے اظہارِ تشکر ہے۔ آپ جو چاہیں کریں' ہمیں اس میں کوئی تعرض نہیں ہوگا۔''

''تشکر کیسا؟ میرے پاس اللہ کے دیے ہوئے وسائل ہیں۔ اور میں وہ کچھ کررہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔''

''دراصل آپ صورتِ حال کو سمجھے بغیر ہمارے اس تشکر کو سمجھ نہیں سکتے۔'' عرفان احمد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ہم ہندوؤں کی منافقت اور مکاری اور انگریزوں کی عیاری کا شکار ہوئے ہیں۔ ہمارے ساتھ تقسیم میں بھی دھاندلی کی گئی اور اب وسائل کی تقسیم کے معاملے میں بھی زیادتی کی جارہی ہے۔ ایک تو ہمارا حق ہمیں دیا ہی نہیں جارہا۔ دوسری طرف جو نام نہاد وسائل ہمیں ملتے ہیں' ان میں بھی لیت ولعل سے کام لیا جارہا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے دفتروں میں لکھنے کے لیے کاغذ اور پنسل تک کی قلت ہے۔''

''لیکن اس سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''انگریز اور ہندو' دونوں ہی تقسیم کے مخالف تھے۔ لیکن مسلم لیگ کی تحریک کے پیچھے عوامی طاقت ایسی تھی کہ انہیں ماننا پڑا۔ مگر ہندوؤں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پاکستان زیادہ دن نہیں چلے گا۔ آخر وہ خود آکر ہندوستان سے ملے گا۔ تو یہ اس ایجنڈے پر کام ہورہا ہے۔ تقسیم میں دھاندلی

کی وجہ سے مسلمانوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ فارمولا یہ تھا کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں' وہ علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ تو اکثریتی علاقوں والے مسلمان مطمئن تھے۔ عین وقت پر انھیں پتا چلا کہ وہ تو ہندوستان میں بیٹھے ہیں۔ تب وہاں ان کا قتلِ عام ہوا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے ہجرت کرکے پاکستان آنے والوں کی ٹرینوں کی ٹرینیں کاٹ ڈالیں۔ ابھی تو گرد بیٹھی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ یقینی ہے کہ شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ اور جو پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگئے' انھیں یہاں آباد کرنے اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کا مسئلہ ہے۔ جبکہ وسائل ہیں ہی نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ ہے۔ ہجرت کرکے آنے والوں میں کتنی کے خوش نصیب ہی ایسے ہوں گے' جنھوں نے اپنے کسی پیارے کو نہ کھویا ہو۔ بچے ماں باپ سے محروم ہوکر یہاں پہنچے ہیں۔ جو وہاں صاحبِ ثروت تھے' ان کے پاس یہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں۔ یہ انسانی ایثار اور قربانی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ سرکاری مشینری کے سامنے مسئلہ صرف وسائل سے محروم اس ملک کو چلانے کا نہیں۔ ان لوگوں کی آبادکاری کا بھی ہے اور انھیں روزگار فراہم کرنے کا بھی ہے۔''

''واقعی...... یہ تو بہت مشکل صورتِ حال ہے۔''

''جی ہاں۔ لیکن ہمارے ساتھ اللہ کی رحمت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان اللہ کے حکم سے قائم رہنے کے لیے بنا ہے۔ ہندوؤں کا یہ خواب کہ پاکستان دوبارہ اُن سے جا ملے گا' کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ ہم اس مشکل وقت سے گزر کر جب ابھریں گے تو انشاء اللہ بہت مضبوط ہوں گے۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' عبدالحق نے بے حد خلوص سے کہا۔

''انشاء اللہ' آپ جیسے لوگ جو موجود ہیں۔ اب آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم کیوں آپ کے احسان مند ہیں۔ آپ ناقابلِ کاشت اراضی کو قابلِ کاشت بنا کر اپنے وطن کو اضافی وسائل مہیا کررہے ہیں۔ یہ آپ کا احسان ہے۔ اسی لیے یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ وہ تمام اراضی آپ کی ہوگی۔''

عبدالحق عرفان احمد سے بہت متاثر ہوا۔ اس میں افسرانہ شان نہیں تھی۔ وہ ملک کی محبت سے سرشار تھا۔ ملک پر کوئی احسان کرے تو وہ اسے خود پر احسان سمجھتا تھا۔ وہ منکسر المزاج تھا اور خدمت کے جذبے سے معمور اور عبدالحق نے اب تک تمام افسر ایسے ہی دیکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ یہ ملک بہت ترقی کرے گا۔ کسی بھی ملک کے لیے یہ بہت بڑی نعمت ہوتی ہے کہ اس کی بیوروکریسی امین اور دیانت دار بھی ہو اور اس سے محبت بھی کرتی ہو۔

''اور ہاں' میں نے آپ کے وسائل میں اضافے کا سامان بھی کیا ہے۔'' عرفان احمد نے

اُسے چونکا دیا۔

"جی...... میں سمجھا نہیں۔"

"میں نے ایک کنٹریکٹر سے بات کر لی ہے۔ جو ریت آپ ہٹوا رہے ہیں' وہ بہت کام آئے گی' آپ کو اس کا معقول پے منٹ بھی ملے گا۔ اگر آپ کو قبول ہو تو یہاں دستخط کر دیں۔" عرفان احمد نے ایک کاغذ اُس کی طرف بڑھایا۔ "وہ ریت کنٹریکٹر اٹھواتا رہے گا۔"

عبدالحق نے کاغذ پر دستخط کر دیے اور ممنونیت سے اُسے دیکھا۔ "میں آپ کے تعاون پر آپ کا شکر گزار رہوں۔"

"یہ تو ہمارا فرض ہے۔ اور ہاں' کرنسی تبدیل کرانے کے لیے بھی تیار رہیے گا۔ پاکستانی کرنسی آنے ہی والی ہے۔"

عبدالحق اس کا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بظاہر ناممکن نظر آنے والا کام ہر مرحلے میں آسان تر ہوتا جا رہا تھا۔ حسن دین کی طرف جاتے ہوئے وہ بہت مطمئن تھا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو ان کتابوں کا جائزہ لے رہی تھی' جو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے سیف سے نکلی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب تو سیرت النبی ﷺ پر تھی' دوسرا قرآن پاک کا ترجمہ تھا' پھر ایک اور کتاب تھی...... احکامات الٰہی۔

کتابوں کو سرسری طور پر دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ پڑھنے والے نے انہیں بڑی دیدہ ریزی سے پڑھا ہے۔ اہم عبارت کو پنسل سے خط کشیدہ کیا گیا تھا۔ جا بجا حاشیے میں تبصرے لکھے تھے اور تبصروں سے پڑھنے والے کی فہم کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔

نور بانو کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ عبدالحق کے والد کا کام تھا۔ کیونکہ جب اُس نے عبدالحق سے ان کے مسلمان ہونے کے بارے میں پوچھا تھا تو اس کے جواب سے اُس کی اُلجھن ظاہر ہو رہی تھی۔ یعنی اُسے اپنے باپ کے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا۔ اور بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ باپ مذہب تبدیل کر لے اور بیٹا اس تبدیلی سے بے خبر رہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ کتابوں کا مطالعہ تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ اُس نے سنا تھا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ قرآن تک کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ بات تو گاندھی کے بارے میں بھی کہی جاتی تھی۔ لیکن جس طرح عبارات کو خط کشیدہ کیا گیا تھا اور جس طرح حواشی میں تبصرے تحریر کیے گئے تھے' اُس سے ثابت ہوتا تھا کہ قاری اور مبصر مسلمان نہیں بھی تھا تو لازمی طور پر مسلمان ہو گیا ہو گا۔

معاملہ عبدالحق سے متعلق نہ ہوتا' تب بھی اُس کے لیے دلچسپ ہی ہوتا لیکن عبدالحق کے تعلق کی وجہ سے وہ نور بانو کے لیے ایک ایسی گتھی بن گیا' جسے وہ ہر حال میں سلجھانا چاہتی تھی۔

قرآن پاک میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی توجہ کا مرکز وہ روشن آیات تھیں' جو اللہ کے قادر مطلق' واحد اور احد ہونے کی دلیل تھیں۔ نور بانو کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان میں سورۂ ملک کی وہ آیات بھی تھیں' جنہیں سن کر عبدالحق ایمان لایا تھا۔ وہاں حاشیے میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے لکھا تھا......

میں نے اس کا مشاہدہ کیا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ اس پر میں اپنی ڈائری میں تفصیل سے لکھوں گا۔

یہ پڑھ کر نور بانو کو اُس کی ڈائری کے بارے میں تجسس ہوا۔ تب اسے پہلی بار پتا چلا کہ ان کتابوں میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی دو ڈائریاں بھی ہیں۔

اُس نے دونوں ڈائریوں کا سرسری جائزہ لیا۔ ایک تو واقعتاً ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے روز و شب کی ڈائری تھی۔ جبکہ دوسری ڈائری مختلف تھی۔ اس میں ٹھاکر نے اپنے تجربات و مشاہدات تحریر کیے تھے اور جو کچھ اُس نے پڑھا تھا' اُس پر تبصرے لکھے تھے۔

نور بانو نے پہلی ڈائری کو تو ذاتی قرار دے کر چھوڑ دیا۔ اصولاً تو دوسری ڈائری بھی ذاتی تھی اور اُسے بلا اجازت اسے پڑھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ مگر اُس نے سوچا کہ وہ صرف ان آیات پر ٹھاکر کا تبصرہ پڑھنا چاہتی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

بالآخر اس نے وہ صفحہ نکال لیا' جہاں ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے سورۂ ملک کی ان آیات پر تبصرہ لکھا تھا۔ وہ اسے پڑھنے لگی......

یہ نشانی پڑھ کر میں آسمان کا مشاہدہ کرنے کے لیے نکلا۔ میرا خیال تھا کہ یہ دو منٹ کا کام ہے۔ میں باہر نکلا اور میں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں آسمان کو دن میں دسیوں بار دیکھتا رہا ہوں۔ مگر غیر شعوری طور پر۔ میں نے کبھی شعوری طور پر آسمان کو نہیں دیکھا۔ مشاہدہ کبھی نہیں کیا۔ اس پر غور کبھی نہیں کیا۔ اس اتنی بڑی چیز کو میں کیسے نظر انداز کرتا رہا۔ ہم سبھی ایسا کرتے ہیں۔ اس لیے تو حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس کتاب میں بالکل سچ لکھا ہے کہ چیزوں کو دیکھو' ان پر سوچو اور غور کرو۔ ان میں نشانیاں ہیں۔

تو جب میں نے پہلی بار آسمان کو سمجھنے کے خیال سے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ صحرا کے آسمان کو منٹ غور سے دیکھیے تو ہیبت طاری ہو جائے۔ اس کا کوئی انت نہیں۔ اپنے سر کے عین اوپر دیکھو تو وہ گنبد کا مرکزی نقطہ لگتا ہے...... آسمان کا بلند ترین مقام۔ اور وہاں سے ہر سمت میں وہ ایک جیسا ستواں ہے۔ ہلکا سا ہموار جھکاؤ ہر سمت میں دور تک...... حدِ نظر تک چلا جاتا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ اس میں ذرا سی بھی ناہمواری نہیں۔ کہیں ذرا سا بھی فرق دکھائی نہیں دیتا اور صحرا کی وسعت میں بھی آسمان' صحرا سے بڑا...... بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔

میں بہت اچھی طرح مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک سمت نظر جما کر دیکھا۔ ایک جگہ دھرتی اور آکاش ملتے دکھائی دے رہے تھے۔ آکاش کا نیلا پن صحرا کی ریت سے گھلتا ملتا نظر آ رہا تھا۔

میں آگے اُس طرف بڑھنے لگا۔ کچھ آگے جا کر میں رکا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اب بھی آسمان کا مرکزی نکتہ..... بلند ترین مقام عین میرے سر کے اوپر تھا۔ حالانکہ میں کوئی پچاس قدم آگے چلا آیا تھا۔ اور میں نے سامنے دیکھا تو وہی منظر تھا۔ دھرتی اور آکاش آپس میں گھل مل رہے تھے۔

میں آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ بار بار میں رک کر اوپر دیکھتا۔ لگتا تھا کہ آسمان کا مرکز میرے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ اور سامنے آخری منظر وہی تھا۔ دھرتی اور آکاش کے گلے ملنے کا!

میں بھی ایک دھن میں تھا۔ بڑھتا رہا۔ بڑھتا رہا۔ مگر آسمان کے مرکز کی حد سے نہیں نکل پایا۔ ہاں، سامنے کا منظر ضرور بدل گیا۔ اب آسمان جھاڑیوں کو چوم رہا تھا۔

میں اور آگے بڑھا تو آسمان ان جھاڑیوں کی حد سے بھی دور نکل گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے گاؤں کے آثار تک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں اپنی دھن میں بہت دور نکل آیا تھا۔ مگر آسمان کے مرکز کی حد سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی۔ میرے پاؤں شل ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ دیر تک مجھ سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ اب مجھے اتنی ہی دور پیچھے بھی جانا تھا۔

میں نے بہت غور کیا اور کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میں دنیا کے کسی ملک میں چلا جاؤں، آسمان کا مرکز میرے سر کے عین اوپر ہی رہے گا۔ اس کا مطلب؟ آسمان کی وسعت نامعلوم ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آسمان کے مرکز کی وسعت اتنی ہے کہ پوری زمین بس اسی کے نیچے ہے۔ میں کہیں بھی کھڑا ہو کر دیکھوں، خود کو اسی مرکز کے عین نیچے پاؤں گا۔

میں آسمان کی ناہمواری کھوجنے نکلا تھا۔ کئی گھنٹوں میں میلوں کی مسافت طے کر کے نامراد لوٹا۔ لیکن نہیں۔ میں نامراد نہیں تھا۔ میں تو ایک بہت بڑا بھید سمجھ آیا تھا۔

سائنسداں کہتے ہیں کہ آسمان فریب نظر ہے۔ مجھ سے کہیں تو میں ان سے فرمائش کروں کہ اس طرح کا ایک چھوٹا سا..... بہت ہی چھوٹا سا..... بہت ننھا منا فریب نظر تخلیق کر کے بتاؤ تو مانوں۔ فریب سب کے لیے نہیں ہوتا۔ کسی کو فریب لگتا ہے، کسی کو نہیں لگتا۔ یہ کیسا فریب نظر ہے کہ دنیا کے ہر انسان کو ہوتا ہے۔ تمام انسانوں کے پرکھوں کو بھی ہوتا رہا اور آنے والی نسلوں کو بھی ہوتا رہے گا۔ ہاں..... فریب نظر ہوتا ہے۔ آدمی جب آسمان اور زمین کو ملتے دیکھتا ہے وہ فریب نظر ہوتا ہے۔ مگر سب کو الگ الگ..... اپنی اپنی نظر کے مطابق ایک ہی جگہ کھڑے ہر آدمی کو زمین آسمان ملتے دکھائی دیں گے۔ مگر کسی کو کہیں اور کسی کو کہیں۔ کسی کو آگے، کسی کو درمیان میں اور کسی کو پیچھے۔ اپنی اپنی نظر کی بساط کے مطابق۔

مجھے افسوس ہوا کہ یہ نشانی میرے مذہب کی کتابوں میں کیوں موجود نہیں۔ میں شروع سے سمجھتا تھا کہ بھگوان، خدا اور اللہ ایک ہی ہستی کے نام ہیں۔ فرق صرف زبانوں کا اور تہذیب و ثقافت کا ہے، لیکن یہاں میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ بنیادی فرق تو تعلیمات کا ہے اور مذہبی عقائد کا ہے۔ عمل کا ہے۔ اب میں اس پر غور کرنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔

میں نے یہ نشانی اتفاقاً پڑھی تھی۔ میں تو بس قرآن کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ نامانوسیت کی وجہ سے میں جم کر پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ یونہی میری نظر اس عبارت پر پڑی اور جم گئی۔

اب سوچتا ہوں کہ جس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایسی دلیل نظر آئے، اس میں اور کتنا کچھ ہو گا۔ اب میں اس کتاب کو باقاعدہ پڑھوں گا۔ مجھے لگتا ہے، کوئی بہت بڑی طاقت میرے اندر سے میری رہنمائی کر رہی ہے......

نور بانو سوچ میں پڑ گئی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ باپ کی نظر انہی آیات پر پڑی......اور بعد میں بیٹے نے انہی آیات کو سن کر اسلام قبول کیا۔ یقیناً اللہ نے دونوں کی رہنمائی کی۔

وہ اس ڈائری کو پڑھنا چاہتی تھی لیکن بغیر اجازت کے پڑھنا اخلاقی اعتبار سے بری بات ہوتی۔ اُس نے سوچا کہ وہ اس کے لیے عبدالحق سے اجازت لے لے گی۔

❁ ❁ ❁

گاؤں میں زراعت کے مستقبل سے مایوس ہو کر کام اور ٹھکانے کی تلاش میں جانے والے شہر کی خاک چھان کر مایوس ہو کر لوٹے تو حیران رہ گئے۔ گاؤں میں مصروفیت، اور گہما گہمی کا عجیب عالم تھا۔ کئی جہتوں میں کام ہو رہا تھا اور بہت تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔

وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ حویلی برآمد ہو چکی ہے۔ بلکہ اب تو حویلی کی جگہ مکانات تعمیر کیے جا رہے تھے۔ دوسری طرف ٹریکٹر اور مزدور اب حویلی کے اطراف سے ریت ہٹانے میں مصروف تھے اور اچھا خاصا علاقہ صاف ہو چکا تھا۔ تیسری طرف شہر سے ٹرک اور اونٹ گاڑیاں ریت لینے کے لیے مسلسل آ رہی تھیں۔ ریت کے پہاڑ سمٹ رہے تھے۔ منظر صاف ستھرا اور خوب صورت لگ رہا تھا۔

وہ عبدالحق کے پاس پہنچے۔ عبدالحق نے پُرتپاک لہجے میں ان سے حال احوال پوچھا۔ پھر بولا۔ ”کوئی بات بنی؟“

وہ سب شرمندہ ہو گئے۔ ”نہیں بھائی، کوئی امکان نظر نہیں آتا۔“

”مایوس کیوں ہوتے ہو۔“ عبدالحق نے انہیں دلاسہ دیا۔

”ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی املاک اور اراضی اُن لوگوں کو دی جا رہی ہے، جن کے پاس ہندوستان میں اس اراضی اور املاک کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ جو وہ ہندوستان میں چھوڑ کر

آئے ہیں۔ ہمارا تو صرف زبانی دعویٰ ہے۔ ہم ایسی افراتفری میں جان بچا کر نکلے کہ ہمیں کاغذات کا خیال بھی نہیں آیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔"

ان لوگوں کو اندازہ تھا کہ عبدالحق کے خواب کو تعبیر ملنے میں وقت لگے گا۔ مگر یہ طے تھا کہ اب یہ گاؤں خوشحال ہو کر رہے گا۔ وہ انتظار کر سکتے تھے' لیکن وہ کھسیار ہے تھے۔ انہیں شرمندگی تھی کہ وہ اپنا گاؤں چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے' اب کس منہ سے وہاں رہنے کی بات کرتے۔

عبدالحق نے اُن کی شرمندگی محسوس کر لی۔ "تو اب فکر کی کیا بات ہے۔" اُس نے بے حد اپنائیت سے کہا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ انشاءاللہ یہ گاؤں آباد بھی ہوگا اور خوشحال بھی۔ دیکھ لیں' آپ سب کے لیے مکان بھی بن رہے ہیں اور انشاءاللہ زمین کی بھی کمی نہیں ہوگی۔"

"اصل میں ہم تو یہ سمجھے تھے کہ آپ گاؤں کی طرف سے مایوس ہو کر حویلی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔" عمر نے کہا۔

"حویلی برآمد کرائے بغیر ہم یہ بڑا کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔" عبدالحق نے وضاحت کی۔

"تو اب ہم یہاں رہ سکتے ہیں؟" اصغر نے پوچھا۔

"مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ۔ فیصلہ تو آپ کو خود کرنا ہے۔"

وہ سب خوش ہو گئے۔

اب یہ صورت حال بھی نہیں تھی کہ گاؤں میں کام نہ ہو۔ بے کاری ہو تو کام کرنے کے عادی لوگوں کا جی اُوب جاتا ہے۔ مگر یہاں تو کام کی کمی نہیں تھی۔ ایک طرف جو ریت ٹرکوں اور گاڑیوں میں بھر کر شہر لے جائی جا رہی تھی' اُس کا حساب رکھنا تھا۔ دوسری طرف ریت ہٹائی جا رہی تھی۔ تیسری طرف مکانات تعمیر ہو رہے تھے۔ وہ سب شریک ہو گئے تو عبدالحق کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب ہر کام کی نگرانی کے لیے لوگ موجود تھے۔ لیکن عبدالحق کا مزاج ایسا تھا کہ وہ ہر کام اپنی نگرانی میں کرانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسے فرصت تو نہیں ملی لیکن سب لوگ مصروف ہو گئے۔

نیاز اور اُس کے بھائی بہت خوش تھے۔ یہ نیا کام انہیں راس آ گیا تھا۔ دودھ کی بہتات تھی۔ رابعہ نے ان کی عورتوں کو گھی مکھن بنانا سکھا دیا تھا۔ چنانچہ آمدنی شروع ہو گئی تھی۔ اس کام کی وجہ سے شہر میں تعلقات الگ بن رہے تھے۔

پہلی بار نفع تقسیم ہوا تو زبیر اپنا حصہ لے کر عبدالحق کے پاس پہنچا۔ اُس نے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو مالک۔"

عبدالحق نے ہاتھ بڑھانے کے بجائے پوچھا۔ "یہ کیا ہے زبیر؟"

"یہ آپ کے حصے کا منافع ہے مالک۔"

"میرا حصہ کیسے' یہ تو تمہارا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ "اس کاروبار میں تم اور نیاز کے بھائی برابر کے شریک ہو۔ میرا تو کوئی بیج نہیں۔"

زبیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "کیسی غیریت کی بات کر دی مالک۔ کیا آپ نے مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا ہے؟"

"دیکھو زبیر' تم بات سمجھ نہیں رہے ہو۔ پرانی باتیں بھول جاؤ۔ وہ تمہارے دھرم کے ساتھ گئیں۔ یہ مت بھولا کرو کہ اب ہم مسلمان ہیں۔"

"تو مالک' اس سے پرانے رشتے تو نہیں ٹوٹ گئے......"

"تم اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرو زبیر۔ اسلام نے غلامی ختم کی ہے۔ مسلمان سب برابر ہیں اور ایک دوسرے کے لیے بھائی ہیں۔ اب نہ میں تم سے برتر ہوں اور نہ تم مجھ سے کم تر۔"

"ایسا نہ کہو مالک۔ ہمارا کون ہے تمہارے سوا۔"

"تو میں تم سے تعلق تو نہیں توڑ رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اب تم میرے بڑے بھائی جیسے ہو۔"

زبیر باقاعدہ رونے لگا۔ "میں پرانا تعلق نہیں بھول سکتا مالک۔"

عبدالحق بے بسی بھی محسوس کر رہا تھا اور اسے جھنجھلاہٹ بھی ہو رہی تھی لیکن اس وقت اس کا اظہار اور مخدوش تھا۔ زبیر تو پہلے ہی دل شکستہ ہو رہا تھا۔ "زبیر بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب ہمیں اچھا مسلمان بننا ہے۔ یہ جو تم مجھے مالک کہہ کر پکارتے ہو' مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے اس میں تماشہ بننے کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے خیال رہتا ہے کہ دوسرے ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ یہی کہ ہم اپنے پرانے طور طریقے نہیں چھوڑ سکے۔ میری خوشی اس میں ہے کہ اب ہمارے درمیان برابری ہو......"

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا مالک۔ ہماری تو سب سے بڑی خوشی چھن جائے گی۔"

"اب میں اوتار سنگھ نہیں ہوں کہ تم میرا نام نہ لے سکو۔ میں عبدالحق ہوں۔ تم بڑے ہو۔ تمہیں تو میرا نام لے کر مجھے پکارنا چاہیے۔"

"اس سے تو اچھا ہے مالک کہ تم ہمیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دو......"

"میں جو اجنبی لوگوں کو گلے لگا رہا ہوں' تمہارے ساتھ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔ "تم تو میرے گھر کا فرد ہو۔ مگر اب مجھے تم سے شکایت ہے......"

یہ سن کر تو زبیر لرز گیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو مالک؟"

"ایک طرف تم مجھے مالک کہتے ہو۔ دوسری طرف میرا حکم بھی نہیں مانتے......"

"جس دن آپ کا حکم نہ مانوں مالک تو مر ہی نہ جاؤں۔"

"تو میں کہتا ہوں کہ میرا نام لو' مجھے چھوٹا بھائی سمجھو۔"

زبیر کو چپ لگ گئی۔ "آپ خود سوچو مالک کہ کیا یہ ہو سکتا ہے۔"

عبدالحق کو اس پر ترس آنے لگا۔ "چلو' تم مجھے مالک کہتے رہو۔ مگر دل میں مجھے چھوٹا بھائی سمجھ لو۔ اور میں کہتا ہوں کہ تم سب کچھ چھوڑ کر پہلے دین کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تبھی بات تمہاری سمجھ میں آئے گی۔ میں مولوی صاحب سے بات کروں گا۔ تم روزان کے پاس پڑھنے کے لیے جایا کرو......"

"جو حکم مالک۔ میں جاؤں گا۔ پر یہ پیسے رکھ لو۔"

"نہیں زبیر۔ یہ تمہارے ہیں۔ اب تم اپنی مرضی سے خرچ کرنا سیکھو۔ تم اگر شہر جاؤ اور میرے لیے کوئی چیز خرید کر لاؤ تو مجھے اس سے بہت خوشی ہوگی۔ تمہارے علاوہ کون ہے مجھے تحفہ دینے والا۔"

یہ بات زبیر پر اثر کر گئی۔ "ٹھیک ہے مالک۔ میں وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کروں گا جو آپ چاہتے ہیں لیکن مجھ سے مالک کہنے کا حق چھینا تو میں مر جاؤں گا مالک۔"

"کوشش تو کرو گے؟"

"جی مالک۔" زبیر نے مرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اگلے روز زبیر شہر گیا اور عبدالحق کے لیے ایک بہت شاندار گھوڑا خرید لایا۔ عبدالحق نے اسے بے حد تشکر کے ساتھ قبول کیا۔ اسے امید تھی کہ زبیر پیسہ خرچ کرے گا تو اس کا شوق بڑھے گا اور وہ پیسہ رکھنے لگے گا۔ لیکن اسے یقین ہو گیا کہ وہ لفظ مالک کو اور اپنے لیے اُس کی خدمت گزاری کو کبھی اس کے سسٹم سے نہیں نکال سکے گا۔

❁ ❁ ❁

دو دن ہو گئے۔ نور بانو کا عبدالحق سے سامنا ہی نہیں ہوا کہ وہ اس سے ڈائری پڑھنے کی اجازت مانگتی۔ یوں وہ ڈائری اس کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بن گئی۔ وہ دن میں کئی بار اسے لے کر بیٹھتی اور خود سے بحث کرتی۔

اُس کے پاس ایک دلیل تھی۔ اس نے عبدالحق سے ان کتابوں کو پڑھنے کی اجازت مانگی تھی اور عبدالحق نے اجازت دی تھی۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انہیں نہ پڑھے۔

مگر رکاوٹ تھا تو اس کا ضمیر...... اس کا ضابطۂ اخلاق۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ اجازت مانگ رہی تھی تو اسے نہیں معلوم تھا کہ ان کتابوں میں دو ذاتی ڈائریاں بھی ہیں۔ اور یہ بات عبدالحق کو بھی معلوم نہیں تھی۔ تو اس نے کتابیں پڑھنے کی اجازت مانگی تھی اور عبدالحق نے اسے کتابیں پڑھنے کی ہی اجازت دی تھی۔ وہ اجازت ڈائری کے لیے نہیں تھی۔ ڈائری تو بہت ذاتی

چیز ہوتی ہے۔

دونوں دن وہ عبدالحق کے لیے باہر بھی نکلی لیکن اسے اس کی مصروفیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ وہ ایک جگہ ٹھہر ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی یہاں ہے تو ابھی وہاں ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے خود کو کام میں اس طرح الجھا لیا ہے کہ اسے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں۔ اور تیسرے دن وہ نظر ہی نہیں آیا۔ کسی ضروری کام سے اسے شہر جانا پڑ گیا تھا۔

اس روز وہ گھر میں واپس آئی تو دونوں ڈائریاں سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بڑی کشمکش میں تھی۔ دل چاہتا تھا کہ پہلی ڈائری کھولے اور پڑھنا شروع کر دے لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ اخلاقاً یہ غلط بات ہے۔

پھر اچانک ایک دلیل نے اس کے ذہن کو چھو لیا۔ عبدالحق کے والد کے سیف سے جتنی بھی کتابیں نکلی تھیں' اس نے ان کو پڑھنے کی اجازت اس سے لے لی تھی۔ اور ان کتابوں میں یہ ڈائریاں بھی شامل تھیں۔

وہ مسکرائی۔ دلیل اس کے دل کو مؤثر لگی تھی۔

لیکن ضمیر ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ اس وقت نہ تمہیں معلوم تھا کہ ان کتابوں میں کوئی ڈائری ہے۔ نہ ہی یہ بات عبدالحق کے علم میں تھی۔ تو وہ اجازت کتابوں کے لیے تھی' ڈائری کے لیے نہیں۔

ضروری نہیں کہ عبدالحق کو ڈائریوں کی موجودگی کا علم نہ ہو۔ نور بانو نے ایک اور دلیل نکالی۔

علم ہوتا تو کتابوں کے برآمد ہونے پر وہ حیران نہ ہوتا۔ ضمیر نے دلیل رد کر دی۔

اس کی حیرت کا سبب کتابوں کے موضوعات تھے۔ ورنہ ایک بیٹے کو تو یہ علم ہوتا ہے کہ اس کا باپ ڈائری لکھتا ہے۔

مگر اس نے تمہیں کتابیں پڑھنے کی اجازت دی تھی' ڈائری پڑھنے کی نہیں۔ اور ڈائری پڑھنے کی اجازت تو تم نے مانگی بھی نہیں تھی۔

نور بانو اخلاقی اعتبار سے کوئی کمزور لڑکی نہیں تھی۔ وہ ضمیر کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

کچھ دیر وہ یونہی ڈائری ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ پھر بے دھیانی میں اس نے ڈائری کا پہلا صفحہ کھول لیا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بے دھیانی اس کی لاشعوری خواہش کی پیدا کردہ تھی یا نہیں۔

بہرحال صفحہ کھولتے ہیں جو الفاظ اسے نظر آئے' انہوں نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ ڈائری پڑھ رہی ہے۔ وہ الفاظ تھے ہی ایسے......! ٹھاکر نے لکھا تھا......

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی ڈائری لکھنے پر مجبور ہوں گا۔ میرے دوست امان اللہ

نے مجھے بتایا تھا کہ ڈائری لکھنا ایسا ہے جیسے تنہائی میں خود سے باتیں کرنا۔ جو بات آدمی کسی کے ساتھ بھی نہ کر سکے' وہ اس کے لیے بوجھ بن جاتی ہے۔ اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے وہ بات خود سے کر لی جائے...... ڈائری لکھ کر یوں دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

اس پر میں نے اکڑ کر کہا تھا...... اسی لیے تو ہم ٹھاکر لوگ ڈائری کبھی نہیں لکھتے۔ ہمیں خود سے بات کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی۔ ہم ٹھاکر لوگ تو ہر بات صاف کرنے کے قائل ہیں۔ میرے دل میں جو بھی آتی ہے، کسی سے بھی کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ اس پر اماں نے کہا تھا...... اکڑو مت! یہ وقت ہر انسان پر آتا ہے۔ میں نے کہا تھا...... مجھ پر بھی نہیں آئے گا۔

''مگر اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا' جس پر میں رنجیتا کے سوا کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک رنجیتا رہی' وہ بوجھ ہونے کے باوجود میرے لیے بوجھ نہیں بنا۔ لیکن رنجیتا کے دیہانت کے بعد اوتار سنگھ تعلیم کے لیے دہلی چلا گیا۔ اور میں اکیلا رہ گیا۔ تب مجھے ڈائری کا سہارا لینا پڑا۔

اوتار سنگھ کا جنم ایسا پُر اسرار معاملہ ہے کہ اگر میرے ساتھ نہ پیش آیا ہوتا اور کسی نے مجھے سنایا ہوتا تو میں مذاق اڑاتا اور کہتا کہ اچھی کہانی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے' چاہے سمجھ میں نہ آئے۔

میں نے کبھی نہیں سنا کہ دو آدمیوں نے ایک ہی وقت میں ایک ہی خواب دیکھا ہو...... لفظ بہ لفظ' ہُو بہ ہُو ایک ہی خواب۔ مگر اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے میں نے اور رنجیتا نے ایک ہی رات ایسا خواب دیکھا تھا......

''نور بانو...... وہیئے' کہاں ہے؟'' حمیدہ کی پکار نے نور بانو کو چونکا دیا۔ چونکی تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو ڈائری کے چار صفحے پڑھ چکی ہے۔ شرمندگی سے اس کا برا حال ہو گیا۔

''نور بانو......''

دوسری پکار پر اسے خیال آیا کہ اس نے حمیدہ کو جواب بھی نہیں دیا ہے۔ ''ابھی آئی اماں۔'' اس نے کہا اور ڈائری کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

وہ حمیدہ کے کمرے میں پہنچی۔ ''کیا بات ہے اماں؟''

''میری آنکھوں میں دوا ڈال دے بیٹی۔ عبدالحق کو تو اب فرصت ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں' ٹھیک سے کھاتا بھی ہے یا نہیں۔''

نور بانو نے دوا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ لیٹ جائیں اماں۔ میں دوا ڈال دوں۔''

وہ اس کی دوسری شرمندگی تھی۔ اماں کو پکارنے کی ضرورت پڑ گئی۔ صرف اس لیے کہ ڈائری کے چکر میں اسے وقت کا احساس نہیں رہا۔ ورنہ وہ خود ہی اماں کو یاد دلاتی تھی کہ دوا ڈالنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اور بلا اجازت وہ ڈائری پڑھنا پہلی شرمندگی تھی۔

❁......❁......❁

اب ڈائری پڑھنے سے تو وہ رک نہیں سکتی تھی۔ جو کچھ اس نے پڑھا تھا' اس سے آتش شوق بھڑک گئی تھی۔ اور اب اس کے پاس ایک دلیل بھی تھی۔ غلطی وہ کر چکی تھی۔ تو اب مکمل غلطی ہی سہی۔

عبدالحق کے باپ نے جس انداز میں لکھا تھا' اس سے پتہ چلتا تھا کہ عبدالحق کی ولادت ایک بڑا واقعہ تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ وہ والدین کی شادی کے بیس سال بعد پیدا ہوا تھا۔ مگر اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی ولادت سے پہلے اور بعد پُر اسرار واقعات پیش آئے تھے۔ پہلا واقعہ وہ خواب تھا' جو اس کے ماں اور باپ نے بیک وقت دیکھا تھا۔ وہ اس خواب کی تمہید ہی پڑھ رہی تھی کہ حمیدہ نے اسے آواز دے دی تھی اب وہ آگے پڑھنے کو بے تاب تھی۔

اس نے آگے پڑھنا شروع کیا تو ڈائری میں کھو ہی گئی۔

وہ تو ناقابل فہم واقعات تھے۔ وہ حقیقت نہیں' افسانہ لگتا تھا اور افسانہ بھی ایسا' جس کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہ ہو...... ایک دیومالائی افسانہ!

جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی' اس کی سمجھ میں آ گیا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے لیے وہ ڈائری لکھنا کتنا ضروری ہو گیا تھا۔ ابتدا میں جو اس نے ڈائری لکھنے کی وجہ بیان کی تھی' نور بانو نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن ڈائری پڑھتے ہوئے وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئی کہ ٹھاکر کیونکہ قلمکار نہیں تھا' اس لیے اپنی مجبوری کو پوری طرح سے بیان نہیں کر سکا تھا۔

جو کچھ اس ڈائری میں تھا' اسے وہ جھوٹ یا افسانہ بھی قرار نہیں دے سکتی تھی۔ اور وہ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس پر آسانی سے یقین کیا جا سکتا لیکن اس کا دل اس پر یقین کر رہا تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے واقعات کو ترتیب کے ساتھ' بے حد سادگی سے لکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں کڑی سے کڑی ملتی گئی تھی اور کہیں کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔

مگر واقعات ناقابل یقین تھے۔ میاں بیوی کا ایک ہی رات ایک جیسا خواب دیکھنا بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پھر اس خواب کے بعد اس درخت کا سوکھ جانا' جس پر انہوں نے آخری بار اولاد کے لیے چڑھاوا دیا تھا۔ اس پر دونوں میاں بیوی کی مایوسی بھی بالکل فطری تھی۔ جس درخت سے وہ بیٹا مانگ رہے تھے' جس سے انہیں خوش خبری ملی تھی' وہ عین بہار کے موسم میں اس طرح جل گیا تھا کہ اس پر ایک پتا بھی نہیں بچا تھا۔ لیکن پھر اچانک ہی ٹھاکرانی کی گود بھر گئی تھی۔

مجذوب کے بارے میں پڑھ کر نور بانو کو وہ بابا یاد آیا' جو دلی میں اس کے گھر عین ضرورت کے وقت آیا تھا۔ جب عبداللہ نے اسلام قبول کیا تھا' جب وہ کہہ رہی تھی کہ انہیں اسلام قبول کرنے کے لیے مسجد جانا ہوگا۔ تو وہ کیا وہی مجذوب تھا؟ اسے تو عبدالحق بھی جانتا تھا اور زبیر بھی۔ بلکہ زبیر نے تو کہا تھا کہ وہ عبدالحق کی پیدائش والے دن گاؤں آیا تھا اور یہی بات ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بھی لکھی تھی۔ تو اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ وہی تھا۔ اور وہ وہی تھا تو ٹھاکر کی ڈائری میں لکھی ہر بات کے سچ ہونے کی سند تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کی تصدیق کر رہے تھے۔

پھر چھوٹے ٹھاکر کا ماں کا دودھ نہ پینا اور حمیدہ کے دودھ پر اصرار کرنا۔ یہ بھی افسانہ لگتا تھا، لیکن یہاں دودھ پلانے والی حمیدہ زندہ تھی اور وہ تفصیل بھی بیان کرتی تھی' جو ٹھاکر کی ڈائری میں نہیں تھی۔ کیونکہ ٹھاکر کو اس کا علم نہیں تھا۔

آگے ایک ایسی بات تھی...... اہم بات' جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ آ بھی نہیں سکتی تھی۔ بات الجھی ہوئی تھی اور ٹھاکر نے کھل کر بھی نہیں لکھی تھی۔ بس وہ یہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ کوئی معاملہ ہے' جس میں تمام انسان ایک طرح سے پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم مسلمان' بچے کو اس حالت کو تبدیل کر کے دوسری حالت پر لایا جاتا ہے۔ یہاں چھوٹا ٹھاکر پیدا ہوا تو اسی دوسری حالت میں تھا۔ اور ٹھاکر نے پوری طرح چھان بین کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کا بیٹا اسی حال میں پیدا ہوا ہے۔ اسے اس پر لایا نہیں گیا ہے۔

نور بانو نے اس پر بہت غور کیا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

ٹھاکر نے آگے اپنی ڈائری میں لکھا تھا......

''رنجو کے علم میں یہ بات آئی تو وہ پریشان ہوگئی۔ اس وقت تک رنجو کے علاوہ دائی راجو اور شانتا کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ وہ دونوں بہت خوف زدہ تھیں۔ کچھ ہی پہلے تو چھوٹے ٹھاکر کے غائب ہو جانے کا معاملہ ہوا تھا اور اس سلسلے میں شانتا پر شک بھی کیا گیا تھا اور اسے دھمکیاں بھی دی گئی تھیں۔ بہرحال رنجو نے مجھے بلوالیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت چھوٹے ٹھاکر کے جشن میں شریک تھا اور مہمانوں میں گھرا ہوا تھا۔ جمال دین نے مجھ سے اصرار نہ کیا ہوتا تو میں اس محفل سے کبھی نہ اٹھتا۔ میں نے جا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ یہ اس مجذوب کی حرکت ہے۔ کمرا تبدیل کرتے وقت اس نے میرے پتر کے ساتھ یہ کارروائی کر دی ہوگی لیکن پھر میں نے سمجھ لیا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک تو وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔ دوسرے وہ چیز تین دن سے پہلے ٹھیک بھی نہیں ہوتی۔ اور میرے پتر کی تو پیدائش کو ہی ابھی تین دن نہیں ہوئے تھے۔ یہ میں جانتا تھا کہ دائی راجو اور شانتا ایسی جرأت نہیں کر سکتیں۔ اور وہ کرتی بھی تو کیوں۔ میں نے ان دونوں سے اس راز کو ہمیشہ راز رکھنے کا وعدہ لیا۔ مگر اس دن میں نے پہلی بار یہ ضرور سوچا کہ میرے

پتر کا مسلمانوں سے کوئی بہت گہرا تعلق ہے۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگا کہ اسے کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا تھا۔ مگر بھگوان نے میری اور رنجو کی محرومی دیکھ کر اسے ہمارے گھر پیدا کر دیا۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے مسلمانوں کے بارے میں سوچنے اور جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ شاید میں مجذوب کی ہدایات پر عمل بھی نہیں کر سکوں گا۔ مجذوب نے کہا تھا کہ مجھے بیٹے کی ہر بات ماننا ہوگی۔ وہ جو چاہے کرے۔ اور معنی خیز بات یہ ہے کہ میرے بیٹے نے ماں کا دودھ ہوتے ہوئے گاؤں میں موجود واحد مسلمان عورت کے دودھ کی ضد کی اور اس کے لیے جان پر کھیل گیا۔ وہ صرف چند روز کا تھا اور اس نے مجھے شکست دے دی......''

ڈائری پڑھتے ہوئے نور بانو کو یہ احساس ہوگیا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ بہرحال بہت اچھا انسان تھا۔ ورنہ راجاؤں کو اپنی رعایا سے کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ اسے چھین لیتے ہیں۔ مگر ٹھاکر نے وہ چیز عزت اور عاجزی سے مانگی تھی...... ضرورت مند بن کر مانگی اور اس کا احسان مانا۔ پھر اس احسان کا صلہ دینے کی بھی کوشش کی۔

نور بانو نے وصال دین کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اور جمال دین کو تو وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ حمیدہ کے ساتھ اب وہ وقت گزار رہی تھی۔ ٹھاکر کی ڈائری پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ غیر معمولی انسان تھے۔ ٹھاکر کو انہوں نے بہت متاثر کیا تھا۔ بلکہ یوں کہیں کہ ٹھاکر کے ذہن پر انہوں نے اَن مٹ نقش چھوڑے تھے۔ ٹھاکر کو اپنے بیٹے کی وجہ سے مسلمانوں کو سمجھنے کی' ان کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مگر مسلمانوں کے بارے میں اچھا تاثر اس پر اس گھرانے نے قائم کیا تھا۔ ٹھاکر کی ڈائری سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ غیر معمولی طور پر وفادار' احسان شناس' منکسر المزاج' عالی ظرف اور نیک تھے۔ ٹھاکر نے دودھ کے صلے میں اپنی زمین جائیداد آدھی ان کے نام کر دی تھی۔ مگر وہ اسی طرح رہتے رہے۔ اور ٹھاکر کو اسی طرح مانتے رہے۔ اور اب یہ تو نور بانو بھی جانتی تھی کہ انہوں نے چپکے سے وہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کے نام کر دیا تھا۔

جیسے جیسے نور بانو وہ ڈائری پڑھتی گئی' اس کی شرمندگی بھی بڑھتی رہی اور پچھتاوے کا احساس بھی۔ اور دونوں چیزوں کا تعلق عبدالحق سے تھا۔ وہ شرمندہ تھی تو اپنے گمان پر۔ وہ محبت کے باوجود ہمیشہ اسے کافر کہہ کر رد کرتی رہی۔ اس کے بارے میں اماں نے جب بھی کوئی اچھی بات کی تو اس نے اسے مکاری اور منافقت قرار دیا۔ اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ ان کے گھر میں گھسنے کے لیے خود کو اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور پچھتاوا اسے اس بات پر تھا کہ جو محبت اس کے لیے خوشی کا باعث ہو سکتی تھی' اس نے اسے اپنے لیے ذہنی اور روحانی اذیت کا سامان بنا لیا تھا۔ وہ اس محبت رد کرتی رہی۔ اس کے نتیجے میں ناخوش رہی اور جلتی کڑھتی رہی۔ اس بات کا احساس اسے باجی کو یاد کر کے ہوتا تھا۔ باجی کتنی خوش رہتی تھیں۔ باجی ایسی ازخود رفتگی کی کیفیت میں رہتی تھیں کہ

اس وقت تو انہیں دیکھ کر اسے غصہ آتا تھا اور لگتا تھا کہ وہ اللہ سے بغاوت کر رہی ہیں۔ مگر اب اس پر رشک آتا تھا۔

وہ ڈائری بند کر کے اس پر سوچتی رہی کہ اس کی اور باجی کی محبت میں اتنا فرق کیوں تھا۔ ایک جواب تو بالکل سامنے تھا۔ وہ اس محبت پر شرمندہ تھی' جبکہ باجی اس محبت پر نازاں تھیں۔ فرق دونوں کے گمان کا تھا۔ اس کا گمان برا اور غیر لچک دار تھا...... ضد اور ہٹ دھرمی پر مبنی...... جبکہ باجی اپنے محبوب کے بارے میں اچھا گمان رکھتی تھی۔ انہیں پتا چلا کہ وہ عربی پڑھتا ہے اور قرآن کی تلاوت سنتا ہے تو انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کا رجحان اسلام کی طرف ہے۔ جبکہ اس نے اتنی بڑی بات کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی اور بدگمانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور بعد میں ثابت ہوا کہ باجی کی سوچ درست تھی۔

مگر یہ تو سامنے کی بات تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ اصل بات تو اندر کی ہے۔ پہلی بار اس نے خود کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہاں آنے کے بعد جو اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی' یہ اس کی بدولت تھا۔ ورنہ تو کبھی وہ ایسا سوچتی بھی نہیں۔ اس کی سمجھ میں ایک بات آ گئی۔ اس کے اور باجی کے درمیان مزاج اور طبیعت کا بہت فرق تھا۔ باجی نرم خو اور درگزر کرنے والی تھیں۔ جبکہ وہ تند مزاج اور دوسروں کی غلطیاں پکڑ کر خوش ہونے والی تھی۔ باجی خوش مزاج تھیں۔ بات بات پر ہنسنے والی۔ اور مسکراہٹ تو کبھی ان کے ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ بد مزاج اور اپنے آپ میں گم رہنے والی تھی۔ مسکراتی بھی وہ کبھی کبھار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ محبت سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور باجی کو تو لگتا تھا کہ بنایا ہی محبت کے لیے گیا تھا۔

اب اس نے سوچا کہ ایسا کیوں تھا۔ کوئی سبب بھی تو ہوگا۔ اس نے حوصلہ کر کے اس پر سوچا تو اسے اس کا بھی جواب مل گیا۔ وہ اپنی صورت شکل اور رنگ و روپ کے حوالے سے احساسِ کمتری کا شکار تھی۔ اسے اللہ سے شکایت تھی کہ اس نے اسے دونوں بہنوں سے مختلف بنایا۔ وہ اپنی بہنوں سے اپنا موازنہ کرتی اور اس کے نتیجے میں ناخوش رہتی۔

تو اب اس کی سمجھ میں آیا کہ مذہب کا فرق اور خوفِ خدا اپنی جگہ' لیکن اسے مسترد کیے جانے کا خوف بھی تھا۔ اس کے اندر گہرائی میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہ اسے کبھی محبت نہیں ملے گی۔ وہ اس قابل ہے ہی نہیں کہ کوئی اس سے محبت کرے۔ اس کے باوجود شاید وہ محبت اس کے لیے کوئی خوب صورت اور نازک خواب بن جاتی اور وہ چپکے چپکے' نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے لطف اٹھاتی۔ مگر جب اسے یہ احساس ہوا کہ باجی کی محبت کا مرکز بھی چھوٹا ٹھاکر ہی ہے' تو اس نے سمجھ لیا کہ اس کے لیے اب کوئی امکان نہیں ہے۔ حالانکہ امکان تو کبھی چھوٹے ٹھاکر سے سامنا ہونے کا بھی نہیں تھا لیکن اب تو اسے خواب و خیال میں بھی چھوٹے ٹھاکر کی محبت نہیں مل سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اور کڑوی ہو گئی۔

یہ تو وہ جانتی تھی کہ عملی طور پر چھوٹے ٹھاکر کے باجی سے یا اس سے ربط ضبط کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کے لیے تو وہ بس خواب و خیال کا معاملہ تھا...... اور پھر وہ بھی نہیں رہا۔

لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ ہونے کو تو دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ جب کے چھوٹے ٹھاکر اور حال کے عبدالحقؒ کے اتنا قریب رہ سکے گی۔ لیکن یہ ہو گیا تھا۔

اس نے سوچا' میرے لیے تو یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ محبت نہیں مل سکتی تو کیا ہوا، اسے اپنے محبوب کی قربت تو مل گئی۔ اس نے عہد کیا اب پہلے کی طرح ناشکرا پن کبھی نہیں کرے گی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ابھی اسے پچھلے ناشکرے پن کی سزا ملنی ہے۔

❁ ❁ ❁

جہاں کبھی حویلی تھی' وہاں عبدالحق کی مرضی کے مطابق مکانات تعمیر ہو گئے تھے۔ عبدالحق نے اپنے لیے وہی کمرا مخصوص کیا تھا' جو پہلے حویلی میں اس کا کمرا تھا۔ اس نے اپنے لیے جو مکان بنوایا' اس میں چھ کمرے تھے۔ ایک کمرا اماں کا' ایک نور بانو کا' دو زبیر کے اور ایک اس کا اپنا تھا چھٹا کمرا مردانہ تھا۔ اور بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

یوں وہ جگہ' جہاں کبھی حویلی تھی' اب گاؤں کا رہائشی علاقہ بن گیا۔ جہاں ایک گھر تھا' وہاں دس گھر بن گئے۔ عبدالحق نے یہ کام بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس کے پیش نظر اس کی افادیت تھی۔ ایک تو وہ زمین کو کفایت کے ساتھ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں ہندوستان سے آنے والوں کی نوآبادکاری کا اہم کام تھا۔ بڑی حویلی اور بڑے مکانوں کی ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح سے زمین بچا کر اسے زراعت کے کام میں لایا جاتا تو کسی ایک گھرانے کا تو بھلا ہوتا۔ دوسرے اس کے نتیجے میں گاؤں میں مرکزیت کا تصور بھی قائم ہوا تھا۔ وہاں رہنے والوں میں قربت اور یگانگت پیدا ہوتی۔

سب لوگ بہت خوش تھے۔ وہ عبدالحق کی طرف ایسے دیکھتے تھے' جیسے وہ اس دنیا کا آدمی ہی نہ ہو۔ وہ نوجوان تھا لیکن وہ اس کی ایسی عزت کرتے' جیسے وہ ان سب سے بڑا ہو۔ انہوں نے اس کے دل کی بڑائی دیکھی تھی' اس کا ایثار دیکھا تھا۔ وہ کبھی صرف اپنے لیے نہیں سوچتا تھا۔ اس کی سوچ اجتماعی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اسے ان سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ ان کی بہتری کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ ان کی تکالیف' ان کے مصائب دور کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد ان کے لیے آرام اور خوش حالی کا حصول تھا۔ ورنہ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا زمین دار بن سکتا تھا۔

سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں منتقل ہو گئے۔ زندگی اپنے نئے راستے پر قدم بڑھانے

لگی۔اب سب لوگوں کو صرف پانی کا انتظار تھا۔پانی آجاتا وہ زمین سے رزق حاصل کرنے کی کوشش شروع کرتے۔اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اس سلسلے میں بھی بہت تیزی سے کام ہو رہا ہے۔وہ سب سوچتے تھے کہ عبدالحق نے اپنا سب کچھ اس کام میں جھونک دیا ہے۔اور جواب میں ان سے کچھ طے بھی نہیں کیا ہے۔

نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد نور بانو کو عبدالحق سے دوری کا احساس ہونے لگا۔سب کے کمرے الگ ہو گئے تھے۔عبدالحق کا زیادہ وقت باہر ہی گزرتا۔پھر وہ دن بھر کا تھکا ہارا آتا تو کبھی بیٹھک میں ہی لیٹ کر سو جاتا۔کئی کئی دن وہ اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پاتی وہ اس سے ڈائری کے سلسلے میں بھی بات نہیں کر پا رہی تھی۔

دوسری طرف وہ خود بھی بہت مصروف ہو گئی تھی۔وہ بیک وقت دو سوئیٹر بن رہی تھی۔اور وہ چاہتی تھی کہ سردی کا موسم آنے سے پہلے چار سوئیٹر مکمل کر لے۔

حمیدہ کی آنکھیں تقریباً پوری طرح ٹھیک ہو چکی تھیں۔عبدالحق اسے ہر ہفتے شہر لے جاتا تھا......ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے۔

"اب آپ چشمہ لگانا کم کر دیں۔" ڈاکٹر نے حمیدہ کو کہا تھا۔

"میں تو لگانا ہی نہیں چاہتی۔"

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔"نہیں' ایسا نہ کریں۔ابھی آپ کو اس کی ضرورت ہے۔"

"تو پھر کم کرنے کا مطلب؟"

"صبح کے وقت اور شام کے وقت' جب دھوپ ہلکی ہو جاتی ہے' آپ چشمہ اتار کر دیکھیں۔" ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔"لیکن نظروں میں چبھن ہو تو فوراً چشمہ لگا لیں۔"

"اور دوپہر میں۔"

"تیز دھوپ میں چشمہ لگانا ضروری ہے۔ابھی یہ احتیاط کریں گی تو کچھ عرصے کے بعد چشمہ لگانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔"

حمیدہ کو وہ رعایت بھی بڑی نعمت لگی۔پہلی بار دن کے اجالے میں اس نے چشمے کے بغیر دنیا کو دیکھا تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔اس کے دل کی گہرائیوں سے عبدالحق کے لیے دعا نکلی۔پھر وہ شوہر اور بیٹے کو یاد کر کے رونے لگی۔آج وہ دونوں موجود ہوتے تو عبدالحق کو عبدالحق دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔اور اپنے گاؤں میں اذان کی آواز سن کر انہیں کتنی خوشی ہوتی۔

❀ ❀ ❀

گاؤں میں ریت ہٹانے کا کام بہت تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔مگر کام بہت بڑا تھا۔عبدالحق واندازہ تھا کہ اس تیز رفتاری کے باوجود اس کام کو مکمل ہونے میں کم از کم چار مہینے تو لگیں گے۔

وہ بہت مصروف ہو گیا تھا۔اسے ریت ہٹانے کے کام کی نگرانی خود کرنا تھی۔اگر وہ اس کام پر توجہ نہ دیتا تو کام کی یہ رفتار ہو ہی نہیں سکتی تھی۔وہ سب کے پیچھے پڑا رہتا۔پھر شہر آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔ان تمام مصروفیات میں وہ تھک کر چور ہو جاتا تھا۔مگر اسے کوئی ملال نہیں تھا۔یہ کام تو اسے کرنا ہی تھا۔

ایک اس پر اللہ کی رحمت تھی۔وہ رات میں مشکل سے دو تین گھنٹے سوتا تھا لیکن وہ ایسی بھرپور نیند ہوتی تھی کہ وہ ایسا تازہ دم اٹھتا تھا' جیسے اس نے آٹھ گھنٹے کی نیند لی ہو۔اور یہ اس رات کا تحفہ تھا' جب اس نے اسلام قبول کیا تھا......رمضان المبارک کی پہلی رات!

ابتدا میں تو وہ اس تبدیلی سے بہت ڈرا تھا۔اس لیے کہ وہ اسے غیر فطری لگتی تھی۔اسے اچھی طرح یاد تھا۔تقریباً دو مہینے تک تو وہ بالکل سو ہی نہیں سکا تھا۔نیند آتی ہی نہیں تھی۔مگر کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔نیند کی کمی کا احساس ہوتا تھا' نہ ہی کوئی تھکن ہوتی تھی۔بس وہ سارا دن' ساری رات جاگتا رہتا تھا۔اس سے اسے جسمانی طور پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔البتہ ذہنی طور پر وہ خود کو بیمار اور ایب نارمل سمجھنے لگا تھا۔تکلیف یہ بھی تھی کہ رات کو نیند نہ آئے تو وہ کیا کرے۔کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔وہ سوچتا کہ اللہ نے دن کام کرنے کے لیے بنایا ہے اور رات آرام کرنے کے لیے اب وہ رات کی نیند سے محروم ہے تو کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں کہ اللہ اس سے ناراض ہے۔اس خیال سے وہ بہت بے چین رہتا تھا۔

وہ سوچتا تھا کہ اس پر کسی سے بات کرے۔لیکن ہمت نہیں ہوتی تھی۔پھر جب مہر علی مسجد امام کی حیثیت سے آئے تو اس نے یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔

مہر علی چند لمحے اسے بغور دیکھتے رہے۔پھر بولے۔"یہ تو تم پر اللہ کی رحمت ہوئی ہے عبدالحق۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"یہ سچ ہے کہ اللہ نے رات آرام کرنے کے لیے بنائی ہے۔مگر اللہ کو یہ بہت پسند ہے کہ اس کا بندہ اپنے آرام کے وقت میں سے اس کے لیے وقت نکالے۔آدھی رات کے بعد کی عبادت اللہ کو بہت پسند ہے۔کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ جس دعا کی قبولیت کا امکان ہوتا ہے' وہ دعائے نیم شب ہے۔"

عبدالحق اب بھی انہیں ایسے دیکھ رہا تھا' جیسے ان کی بات سمجھ نہیں پا رہا ہو۔

"دیکھو......دن اللہ نے کام کے لیے بنایا ہے۔اس لیے بنایا ہے کہ تم اس میں اللہ کا فضل تلاش کرو یعنی دن میں تمہیں بندوں کے حقوق ادا کرنے ہیں۔اس میں فرض نمازیں بھی پڑھنی ہیں۔سورہ مزمل میں اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآن رات کے وقت پڑھو اور ٹھہر ٹھہر کر......سمجھنے کی نیت

سے پڑھو۔ وجہ؟" اتنا کہہ کر مہر علی نے توقف کیا اور چند لمحے یوں خاموش رہے' جیسے اپنے ہی اٹھائے ہوئے سوال کا جواب سوچ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "دن کام کے لیے ہے۔ کام آدمی اپنے لیے بھی کرتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ یعنی وہ وقت خالص تمہارا نہیں ہوتا۔ اب تم دن میں قرآن پڑھو تو دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ دھیان کسی ایسے کام کی طرف لگا ہوگا' جو تمہیں کرنا ہے تو یکسوئی نہیں ہوگی۔ یکسوئی نہیں ہوگی تو سمجھ میں کیا آئے گا۔ پھر وہ اللہ کا کلام ہے۔ یکسوئی کے بغیر اسے پڑھنا احترام کے منافی ہے...... گستاخی ہے۔ تو تمہیں قرآن پڑھنے سے وہ کچھ حاصل نہیں ہوگا' جو ہونا چاہیے۔ الا یہ کہ اللہ چاہے اور پھر تم ایسے وقت میں قرآن پڑھ رہے ہوگے' جس پر دوسروں کا حق ہے۔ یا پھر اللہ کے فضل کی تلاش میں کوتاہی کر رہے ہوگے۔ اور رات کا وقت خالص تمہارا اپنا ہے' تمہارے آرام کے لیے ہے۔ اپنے آرام کو نظر انداز کر کے اللہ کے لیے وقت نکالو تو اللہ خوش ہوگا۔ تمہاری عبادت قبول ہوگی۔ اس لیے نفلی عبادت کے لیے رات ہی ہے۔ اللہ نے رات آرام کے لیے بنائی ہے۔ تم آرام کی بجائے عبادت کرو' قرآن پڑھو' ذکر کرو تو اس کے اجر کا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔"

عبدالحق کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے دل سے مہر علی کے لیے دعا نکلی۔ رات کے وقت کے زیاں نے اسے بہت بے چین کر رکھا تھا۔

مہر علی نے اسے تہجد کی نماز کے بارے میں بتایا۔

اس کے بعد پہلی بار وہ سویا۔ شاید اس لیے کہ تہجد کے لیے سو کر اٹھنا ضروری تھا۔ دو گھنٹے کے بعد وہ اٹھا تو پوری طرح تازہ دم تھا۔

یوں اس کا ایک نیا معمول قائم ہو گیا' ایسا معمول' جس میں اس کے لیے روحانی خوشی تھی۔ قرآن پاک سے تو اسے عشق تھا۔ قرآن پڑھنے سے تو اس کا دل ہی نہیں بھرتا تھا۔

یہاں بھی مہر علی نے اس کی رہنمائی کی۔ "قرآن صرف اس وقت تک پڑھا کرو' جب تک طبیعت میں شگفتگی رہے۔ یہ بہت بھاری کلام ہے۔ دل و دماغ بوجھل محسوس ہونے لگیں تو طبیعت کی شگفتگی واپس آنے تک وقفہ کرو۔"

اب اس مصروفیت میں یہ نیا معمول اور بڑی نعمت بن گیا۔ دن میں قرآن پڑھنے کا وقت ملتا ہی نہیں تھا۔ وہ رات کو سونے سے پہلے اور پھر تہجد اور فجر کے درمیان پڑھتا تھا۔

شب بیداری میں اسے لذت ملنے لگی!

❋ ❋ ❋

نور بانو نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی پہلی ڈائری پڑھ لی جس میں واقعات تھے۔ اس کے بعد دوسری ڈائری بھی پڑھنے لگی۔ دوسری ڈائری تاریخ وار لکھی گئی تھی۔ اس میں ٹھاکر کے شب و روز

بھی تھے' واقعات بھی اور اس کے بدلتے ہوئے رجحانات کا عکس بھی۔

وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی ایک بات سے پوری طرح متفق تھی۔ عبدالحق کی ٹھاکر پرتاپ کے ہاں پیدائش میں اللہ کی کوئی مصلحت تھی' اللہ کا کوئی بھید تھا' جو وہی جانتا تھا۔ ورنہ عبدالحق کو تو واقعی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔

اب وہ سوچتی تھی کہ اماں پہلی بار اوپر گئیں تو چھوٹے ٹھاکر کو پُرسہ دینے گئی تھیں۔ مگر وہ اتنا اچھا لگا کہ اسے بیٹا بنالیا۔ وہ تو اسے اپنے گھر بلانے پر تلی ہوئی تھیں۔ اگر خود اس نے مزاحمت نہ کی ہوتی تو وہ اسے ہر حال میں اپنے گھر لے آتیں۔ اماں کہتی تھیں...... اس میں کافروں اور مشرکوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بتوں کی پوجا نہیں کرتا۔ وہ حق کی جستجو میں ہے۔ اور اماں کہتی تھیں کہ میں ہر نماز میں اللہ سے اس کی ہدایت کے لیے دعا کرتی ہوں۔

اماں تو خیر اس سے ملتی رہی تھیں۔ باتیں کرتی رہی تھیں۔ لیکن باجی نے تو اس سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ وہ تو بس اس سے محبت کرتی تھیں اور ان کا یقین تھا کہ وہ ایک دن مسلمان ہو جائے گا۔ کیسے؟ صرف محبت کی وجہ سے! وہ اسے اتنا یقینی طور پر سمجھتی تھیں۔ تو اس کی اپنی محبت میں کوئی کمی تھی کہ وہ اسے کافر اور مشرک سمجھتی اور کہتی رہی۔

بہرحال اب ڈائری پڑھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ اماں اور باجی دونوں درست تھیں اور وہ غلطی پر تھی۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس وقت کے چھوٹے ٹھاکر کے لیے اس کی اور باجی کی محبت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور وہ اس پر شرمندہ ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری ڈائری پڑھتے ہوئے ایک مقام ایسا آیا کہ وہ ہل کر رہ گئی۔ ٹھاکر نے لکھا تھا......

"مجھے اپنے پتر کی صورت دیکھے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی تو دل میں آتا تھا کہ اسے اسکول سے اٹھالوں۔ اسکول سے اچھی پڑھائی کا تو میں گھر پر بھی بندوبست کر سکتا تھا لیکن ہر بار میں نے خود کو سمجھایا کہ گاؤں میں میرا بیٹا کتنا ہی علم حاصل کر لے' کنویں کا مینڈک رہے گا۔ شہر میں' اسکول میں وہ بہت کچھ سیکھے گا۔ میں اپنی خودغرضی پر کڑھتا تھا۔ مگر میں کیا کرتا' رنجو کے بعد میرے پاس اوتار سنگھ کے سوا تھا ہی کیا۔

پھر اس دن میری برداشت جواب دے گئی۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اب اوتار سنگھ گھر آئے گا۔ مگر اس میں ابھی دس پندرہ دن باقی تھے۔ اور میں اسے دیکھے بنا نہ رہ سکتا تھا۔ میں اس کے ساتھ تین دن گزارنے کی غرض سے دہلی چلا گیا۔

میں ان تین دنوں میں اس کو ہر پل اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ اسکول جانا تو مجبوری تھی۔ مگر شام کو وہ کتابیں لے کر کوٹھے پر جانے لگا۔ مجھے فخر ہوا کہ اسے پڑھائی کی کتنی فکر ہے۔ میں اس کے ساتھ اوپر چلا گیا کہ وہ پڑھے' تب بھی میں اسے دیکھتا رہوں۔

مگر اوپر پہنچ کر وہ پڑھنے کی بجائے مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ میرے ٹوکنے پر اس نے کہا کہ امتحان ہو چکے ہیں۔ اب میں آگیا ہوں تو وہ مجھے دیکھنا بھی چاہتا ہے اور مجھ سے باتیں کرنا بھی چاہتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ بات کچھ اور ہے۔ بلکہ مجھے ایسا لگا کہ وہ پڑھائی کے لیے کوٹھے پر نہیں آیا' کسی اور وجہ سے آیا ہے۔ بیٹا کتنا ہی ذہین ہو' باپ کا تجربہ تو اس کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ باپ بیٹوں کے بہت سے راز بغیر کہے سمجھ جاتے ہیں۔ میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ ہو رہا تھا...... جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا' ہو نہ ہو' یہ کوئی لڑکی کا چکر ہے۔ میرا پتر محبت کرنے کی عمر میں داخل ہو گیا ہے۔

میں نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں اسے موقع دے رہا تھا کہ وہ جس مقصد کے تحت اوپر آیا ہے' وہ پورا کرے۔ اور میں چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کی نظریں مجھ پر جمی تھیں وہ اِدھر اُدھر نہیں بھٹک رہی تھیں۔ وہ پورے دھیان کے ساتھ مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اپنی بدگمانی پر شرمندگی ہونے لگی۔ وہاں اردگرد اور کوٹھے بھی تھے۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا مگر مجھے کسی کوٹھے پر کوئی لڑکی نظر نہیں آئی۔ پھر بھی میرے دل کو یقین تھا کہ کوئی بات ضرور ہے اور سامنے بھی آئے گی۔"

یہ عبارت پڑھتے ہوئے خنک موسم میں بھی نور بانو کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کسی بہت بڑے راز سے پردہ اٹھنے والا ہے۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا' کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی کوٹھے پر کوئی لڑکی آتی ہو اور چھوٹے ٹھاکر کو اس سے محبت ہو گئی ہو۔ مگر پھر اسے باجی کا خیال آیا' جو عصر کی نماز میں بھی سستی کرتی تھیں اور قرآن پڑھتے ہوئے وضو کے بہانے اٹھ جاتی تھیں اور چھوٹے ٹھاکر کو دیکھتی تھیں۔ تو کیا چھوٹا ٹھاکر بھی انہیں دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں کانٹا سا چبھ گیا۔ یہی بات ہو گی۔

پھر اسے شرمندگی ہوئی۔ اب تو وہ بہن دنیا میں بھی نہیں تھی۔ اور وہ اس سے رقابت محسوس کر رہی تھی۔

اس نے سر جھکایا اور دوبارہ ڈائری پڑھنے لگی......

"پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ اوتار سنگھ نے مجھ سے کہا کہ اسے ٹیچر کی ضرورت ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے کہا' کانتی پرشاد جی ہیں نا۔ اس پر وہ بولا...... نہیں پتا جی۔ مجھے عربی پڑھنی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ مگر میں نے کہا کہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اس کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ وہ کچھ شرمندہ نظر آنے لگا اور بولا کہ وہ اس بار گرمی کی چھٹیاں دہلی میں گزارنا چاہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد عربی پڑھ لینا چاہتا ہے۔ کیونکہ عربی میں وہ دس سال پیچھے ہے اور چاہتا ہے

کہ ان چھٹیوں میں یہ فرق پورا کر لے۔

میرے لیے تو وہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ میں تو پورا سال ان چھٹیوں کی راہ دیکھتا تھا کہ میرا پتر میرے ساتھ وقت گزار سکے گا۔ میں اس سے کیسے دست کش ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ تم فکر نہ کرو۔ تم چھٹیاں گاؤں میں بھی گزار سکو گے اور عربی بھی پڑھ لو گے۔

اس رات میں سوچتا رہا۔ اوتار سنگھ کو عربی پڑھنے کا خیال کیسے آیا؟ اور وہ بھی اتنا اچانک؟ اسکول اور کالج کے دونوں میں میرا سب سے قریبی دوست مسلمان تھا۔ میں جانتا تھا کہ عربی مسلمانوں کی زبان ہے۔ ان کی مقدس کتاب اس زبان میں ہے۔ تو کیا یوں ہے کہ اسے کسی مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن یہ تو کوئی معترضانہ خیال نہیں تھا۔ مجھے تو بالکل ابتدا ہی میں واضح طور پر بتا اور سمجھا دیا گیا تھا۔ مجذوب نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اپنے بیٹے کی ہر بات ماننی ہو گی۔ میں اسے کسی بات سے نہیں روکوں گا۔ وہ جس طرف جانا چاہے گا' میں اسے اسی طرف جانے دوں گا۔ اور جوتشی نے مجھ سے کہا تھا...... چھوٹے ٹھاکر اپنا بھاگ آپ لکھیں گے۔ اور بالکل ابتدا میں میرے شیر خوار بچے نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے مجذوب اور جوتشی کی باتیں ہمیشہ یاد رکھنی ہوں گی۔ شاید میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی تھا۔ اگر اوتار سنگھ نے مسلمان عورت کا دودھ پینے کی ضد کی تھی اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی تو یہ امکان بھی قوی تھا کہ وہ اپنے لیے مسلمان پتنی چنے گا۔ تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن میرا جی چاہا کہ اس لڑکی سے ملوں' اس کے سر پر ہاتھ رکھوں۔ بیٹے کا رجحان دیکھ کر ہی تو میں نے مسلمانوں کو اور ان کے دھرم کو سمجھنے کے لیے مطالعہ شروع کیا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ جو کچھ میں نے پڑھا اور جانا تھا' اس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میرے مطالعے کا شوق اور بڑھ گیا تھا۔

اگلے روز میں اس کے اسکول جا کر ہیڈ ماسٹر سے ملا۔ ان کی مدد سے مجھے اوتار سنگھ کے لیے عربی کا استاد مل گیا۔ مولوی برکت علی ہمارے ساتھ گاؤں میں چھٹیاں گزارنے پر بھی رضا مند ہو گئے۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ کم از کم چھٹیوں میں تو وہ مجھ سے دور نہیں ہو گا۔

مگر مجھے اس معاملے کی کھوج تھی۔ اگلے دن شام کو وہ اچانک بے چین نظر آنے لگا۔ وہ مجھ سے بات کر رہا تھا لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا مجھے اس پر محبت آ گئی۔ میں نے خود اس سے کہا...... تم پڑھنے کے لیے اوپر نہیں جاؤ گے پتر؟...... اس نے بے پروائی سے کہا...... نہیں پتا جی' آپ کے ساتھ وقت گزارنے کا یہ موقع میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے کہا...... دو گھنٹے کی تو بات ہے پتر۔ جاؤ' تم پڑھ لو۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی میں بازار جاؤں۔

میرے کہنے پر وہ اوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی دبے پاؤں زینے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے سامنے نہیں گیا۔ بلکہ چھپ کر اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کتاب نہیں کھولی تھی۔ مگر وہ اِدھر

اُدھر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ تو بس سر جھکائے بیٹھا تھا خاصی دیر ہوگئی۔ اس نے سر اٹھا کر ایک بار بھی کسی کی جستجو میں نظر نہیں دوڑائی۔ مجھے شرمندگی ہونے لگی کہ میں نے اس پر شک کیا...... اسے غلط سمجھا۔ لیکن پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ بظاہر وہ پڑھنے کے لیے کوٹھے پر آیا ہے۔ جبکہ اب تک اس نے ایک بار بھی کتاب کھول کر نہیں دیکھی' کوئی بات تو ہے۔

میں وہاں سے ہٹنے ہی والا تھا کہ اچانک نیچے سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔ وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ وہ آواز سنتے ہی میرے اوتار سنگھ کے جسم میں جیسے کوئی برقی رو دوڑ گئی۔ اس نے سر اٹھایا اور اپنے سامنے دیکھنے لگا۔ لیکن اگلے ہی پل مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ اس وقت کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ہے وہ تو صرف سن رہا تھا...... اور اس میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ میں اس کے سامنے بھی چلا جاتا تو وہ مجھے نہ دیکھ پاتا۔

میں نے اوتار سنگھ سے دھیان ہٹا کر لڑکی کی آواز پر توجہ کی۔ چند ہی لمحوں میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ لڑکی قرآن پڑھ رہی ہے۔ میرا زمانۂ تعلیم کا ساتھی امان اللہ اکثر میرے سامنے قرآن پڑھا کرتا تھا۔ اس لیے مجھے یہ بات معلوم تھی۔ مگر میرے خیال میں میرے بیٹے کو اس بات کا علم نہیں ہوگا بلکہ اسے تو یہ بھی مشکل سے ہی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ عربی زبان ہے۔

بہرحال میری سمجھ میں بات آگئی کہ وہ عربی کیوں سیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے اگلے دن بھی مشاہدہ کیا۔ بات میری سمجھ میں آگئی۔ اوتار سنگھ صرف وہ آواز سننے کے لیے کوٹھے پر جاتا تھا۔ وہ آواز رکتی تو وہ مشکل سے دو تین منٹ وہاں ٹھہرتا۔ آواز رکتے ہی اس کی محویت ٹوٹتی۔ وہ اس بچے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا جس سے اس کا من پسند کھلونا چھین لیا گیا ہو۔ پھر وہ نیچے کا رخ کرتا۔

اتنی بات تو سمجھ میں آگئی۔ مگر اس کے ساتھ الجھنیں بھی بڑھ گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسی دلچسپی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اوتار سنگھ کھڑا ہوتا اور جالیوں کے پاس جا کر اس لڑکی کو دیکھتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو بس مبہوت ہو کر اس آواز کو سنتا تھا۔ میں نے ایک بار بھی اسے اپنی جگہ سے اٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ اب اسے محبت تو نہیں کہا جاسکتا۔

تین دن دہلی میں گزار کر میں گاؤں چلا آیا۔ ایک ہفتے بعد اوتار سنگھ کو بھی آنا تھا۔ میں اس معاملے پر سوچتا رہا۔ اگر اوتار سنگھ اس لڑکی کی خاطر عربی سیکھ رہا ہے تو پھر یہ تو محبت ہی ہوئی۔ لیکن وہ اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ غیر معمولی بات ہے۔

گرمی کی چھٹیاں شروع ہوئیں اور وہ سب گاؤں آگئے۔ ان کے ساتھ اوتار سنگھ کے نئے استاد مولوی صاحب بھی تھے۔ میں نے رگھو اور رنجنا سے الگ الگ بات کی۔ رنجنا سے باتوں ہی باتوں میں نیچے والوں کے بارے میں پوچھا۔ وہاں تین لڑکیاں تھیں۔ یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ

اوتار سنگھ ان میں سے کس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ نیچے والوں کے ہاں پردہ بہت سخت ہے۔

پندرہ دن بعد میں نے مولوی صاحب سے اوتار سنگھ کی پروگریس پوچھی۔ وہ خود حیران تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں زندگی میں ایسا لائق اور محنتی شاگرد کبھی نہیں ملا۔ وہ اتنا تیز چلتا ہے کہ وہ بھی تھک جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی علم کی لگن غیر معمولی تھی۔

میں نے یہ بات بہت پہلے سمجھ لی تھی کہ اوتار سنگھ کو کبھی کسی بات سے روکنا نہیں ہے۔ مجھے اس کی محبت پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس کی خوشی کے لیے میں کوئی بھی قربانی دے سکتا تھا۔ مجھے پریشانی بس اس بات کی تھی کہ دھرم کے فرق نے اس معاملے کو پیچیدہ بنا دیا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا خود بہ خود کوئی حل نکل آئے گا۔ ویسے یہ بات تو میرے لاشعور میں کہیں پہلے سے موجود تھی کہ مسلمان عورت کے دودھ کی ضد کرنے والے اوتار سنگھ کو محبت بھی کسی مسلمان لڑکی سے ہی ہوگی......"

نور بانو نے ڈائری بند کر دی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ یہ اسے وہ بات معلوم ہوئی تھی' جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی وہ سمجھ گئی تھی کی باجی کی محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ چھوٹا ٹھاکر بھی ان سے محبت کرتا تھا۔ آج باجی زندہ ہوتیں اور یہ بات انہیں معلوم ہوتی تو وہ کیسی خوش ہوتیں۔

اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا تھا۔ اسے اپنے گھر کا پرانا معمول یاد تھا۔ عصر کی نماز کے بعد تینوں بہنیں قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھیں...... مغرب کی اذان تک۔ اور پھر مغرب کی نماز پڑھتی تھیں۔ اور اسے یاد تھا کہ ابتدائی دنوں میں اس کی نگاہوں میں ہر وقت چھوٹے ٹھاکر کی صورت پھرتی تھی۔ اور اس بات پر وہ خود سے چڑنے لگی تھی۔ بس قرآن پڑھتے ہوئے اسے چھوٹے ٹھاکر کے تصور سے چھٹکارا ملتا تھا۔ تو ان دنوں وہ اس ضرورت کے تحت بھی قرآن کی تلاوت کرتی تھی...... اور تلاوت کے دوران اس کی کیفیت عجیب ہوتی تھی۔ اسے گرد و پیش کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ وہ بلند آواز میں تلاوت کرنے لگی تھی۔ دو ایک بار اماں نے اسے اس پر ٹوکا بھی تھا۔ حالانکہ پہلے صرف باجی ہی بلند آواز میں قرأت کرتی تھیں۔

اسے یاد تھا کہ جس عرصے میں اس کا تلاوت کا رجحان بڑھا تھا' اس عرصے میں باجی تلاوت سے دور ہوگئی تھیں۔ وجہ تو وہ نہیں سمجھ سکتی تھی' مگر یہ حقیقت تھی وہ قرآن پڑھنے سے جی چرانے لگی تھیں۔ عصر اور مغرب کے درمیان وہ وضو کا حیلہ کر کے دالان میں وقت گزارنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اسے حساس ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں اس نکتے کی کوئی خاص اہمیت ہے' جیسے وہ سمجھ نہیں پا رہی ہے۔ کوئی اہم بات ہے' جو اس کے شعور کی گرفت میں آتے آتے پھسل جاتی ہے۔

بہر حال ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی وہ ڈائری اس کے لیے چشم کشا ثابت ہوئی تھی۔ اس کے ذریعے کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ٹھاکر کو باجی کے لیے اپنے بیٹے کی محبت کا ادراک ہو گیا تھا اور وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار بھی تھا۔ اب وہ بس یہی سوچ سکتی تھی کہ کاش اللہ نے اس کے حصے کی زندگی باجی کو اور باجی کے حصے کی موت اسے دے دی ہوتی تو آج محبت کی اس عجیب کہانی کو ایک خوش گوار انجام مل چکا ہوتا۔

وہ اس ڈائری کو پڑھتی گئی۔ وہ حیران تھی۔ اس ڈائری میں انکشافات ہی انکشافات تھے۔ وہ ڈائری ایک انسان کی عظیم باطنی تبدیلی کی گواہ تھی۔ یقینی طور پر وہ بہت ذاتی دستاویز تھی۔ اسے شرمندگی تھی کہ اس نے اسے بلا اجازت پڑھا۔ مگر اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ یہ بات بھی اس نے سمجھ لی کہ درحقیقت وہ ڈائری عبدالحق کی امانت تھی...... اس کے باپ کا ترکہ تھی۔ اور اسے پڑھ کر عبدالحق کو ایک بہت بڑی بات معلوم ہوتی اور ایک بہت بڑی خوشی حاصل ہوتی۔ اب اسے یہ بات عبدالحق کو بتانی تھی۔

ڈائری کے آخری چند اندراجات بے حد سنسنی خیز تھے۔ اور عبدالحق سے ان کا بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ اسی یقینی تبدیلی کا اعلان کر رہے تھے، جو آ چکی تھی۔ لیکن آخری اندراج نامکمل تھا اور اس کا براہ راست عبدالحق سے تعلق تھا۔

اس آخری اندراج میں ٹھاکر نے لکھا تھا......

''آج میں وقت سے پہلے ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے پتر پر قربان ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس کے بعد میں کبھی ڈائری نہیں لکھ سکوں گا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے کیدار ناتھ کے دو متر مجھ سے ملنے آئے۔ وہ جے پور سے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ چھوٹے ٹھاکر کی جان کو خطرہ ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے وجہ بتائی۔ اور وہ وجہ سن کر میرا دل خوش ہو گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اوتار سنگھ نے جے پور کے بڑے مندر کے تمام بت توڑ ڈالے ہیں۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ اس میں کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں۔ تب میرا جی چاہا کہ میں ہنسوں۔ بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ دباتا رہا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہم دونوں کو منزل ملنے والی ہے......

میں نے انہیں بتایا کہ اوتار سنگھ تو ابھی واپس نہیں آیا ہے۔ میں نے دیکھا، انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جے پور سے مشتعل لوگ بڑی تعداد میں ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم ان سے مقابلے کی تیاری کریں گے اور لڑیں گے۔

میں نے گاؤں کے تمام لوگوں کو بلوا بھیجا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ میری آخری آزمائش ہے۔

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ گاؤں والوں سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ انہیں بتا دوں گا کہ اوتار سنگھ پر کیا الزام ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد بڑی تعداد میں لوگ میرا ساتھ چھوڑ دیں گے لیکن ضرورت پڑی تو میں تنہا لڑوں گا اور آخری سانس تک لڑوں گا۔

مجھے ایک بات کا افسوس ہے۔ میں نے اپنے بارے میں جو سوچا تھا اور فیصلہ کیا تھا، اب مجھے اس پر عمل کرنے کی مہلت نہیں مل سکے گی۔ صرف اس لیے کہ اوتار سنگھ واپس نہیں آ سکا۔ مگر ساتھ ہی مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ اوتار سنگھ واپس نہیں آیا۔ اب میری نسل آگے بڑھ سکے گی۔

جس دن اوتار سنگھ پیدا ہوا تھا، مجذوب نے مجھ سے ایک بات کہی تھی آج وہ بات مجھے رہ رہ کر یاد آ رہی ہے۔ مجذوب نے کہا تھا......''جان دے دینا اس کے لیے۔ پھر تیرا کھوٹا سکہ بھی اشرفی کے مول چل جائے گا۔'' آج مجھے لگ رہا ہے کہ وہ بات پوری ہو گی۔ اور یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرا کھوٹا سکہ اشرفی کے مول چل چکا ہے۔

اب گاؤں کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ میں ڈائری بند کرتا ہوں۔''

اس کے بعد ڈائری کے تمام ورق سادہ تھے!

وہ آخری اندراج پڑھتے ہوئے نور بانو کو کچھ ہونے لگا۔ چھوٹے ٹھاکر نے جے پور کے بڑے مندر میں بت توڑے تھے۔ اس کے نتیجے میں اس کے گاؤں پر حملہ ہوا تھا لیکن اس کا گاؤں تو سرخ آندھی کی لپیٹ میں آ کر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔ کچھ بھی ہوا اور کچھ بھی ہوا ہو، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت تھی کہ چھوٹے ٹھاکر نے سنت ابراہیم علیہ السلام کو تازہ کیا تھا۔ اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس پر شروع ہی سے اللہ کی رحمت ہے۔ اس کے بغیر وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس بار وہ اس سے پوری طرح مرعوب ہو گئی۔

اب اسے بے تابی ہو رہی تھی کہ وہ عبدالحق کو ڈائری دے اور پڑھنے کے لیے اصرار کرے۔ عبدالحق کو تو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ اس ڈائری کے صفحات میں اس کے لیے کتنی خوشی چھپی ہے۔ وہ اسے وہ خوشی دینا چاہتی تھی۔

❀ ❀ ❀

عبدالحق کے دن اتنی مصروفیت میں گزر رہے تھے کہ اس کے پاس سوچنے کی مہلت ہی نہیں تھی۔ رہ گئیں راتیں تو رات کو وہ قرآن پاک پڑھنے میں مصروف رہتا۔ اس معاملے میں اسے احساس ہوتا کہ وہ دس سال پیچھے ہے اور اسے اس زیاں کی تلافی کرنی ہے۔

قرآن پاک وہ ترجمے کے ساتھ پڑھتا تھا...... اور ٹھہر ٹھہر کے، خوب غور کر کے پڑھتا تھا۔

قرآن میں اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں پڑھا تو اس کے لیے سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔ [illegible]یسے تو اس میں عاجزی بہت [illegible]ی لیکن [illegible] آ[illegible] [illegible]ھنے کے بعد اسے یہ احساس

ہونے لگا کہ اس میں عاجزی کم...... بہت کم ہے۔

پہلی بار اس نے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں پڑھا تو حیران رہ گیا۔ اس نے بھی تو اسی انداز میں سوچا تھا۔ اس کے بعد ہی تو اس کی تلاشِ حق کا آغاز ہوا تھا۔ ورنہ وہ اسی گم راہی میں پڑا رہتا، جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس نے بھی بے جان بتوں کو اس دلیل سے مسترد کیا تھا کہ وہ نہ کسی کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہ ہی ضرر پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ تو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ان کی پرستش کیوں کی جائے۔ پھر جب اس نے قرآن پاک میں وہ واقعہ پڑھا، جہاں ابراہیمؑ نے بت توڑے تھے، تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ فوراً ہی چوکنا ہو گیا۔ حالانکہ اس کی سمجھ میں وجہ نہیں آئی تھی۔ مگر اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں ایک لمحے میں وہ سب کچھ کھو سکتا ہے...... جہاں اس کے گم راہ ہو جانے کا قوی امکان ہے۔

وہاں رک کر اس نے غور کیا۔ وہ واقعہ پڑھتے ہوئے ایک ثانیے کو اسے ابراہیمؑ سے اپنی مماثلت پر فخر کا احساس ہوا تھا۔ مگر اس کے چوکنے پن نے فوراً ہی اسے دبا دیا۔ چند لمحے غور کرنے کے بعد بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس مماثلت میں فخر کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بلکہ مزید غور کرنے پر اسے منزل مل گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ خیال، اس کی یہ سوچ ہی گم راہ کن ہے۔ اللہ کے بندے، اللہ سے ڈرنے والے اس انداز میں نہیں سوچا کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مشرک گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ وہ صرف اللہ کی ہدایت ہے کہ اس کے دل میں یہ سوچ پیدا ہوئی اور اللہ کی رحمت ہے کہ اسے منزل ملی۔ ورنہ وہ عمر بھی تلاش حق میں بھٹکتا رہتا اور ناکام ہی رہتا۔ اور اگلے ہی لمحے جو اس کے ذہن میں خیال ابھرا، اس نے اسے لرزا دیا۔ صحرا کی سرد رات میں بھی اس کے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔ یہ میں نے سوچا بھی کیسے؟ وہ بڑبڑایا۔ اس کے لہجے میں پچھتاوا تھا...... ملامت تھی۔ کسی پیغمبر سے اپنی مماثلت کا تو خیال بھی بہت بڑی گستاخی ہے۔ اپنے بارے میں اتنا بڑا گمان! پستی کی انتہا اور اتنی بلندی کی خوش فہمی!!

اس نے عاجزی کے ساتھ موازنہ کیا تو پیغمبر کے عمل کی عظمت اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پیغمبر نے بت توڑے تو اس لیے کہ وہ اپنی قوم کو گم راہی سے بچانا چاہتے تھے۔ وہ انہیں ان کے عقائد کی کمزوری سے آگاہ کر رہے تھے کہ وہ ان سے مدد اور عافیت کے طلب گار ہیں، جو آپ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔ ان کا عمل اجتماعی فلاح کے لیے تھا۔ جبکہ اس کا عمل انفرادی تھا۔ وہ بس اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے دوسروں کی گمراہی اور ہدایت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ پھر پیغمبر کے عمل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ بلکہ ان گمراہوں کا سامنا کرنا پیغمبر کی اسکیم کا حصہ تھا۔ جبکہ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کا عمل پوشیدہ رہے۔ وہ پکڑا نہ جائے۔ پیغمبر نے اپنی مغضوب الغضب قوم کا سامنا کیا اور ان کے سامنے نظریۂ وحدانیت رکھا، کلمۂ حق بلند کیا۔ اپنے عمل کے نتائج کا سامنا

تن تنہا کیا۔ آگ میں جلائے جانے کی سزا بھی قبول کی۔ فرشتے کی امداد بھی گوارا نہیں کی اور صرف اللہ سے لو لگائی۔ اس کے نتیجے میں آگ بھی گلزار بن گئی۔ جبکہ اس کے عمل کے نتیجے میں اس کے گاؤں کے لوگ آزمائش میں پڑے۔ اس کے باپ اور اس کے چاہنے والوں کو زندگی کا نذرانہ دینا پڑا۔

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں جتنا اس نے پڑھا، اتنا ہی وہ ان کی شخصیت کا اسیر ہوتا گیا۔ ان کی شخصیت کا جزوِ اعظم اللہ کی محبت تھی۔ اور عبدالحق کا اپنا بھی ابتداء ہی سے مقصد یہی تھا۔ وہ اللہ سے ایسی محبت کرنا چاہتا تھا، جیسی کہ کرنی چاہیے۔ مگر اب حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں پڑھنے اور جاننے کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ یہ کہنا کہ آپ اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور دنیا کی ہر محبت اور ہر چیز سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں، بہت آسان ہے۔ مگر عملاً ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ سوچنا کہ آپ اپنا سب کچھ اللہ کے نام پر قربان کر سکتے ہیں، بہت آسان ہے مگر قربان کرنا پڑے تو پتا چلتا ہے۔

سچ تو یہ تھا کہ اللہ پر ایمان، اللہ کی فرماں برداری اور اللہ سے محبت کے بارے میں عبدالحق سب کچھ ابراہیم خلیل اللہ کے حوالے سے سمجھ رہا تھا۔ محض ایک خواب دیکھ کر اللہ کی خاطر بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جانا محبت کی مثال تھا۔ صرف ایک زندگی میں اللہ سے محبت کے متعدد روشن ثبوت چھوڑنا ابراہیمؑ کا ایسا کارنامہ تھا، جس پر انسانیت فخر کر سکتی تھی۔ فرمانبرداری اور اللہ پر بھروسہ ہی تو تھا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بیٹے کو لق و دق صحرا میں بہ ظاہر وسائل سے محروم بے سروسامانی کے عالم میں چھوڑ گئے تھے۔

عید قرباں گزر چکی تھی۔ عبدالحق نے اللہ کی راہ میں ایک جانور کی قربانی پیش کی تھی۔ مگر اب وہ سوچتا تھا کہ اس کی قربانی اس عظیم قربانی کے شایانِ شان تھی، جس کی یاد میں یہ دن منایا جاتا تھا۔ اس جانور کو قربان کرتے ہوئے اس کے دل میں کسی دکھ، کسی ملال کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ کیا قربانی ایسی ہوتی ہے؟

اس نے اس سلسلے میں مہر علی سے بات کی۔

"تو پتر، آپ ایسا کرو کہ ابھی ایک بچہ جانور کا لو اور اسے پالو"۔ مہر علی نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا مولانا؟"

"پالو گے تو پتا چلے گا۔"

"پھر بھی، کچھ بتائیں تو۔"

"پالو گے تو آپ کو اس سے محبت ہو جائے گی۔ وقت آئے گا تو قربان کرنے کو دل نہیں چاہے گا۔"

''کیا واقعی؟''

''پالنے کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے پتر جی۔ تب سمجھ میں آئے گی۔ پھر سوچنا کہ اصل پروردگار تو اپنا رب ہے۔ اور وہ اپنی مخلوق سے جو محبت کرتا ہے' وہ اولاد کے لیے ماں کی محبت سے کم از کم ستر گناہ زیادہ ہوتی ہے۔ جب خود محبت کرو گے تو پتا چلے گا۔''

عبدالحق کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ''یہ تو آپ نے بہت کام کی بات بتائی ہے۔ اس پر میں ضرور عمل کروں گا۔''

اگلی بار وہ شہر گیا تو وہاں سے اپنے لیے چھوٹا سا ایک مینڈھا بھی لے آیا۔ اسے اس نے پورے بازار میں گھوم پھر کر منتخب کیا تھا۔ یہ وہ سوچ کر نکلا تھا کہ جانور جب تک دل سے پسند نہیں ہوگا' نہیں خریدے گا۔

زبیر اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ ''مالک...... یہ تم لائے ہو...... اپنے لیے۔''

''ہاں۔''

''بے فکر رہنا مالک۔ میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ اس کا ہر کام میں خود کروں گا۔''

زبیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ مالک کے پاس فرصت تو تھی نہیں۔ اور بات ہو رہی تھی جانور پالنے کی۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ دل میں یہ ضرور سوچا کہ چار دن کا شوق ہے۔ اور کوئی مسئلہ بھی نہیں۔ جانور تو پہلے ہی پل رہے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ عبدالحق کی مصروفیت بہت تھی لیکن اس نے بچے مینڈھے کے لیے خاص طور پر وقت نکالا۔ وہ اسے خود ہی کھلاتا پلاتا۔ لیکن چار ہی دن میں اس کو فکر لاحق ہو گئی کہ وہ بڑا نہیں ہو رہا ہے۔ اس نے زبیر سے اس تشویش کا اظہار کیا۔

''ارے مالک...... چار دن میں جانور کتنا بڑا ہو سکتا ہے۔'' زبیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بڑا تو ہونا چاہیے نا۔''

''اب ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ اس کے بڑے ہونے کا تو پتا بھی نہیں چلے گا آپ کو۔''

''مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ بڑا ہوا ہی نہیں ہے۔'' عبدالحق بدستور فکر مند تھا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ کچھ خاص کھلانے کی ضرورت ہے اسے۔''

''ارے مالک' سب بڑھتے ہیں اپنی رفتار سے۔ ایک جیسا کھاتے ہیں سب۔''

''نہیں۔ یہ خاص ہے۔ بتاؤ تو' مجھے کیا کھلانا ہوگا اسے۔''

زبیر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''شوقین لوگ تو خشک میوہ بھی کھلاتے ہیں۔''

اس دن سے عبدالحق نے بچے مینڈھے کے لیے خشک میوے کا اہتمام کر دیا۔ دراصل اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد بڑا ہو جائے۔ اور اس کے خیال میں یہ جبھی ممکن تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ کھلایا جائے۔

اس کی توجہ اور محبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیسرے دن بچے مینڈھے کو دست لگ گئے۔ زیادہ کھلانا اور وہ بھی خشک میوہ' اس کا یہ نتیجہ تو نکلنا ہی تھا۔ عبدالحق کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

زبیر نے اس کے لیے دوا بنا کر دی۔ ''لیکن مالک' دوا سے زیادہ ضروری یہ سمجھنا ہے کہ زیادہ کھلانے سے یہ بڑا نہیں ہوگا۔ بلکہ پیٹ خراب ہو جائے گا اس کا۔ بڑا تو یہ اپنے وقت پر ہی ہوگا۔''

''تو میں زیادہ کب کھلاتا ہوں اسے۔'' عبدالحق نے احتجاج کیا۔

اسی وقت مہر علی بھی آ گئے۔ ''کیا ہو رہا ہے پتر؟''

''اب مالک' پاؤ بھر بادام کو آپ زیادہ ہی نہیں سمجھتے۔ میں کیسے سمجھاؤں۔'' زبیر نے بے بسی سے کہا۔

بات مہر علی کی سمجھ میں آئی تو انہوں نے عبدالحق کو سمجھانے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ ''دیکھ پتر' اللہ نے مینڈھوں کے لیے بادام پستے اور اخروٹ نہیں بنائے تھے۔ اب یہ تو تم محبت میں کھلاتے ہو۔ یہ سچ ہے کہ خشک میوہ کھانے سے اس میں طاقت آئے گی لیکن اعتدال ضروری ہے۔ صبح و شام دو دو چار چار دانے کھلا دیا کرو بس۔''

عبدالحق کا دل تو نہیں مانتا تھا لیکن مہر علی سے وہ بحث نہیں کرتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے مولانا۔''

''اور تم اسے باندھ کر رکھتے ہو پتر۔''

''جی مولانا''۔ عبدالحق نے سادگی سے کہا۔

''تو اس کا پیٹ تو خراب ہوتا ہی ہے۔ یہ تو بھاگنے والا جانور ہے پتر۔ یہ تو اس پر دو ظلم ہو گئے۔''

''لیکن ابھی تو یہ بہت چھوٹا ہے مولانا کھول دوں گا تو اِدھر اُدھر بھاگتا پھرے گا۔ مجھے ڈر لگتا ہے یہ بڑے بڑے بلڈوزر چلتے ہیں یہاں۔ میں اسے خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔''

مہر علی مسکرائے۔ ''اب سمجھ میں آ رہا ہے پتر کہ پالنا کیا ہوتا ہے۔'' وہ بولے۔ ''بہ ظاہر تو ماں باپ بچے کو پالتے ہیں لیکن پروردگار صرف رب ہوتا ہے۔ وجہ؟ انسان کسی کی خبر گیری نہیں کر سکتا۔ جو اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں' اس سے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ جو اس کی عقل اور اس کے حواس سے باہر ہو اسے اس کا علم نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو ماں چاہتی ہے کہ اس کا بچہ ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ اور پروردگار سب جانتا ہے۔ علم سارے کا سارا اسی کا ہے۔ اس نے

پیدا کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی مخلوق کی کیا ضرورتیں ہیں۔ وہ ہر پل اپنی ہر مخلوق سے باخبر رہتا ہے۔ اور ہر پل اس کی تمام ضرورتیں پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اسی لیے تو اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں ہے۔ اسی لیے تو ماں کی محبت میں پریشانی اور تفکرات ہیں۔ اور اللہ کی محبت میں جو ماں کی محبت سے ستر گنا سے بھی زیادہ ہے' تحفظ اور حاجت روائی ہے۔ پریشان اور فکر مند تو وہ ہوتا ہے نا' جو بے بس ہو۔ تو پتر عبدالحق' یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھا کرو کہ پروردگار وہ ہے۔ تم کسی کو موت سے نہیں بچا سکتے۔ اور اگر تم کسی کو کچھ دیتے ہو' کسی کے لیے کچھ کرتے ہو تو وہ بس ایک اعزاز ہے جو اللہ نے تم کو عطا کیا ہے۔''

عبدالحق بڑی توجہ سے مہر علی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ان کی دانش کا قائل تھا۔ وہ بڑی مشکل باتیں بڑی آسانی سے سمجھا دیتے تھے۔

''تو پتر عبدالحق' تم اپنے جانور کو اس کی ضرورت سے زیادہ نہ کھلاؤ۔ اور اسے کھلا رکھو۔ اس کی حفاظت اللہ کا کام ہے۔''

عبدالحق نے اس نصیحت پر عمل شروع کر دیا۔

پندرہ دن بعد اسے اندازہ ہوا کہ محبت کا جذبہ جانوروں میں بھی ہوتا ہے۔ ان کا ننھا مینڈھا سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ وہ کہیں بھی ہوتا۔ مینڈھا دوڑ کر اس کی طرف چلا آتا۔ اور وہ پھرتیلا بہت تھا۔ گاڑیوں سے ایسے بچتا کہ وہ دیکھتا رہ جاتا۔ کبھی وہ جانوروں کے باڑے میں بھی چلا جاتا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ وہ کہیں منہ نہیں مارتا تھا۔ بلکہ جو کچھ بھی کھاتا تھا' صرف عبدالحق کے ہاتھ سے کھاتا تھا۔ اس کا علم بھی عبدالحق کو اتفاق سے ہی ہوا تھا۔

وہ جب بھی شہر جاتا تھا' زبیر سے اپنے مینڈھے کا خیال رکھنے کو کہہ کر جاتا تھا لیکن کبھی یہ نوبت نہیں آئی کہ زبیر کو اسے کھلانا پڑے' عبدالحق شام سے پہلے واپس آ جاتا تھا۔

مگر اس روز اسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ وہ گھر پہنچا تو رات ہو گئی تھی۔ کھانا کھانے کے لیے بیٹھا تو مینڈھا یاد آیا۔

''میرا مینڈھا کہاں ہے؟ ٹھیک تو ہے؟'' اس نے زبیر سے پوچھا۔

''وہ اپنے شیڈ میں ہے مالک۔ پر اس نے کچھ کھایا نہیں ہے۔''

''کھایا نہیں ہے کا مطلب؟''

عبدالحق کا نوالہ منہ میں لے جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

''میں نے بہت کوشش کی۔ لیکن اس نے کھایا ہی کچھ نہیں مالک۔''

عبدالحق نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ ''بیمار تو نہیں ہے وہ؟''

''نہیں مالک۔''

''تو پھر اس نے کچھ کھایا کیوں نہیں؟''

''وہ آپ کے ہاتھ سے کھانے کا عادی ہو گیا ہے مالک۔ اس نے رابعہ کے ہاتھ سے بھی نہیں کھایا۔''

عبدالحق اٹھا اور شیڈ کی طرف چل دیا۔ زبیر لالٹین لیے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ عبدالحق کو زبیر کی اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ مینڈھا اس کے علاوہ کسی کے ہاتھ کا نہیں کھاتا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔

مینڈھا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا تھا اور جاگ رہا تھا۔ عبدالحق کے پاؤں کی چاپ سن کر وہ اٹھا اور ممیانے لگا۔ عبدالحق شیڈ میں داخل ہو کر اس طرف بڑھا تو مینڈھا بھی اس کی طرف لپکا لیکن رسی نے اسے روک دیا

عبدالحق نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا سر تھپ تھپایا۔ ''کیا بات ہے مینو۔ کچھ کھاتا کیوں نہیں؟''

مینڈھا اس کے جسم سے اپنا سر رگڑتے ہوئے لاڈ بھری آواز میں ممیاتا رہا۔ عبدالحق نے اپنے ہاتھ سے گھاس اس کی طرف بڑھائی تو وہ بڑے بے صبرے پن سے کھانے لگا۔ پھر عبدالحق نے اپنے ہاتھ پر چارہ رکھ کر اسے کھلایا اور اس نے معمول کے مطابق کھایا۔ کھاتے ہوئے اس کی کھردری زبان اس کی ہتھیلی سے ٹکراتی تھی تو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

''تو میرے مینو کی عادتیں بگڑ گئی ہیں۔'' عبدالحق کھلاتے ہوئے کہتا رہا۔ ''اب نخرے ہو گئے ہیں اس کے۔ میرے علاوہ کسی کے ہاتھ سے نہیں کھائے گا۔'' اس کے لفظوں میں شکایت تھی لیکن اس کے برعکس لہجے میں فخر اور مسرت تھی۔

چارے کے بعد اس نے بادام پستے اور اخروٹ کی چند گریاں ہتھیلی پر رکھیں۔ مینو بڑی رغبت سے مزے لے لے کر کھاتا رہا۔

''دیکھ لیا مالک!'' زبیر نے کہا۔ ''آپ نے سچ مچ اسے بگاڑ دیا ہے۔''

مینو کھانے کے بعد عبدالحق کی ہتھیلی کو ممنونیت سے چاٹ رہا تھا۔ اس رات عبدالحق کو ایسا لگا کہ اسے مینو سے محبت ہو گئی ہے۔

❀ ❀ ❀

پاکستان بننے کے چند ماہ بعد ہی ہندوؤں اور انگریزوں کی ملی بھگت اور منافقت واضح ہو گئی۔ مطالبہ پاکستان کو تو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مسلمانوں کی بہت بھاری اور قطعی اکثریت اس کے پیچھے تھی۔ لیکن ملک کی تقسیم تو ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے اپنے اس اختیار کو اس طرح استعمال کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں مسلمان اپنے مطالبے پر پچھتائیں اور پاکستان کو دوبارہ بھارت میں ضم کرنے کی پیشکش خود ہی کر دیں۔

کسی بھی ملک کی تقسیم آسان نہیں ہوتی۔ اس میں بڑی پیچیدگیاں' بڑے الجھاؤ ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم صرف جغرافیائی نہیں ہوتی کہ بس ایک لکیر کھینچ کر سرحد بنادی۔ اس میں وسائل بھی تقسیم ہوتے ہیں۔ فوج کی تقسیم کے ساتھ اسلحہ بھی تقسیم ہوتا ہے...... اور کرنسی بھی۔ پھر قدرتی وسائل کا معاملہ بھی ہوتا ہے' جو بہت اہم ہوتا ہے۔ یہاں قدرتی وسائل میں پانی کی بہت اہمیت تھی۔ اور دریا اگرچہ پاکستان میں تھے لیکن تمام آبی ذخائر ہندوستان میں تھے۔ اس پر مستزاد ہندوستان سے بھاری تعداد میں ہجرت کرکے آنے والوں کی نوآبادکاری کا مسئلہ تھا۔ اور ہجرت کے دوران ہندوؤں کی مکاری اور سکھوں کی سفاکی نے جو منظر ابھارا تھا' وہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ تھا۔

چنانچہ آثار یہی بتاتے تھے کہ پاکستان قائم تو ہوگیا ہے لیکن زیادہ عرصہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ اسے بالآخر بھارت کا دست نگر بن کر رہنا پڑے گا۔

عبدالحق کی لگن اور محنت رنگ لائی۔ ریت کے نیچے دبے ہوئے تمام گاؤں برآمد ہوئے اور حق نگر کے نام سے ایک ہوگئے۔ لیکن خوش حالی اب بھی ایسا خواب تھا' جس کی تعبیر محال تھی۔ وجہ تھی پانی کی کمی۔ پانی ہی موجود نہیں تھا۔ تو نہری نظام کی بحالی سے کیا ہوسکتا تھا۔ دریاؤں میں پانی بہت کم تھا اور آبی ذخائر موجود نہیں تھے۔

گاؤں میں جو کاشت کار آبسے تھے' وہ اس صورت حال سے مایوس تھے لیکن ان کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو صورت حال گاؤں کی تھی' کم وبیش وہی پورے ملک کی تھی۔ اور ان سب کا تو زمین پر کوئی کلیم بھی نہیں تھا۔ کلیم والوں کو بھی زیادہ تر بارانی زمینیں ہی مل رہی تھیں۔ یہاں کم ازکم انہیں زمین تو مل گئی تھی چنانچہ وہ تن بہ تقدیر ہوگئے۔

پریشانی کے ساتھ ہی سہی' بہرحال عبدالحق کو فرصت ملی تو اسے اس کے بارے میں سوچنے کا موقع ملا' جس کے بارے میں وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اور وہ تھی نور بانو۔ اسے نور بانو کی بے چینی کی فکر تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس نے دہلی میں نور بانو سے کوئی وعدہ کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ پاکستان میں اس کے چچا کو تلاش کرے گا اور اسے ان تک پہنچائے گا۔

اب اسے اس خیال سے گھبراہٹ ہورہی تھی کہ کیا وہ خود نور بانو کو خود سے دور کرنے کا سامان کرے گا۔ کم ازکم اس وقت وہ اس کی قربت تو محسوس کرسکتا ہے۔ چاہے کئی دن اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھے۔ یہ خیال تو رہتا ہے کہ وہ اس کے قریب موجود ہے۔

لیکن وعدے کی پاس داری اُس کے خون میں شامل تھی۔ کتنا ہی بڑا نقصان ہو' وہ وعدے سے رُوگردانی نہیں کرسکتا تھا۔ البتہ مصروفیت کی بات اور تھی۔ پچھلے دنوں وہ گاؤں کے معاملات میں اس طرح الجھا رہا تھا کہ اماں کو بھی بھول گیا تھا۔ اماں کی ایک جھلک دیکھے بھی کئی کئی دن ہو جاتے تھے۔ مگر اب وہ آزاد تھا۔

اُس رات وہ نور بانو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دہلی میں اوپر والے مکان میں رہنے کے دوران نور بانو کا رویہ اُسے یاد تھا۔ وہ اُن لوگوں سے ڈرتی تھی۔ اور اسے وہ گفتگو بھی یاد تھی جو اُس سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے چچا کے ہاں آگرہ جانا چاہتی تھی۔ پھر پتا چلا کہ وہ لوگ پہلے ہی پاکستان جا چکے ہیں۔ تب انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان میں انہیں ڈھونڈ نکالے گا اور اُسے ان تک پہنچا دے گا۔

اب اسے شرمندگی ہورہی تھی۔ یہاں آکر وہ اپنا وعدہ بھول گیا۔ اپنے ضمیر کی حد تک تو وہ مطمئن تھا۔ اُس نے دانستہ کوتاہی نہیں کی تھی۔ وہ زیادہ بڑے معاملات میں الجھ گیا تھا۔ ایک آدمی کے مستقبل پر بہت سارے لوگوں کے مستقبل کو بہرحال فوقیت دینی پڑتی ہے۔ اتنے دن اُس نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں لیکن اب اسے فکر ہورہی تھی کہ نور بانو اُس کے بارے میں کس انداز میں سوچتی ہوگی۔ کون جانے' وہ اُس کی نیت پر بھی شبہ کرتی ہو۔

وہ یہ سوچتے سوچتے سوگیا کہ نور بانو کا سامنا وہ کیسے کرسکے گا!

❁ ❁ ❁

نور بانو کو وہ دن بہت مبارک لگا۔ بہت دن کے بعد اسے عبدالحق کی جھلک نظر آئی تھی۔ اُس نے سوچا' آج وہ اُس سے بات کرے گی اور اُس کے باپ کی ڈائری اور کتابیں اُسے سونپ دے گی۔

وہ ایک طرف کھڑی رہی۔ عبدالحق حمیدہ کے کمرے سے نکلا۔ توقع کے عین مطابق وہ اُسے نہ دیکھ سکا۔ وہ سر جھکائے آگے بڑھتا رہا۔

''سنیے......'' نور بانو نے اُسے پکارا۔

وہ یوں رُکا' جیسے اُس زمین نے اُس کے قدموں کو پکڑ لیا ہو۔ پھر وہ آہستہ سے پلٹا۔

''جی...... فرمایئے۔'' اُس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

نور بانو اپنی جگہ کھڑی تھی۔ عبدالحق کا سر جھکا کر بات کرنا اُس کے لئے غیر معمولی نہیں تھا لیکن اُس کے لہجے نے اسے عجیب سا احساس دلایا۔ وہ جیسے احساسِ جرم کا شکار ہو رہا تھا۔ مگر کیوں؟ ایک لمحے کو وہ الجھ کر رہ گئی۔

چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ عبدالحق بدستور مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

''ایک بہت ضروری اور اہم بات کرنی تھی آپ سے۔'' نور بانو نے کہا۔

سر جھکا کر کھڑے عبدالحق نے سوچا' شرمندگی کا وہ لمحہ آگیا' جس سے وہ ڈر رہا تھا۔ اُس کے بس میں ہوتا تو وہ وہاں سے بھاگ جاتا۔ کہنے کو تو اُس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

اُس کی کیفیت سے بے خبر نور بانو نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ اتنے دن گزر گئے۔ یہ بات تو مجھے بہت دن پہلے کرلینی چاہئے تھی لیکن موقع ہی نہیں ملا۔ آپ کی

مصروفیت......''

عبدالحق نے سوچا' وہ اخلاق اور مروت کی وجہ سے شکایت کے بجائے افسوس کا اظہار کر رہی ہے' جیسے کوتاہی اس بے چاری کی ہو۔ اب ایسے میں چپ رہنا ٹھیک نہیں۔ وہ ایسے جتنے لفظ کہے گی' اتنی ہی اُس کی شرمندگی بڑھے گی۔ چنانچہ اُس نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں نور بی بی۔ مجھے اپنی ذمے داری یاد ہے۔ اتنے دن گاؤں کی الجھنوں میں مجھے خیال نہیں رہا لیکن اب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ اب میں آپ کا کام کر کے واپس آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

نور بانو اتنی حیران تھی کہ کچھ کہہ بھی نہ سکی۔ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اُس کے کس کام کی اور اپنی کس ذمے داری کی بات کر رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ وہ چور سا کیوں ہو رہا تھا۔

اُس نے سر جھٹکا اور حمیدہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

❁ ❁ ❁

زبیر بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ''مالک...... اتنے بڑے ملک میں تم انہیں کہاں ڈھونڈو گے؟''

''اللہ مدد کرنے والا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے وعدے کی عزت ضرور رکھے گا۔'' عبدالحق کے لہجے میں یقین تھا۔

''لیکن یہ اتنا بڑا ملک......''

عبدالحق نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''سب سے بڑا کیمپ تو لاہور میں ہے مہاجروں کا۔'' اُس نے کہا۔ ''پھر سب سے زیادہ مہاجر کراچی میں جا کر آباد ہوئے ہیں۔ لاہور میں پتا نہ چلا تو میں کراچی چلا جاؤں گا۔''

''مگر مالک' آپ ایک بات بھول رہے ہو۔''

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

''وہ لوگ کافی پہلے پاکستان چلے آئے تھے۔''

عبدالحق چونکا۔ زبیر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نور بانو کے چچا اپنی فیملی سمیت پاکستان بننے سے کم از کم ایک ماہ پہلے پاکستان چلے آئے تھے۔ اُس وقت تو مہاجروں کے کسی کیمپ کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ تو وہاں سے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر بات تو وعدہ نبھانے کی تھی۔ کام مشکل ہو یا ناممکن' عبدالحق جانتا تھا کہ اُسے کرنا ہی ہے۔ اب وہ اللہ سے مدد کی دعا ہی کر سکتا ہے۔ اُس نے بہر حال یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ان کے

بارے میں معلوم کر کے ہی واپس آئے گا۔

''ٹھیک ہے زبیر۔ لیکن ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔'' اُس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''مجھے جانا ہے۔ کوشش کرنی ہے۔ تم مجھے ان کے بارے میں پوری معلومات دے دو۔''

زبیر ہچکچا رہا تھا۔ ''مالک...... ایک صورت اور ہے۔''

عبدالحق نے پھر اسے مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

''میں چلا جاتا ہوں۔ جو کچھ آپ کر سکتے ہیں' وہ میں بھی کر سکتا ہوں۔''

''نہیں۔'' عبدالحق نے بلا جھجک کہا۔ ''انہیں ڈھونڈنے کی اہلیت مجھ میں تم سے زیادہ ہے۔ دوسرے وعدہ میں نے کیا تھا۔ ذمے داری بھی میری ہے۔ خدانخواستہ میں ناکام ہو جاؤں تو کم از کم میرا ضمیر تو مطمئن رہے گا کہ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ تم ناکام ہوئے تو میں بدگمانی ہی کرتا رہوں گا کہ تم نے کوتاہی کی ہے......''

''مالک...... آپ جانتے ہو کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' زبیر نے احتجاج کیا۔

''جانتا ہوں' لیکن ایسی صورت حال میں بدگمانی فطری ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ تم چلے جاؤ گے تو رابعہ کی حق تلفی ہوگی۔ میں جاؤں گا تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

یہ سن کر تو زبیر جیسے تڑپ گیا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو مالک۔ تمہارے نہ ہونے سے تو پورے گاؤں کو فرق پڑے گا......''

''اچھا بس۔'' عبدالحق نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو میں کہتا ہوں' وہ کرو۔ تم مجھے وہ کاغذ لا کر دو' جس پر ان لوگوں کے متعلق معلومات لکھی ہیں۔''

اُس کے لہجے نے زبیر کو سہما دیا۔ اُس نے کبھی زبیر سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ''جو حکم مالک۔'' زبیر نے کہا اور گھر کی طرف چلا گیا۔

عبدالحق کو افسوس ہوا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ضروری ہے۔ وہ اس لہجے میں بات نہ کرتا تو زبیر اس کے بجائے خود جانے پر اصرار کرتا رہتا۔ وہ اُسے کبھی نہ جانے دیتا۔

عبدالحق دل میں اللہ سے مدد کی دعا کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ کام بہت مشکل ہے۔

اگلی صبح نور بانو ٹھاکر پرتاب سنگھ کی کتابیں اور ڈائریاں لیے اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس نے رات کو بھی کافی دیر تک عبدالحق کا انتظار کیا تھا۔ صبح وہ اُس کی پوری بات سنے بغیر ہی چلا گیا تھا اور وہ اُس کی بات سمجھ بھی نہیں پائی تھی۔ مگر اب اُس نے سوچا تھا' پہلے اس کی امانتیں اُسے سونپے گی اور وضاحت بعد میں کرے گی۔

لیکن وہ رات کو آیا ہی نہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پچھلے دنوں وہ اتنا مصروف رہا

تھا کہ رات کو اماں کے پاس کم ہی آپاتا تھا۔ صبح کو بھی وہ بہت سویرے ہی ہو کر چلا جاتا تھا۔ ہاں باہر اُس کی جھلک ضرور نظر آ جایا کرتی تھی۔

خاصی دیر ہوگئی اور وہ نہیں آیا۔ نور بانو کتابیں اور ڈائریاں لے کر حمیدہ کے کمرے میں چلی گئی۔ حمیدہ کی آنکھیں اب بالکل ٹھیک ہو چکی تھیں۔ البتہ وہ نظر کا چشمہ لگانے لگی تھی۔ دوا سے تو اسے نجات مل چکی تھی۔ البتہ عرقِ گلاب کا معمول اب بھی جاری تھا۔

نور بانو نے حمیدہ کو سلام کیا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں عرقِ گلاب ڈالا۔ حمیدہ نے آنکھیں موند لیں۔

نور بانو بیٹھی انگلیاں مروڑتی رہی۔ ہر آہٹ پر ایسے لگتا تھا کہ عبدالحق آ رہا ہے لیکن وہ نہیں آیا۔ حمیدہ سے پوچھتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی لیکن کب تک۔ آخر اُس سے رہا نہیں گیا۔

''اماں...... وہ نہیں آئے اب تک؟''

حمیدہ نے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ مگر وہ غیر معمولی بات تھی۔ نور بانو نے خود سے عبدالحق کے بارے میں بات کبھی نہیں کی تھی۔ چنانچہ حمیدہ نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔ ''کون؟ کس کی بات کر رہی ہے بیٹی؟''

''وہ...... وہ...... عبدالحق......'' سردی کے موسم میں بھی نور بانو کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔

''وہ کہاں سے آئے گا۔ وہ تو چلا گیا۔''

نور بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''چلے گئے؟ کہاں چلے گئے؟''

''وہ تو لہور گیا۔ ہو سکتا ہے' اور آگے بھی جائے۔''

''لاہور! لیکن کیوں اماں؟''

اُس کے لہجے میں ایسی پریشانی' ایسا صدمہ تھا کہ حمیدہ کو پہلی بار مکمل یقین ہوا کہ وہ عبدالحق سے محبت کرتی ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس پر خوش ہوتی۔ مگر اس وقت تو اُسے اُس پر غصہ آ رہا تھا۔ ''تیرے ہی لئے تو گیا ہے۔ تُو نے ہی تو بھیجا ہے اسے۔'' حمیدہ کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور ملامت بھی۔

نور بانو کے لئے وہ لفظ' وہ لہجہ...... سبھی کچھ خلافِ توقع تھا۔ وہ تو ہکا بکا رہ گئی۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

حمیدہ نے بھی کچھ نہیں کہا...... اُس نے آنکھیں صاف کر کے چشمہ لگایا اور نور بانو کو غور سے دیکھتی رہی۔ اُس کا ردِعمل اُسے بے ساختہ لگا۔ اُس میں بناوٹ تو کہیں سے نہیں تھی۔

نور بانو کو سمجھنے میں چند منٹ لگے۔ پھر اُس نے حیرت سے کہا۔ ''میرے لئے گئے ہیں وہ!

میں نے بھیجا ہے انہیں؟ نہیں اماں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ کس نے کہا آپ سے؟''

حمیدہ سوچ میں پڑ گئی۔ گزشتہ روز عبدالحق دوپہر کو اُس کے پاس آیا تھا اور اسے بتا کر اُس سے اجازت لی تھی۔ وہ تو ہچکچا رہی تھی۔ مگر اُس نے کہا تھا...... اماں' اس کام سے مجھے نہ روکنا۔ مجھے وعدہ پورا کرنا ہے۔

''خود اُس نے بتایا ہے مجھے۔'' حمیدہ نے کہا۔ پھر نرم لہجے میں پوچھا۔ ''تُو نے کل صبح اُس سے کیا بات کی تھی دھیے؟''

نور بانو جانتی تھی کہ اُس نے عبدالحق سے کہیں جانے کو نہیں کہا۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ عبدالحق جھوٹ نہیں بولتا۔ تو پھر یہ معاملہ کیا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ''میں نے...... میں نے تو کوئی بات نہیں کی ایسی۔'' وہ بولی۔

''تیری کل اُس سے کوئی بات نہیں ہوئی دھیے؟'' حمیدہ کے لہجے میں اصرار تھا۔

اچانک نور بانو کو گزشتہ صبح یاد آئی۔ ''بات! بات تو انہوں نے مجھے کرنے ہی نہیں دی تھی۔ وہ خود پتا نہیں کس ذمے داری کی...... اپنی کس شرمندگی کی بات کرنے لگے۔ پھر بولے کہ اب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا اور آپ کا کام کر کے ہی واپس آؤں گا۔ میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ اور میری تو انہوں نے سنی ہی نہیں۔''

اب حمیدہ الجھ گئی۔ یہ کیا معما ہے؟ ''تُو اُس سے کیا کہنا چاہتی تھی دھیے؟''

نور بانو نے یہ تو نہیں بتایا کہ بڑے ٹھاکر کی ڈائری میں کیا لکھا تھا۔ وہ تو خود بھی پڑھ کر پچھتا رہی تھی۔ وہ سب کچھ جاننے کا پہلا حق تو عبدالحق کا تھا۔ تاہم اُس نے حمیدہ کو یہ بتا دیا کہ وہ ڈائری عبدالحق کے لئے بہت اہم ہے۔ اور وہ اسے اُس کے باپ کی کتابیں اور ڈائری دینا چاہتی تھی۔

حمیدہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ''وہ تو اور ہی کچھ سمجھا تھا۔ پگلا کہیں کا۔''

نور بانو کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ ''اب مجھے یہ تو بتا دیجئے اماں کہ وہ لاہور کیوں گئے ہیں......؟ اور وہ بھی میرے لئے!'' اُس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''تُو نے کبھی اُس سے کوئی وعدہ لیا تھا بیٹی؟'' حمیدہ نے الٹا اُس سے سوال کیا۔

نور بانو کا تو دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ وہ تو اپنی دانست میں محروم تھی اور یہاں اُس پر یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ وہ جس پر کبھی اپنی دلچسپی کا اظہار بھی نہ کر سکی' اُس سے مطالبے کرتی رہی ہے۔ بلکہ اُس کے لئے تو یہ تہمت کے مترادف تھا۔ ''اماں...... میں تو کبھی چھوٹے......'' اُسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ ذہنی طور پر اُس زمانے میں پہنچ گئی ہے' جب عبدالحق چھوٹا ٹھاکر ہوا کرتا تھا۔ مگر اب اسے اُس کو اس طرح پکارنے کا کوئی حق نہیں۔ اُس نے جلدی سے تصحیح کر لی۔ ''...... میرا مطلب ہے اماں کہ میں تو کبھی ان کے سامنے ہی نہیں آئی۔ میں نے تو کبھی اُن سے بات بھی نہیں

کی۔ پھر میں ان سے کوئی وعدہ کیسے لے سکتی تھی؟"

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نظریں اسے اپنے وجود کے آر پار دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ "تُو یاد تو کر دھیے۔ عبدالحق میرے سامنے چھوٹے سے بڑا ہوا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔"

مگر نور بانو کا حیا اور شرمندگی سے برا حال تھا۔ اُس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ ایسی کوئی بات اسے یاد آ ہی نہیں سکتی تھی۔ دوسری طرف حمیدہ کے لہجے میں بڑا دعویٰ تھا...... چیلنج تھا۔ اور یہی بات کبھی اُس کی شہید اماں نے بھی کہی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ انہیں جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔
"میں بھی جانتی ہوں اماں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔" اُس نے بے بسی سے کہا۔ "مگر اماں، میں بھی سچ کہہ رہی ہوں کہ مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں۔ میں نے تو کبھی ان سے بات بھی نہیں کی۔"

حمیدہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی۔ اُس کے چہرے پر اُلجھن تھی۔ پھر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔ اُس نے پوچھا۔ "تیرے کوئی رشتے دار بھی ہیں بیٹی......؟"

"ہاں اماں۔ ایک چچا تھے میرے آگرے میں......" اور یہ کہتے کہتے اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ "ارے ہاں اماں...... وہ......! مگر وہ تو اُس وقت کی بات ہے اماں جب میرے گھر پر قیامت ٹوٹی تھی۔ جب مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس وقت میں بس کسی اپنے کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ مجھے ہر جگہ ڈر لگتا تھا......" اُسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ صفائی پیش کرنے والے ملزم کے انداز میں بات کر رہی ہے۔ وہ حمیدہ کو بہت تفصیل سے بتا رہی تھی کہ اُس کی ماں، بہنوں، بوا اور آکا پر کیا گزری تھی۔

حمیدہ دیکھ سُن اور سمجھ رہی تھی۔ ایک بات پوری طرح واضح تھی۔ نور بانو اب یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کے لہجے میں عبدالحق کے جانے کا دکھ تھا۔ مگر اُس دکھ سے زیادہ اُس کے لہجے میں اسی بات کا خوف تھا کہ کہیں عبدالحق اُس کے چچا کو تلاش نہ کر لے اور اسے اپنے چچا کے پاس جانا نہ پڑ جائے۔ اُس لمحے حمیدہ کو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ نور بانو عبدالحق سے محبت کرتی ہے۔

اُس نے بڑی محبت سے نور بانو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اسے قریب کر کے لپٹا لیا۔ "تُو فکر نہ کر دھیے۔ رب کی مہربانی سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اُس نے اُسے تھپکتے ہوئے دلاسہ دیا۔
نور بانو کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح اُس سے چپکی رہی۔ "نہیں اماں! وہ وعدے کے پکے ہیں۔" اُس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور وہ کہہ کر گئے ہیں کہ اب میرا کام کر کے ہی واپس آئیں گے۔"

"میں نے کہا نا دھیے، تُو فکر نہ کر۔ اتنے بڑے ملک میں کسی کو صرف اُس کے نام سے ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں۔"

"مجھے اس کا ہی تو ڈر ہے اماں تو کیا وہ واپس ہی نہیں آئیں گے۔"
اس بار حمیدہ کو اس محبت کی گہرائی کا بھی پتا چل گیا۔ نور بانو کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔
اُدھر نور بانو کو بھی احساس ہوا کہ اس بحران میں وہ اپنے دل کا بھید کھول بیٹھی ہے۔ وہ حمیدہ سے الگ ہوئی۔ اُس نے حمیدہ کے چہرے کو غور سے دیکھا اور وہاں تفہیم کا رنگ دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔
اُس لمحے میں، جب وہ بھاگ ہی نہیں سکتی تھی اور حیا کی وجہ سے وہ حمیدہ کا سامنا بھی نہیں کر پا رہی تھی، باہر سے قدرتی مدد میسر آ گئی۔ اُسے رابعہ کی پکار سنائی دی۔ وہ بے حد پریشان لہجے میں اُسے پکار رہی تھی۔ "منجھلی بی بی...... نور بی بی...... کہاں ہو؟"
"خیر تو ہے۔" حمیدہ نے پریشان ہو کر کہا۔
"میں دیکھتی ہوں اماں۔" نور بانو بولی اور اٹھ کر باہر کی طرف لپکی۔ کتابیں اور ڈائریاں حمیدہ کی چارپائی پر ہی رہ گئی تھیں۔

❁ ❁ ❁

باہر رابعہ پریشان کھڑی تھی۔ نور بانو باہر نکلی۔ "کیا بات ہے آپا؟" اُس نے رابعہ سے پوچھا۔
"وہ منجھلی بی بی، مینو کچھ کھا ہی نہیں رہا ہے۔" رابعہ کے لہجے میں سراسیمگی تھی۔
نور بانو جانتی تھی کہ مینو عبدالحق کے مینڈھے کا نام ہے۔ اور بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ مینو عبدالحق کے ہاتھ سے کھانے کا عادی تھا۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ مگر جب عبدالحق واپس آ گیا تھا اور اُس نے آدھی رات کو مینو کو اپنے ہاتھ سے کھلایا تھا۔
لیکن اب اور بات تھی۔ نور بانو کو لگتا تھا کہ عبدالحق خدانخواستہ بہت دنوں کے لئے چلا گیا ہے۔ تو اب مینو کا کیا بنے گا؟ وہ بھی پریشان ہو گئی۔ "اب کیا ہو گا آپا؟"
"کچھ سمجھ نہیں آتا۔ میں نے اور زبیر نے تو بہت کوشش کر لی۔ پر وہ کچھ کھاتا ہی نہیں۔ کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہے اُس نے۔"
"کچھ تو کرنا ہو گا۔ وہ تو جلدی آنے والے نہیں۔"
"آپ چلو نا منجھلی دیدی۔ آپ کوشش کرو۔ شاید کچھ کھا لے۔"
"میں؟" نور بانو نے حیرت سے کہا۔ "مجھ سے تو وہ بالکل بھی مانوس نہیں ہے۔"
"آپ جانوروں سے محبت کرتی ہیں۔ اور جانور محبت کو سمجھتے ہیں منجھلی بی بی۔"
نور بانو کو اپنے والے بکری بچوں کا خیال آ گیا۔ یہ جانوروں سے محبت اُس نے یہاں آ کر ہی تو سیکھی تھی۔ اور اب تو وہ بچے بھی نہیں رہے تھے۔ بڑے ہو رہے تھے۔ ان میں ایک بکرا تھا اور ایک بکری۔ چھوٹے تھے تو وہ بھی بہت نخرے کرتے تھے۔ مگر اب کھلے پھرتے تھے۔ نور بانو کی

دلچسپی بھی اب کم ہو گئی تھی۔ وہ بچے تھے تو وہ ان میں بہت کشش محسوس کرتی تھی۔

مینو بہت خوب صورت تھا۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن وہ کبھی اُس کے قریب نہیں آتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ عبدالحق گاؤں میں ہوتا تو مینو ہر وقت اُس کے ساتھ ہی لگا رہتا تھا۔

"چلو نا منجھلی دیدی۔" رابعہ نے اسے چونکا دیا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ کچھ فائدہ ہوگا۔"

"کوشش تو کرو منجھلی دیدی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ مینو کو کچھ ہو نہ جائے۔"

اُس لمحے نور بانو کو مینو پر ایسا پیار آیا کہ وہ خود بھی حیران ہو گئی۔ "اللہ نہ کرے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا مینو کو۔ چلو آپا۔" دونوں باہر نکل آئیں۔ "مینو ہے کہاں؟" نور بانو نے پوچھا۔

"اپنے شیڈ میں ہے۔"

"یہ غلطی ہوئی ہے نا۔ اسے کھول دینا چاہئے تھا۔ خود ہی کھا لیتا کہیں نہ کہیں۔"

"کھولا تھا منجھلی بی بی۔ کھایا تو اُس نے کچھ نہیں۔ پاگلوں کی طرح پورے گاؤں میں مَیں مَیں کرتا پھرا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مالک کو ڈھونڈ رہا ہے۔ سچ منجھلی بی بی! مجھے تو رونا آنے لگا۔ تبھی تو شیڈ میں لا کر باندھا ہے اُسے۔"

نور بانو نے سوچا' واقعی یہ تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ یوں تو اسے کھولنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔ کھولیں گے تو وہ ہر طرف عبدالحق کو ہی تلاش کرتا پھرے گا۔ مسئلہ کافی ٹیڑھا تھا۔

وہ دونوں شیڈ میں پہنچ گئیں۔ مینو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھ کر نور بانو کو کچھ ہونے لگا۔ اس کا پیٹ بالکل پچک گیا تھا اور ابھی سے وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔

مینو نے ایک بار بڑی بے زاری میں نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ مگر فوراً ہی سر جھکا لیا۔ اُس نے منہ سے کوئی آواز نہیں نکالی۔

نور بانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر سکتی ہے۔ زبیر اور رابعہ تو شروع ہی سے مویشی پالنے والے تھے۔ مگر وہ مینو کو کچھ نہیں کھلا سکے تو وہ کیسے کھلا سکتی ہے۔ وہ سوچتی رہی۔ مگر اس مسئلے کا کوئی حل اُسے سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کچھ کرو نا منجھلی بی بی۔" رابعہ نے اُسے ٹہوکا دیا۔

"سوچنے تو دو آپا۔"

نور بانو نے شیڈ کا جائزہ لیا۔ وہ صرف مینو کے لئے بنایا گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے شیڈ میں صرف مینو بندھا ہے۔ لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ شید کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہاں بھوسے اور کھل کی بوریاں بھی موجود تھیں۔ یعنی اسے گودام کے طور پر بھی استعمال کیا

جاتا تھا۔ اُس کے علاوہ وہاں چارہ کاٹنے کی مشین بھی لگی تھی۔ ایک طرف گھاس کا ڈھیر تھا۔ یہ سردی کا موسم تھا۔ اس لئے وہاں سوکھی گھاس تھی۔ سردیوں میں ہری گھاس نہیں ہوتی تھی۔

"آپ کچھ کرو منجھلی بی بی۔ میں ابھی آتی ہوں۔" رابعہ نے کہا اور شیڈ سے چلی گئی۔

نور بانو نے سوچا کہ رابعہ اور زبیر اگر مینو کو کھلانے میں ناکام ہو گئے ہیں تو وہ آسانی سے تو کچھ کھائے گا نہیں۔ اور ابھی وہ اُس سے مانوس بھی نہیں ہے۔ اس لئے پہلے کچھ کھلانے کی کوشش کرنے کی بجائے دوستی کی جائے...... اسے خود سے مانوس کیا جائے۔

چنانچہ وہ مینو کے پاس بیٹھ گئی اور اُس کا سر سہلانے لگی۔ بکروں اور مینڈھوں کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ ان کے سر کے اگلے حصے میں کوئی میکنزم ہوتا ہے۔ وہاں ہاتھ لگاؤ تو وہ پُر جوش ہو جاتے ہیں...... ہیجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ان میں جارحیت بھی جاگ اٹھتی ہے۔

نور بانو کو اپنی دو بکریوں کا تجربہ تھا۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا لیا اور مینو کی کمر سہلانے لگی۔

شروع میں تو مینو کے انداز میں بے نیازی تھی۔ اُس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ مگر چند منٹ بعد نور بانو کو اپنے ہاتھ پر اُس کی گرم گرم سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ شاید وہ سونگھ رہا تھا۔

نور بانو کو تجربہ ہو گیا تھا کہ جانوروں کو بھی باتیں سننا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور وہ خود بھی بہت بوجھل ہو رہی تھی۔ دل پر ایسا بوجھ تھا' جو وہ کسی کے سامنے بھی ہلکا نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ بے زبان مینو کی بات اور تھی۔ وہ نہ کچھ سمجھتا اور نہ نور بانو کو حیا آتی۔

لیکن ایسے میں اسے رابعہ کی بات یاد آئی۔ ایک بار رابعہ نے کہا تھا...... جانور ہر بات سمجھتے ہیں۔ بس بول نہیں سکتے۔

"چلو ایسا ہی سہی۔" نور بانو نے مینو کی کمر سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم سن لو' سمجھ بھی لو۔ مگر کسی سے کچھ کہو گے تو نہیں۔"

مینو ویسے ہی بیٹھا رہا۔ اُس کی گرم سانسیں نور بانو کے ہاتھ کو چھوتی رہیں۔

"تمہاری قصوروار میں ہوں۔" نور بانو کہتی رہی۔ "لیکن سچ پوچھو تو میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ انہوں نے خود ہی ایک مطلب نکالا اور چل دیے۔ اب بتاؤ' میں نے تو کچھ نہیں کہا نا۔ لیکن سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ ان کے جانے کی ذمے دار میں ہوں۔"

نور بانو کا ہاتھ اب مینو کی گردن کو سہلا رہا تھا۔ اب لگتا تھا کہ اس لمحہ میں مینو کو کوئی کرنٹ محسوس ہو رہا ہے۔ کیونکہ وہ کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا اور سر اٹھا کر نور بانو کو دیکھ رہا تھا۔

"تم پر جو گزر رہی ہے مینو' میں اسے سمجھ سکتی ہوں۔ میں تم سے کم تکلیف میں نہیں ہوں۔ لیکن تم اظہار تو کر سکتے ہو۔ کھانا پینا چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟ میں تو کچھ بھی نہیں کر

سکتی۔" اُس کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور بے بسی بھی۔ "میں تو کسی سے کچھ کہہ ہی نہیں سکتی۔ اب تم ہی کہو' میرا دکھ بڑا ہے نا؟ مگر میں تمہاری دل جوئی کر رہی ہوں۔ اور تم ہو کہ نخرے کیے جا رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں میری دل جوئی کرنی چاہیے۔"

مینو اب بھی سر اٹھا کر معصومیت سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

نور بانو نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شیڈ میں کوئی نہیں تھا۔ رابعہ ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ "دیکھو نا مینو' تم تو بہت خوش نصیب ہو۔ ہر وقت ان کے ساتھ لگے پھرتے ہو۔ تمہارے سب کام وہی کرتے ہیں۔ تمہارے لاڈ کرتے ہیں' ناز اٹھاتے ہیں تمہاری سیری نہیں ہوتی؟" اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا' جیسے سچ مچ جواب کی توقع کر رہی ہو۔ "اور ایک میں ہوں۔ کبھی چلتے پھرتے اُن کی ایک جھلک دیکھ لی تو دیکھ لی۔ اب میں اُس سے بھی گئی۔"

مینو نے ہلکی سی آواز نکالی' جیسے تائید کر رہا ہو۔

وہ مینو کا پہلا مثبت ردِعمل تھا۔ یعنی مانوس ہونے کا عمل شروع ہو رہا تھا۔ لیکن نور بانو کو پتا نہیں چلا۔ برسوں میں پہلی بار وہ اندر کی بات کسی سے کہہ رہی تھی اور اُسے ڈر بھی نہیں تھا۔

"بہ ظاہر تو تمہاری محرومی بڑی ہے۔ کیونکہ میرے پاس تو کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔ اور تمہارے پاس سب کچھ تھا۔" وہ کہتی رہی۔ "لیکن غور کیا جائے تو میری محرومی تم سے بہت بڑی ہے۔ یہ تو برسوں کی محرومی ہے۔ اور پھر تم تو اس کا اظہار بھی کرتے ہو۔ میں تو نہیں کر سکتی۔ اور تم تو کچھ بھی نہیں جانتے جبکہ میں جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اُن کی واپسی آسان نہیں۔ نجانے کتنا وقت لگے انہیں واپس آنے میں اور کون جانے......" اُس نے گہری سرد آہ بھری۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "میں بس دعا ہی کر سکتی ہوں۔ اور اب تو مجھے تمہاری بھی فکر ہے۔ تمہیں کچھ ہو نہ جائے......"

اس بار مینو کی مَیں مَیں زیادہ طویل تھی۔

"سنو سنو' تم کچھ کھاؤ گے نہیں تو خدانخواستہ مر جاؤ گے۔ اور ایسا ہو گیا تو یہ میرے لئے ایک اور شرمندگی ہو گی۔" اُس نے سر جھکا کر مینو کی چھوٹی سی تھوتھنی پر اپنا رخسار رکھ دیا۔ "مجھ پر مہربانی کرو مینو' کچھ کھا لو۔ مجھے شرمندگی سے بچا لو۔" آنسو اب اُس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

اچانک مینو کی کھردری زبان اُس کے رخسار کو چاٹنے لگی۔ اسے ناگوار نہیں ہوئی۔ بلکہ اچھا لگا۔ چند لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ مینو اُس کے آنسو چاٹ رہا ہے۔

"مینو' میں تمہاری نسبت زیادہ محبت کرتی ہوں اُن سے......"

اسی لمحے باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں اُن سے کتنی محبت کرتی ہوں۔" نور بانو نے جلدی سے کہا۔ "لیکن دیکھ لو۔ میں نے کھانا نہیں چھوڑا۔ یہ تو حماقت ہے۔ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو......"

رابعہ شیڈ میں داخل ہوئی۔ وہ منظر دیکھ کر وہ بولی۔ "اوہو...... باتیں ہو رہی ہیں مینو سے۔ لگتا ہے' دوستی ہو گئی۔"

نور بانو اب محتاط ہو گئی تھی لیکن اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تمہیں کھانا پڑے گا مینو...... میری خاطر......"

مینو نے مَیں مَیں کر کے کچھ کہا۔

نور بانو وہاں سے ہٹی۔ اُس نے دانے کے ڈھیر سے مٹھی بھر دانہ اٹھایا۔ اور مینو کے سامنے دانے والا ہاتھ پھیلا دیا۔

مینو نے گہری سانس لی۔ وہ ایسا تھا' جیسے اُس نے زور سے پھونک ماری ہو۔ سارا دانہ اُڑ گیا۔ چند دانے نور بانو کی ہتھیلی پر رہ گئے۔

"چلو دانے کو دل نہیں چاہتا تو نہ سہی۔ گھاس کھا لو۔" نور بانو نے اُس کی طرف سوکھی گھاس بڑھائی۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اُس کی گردن سہلا رہی تھی۔ "چلو جلدی سے کھا لو ننھے بچے...... شاباش۔ ضد نہیں کرتے۔"

لیکن مینو نے منہ پھیر لیا۔ وہ گھاس کو منہ لگانے کو تیار نہیں تھا۔

"اچھا چلو۔ میں تمہارے نخرے اٹھاتی ہوں۔ گھاس کاٹتی ہوں تمہارے لئے۔"

نور بانو نے چارہ کاٹنے کی مشین میں تھوڑی سی سوکھی گھاس کاٹی اور ہتھیلی پر رکھ کر مینو کی طرف بڑھا دی۔ "لو...... اب تو کھا لو۔ دیکھو میں نے یہ گھاس صرف تمہارے لئے کاٹی ہے۔"

مینو چند لمحے سر اٹھا کر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے سر جھکایا اور بے دلی سے سہی' مگر کٹی ہوئی گھاس کھانے لگا۔ لیکن اس نے زیادہ نہیں کھایا۔ لگتا تھا کہ معصوم جانور زندہ رہنے کے لئے کھانا سیکھ رہا ہے۔

"آپ نے تو کمال کر دیا منجھلی بی بی۔" رابعہ نے خوش ہو کر کہا۔

میرا نہیں' یہ محبت کا کمال ہے۔ نور بانو نے دل میں سوچا۔

❊ ❊ ❊

پناہ گزینوں کا کیمپ ایسا تھا کہ عبدالحق نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہاں اُس نے وہ مناظر دیکھے جن کا اُس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور جو کچھ اُس نے وہاں سنا اور جانا وہ اس سے بھی سوا تھا۔ اُسے تو ایسا لگا کہ وہ زندگی کی تعلیم حاصل کرنے یہاں آیا ہے۔

وہ رحیم یار خاں سے عرفان احمد کا تعارفی سفارشی خط اپنے ساتھ لایا تھا۔ کیمپ کے انچارج مسعود احمد خان عرفان احمد کے کلاس فیلو تھے اور دونوں میں بہت اچھی دوستی رہی تھی۔ "مسعود تمہاری ہر ممکن مدد کرے گا۔" عرفان احمد نے کہا تھا۔

عبدالحق کیمپ پہنچ کر مسعود صاحب سے ملا اور انہیں عرفان احمد کا خط دیا۔ مسعود صاحب نے وہ خط پڑھا' سرسری انداز میں عبدالحق کو دیکھا اور بولے۔ ''اندر بلاؤ نا انہیں۔''

عبدالحق نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''کسے بلاؤں جناب؟''

''ارے بھئی اُسی کو جس کے بارے میں عفّی نے یہ خط لکھا ہے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ پھر دوبارہ خط کا جائزہ لیا اور نام پڑھنے کے بعد بولے۔ ''عبدالحق صاحب کو۔''

''عبدالحق میرا ہی نام ہے جناب۔''

مسعود صاحب نے اُسے یوں دیکھا' جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ ''جس عبدالحق کے بارے میں عفّی نے خط میں لکھا ہے' وہ تم ہو!''

''جی صاحب۔''

مسعود صاحب چند لمحے خاموش ہو کر سوچتے رہے۔ ''عفّی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' انہوں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''اگر آپ محکمۂ زراعت کے سیکشن آفیسر عرفان احمد صاحب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تو الحمدللہ وہ خیریت سے ہیں۔''

مسعود صاحب ہنسنے لگے۔ ''میں اُسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ ہم اسے پیار سے عفّی کہتے تھے اور وہ مجھے مجّو کہتا تھا۔'' وہ ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ ''وہ اپنی ڈیوٹی تو کر رہا ہے نا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی باقاعدہ سے۔ مگر آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں ان کے لئے؟''

''تمہاری وجہ سے پریشان ہو رہا ہوں برخوردار۔ اچھا یہ بتاؤ' تمہاری عمر کیا ہے؟''

''جی...... میں 22 سال کا ہوں۔'' خلافِ عادت عبدالحق نے عمر بڑھا کر بتائی۔

''لگتی تو نہیں اتنی۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''مگر خیر' عفّی نے خط میں جو کچھ لکھا ہے' اُس کے مطابق تو تمہیں بہت بڑا ہونا چاہئے۔ اتنی سی عمر میں کوئی اتنا کچھ کیسے کر سکتا ہے۔''

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ عرفان صاحب نے محبت میں میرے بارے میں کیا کچھ لکھ دیا ہے۔ لیکن......''

''میں عفّی کو بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ بلاوجہ کسی کی تعریف نہیں کرتا۔ ارے...... میں نے تمہیں بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ بیٹھو نا۔''

عبدالحق نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں بیٹھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ پہلی بار اُس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اسے دیکھ کر اسے اپنے مینو کا شیڈ یاد آ گیا۔ جس میز کے پیچھے مسعود صاحب بیٹھے تھے' اُس کا بھی ایک پایا ندارد تھا۔ پائے کی کمی پوری کرنے کے لئے میز کے نیچے اوپر تلے چند اینٹیں رکھ دی

گئی تھیں۔ کمرے میں موجود واحد کرسی پر مسعود صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں بائیں سبزی اور فروٹ کی متعدد پیٹیاں اور ٹوکرے رکھے تھے۔ ان میں سے کچھ تو بھرے ہوئے لگ رہے تھے۔ بلکہ ٹٹولے بغیر تو یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ ان میں سے کون سا خالی ہے۔ ''جی...... میں یہیں ٹھیک ہوں'' اُس نے گڑبڑا کر کہا۔

''ارے نہیں بھئی' یہاں تکلف کی کوئی گنجائش نہیں۔'' مسعود صاحب اُس کی کیفیت بھانپ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''یہاں خالی پیٹیاں رکھی ہیں۔ یہ لے لو بیٹھنے کے لئے۔'' انہوں نے اپنے بائیں جانب اشارہ کیا۔

عبدالحق اُس طرف بڑھا۔ تب اُس کی نظر مسعود صاحب کی کرسی پر پڑی۔ وہ ان کی میز سے بھی آگے کی چیز تھی۔ وہ دو پایوں سے محروم تھی اور اینٹوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ عبدالحق پیٹی اٹھا کر لایا اور میز کے سامنے رکھی۔

''اس سے کام نہیں چلے گا میاں۔ میں تم سے غائبانہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

عبدالحق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے انہیں تکتا رہا۔

''نہیں سمجھے۔ چلو بیٹھ کر دیکھو سمجھ جاؤ گے۔''

وہ پیٹی پر بیٹھا اور بات فوراً ہی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پیٹی پر بیٹھ کر نہ تو وہ مسعود صاحب کو دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی وہ انہیں نظر آ سکتا تھا۔ غائبانہ گفتگو کے تصور پر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ ایک اور پیٹی اٹھا لایا۔ دو پیٹیاں اوپر تلے رکھ کر وہ بیٹھ گیا۔

''ہاں بھئی عبدالحق میاں' اب ہوگی بات۔ یہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ تم بھی کسی کی تلاش میں آئے ہو۔''

عبدالحق نے تمام کوائف بیان کر دیے۔

''یہ کام تو مشکل [illegible] ہے۔'' مسعود صاحب نے تفصیل سن کر کہا۔ ''وہ لوگ پاکستان بننے سے ایک ماہ پہلے ہی یہاں آ گئے۔ اُس وقت تو یہاں کوئی کیمپ تھا نہیں۔ اور جو لوگ پہلے آئے عام طور پر یہاں ان کی پہلے سے کوئی سیٹنگ تھی۔ کوئی دوست' کوئی رشتے دار' جس نے انہیں یہاں بلایا۔ ان کے لئے کچھ بندوبست کیا۔ اب ایسے لوگوں کا کیمپ سے تو پتا چلنا میرے خیال میں ممکن نہیں۔''

عبدالحق مایوس نظر آنے لگا۔ مسعود صاحب کی بات معقول تھی۔

''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔'' مسعود صاحب نے جلدی سے کہا۔ ''یہ وقت ہی معجزوں کا ہے۔ میں نے تو یہاں ایسے ایسے لوگوں کو ملتے دیکھا ہے کہ جو ایک دوسرے کو رو بیٹھے تھے۔ تم فکر نہ کرو۔ انشاءاللہ وہ لوگ تمہیں مل جائیں گے۔''

اُسی وقت ایک ادھیڑ عمر شخص کمرے میں آیا۔ اُس نے ایک کاغذ کا ٹکڑا مسعود صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ مسعود صاحب نے غور سے اُس کا جائزہ لیا اور پھر اُس پر دستخط کر دیے۔ ''لو بھئی جمیل میاں۔ اب سامان نکال دو۔'' انہوں نے کاغذ کا ٹکڑا میز کی دراز میں رکھ لیا۔

جمیل باہر چلا گیا۔ چند منٹ بعد اُس کے ساتھ تین آدمی آئے جو حلیے سے مزدور لگتے تھے۔ وہ چاروں مسعود صاحب کی میز کے پیچھے گئے۔ وہاں عقبی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور اندر چلے گئے۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔ بس ایک منٹ میں آیا۔'' مسعود صاحب بھی اٹھ کر اندر چلے گئے۔ عبدالحق اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

تب پتا چلا کہ وہ عقبی کمرا اجناس کا گودام تھا۔ اس وقت کیمپ میں دوپہر کے کھانے کا سامان ہو رہا تھا۔ ایک مزدور آٹے کی ایک بڑی بوری لے کر نکلا۔ دوسرے دو مزدوروں نے بھی سامان اٹھایا ہوا تھا۔ اور جمیل کے ہاتھوں میں دو کنستر تھے۔

وہ لوگ چلے گئے اور مسعود صاحب اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔ ''ہاں بھئی عبدالحق' کیا کہہ رہے تھے ہم؟''

''آپ کہہ رہے تھے کہ رضوان صاحب کو تلاش کرنا آسان نہیں لیکن انشاءاللہ وہ مل جائیں گے۔''

''ہاں۔ میں احتیاطاً ریکارڈز میں ان کی فیملی کو چیک کروں گا۔ اور میں تمہیں افضال صاحب سے ملواؤں گا۔ ان سے بڑھ کر کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔''

''یہ افضال صاحب کوئی افسر ہیں؟''

مسعود صاحب ہنسنے لگے۔ ''افسر سے بھی بڑے ہیں وہ۔ وہ اس کیمپ کے سب سے سینئر اور مستقل باسی ہیں۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

''جیسے اسکولوں میں کوئی کریکٹر ہوتا ہے نا۔ وہ لڑکا جو کئی برس سے ایک کلاس میں فیل ہوتا آ رہا ہو۔ یہ افضال صاحب بھی ویسا ہی کیریکٹر ہیں۔ اس کیمپ کو' اس کی تاریخ اور جغرافیے کو' یہاں رہنے والوں کو' یہاں سے رخصت ہو جانے والوں کو افضال صاحب سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ مگر تم اس وقت اُن سے نہیں مل سکو گے۔ وہ شام کو گھر واپس آتے ہیں۔''

''گھر؟''

''ہاں' کیمپ ان کا گھر ہی تو ہے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''اچھا چلو' میں تمہیں اسٹاف سے ملوا دوں۔ پھر میں ریکارڈز میں تمہارے رضوان صاحب کو چیک کروں گا۔'' وہ اُٹھ کھڑے

ہوئے۔

❁ ❁ ❁

کیمپ اپنی جگہ ایک بڑی دنیا تھی۔ ایسی دنیا جس کا رقبہ تو بہت زیادہ نہیں تھا' لیکن آبادی بہت زیادہ تھی۔ اور اس دنیا میں ہر طرف کہانیاں ہی کہانیاں بکھری ہوئی تھیں۔

کیمپ کے پناہ گزینوں کو جس زاویے سے بھی دیکھا جاتا' کئی کیٹیگریز میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ البتہ ایک قدر ان میں مشترک تھی۔ وہ سب پاکستان کی محبت میں مبتلا تھے۔ اور پاکستان کے لئے اپنے پُرکھوں کی زمین چھوڑ آئے تھے۔

عبدالحق پہلے تو اسٹاف سے ملا۔ ان میں جمیل تھا...... مسعود صاحب کا اسسٹنٹ۔ پھر باورچی شمشاد تھا اور اُس کے بے شمار معاونین تھے۔ ڈسپنسری تھی۔ وہاں ڈاکٹرز اور دیگر اسٹاف تھا۔

بنیادی طور پر کیمپ خیموں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ کیمپ میں داخل ہوتے ہی خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ لیکن صاف پتا چلتا تھا کہ کیمپ قائم کرنے والوں کا اندازہ بری طرح پٹ گیا ہے۔ پناہ گزینوں کی تعداد ان کے اندازے اور توقع سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کیمپ کو جس حد تک بھی بڑھایا جا سکتا تھا' بڑھا دیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ خیموں کے آگے کیمپ کے کئی رنگ تھے۔ کہیں چٹائیوں کی جھونپڑی تھی تو کہیں چادروں کی مدد سے چار دیواری بنالی گئی تھی اور چھت بھی چادر ہی کی ڈال لی گئی تھی۔ درمیان میں ایسے لوگ بھی تھے' جو محض ایک دری بچھائے بیٹھے تھے۔ وہ اکیلے مرد تھے' جن کے ساتھ عورتیں نہیں تھیں۔ لہٰذا انہیں نہ چھت کی ضرورت تھی نہ دیواروں کی۔

مجموعی طور پر وہ کیمپ ایک بہت بڑا گھر تھا اور وہاں رہنے والے ایک بہت بڑا کنبہ۔ ایسا کنبہ جس میں بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ عبدالحق ایسا مسحور ہوا کہ کچھ دیر کے لئے تو یہ بھی بھول گیا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ یہ تو اسے وہاں کچھ عرصہ گزارنے پر پتا چلا کہ اس کیمپ کو دیکھ کر وہ پاکستان کو سمجھ سکتا ہے۔

وہ دوبارہ مسعود صاحب کے پاس پہنچا تو مسعود صاحب اسے اپنے کمرے کے برابر ایک بڑے خیمے میں لے گئے۔ وہ کیمپ کا ریکارڈ آفس تھا۔ وہاں پھلوں کی خالی پیٹیاں ہی میز کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں اور وہی کرسی بھی تھیں۔ ''یہ ہے ہمارا ریکارڈ آفس۔''

عبدالحق کو ریکارڈ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ ایسے کاغذوں پر مشتمل تھا' جو تقسیم سے پہلے ایک طرف سے استعمال کر لئے گئے تھے۔ یہاں ان کے پیچھے کا حصہ استعمال کیا گیا تھا۔ کیمپ میں جو بھی کبھی آیا تھا' خواہ چند گھنٹوں کے لئے آیا ہو' اُس کے کوائف وہاں درج تھے۔ اُس کا نام' کہاں سے آیا' ساتھ میں کون کون ہے' عمر کتنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر اگر وہ رخصت ہوا تو اس کی تفصیل بھی تھی۔ کس تاریخ کو گیا' کہاں گیا' نیا پتا کیا ہے۔ کیا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

عبدالحق بہت متاثر ہوا۔ ''یہ بہت بڑا کام کیا ہے آپ لوگوں نے۔'' اس نے ہیڈ کلرک اخلاق سے کہا۔

اخلاق ایسا سنجیدہ طبع جوان تھا' جس کی آنکھوں سے گہری اداسی نظر آتی تھی۔ ''بڑا کام تو نہیں کہا جا سکتا اسے۔'' اُس نے عاجزی سے کہا۔ ''ہاں......ایک مخلصانہ کوشش کہہ لو۔''

''کیا مطلب؟''

''میں چاہتا تھا کہ یہ ریکارڈ ہر اعتبار سے مکمل ہو۔''

''مجھے تو یہ مکمل ہی لگتا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن ہے نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''جو لوگ اکیلے ہیں' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا آسان نہیں۔'' اخلاق نے وضاحت کی۔ ''ان میں سے کوئی کیمپ سے باہر گیا۔ وہاں اسے کوئی موقع ملا اور وہ کہیں سیٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ اب اُس نے یہاں آ کر بتانے کی زحمت نہیں کی تو ہم تو بے خبر ہی رہیں گے نا۔ یہاں ہزاروں افراد ہیں۔ ہم اسکول کی طرح حاضری تو نہیں لے سکتے۔ اب مجھے کیسے پتا چلے گا کہ کوئی یہاں سے چلا گیا۔ پھر بھی میں باخبر رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اپنے طور پر۔''

عبدالحق کو سوچ کر چکر آ گیا۔ واقعی' یہ تو بڑا پیچیدہ معاملہ تھا۔ اس نے تو اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اب غور کیا تو اسے اخلاق کا باخبر رہنا بھی ممکن نہیں لگا۔ ''آپ کو کیسے پتا چل سکتا ہے؟'' اُس نے حیرت سے کہا۔

اخلاق مسکرایا۔ اس مسکراہٹ سے اُس کا چہرہ دو متضاد کیفیات میں تقسیم ہو گیا۔ کیونکہ آنکھوں کی اداسی اور گہری ہو گئی تھی۔ ''اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔'' اُس کے لہجے میں عاجزی اور بڑھ گئی۔ ''افضال صاحب اور ان جیسے کچھ اور لوگ ہیں۔ وہ یہاں گھل مل کر رہتے ہیں اور سب سے باخبر رہتے ہیں۔ میں اُن سے رابطہ رکھتا ہوں۔''

''گھل مل کر تو سبھی رہتے ہیں یہاں۔'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔ ''افضال صاحب میں ایسی کیا خاص بات ہے۔''

''آپ یہاں رہیں تو سمجھیں۔ ساتھ رہنے کا مطلب گھل مل کر رہنا نہیں ہوتا۔ یہاں بیشتر لوگ خود میں گم رہتے ہیں۔ کسی کو کسی کا پتا نہیں چلتا۔'' کہتے کہتے اخلاق کا لہجہ بدلا اور وہ صفائی پیش کرنے لگا۔ ''ان کا بھی کوئی قصور نہیں اس میں۔ یہ سبھی لوگ بہت کچھ قیمتی کھو کر آئے ہیں۔ وہ لوگ بہت خوش قسمت ہیں' جو بغیر کسی جانی قربانی کے یہاں تک پہنچ گئے۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ اور وہ بھی اپنا گھر' اپنا جائیداد اور کچھ نہیں تو اپنے اجداد کی قبریں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ ایسے

لوگوں کا ماضی میں گم رہنا فطری ہے۔ پھر یہاں بھی وہ عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ مستقبل میں روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی۔ ایسے میں آدمی کسی دوسرے کے بارے میں سوچ سکتا ہے بھلا؟''

''تو افضال صاحب اور وہ دوسرے لوگ تو عظیم انسان......''

''ان کی عظمت سے تو میں انکار نہیں کروں گا لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو خود میں گم ہو ہی نہیں سکتے۔''

''کیوں بھئی؟''

''اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں' جن کا پورا خاندان ہجرت کے دوران ختم ہو گیا۔ کوئی بھی نہیں بچا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔''

''ایسے لوگوں کو تو دوسروں سے زیادہ خود میں گم ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ان کے پاس اپنے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ مگر پھر ایسے لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔ وہی ٹھیک رہتے ہیں' جو اپنے دکھ بھول کر دوسروں کو توجہ دیتے ہیں۔'' اخلاق نے سادگی سے کہا۔ ''تو مجھے ان لوگوں سے دوسروں کے بارے میں پتا چلتا رہتا ہے۔ پھر بھی ہمارے ریکارڈ کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔''

بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ لیکن ابھی عبدالحق کو اس کی گہرائی اور سنگینی کا اندازہ نہیں تھا۔ ابھی اُس نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ ''تو ذرا ہمارے رضوان صاحب کو بھی اپنے ریکارڈ میں چیک کر لیں۔'' وہ بولا۔

تھوڑی دیر بعد اخلاق نے نفی میں سر ہلایا تو عبدالحق کو کوئی مایوسی نہیں ہوئی۔ مسعود صاحب نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں رضوان صاحب کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ وہ کیمپ قائم ہونے سے کافی پہلے پاکستان آ چکے تھے۔

لیکن نجانے کیوں اسے ایسا لگتا تھا کہ رضوان صاحب کے بارے میں معلومات اسے یہیں سے حاصل ہوں گی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر مسعود صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔ ''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''لیکن کوئی بات نہیں۔ بس ڈٹے رہو۔ وقت تو لگتا ہی ہے۔ اب یہ بتاؤ' آگے کا کیا پروگرام ہے؟''

''میں رضوان صاحب کے بارے میں معلومات کیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تو تم پہلے سے ہی ڈٹے ہوئے ہو۔'' مسعود صاحب مسکرائے۔ ''اچھا......لاہور میں کوئی

ٹھکانہ ہے تمہارا؟"

"آدمی جاتا ہی وہیں ہے' جہاں اُس کا ٹھکانا بھی ہوتا ہے اور آب و دانہ بھی۔"

"سچ کہا تم نے۔ مگر میرا مطلب اور تھا۔ دیکھو عبدالحق' میرا غریب خانہ حاضر ہے تمہارے لیے۔"

"شکریہ سر۔ لیکن کیا میں یہاں کیمپ میں نہیں رہ سکتا؟"

"ایسا مذاق مت کرو میاں کہ میں گر پڑوں۔" مسعود صاحب نے کہا۔ پھر عبدالحق کے چہرے کا تاثر دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی۔ "میں یہاں جس پوزیشن میں بیٹھتا ہوں' اس میں پہلو بدلنے کی بھی گنجائش نہیں۔ میں جذباتیت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"میں سمجھا نہیں جناب۔"

"نہیں سمجھے تو ایک بار پھر میری کرسی کو غور سے دیکھو۔ میں تو یہاں پہلو بھی بدلوں گا تو لڑھک جاؤں گا۔"

عبدالحق کو ہنسی آ گئی۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں یہاں کیمپ میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے؟"

"اب میں اس کا کیا جواب دوں۔ یہاں ابھی دو ہزار مہاجرین کا قافلہ آ جائے تو نہ وہ یہ سوال کریں گے اور نہ ہی میں ایک لمحے کے لیے سوچوں گا۔ بس وہ آئیں گے اور یہاں رہنے لگیں گے۔ تم تو بس ایک فرد ہو...... اکیلے آدمی۔"

"تو میں یہاں رہ سکتا ہوں نا؟"

"میرا خیال ہے' میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے' مجھے اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ کرنا چاہو تو اپنے لیے ایک بستر' ایک تکیے اور ایک چادر کا بندوبست کر لو۔ ورنہ ضرورت تو اس کی بھی نہیں۔ کسی کے ساتھ بھی سو جانا۔ اپنے افضال صاحب ہی تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ میں یہیں رہوں گا۔"

"بالکل رہو۔ لیکن جب بھی دل گھبرائے' مجھے بتا دینا۔ میں اپنے گھر لے چلوں گا تمہیں۔"

❁ ❁ ❁

مینو اب نور بانو کا سایہ بن گیا تھا!

نور بانو کو اکثر وہ پہلا دن یاد آتا' جب عبدالحق کے جانے کے بعد اُس نے پہلی بار مینو کو کچھ کھلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا پیٹ پچکا ہوا تھا۔ زبیر اور رابعہ نے کیسے جتن کیے تھے لیکن اس نے

بھوسے کا ایک تنکا بھی قبول نہیں کیا تھا۔ خود نور بانو نے کوشش کی تو اس نے برائے نام کچھ کھا لیا تھا۔ ایسے جیسے بس اس کا دل رکھ رہا ہو۔

نور بانو نے اس وقت یہ سوچا تھا کہ میرے ساتھ یہ رعایت کیوں؟ اور وہ اب بھی اکثر یہ سوچتی تھی۔ اس وقت اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ شاید بے زبان مینو عبدالحق سے اس کے تعلق کو سمجھتا ہے۔ لیکن عبدالحق سے تو زبیر اور رابعہ کا بھی تعلق ہے۔ بلکہ زیادہ پرانا اور شاید زیادہ گہرا تعلق ہے۔ پھر اس نے ان کے ہاتھ سے کچھ کیوں نہیں کھایا۔ اور اس سوال کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اُس پہلے دن' اُس پہلی کوشش میں مینو نے کچھ زیادہ نہیں کھایا تھا۔ بلکہ اتنا کم کھایا تھا کہ اسے زندہ رہنے کے لیے کھانا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نور بانو ناکامی کے احساس کے ساتھ وہاں سے چلی آئی تھی۔ مگر وہ اسی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ اور اُس نے سوچا تھا کہ تھوڑی دیر بعد پھر کوشش کرے گی۔ اسے فکر تھی...... مینو کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ مینو کو زندہ رہنا ہے۔

اسے عبدالحق پر غصہ آنے لگا...... شدید غصہ۔ ایسا بھی کیا آدمی دوسرے کو سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرے...... بلکہ اس کی بات بھی نہ سنے۔ اپنے طور پر سوچے...... اپنی طرف سے بھی اور دوسرے کی طرف سے بھی۔ پھر فیصلہ کرے اور چل دے۔ اب یہاں سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ اس کی وجہ سے گیا ہے۔ حالانکہ وہ نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو اداس ہو گئی ہے اس کے جانے سے

مگر پھر سوچتے سوچتے اُس کے غصے کا رخ خود اُس کی طرف ہو گیا۔ یہ سب اُس کی حماقت کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیا وہ سیدھی سی بات نہیں کر سکتی تھی۔ اور بات کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ڈائری اور کتابیں اسے دیتی اور ہر بات کرتی۔ ایسا کیا ہوتا تو وہ بے چارہ یہ تو نہ سمجھتا کہ وہ اسے اس کی غیر ذمے داری پر ملامت کر رہی ہے۔ اور اُس نے سمجھا تو اس کے لہجے میں ملامت' شکایت...... کوئی تو ایسی بات ہوگی نا۔

اسے خود پر اور غصہ آیا۔ وہ خود کو نجانے کیا سمجھتی ہے۔ کچھ زیادہ ہی...... یا بہت ہی کم! ارے لڑکیاں حیا کرتی ہیں۔ شرمیلی ہوتی ہیں۔ ان کی زبان پر حیا کے تالے ہوتے ہیں۔ محبت کرتی ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کر پاتیں۔ یہ سب کچھ فطری ہے۔ مگر یہ بھی تو فطری ہے کہ محبت ہوا کی طرح ہوتی ہے۔ ہوا جو ہر وقت' ہر جگہ موجود ہے۔ جس کے دم سے زندگی ہے۔ لیکن زندہ لوگوں کو کیونکہ وہ نظر نہیں آتی' اس لیے ہر وقت اُس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ مگر ہوا جب چاہتی ہے' اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتی ہے۔ اس کی چال میں تنوع ہے۔ اس کے لہجے ہزاروں ہیں۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولتی۔ مگر سب کچھ کہہ دیتی ہے۔ ایسے ہی قدرت نے عورت کو حیا دی ہے تو اس

کے ساتھ ہی اسے محبت کے اظہار کے اَن گنت پیرائے بھی دیے ہیں۔ اس کی نگاہ کے نہ اٹھنے میں اس کے ہونٹوں سے لفظ نہ نکلنے میں اس کے ہونٹوں کی بے بس تھرتھراہٹ میں اس کی خاموشی تک میں ایسا بھرپور اظہار ہے کہ شاعر کے اشعار اور نثر نگار کی طویل تحریریں بھی اُس کے سامنے عاجز نظر آتی ہیں۔ پھر وہ کون سی انوکھی ہے کہ آج تک اُس کی محبت اپنے محبوب پر ظاہر نہیں ہوئی۔

چلو...... پہلے تو اس کے پاس معقول وجہ تھی۔ مگر اب کیا ہے......؟ اُس کا احساسِ کم تری! تو اس میں ہونا یہ چاہیے کہ آدمی محبت کرے۔ اظہار تو خود بہ خود ہو جاتا ہے۔ ہاں دوسرے سے محبت کی طلب نہ کرے۔ شاید یہی اُس کا مسئلہ ہے۔ اُس کا مسئلہ ہے انا...... وہ نہیں چاہتی کہ اسے ٹھکرا جائے۔ لیکن اس کی وجہ سے تو اس کی محبت ہی کھوٹی ثابت ہوتی ہے۔

اس خود ملامتی سے بچنے کے لیے وہ پھر مینو کے شیڈ کی طرف چلی گئی۔ اس نے پھر مینو کو پیار کیا اس سے باتیں کیں اسے کچھ کھلانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے پھر جیسے مروتاً بہت تھوڑا سا کھایا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ معصوم مینو ناز برداری کرانا چاہتا ہے۔ اس نے دانے اور بھوسے کو منہ بھی نہیں لگایا۔ ہاں جو گھاس اُس نے کاٹ کر دی اس میں سے تھوڑا سا کھا لیا۔ مگر اس نے پانی بھی نہیں پیا۔

اس بار وہ واپس آئی تو عبدالحق کے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سوچا اب وہ ہر روز اُس کے کمرے کی صفائی کیا کرے گی۔

عبدالحق کے کمرے کی صفائی ہر روز ہوتی تھی...... رابعہ کرتی تھی۔ مگر اس وقت خود ملامتی کی شکار نور بانو بہت دلیر ہو گئی تھی۔ درحقیقت وہ خود پر غصہ اتار رہی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ رابعہ سے کہہ دے گی کہ اب عبدالحق کے کمرے کی صفائی وہ کیا کرے گی۔

اُس نے جھاڑن سے ہر چیز کی گرد جھاڑی پھر جھاڑو دی۔ بستر کو درست کرتے ہوئے اس کی نظر عبدالحق کی چادر پر پڑی۔ رضائی تہ کر کے پائنتی پر رکھنے کے بعد وہ چادر کو تہ کرنے لگی۔ مگر اچانک ٹھٹک گئی۔

یہ وہ چادر تھی جو عبدالحق تقریباً ہر وقت کندھے پر ڈالے رکھتا تھا۔ حیرت انگیز بات تھی کہ وہ چادر اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ نور بانو چادر کو تہ کرتے کرتے ٹھٹکی اور اسے چھو کر دیکھا۔ اسے نرمی اور حدت کا احساس ہونے لگا۔ اس نے چادر اٹھائی اور اپنے جسم پر ڈال لی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا عکس دیکھا۔ چادر اوڑھے ہوئے وہ خود کو بہت خوبصورت لگی۔ اس نے چادر کا کنارہ تھام کر اسے سونگھا۔ اس میں سے خوشبو آ رہی تھی۔ کیا یہ خوشبو عبدالحق کی ہے؟ اس نے سوچا۔ اس خیال سے ہی اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور جب اسے چادر میں عبدالحق کے لمس کا احساس ہوا تو وہ حیا سے دہری ہو گئی۔

لیکن وہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اس چادر میں لپٹی باہر نکل آئی۔ ابتدا میں تو اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ سب کو للکار رہی ہو...... جسے جو کرنا ہو کر لے۔ میں عبدالحق سے محبت کرتی ہوں۔ مگر پھر ایک ایسے احساس نے اسے آ لیا کہ دوسرا ہر احساس مٹ گیا۔ اور وہ احساس تھا تحفظ کا۔ وہ چادر اُسے ایسے تحفظ کا احساس دلا رہی تھی جو اسے کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ جیسے اس چادر میں لپٹ کر وہ دنیا کی ہر پریشانی ہر بلا سے محفوظ ہو گئی ہے۔

ابتدا میں وہ اس کے لیے چیلنج تھا۔ چنانچہ وہ چادر میں لپٹی ہر جگہ گئی۔ اس کا خیال تھا لوگ اسے دیکھیں گے...... گھوریں گے...... اور ان کی نظریں خاموشی کی زبان میں اس سے کہہ رہی ہوں گی کہ وہ کیسی بے شرم ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کہیں کسی نے اس پر دوسری نظر نہیں ڈالی۔ لگتا تھا کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا ہے کہ وہ عبدالحق کی چادر اوڑھے ہوئے ہے۔

اس سے اسے اعتماد ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ چادر اب وہ ہمیشہ اوڑھے گی۔ اب وہ یہ چادر عبدالحق کو بھی نہیں دے گی۔

مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ اس چادر کو پہچاننے والا کوئی موجود ہے اور وہ شور بھی مچا دے گا!

وہ شیڈ میں داخل ہوئی اور مینو کی طرف بڑھی۔ اچانک مینو تڑپ کر اٹھا اور اس نے مَیں مَیں کر کے شیڈ سر پر اٹھا دیا۔ وہ اس کی طرف لپک رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنی زنجیر توڑ ڈالتا۔

نور بانو گھبرا گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لمحے وہ یہ بھول گئی کہ اسے تو کسی کی پروا تھی ہی نہیں۔

وہ آگے بڑھی مینو کے پاس پہنچی جو زنجیر کی پوری حد تک آگے آیا ہوا تھا۔ مینو نے چادر کو سونگھا اور پھر بے تابی سے اسے چاٹنے لگا۔ نور بانو اس کی گردن سہلانے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس چادر میں عبدالحق کی خوشبو ہے جسے بے زبان مینو پہچانتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ میرے ہاتھ سے کھائے گا بھی۔ اس کا دل امید سے بھر گیا۔

یہ سوچ کر وہ دانے کی طرف چلی۔ اسے جاتے دیکھ کر مینو نے اودھم مچا دیا اور زنجیر تڑانے کے لیے زور لگانے لگا۔

"بے صبرے مت بنو۔ تمہارے لیے دانہ لینے جا رہی ہوں۔" نور بانو نے پلٹ کر کہا۔

لیکن مینو کی اچھل کود جاری رہی۔

نور بانو دانہ لے کر آئی اور اُس نے مینو کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ مینو بے قراری سے کھانے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ نور بانو کی ہتھیلی چاٹ رہا تھا۔

نور بانو نے اس کی طرف گھاس بڑھائی اور وہ بڑی رغبت سے گھاس کھانے لگا۔

نور بانو نے مینو کو کھول دیا۔ مینو نے پیٹ بھر کر کھانے کے بعد پانی پیا۔ پھر چادر سے اپنا سر

رگڑنے لگا۔ چند لمحے بعد نور بانو کو چادر سے لگے ہوئے اپنے ہاتھ پر اُس کی گرم گرم سانسیں محسوس ہوئیں۔ اُس نے سر جھکا کر دیکھا۔ مینو اُس کی کلائی کو سونگھ رہا تھا' جیسے اس بار چادر سے آنے والی خوشبو اور اس کی خوشبو میں فرق کر رہا ہو...... اور جیسے اُس کی خوشبو کو یادداشت میں محفوظ کر رہا ہو۔

نور بانو نے پیار سے اُس کے سر کو سہلایا اور پھر اسے اپنی گود میں بھر لیا۔ چند لمحے بعد اُس نے سر جھکا کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ مینو اس کی گود میں دبک کر سو گیا۔

اُس دن سے مینو نور بانو کا سایہ بن گیا...... اور عبدالحق کی اس چادر کو نور بانو نے جیسے جزو بدن بنالیا۔ رات کو سونا اُس کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔ اپنے بستر پر لیٹ کر وہ سوچتی کہ عبدالحق نجانے کہاں' کس حال میں سو رہا ہوگا۔ کتنا بے آرام ہوگا وہ...... اور پردیس میں اکیلا۔ جانے بستر بھی میسر ہوگا اسے یا نہیں۔ اور یہ سب کچھ وہ صرف اس کے لیے کر رہا ہے۔ یہ جانے' سمجھے بغیر کہ وہ یہ نہیں چاہتی۔ اس میں اس کی خوشی بھی نہیں ہے۔ مگر وہ بے خبر یہ اُس کی خوشی کے لیے کر رہا ہے۔

ایسے میں نیند نہیں آتی اور وہ بہت بے چین ہوتی تو اٹھ کر وضو کرتی اور نفل ادا کرتی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو اس کے ذہن کا صفحہ جیسے سادہ ہو جاتا۔ وہ عبدالحق کی جلد سے جلد واپسی کی دعا کرتی۔ مگر پھر ٹھٹک جاتی۔ اسے خیال آتا کہ عبدالحق کیا کہہ کر گیا ہے...... یہ کہ وہ چچا جان کا پتا معلوم کیے بغیر واپس نہیں آئے گا۔ اب یہ دعا وہ کیسے کر سکتی تھی کہ عبدالحق کو چچا جان مل جائیں۔ یہ دعا تو وہ عبدالحق کی واپسی کی خاطر بھی نہیں مانگ سکتی تھی۔

بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے وہ تھک جاتی تو چادر میں منہ چھپا لیتی۔ اسے ایسا لگتا کہ عبدالحق کی خوشبو اس سے لپٹ گئی ہے۔ اس کے چند لمحے بعد وہ سو جاتی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کھلے آسمان کے نیچے لیٹا تھا!

وہ ایک بڑی اور موٹی دری تھی' جس پر وہ مرد سوتے تھے' جو اکیلے تھے۔ مسعود صاحب کے اصرار کے باوجود عبدالحق نے ان کے گھر قیام کی پیشکش قبول نہیں کی تھی۔ ویسے وہ اپنا بندوبست کہیں اور بھی کر سکتا تھا۔ لاہور میں ہوٹلوں کی کمی نہیں تھی لیکن وہ کیمپ میں اصل پاکستانیوں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اُس کے نزدیک پاکستان کے اصل شہری یہی لوگ تھے' جو پاکستان کے نام پر اپنے گھر بار' اپنی زمین جائیداد' اپنے کاروبار چھوڑ کر خالی ہاتھ چلے آئے تھے اور سفر میں ان پر جو گزری تھی' وہ قیامت سے کم نہیں تھی۔ ان کے قافلوں پر' ان کی ٹرینوں اور ان کے ٹرکوں پر ہندوؤں اور سکھوں نے حملے کیے تھے۔ اس دوران بہت بھاری جانی نقصان ہوا تھا۔ شاید ہی ان میں کوئی ایسا خوش نصیب ہو' جس نے اپنے کسی پیارے کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے نہ دیکھا

ہو۔

عبدالحق کو ان بے خانماں لوگوں سے خصوصی دلچسپی تھی۔ وہ انہیں سمجھنا چاہتا تھا۔ وہ سننا اور جاننا چاہتا تھا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ اس حوالے سے وہ پاکستان کی قدر و قیمت کا یقین کرنا چاہتا تھا۔

پہلی رات شمشاد نے اسے افضال صاحب سے ملوایا۔ ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ ان کی شخصیت میں اسے تضاد نظر آیا۔ ان کا چہرہ استخوانی تھا اور دیکھنے میں وہ پریشان حال لگتے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں زندہ دلی کی چمک تھی اور گفتگو میں رجائیت تھی۔

انھوں نے متعارف ہوتے ہی کہا۔ ''تم اکیلے نہیں ہو میاں عبدالحق۔ یہاں ہر شخص کسی نہ کسی کو تلاش کر رہا ہے۔''

''آپ بھی؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

اُن کی آنکھیں اچانک ہی دھندلا گئیں۔ ''نہیں۔ میرا تو کوئی نہیں کھویا۔ لیکن کچھ تلاش تو میں بھی کر رہا ہوں۔''

عبدالحق کو ان کے جواب پر حیرت ہوئی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں' جن کے بھرے پرے خاندان میں کوئی بھی نہیں بچا...... سوائے ان کے۔ ''آپ کا کوئی بھی نہیں کھویا' اس کا مطلب ہے کہ آپ کے سب لوگ موجود ہیں۔''

''ہاں میاں' اللہ کا شکر ہے کہ میرا کوئی نہیں مرا۔ سب کے سب موجود ہیں۔'' وہ بولے۔

''تو آپ تلاش کسے کر رہے ہیں؟''

''خود کو۔''

''خود کو!'' عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں میاں۔ خود کو تلاش کر رہا ہوں۔ ایک بحران آیا تھا میری زندگی میں۔ وہاں میں کھو گیا۔''

عبدالحق کو ان کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ ''اور آپ کے لوگ کہاں ہیں؟''

''وہ...... وہ سب زندہ جاوید ہو گئے۔ شہید ہو گئے۔ اور تم تو جانتے ہی ہو میاں کہ شہید کبھی نہیں مرتے۔ اور موت سے وہ ڈرتے ہیں' جن کا ایمان کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں خوف خدا بھی نہیں ہوتا۔ اور جو موت سے ڈرتے ہیں' وہ راہ حق میں جیتے جی مر جاتے ہیں۔''

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا تھا...... وہ بھی لاشعوری طور پر۔ وہ سب کچھ سمجھنا چاہتا تھا لیکن اسے احساس ہو رہا تھا کہ افضال صاحب سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں۔ وہ ان کے لیے دماغی طور پر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

مگر اس سے رہا بھی نہیں گیا۔ ''آپ دن بھر غائب رہتے ہیں۔ کیوں؟''

''اپنے سب لوگوں کو تلاش کرتا ہوں۔'' افضال صاحب نے کہا اور پھر اُس کے اعتراض کرنے سے پہلے ہی وضاحت کرنے لگے۔ ''دیکھو نا میاں' شہید تو نہیں مرتے۔ وہ زندہ ہوتے ہیں۔ بس نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہ یہیں کہیں ہوں...... اسی شہر میں۔ کسی اور روپ میں' کچھ اور ناموں سے۔ تو میں انہیں ڈھونڈتا ہوں۔ مجھے یقین ہے' کہیں نہ کہیں وہ مل جائیں گے۔''

عبدالحق نے گھبرا کر سوچا کہ گفتگو کا رخ بدلا جائے۔ خوش قسمتی سے اسے سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دانت بجنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جس طرف سے آواز آ رہی تھی' وہاں کمبل کے نیچے جیسے زلزلہ آیا ہوا تھا۔

افضال صاحب تڑپ کر اٹھے اور اس طرف لپکے۔ انھوں نے کمبل ہٹا کر دیکھا۔ ''ارے...... یہ تو حمید ہے۔ کیا ہوا؟''

حمید کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

افضال صاحب نے اُس کی پیشانی کو چھوا۔ ''اسے تو بہت تیز بخار ہے۔'' وہ بولے۔ ''اور سردی بھی چڑھ رہی ہے۔'' انھوں نے اپنا کمبل اس پر ڈال دیا۔ عبدالحق نے بھی ان کی تقلید کی' مگر حمید کی تھرتھری نہیں رکی۔

''ڈسپنسری جا کر کمپاؤنڈر کو لانا ہوگا۔'' افضال صاحب اٹھے۔

کمپاؤنڈر کو بلایا گیا۔ اُس نے دوا دی۔ تھوڑی دیر بعد حمید کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔

وہ دونوں اپنی جگہ آ بیٹھے۔ مگر دونوں کا سردی سے برا حال تھا۔ باقی لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ ''تم ایسا کرو میاں کہ اپنا کمبل اٹھا لو۔'' افضال صاحب نے عبدالحق سے کہا۔ ''کہیں تم بھی بیمار نہ پڑ جاؤ۔''

عبدالحق نے تین کمبلوں کے نیچے حمید کو ٹٹولا۔ اب وہ پُرسکون تھا۔ اس کے جسم میں خفیف سی تھرتھری بھی نہیں تھی اور پسینہ بھی آ رہا تھا۔ ''آپ کا کمبل بھی اٹھا لوں؟ میرے خیال میں اب انہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے افضال صاحب سے پوچھا۔

''پسینہ آ رہا ہے اسے؟''

''جی ہاں۔''

''تو میرا کمبل رہنے دو۔ پسینے کے بعد خدانخواستہ ٹھنڈ لگ گئی تو بہت خطرناک ہوگا۔''

عبدالحق نے زبردستی افضال صاحب کو اپنے کمبل میں شریک کیا۔

❊ ❊ ❊

وہاں کیمپ میں اور کیمپ سے باہر کہانیاں ہی کہانیاں بکھری ہوئی تھیں...... اور کردار ہی کردار تھے۔ ہر رنگ کے کردار! وہ زندگی کی ایک مکمل تصویر تھی۔ اس میں ہیرو بھی تھے' ولن بھی اور عام لوگ بھی۔

کیمپ میں پہلے ہفتے نے ہی اسے سب کچھ بھلا دیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے۔

کیمپ ایک بہت بڑے گھر کی طرح تھا۔ وہاں زندگی کے لگے بندھے معمول تھے۔ صبح سویرے چائے بنتی۔ وہ سرکاری چائے ہوتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی باہر سے کیمپ والوں کے لیے ناشتے کا سامان آتا تھا۔ اس میں پاپے' ڈبل روٹی' بسکٹ' حلوہ پوری اور جانے کیا کیا ہوتا تھا۔ وہ شہر کے دولت مند اور مخیر لوگوں کی طرف سے ہوتا تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی۔ شمشاد اور اس کی ٹیم اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔

پہلے دن عبدالحق نے کھانا پکتے دیکھا تو وہ بہت حیران ہوا۔ کیمپ میں موجود لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اس لحاظ سے کھانا بہت کم پک رہا تھا۔ یہ طے تھا کہ کھانا کم پڑ جائے گا اور لوگ بھوکے رہ جائیں گے۔

اس نے اس سلسلے میں انتظامیہ کے لوگوں سے بات کی۔ مختلف لوگوں نے مختلف جواب دیے۔

شمشاد نے کہا۔ ''جتنا دیا جائے گا' ہم اتنا ہی پکائیں گے صاحب۔''

پیاز کاٹنے والا بولا۔ ''اللہ کی رحمت ہے صاب۔ برکت بڑی چیز ہوتی ہے۔ نیت ٹھیک ہونی چاہیے بندے کی۔''

اُس نے جمیل سے بات کی تو جمیل کا موڈ بگڑ گیا ''بڑے صاحب کا دل بہت چھوٹا ہے دوسروں کے لیے۔'' اُس نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ارے...... وہ سوچتے ہی نہیں کہ اتنے سارے لوگ ہیں۔ انہیں تو راشن بچانے میں دلچسپی ہے۔''

''راشن بچانے میں! مگر کیوں؟''

جمیل نے معنی خیز انداز میں ایک آنکھ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہ کہنے والی بات نہیں ہے بابو جی۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔''

پہلی بار ایک منفی تصویر سامنے آ رہی تھی۔ ''میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔'' عبدالحق نے

کہا۔

جمیل نے رازدارانہ سرگوشی میں کہا۔ ''اپنے لیے بابو جی! اپنے لیے۔ بڑے صاحب اپنے لیے راشن بچاتے ہیں۔''

''کیوں...... وہ کیا کرتے ہیں راشن کا۔ اپنے گھر لے جاتے ہیں؟''

''اتنے بے وقوف نہیں ہیں وہ۔ ہاں' مارکیٹ میں بیچ دیتے ہیں۔''

عبدالحق یہ سن کر دہل گیا۔ مسعود صاحب کا اس پر بہت اچھا تاثر تھا۔ وہ ان کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ ''میں نہیں مانتا۔'' اس نے تند لہجے میں کہا۔

''نہ مانو بابو جی۔ پر یہ تو مانو گے کہ وہ بہت بڑے افسر ہیں...... یہاں کے سب سے بڑے افسر۔'' جمیل نے کہا۔

''ہاں...... وہ تو ہیں۔''

''تو پھر یہ بتاؤ کہ اتنے بڑے افسر کے شایانِ شان ہے کہ وہ اسٹور کیپر بن کر بیٹھے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ارے بھئی' تم نے دیکھا تو ہے۔ ان کے کمرے کے پیچھے اسٹور روم ہے۔ وہ اس کے دروازے پر یوں بیٹھے رہتے ہیں' جیسے مایا پر سانپ۔ شمشاد پرچا تیار کر کے مجھے دیتا ہے۔ اب اصولاً مجھے سامان نکال کر دینا چاہیے۔ لیکن نہیں۔ مسعود صاحب خود ناپ تول کر دیتے ہیں۔ اب سمجھ میں کچھ آیا بابو جی۔''

بات عبدالحق کی سمجھ میں تو آ گئی تھی لیکن حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ مسعود صاحب ایسے نہیں لگتے تھے۔ لیکن جمیل نے جو کچھ کہا تھا' وہ اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔

''اب بولو بابو جی۔ جو ایسے مظلوموں کے حصے کا مال ہڑپ کرے' اُسے کیا کہا جائے۔'' جمیل نے زہریلے لہجے میں کہا۔

عبدالحق کے دل میں پھانس سی چبھی اور اٹک کر رہ گئی۔

مگر دوپہر کے کھانے میں کوئی کمی' کوئی تنگی نہیں ہوئی' اور اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ باہر سے ناشتے کی طرح کھانے کی دیگیں بھی آئی تھیں...... اور اتنی آئی تھیں کہ گنتی بھی ممکن نہیں تھی۔ وہاں زردہ اور بریانی بھی تھی اور سالن اور روٹی بھی۔ یہ ثابت ہو گیا کہ وہاں کھانے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس افراط تھی۔

دوپہر کو کھانے کے بعد کیمپ میں زندگی گویا اونگھنے لگی۔ عورتیں اور بچے اپنے خیموں میں دراز ہو گئے۔ مردوں کی تعداد ویسے بھی کم تھی۔ کھانے کے بعد ان میں سے کچھ باہر چلے گئے اور کچھ خیموں میں آرام کرنے لگے۔

جمیل البتہ بہت مصروف تھا' وہ کچھ دیگیں اٹھوا کر کیمپ سے باہر بھجوا رہا تھا۔ ''خالی دیگیں واپس بھجوا رہے ہو؟'' عبدالحق نے کہا۔

''آں...... ہاں...... بھجوانی تو ہیں۔''

لیکن اتنی دیر میں عبدالحق کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ دیگیں خالی نہیں ہو سکتیں۔ اٹھانے والوں کے انداز سے پتا چل رہا تھا۔

''کھانا خراب نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کے بھی پیٹ میں پڑ جائے۔'' جمیل نے کہا۔ ''کبھی ہمارے ہاں کھانا بچتا ہے تو ہم دوسرے کیمپ بھجوا دیتے ہیں۔''

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ کھانا کم پڑے گا۔ یہاں تو صورتِ حال الٹ گئی۔'' عبدالحق بولا۔ ''کیا روز یہی ہوتا ہے؟''

جمیل جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ ''اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو بھی خیال رکھنا چاہیے۔ باہر سے آنے والے کھانے کا کوئی اعتبار تو نہیں ہے نا۔ کسی دن کم آیا تو کمی پڑ جائے گی۔''

''کبھی ایسا ہوا بھی ہے؟''

''ہوا تو نہیں لیکن کسی بھی دن ہو سکتا ہے۔''

عبدالحق ابتدا ہی سے سوچنے' غور و فکر کرنے اور تجزیہ کرنے والا تھا۔ وہ اس بات پر بھی غور کرتا رہا۔ پہلا افسر جس سے اُس کا واسطہ پڑا' وہ حسن دین تھا۔ حسن دین جس نے بغیر کاغذات کے' نہ صرف اس کا پورا گاؤں' بلکہ ارد گرد کی زمینیں بھی اُس کے نام کر دی تھیں' اور صلے میں اُس سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ اس کے جذبے سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس بات سے کہ وہ اپنی زمینوں پر ہندوستان سے لٹ پٹ کر آنے والوں کو بے غرض پناہ دے رہا تھا۔ پھر اُس نے پانی کے سلسلے میں اسے محکمۂ زراعت کے دوسرے افسر عرفان احمد سے ملوایا تھا۔ وہ بھی بے غرض' دردمند اور پاکستان سے محبت کرنے والے افسر تھے۔ یعنی یہاں کند ہم جنس با ہم جنس پرواز والا معاملہ کام کر رہا تھا۔ اور عرفان احمد نے اسے مسعود احمد خان کے پاس بھیجا تھا۔ اس لحاظ سے مسعود صاحب کے بارے میں بدگمانی کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

اُس نے اس بات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ چند روز بعد بات خود ہی کھل گئی۔

مسعود صاحب کے لگے بندھے معمولات تھے۔ شام پانچ بجے وہ اپنے گھر چلے جاتے۔ جانے سے پہلے وہ رات کے کھانے کا راشن جمیل کو دے جاتے۔ پھر وہ رات آٹھ بجے دوبارہ کیمپ آتے اور رات کے کھانے کے معاملات دیکھتے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی وہ گھر واپس چلے جاتے۔

یہ جمیل کی عبدالحق سے گفتگو کے دو دن بعد کی بات ہے کہ رات کو کھانا کم پڑ گیا۔

مسعود صاحب کو پتا چلا تو تڑپ کر اپنے دفتر سے نکل آئے۔ کُلی صورتِ حال سمجھنے میں انہیں ذرا دیر نہیں لگی۔ اس وقت تک کھانا ختم ہو چکا تھا اور چوتھائی کیمپ کھانے سے محروم تھا۔

انہوں نے جمیل اور شمشاد کو طلب کر لیا۔ ''یہ کیسے ہوا؟'' انہوں نے کڑے لہجے میں ان دونوں سے پوچھا۔

عبدالحق نے پہلی بار انہیں اس لہجے میں گفتگو کرتے دیکھا تھا۔ ورنہ وہ تو ظرافت کی چاشنی کے بغیر بات کرنے کے قائل ہی نہیں تھے۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔'' شمشاد نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''میں نے تو ہمیشہ کی طرح پرچا بنایا اور جمیل صاحب کو دے دیا۔ سامان مجھے ملا' اور میں نے کھانا تیار کر دیا۔ اس کے آگے تو مجھے کچھ معلوم نہیں جناب۔''

''اور تم کیا کہتے ہو؟'' مسعود صاحب جمیل کی طرف مڑے۔

''مجھ سے کیا پوچھتے ہیں سر' ذمے داری تو آپ کی ہے۔'' جمیل نے بے حد بے خوفی سے کہا۔

''کیمپ کے انچارج تم ہو۔ جواب دہی بھی تمہیں کرنی ہے۔'' مسعود صاحب کے لہجے میں غصہ تھا۔

''میں تو نام کا انچارج ہوں۔ آپ کسی کی سنتے ہی کب ہیں۔''

مسعود صاحب کا لہجہ اچانک نرم ہو گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ یہ میری ذمہ داری ہے؟''

''جی سر۔'' جمیل اب بھی اُن کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

مسعود صاحب مسکرائے۔ ''تمہاری بات وضاحت طلب ہے جمیل۔'' وہ بے حد نرم لہجے میں بولے۔ ''لیکن پہلے ہمیں اصل مسئلے سے نمٹنا ہے۔ تم سے بات میں ذرا دیر بعد کروں گا۔'' وہ شمشاد کی طرف مڑے۔ ''شمشاد' فوری طور پر کھانے کا بندوبست کرنا ہے۔''

''جو حکم جناب۔ آپ سامان نکلوا دیں۔ میں تیاری کرتا ہوں۔''

''نہیں شمشاد' اس میں دیر لگے گی۔ کھانا باہر سے منگوانا ہوگا۔''

''ایک گھنٹے میں تیار ہو جائے گا جناب......''

مسعود صاحب نے جیب سے چند نوٹ نکال کر شمشاد کی طرف بڑھائے۔ ''فوری طور پر باہر سے کھانا منگوا کر لوگوں کو کھلاؤ۔''

شمشاد ایک لمحے کو ہچکچایا۔ مگر پھر اس نے نوٹ لے لیے اور کچن کی طرف چلا گیا۔

اب مسعود صاحب جمیل کی طرف مڑے۔ ''ہاں' اب ذرا اپنی بات کی وضاحت بھی کر دو۔''

''دیکھیں نا سر' میں ہمیشہ آپ سے کہتا ہوں کہ کھانا ذرا زیادہ پکوایا کریں۔ کم پڑنے کا احتمال

نہ رہے۔''

''شمشاد جو پرچا بناتا ہے' اس کے مطابق اسٹور سے سامان تم خود نکالتے ہو۔''

''مگر آپ کی نگرانی میں۔'' جمیل نے بے ساختہ کہا۔

''اوہ...... تو تمہیں اس پر اعتراض ہے۔'' مسعود صاحب کا لہجہ اور نرم ہو گیا۔

''جی نہیں۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔'' جمیل گڑبڑا گیا۔ ''میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اس صورت میں کمی کا ذمہ دار شمشاد ہے۔ میں یہاں اسسٹنٹ انچارج ہوں۔ مگر میری سنتا کون ہے۔''

''یعنی تم یہاں وزیرِ بے قلم دان ہو۔'' مسعود صاحب کی روایتی ظرافت اور شگفتگی لوٹ آئی۔ مگر عبدالحق کو نجانے کیوں اس کی تہ میں سنگینی چھپی نظر آ رہی تھی۔

اس شگفتگی نے جمیل کو اور شیر کر دیا۔ ''آپ خود ہی دیکھ لیں سر۔ پرچا تو شمشاد بناتا ہے نا۔''

''ہاں...... لیکن باہر سے آنے والے کھانے کو ذہن میں رکھ کر۔''

''اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔''

''ہاں' یہ تو ہے۔'' مسعود صاحب نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ پھر جمیل کو بہت غور سے دیکھا۔ ''تو یہاں کھانے کے سلسلے میں ذمہ دار دو افراد ہیں' ایک میں اور دوسرا شمشاد۔'' ان کے لہجے میں تاسف تھا۔

''جی ہاں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہاں اسسٹنٹ انچارج کی ضرورت ہی نہیں۔ یعنی تم غیر ضروری ہو۔''

''بہ ظاہر تو یہی لگتا ہے جناب۔ لیکن بہرحال میں سرکاری ملازم ہوں۔''

''ارے ہاں' یاد آیا۔'' مسعود صاحب کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا۔ ''ایسے بے کار بھی نہیں ہو تم۔ کام تو بہت کرتے ہو تم۔''

''آپ ہی جانیں سر۔'' جمیل نے بے پروائی سے کہا۔

''باہر سے آنے والا کھانا تو تمہاری ہی ذمہ داری ہے۔'' مسعود صاحب نے بے حد سرسری انداز میں کہا۔

اچانک جمیل بہت چوکنا نظر آنے لگا۔ ''جی...... جی ہاں۔''

''اس میں تو میں دخل بھی نہیں دیتا۔ وہ تو مکمل طور پر تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس معاملے میں تم پوری طرح بااختیار ہو۔ یعنی تم کیمپ کے انچارج ہو۔ نام کے نہیں' سچ مچ کے۔''

''جی ہاں۔ لیکن میں باہر جا کر مخیّر لوگوں سے اپیل تو نہیں کرتا۔''

''تھوڑی دیر پہلے تم نے معترضانہ انداز میں کہا تھا کہ پرچا شمشاد بناتا ہے۔ اس پرچے کے

مطابق سامان تم نکالتے ہو۔ لیکن میری نگرانی میں۔ گویا میری نگرانی کے بغیر تم آزادانہ سامان نکالو تو کمی نہیں پڑے گی۔ شاید میری نگرانی بے برکتی کا سبب ہے۔"

"یہ تو نہیں کہا میں نے۔" جمیل نے جلدی سے کہا۔

"مگر مطلب تو یہی تھا۔ خیر...... ایک بات ذہن میں آتی ہے۔ ممکن ہے' آج باہر سے کھانا کم آیا ہو۔"

"جی...... جی ہاں' ممکن ہے۔" اب جمیل پریشان نظر آ رہا تھا۔

مسعود صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھا' پھر آواز لگائی۔ "عابد...... نسیم...... ذرا یہاں آؤ۔"

کچن میں کام کرنے والوں میں سے دو افراد ان کی طرف چلے آئے۔ "کیا حکم ہے صاحب جی؟"

"نسیم' تم ذرا باہر سے آنے والی دیگیں گن کر مجھے بتاؤ۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "اور عابد' تم ذرا اخلاق صاحب کو بلا لاؤ۔"

عبدالحق نے دیکھا کہ جمیل بری طرح مضطرب ہو گیا ہے۔ وہ بار بار پہلو بدلتا تھا' کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا تھا' مگر فوراً ہی سختی سے ہونٹ بھینچ لیتا تھا۔ مگر مسعود صاحب جیسے اس سے بے تعلق ہو گئے تھے۔

"آپ نے مجھے یاد فرمایا سر؟"

اخلاق کی آواز سن کر مسعود صاحب چونکے اور انہوں نے سر اٹھایا۔ "ہاں اخلاق' اپنے رجسٹر میں چیک کر کے مجھے بتاؤ کہ آج باہر سے کتنا کھانا آیا تھا۔"

"میں رجسٹر چیک کیے بغیر بھی بتا سکتا ہوں سر۔ چاول کی 25 دیگیں......"

مسعود صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے یقین ہے کہ تمہارا زبانی حساب بھی درست ہو گا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تم رجسٹر سے چیک کر کے تحریری طور پر مجھے بتاؤ۔"

"جی بہت بہتر۔" اخلاق نے جمیل کو ایک نظر دیکھا اور پلٹ کر چلا گیا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ اخلاق یہ کام بھی کرتا ہے۔" جمیل نے کہا۔ اُس کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "اس کی ذمہ داری تو صرف کیمپ میں آنے اور رخصت ہونے والوں کا ریکارڈ مرتب کرنا ہے۔"

"جی نہیں۔ کیمپ میں آنے والی اور کیمپ سے باہر جانے والی ہر چیز کا ریکارڈ وہ مرتب کرتا ہے......"

"لیکن سر......"

"میں اس کیمپ کا انچارج ہوں اسسٹنٹ انچارج صاحب۔ یہاں کی ہر بات سے باخبر

رہنا چاہتا ہوں میں۔ تمہاری طرح نام کا انچارج بننا مجھے گوارا نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں......"

"بات اعتماد کی نہیں' اپنی ذمہ داری کی ہے جمیل۔" مسعود صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "امانت بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے' اور اس معاملے میں مَیں اپنا بار دوسروں پر ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ ورنہ پرچون فروش بنیوں کی طرح خود اپنے سامنے راشن نہ تلواتا۔ یہی شکایت ہے نا تمہیں۔"

"نہیں سر' یہ بات نہیں......"

اتنی دیر میں نسیم آ گیا۔ "سر جی' یہاں سولہ خالی دیگیں موجود ہیں...... بارہ چاول کی اور چار سالن کی۔"

"دیکھا آپ نے۔ آج باہر سے کھانا آیا ہی کم تھا۔" جمیل نے کہا۔

"اچھا...... ذرا اخلاق آ جائے' پھر دیکھتے ہیں۔" مسعود صاحب نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

اخلاق اس بار پتلے سے ایک رجسٹر کے ساتھ آیا۔ "جی سر' چاول کی 25 دیگیں' سالن کی پندرہ دیگیں آئی تھیں آج۔"

"کچھ خالی دیگیں میں نے پہلے ہی واپس بھجوا دی تھیں۔" جمیل نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

"ابھی دو منٹ پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ کھانا ہی کم آیا تھا۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "تمہیں یاد ہے کہ کتنی دیگیں آئی تھیں اور کتنی خالی دیگیں تم نے واپس بھجوائیں۔"

"اب میں گنتا تو نہیں ہوں۔"

"حالانکہ حساب رکھنا چاہیے تمہیں......" مسعود صاحب نے کہا۔ پھر اضافہ کیا۔ "میری طرح۔ آخر یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔" پھر وہ اخلاق کی طرف مڑے۔ "تم کیا کہتے ہو اس سلسلے میں؟"

"مزا سر۔ 40 دیگیں آئی تھیں۔ ان میں سے 24 دیگیں واپس بھجوائی جا چکی ہیں لیکن وہ خالی نہیں تھیں۔ جیسی بھری ہوئی آئی تھیں' ویسی ہی بھری ہوئی گئیں۔" اخلاق نے کہا۔ "اور یہ تو ہر روز ہوتا ہے۔ بس آج تعداد بڑھ گئی تھی۔"

"یہ بات تمہارے علم میں تھی؟" مسعود صاحب نے جمیل سے پوچھا۔

"نہیں جناب۔"

"اخلاق تو کہتا ہے کہ یہ روز کا معمول ہے۔"

"جی' وہ کھانا زیادہ ہوتا ہے تو میں دربار بھجوا دیتا ہوں' یہ سوچ کر کہ کھانا ضائع نہ ہو۔"

"بہت اچھی سوچ ہے تمہاری۔" مسعود صاحب بولے۔ "لیکن میں نے کہا نہ کہ میر ے

کیمپ کے بارے میں بے خبر رہنا پسند نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دیگیں دربار کی لنگر کی دکانوں پر سجا دی جاتی ہیں اور تم ان کے پیسے وصول کرتے ہو۔ میں جانتا تھا' لیکن چشم پوشی کرتا رہا۔ مگر آج تم حد سے گزر گئے۔ کیمپ میں کھانا کم پڑ گیا۔ اس کے لیے میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

"جانے دیجیے سر۔" جمیل نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ "پہلی بار یہ غلطی ہوئی کہ کیمپ کو نمٹانے سے پہلے دیگیں دربار بھجوا دیں۔ اب آدمی سے غلطی تو ہو جاتی ہے سر۔"

"یہ غلطی نہیں' بد دیانتی ہے۔ اب میں تمہیں برداشت نہیں کر سکتا......"

"مگر آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں سرکاری ملازم ہوں۔"

"میں اپنے اختیارات سے واقف ہوں جمیل۔ فی الحال تمہیں معطل کر رہا ہوں۔ انکوائری ہونے پر تم یقیناً ڈسمس ہو جاؤ گے۔"

"دیکھ لیں گے سر۔"

"تم یہاں حاضر رہو گے۔ لیکن کسی کام میں دخل نہیں دو گے۔"

جمیل پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ مسعود صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔

❀......❀......❀
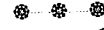
عبدالحق دنیا کی نیرنگی اور بوالعجبی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے خوشی تھی کہ مسعود صاحب کھرے آدمی ثابت ہوئے۔ لیکن اسے افسوس تھا کہ جمیل جو خود اتنا خراب آدمی تھا' کیسے ان کی کردار کشی کرتا رہا۔ جو کچھ اس نے مسعود صاحب کے بارے میں اُس سے کہا تھا' نجانے کس کس سے کہتا رہا ہو گا۔ اسے جمیل کے کردار پر افسوس تھا۔

رات تک کیمپ میں سب کو معلوم ہو گیا کہ جمیل کو معطل کر دیا گیا ہے۔ لیکن جمیل کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ وہ لوگوں سے یوں مذاق کرتا پھر رہا تھا' جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ بہر حال اس رات کیمپ میں اسی موضوع پر بات ہوتی رہی۔ لیکن جمیل کے سامنے کسی نے کچھ نہیں کہا۔

اس رات افضال صاحب جلدی سو گئے۔ نجانے کیوں وہ بہت اداس اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ سونے سے پہلے دیر تک وہ اکیلا ایک گوشے میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے بیٹھے رہے تھے۔ رہ رہ کر وہ کچھ بڑبڑاتے اور اپنے سر پر زور سے ہاتھ مارتے' کوئی اندرونی اضطراب تھا' جو انہیں بے چین کیے ہوئے تھے۔

عبدالحق نے حمید سے کہا۔ "افضال صاحب کی آج کچھ طبیعت خراب ہے۔"

"ہاں...... ایسا ہوتا رہتا ہے۔"

عبدالحق کا جی چاہ رہا تھا کہ جا کر ان کے پاس بیٹھے' ان کی دل جوئی کرے لیکن کوئی غیر شعوری احساس اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس وقت افضال

صاحب کو تنہائی کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی اپنی فطرت ایسی تھی کہ وہ کسی کو پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سو فطرت اسے بار بار اکساتی تھی کہ وہ ان کی طرف بڑھے۔ اسے اس پر بھی حیرت تھی کہ کسی اور کو افضال صاحب کی فکر نہیں ہوئی۔ حالانکہ وہ خود بھی کی فکر کرتے تھے۔

عبدالحق کو افضال صاحب کی طرف بڑھنے کے لیے ایک بہانہ...... کسی کی تائید درکار تھی۔ اُس نے حمید سے کہا۔ "چلو...... کچھ دیر چل کر افضال صاحب کے پاس بیٹھیں۔"

"ایسا غضب نہ کرنا۔" حمید نے جلدی سے کہا۔ "اس وقت انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے ہی میں بہتری ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو' مہینے میں کم از کم ایک بار ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتے۔"

"لیکن......"

"ایسے میں کوئی قریب جائے تو وہ جنونی ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کوئی بھی نقصان پہنچ سکتا ہے ان سے۔"

"تو پھر یہ ایسے ہی رہیں گے؟"

"کچھ دیر ایسے ہی رہیں گے۔ پھر سو جائیں گے...... بے خبر' گہری نیند۔ اور ہو سکتا ہے کہ کل دوپہر کو بلکہ شام کو سو کر اٹھیں۔"

عبدالحق بہت طول ہوا۔ اُس سے ان کا حال دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

"تم بے کار کڑھ رہے ہو۔" حمید نے اسے تسلی دی۔ "یہ کیفیت ان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ کی رحمت ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس کیفیت کے بعد وہ گہری طویل نیند سو جاتے ہیں۔ نیند ان کے لیے نعمت ہے۔ جانتے ہو کیوں؟"

عبدالحق نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس لیے کہ وہ کبھی سوتے ہی نہیں ہیں۔"

"مگر میں نے تو ہر رات انہیں سوتے ہوئے دیکھا ہے۔" عبدالحق نے اعتراض کیا۔

"سوتے نہیں ہیں' بس آنکھیں بند کیے پڑے رہتے ہیں۔ تاکہ دوسروں کی نیند خراب نہ ہو۔ شروع میں یہ سوتے تھے۔ مگر ذرا دیر میں ہی چیختے ہوئے اٹھ جاتے تھے۔ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتے تھے اور اٹھتے تو زور زور سے چیختے تھے...... مجھ پر لعنت ہو...... لعنت ہو مجھ پر۔ موت

نے بھی مجھ پر لعنت بھیج دی ہے۔"

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔ یہ تو نفسیاتی معاملہ ہوا۔ کچھ ایسی گزری ہے ان پر' جو ان کے ضمیر کے لیے بوجھ ہے۔ "کبھی ان سے پوچھا کہ پاکستان آتے ہوئے ان پر کیا گزری تھی۔"

"وہ بس اتنا کہتے ہیں کہ کچھ نہیں بچا...... کچھ نہیں بچا...... اور جو بچا' وہ زمین کا بوجھ ہے۔"

"اپنے بیوی بچوں' اپنے رشتہ داروں کے بارے میں نہیں بتاتے۔"

"بس اتنا کہتے ہیں کہ سب شہید ہو گئے۔ اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ میں کہیں کھو گیا' ضائع ہو گیا۔"

عبدالحق کو افضال صاحب سے اپنی گفتگو یاد آ گئی۔ اُس سے بھی انہوں نے یہی کہا تھا۔ اب وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ افضال صاحب کا نہ سونا بھی فطری تھا۔ یہ نہیں کہ انہیں نیند نہیں آتی ہو گی۔ بات یہ ہے کہ وہ نیند سے لڑتے تھے' سونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنے ڈراؤنے خواب سے گھبراتے تھے۔ ڈراؤنے خواب دیکھنے والے بھی نیند سے نہیں لڑتے۔ نیند بہت بڑی آسائش ہے' اللہ کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے' تھکن اور اضمحلال کو زائل کر کے آدمی کو تازہ دم کرنے کا قدرتی عمل۔ کوئی شخص اگر دو رات نہ سوئے تو اس کی تھکن اور اضمحلال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نڈھال ہو جاتا ہے آدمی۔ اس لیے ڈراؤنے خواب کا خوف بھی اسے نیند سے دور نہیں رکھ سکتا۔ افضال صاحب دوسروں کا خیال رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ سونے کے بعد وہ چیختے ہوئے اٹھتے ہیں اور دوسروں کی نیند خراب ہوتی ہے تو انھوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ سوئیں گے ہی نہیں۔ اپنے خوابوں پر تو ان کا قابو نہیں تھا' اپنی نیند سے تو وہ لڑ سکتے تھے۔

اب عبدالحق سمجھ سکتا تھا کہ افضال صاحب کی یہ کیفیت اللہ کی طرف سے بہت بڑی رحمت ہے۔ اس طرح اللہ انہیں ایک طویل نیند عطا فرما کے تازہ دم کر دیتا ہے۔ ورنہ جاگنے کی وہ تھکن اور بے آرامی ان کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ جائے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے عبدالحق کو افضال صاحب پر ترس آنے لگا۔ ایک ایسا شخص جو زندہ رہنے کا ہر جواز کھو چکا ہو' مگر اللہ کا حکم آنے تک اسے جینا ہو' کیسا قابلِ رحم ہوتا ہے۔ افضال صاحب نے بہ ظاہر جینے کے کئی جواز بنا لیے تھے لیکن اندر سے وہ موت کے آرزومند تھے' ورنہ وہ چیخ کر یہ کیوں کہتے کہ موت نے بھی ان پر لعنت بھیج دی ہے۔

افضال صاحب کے بارے میں عبدالحق کا تجسس اور بڑھ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ پس منظر میں کوئی بڑی کہانی ہے۔ اسے شرمندگی بھی ہوئی۔ عام حالات میں وہ غیر ضروری تجسس سے بچتا تھا کہ اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

"وہ دیکھو' وہ سو گئے۔"

حمید کی آواز نے عبدالحق کو چونکا دیا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ افضال صاحب جہاں بیٹھے ہوئے تھے' وہیں ڈھے گئے تھے۔ ان کا جسم بے ترتیب اور نہایت بے آرامی کی حالت میں تھا۔ ایسی بے آرامی میں کوئی سو نہیں سکتا۔ لیکن افضل صاحب گہری نیند سو رہے تھے اور ان کے چہرے پر ایسا سکون تھا کہ وہ کسی معصوم بچے کا چہرہ لگ رہا تھا۔

کچھ دیر تو عبدالحق یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ کہیں ان کی نیند خراب نہ ہو جائے۔ پھر وہ اٹھا اور اس نے انہیں سیدھا کر کے لٹایا اور کمبل اڑھا دیا۔ افضال صاحب اتنی گہری نیند میں تھے کہ اس دوران کسمسائے بھی نہیں۔

عبدالحق کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔ اس دوران نذیر' نعمان اور مجید بھی سونے کے لیے وہاں آ گئے تھے۔ ان کے درمیان گفتگو ہونے لگی۔ جمیل کا نام سن کر عبدالحق چونکا' اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اب جمیل کا کیا بنے گا؟" مجید نے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

"بڑے صاحب اصول کے پکے ہیں۔ اسے چھوڑیں گے نہیں۔" نعمان نے کہا۔ "لیکن تجھے اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے جمیل صاحب کی۔"

"یہ مجید کسی کی فکر نہیں کرتا۔ یہ صرف اپنی فکر کرتا ہے۔" نذیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ کروں۔ میری فکر کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ میں بھی اپنی فکر نہ کروں تو کیا بنے گا میرا۔" مجید نے جھنجھلا کر کہا۔

"ارے' تین وقت کی روٹی کے سوا فکر کی بات کیا ہے۔ اور وہ بھی فکر کے بغیر مل جاتی ہے۔" نذیر نے کہا۔

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔" نعمان چھیڑنے والے انداز میں گنگنانے لگا۔

"تو اور کیا ..... آگے پوری زندگی پڑی ہے۔ اس کیمپ میں تو نہیں گزرے گی نا۔" مجید بولا۔

"ابھی تو شادی کرنی ہے' گھر بسانا ہے۔ بچے ہوں گے' ان کے مستقبل کا سوچنا ہے۔" نذیر نے ٹکڑا لگایا۔

حمید ابھی تک اس گفتگو میں شامل نہیں ہوا تھا اور عبدالحق اس رمزیہ گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ تینوں جوان تھے۔ تیس سے کچھ کم ہی عمر ہو گی اُن کی لیکن جو کچھ وہ دیکھ کر آئے تھے' اس کے نتیجے میں اپنی عمر سے بڑے لگتے تھے۔

"ہاں' جو ہونا تھا' وہ تو ہو چکا۔" مجید نے آہ بھر کے کہا۔ "مستقبل کی تو فکر کرنی ہو گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اگر چھن گیا اک نشیمن تو کیا غم۔ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں۔" نعمان

پھر گنگنایا۔

"لیکن ایک بات بتاؤں' جمیل صاحب کا کچھ نہیں بگڑے گا۔" مجید نے جیسے چڑ کر کہا۔

"تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔" نذیر کے انداز میں چیلنج تھا۔

"دیکھ لینا۔"

"مجید ٹھیک کہتا ہے۔" نعمان نے پہلی بار سنجیدگی سے کہا۔ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ "بڑے صاحب جمیل کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

عبدالحق عام طور پر خاموشی سے سنتا تھا' دوسروں کی گفتگو میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ مگر اس وقت اُس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ جمیل کو سزا ملنی چاہیے' اور ملے گی بھی۔ مسعود صاحب نے اسے معطل تو کر ہی دیا ہے۔ اس کے خلاف تمام ثبوت موجود ہیں۔ انکوائری کے نتیجے میں وہ برطرف بھی ہوگا۔"

"بابو صاحب' آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔" نذیر نے کہا۔ "جمیل صاحب بڑی چیز ہیں......"

"لیکن مسعود صاحب......" عبدالحق نے کچھ کہنا چاہا۔

"بڑے صاحب سے بھی بڑی چیز۔" نذیر نے ان کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

"اور جمیل صاحب زیادہ دیر معطل بھی نہیں رہیں گے۔" مجید نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں۔ یہاں تو اللہ کا قانون ہے۔ مجرم کو سزا تو ملے گی۔" عبدالحق کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"ابھی تو یہاں انگریز کا قانون ہے اور نجانے کب تک چلے گا۔" نعمان کے لہجے میں بھی تلخی تھی۔

"میری سمجھ میں تو نہیں آتا......"

"آپ نہیں سمجھ سکتے۔ جمیل صاحب کے بڑے صاحب سے بھی بڑے افسروں سے تعلقات ہیں۔"

"تو تعلقات سے کیا ہوتا ہے۔ تعلقات سے جرم کرنے کا لائسنس مل جاتا ہے کیا؟"

"جی ہاں بابو صاحب' اب تک یہاں ہم نے یہی دیکھا ہے۔" حمید نے پہلی بار زبان کھولی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا' جمیل میں ایسی کیا خصوصیت ہے کہ مسعود صاحب سے بڑے افسروں سے اس کے تعلقات ہیں۔ جبکہ وہ تو مسعود صاحب کی نظروں میں بھی عزت حاصل نہیں کرسکا۔"

"آدمی آدمی کا فرق ہوتا ہے بابو صاحب۔" نعمان نے کہا۔ "یہاں بنیادی رشتہ غرض کا

ہے۔ غرض سے دوستی ہے' غرض سے تعلق ہے۔ جو غرض نہیں رکھتا۔ اسے جیتا بھی نہیں جاسکتا' جیسے اپنے بڑے صاحب۔"

عبدالحق کی نظر حمید پر پڑی۔ اسے محسوس ہوا کہ حمید کی نگاہوں میں تنبیہہ ہے' جیسے وہ اسے موضوع پر گفتگو سے منع کر رہا ہو۔ وہ خاموش ہوگیا' ویسے بھی اس گفتگو نے اس کے ذہن میں کئی سوالوں کو جنم دیا تھا' جن پر اسے سوچنا تھا۔

سب سونے کے لیے لیٹ گئے اور سو بھی گئے۔ مگر عبدالحق دیر تک جاگتا رہا اور ان سوالات پر سوچتا رہا۔ بڑے افسروں کو جمیل سے کیا غرض ہوسکتی ہے؟ کیا دے سکتا ہے وہ اُنہیں' بڑے افسروں کو کھانے کی ضرورت تو نہیں ہوسکتی۔ مگر اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ شاید حمید اس سوال کا جواب دے سکے۔ تبھی تو اس نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

پھر وہ ان گروہ بندیوں پر غور کرنے لگا' جو اسے وہاں نظر آئی تھیں۔ نذیر' مجید اور نعمان ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ لیکن جمیل کے مسئلے پر ان کا ردِعمل مختلف تھا۔ مجید جمیل کا حامی معلوم ہوتا تھا اور نعمان مخالف۔ جبکہ نذیر غیر جانبدار تھا۔ یہاں بھی غرض کی...... ضرورتوں کی کارفرمائی ہوگی۔ مگر یہاں وہ سمجھ سکتا تھا۔ ہاں...... یہاں تو غرض موجود تھی۔

وہ پھر سوچنے لگا کہ جمیل جیسے عام آدمی سے بہت بڑے افسروں کو کیا ضرورت ہوسکتی ہے۔ اس کے مشاہدے کے مطابق جمیل کی اہلیت بس اتنی تھی کہ وہ کسی بھوکے کو کھانا کھلا سکتا تھا لیکن بڑے سرکاری افسروں کو یہ حاجت تو نہیں ہوسکتی۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے نجانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ عبدالحق کے لیے بہت پریشان' بہت فکرمند تھی۔ عبدالحق سے وہ اس کے زمانۂ شیر خواری سے واقف تھی۔ نور بانو نے اسے بتایا تھا کہ وہ کیا کہہ کر گیا ہے...... یہ کہ وہ اس کا کام کرکے ہی آئے گا۔ اور کام ناممکن تھا۔ ایک ایسے شخص کو انسانوں کے جنگل میں تلاش کرنا' جسے آپ نے دیکھا بھی نہ ہو' جسے آپ صرف نام سے جانتے ہوں' ناممکن ہی کہلائے گا۔ ارے بڑے شہر میں تو ایک نام کے دسیوں آدمی ہوسکتے ہیں۔ اور پھر سوال یہ تھا کہ وہ انہیں ڈھونڈے گا کہاں۔ کوئی پتا' کوئی نشان' کوئی سراغ نہیں اس کے پاس۔ تو کیا نور بانو کا خدشہ درست ہے۔ اس ضدی لڑکے کو نور بانو کا چچا نہیں ملے گا...... اور وہ اپنے عہد کے مطابق یہ کام کیے بغیر واپس نہیں آئے گا۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ عبدالحق وعدے کا پکا ہے۔

مگر حمیدہ زیادہ دیر مایوس رہنے والی نہیں تھی۔ اس نے زندگی ہی ایسی گزاری تھی۔ اتنا کچھ دیکھ چکی تھی وہ کہ مایوسی سے اس کا تعلق زیادہ دیر کا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے تو اللہ کی رحمت کے عقل

کو عاجز کر دینے والے مظاہرے دیکھے تھے۔ اللہ نے اس لال آندھی سے اُس کو بچالیا تھا، جس نے اردگرد کے کئی گاؤں نگل لیے تھے اور ان میں کوئی متنفس بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ اور وہ بچی بھی کیسے کہ آنکھوں سے محروم ہو گئی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلی ہے۔ تب اللہ کی رحمت نے اسے سہارا دیا، سر چھپانے کا ٹھکانہ فراہم کیا، کھانے کو کھجوریں اور پینے کو پانی عطا فرمایا۔ اس رزاق نے جو پتھر میں بھی کیڑے کو رزق عطا کرتا ہے۔ وہ اگر ایسی بھیانک تنہائی میں زندہ رہی تو صرف اللہ کے فضل و کرم سے۔ اس نے کبھی انسانی آواز تو کجا، کسی جان دار کے قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی، یہاں تک کہ چھوٹا ٹھا کر عبدالحق بن کر چلا آیا۔ وہ تو معجزہ تھا۔ ورنہ اُس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے کبھی مل سکے گا۔ وہ تو اپنی دانست میں زندگی کے باقی دن پورے کر رہی تھی۔ مگر اللہ نے اسے کتنا کچھ دے دیا۔ عبدالحق مل گیا، آنکھوں کی کھوئی ہوئی روشنی مل گئی اور وہ اب بھی زندہ ہے...... زندہ اور صحت مند!

حمیدہ کبھی اس پر غور کرتی تو سوچتی کہ اس نے تین زندگیاں گزاری ہیں۔ ایک زندگی تو جمال دین کی بیوی، وصال دین کی ماں اور اوتار سنگھ کی اماں کی حیثیت سے۔ دوسری وہ تنہا زندگی، جہاں نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد اور جہاں دنوں کا شمار بھی ممکن نہیں تھا، اور تیسری یہ جو وہ اب گزار رہی ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھتی تو وہ پہلی زندگی اسے اپنی نہیں لگتی تھی۔ وہ جمال دین کی بیوی اور وصال دین کی ماں حمیدہ کوئی اور عورت تھی۔ بس وہ اُس کی زندگی کی عینی شاہد تھی، وہ وہ نہیں تھی۔ اور دوسری زندگی اب محض ایک ڈراؤنا خواب لگتی تھی۔ جیسے خواب دیکھا اور آنکھ کھل گئی۔ ہاں، اب جو وہ زندگی گزار رہی تھی، وہ حقیقی لگتی تھی۔

تو حمیدہ نے خود کو جھڑکا اور مایوسی اور پریشانی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ رب جس نے عبدالحق کو اُس تک پہنچا دیا، وہ انشاء اللہ عبدالحق کو نور بانو کے چچا تک پہنچا دے گا۔ پھر عبدالحق سرخرو واپس آئے گا۔

مگر اس خیال سے حمیدہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اگر نور بانو کے چچا مل گئے تو نور بانو ان کے پاس چلی جائے گی۔ اس کے بعد ضروری نہیں کہ وہ ان سے عبدالحق کے لیے نور بانو کا رشتہ مانگیں اور وہ ہاں کر دیں۔ کیا پتا، ان کا اپنا کوئی بیٹا ہو اور وہ اس سے نور بانو کی شادی کرنا چاہیں۔ اس صورت میں عبدالحق تو رہ جائے گا۔

لیکن اُس نے فوراً ہی لاحول پڑھی اور اس خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دیا۔ آدمی اندیشے پالنا شروع کر دے تو ان کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ آدمی کر ہی کیا سکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ اللہ کا اتنا فضل و کرم دیکھنے کے بعد اُس کے خوف کا یہ حال ہے۔ یہ تو اللہ کو ناراض کرنے والی بات ہے۔ اس طرح سے سوچے گی تو وہ تو دعا بھی نہیں کر سکے گی۔ اگر نور بانو

کے چچا کے مل جانے کی دعا کرتی ہے تو نور بانو کے ہاتھ سے نکلنے کا ڈر ہے۔ اور اگر ان کے نہ ملنے کی دعا کرتی ہے تو وعدے کا سچا عبدالحق واپس ہی نہیں آئے گا۔ یہ تو بند گلی ہے۔

اُس نے دل میں اللہ سے توبہ کی۔ جن لوگوں کو اللہ کی طرف سے معجزے جیسی عطا نصیب ہو، ان کا تو ایمان پختہ ہونا چاہیے۔ انہیں تو کبھی کسی خوف اور اندیشے کا شکار ہونا ہی نہیں چاہیے۔

اس نے اللہ سے دعا کی کہ ایسا کچھ کر دیں، جس میں سب کے لیے بہتری ہو۔

پھر اس نے کچھ اچھا، کچھ ایسا سوچنے کی کوشش کی، جو مایوسی اور خوف سے پاک ہو اور جس میں دل خوش ہو۔ اور ایسا سوچنے کے لیے اس کے پاس عبدالحق اور نور بانو کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

کبھی وہ اپنے بیٹے وصال دین کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتی تو وہ اسے بھولی بسری بات لگتی۔ بلکہ کبھی تو اسے لگتا کہ وہ کسی اور حمیدہ کا بیٹا تھا، اُس کا اپنا نہیں۔ ایسے میں ایک لمحے کے لیے احساسِ جرم ہوتا...... ارے، وہ کیسی ماں ہے کہ اپنے بیٹے کو ایسے بھول گئی ہے کہ اب اُس کی صورت اسے یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتی۔ مگر فوراً ہی اسے لال آندھی کا سماں یاد آ جاتا۔ اُس کی خوف ناکی کا یہ حال تھا کہ اُس کا تصور کرنے پر بھی اُس کے جسم میں تھرتھری دوڑنے لگتی۔

وہ دن اسے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اسے کبھی بھول ہی نہیں سکتی تھی۔ اُس دن ٹھا کر جی نے گاؤں کے تمام لوگوں کو طلب کیا تھا، جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ جمال دین اور وصال دین بھی گئے تھے۔ تب اُس نے اُن دونوں کو آخری بار دیکھا تھا۔ پھر وہ پلٹ کر نہیں آئے۔ وہ اپنے دروازے پر کھڑی رہی۔ پھر اچانک گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگوں نے اپنے گھروں پر سفید جھنڈے لہرا دیے لیکن ساتھ ہی وہ گھر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ سب لوگ گاؤں سے باہر جا رہے تھے۔

حمیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اُس نے گاؤں کی عورتوں کو روک کر ان سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن پوری بات کسی نے بھی نہیں بتائی۔ وجہ یہ تھی کہ کوئی رک کر بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ بیشتر کا رویہ اُس کے ساتھ معاندانہ تھا۔ گزرتی ہوئی عورتوں سے ایک ایک جملے کی معلومات حاصل ہو سکیں۔

''ہُوا کیا ہے؟'' اُس نے ایک عورت سے پوچھا۔

''کل جگ ہے کل جگ۔'' عورت نے جواب دیا۔

دوسری عورت نے کہا۔ ''جے پور والے حملہ کرنے آ رہے ہیں۔''

''کیوں؟'' حمیدہ نے پوچھا تھا۔

مگر اُس کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ عورت آگے جا چکی تھی۔

پھر ایک اور عورت نے کہا۔ ''یہ سب کچھ اُس اپرادھی چھوٹے ٹھا کر کی وجہ سے ہو رہا ہے۔''

حمیدہ کو الجھن ہونے لگی۔ چھوٹا ٹھاکر تو دہلی میں ہے۔ اُس نے ایسا کیا کر دیا کہ جے پور والے ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔

''دیکھ لینا' اب تو یہ گاؤں مٹ کر رہے گا۔'' ایک عورت دوسری عورت سے کہتے ہوئے گزری۔

ایک گھنٹے میں اُس نے دیکھ لیا کہ گاؤں پوری طرح خالی ہو گیا ہے۔ عورتوں اور بچوں میں سے تو کوئی بھی نہیں رہا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مردوں کی بھاری اکثریت بھی گاؤں خالی کر گئی تھی۔ حمیدہ کا اندازہ تھا کہ بہت تھوڑے مرد گاؤں میں رہ گئے ہیں۔

حمیدہ کو الجھن بھی تھی اور پریشانی بھی۔ ٹھاکر اتنا اچھا انسان تھا کہ گاؤں کے تمام لوگ اُس سے محبت کرتے تھے' پوجا کرتے تھے اُس کی۔ تو چھوٹے ٹھاکر نے ایسا کیا کر دیا کہ وہ بڑے ٹھاکر کو اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لیکن اُس کے سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

شام ہو گئی۔ حمیدہ وہیں کھڑی رہی۔ جمال دین اور وصال دین میں سے کوئی واپس نہیں آیا۔ پھر گاؤں کی طرف سے ایسی دھول اٹھی کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ساتھ ہی نعرے بھی سنائی دینے لگے۔ لگتا تھا کہ حملہ ہو گیا ہے۔ حمیدہ اُس طرف جانا چاہتی تھی۔ لیکن ایک خیال اسے روک رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چھوٹے ٹھاکر کو واپس آنا تھا لیکن ابھی وہ واپس نہیں آیا ہے۔ واپس آتا تو وہ سب سے پہلے اسے ملنے آتا تھا۔ اور اسے یہ خیال تھا کہ یہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کی وجہ سے ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ چھوٹے ٹھاکر کی جان کو خطرہ ہے۔ کاش' وہ اِس راستے سے آئے تو وہ اسے گاؤں جانے ہی نہیں دے گی۔ وہ اسے یہیں سے بھگا دے گی۔ مگر اس کے لئے کچھ کرنا بھی چاہیے۔

سورج غروب ہوا تو اس نے نماز پڑھی اور سب کے لیے...... خاص طور پر چھوٹے ٹھاکر کے لیے دعا کی۔ اس سے فارغ ہوئی تو وہ ٹھاکر جی کی امانتوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس میں زرد جواہر اور نقد رقم کے علاوہ زمینوں کے کاغذات بھی تھے۔ اسے خیال تھا کہ یہاں گاؤں میں بہت کچھ ختم ہونے والا ہے...... بلکہ شاید سب کچھ تب چھوٹے ٹھاکر کو شہر میں زندگی گزارنی ہو گی۔ اسے یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہئے۔ اُس نے خاصے زیورات اور رقم ایک طرف کر کے اس کو ایک پوٹلی میں باندھ دیا۔ اور باقی رقم اور زیورات اور زمین کے کاغذات کی ایک اور پوٹلی بنا دی۔ پھر وہ دوبارہ دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔

گاؤں کی طرف سے چیخ و پکار اور فائرنگ کی آوازوں میں شدت آ گئی تھی۔ حمیدہ کا دل چاہتا تھا کہ وہاں جائے مگر وہ جانتی تھی کہ چھوٹے ٹھاکر کے لئے اُس کی ذمہ داری زیادہ اہم ہے۔ کبھی کبھی اسے یہ خیال ستاتا کہ کہیں چھوٹا ٹھاکر حویلی ہی میں نہ ہو۔ لیکن مطمئن دل ہر بار تردید کر

دیتا تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ اُس کا دل سچا ہے۔

صبح کی نماز پڑھ کر اُس نے پھر دعا کی۔ اس بار وہ باہر آئی تو گاؤں میں سکوت تھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ سورج طلوع ہوا تو پوٹلی کو گھر میں رکھ کر وہ گاؤں کی طرف چل دی۔ راستے میں جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ حویلی کے پھاٹک کے باہر لاشوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہیں اسے جمال الدین کی لاش نظر آ گئی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چند لمحے وہ اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی' جس پر ابدی سکون تھا۔ ''رب راکھا۔ اللہ تمہیں اپنے بہت قریب جگہ عطا فرمائے۔'' اُس نے زیرِ لب کہا اور آگے بڑھ گئی۔

پھاٹک سے گزر کر وہ احاطے میں داخل ہوئی۔ احاطہ لاشوں سے اس طرح پٹا ہوا تھا کہ آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ اُس کا دل گھبرانے لگا۔ اتنا خون' اتنی لاشیں اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ لیکن کچھ فاصلے پر اُس کی نظر ایک جانی پہچانی قمیص پر پڑی۔ وہ گرتی پڑتی اِس کی طرف بڑھی۔ وہ وصال دین تھا۔ اُس کے سینے میں بہت بڑا گھاؤ تھا۔ خون جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ لیکن چہرے پر نور اور سکون تھا۔ حمیدہ نے اُس کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا' پھر جھک کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ ''اللہ تمہیں قبول فرمائے پتر۔'' وہ اٹھی اور پلٹ کر دیکھے بغیر پھاٹک کی طرف چل دی۔ اور آگے جانے کی اُس میں ہمت نہیں تھی۔ ویسے بھی وہاں لاشوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

وہ واپس اپنے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ لیکن اب اُس کا یقین متزلزل ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی' کون جانے چھوٹا ٹھاکر بھی......؟ اب اپنے دل کی بات پر بھی اسے یقین نہیں رہا تھا۔ وہ تو بس ایک موہوم آس کی ڈور تھامے کھڑی تھی۔

پھر ایک دم ہوا جیسے بند ہو گئی اور فضا پہ ایک گہرا' غیر فطری سا سکوت طاری ہو گیا۔ سکوت تو پہلے بھی تھا لیکن یہ سکوت تو ایسا تھا کہ اسے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اُس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا' جو گہرا سرخ ہو رہا تھا۔ لال آندھی! اُس کے اندر سے کوئی سہمی ہوئی آواز ابھری۔ اب سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ کچھ بھی نہیں بچے گا!

مگر وہ چھوٹے ٹھاکر کا انتظار کرنے پر مجبور تھی۔ وہ پوٹلی ہاتھ میں لئے دروازے پر کھڑی رہی۔ وہ انتظار امید سے ایسا محروم تھا کہ جب اُس نے چھوٹے ٹھاکر کو آتے دیکھا تو لگا کہ وہ اُس کا فریبِ نظر ہے۔

مگر جب وہ آ کر اُس سے لپٹا تو ثابت ہو گیا کہ وہ حقیقت ہے۔

حمیدہ جانتی تھی کہ وقت بہت کم ہے۔ اوتار سنگھ ضد کر رہا تھا کہ اسے ساتھ لے کر جائے گا۔ زندگی میں پہلی بار حمیدہ نے ماں بن کر اسے حکم دیا اور اسے جانے پر مجبور کر دیا۔ شاید وہ دن تھا' جب اُس کی پچھلی زندگی ختم ہو گئی۔ کیونکہ اس آندھی میں اُس کا بچ جانا بس معجزہ ہی تھا۔ اور صرف

بچ جانا ہی نہیں، جس طرح رب نے اُس کے زندہ رہنے کا اہتمام فرمایا، وہ بھی معجزہ تھا۔ اب اُس نے سوچا تو اسے لگا کہ جیسے وہ برزخ کی زندگی تھی۔ وہ اکیلی، اندھی عورت اس مقام پر جہاں کئی گاؤں ریت کے نیچے دب کر فنا ہو گئے، اس کے لئے سر چھپانے کا ٹھکانہ ایک جھونپڑی، رزق کا سامان کھجور کا درخت اور پیاس کے لئے نہ ختم ہونے والا پانی! بے شک اللہ اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا، اور اس کا کوئی مقصد بھی تھا۔

پھر اُس کی زندگی چھوٹے ٹھاکر کی آمد سے شروع ہوئی۔ اور چھوٹا ٹھاکر عبدالحق بن کر آیا تھا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اللہ نے اسے عبدالحق کیلئے ہی زندہ رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنے بیٹے وصال دین کی یاد بھی نہیں آتی تھی۔ وہ زندگی تو اُس کی ختم ہو چکی تھی۔

جو عرصہ اُس نے تنہائی میں گزارا تھا، اُس کے بارے میں اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ کس وقت دن ہے اور کس وقت رات۔ عرصے کا شمار وہ کیا کرتی۔ اسے تو لگتا تھا کہ دسیوں برس گزر گئے اور اس عرصے میں وہ ہر سوچ سے مبرا رہی تھی۔ بس وہ تھی، اندازے سے پڑھی جانے والی نماز اور یا اللہ کا ورد۔ شاید سوچتی تو وہ پاگل ہی ہو جاتی۔ ہاں، ایک یقین اُس کے اندر موجود تھا، اور وہ یہ کہ اُس کا چھوٹا ٹھاکر ضرور واپس آئے گا۔

اور وہ واپس آیا تھا۔ اور اُس کی ٹوٹی ہوئی زندگی کی ڈور پھر سے جڑ گئی تھی۔ اور اب تو اسے آنکھیں بھی مل گئی تھیں۔ کبھی کبھی تو اسے یہ سب اتنا غیر حقیقی لگتا تھا کہ وہ سوچتی تھی، کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ ایسے میں وہ اپنے بازو میں چٹکی بھرتی۔ منہ سے سسکی کی آواز نکلتی تو اسے یقین ہوتا کہ یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے وہ چونکی۔ اسے احساس ہوا...... اور پھر حیرت ہوئی۔ یہ سب کچھ اُس نے پہلی بار سوچا تھا، اس سے پہلے اُس نے زندگی کے ان غیر معمولی ادوار پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ اب بھی شاید وہ سب کچھ اس لئے یاد آیا، تا کہ ایمان تازہ ہو جائے اور اُس کے اندر کے خوف اور وسوسے دھل جائیں۔

اور خوف اور وسوسے واقعی دھل گئے تھے۔ اب اُس کے اندر ایک خوشی تھی...... اور بے پایاں طمانیت!

وہ نور بانو کے بارے میں سوچنے لگی۔ نجانے کیسے، مگر اسے شروع ہی میں احساس ہو گیا تھا کہ عبدالحق اور یہ لڑکی ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔ اُس نے بھی بغیر دیکھے ہی اس لڑکی کو عبد الحق کے لئے پسند کر لیا تھا۔ پھر جب اُس کی آنکھوں کی بینائی واپس آنی شروع ہوئی تو اس نے چپکے چپکے اسے جانچنا شروع کیا۔ نور بانو کو تو نہیں معلوم تھا کہ اس کی بینائی کس حد تک بحال ہو چکی ہے۔ سو وہ اس کے سامنے عبدالحق کا تذکرہ کرتی اور اس کا ردِ عمل دیکھتی۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ

لڑکی کے پاس وہ گہرائی ہے، جو با کردار لوگوں میں ہوتی ہے۔ اس کے باوجود محبت تو چھپائے نہیں چھپتی لیکن یہ طے تھا کہ وہ لڑکی اظہارِ محبت کی قائل نہیں ہے۔

البتہ عبدالحق کا معاملہ اُس کی گہرائی کے باوجود کھلا تھا۔ وہ یقیناً نور بانو سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اُس نے اسے ایسا بلند مقام، ایسا مرتبہ دے رکھا تھا کہ وہ اس کے لئے عزت اور احترام سے بڑھ کر کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ حمیدہ نے جب پوری طرح نور بانو کو دیکھا تو وہ قائل ہو گئی کہ نور بانو اس رویے کی حق دار ہے۔ اتنی پاکیزہ اور اتنی نیک لڑکی اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بعد تو اس کی یہ خواہش اور شدید ہو گئی کہ عبدالحق کی شادی اس سے ہو۔

حمیدہ نے سمجھ لیا کہ وہ دونوں اپنی اپنی محبت میں مدہوش اور دوسرے کی محبت سے بے خبر ہیں۔ عبدالحق سے تو اُس نے جب بھی بات کی، اُس نے یہی کہا کہ اماں، ایسا سوچنا بھی مت۔ منجھلی بی بی ہمارے پاس مہمان ہیں...... امانت ہیں۔ اور منجھلی بی بی کہتے ہوئے اُس کے لہجے میں کیسا احترام ہوتا تھا۔

مگر عبدالحق کے لاہور جانے پر بات پوری طرح کھل گئی۔ نور بانو کو جب اُس نے بتایا کہ عبدالحق اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے اس کے چچا کی تلاش میں لاہور گیا ہے تو اس کا خوف بالکل واضح تھا۔ اور حمیدہ نے اس خوف کو پوری طرح سمجھ لیا۔ کیونکہ وہ ہر زاویے سے اُس کے خوف سے مماثل تھا۔ نور بانو کو ڈر تھا کہ عبدالحق نے جو کہا ہے، وہی کرے گا۔ جب تک وہ اس کے چچا کو ڈھونڈ نہیں لیتا۔ واپس نہیں آئے گا۔ یعنی واپس آئے گا تو جدائی کی خبر لائے گا۔ نور بانو کو اُس کے چچا کے سپرد کر دے گا۔ یہ تو آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ تھا۔

اب سے کچھ دیر پہلے حمیدہ بھی اسی بات سے ڈر رہی تھی۔ مگر اب اسے خیال آیا کہ نور بانو کے چچا کا مل جانا ہی بہتر ہے۔ یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ نور بانو کو اُس کے چچا کے سپرد کر دینے کے بعد ان سے عبدالحق کے لئے نور بانو کا ہاتھ بھی تو مانگا جا سکتا ہے۔

اس خیال نے حمیدہ کو یک سو اور پوری طرح سے مطمئن کر دیا۔ اب تو اُس کی یہی دعا تھی کہ عبدالحق کو جلد از جلد نور بانو کے چچا مل جائیں اور یہاں ایک کام اور کرنا تھا۔ اسے نور بانو سے کھل کر بات کرنی تھی۔ لیکن یہ مرحلہ بہت نازک اور دشوار تھا۔ حمیدہ سمجھ گئی تھی کہ نور بانو ایسی لڑکی ہے جو اپنی محبت کو خود سے بھی چھپا کر رکھتی ہے۔

اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اسے نور بانو کو بچھڑنے کے خوف میں مبتلا کرنا تھا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کے دل پر بہت بوجھ تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اماں نے سچ کہا تھا۔ کسی اَن دیکھے آدمی کو صرف اس کے نام کے حوالے سے تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ مشکل نہیں،

ناممکن۔ اگر اسے عبدالحق کے مزاج کا پتا نہ ہوتا تو یہ بات اُس کے لئے بہت خوش کن ہوتی کہ نہ عبدالحق اُس کے چچا جان تک پہنچ سکے گا اور نہ ہی اس سے جدائی کی نوبت آئے گی۔ لیکن جب عبدالحق کی کہی ہوئی آخری بات اس کی سماعت میں گونجتی تو خون اس کی رگوں میں جیسے جمنے لگتا۔ عبدالحق نے کہا تھا...... اب میں آپ کا کام کر کے ہی واپس آؤں گا۔ اور وہ جانتی تھی کہ عبدالحق وعدے کا پکا ہے۔

نور بانو بہت بدل گئی تھی۔ اسے تو بدلنا ہی تھا۔ کوئی کسی سے اتنی گہری محبت کر بیٹھے اور برسوں اس محبت سے لڑتا رہے' اسے دبانے کی کوشش کرتا رہے اور محبت میں کوئی کمی تک نہ ہو' تو ایسا آدمی جب خود کو اس محبت کے سپرد کر دے تو وہ تو مکمل سپردگی ہوتی ہے۔ ساری مزاحمت اور مدافعت تو اُس کی ختم ہو چکی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اُس نے خود کو اس بے حد مختلف معاشرت میں ایسے ڈھال لیا تھا کہ وہ پرانی نور بانو نہیں رہی تھی۔ اور یہ سب کچھ اُس نے دل سے قبول کیا تھا۔ اب وہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتی تھی...... عبدالحق سے دور ہونے کا تصور بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اُس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ ہر وقت دھیان اُڑا اُڑا رہتا تھا۔ نہ بھوک نہ پیاس۔ بس ایک کام اسے بہت عزیز تھا...... سویٹر بُننا۔ وہ مضطرب ہوتی تو اس کا سارا اضطراب جیسے ہاتھوں کی انگلیوں میں کھنچ آتا۔ سلائیاں اس کے ہاتھوں میں بہت تیزی سے گردش کرنے لگتیں۔ یہ کام وہ دیوانہ وار کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچوں سویٹر مکمل ہو گئے۔ سردی بھی شباب پر تھی۔ اُس نے اماں' زبیر بھائی اور رابعہ آپا کے سویٹر انہیں دے دیے۔ وہ تینوں بہت خوش ہوئے۔ اماں نے تو اسے ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہوئے کہا تھا...... "کیسا نرم اور گرم ہے یہ۔"

اپنا اور عبدالحق کا سویٹر اس نے ٹرنک میں چھپا دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں سویٹر ایک ہی رنگ اور ایک ہی ڈیزائن کے تھے۔ یہ کام غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ اور جب اسے احساس ہوا تو وہ حیا سے دہری ہو گئی۔ "انہیں تو سویٹر دے دوں گی۔" اُس نے دونوں سویٹروں کو سامنے رکھ کر غور سے دیکھتے ہوئے زیرِ لب خود سے کہا۔ "لیکن میں یہ سویٹر کیسے پہنوں گی۔ سب لوگ کیا سمجھیں گے...... کیا کہیں گے۔"

سویٹر بننے کے دوران اسے خوش قسمتی سے ایک اور مصروفیت مل گئی۔ اور وہ تھا مینو۔ مینو جو عبدالحق کی چادر کی وجہ سے اُس کا بن گیا تھا۔ مینو نے اسے پوری طرح اپنا لیا تھا اور اسے وہی مقام دے دیا تھا' جو عبدالحق کا تھا۔ یہ اُس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ اب تو مینو پورے دن اُس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ مینو نہ ہوتا تو اسے کچھ ہو جاتا۔ بے زبان مینو کی شکل میں اسے ایک راز داں میسر آ گیا تھا...... ایسا راز داں جو راز کو کبھی افشا نہیں کرتا۔ وہ دل پر بوجھ محسوس کرتی تو شیڈ میں چلی

جاتی اور اسے اپنی گود میں بھر کر اُس سے دل کی ہر بات سرگوشی میں کہہ دیتی۔ اور بات کرتے ہوئے وہ چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی رہتی کہ وہاں کوئی موجود تو نہیں ہے۔ کوئی اُس کی باتیں سن تو نہیں رہا ہے۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کیا کچھ کہتی رہی ہے۔ اُس سے باتیں کرتے ہوئے وہ از خود رفتگی کی کیفیت میں ہوتی تھی۔ بس اتنا خیال ضرور رہتا تھا کہ کوئی اُس کی باتیں سن نہ لے۔

"مینو' تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو مجھے کیسا لگا۔" وہ کہتی۔ "میں انہیں دیکھتی رہ گئی اور سینے سے دل جیسے اُڑ کر نکل گیا۔ تم نے تو دیکھا ہے انہیں۔ کوئی شہزادہ بھی کیا ہو گا ان کے سامنے۔ تو اسی لمحے مجھے کچھ ہو گیا' اور میری سمجھ میں آ گیا کہ اب میں کبھی بھی پہلے جیسی نہیں ہو سکوں گی۔ یہ محبت کبھی میرے دل سے نہیں نکلے گی۔"

مینو سر جھٹک کر ہلکی سی مَیں مَیں کرتا' جیسے کہہ رہا ہو۔ ہاں' میں سمجھتا ہوں۔

"مگر وہ پہلی محبت ساتھ ہی مجھے نفرت بھی دے گئی۔ اُس سے پہلے نہ میں محبت سے واقف تھی نہ نفرت سے۔ اور بد قسمتی کہو یا میرے اندر کی خرابی' میری نفرت محبت سے زیادہ شدید تھی۔ اے مینو...... بدتمیز' تم میری بات دھیان سے نہیں سن رہے ہو۔"

ایک لمبی سی مَیں' جیسے مینو پوچھ رہا ہو' یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟

"اب کہ تم نے پوچھا ہی نہیں کہ محبت کے ساتھ نفرت کیسے ہو گئی اور پھر نفرت محبت سے کیسے بڑھ گئی' خیر میں تمہیں سمجھاتی ہوں' دیکھو نا' محبت کی اس پہلی نظر کے ساتھ ہی مجھے یہ احساس ہو گیا کہ وہ تو ہندو ہیں...... مشرک اور کافر اور ایک مسلمان لڑکی کے لئے کسی ہندو سے محبت کرنا بالکل ناجائز ہے۔ اوہو...... مَیں مَیں مت کرو۔ میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات۔ بھئی تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔ تم تو مینڈھے ہو...... جانور ہو۔ تمہارے ہاں یہ جھنجٹ کہاں ہوتے ہیں۔ تم نہ ہندو ہو نہ مسلمان۔ یہ تو ہمارا مسئلہ ہے۔ تو جیسے ہی مجھے محبت ہوئی' وہ نفرت میں بدل بھی گئی۔ اس کے بعد سے کوئی لمحہ اس محبت کے بغیر نہیں گزرا مگر ہر روز میں اُس پر نفرت کی ایک تہہ چڑھا لیتی تھی۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ نفرت ہی نفرت رہ گئی اور اصل چیز محبت کہیں بہت نیچے رہ گئی۔ اور میں اس محبت کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں بس تمہارے مالک سے اندھی نفرت کرتی رہی۔"

مینو سے اس طرح باتیں کرتے کرتے نور بانو اچانک سوچنے لگتی' یاد کرنے لگتی۔ بہت سی باتیں تھیں' جو وہ پہلے سمجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ اب غور کرنے پر سمجھ میں آتی تھیں۔ بہت سی باتیں تھیں' جنہیں اُس نے یادداشت کے نچلے تہہ خانے میں بند کر دیا تھا۔ وہ نہ انہیں یاد کرنا چاہتی تھی' نہ تصور میں انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر محبت شاید ایسی طاقت ور چیز ہے' جو آدمی کو طاقت ور اور جرأت مند بنا دیتی ہے۔ اب وہ سب کچھ دیکھ اور سمجھ سکتی تھی اور وہ سب کچھ دیکھنا اور سمجھنا چاہتی تھی۔

نور بانو ابھی تک اپنے ماضی کے حصار سے نہیں نکل سکی تھی۔ وہ حال میں جی رہی تھی، مگر سانس ماضی میں لیتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اُس نے ماضی کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کبھی نہیں دیکھا تھا' آدمی جب تک حقائق کو پوری طرح قبول نہ کرے' ماضی میں ہی کھڑا رہتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ماضی ایسا ہوتا ہے کہ اُس سے آنکھیں چرانی پڑتی ہیں۔

''اور مینو' جانتے ہو' آگے کیا ہوا۔'' اُس نے مینو کا کان پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایک دن مجھے صاف صاف پتا چل گیا کہ میری باجی بھی ان سے محبت کرتی ہیں۔ اوہو...... باجی کے متعلق تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں۔ حور بانو نام تھا میری باجی کا۔ ایسا اسمِ بامسمّیٰ تو میں نے کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ تو سچ مچ جنت کی حور تھیں...... اور بہت سچی' بہت کھری۔ وہ میری طرح نہیں تھیں۔ انہیں چھوٹے ٹھاکر سے محبت ہوئی تو وہ اس محبت میں' اُس کے بہاؤ پر بہنے لگیں۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ ایک ہندو سے محبت کر رہی ہیں۔ میں ان سے چڑنے لگی۔ مگر اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ اصل وجہ رقابت تھی۔ مل تو وہ ہم میں سے کسی کو بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کا تو امکان ہی نہیں تھا۔ مگر باجی یہ سوچے سمجھے بغیر اس محبت کی لذت میں گم تھیں۔ جبکہ میں نے اسے انگاروں کا راستہ بنا لیا تھا۔ وجہ بتاؤں؟''

مینو سر اٹھا کر اسے دیکھتا رہا۔

''باجی اور گلنار جس قدر خوب صورت تھیں' میں اتنی ہی بدصورت تھی۔ اکثر میں بڑے وثوق سے سوچا کرتی کہ میں امی کی سگی بیٹی ہو ہی نہیں سکتی۔ ضرور امی مجھے کہیں سے اٹھا لائی ہیں۔ اب میں وہ سب کچھ سمجھ سکتی ہوں۔ کم عمری کی محبت میں کوئی ممکن اور ناممکن نہیں دیکھتا۔ وہ تو بس تصورات میں گم رہتا ہے۔ موقع ملتا تو میں بھی ایسی ہی محبت کرتی۔ فطری بات تو یہ تھی کہ میں تصور میں دیکھتی کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں لیکن جب مجھے چھوٹے ٹھاکر کے لئے باجی کی محبت کا پتا چلا تو سب کچھ بدل گیا۔ میں نے جان لیا کہ میں ہار گئی۔ میں تو خواب و خیال میں' تصور میں بھی باجی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ تو پھر میں نفرت کے سوا کیا کرتی۔ میں کوئی امکان نہیں تراش سکتی تھی۔ کسی تصورِ امکان میں مَیں ان کے سامنے کھڑی ہوتی تو باجی آ جاتیں' اور میں کسی وہم کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔ جانتے ہو مینو' یہ باتیں میں نے کبھی خود سے بھی نہیں کہیں جو تم سے کہہ رہی ہوں۔ تم بہت اچھے ہو مینو۔'' اور وہ مینو کو لپٹا لیتی۔

مینو کے ساتھ تحلیلِ نفسی کے اس سیشن میں اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کے لئے ایک بات کی بڑی اہمیت ہے' جس کو شاید وہ کبھی نہیں جان سکے گی۔ وہ بات بھی کہیں اُس کے لاشعور میں دبی ہوئی تھی' اور اب اچانک ابھر آئی تھی۔

چھوٹے ٹھاکر نے...... آج کے عبدالحق نے باجی کو کبھی دیکھا تھا یا نہیں؟

اس کا حتمی جواب تو صرف عبدالحق دے سکتا تھا' اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ کبھی اُس سے یہ بات پوچھ سکے گی۔ البتہ اس کا جواب بڑے ٹھاکر کی ڈائری دیتی تھی۔ اس میں بڑے ٹھاکر نے حیرت ظاہر کی تھی کہ اس کے بیٹے کو یہ کیسی محبت ہے کہ وہ اس لڑکی کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ صرف اس کی آواز سننے کے لئے تڑپتا ہے۔ دوسری طرف وہ خود بھی گواہ تھی۔ اُس نے بارہا جالیوں کے پیچھے عبدالحق کو مضطربانہ انداز میں ٹہلتے دیکھا تھا۔ اُس کا رخ کسی طرف بھی نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں خالی پن ہوتا تھا نہ کہ کوئی تلاش۔ اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اُس نے باجی کو کبھی نہیں دیکھا۔ دیکھا ہوتا تو بار بار دیکھنا چاہتا۔ اُس کی نظریں ان کی جستجو میں بھٹکتی ہی رہتیں۔ وہ تھیں ہی ایسی۔

پھر اسے ایک اور بات یاد آئی۔ امی نے اُس سے کہا تھا کہ وہ جب اور جس وقت چاہے' نیچے آ سکتا ہے...... اپنے گھر کی طرح۔ اس بات پر اُس نے بہت ہنگامہ کیا تھا...... شاید اس لئے کہ وہ دوسری نظر کے قابل بھی نہیں تھی اور باجی کی جیت یقینی تھی۔ بہر حال چھوٹا ٹھاکر کبھی نیچے نہیں آیا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ کسی کو دیکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ باجی کو دیکھ لیا ہوتا تو وہ سر کے بل نیچے آتا اور بار بار آتا۔

اس کے باوجود نور بانو یہ تو دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ عبدالحق کی محبت کی ابتدا آواز سے ہوئی تھی...... باجی کے قرآن پڑھنے کی آواز سے۔ اُس نے اگر انہیں دیکھا بھی ہوگا تو بہت بعد میں۔ اور اس دیکھنے کی بھی حتمی تصدیق ممکن نہیں ہے۔

یہاں ایک اور سوال نے سر اٹھایا۔ بہت اہم اور چبھتا ہوا سوال یہ تھا کہ کیا عبدالحق کو واقعی باجی سے محبت تھی۔ اس بات کے حق میں صرف ایک دلیل تھی...... بڑے ٹھاکر کی ڈائری۔ بڑے ٹھاکر نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اُس کے بیٹے کو نیچے رہنے والی کسی مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن وہ ڈائری ہی ثابت کرتی تھی کہ بڑا ٹھاکر ذہنی طور پر غیر جانب دار نہیں تھا۔ ماضی میں ہونے والے غیر معمولی واقعات کی روشنی میں وہ پہلے ہی یہ فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ اس کا بیٹا کسی مسلمان لڑکی سے شادی کرے گا۔ اور وہ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

اور اس بات کے خلاف بہت زوردار دلیل موجود تھی کہ عبدالحق کو باجی سے محبت تھی۔ محبت کرنے والے تو اپنے محبوب کی موت کے غم میں زندگی کی رغبت اور محبت سے محروم ہو جاتے ہیں' پاگل دیوانے ہو جاتے ہیں' مر جاتے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کو بس یہ ملال تھا' پچھتاوا تھا کہ اس واقعے کے وقت وہ وہاں موجود نہیں تھا' کچھ کر نہیں سکا۔ اسے دل چیر دینے والا کوئی غم نہیں تھا۔ بلکہ اُس رات اُس کی سورۃ الملک کی تلاوت سن کر وہ جس از خود رفتگی کی کیفیت میں اوپر آیا تھا' اس سے تو یہ ثابت ہوتا تھا کہ اسے محبت آواز سے بھی نہیں تھی' بلکہ کلامِ الٰہی سے تھی۔ وہ سامنے تھی' مگر وہ اپنے

نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سن رہا تھا‘ مگر اُس کی سماعت کا مرکز و محور اُس کی آواز نہیں تھی‘ اللہ کا کلام تھا‘ اور کیسی کیفیت میں اُس نے کلمہ پڑھا تھا۔ اس میں کسی لڑکی کے عشق کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اُس کے دل کو اطمینان سا ہوا۔ یہ تو طے تھا کہ باجی ٹھاکر اوتار سنگھ سے محبت کرتی تھی۔ مگر اس بات کے شواہد نہیں ملتے تھے کہ وہ بھی باجی سے محبت کرتا تھا۔ اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اُس نے باجی کو نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا ہوتا تو وہ ان سے محبت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور پھر باجی اللہ میاں کے ہاں چلی گئیں......

اچانک نور بانو کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر آ گیا...... دل خراش‘ روح فرسا منظر۔ وہ منظر‘ وہ صورتِ حال وہ زندگی میں کبھی یاد کرنا‘ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ منظر جس لمحے اُس نے دیکھا تھا‘ اسی لمحے اسے بھلا دیا تھا۔ اُس نے ایک گہری سسکی لی اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے لیکن وہ منظر محو نہیں ہوا۔ وہ تو جیسے اُس کی نگاہ کے کینوس پر چپک گیا تھا۔ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے رکھے اُس نے کئی بار سر جھٹکا لیکن وہ منظر نہیں ہٹا۔

نور بانو کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس وقت وہ دہلی میں اپنے گھر میں تھی اور اس خوف اور دہشت کو دوبارہ جی رہی تھی‘ جس سے وہ اُس رات دوچار ہوئی تھی۔ وہ اس منظر سے نہیں بچ سکتی تھی‘ جو آنکھیں بند کرنے پر بھی اسے صاف نظر آ رہا تھا۔

جس وقت کا وہ منظر تھا‘ اس وقت وہ اپنی زندگی کے سب سے خوفناک بحران سے دوچار تھی۔ ایسے میں آدمی کسی بھی چیز کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتا۔ لیکن اُسے یاد تھا کہ وہ لرزہ خیز منظر تھا۔ شاید اس کے اندر اللہ کے قائم کردہ مدافعتی نظام کا کمال تھا کہ اس دن کے بعد اُس کی نگاہوں میں وہ منظر کبھی نہیں لہرایا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی تو بس اتنا کہ اس دن اُس کے گھر والوں پر کیا قیامت گزری۔ اور صرف اتنا سوچنے پر سوچوں کا وہ سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا...... خود بہ خود۔ تصور تک پہنچنے کی تو نوبت ہی نہیں آتی تھی۔

ایک بار حقیقت میں وہ منظر دیکھنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ منظر اسے یاد آیا۔ اور اگلے ہی لمحے اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اس کے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا اور وہ جیسے بے جان ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ ڈھے جاتی۔ مگر اس لمحے وہ خیال اُس کے جسم میں کرنٹ کی طرح دوڑ گیا۔ اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

کیا اس روز عبدالحق نے باجی کو دیکھا تھا؟ یہ ایک سوال اُس کے ذہن میں اس چڑیا کی طرح چکرا رہا تھا‘ جو ایک بند کمرے میں آ پھنسی ہو اور اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہو۔

وہ اُس کی زندگی کے لئے بہت خطرناک وقت تھا۔ وہ متضاد کیفیات سے دوچار تھی اور اصل

مسئلے کو بھول گئی تھی‘ جو اسے یہاں تک لے آیا تھا۔ یہ خیال بھی اُس کے لئے روح فرسا تھا کہ اُس وقت کے اوتار سنگھ اور حال کے عبدالحق نے امی اور اُس کی بہنوں کو اس حال میں دیکھا ہوگا‘ جو اُس نے دیکھا تھا...... جسموں پر کھرونچے‘ لہولہان‘ درندگی کے نشان لئے‘ ایسے کہ جسموں پر لباس کے نام پر ایک تار بھی نہ ہو۔ اسے یہ سوچتے ہوئے بھی حیا آ رہی تھی اور ساتھ ہی جھنجلاہٹ بھی تھی اور عبدالحق پر غصہ بھی۔ کیوں دیکھا اُس نے انہیں ایسے؟ اس حال میں؟ ذہن میں دبی دبی کچھ آوازیں بھی تھیں...... ضروری تو نہیں کہ دیکھا ہو۔ اور اس صورتِ حال میں اور نجانے کس کس نے دیکھا ہوگا۔ مگر اس کے اندر جو وحشت امنڈ رہی تھی‘ کسی طغیانی کی طرح بڑھ رہی تھی‘ اُس کے سامنے ان آوازوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اسے موہوم سا احساس ہو رہا تھا کہ یہ وحشت اسی طرح بڑھتی رہی تو اسے کچھ ہو جائے گا۔ وہ پھٹ جائے گی...... ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔

ایسے میں مینو نے اسے بچا لیا!

وحشت کے اس عالم میں تشنجی کیفیت میں گود میں لیٹے ہوئے مینو کو اُس نے بھینچا تو وہ گھبرا کر اٹھ گیا اور فریاد کرنے والے انداز میں مَیں مَیں کرنے لگا۔ اُس کی آواز نور بانو کو ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی۔

اس منظر سے‘ اس خیال سے‘ اس تصور سے پیچھا چھڑانا تو اب اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ تحت الشعور کی تاریک کوٹھری کا دروازہ کھل گیا تھا‘ اور وہاں چھپی ہوئی بلائیں لاشعور کے نیم تاریک کمرے میں رکے بغیر شعور کے جگمگاتے ایوان میں چلی آئی تھیں۔ اب ان سے نظریں چرانا‘ صرف نظر کرنا ناممکن تھا۔

آدمی اللہ کی رحمتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اللہ نے کیسے کیسے اہتمام کیے ہیں آدمی کی بہتری کے لئے۔ جب وہ کچھ ایسا دیکھتا یا جھیلتا ہے‘ جو اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو‘ مار دینے والا ہو تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ کبھی اُس کی یادداشت جزوی طور پر معطل ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس واقعے سے بے خبر اور یوں محفوظ ہو جاتا ہے۔

اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ وہ کسی پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی پر کوئی افتاد پڑنے والی ہو تو اللہ اُس سے پہلے ہی اس کے اندر ظرف‘ برداشت اور سکت بڑھا دیتا ہے۔ ورنہ تو آدمی صدمے سے مر جائے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی وقتی طور پر اس افتاد کو بھول جاتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر پریشانی کی اپنے لمحے پر بڑی اہمیت ہوتی ہے‘ جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بتدریج کم ہوتی جاتی ہے‘ یہاں تک کہ کچھ وقت گزرنے پر وہ غیر اہم ہو جاتی ہے۔

آدمی صرف اپنے وجود‘ اپنے جسم کو سمجھ لے تو اللہ کی رحمت پر شکر گزاری سے شل ہو جائے۔

جسم کے اندر ایسا مکمل نظام قائم ہے' جسے طبی سائنس بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتی۔ ورنہ صرف ایک مکمل نظام کار ہے۔ بلکہ اُس میں ہر موقع اور ہر صورت حال کے لئے مدافعتی نظام بھی موجود ہے' جو خودکار انداز میں کام کرتا ہے۔ جیسے ناقابلِ برداشت صدمے سے دوچار ہونے پر آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے' اور ہوش میں آنے پر بعض اوقات اسے یاد بھی نہیں ہوتا کہ ہوا کیا تھا۔

درحقیقت آدمی بھولتا کچھ نہیں ہے۔ انسانی دماغ اللہ کی وہ عظیم تخلیق ہے' جسے نہ تو دماغ کے ڈاکٹر پوری طرح سمجھ سکیں گے' نہ ہی ماہرین نفسیات۔ یہ وہ مشین ہے جو پورے جسم پر نگراں ہے' بلکہ حکمراں ہے۔ تمام اعضا اسی کے تابع ہیں۔ وہ ضرورت پڑنے پر کسی بھی عضو کو معطل کر دیتا ہے' اور کسی بھی عضو کی کارکردگی کو بہت زیادہ بڑھا دینے کی قدرت بھی اسے حاصل ہے۔ دوسری طرف یہ صرف جسم کی کارکردگی پر حکمراں نہیں ہے۔ بلکہ مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو جمع کرنا' ان کا تجزیہ کرنا اور ترجیحی بنیاد پر ان کے لئے ردِعمل متعین کرنا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔

تو جہاں اللہ نے پورے جسم کے لئے ہر ہر عضو کے لیے دفاعی میکنزم تیار کیا ہے' وہاں دماغ جیسا اہم حکمراں کیسے محروم رہ جاتا۔ تو دماغ کے لئے بھی مکمل مدافعتی نظام موجود ہے۔ اور وہ خودکار انداز میں کام کرتا ہے۔ دماغ کے معلومات جمع کرنے اور تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرنے والے حصے کو ہم شعور کہتے ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے اور بہت روشن ہال کی طرح ہے' جہاں کچھ بھی نہیں چھپتا۔ وہاں ہونے والے تجزیوں اور اخذ ہونے والے نتائج آدمی کی فکری اور نظریاتی شخصیت کا تعین کرتے ہیں۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ...... اللہ قرآن میں فرماتا ہے' وہی نہ جانے' جس نے پیدا کیا ہے۔ بے شک وہ سب کچھ جانتا ہے' اس لئے اُس نے ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم بھلائی سے زیادہ برائی میں کشش اور خوب صورتی محسوس کرنے والے ہیں' ہم گناہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ ہمارا نفس ہم پر ہمیشہ غالب رہے گا۔ چنانچہ ہمیں پوری طرح بے لگام ہونے سے بچانے کے لئے اس نے نفس کے ساتھ ہمیں ضمیر بھی عطا فرمایا...... ایک محتسب' جس کے پاس روکنے کی قوت تو نہیں' لیکن وہ ہمیں ٹوکتا رہتا ہے کہ کہاں ہم کیا غلط کر رہے ہیں۔ پھر ہمارا پیدا کرنے والا جانتا تھا کہ ہمارے لیے اپنے اچھے ہونے کی بڑی اہمیت ہے۔ جبکہ ہم ہمیشہ اچھے کم اور برے زیادہ ہوں گے۔ لیکن اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ ہم خود کو اچھا سمجھیں۔ جو خود کو برا سمجھنے لگے' وہ تو پھر بہت تیزی سے بدترین ہونے کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ آدمی خود کو اچھا سمجھے گا' تبھی تو اور اچھا ہونے کی خواہش کرے گا۔ تو اللہ نے اپنے بندوں کی یہ ضرورت پوری کرنے کے لئے بھی اہتمام فرمایا۔ اسے توبہ جیسی نعمت عطا فرمائی۔ شرک کے سوا ہر گناہ معاف کرنے کا وعدہ فرمایا۔ دل کی گہرائیوں سے اپنے گناہ پر نادم ہو اور اس عہد کے ساتھ اللہ سے توبہ کرو کہ اس

گناہ کا اعادہ نہیں کرو گے تو وہ تمہیں دھو کر پاک کر دے گا۔ اس گناہ کو تمہارے نامۂ اعمال سے مٹا دے گا اور تم ستر مرتبہ بھی وہ گناہ کر کے دل کی سچائی کے ساتھ توبہ کرو گے تو وہ بخش دے گا۔ سچائی شرط ہے' اور اللہ سے کچھ بھی چھپا نہیں ہے۔ تبھی تو مایوسی کو کفر قرار دیا ہے۔ گناہ سمندروں کے جھاگوں جتنے بھی ہوں تو اُس کی بے پایاں رحمت اور وسیع مغفرت کے سامنے بے حقیقت ہیں۔ توبہ کا دروازہ نہ کھلا ہوتا تو آدمی اپنے بے حد و بے حساب گناہوں کی وجہ سے مایوس ہوتا۔ مایوس ہوتا' اور بخشش کی امید نہ ہوتی تو سوائے اس کے کیا کرتا کہ نڈر ہو کر...... بلکہ خوف زدہ ہو کر پیٹ بھر کے گناہ کرتا کہ اب تو جہنم ہی مقدر ہے' اس دنیا میں جو جی چاہے' کر لو۔ اور اللہ کا انکار کر دو کہ اسی میں عافیت ہے۔ کفر اور کیا ہے؟ یہی تو ہے!

مگر یہ بچت تو ان کے لئے ہے' جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں' اُس سے رجوع کرنے والے ہیں۔ اللہ کی رحمت تو تمام عالموں کے لئے ہے۔ اُس نے تو انکار کرنے والوں کا بھی خیال رکھا۔ وہ جو نہ اللہ کو جانتے اور مانتے ہیں اور نہ انہیں توبہ کا پتہ ہے۔ ان کے لئے اس نے دماغ کے تین حصے کر دیے۔ اوپر جگمگاتا ہوا روشن ایوان' جسے شعور کہا جاتا ہے۔ اُس کے نیچے ایک نیم تاریک تہ خانہ' جو لاشعور کہلاتا ہے۔ اور اُس کے نیچے نہایت تنگ و تاریک کوٹھری' جسے تحت الشعور کہتے ہیں۔ انسان کچھ بھی کر لے' کتنی ہی آگہی حاصل کر لے' اس کوٹھری سے بے خبر ہی رہتا ہے۔ اللہ' جو علیمٌ بذات الصدور ہے' وہی جانتا ہے کہ کس کی کوٹھری میں کیا ہے۔ اپنے اعمال میں سے' رُونما ہونے والے واقعات میں سے' سنی جانے والی باتوں' نظر آنے والے مناظر میں سے' جو کچھ بھی آدمی کو ناپسند ہو' جس سے وہ نظریں چرانا چاہے' جسے وہ تجزیہ کر کے شعوری طور پر نہ سمجھنا چاہے' اس سب کو وہ روشن ایوان کے نیچے نیم تاریک تہ خانے میں دھکیل کر بھول جاتا ہے...... یا یوں کہیں کہ گمان کرتا ہے کہ بھول گیا۔

انسان کے لاشعور میں جو کچھ جاتا ہے' وہ دو طرح سے جاتا ہے۔ کبھی تو وہ خود کسی بات کو اس نہاں خانے میں دھکیل دیتا ہے۔ اور کبھی اللہ کے قائم کردہ خودکار نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے۔ بہر کیف اس تہ خانے پر آدمی کا اپنا کوئی اختیار نہیں۔ وہ وہاں سے خود کچھ نکال نہیں سکتا۔ وقت آنے پر جب بھی ایسا ہوتا ہے تو وہ بھی قدرت کے خودکار نظام کے تحت ہوتا ہے۔ البتہ آدمی کے اپنے حیران کن اور ناقابلِ فہم اقوال و افعال کا محرک ہمیشہ اس کے لاشعور میں چھپی کوئی بات ہوتی ہے۔ اسی لئے تو وہ اس کے لئے حیران کن اور ناقابلِ فہم ہوتی ہے۔

تحت الشعور کی تاریک کوٹھری پر آدمی کا ذرا بھی اختیار نہیں۔ نہ وہ وہاں کچھ داخل کر سکتا ہے اور نہ ہی وہاں سے کچھ نکال سکتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ تو اس کی موجودگی سے بھی بے خبر ہے۔ اس حجرۂ ہفت بلا کو تو بس ہمارا خالق جانتا ہے۔ اور اس کے لئے اُس نے خودکار نظام متعین کر دیا ہے۔

خود آدمی کو بھی علم ہے کہ وہ کتنا نازک ہے۔ تبھی تو میر نے کہا تھا......

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

......تو یہ دیکھیں کہ کوئی بہت بڑی یا بہت بری خبر کسی کو سنانی ہو تو اس کے محبت کرنے والے' اس کے خیر خواہ اس تک وہ خبر مرحلہ وار' کئی قسطوں میں پہنچاتے ہیں' ایک دم سے نہیں' اس ڈر سے کہ وہ سن کر اسے کچھ ہو نہ جائے...... پہلے اُس نے مُس کہا' پھر تق کہا' پھر بل کہا' کے مصداق' اور ان کا یہ عمل درحقیقت قدرت کی پیروی ہی ہے۔

تحت الشعور بلاؤں کا گھر ہے...... بڑی بلاؤں کا۔ وہ ایسی بلائیں ہوتی ہیں جن سے آدمی بے خبر ہوتا ہے۔ کسی بھی مصلحت یا ضرورت کے تحت قدرت جب آدمی کو اُس کی آگہی عطا کرنا چاہے تو وہ بھی یہ اہتمام کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اس بات کو ایک دم تحت الشعور سے شعور میں دھکیل دیا جائے۔ وجود کے پاتال کی اس کوٹھری کا آہنی دروازہ کھلتا ہے اور وہ بلا نکلتی ہے اور اُس کی منزل لاشعور کا تہہ خانہ ہوتا ہے۔ اور جب وہ لاشعور میں آ جائے تو آدمی کسمساتا ہے' اسے احساس ہوتا ہے کہ کوئی اہم بات ہے' جو اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہتا ہے' اور یوں اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ شعور میں آ جائے' تب بھی وہ اسے فوری طور پر قبول نہیں کرتا۔ روشنی میں اُس کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ یوں اس بات کی شدت بھی کم ہوتی ہے اور وہ اُس کے لئے بہتر طور پر تیار بھی ہو جاتا ہے۔ پھر ضروری نہیں کہ وہ بات براہِ راست اس کے شعور تک پہنچے۔ نفسیات بتاتی ہے کہ عام طور پر یہ عمل خوابوں کے ذریعے ہوتا ہے۔

نور بانو کا یہ عمل بھی مہینوں سے چل رہا تھا۔ کچھ تو ایسا تھا' جس سے وہ نظریں چراتی تھی' جو وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ ہوا کہ اُس نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اُس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی' جو اس سے بہت مختلف تھی' جسے وہ حقیقت سمجھتی تھی' اسے احساس ہوا کہ اس آگہی میں اُس کے لئے بہتری تھی۔ چناں چہ اُس کا حوصلہ بڑھا۔

مگر اس وقت جو کچھ اُس کے سامنے آیا' وہ بہت خوف ناک تھا۔ وہ منظر...... اسے دیکھنا تو دور کی بات' وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن اب وہ اس سے بچ بھی نہیں سکتی۔ اب تو وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی خود غرض ہے۔ اس کی اماں' بہنیں' چھمن بوا اور آ کا پر جو گزری تھی' اللہ نے اسے اس سے بچا لیا تھا۔ اور وہ ان محبت کرنے والوں کی یادوں سے منہ موڑے بیٹھی تھی' ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ چند لمحے ان لوگوں کی اذیت کو محسوس کرنے کی کوشش تو کرتی۔ مگر وہ اس سے ڈرتی تھی' اور اب بھی ڈرتی ہے۔ جبکہ وہ محض تصور میں اس اذیت کو محسوس کرے گی' جو ان لوگوں نے حقیقت میں اٹھائی تھی اور اس اذیت سے گزر کر موت کی سرحد میں چلے گئے تھے۔

یہ تو اُس نے پہلے بھی مان لیا تھا کہ وہ بہت خود غرض ہے مگر اس بار تو اُس نے سوچا کہ واقعی اُس نے حد کر دی۔ اُس نے اس موضوع پر کسی سے بات نہیں کی۔ چلو عبدالحق اور زبیر بھائی سے تو ممکن نہیں تھا لیکن وہ رابعہ آپا سے تو بات کر سکتی تھی۔ کیا ان جانے والوں کا اُس پر یہ حق نہیں تھا کہ وہ ان کے بارے میں بات کرتی' معلوم کرتی۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی تدفین کیسے ہوئی؟ وہ کہاں دفن ہوئے؟

وہ لرز کر رہ گئی۔ یہ تو خود غرضی کی آخری حد تھی کہ آج چھ ماہ سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی اسے اس منظر کا خیال آیا تو وہ بھی اس لئے کہ وہ رقابت کے زیرِ اثر یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ عبدالحق نے باجی کو کبھی دیکھا تھا یا نہیں۔ اور کتنی تن دہی سے وہ اس بات کو کھوج رہی تھی' جیسے اس کی بہت بڑی اہمیت ہو۔ حالانکہ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا مری ہوئی مظلوم بہن اب بھی اُس کے لئے رقیب ہے۔

اس کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اپنے چھپے ہوئے ماضی کے بارے میں رابعہ آپا سے تفصیل سنے گی...... کسی گھٹیا تجسس کی خاطر نہیں' بلکہ اپنے مظلوم شہید لوگوں کی محبت کا قرض اتارنے کے لئے!

اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں...... ان میں کچھ دکھ کے تھے اور کچھ شرمندگی کے!

❁ ❁ ❁

زبیر نے جب مالک کی تقلید میں اسلام قبول کیا تو اس کے خیال میں وہ محض نام کی تبدیلی تھی۔ پہلے وہ رگھو تھا' اب زبیر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک معروفیت اتنی تھی کہ جو کچھ اُس نے دیکھا تھا' اس پر سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ دہلی سے یہاں آنا' آباد ہونا' پھر ہندوستان سے مہاجروں کی آمد' حویلی کو برآمد کرانے کا مرحلہ اور اُس کے بعد ریت میں دبے ہوئے گیارہ گاؤں برآمد کرانا۔

مگر اب وہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ گیارہ گاؤں برآمد ہو چکے تھے۔ پٹواری حسن دین آیا تو اور زمین کے کاغذات اسے دے گیا تھا۔

''صاحب تو شہر گئے ہیں۔'' زبیر نے اسے بتایا۔ بڑی مشکل سے اس نے مالک کو صاحب سے تبدیل کیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' حسن دین نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اس موقع ہی سے تو فائدہ اٹھایا ہے میں نے۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ گیارہ گاؤں ہیں نا' ان میں سے سات گاؤں کی مثل میں نے عبدالحق کے نام بنا دی

ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟ وہ آئیں گے تو یہ زمین تقسیم کر دیں گے۔"

حسن دین مسکرایا۔ "میں تمہارے اس صاحب کا مزاج سمجھ گیا ہوں۔ اس سلسلے میں میں نے گاؤں والوں سے بھی بات کی ہے اور انہیں سمجھایا ہے۔ اُس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ عبد الحق صاحب اپنے دل کی ہی کریں گے۔ مگر اُس کا بھی توڑ کر لیا ہے میں نے۔"

"وہ کیا؟"

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ گیارہ میں سے چار گاؤں کا میں نے کیا کیا؟"

"کسی دعوے دار کو دے دیے ہوں گے۔" زبیر نے بے پروائی سے کہا۔

"دعوے داروں کی تو پوچھو ہی مت۔ یہ گناہ گار آنکھیں کیا کچھ دیکھ چکی ہیں۔ بڑے بڑے کھیلے ہو رہے ہیں۔ جو وہاں غلامی کرتے تھے' وہ یہاں زمین دار اور آقا بن گئے ہیں' اور حق دار خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ کوئی حقیقی دعوے دار ثبوت کے ساتھ آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ کوئی جعلی کاغذات کی مدد سے پہلے ہی ہاتھ صاف کر چکا ہے۔ خیر...... دو چار گاؤں میں نے تمہارے نام کر دیے ہیں۔ یہ رہی ان کی مثل۔"

زبیر ہکا بکا رہ گیا۔ "لیکن میرا نہ کوئی دعویٰ ہے نہ حق۔ یہ تو زیادتی ہے حق داروں کے ساتھ۔"

"یہ سب کچھ مجھے مت پڑھاؤ۔" حسن دین نے ترشی سے کہا۔ "اس تھوڑے سے عرصے میں میں اتنا کچھ دیکھ اور سیکھ چکا ہوں' جو ساری عمر نہیں سیکھ سکا تھا۔ جو وہاں حویلیوں میں رہتے تھے' انہیں کیمپ میں کس مپری کی زندگی گزارتے دیکھ رہا ہوں۔"

"مگر یہ سب تم نے کیا کیسے؟"

"یہاں بہت ایمان دار اور درد مند اعلیٰ افسر بھی ہیں۔ جن سے میرا رابطہ ہے' میں نے ان کو عبد الحق کے بارے میں بتایا ہے۔ یوں کلیم آفس کے ایک بڑے افسر سے بات ہوئی اور کام ہو گیا۔ اپنے میدان میں میرے اپنے اختیارات بھی کم نہیں ہیں۔"

"لیکن میں کیوں؟ میرے پاس تو بس اپنا کچا گھر تھا اسی گاؤں میں۔ اور اب اُس سے اچھے گھر میں رہتا ہوں۔" زبیر نے کہا۔ "اور جانتے ہو' صاحب کو پتا چلے گا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ کیا پتا' مجھے چھوڑ ہی دیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز لرزنے لگی۔

"اُنہیں بتانے کی غلطی بھی نہ کرنا۔" حسن دین نے جلدی سے کہا۔ "ورنہ یہ زمین بھی وہ تقسیم کر دیں گے۔ اصل میں تو یہ زمین انہی کے لیے ہے۔ دیکھو نا' ان کی شادی ہو گی' بچے ہوں گے۔ وہ خود تو دوسروں کی فکر کرتے رہیں گے اور ان کے بچے محروم رہ جائیں گے۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" زبیر نے فکر مندی سے کہا۔ وہ خود بھی اسی انداز میں سوچتا تھا۔

"تو یہ زمین دراصل انہی کے لئے ہے۔ تمہارے پاس امانت رہے گی۔ آدھی بے شک تم اپنے لئے رکھ سکتے ہو۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" زبیر نے کہا۔ "مگر یہ تو بُری بات ہے کہ یہ زمین غیر آباد پڑی رہے۔"

"غیر آباد کیوں ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ میں یہاں پانی آ جائے گا۔ میں مناسب آدمی دیکھ کر یہ زمین کاشت کے لیے دے دوں گا۔ کاغذات تمہارے پاس' اور تمہارے نام ہیں۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ جو کچھ ملے' وہ آدھا تمہارا' اور آدھا اپنے صاحب کے لئے جمع کرتے رہنا۔"

"دل تو میرا بھی چاہتا ہے کاشت کاری کو۔"

"تو زمین تو تمہاری ہی ہے۔ جتنی چاہو' زیرِ کاشت لے آؤ۔"

"اور صاحب کو کیا جواب دوں گا؟"

حسن دین جیسے ہر بات سوچ سمجھ کر آیا تھا۔ "کہہ دینا کہ میں نے کسی سے زمین دلوائی ہے تمہیں۔" اُس نے جھٹ سے کہا۔

زبیر مطمئن ہو گیا۔ "اور یہ تو بتاؤ' میرے صاحب کا کیا حال ہے؟"

حسن دین ہنسنے لگا۔ "عیش کر رہے ہیں۔ پناہ گزینوں کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں' ان کے ساتھ سوتے ہیں اور کسی رضوان کو تلاش کرتے ہیں۔ فکر نہ کرو' کیمپ کے انچارج عرفان صاحب ان کا خیال رکھتے ہیں۔"

"صاحب واپس کب آئیں گے؟"

"اس کے بارے میں تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

سونہری پانی کے آنے تک زبیر کے لئے فرصت ہی فرصت تھی۔ نیاز اور اس کے بھائی مویشیوں کے کام کو پوری طرح سمجھ چکے تھے' اور اس میں ان کا دل بھی لگ گیا تھا۔ زبیر کو اب ان کے ساتھ آگے آگے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ چند روز آرام کرے گا اور پھر نیاز سے کہے گا کہ اب وہ اپنا کام خود سنبھالیں۔ اسے کاشت کاری کرنی ہے۔

یوں پہلی بار اسے سوچنے کا وقت ملا۔ اور سوچا تو اس پر حیرت کے دروازے کھلتے گئے۔ اُس نے تو یہ سوچ کر دھرم بدلا تھا کہ جو مالک کا دھرم' وہ اُس کا دھرم۔ مگر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ بدل گیا ہے۔ اور تبدیلی کا عمل اتنا سُست رفتار اور تدریجا تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

قرآن وہ اور رابعہ اب بھی پڑھتے تھے ابتدا میں تو وہ بہت مشکل، بلکہ ناممکن لگتا تھا۔ مگر پھر ان کی زبان حروف وصوت کو قبول کرنے لگی۔ ابھی ان کا تیسواں پارہ ختم نہیں ہوا تھا لیکن انہیں قرآن پڑھنا بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ بلکہ قرآن پڑھنے کے وقت میں انہیں بے تابی ہوتی تھی۔ اور اذان کی آواز سن کر تو وہ بے چین ہو جاتا تھا۔ کوئی مصروفیت ہوتی تو اُس میں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔

البتہ ایک موقع پر وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔ مالک کا خیال نہ ہوتا تو وہ بھاگ کھڑا ہوتا۔

مسجد کے امام مہر علی صاحب کو جب پتا چلا کہ وہ ہندو تھے اور مسلمان ہوئے ہیں تو انہوں نے پوچھا۔ ''مسلمانی ہوئی ہے تم لوگوں کی؟''

''وہ کیا ہوتی ہے؟'' عبدالحق نے سوال کیا۔

''ایک طرح کی جراحت ہوتی ہے۔'' مہر علی نے کہا اور پھر وضاحت کی۔ وہ وضاحت سن کر زبیر کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ گھبراہٹ عبدالحق کے چہرے پر بھی تھی۔ ''کیا یہ ضروری ہے مولانا؟''

''بالکل ضروری ہے۔ بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے تو اُس کی مسلمانی کرادی جاتی ہے۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا لیکن بڑے ہونے پر ہو تو تکلیف بھی ہوتی ہے اور ٹھیک ہونے میں بھی زیادہ وقت لگتا ہے۔''

''ضروری ہے تو تکلیف کی مجھے پروا نہیں۔ لیکن مجھے جراح کے سامنے......'' عبدالحق سے جملہ پورا نہیں کیا گیا، اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''مجبوری ہے اب دیکھو، ڈاکٹر سے تو پردہ نہیں ہوتا نا۔''

مہر علی صاحب نے بڑی رازداری سے جراح کا بندوبست کیا۔ یہ طے تھا کہ عبدالحق، زبیر، مہر علی اور جراح کے سوا کسی کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔ مسجد سے متصل مہر علی کا چھوٹا سا گھر تھا، جہاں وہ اکیلے رہتے تھے۔ وہاں کسی کا آنا جانا بھی نہیں تھا۔ ٹھیک ہونے تک وہ دونوں وہیں رہتے۔

گاؤں والوں کو بتا دیا جاتا کہ وہ کسی کام سے شہر گئے ہیں۔ اس کام کے لئے وقت عشا کے ایک گھنٹے بعد کا طے پایا کہ اس وقت تک گاؤں میں سناٹا ہو جاتا تھا۔ سب لوگ سو جاتے تھے۔

وہ پہلا موقع تھا کہ مالک کی وفاداری خون میں رچی بسی نہ ہوتی تو زبیر بھاگ جاتا...... گاؤں سے بھی اور اپنے اس مذہب سے بھی۔ وہ سوچتا اور دہلتا رہا، ارے انگلی میں پھانس چبھ جائے تو اسے نکالنے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے، جبکہ یہ تو بات بہت آگے کی تھی۔

عبدالحق نے اُن کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ اُس نے زبیر سے کہا۔ ''بھائی! اللہ کی خاطر میں سر بھی کٹا سکتا ہوں۔ تکلیف سے ڈر نہیں لگتا۔ بس بے پردگی کے خیال سے شرم آتی ہے۔ مگر مجبوری ہے۔''

اس لمحے زبیر کو کچھ یاد آ گیا۔ ڈر اور خوف تو اس کے ذہن سے نکل گیا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ ''دہلی سے یہاں آنے والا سفر یاد ہے مالک؟ وہ جو راستے میں ہمیں روکا گیا تھا۔ حیرت ہے، مجھے پہلے خیال نہیں آیا۔ وہ لوگ بھی تو دیکھتے تھے۔ اس سے انہیں پتا چل جاتا تھا کہ مسافر مسلمان ہے یا نہیں۔''

عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تو وہ تمہیں اس لئے الگ لے گئے تھے؟''

''تو اور کیا۔ آپ کے لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ راج پوت ہیں......''

''واقعی...... میں تو جان لے لیتا یا جان دے دیتا۔'' عبدالحق نے جھرجھری لے کر کہا۔

''لیکن یہاں تو مجبوری ہے۔''

جراح آ گیا۔ عبدالحق نے زبیر سے کہا۔ ''بھائی، پہلے میں جاؤں گا۔ اور دیکھو، تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔ بس یہ تصور کر لینا کہ اس میں اللہ کی خوشی ہے، تو پھر تکلیف ہوگی ہی نہیں۔ اور ہوگی تو بڑی اور بری نہیں لگے گی۔''

لیکن جراح کے سامنے بے پردہ ہوتے ہوئے اسے خود کو یاد دلانا پڑا کہ اگر یہ اللہ کا حکم نہ ہوتا تو بے پردہ ہونے سے پہلے وہ شرم سے مر جاتا۔ اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''ارے...... تمہاری تو ختنہ پہلے ہی ہو چکی ہے۔''

جراح کی آواز نے اسے چونکا دیا اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ سمجھ میں اُس کی کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

''یہ تم نے کوئی مذاق کیا ہے میرے ساتھ؟'' جراح اب خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ ''سمجھ رہے ہو نا۔ تمہاری تو ختنہ ہو چکی ہے۔''

''کک...... کب...... کک...... کک...... کیسے۔'' عبدالحق بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

''اب یہ تو تمہیں ہی معلوم ہوگا۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں پیسے پورے لوں گا۔''

''پیسوں کی آپ فکر نہ کریں۔ میں زیادہ ہی دوں گا۔''

''وہ دوسرا بھی تم جیسا تو نہیں؟''

''پپ...... پتا نہیں۔ آپ خود دیکھ لیں۔''

''بلاؤ اسے۔''

یہ سب کچھ عبدالحق نے اسے بتایا تھا۔ مگر اس وقت وہ کچھ سوچ سمجھ نہیں سکا تھا۔ اُس وقت تو صحن میں جراح کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ مگر پھر اسے یاد آیا۔ دہلی سے آتے ہوئے جب اس بلوائی نے اسے چیک کیا تھا تو مطمئن ہو کر سر ہلاتے ہوئے کہا تھا...... ہاں یہ ہندو ہی ہیں۔

جراح نے اسے دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔ ''شکر ہے۔ تم تو کام کے نکلے۔''

یہ سن کر زبیر کا تو دم ہی نکل گیا۔ ''کیا بہت تکلیف ہوگی؟''

''میں استاد عبدالقادر ہوں......اپنے فن میں ماہر۔'' جراح نے برا مانتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یوں ایک سیکنڈ میں چڑیا اُڑ جائے گی پھر سے۔'' اُس نے چٹکی بجائی۔ ''اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔''

استرے کا چمکتا ہوا پھل دیکھ کر زبیر کے اوسان خطا ہو گئے۔ ''اور میں کتنے عرصے میں ٹھیک ہو جاؤں گا؟'' اس نے مہلت حاصل کرنے کے لئے کہا۔

''زیادہ سے زیادہ تین دن۔''

''بس۔'' زبیر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''ہاں......استاد عبدالقادر کے ہاتھ کا کام اس سے زیادہ وقت نہیں مانگتا۔'' جراح زبیر کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر اچانک اُس نے کہا۔ ''یہ اوپر جو اُڑ رہی ہے' چڑیا تو نہیں ہو سکتی۔ چمگادڑ ہو گی۔''

زبیر نے بے ساختہ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ''کہاں؟'' اسی لمحے اسے ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا۔

''اُڑ بھی گئی۔'' جراح نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ تب زبیر کو پتا چلا کہ اُس کا کام ہو گیا تھا۔

اور جراح کی بات سچی ثابت ہوئی۔ تین دن میں وہ بھلا چنگا ہو گیا۔ لیکن ان تین دنوں میں عبدالحق نے اسے ایک لمحے کے لئے بھی اکیلا نہیں چھوڑا۔

طبیعت ذرا سنبھلی اور زبیر کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اس کی سمجھ میں وہ بات آئی۔ دہلی سے نکلتے ہوئے اگر ہندو انتہا پسندوں نے اگر اُس کی بات نہ مانی ہوتی اور مالک کو چیک کیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ چیک کرنے والا نعرہ لگاتا...... ہے پربھو' یہ تو مُسلا ہے مُسلا۔ جے بجرنگ بلی۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ مالک کے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکتا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اِس مذہب کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا۔ یہ تو واقعی اللہ کی رحمت تھی۔ تو چھوٹے ٹھاکر اسی حال میں پیدا ہوئے تھے۔ اُس نے دیکھا تھا کہ وہ شروع ہی سے مختون تھے۔ لال آندھی کے بعد وہ جس حال میں آئے تھے' وہ بھی اسے یاد تھا۔ وہ کئی دن تک سوچتا رہا کہ جس آندھی میں گیارہ گاؤں ریت میں دفن ہو گئے' چھوٹے ٹھاکر وہاں سے کیسے بچ آئے۔ ویسے ہی جیسے بعد میں وہ دہلی سے نکل آئے۔ جبکہ ان کے سامان میں قرآن پاک کے کئی نسخے بھی موجود تھے۔ اور چھوٹے ٹھاکر کی جانچ ہو جاتی تو وہ سب مارے جاتے۔

اُس کی سمجھ میں آنے لگا کہ وہ سب سے مہان شکتی ہے۔ ہوتا وہی ہے' جو وہ چاہتا ہے۔ کتنا

کچھ دیکھ لیا تھا اُس نے۔ پورے گیارہ گاؤں اُس نے ریت میں سے برآمد ہوتے دیکھے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

اُس رات وہ سونے کے لئے لیٹا۔ زمینوں کے کاغذات اُس نے رابعہ کو احتیاط سے رکھنے کے لئے دے دیے تھے۔ اپنے کاغذات کو اُس نے علیحدہ رکھوایا تھا۔ وہ اُس کے پاس عبدالحق کی امانت تھے۔

اسے احساس ہوا کہ رابعہ اسے بار بار دیکھتی ہے اور نظریں جھکا لیتی ہے۔ جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک بڑی خبر ہے جی' میں ماں بننے والی ہوں۔''

زبیر ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔ ''کیا کہتی ہو؟ یہ کیسے......؟''

''میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ دو مہینے ہو گئے ہیں۔ میں نے سوچا' ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری گود بھر سکتی ہے۔ لیکن آج نیاز بھائی کی اماں نے مجھے ٹوک دیا۔ کہنے لگیں' تمہیں پتا بھی ہے یا نہیں' اب سنبھل کر قدم اٹھایا کرو۔ میں تو کچھ سمجھی ہی نہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا' یہ تمہارا پہلا بچہ ہے؟ تب مجھے سمجھ آئی۔''

''بوڑھی عورت ہے' اُسے کیا پتا۔'' زبیر پھر دراز ہو گیا۔

''نہیں جی۔ انہوں نے دیکھا کہ مجھے یقین نہیں آیا ہے تو انھوں نے شاداں کو بلوالیا......''

''کون شاداں؟''

''دائی ہے۔ اور وہ آئی تو اُس نے بھی یہی بات کہی۔ اُس نے کہا' یہ تیسرا مہینہ ہے۔''

زبیر پھر اٹھ بیٹھا۔ ''مجھے تو یقین نہیں آتا۔''

''مجھے بھی' لیکن من میں کچھ کچھ ہوتا ہے۔ اور مجھے بھاری بھاری سا بھی لگتا ہے۔''

''اللہ کرے' یہ سچ ہو۔'' زبیر نے بڑے خلوص سے کہا اور رابعہ کو لپٹا لیا۔

''پر مجھے تو یقین اُس وقت آئے گا' جب ہو گا۔''

''اللہ پر یقین رکھو پگلی۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہے۔''

اس لمحے نے زبیر کو پوری طرح بدل دیا۔ اُس نے بڑے فخر سے سوچا' ہمارا بچہ خالص مسلمان ہو گا۔ یہی تو کہا تھا' مولوی مہر علی نے۔ مسلمانی کے بعد انہوں نے کہا تھا' اب تمہارا اور رابعہ کا نکاح بھی ضروری ہے۔ اُس نے اعتراض کیا کہ وہ تو پہلے ہی سے شادی شدہ ہیں۔ تب مولوی مہر علی نے کہا تھا کہ نکاح حرام کو حلال کر دیتا ہے۔ اس نکاح کے بعد جو اللہ تمہیں اولاد دے گا' وہ انشاء اللہ نیک اور صالح ہو گی۔ زبیر نہ چاہتے ہوئے بھی مان گیا تھا۔ اعتراض تو اسے کوئی نہیں تھا لیکن لگتا تھا کہ وہ اور رابعہ تماشا بن رہے ہیں۔

مگر یہی بات یہ تھی کہ اس نکاح کے بعد رابعہ اسے نئی نئی لگی تھی۔ بعد میں رابعہ نے بھی یہی بات کہی۔

ان دونوں کی شادی کو بارہ سال ہو چکے تھے۔ عمریں ان کی زیادہ نہیں تھیں۔ زبیر اب بہ مشکل بتیس کا ہوگا۔ اور اولاد کی آرزو تو سبھی کو ہوتی ہے۔ زبیر کے ماں باپ کو اُس سے بھی زیادہ خواہش تھی پوتے کی۔ انہوں نے کوئی در نہیں چھوڑا تھا۔ منتیں مان مان کر ہار گئے تھے۔ کوئی وید طبیب نہیں چھوڑا تھا۔ مگر جواب یہی ملا تھا کہ ان کے نصیب میں اولاد ہے ہی نہیں۔

اور اب زبیر سوچ رہا تھا کہ نکاح کی برکت سے یہ اَن ہونی بھی ہو گئی۔ ان کے نکاح کو ابھی چار مہینے ہی تو ہوئے تھے۔

اُسی وقت عبدالحق اسے بڑی شدت سے یاد آیا۔ مالک یہاں ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اور وہ اسی سے وہی بات کہتے، جو ہر خوشی کے موقع پر کہا کرتے تھے...... اللہ کا شکر ادا کرو زبیر۔ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔

زبیر نے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور زیرِ لب بولا...... اللہ تیرا شکر ہے۔ پھر اُس نے رابعہ سے کہا۔ ''اللہ کا شکر ادا کر رابعہ۔''

''وہ تو میں نے کیا تھا۔''

''مالک کہتے ہیں، شکر کا اچھا اور آسان طریقہ دو نفل ہیں۔ چل اٹھ۔ وضو کریں اور شکر ادا کریں۔''

❁ ❁ ❁
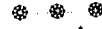
انکوائری کا فیصلہ آ گیا تھا۔ انکوائری آفیسر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ جمیل کو بدعنوانی کا مرتکب پایا گیا لیکن کیونکہ یہ اُس کی پہلی غلطی تھی اور بدعنوانی سنگین نوعیت کی نہیں تھی۔ پھر جمیل نے تحریری طور پر معافی بھی مانگ لی تھی۔ اس لئے اسے بحال کر دیا گیا تھا۔

بحال ہونے کے بعد جمیل پورے کیمپ میں دندناتا پھرا تھا۔ وہ مسعود صاحب کا مذاق اڑا رہا تھا۔ ''بڑے افسر بنے پھرتے ہیں۔ ارے افسروں والے اعمال بھی تو ہوں۔ راشن تولتے ہیں تو یہ نہیں سوچتے کہ یہ چپراسی کا کام ہے۔ ایسے افسروں کو کون پوچھتا ہے۔''

''لیکن یہ ہوا کیسے؟'' عبدالحق نے اُس سے پوچھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس فیصلے سے اسے شاک پہنچا تھا۔ ''تمہارے خلاف ثبوت تو سارے پکے تھے۔''

''ثبوتوں سے کیا ہوتا ہے۔ جس کے پاس پوا ہو، اُس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''اور یہ پوا کیا ہوتا ہے؟''

''تعلقات کو کہتے ہیں۔'' جمیل نے اسے بچوں کی طرح سمجھایا۔ ''میرا پوا بہت بھاری

ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''جن افسروں سے میرے تعلقات ہیں، وہ مسعود صاحب جیسوں کو اپنی جیب میں ڈالے پھرتے ہیں۔''

''اتنے بڑے افسروں سے تمہارا کیا تعلق؟''

جمیل نے بائیں آنکھ دباتے ہوئے لچرپن سے کہا۔ ''اب گھر کی باتیں تو نہیں بتائی جا سکتیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ یہ دنیا ضرورت کی ہے۔ تم میری ضرورت پوری کرو گے تو میں تمہارا خیال تو رکھوں گا نا۔ یہ دنیا مطلب کی ہے۔''

عبدالحق کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ مگر وہ اندر سے بہت زخمی ہوا۔ یہ کیسا اسلامی ملک ہے اور یہ کیسے مسلمان ہیں۔ کیا اسلام یہ سکھاتا ہے۔ کیا اس ملک میں باطل حق پر غالب آ سکتا ہے؟ اسے کالج میں ہونے والی بحثیں یاد آ گئیں۔ وہاں تو کچھ اور ہی باتیں ہوتی تھیں۔

پھر اسے پتا چلا کہ اسی سلسلے میں مسعود صاحب کی انکوائری افسر صدیق صاحب سے خاصی تلخی ہوئی ہے۔ ان کا مؤقف تھا کہ جمیل کا جرم معمولی نہیں، بلکہ سنگین تھا، اور بے شک پکڑا وہ پہلی بار گیا تھا لیکن یہ اُس کی پہلی غلطی بہر حال نہیں تھی۔ انداز سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عادی مجرم ہے۔ اور اسے ڈسمس ہونا چاہئے تھا۔ اس پر صدیق صاحب نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ مجبور تھے۔ جمیل کے لئے سفارش بہت اوپر سے آئی تھی۔

عبدالحق اسی روز مسعود صاحب سے ملنے گیا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ ''آؤ میاں عبدالحق، کیسے ہو؟''

''جی، اللہ کا شکر ہے۔''

''او، تمہارا کام بھی کچھ بنا؟''

''ابھی تک تو ناکام ہی ہوں۔''

''چند روز افضال صاحب کے ساتھ باہر جا کر دیکھو۔ اللہ مسبب الاسباب ہے اور حرکت میں برکت ہے۔''

عبدالحق کو وہ تجویز اچھی لگی۔ ''واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ کل سے یہی کروں گا۔''

''اور ملازمت کے بارے میں بھی کچھ سوچا تم نے؟''

''جی نہیں، اور اب تو سوچنے کی گنجائش بھی نہیں۔'' عبدالحق کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''میں نے یہاں بے ایمانی کو ایمان داری پر غالب ہوتے دیکھا ہے۔''

''ارے وہ...... ان باتوں کو اتنی اہمیت نہ دو۔'' مسعود صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بلکہ اس صورتِ حال میں تو تم جیسے لوگوں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اور ایک بات یاد رکھو۔ یہ حق و باطل کی جنگ تو ازل سے جاری ہے۔ اس میں دل چھوٹا کرنے کی گنجائش نہیں۔ ہم دست بردار ہو گئے تو باطل جیت جائے گا۔ یہ تو ہر مسلمان پر اُس کی حیثیت اور استطاعت کے مطابق فرض ہے۔"

"لیکن جو کچھ ہوا' اُس میں آپ کی بے عزتی ہوئی ہے۔"

"ایک بات اور یاد رکھو۔ عزت ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم خاک کے پتلے عزت کے مستحق تو نہیں۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے۔ اپنا تو موٹو ہے کہ سیدھی راہ پر چلو اور بے عزتی سے مت ڈرو۔ اب میں اس دکھ کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں' جو تمہیں میری بے عزتی سے ہوا ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور لفظ بے عزتی پر خاص طور پر زور دیا۔ "تو یہاں' میں نے اوپر والوں کو لکھ بھیجا ہے کہ یہ ملازمت میں ملک و قوم کی خدمت کے لئے کر رہا ہوں۔ ورنہ اللہ کے فضل و کرم سے مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے کیمپ میں کسی کرپٹ آدمی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر جمیل بحال ہوتا ہے تو میں احتجاجاً استعفٰی دینے پر مجبور ہوں گا۔"

"یعنی آپ ہار مان لیں گے؟" عبدالحق نے کہا۔ "اور آپ مجھے سرکاری ملازمت کا مشورہ دے رہے ہیں۔"

"ابھی بچے ہو نا میاں۔" مسعود صاحب ہنسنے لگے۔ "سول سروس کے بھی کچھ گہرے رموز ہوتے ہیں۔ احتجاج کے تحت دیے جانے والا استعفا کوئی قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اس طرح وجہ احتجاج ریکارڈ کا حصہ بن جاتی ہے۔ آدمی کو سروس رولز میں پکا ہونا چاہئے بس۔ اور دوسری مضبوطی یہ ہو کہ آدمی کو اس ملازمت کی ضرورت نہ ہو تو یہ سونے پر سہاگہ ہے۔ خوش قسمتی سے یہ مضبوطی مجھے بھی حاصل ہے اور تمہیں بھی۔"

"آپ مجھے بار بار کیوں گھسیٹتے ہیں اس میں۔"

"ملک و قوم کی ضرورت کی خاطر۔ اور سنو عبدالحق' میں اپنے تو کل کی بھی فکر نہیں کرتا۔ لیکن ملک اور قوم کی خاطر بہت دور تک دیکھتا ہوں۔ آج بہت سوچ سمجھ کر تمہیں مشورہ دے رہا ہوں۔ تم نے ایف اے کیا ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"تم بی اے کرو اور سروس جوائن کر لو۔ میں تمہیں کتابیں دوں گا۔ تم سول سروس کے مسابقتی امتحان کی تیاری کرتے رہو۔ یہاں اس سلسلے میں کام ہو رہا ہے۔ جیسے ہی پہلے امتحان کا اعلان ہو' تم اس میں شریک ہو جاؤ۔ سی ایس پی افسر کی حیثیت سے بہت کچھ کر سکو گے۔"

"اس کی اتنی اہمیت کیا ہے جناب؟"

"یہی تو رونا ہے۔ کسی چیز کی اہمیت کو سمجھنے میں ہماری قوم بہت دیر کر دیتی ہے۔" مسعود صاحب نے افسردگی سے کہا۔ "سرسیّد کی بات بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ہندوؤں نے بہ کثرت آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا۔ ان کے پاس قابل افسروں کی کمی نہیں۔ اور یہاں نرے اندھوں میں لاٹھی والے اندھے راجا بنے ہوئے ہیں۔ اسی لئے تو جمیل جیسوں کی اتنی اہمیت ہے۔"

"میں آپ سے سی ایس پی آفیسر کی اہمیت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" عبدالحق نے انہیں ٹوکا۔

"دیکھو' میں اللہ کی دی ہوئی عقل کی روشنی میں دور تک دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔" مسعود صاحب نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ "اس خطے پر انگریزوں کے چھوڑے ہوئے اثرات شاید پوری طرح کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ میرا دعویٰ ہے کہ کم از کم سو سال تک تو اس انتظامی ڈھانچے میں اور انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

"کیوں نہیں ہوگی۔ کم از کم پاکستان میں تو اسلامی نظام قائم ہوگا۔"

"نعروں پر مت جاؤ۔ نعرے محض کوئی مقصد حاصل کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اب میں وجہ بھی بتا دوں۔ اب اس ملک میں وکیلوں کی تعداد کتنی ہوگی۔ اور وہ سب تعزیرات ہند کے تحت تعلیم حاصل کر کے وکیل بنے ہیں۔ یہ قانون نہ رہا تو وہ وکیل بھی نہیں رہیں گے۔ اور یہ مسئلہ اور بھی بہت سارے پیشوں کے ساتھ ہے۔ تو یہ تبدیلی آئی بھی تو صدیوں میں آئے گی۔ اب میں تمہیں بتاؤں کہ انگریز Direct governance کی بجائے Indirect governance کے قائل تھے۔ ان کے انتظامی ڈھانچے میں بیوروکریسی کی بڑی اہمیت تھی' اور میں اس کا حصہ رہا ہوں۔ پاکستان ہمیں جس پوزیشن میں ملا ہے' اس میں اس کا جیسے تیسے چلنا بھی آسان نہیں۔ اس وقت افراتفری کا یہ حال ہے کہ سمت کا نہ کسی کو خیال ہے' نہ ہوش۔ پہلی ترجیح ملک کے نظم و نسق کو نارمل انداز میں چلانا ہے۔ ہم اس وقت ایک نوزائیدہ قوم ہیں۔ شیر خوار بچے کی طرح۔ سب سے پہلے تو ہمیں Survive کرنا ہے۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ انگریز اور ہندو دونوں یہی سمجھتے ہیں کہ پاکستان بہت جلد ایک ناکام ریاست ثابت ہو جائے گا۔ لیکن مجھ جیسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ملک اللہ کے حکم سے بنا ہے۔ اس کا قیام کسی بڑے مقصد کے تحت ہے' اس لئے یہ قائم رہے گا۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ یہاں سو سال تک حکمران بیوروکریسی کے محتاج ہوں گے۔ اصل حکومت بیوروکریسی کی ہوگی۔ میری یہ بات آج لکھ لو کہ بیوروکریسی پاکستان سے مخلص اور ایمان دار ہوئی تو یہ ملک بہت ترقی کرے گا۔ دوسری صورت میں تم سمجھ سکتے ہو۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "اور میں یہاں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ہم خیال افسران کا ایک چھوٹا سا گروپ

ہے۔ہم ہندوستان سے آنے والوں کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں' اور ان میں سے اہل لوگوں کو چن رہے ہیں۔اس ملک کو ایسے افسروں کی ضرورت ہے' جو یہاں تنظیم نو کا کام کر سکیں۔ہم بے ایمان' خود غرض اور مفاد پرست لوگوں سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔دوسری طرف وہ بھی ہم سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔یہ ہمارے لئے ایک جہاد ہے۔ورنہ میں واقعی استعفادے دیتا۔میں نے کہا نا کہ یہ ملازمت میری معاشی ضرورت نہیں لیکن اگر میں ہٹ جاؤں اور میری جگہ کوئی کرپٹ آدمی آجائے تو یہ بڑا نقصان ہوگا۔اور میں اپنی انا کی خاطر یہ حماقت کروں تو مجھ سے بڑا خود غرض کوئی نہیں ہوگا۔''

عبدالحق کی آنکھیں کھل گئیں۔یہ تو وہ جانتا تھا کہ حسن دین' عرفان احمد اور مسعود احمد خان بہت اچھے انسان ہیں لیکن اب اسے ان کی عظمت کا اندازہ ہو رہا تھا۔یہ وہ لوگ تھے' جنہوں نے اپنے قد سے بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔وہ ایک ملک کی تعمیر نو کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اور اس میں ان کا اپنا کوئی مفاد نہیں تھا۔

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''صاف لفظوں میں تو کہہ چکا ہوں۔تم یہاں آجاؤ' تعلیم مکمل کرو۔سرکاری ملازمت کرو۔ پھر مقابلے کے امتحان میں بیٹھو' اور افسر بن کر ہمارے اس مشن پر کام کرو۔''

''اور واضح لفظوں میں بتائیے کہ آپ کا مشن کیا ہے؟''

''بے ایمانی' رشوت ستانی اور ہر طرح کے کرپشن کو روکنا اور ختم کرنا' اس ٹوٹے پھوٹے ملک کو مستحکم کرنا اور زخموں سے چُور' لٹی پٹی قوم کے زخموں پر مرہم رکھنا اور مظلوموں کی دادرسی کرنا۔''

''یہ کام تو میں ویسے بھی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔مگر وہ بہت چھوٹا کینوس ہے۔میں تمہیں ایک بہت بڑے منظر کی طرف بلا رہا ہوں۔''

''لیکن میں اپنے گاؤں کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں......''

''کہاں کچھ کر رہے ہو تم؟ یہاں اس کیمپ میں بے کار زندگی گزار رہے ہو' جہاں سے فرسٹریشن کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔مایوسی اور تھکن کا شکار ہو جاؤ گے۔''

''کچھ ذاتی قرض بھی تو ادا کرنے ہوتے ہیں۔'' عبدالحق نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''قومی فرض کے سامنے ذاتی قرض کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔خیر...... کچھ دن بعد تمہیں ایک بہت بڑی خوش خبری سناؤں گا۔پھر بات کریں گے۔''

عبدالحق وہاں سے اُٹھ آیا۔اس رات وہ دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔تعلیم تو اسے ویسے

بھی مکمل کرنا تھی۔اور مسعود صاحب کی باتیں بھی ایسی نہیں تھیں کہ انہیں نظرانداز کیا جاتا۔لیکن سوال یہ تھا کہ وہ نور بانو کو کیا منہ دکھائے گا۔کیا جواب دے گا۔اتنی بڑی شرمندگی تو وہ نہیں اٹھا سکتا۔

❀ ❀ ❀

دو دن بعد مسعود صاحب کی ہر بات ثابت ہوگئی۔جمیل کا ٹرانسفر ہوگیا۔مسعود صاحب کی کامیابی گو مکمل نہیں تھی لیکن ان کی اہمیت بہرحال ثابت ہوگئی۔وہ جمیل کو نکلوا نہیں سکے۔لیکن اس تبادلے میں جمیل کی بڑی خفت ہوئی۔دو دن سے وہ مسعود صاحب کے خلاف ڈینگیں مارتا پھر رہا تھا لیکن بالآخر اسے کیمپ سے رخصت ہونا پڑا۔

عبدالحق کی سمجھ میں اب مسعود صاحب کی ہر بات آگئی تھی۔کرپٹ لوگوں کی تعداد بہرحال زیادہ تھی' اور جمیل والے معاملے سے ثابت ہوتا تھا کہ ایمان دار افسران پر ان کا پلہ کچھ بھاری ہے۔اس کے باوجود مسعود صاحب کا دم غنیمت تھا۔ورنہ جمیل نے کہا تھا کہ اس کے اتنے بڑے افسروں سے تعلقات ہیں' جن کے سامنے مسعود صاحب کی کوئی اہمیت نہیں۔اس کے باوجود مسعود صاحب نے جمیل کو اپنے کیمپ میں نہیں رہنے دیا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ مسعود صاحب اپنے بڑوں سے ٹکرا سکتے ہیں۔ان کے پاس بے غرضی اور ایمان داری کی قوت تھی۔

رات کو وہ حمید کے پاس بیٹھا تھا۔افضال صاحب کیمپ میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔حمید نے کہا۔''بڑے صاحب نے تو کمال کر دیا۔''

عبدالحق جانتا تھا کہ مسعود صاحب کو بڑے صاحب کہا جاتا ہے۔''کیا کمال کر دیا انھوں نے؟'' اس نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔

''ارے...... تمہیں نہیں پتا؟ جمیل کا تبادلہ ہوگیا!''

''تو اس میں کمال کی کیا بات ہے۔اصولاً تو اسے برخواست ہونا چاہیے تھا۔''

''اس کا تبادلہ بھی معمولی بات نہیں۔اب دیکھو بابو جی' بحال تو وہ ہو گیا تھا نا۔اس کے تعلقات ہی ایسے ہیں لیکن بڑے صاحب نے پھر بھی اسے اس کی اوقات یاد دلا دی۔''

عبدالحق کو مجید' نعمان اور نذیر کی گفتگو یاد تھی۔بلکہ وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ جمیل کے اتنے بڑے افسروں سے تعلقات کیوں اور کیسے ہیں' لیکن حمید نے ہی آنکھ کے اشارے سے اسے روک دیا تھا۔اس نے حمید کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔''اس رات تم نے مجھے پوچھنے سے کیوں روکا تھا؟''

''وہ مجید ہے نا' وہ جمیل کا ہی آدمی ہے۔''

''تو پھر؟''

''اس وقت مناسب نہیں تھا۔'' حمید نے اسے ایسے سمجھایا' جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو۔''اس وقت جمیل یہاں موجود تھا۔میں تمہارا مزاج سمجھتا ہوں بابو صاحب۔تم ضرور اس کے راستے میں

رکاوٹ بنتے' اور نقصان تمہارا ہی ہوتا۔"

"تو تمہیں معلوم ہے کہ جمیل کے اتنے بڑے افسروں کے ساتھ تعلقات کس بنیاد پر تھے؟"

"ہاں۔ مگر عافیت اسی میں تھی کہ انجان بنا رہوں۔"

"تو اب تو مجھے بتا دو۔"

حمید اس کے بہت قریب ہو گیا' پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "جمیل بڑے بڑے افسروں کو لڑکیاں سپلائی کرتا تھا۔"

عبدالحق کا تو دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ لڑکیاں سپلائی! اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ کالج کے ہوسٹل میں رہنے والے لڑکے بھی اسی طرح کی بات کرتے تھے...... یار' آج وہ انڈے سپلائی کرنے والا نہیں آیا۔ ناشتہ بھی ڈھنگ کا نصیب نہیں ہوا۔ مگر لڑکیاں...... لڑکیاں بھی سپلائی کی جاسکتی ہیں؟ کیا وہ کوئی جنس ہیں' جو دکانوں سے ملتی ہوں' یا بیکری میں بنتی ہو۔ یہ بات اس نے حمید سے بھی کہہ دی۔

"ابھی بچے ہو بابو صاحب۔ ارے لڑکیوں کی یہاں کیا کمی۔ ہر طرف کٹی پتنگوں کی طرح اُڑتی ہوئی مل جاتی ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں تو اپنے اسی کیمپ میں ہی ہیں۔"

"لیکن بھائی' لڑکیوں کی سپلائی۔" عبدالحق کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "کیا اچار ڈالا جاتا ہے لڑکیوں کا۔" اچانک اسے خیال آیا کہ ممکن ہے' گھروں میں کام کرنے کے لیے لڑکیوں کی ضرورت پڑتی ہو۔ یہاں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ بڑے افسر جمیل سے کہتے ہوں گے اپنی ضرورت' اور جمیل یہاں سے ان کو لڑکیاں فراہم کر دیتا ہوگا۔ اب وہ احسان مند تو ہوتے ہوں گے جمیل کے۔

مگر پھر ایک اور الجھن سامنے آئی۔ حمید تو ایسے بات کر رہا تھا جیسے گالی دے رہا ہو...... جیسے لڑکیاں سپلائی کرنا بری بات ہو۔ اور اگر یہ بری بات ہے تو اخلاق جو ہر چیز پر نظر رکھتا ہے' اس نے مسعود صاحب کو یہ اطلاع کیوں نہ دی۔

حمید اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "کہاں پہنچ گئے بابو صاحب؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مسعود صاحب نے اس کی روک تھام کیوں نہیں کی؟"

"انہیں پتا ہی کب ہے اس بات کا۔ کیسے پتا چلتا انہیں؟"

"اخلاق سے۔ اخلاق کو تو سب معلوم ہوتا ہے۔"

"لیکن اخلاق آدمی کا بچہ ہے۔ یہ رات کو سوتا بھی ہے۔"

"تو جمیل یہ کام رات کو کرتا تھا۔"

"تو اور کیا دن میں کرے گا۔ تم بھی کمال کرتے ہو بابو صاحب۔"

"لیکن رات کو تو گھروں میں کام نہیں ہوتے۔ رات کو لڑکیاں کیا کرتی ہوں گی۔"

اب حمید کی الجھنے کی باری تھی۔ "تم کس کام کی بات کر رہے ہو بابو جی؟"

"یہی گھر کے اوپر کے کام...... جھاڑو دے دی' برتن دھو دیے......"

حمید نے بہت زور سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "اب بابو صاحب' تم بے وقوف ہو یا مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ جوان آدمی ہو۔ ارے' یہ جو پاکستان بنا ہے تو وہاں سے تو آنے والے بچے بھی بالغ ہو گئے ہیں۔ کیا کیا کچھ دیکھا ہے معصوم آنکھوں نے تمہیں کچھ بھی نہیں پتا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ رات کے اندھیرے میں لڑکیاں کس لیے سپلائی کی جاتی ہیں۔" اب حمید کو غصہ آ رہا تھا۔

"ارے تم نے کچھ نہیں دیکھا کیا۔ کیا ماں کے پیٹ سے سیدھے یہاں چلے آئے ہو۔ ارے یہاں تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا بچہ بھی اس دکھ کو سمجھتا ہے۔" بالکل اچانک ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

عبدالحق بوکھلا گیا اور اسے سینے سے لپٹا کر چپ کرانے لگا۔ "مجھ سے خفا کیوں ہوتے ہو حمید بھائی۔ میں واقعی بے وقوف ہوں۔"

"تم سے کہاں خفا ہوں۔ خود سے خفا ہوں۔ زندگی سے خفا ہوں۔ ساری دنیا سے خفا ہوں' " حمید روئے جا رہا تھا۔ "میری بہن تھی...... بہت پیاری تھی مجھے۔ پاکستان آتے ہوئے ٹرین پر حملہ ہوا۔ ظالموں نے میری آنکھوں کے سامنے......" اس سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔ "بہنیں تو غیرت ہوتی ہیں بھائیوں کی۔ میں نہتا ہی ان سے بھڑ گیا۔ کسی نے میرے پیٹ کو چیر دیا۔ میں گر گیا' اور میری آنکھوں کے سامنے میری بہن لٹ گئی۔ میں لاشوں میں دبنے کی وجہ سے بچ گیا۔ اسپتال میں انہیں میرے ہاتھ باندھنے پڑے۔ کیونکہ میں اپنے زخم کو نوچ کر خراب کر لیتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ زخم ٹھیک ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں زندہ رہوں۔ آج بھی بہن یاد آتی ہے تو میں اس زخم کو نوچتا ہوں...... یہ دیکھو۔" اس نے پیٹ پر سے قمیص اٹھائی۔ وہ کوئی دس گیارہ انچ لمبا زخم کا نشان تھا۔ زخم مندمل ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے ارد گرد کئی کھرنڈ تھے...... کچھ کچے' کچھ پکے۔ "تم نہیں جانتے بابو صاحب کہ لڑکیاں کیا ہوتی ہیں۔ تمہاری کوئی بہن ہے؟"

"نہیں۔" عبدالحق کی آواز رندھ گئی۔

"تو پھر تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔ میں سمجھاتا ہوں۔ یہ معصوم چڑیاں ہوتی ہیں...... ایک آنگن میں رہنے والی...... بہت نازک...... ننھے ننھے سے دل' جو ذرا سی بات پر بری طرح دھڑکنے لگتے ہیں۔ باپ کے پاؤں دبانے والی' ماں کا ہاتھ بٹانے والی' بھائی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھنے والی۔ جن کے ماں باپ اور بہن بھائی ان کے لیے اچھے گھر میں وداع ہونے کی دعا کرتے ہیں...... یہ آنگن میں پھدکتی' چہچہاتی چڑیاں' یہ معصوم بہنیں' جنہیں باپ اور بھائی کے سوا کچھ معلوم

نہیں ہوتا۔ وہ نہیں جانتیں کہ باہر کی دنیا کیسی ہے۔ دو ٹانگوں پر چلنے والے درندے کیسے ہوتے ہیں۔ پاکستان بنا تو ہماری بہنوں نے وہ وحشی درندے بھی دیکھ لیے' جنہیں انسان نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے اپنی بہن کو جس طرح لٹتے اور مرتے دیکھا' وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے بہت غم تھا' بہت دکھ تھا اس کا۔ مگر میں دوسروں کی بہنوں کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ چلو ہم تو لٹ گئے' لیکن یہ تو خیریت سے پاکستان آ گئیں...... درندوں اور درندگی سے دور۔ میں سوچتا' میری بہن معصوم تھی' معصوم ہی مری۔ اچھا ہوا' مر گئی۔ انشا اللہ شہید کا مرتبہ پائے گی اللہ کے ہاں۔ اس کا جسم توڑ پھوڑ دیا...... کاٹ پیٹ دیا ظالموں نے لیکن اس کی معصومیت تو سلامت رہی۔ مگر پھر میں نے یہاں جو کچھ دیکھا تو اپنی بہن کا غم بھول گا۔ یہاں جو ہو رہا ہے' وہ اس سے بہت برا ہے۔ یہاں تو اپنے مسلمان بھائی ہیں۔ لیکن نہیں' بھڑوے مسلمان کیسے ہو سکتے ہیں۔ صرف کلمہ پڑھنے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا۔ بابو صاحب' تم یہ بھی نہیں جانتے ہو گے کہ بھڑوا کیا ہوتا ہے۔ میں بتاتا ہوں' جو اپنے کسی بھی فائدے کی خاطر کسی کی بیٹی' کسی کی بہن' کسی کی بہو کو لے جا کر کسی درندے کے سامنے ڈال دے' وہ بھڑوا ہوتا ہے۔ اور یقین کرو بابو صاحب' بھڑوے سے بری کوئی مخلوق رُوئے زمین پر نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ان مشرک درندوں سے بھی برا ہے' جنہوں نے مسلمان عورتوں کی عزتیں لوٹیں۔ کیونکہ وہ مسلمان عورتوں کی معصومیت نہیں لوٹ سکے' انہیں گناہ گار نہیں کر سکے۔ جبکہ یہ بھڑوے یہ کام بھی کرتے ہیں۔ جمیل یہاں سے معصوم لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر' کوئی فریب دے کر' کوئی لالچ دے کر رات کو کسی افسر کی خواب گاہ میں پہنچا دیتا تھا۔ پھر میں صبح کو دن میں' ان لڑکیوں کو روتے دیکھتا تو بہت خوش ہوتا تھا کہ معصومیت محفوظ ہے۔ مگر وہ دوبارہ بھی چلی جاتی تھیں۔ پھر واپس آتی تھیں تو نہ آنسو ہوتے تھے' نہ افسردگی۔ اور بعد میں تو وہ جمیل کی خوشامد کرنے لگتی تھیں۔ تو صاحب' آنگن کی بھولی بھالی چڑیوں کو میں نے لہولہان بھی دیکھا اور پھر انڈے ڈبل روٹی کی طرح ان کی سپلائی ہوتے بھی دیکھی تھی...... یہاں' اسی پاکستان میں۔"

عبدالحق اس کی آواز بھی سنتا رہا تھا۔ لیکن وہ دہلی والے گھر میں تھا' جہاں اس نے ماں جی کی' بوا کی' اور دو معصوم لڑکیوں کی برہنہ خون میں نہائی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں۔ اور اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ اسے بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔ یہ پاکستان ہے...... اور یہ مسلمان ہیں۔ واقعی حمید نے سچ کہا' یہ تو مشرکوں سے بھی بدتر ہیں۔ جمیل جیسے بھی اور ان افسروں جیسے بھی' جو معصوم اور بے سہارا لڑکیوں کو اپنی ہوس کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ لفظ بھڑوا اس نے دہلی میں بہت سنا تھا۔ وہ بس یہ جانتا تھا کہ یہ ایک بری گالی ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں' اور یہ لفظ ان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر عبدالحق نے کہا۔ "یہ بات تمہیں مسعود صاحب کو بتا دینی چاہیے

تھی۔"

"مجھے ابھی چند روز پہلے ہی تو معلوم ہوا ہے۔ پھر میں سوچتا رہا کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ اپنے بڑے صاحب جیسے لوگ اس پاکستان میں بڑی نعمت ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے شکایت کی تو ہم اس سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ یہ جمیل جیسے لوگ بہت گھٹیا' بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ اور پھر اس کے تعلقات بھی بہت بڑے لوگوں سے ہیں۔ اب دیکھ لو کہ بڑے صاحب اسے برخواست نہیں کرا سکے۔ بس تبادلے پر بات ٹلی اور پھر یہاں ایک جمیل ہی تو نہیں' اور بھی بہت ہوں گے اس جیسے۔"

"لیکن ایسے لوگوں کو کم نہیں کیا گیا تو یہ بڑھتے رہیں گے۔"

"میرے خیال میں اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اچھے لوگوں کی طاقت کم نہ ہو۔"

اسی وقت افضال صاحب آ گئے۔ ان کی گفتگو رک گئی۔

"افضال صاحب' کل سے میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" عبدالحق نے افضال صاحب سے کہا۔

"کیوں بھئی؟"

"مجھے بھی کسی کی تلاش ہے۔"

"ضرور چلنا۔ مگر ٹانگوں کی تھکن کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ کھوئے ہوئے تو بس اللہ کے حکم سے ملتے ہیں۔"

"آپ کو بھی تو آپ کے بچھڑے ہوؤں میں سے کوئی نہیں ملا۔ پھر بھی آپ ہر روز کوشش کرتے ہیں۔"

"کوشش کرنا تو ہمارا کام ہے نا۔ آگے اللہ کی مرضی۔"

❁ ❁ ❁

نور بانو نے رابعہ سے اس خونی رات کی پوری کہانی' پوری تفصیل کے ساتھ سن لی تھی۔ سنتے ہوئے چند ایک باتیں تو اسے دھندلی دھندلی سی یاد آئیں' جیسے وہ پہلے بھی سن چکی ہو۔ پھر رابعہ کو یہ باتیں تو وہ پہلے ہی بتا چکی ہے۔ اس سے نور بانو کی سمجھ میں آیا کہ وہ اس وقت کس کیفیت میں ہو گی۔ صورت حال ہی ایسی تھی کہ وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

بہر حال اب سب کچھ شعور میں آ گیا تھا۔ اب کوئی بات خود سے چھپی نہیں تھی۔ اس سے پہلے اسے آخری بات جو یاد تھی' وہ اپنی بہنوں کی خون میں نہائی ہوئی بے لباس لاش دیکھنا تھا۔ اس کے بعد گھبرا کر بستروں کے بکس میں جا گھسی تھی۔ پھر کوئی آواز سنائی دی تھی اور بکس کھولا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

رابعہ سے سن کر اس نے کڑیاں ملائیں اور واقعات کو مربوط کرلیا۔ تصویر کچھ اس طرح بنی۔
حملہ آوروں نے گلی کے تمام گھروں کے دروازے باہر سے بند کردیے تھے۔ زبیر بھائی بھی بے بس تھے۔ ان کی اور رابعہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ گھر کے اندر سے ایسی دردناک اور فلک شگاف چیخیں سنائی دے رہی تھیں کہ یقیناً پورا محلّہ جاگ اٹھا ہوگا لیکن کسی کو باہر نکل کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی ہوگی۔ کسی نے کوشش بھی کی ہوگی تو بند دروازوں کی وجہ سے کچھ نہیں کرسکا ہوگا۔

پھر جب نیچے سکوت طاری ہوئے کچھ دیر ہوگئی تو عبدالحق کی واپسی ہوئی۔ گھروں کے بند دروازے دیکھ کر اسے گڑبڑ کا احساس ہوا ہوگا اپنے گھر کے بالائی حصے کا دروازہ بھی اسے باہر بند ملا۔ البتہ نچلے حصے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔

یہ طے تھا کہ تباہی کے بعد اس گھر میں سب سے پہلے گھسنے والا شخص عبدالحق تھا۔ اندر اسے صرف لاشیں ملیں۔ اور بھنچی بھنچی سسکیوں کی آواز اسے صندوق تک لے گئی۔ پھر وہ وہاں سے نوربانو کو اٹھا کر اوپر لے گیا۔

عبدالحق نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اس لڑکی کی موجودگی کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے گھر میں یہ لڑکی غیر محفوظ ہوگی۔ اور اگر مسلمانوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ ہمارے ہاں ہے تو وہ یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ وہ بہت شرمندہ تھا۔ اس نے ماں جی سے وعدہ کیا تھا کہ جان دے کر بھی ان سب کی حفاظت کرے گا اور وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرسکا۔ اب نوربانو اس کے لیے بہت قیمتی تھی وہ محفوظ رہتی تو اس کی شرمندگی کسی حد تک کم ہوتی۔

"یہ ہے میری اہمیت۔ چلو، کچھ تو ہے۔" نوربانو نے حسرت سے سوچا۔ پھر اس نے رابعہ سے کہا۔ "آپا، وہاں سب لوگ میرے بارے میں جانتے تھے۔ انہوں نے سوچا تو ہوگا کہ میں کہاں گئی۔"

"ہاں...... عورتوں میں یہ باتیں ہوئی تھیں۔" رابعہ نے بتایا۔ "ایک عورت بولی، اٹھا کر لے گئے ہوں گے موئے اس کو۔ اور یہ بات سب کی سمجھ میں آگئی۔" یہ سب کچھ سننے کے بعد نوربانو بہت روئی...... دودن تک روتی رہی۔ وہ تو جانے والوں کا ماتم بھی نہیں کرسکی تھی۔ سو اب کررہی تھی۔

مگر تیسرے دن اسے احساس ہوا کہ اس کے سینے پر سے کوئی چٹان سا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ کبھی اس نے خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس نہیں کیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اب باجی کے بارے میں اس کا سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ وہ اس کی مظلوم شہید بہن تھی، رقیب نہیں۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ عبدالحق نے باجی کو دیکھا تھا یا نہیں۔ اور پہلی بار اس نے بغیر کسی اندرونی مزاحمت کے تسلیم کیا کہ عبدالحق کے اس پر بڑے احسانات ہیں۔

وہ دودن اس کے ایسے گزرے تھے کہ وہ ماضی میں زندہ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو اسے اپنا خیال بھی نہیں تھا۔ ایسے میں بس ایک مینو تھا، جو وقتاً فوقتاً اسے ماضی سے حال میں کھینچ لاتا تھا۔ وہ باہر نہیں نکلی تو وہ اس کے کمرے میں چلا آیا اور اس کے پیروں پر سر رگڑنے لگا۔ اس نے چونک کر دیکھا تو اسے بے زبان جانور پر بڑا ترس آیا۔ ارے...... یہ تو بھوکا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ اور کسی کے ہاتھ سے تو یہ کچھ کھائے گا بھی نہیں۔ تب وہ اٹھی اور اس نے مینو کو کھلایا۔ مگر پھر مینو اس سے چپک ہی گیا۔ شاید وہ بے زبان جانور کا خوف تھا۔ ایک مالک کو تو وہ کھو چکا تھا۔ اب دوسرے مالک کو نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

نوربانو نے جو یہ صورت حال دیکھی تو محبت بھرے لہجے میں اسے ڈپٹا۔ "اے مینو...... یہاں گندگی نہ کرنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

جواب میں مینو نے مَیں مَیں کرکے گویا اسے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اور واقعی ایسا ہوا بھی نہیں۔

اب اسے احساس ہوا کہ پچھلے دودن سے اس نے اماں کی خبر بھی نہیں لی، انہیں پوچھا بھی نہیں۔ اس نے چادر اوڑھی اور اماں کے کمرے کی طرف چل دی۔ مینو بھی اس کے پیچھے لگ لیا۔

"اب تم کیا میرے پیچھے ہی لگے رہوگے؟" اس نے کہا۔

مینو نے ہلکی سی مَیں مَیں کردی۔ جیسے شرمندہ ہورہا ہو۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ بہت بے چین اور مضطرب تھی۔ اب تو وہ بس ایک ہی بات سوچتی تھی۔ کسی طرح عبدالحق کی نوربانو سے شادی ہوجائے۔ وہ دونوں ہی اپنے اپنے دل کی بات اس پر کھول چکے تھے۔ یہ الگ بات کہ ایسا انجانے میں ہوا تھا۔ حمیدہ نے اپنا لائحہ عمل بھی طے کرلیا تھا۔ ایک طرف وہ عبدالحق کے جلد از جلد لوٹ کر آنے کی دعا کرتی تھی تو دوسری طرف اسے یہ فکر بھی تھی کہ اس کی آمد سے پہلے نوربانو کو ہموار کرلے۔

آنکھیں تو اس کی بالکل ٹھیک ہوگئی تھیں۔ بس کبھی کبھی کھٹک سی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ عرق گلاب باقاعدگی سے ڈالتی رہیں تو کچھ دن بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔

نوربانو باقاعدگی سے اس کے پاس آتی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں عرق گلاب ڈالتی اور پھر دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر اس کی باتیں سنتی۔ خود وہ بہت کم بولتی تھی۔ البتہ عبدالحق کا تذکرہ نکلتا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔

ادھر حمیدہ نے نوربانو سے بات چھیڑنے کا فیصلہ کیا اور ادھر وہ غائب ہوگئی پورا دن ہوگیا،

اور وہ نہیں آئی۔ دوسری صبح بھی دن چڑھے تک اس کی صورت نظر نہیں آئی تو وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ رابعہ کو آواز دے کر بلائے اور اس سے کہہ کر نور بانو کو بلوائے۔ مگر یہ سوچ کر رہ گئی کہ نجانے کیا بات ہو...... بلوانا مناسب بھی ہو یا نہ ہو۔

دوپہر کو رابعہ خود اس کے پاس چلی آئی۔ ''کیسی ہو اماں؟''

''بس اب دل نہیں لگتا عبدالحق کے بنا۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''خیر تُو سنا کیسی ہے تُو؟''

''اچھی ہوں اماں۔ اللہ کا شکر ہے۔'' رابعہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ پھر وہ جھجکتے جھجکتے بولی: ''اماں، ایک خوش خبری ہے۔''

''تو سنا دے نا۔ خوش خبری سنانے میں کنجوسی نہیں کرتے۔ میں تو کب سے انتظار کر رہی ہوں۔''

رابعہ نے چونک کر سر اٹھایا اور اسے دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور وہ مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔ رابعہ نے پھر نظریں جھکا لیں۔ ''اماں...... میں ماں بننے والی ہوں۔''

''اللہ مبارک کرے...... نیک اور نصیب والی اولاد عطا فرمائے۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''دیکھ تو میں بھی رہی تھی۔ اب اندھی تو نہیں ہوں میں۔'' پھر اس کے لہجے میں شکایت در آئی۔ ''میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کوئی اپنا سمجھے تو بتائے گا نا۔''

رابعہ تڑپ گئی۔ ''ایسا نہ کہو اماں۔ اب تمہارے اور مالک کے سوا ہمارا ہے کون۔''

''تو پھر خوش خبری سنانے میں اتنی دیر کیوں؟''

''بس اماں، شرم آتی تھی مجھے۔'' رابعہ نے نظریں جھکائے کہا۔

اس لمحے حمیدہ ایک بیٹی کی تجربہ کار ماں بن گئی۔ حالانکہ وہ سمجھتی تھی کہ اسے وہ سب کچھ یاد ہی نہیں ہے جو وصال دین کی دادی نے اسے سمجھایا تھا۔ مگر وہ تو کہیں گہرائی میں محفوظ تھا۔ وہ رابعہ کو سمجھانے لگی کہ اسے کیا کرنا چاہیے، کیسے کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کون کون سا وقت زیادہ نازک ہوتا ہے۔ کن کن معاملات میں احتیاط کرنی ہے۔

رابعہ بڑی توجہ سے سنتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یہ آنسو کیسے؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں اماں، ماتا جی یاد آ گئی تھیں۔ وہ ہوتیں تو ایسے ہی سمجھاتیں مجھے۔''

''تو میں بھی تو تیری ماں ہوں پگلی!'' حمیدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں کے بعد حمیدہ کو خیال آیا کہ رابعہ سے نور بانو کے بارے میں پوچھنا ہے۔ ''یہ نور بانو کہاں ہے۔ پرسوں سے میرے پاس نہیں آئی ہے وہ۔''

رابعہ نے اسے نور بانو کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ ''اسی دن سے بس رو رہی ہیں۔

اپنے کمرے سے بھی نہیں نکلیں۔'' وہ بولی۔ ''کھانا بھی میں کمرے میں لے جاتی ہوں۔ بس تھوڑا سا کھا لیتی ہیں۔ کہتی ہیں، دل ہی نہیں چاہتا۔''

''قدرتی بات ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''مرنے والوں کو جب تک رو نہ لے آدمی، قرار نہیں آتا۔ غم دل پر بیٹھ جائے تو برا ہوتا ہے۔ آنسوؤں میں بہہ جائے تو شفا ہو جاتی ہے۔''

''پر ایسا کب تک چلے گا اماں۔''

''دیکھ لینا، وہ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔'' حمیدہ نے بڑے یقین سے کہا۔ ''اور یہ بھی دیکھ لینا کہ پہلے سے اچھی ہو جائے گی ان شاء اللہ۔ خوش مزاج ہو جائے گی۔ پہلے چپ چپ رہتی تھی نا۔ اب ہنسے بولے گی بھی۔''

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا اماں۔ رو رو کے آنکھیں سجا لی ہیں۔''

''قدرتی بات ہے۔ بس تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔''

اور ہوا بھی یہی۔ دو دن نور بانو نے باورچی خانے کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ کھانا پکانے میں وہ بہت دلچسپی لیتی تھی لیکن تیسرے دن وہ خود ہی باورچی خانے میں چلی آئی۔ ''کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے رابعہ سے پوچھا۔

''کھانا پکا رہی ہوں۔''

''آپ چھوڑ دیں۔ میں پکا لوں گی۔''

''ٹھیک ہے مجھلی بی بی۔''

نور بانو کو احساس تھا کہ دو دن سے وہ اماں سے دور ہے۔ اب اس کی تلافی کرنا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اماں کو سرسوں کا ساگ بہت پسند ہے۔ وہ اس نے رابعہ سے پکانا سیکھا تھا۔ لیکن پھر اس میں کچھ جدت اور مسالوں میں دہلی والوں کے کچھ اضافے بھی شامل کر دیے تھے۔ اور جب اماں نے پہلی بار اس کا پکایا ہوا ساگ کھایا تو حیران رہ گئی تھیں۔ اتنے مزے کا ساگ تو پہلے کبھی نہیں کھایا میں نے، سو نور بانو نے وہی ساگ پکا لیا۔ مکئی کی روٹی البتہ وہ کبھی نہیں پکا سکی تھی۔ وہ رابعہ ہی کی ذمہ داری تھی۔

کھانا لے کر وہ حمیدہ کے کمرے میں چلی گئی۔ ''لیجیے اماں...... کھانا لیجیے۔''

حمیدہ نے بہت غور سے اسے دیکھا اس کا اندازہ درست تھا۔ غم بالآخر ڈھل گیا تھا۔ نور بانو کی آنکھیں تو ضرور متورم تھیں لیکن وہ پہلے کے مقابلے میں بہت نکھری نکھری لگ رہی تھیں۔ ''آ بیٹی تُو بھی میرے ساتھ بیٹھ جا۔''

''آپ کھائیں اماں۔ میں بعد میں کھا لوں گی۔''

مگر حمیدہ اپنے سوچے سمجھے لائحہ عمل پر چل پڑی تھی۔ اس نے آہ بھر کے کہا۔ ''اب تو میرے

ساتھ ہی کھایا کر بیٹی۔ کچھ ہی دن کی تو بات ہے۔"

نور بانو اس بات کا مطلب پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر اسی لمحے دروازے کی طرف سے قریب آتی مَیں مَیں کی آواز سنائی دی' اور اگلے ہی لمحے مینو کمرے میں آ گیا۔ وہ نور بانو کے پاس آ کر اس کے گھٹنے پر دھیرے دھیرے ٹکریں مارنے لگا۔ پھر اس نے نور بانو کی چادر کو سونگھا اور اس سے سر رگڑنے لگا۔

حمیدہ یہ سب کچھ بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ عبدالحق کے جانے کے بعد مینو نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ مگر پھر نجانے کیسے نور بانو نے اسے لبھا لیا۔ یہ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ایسا کیوں کر ہو گیا۔

مگر اسی وقت حمیدہ کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا اور اسے اپنی ناسمجھی پر بہت غصہ آیا۔

اچھے خاصے عرصے سے وہ نور بانو کو یہ چادر اوڑھے دیکھ رہی تھی۔ دو ایک بار اسے خیال آیا کہ یہ مردانہ چادر ہے۔ مگر اس نے سوچا کہ نور بانو کو پردے کا بہت خیال رہتا ہے' اس لیے بڑی ہونے کی وجہ سے وہ یہ چادر اوڑھتی ہے۔ اسے کبھی یاد نہیں آیا کہ یہ تو عبدالحق کی چادر ہے' جو وہ ہر وقت اوڑھتا تھا۔ لیکن اس وقت مینو کو اس چادر سے سر رگڑتے اور سونگھتے دیکھ کر اسے یہ بات یاد آ گئی۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت تھا کہ نور بانو عبدالحق سے محبت کرتی ہے۔ مینو ہی کے حوالے سے اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ جو کپڑا آدمی کے جسم سے لگا رہے' اس میں آدمی کے جسم کی خوشبو رچ جاتی ہے۔ عبدالحق کی یاد سے اور اس کی جدائی سے بے حال نور بانو نے بھی عبدالحق کی خوشبو کو اوڑھ لیا تھا۔ اور اس خوشبو نے ہی مینو کو رام کیا ہو گا۔

نور بانو اس کی نظروں اور سوچوں سے بے خبر اپنی ہتھیلی پر ساگ رکھ کر مینو کو کھلا رہی تھی' اور وہ بڑی رغبت سے کھا رہا تھا۔ بلکہ ہر بار اور مانگتا تھا۔ "تو تم مجھے نہیں کھانے دو گے؟" نور بانو نے بڑے لاڈ سے کہا۔

"تُو نے اس کی عادتیں بہت بگاڑ دی ہیں بیٹی۔"

"نہیں اماں' اس کی عادتیں تو پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھیں۔"

"پر تُو نے اس کا دل کیسے جیت لیا؟"

نور بانو کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔ "پتا نہیں اماں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ حمیدہ چادر کو بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ اگر یہ پول کھل گئی تو کیا ہو گا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "آپ کھانا کھائیں نا اماں۔"

"کھانا' تیرے ساتھ ہی کھاؤں گی۔"

"یہ مینو مجھے کہاں کھانے دے گا۔"

مگر مینو نے جیسے بات سمجھ لی۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اور نیچے بیٹھ گیا۔ "چلیں' اب کھائیں اماں۔"

دونوں کھانا کھانے لگیں۔ اچانک حمیدہ نے کہا۔ "تُو روز میرے ساتھ کھانا کھایا کر دھی میری۔ دیکھو نا' کچھ ہی دن کی تو بات ہے۔ پھر تُو کہاں' میں کہاں۔"

"یہ..... کیوں کہہ رہی ہیں آپ۔" نور بانو نے دل گرفتگی سے کہا۔

"سچ سے آنکھیں چرانے سے سچ تو نہیں بدل جاتا۔"

"کس سچ کی بات کر رہی ہیں آپ؟"

"اس سچ کی کہ تُو پرائی ہے۔ اب دیکھو نا' عبدالحق کسی بھی طرح تیرے چچا کو ڈھونڈ نکالے گا۔ پھر تُو اپنے چچا کے ساتھ چلی جائے گی۔ پھر تُو کہاں اور ہم کہاں۔" حمیدہ نے ایک گہری سرد آہ بھری۔ "میں تو کہتی ہوں' اب تُو کھانا پکانا بھی چھوڑ دے۔ ہماری تو عادتیں خراب ہو گئی ہیں۔ ابھی سے اس سواد کو بھلانے کی کوشش کریں۔ تیرے بعد کون کھلائے گا ایسا کھانا۔"

نور بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تاہم وہ ضبط کی کوشش کرتی رہی۔

"تُو دل چھوٹا کیوں کرتی ہے پگلی۔" حمیدہ نے اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تُو تو اپنوں میں چلی جائے گی۔ کچھ دن ہم یاد رہیں گے۔ پھر بھول جائے گی۔"

نور بانو ابھی دو دن پرانے زخموں کی تکلیف جھیل کر بہ مشکل سنبھلی تھی کہ ایک نئے مہیب دکھ کا امکان نظر آنے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حمیدہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔ "لے..... تجھے کیا ہو گیا ہے۔ روئیں گے تو ہم تجھے کھو کر۔ تُو تو اپنوں میں ہو گی۔"

"آپ کیسی باتیں کرتی ہیں اماں۔" نور بانو نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ "آپ لوگوں سے بڑھ کر اب میرا اپنا کون ہے۔"

"دیکھ' وہ تو تیرے سگے چچا ہیں..... تیرے باپ کی جگہ۔"

اچانک نور بانو کے دل میں ایک ایسی طاقت ور شکایت ابھر آئی۔ جس سے وہ اس لمحے سے پہلے بے خبر تھی۔ وہ رونا بھول گئی اور تلخ لہجے میں بولی۔ "باپ کی جگہ! خوب حق ادا کیا انہوں نے اس رشتے کا۔ کبھی ہمیں پوچھا بھی نہیں کہ کس حال میں ہیں۔ ہندوستان چھوڑتے ہوئے۔ یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ہمیں بھی ساتھ لے لیں۔ حالات خراب ہونے سے پہلے وہ یہاں آ گئے تھے۔ ہمیں انہوں نے پوچھا بھی نہیں۔ اگر انہیں ہمارا خیال آ گیا ہوتا تو میری امی اور بہنوں پر آ کا میاں اور بوا پر وہ قیامت کبھی نہ ٹوٹتی۔" وہ پھر رونے لگی۔

"ہوتا وہی ہے دھیے جو رب کو منظور ہو۔ جو ہوا' وہ ایسے ہی ہونا تھا۔" اب حمیدہ سچ مچ اسے تسلی دے رہی تھی۔ "لیکن خون کے رشتے بڑی سے بڑی شکایت سے بھی نہیں ٹوٹتے۔ آخر وہ

تیرے سگے چچا ہیں۔"

"انہیں تو اس وقت ہم میں سے کوئی یاد بھی نہیں ہوگا۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم پر کیا گزری۔ کون جیتا ہے اور کون مر گیا۔"

"پھر بھی وہ تیرے وارث ہیں۔ اور تُو نے خود ہی تو عبدالحق سے وعدہ لیا تھا......"

"مجھ پر تو قیامت گزری تھی اور میں اس وقت اس سے سنبھلی بھی نہیں تھی۔ میں تو اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ اور انہوں نے تو اسی وقت زبیر بھائی کو آگرے بھیج دیا تھا۔ مگر چچا جان پاکستان جا چکے تھے۔ وہ وعدہ تو انہوں نے اسی وقت پورا کر دیا تھا۔"

"پر اسے تو تُو نے نہیں بتائی تھی یہ بات۔"

نور بانو جھک گئی' شرما گئی۔ "تو میں ان سے بات کب کرتی ہوں۔"

"اب یہ بھی غلط ہے کہ ایک گھر میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے بات بھی نہ کریں۔"

"میں......میں کیا کروں اماں......شرم آتی ہے مجھے۔ اور اگر انہوں نے مجھے بتایا ہوتا کہ وہ اس کام سے لاہور جا رہے ہیں تو میں انہیں منع کر دیتی۔ مگر دیکھیں نا' وہ بھی تو بات نہیں کرتے مجھ سے"۔ اس کے لہجے میں شکایت اتر آئی۔

حمیدہ اندر ہی اندر خوش ہوئی یہ سن کر۔ "اب تم دونوں بے وقوف ہو تو کوئی کیا کرے۔ چل' اب کھانا تو کھا۔"

"آپ کھائیں اماں۔ میری تو بھوک ہی اُڑ گئی ہے۔"

"نا میری دھی' تیرے بغیر تو میں نہیں کھاؤں گی۔"

"ضد نہ کریں اماں۔ مجھ سے کھایا ہی نہیں جائے گا۔"

"دیکھ بیٹی' کوئی مشکل ہوتی ہے تو اس کا حل بھی ہوتا ہے۔" حمیدہ نے بڑی محبت سے کہا۔ "بس ذرا سوچنا پڑتا ہے۔ کھانا پینا چھوڑنے سے کام نہیں چلتا۔ الٹا کمزور ہو جاتا ہے آدمی۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ تُو یہاں سے جائے۔ میری تو کوئی دھی تھی ہی نہیں۔ تُو ملی تو سوچا' خدا نے مجھے بیٹی دے دی ہے۔ پھر جب تیرے چچا کا پتا چلا تو میں نے سوچا کہ تُو پرائی ہے۔ تجھے تو جانا ہوگا۔ پر دل نہیں چاہتا کہ تُو جائے۔ میں سوچتی ہوں کہ یہ تو خود غرضی ہے۔ میں اپنی خوشی کے لیے تیری خوشی خراب کر رہی ہوں۔ اچھا' کھانا تو کھا' دیکھ' اللہ پر یقین رکھ۔ میں سوچتی ہوں۔ کوئی صورت نکل آئے گی۔"

نور بانو بے دلی سے کھانے لگی۔ حمیدہ بھی اب کھا رہی تھی۔

اچانک حمیدہ نے کہا۔ "ایک بات سچی سچی بتا۔ تُو یہاں سے جانا تو نہیں چاہتی نا؟"

نور بانو کے جواب دینے سے پہلے نیچے بیٹھے مینو نے بے قراری سے مَیں مَیں کی آواز نکالی۔ "تُو چپ بیٹھا رہ۔" حمیدہ نے اسے ڈپٹا۔ "بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے۔ ہاں بیٹی تُو بتا۔"

"میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی اماں۔"

"لیکن تیرے چاچا آئیں تو ہم انہیں منع بھی نہیں کر سکتے......"

"کیوں منع نہیں کر سکتے۔ انہیں ہماری کون سی پروا......"

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ تُو میرے سامنے تو کہہ سکتی ہے' ان کے سامنے زبان نہیں کھلے گی تیری۔ میں نے کہا نا' تُو کھانا کھا۔ یہ سوچنے کا کام مجھ پر چھوڑ دے۔"

نور بانو نے ایک لقمہ لیا اور دھیرے دھیرے چبانے لگی۔

حمیدہ کھا تو رہی تھی لیکن کسی گہری سوچ میں تھی۔ پھر اچانک اس نے کہا۔ "ایک ترکیب ہے تو سہی۔"

نور بانو نے پُرامید نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"یہ تو لازم ہے کہ ہم تجھے تیرے چاچا کے سپرد کر دیں۔ اور پھر اس سے تجھے مانگ لیں۔"

"کیسے مانگ لیں گی؟" نور بانو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"تُو تو بالکل ہی نا سمجھ ہے۔ میرا مطلب ہے' تیرا رشتہ مانگ لیں گے ان سے۔"

"میرا رشتہ! مگر کس کے لیے؟"

حمیدہ نے ماتھے پر بہت زور سے ہاتھ مارا۔ "ارے یہاں ہے کون تیرے قابل...... عبدالحق کے سوا۔"

عبدالحق کا نام سن کر نور بانو جیسے سن ہو گئی۔ پھر سنبھل کر بولی

"کوئی زبردستی ہے۔ یہ تو زیادتی ہوگی۔"

لیکن حمیدہ اس بار کام مکمل کیے بغیر پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی۔ "اب تجھے اس پر اعتراض ہے تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"م......م......مجھے کوئی اعتراض نہیں......" نور بانو گڑبڑا گئی۔

"زیادتی بھی کہہ رہی ہے اور کہتی ہے' اعتراض بھی نہیں ہے۔" حمیدہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"یہ زیادتی میرے ساتھ تھوڑی ہے......" نور بانو نے معصومیت سے کہا۔

"تو پھر؟"

"یہ تو ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

''تیرا مطلب ہے عبدالحق کے ساتھ؟''

نور بانو نے نگاہیں جھکائیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ تُو کیسے کہہ سکتی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ میں ان کے قابل نہیں ہوں۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ کسی اور سے محبت کرتے ہیں۔''

اس بار حمیدہ کو جھٹکا لگا...... ایک نئی پیچیدگی۔ اور نور بانو اتنے یقین سے کہہ رہی تھی۔ ''کس سے محبت کرتا ہے وہ؟''

''میری باجی سے۔''

''لیکن وہ تو......''

''جی اماں۔ وہ دہلی میں شہید ہو گئی تھیں۔'' نور بانو نے اداسی سے کہا۔

حمیدہ نے سکون کا سانس لیا۔ ''تُو یہ بتا' تجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔''

نور بانو نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''لیکن اماں' یہ ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ میں کسی طرح بھی ان کے قابل نہیں۔''

''پاگل ہے تُو تو۔ بلکہ دونوں ہی پاگل ہو۔ پتا ہے' یہ بات اس سے بھی پوچھی تھی میں نے۔ اور اس نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ خیر اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ نہ تجھے کوئی اعتراض ہے نہ اسے۔ اور تم دونوں بے وقوف ہو۔''

نور بانو ہکا بکا رہ گئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ عبدالحق نے بھی یہی کہا...... وہ خود کو میرے قابل نہیں سمجھتے۔ حالانکہ میں سچ مچ ان کے قابل نہیں ہوں۔ انہوں نے ایسا کیوں سمجھا؟ اور وہ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ ارے...... میں کیا' میرے خیال میں تو دنیا کی کوئی لڑکی بھی ان کے قابل نہیں۔ ایسے لوگ تو نصیب سے ہی ملتے ہیں۔ وہ حیران ہو کر سوچتی رہی۔

''اب تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' حمیدہ نے اسے ٹوکا۔ ''سب مجھ پر چھوڑ دے۔ تُو یہاں سے کہیں نہیں جائے گی۔''

نور بانو نے ایک نظر احسان مندی سے اسے دیکھا' اور فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

''بس اب تُو کھانا کھا لے سکون سے۔ اور مجھے بھی کھانے دے۔''

اس لمحے نور بانو کو احساس ہوا کہ اسے تو بہت شدید بھوک لگی ہے!

❁ ❁ ❁

دنیا ایسی رنگین ہو گی' یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے افضال صاحب سے جب ان کے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ ''تھک جاتے ہو؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''میں تو یہاں چلتا رہتا ہوں بس۔ چلے جاتا ہوں' چلے جاتا ہوں۔''

''تو آپ بھی تو تھک جاتے ہوں گے؟''

''یہ تو کبھی خیال ہی نہیں آیا۔'' انہوں نے بے حد سادگی سے کہا۔ پھر اچانک پوچھا۔ ''کیا تمہیں بھی کسی کی تلاش ہے؟'' لہجے میں تجسس تھا۔

''جی ہاں۔ مجھے بھی کسی کو ڈھونڈنا ہے۔''

''اللہ تمہیں کامیاب کرے۔'' افضال صاحب نے خلوص سے کہا۔

افضال صاحب تیز نہیں چلتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ وہ بہت آہستہ چلتے تھے' اور ان کی نظریں گرد و پیش کا بڑی بارک بینی سے جائزہ لیتی تھیں۔ یہ تو عبدالحق کو بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ صرف لوگوں کو' چہروں کو غور سے دیکھتے تھے۔

عبدالحق کو ذرا دیر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ لاہور بہت بارونق شہر ہے۔ وہ زندہ دلوں کا شہر تھا۔ لوگوں کا ایک مخصوص لہجہ تھا...... چہکار سے بھرا' آواز میں بے تکلفانہ پکار۔ ہر شخص زور سے بولتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ لاہور والوں کا اپنا مخصوص لہجہ ہے۔ اور رونق دیکھ کر اسے دہلی کا خیال آ رہا تھا۔

وہاں کی رونق میں بہت بڑا دخل ٹھیلے والوں کا تھا۔ لگتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز ٹھیلوں پر ملتی ہے۔ موسم کا ہر پھل وہاں موجود تھا۔ انواع و اقسام کے شربت تھے۔ پھر نان چھولے' دال چاول اور کھانے کی ایسی ہی اور چیزیں تھیں۔ اور ہر چیز پر چھائی ہوئی آوازیں تھیں۔ ہر شخص اپنے مال کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اور تعریف کے انداز بھی بے حد متنوع اور دلچسپ تھے۔ وہ تمام ملی جلی آوازیں ایک دوسرے میں گھل مل کر زندگی کے محرک احساس کو اجاگر کر رہی تھیں۔

دوپہر کے قریب لوگوں کا ہجوم کافی کم ہو گیا۔ عبدالحق کو تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ''اب کہیں بیٹھ نہ جائیں۔'' اس نے افضال صاحب سے کہا افضال صاحب مسکرائے۔

''آپ تھک گئے نا؟''

''تھکن تو ہے۔ اچھا یہ بتائیں' شربت پئیں گے؟''

افضال صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''شربت! پیسے ہیں تمہارے پاس؟'' ان کے انداز میں عجیب سی معصومیت تھی۔

عبدالحق نے جیب تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''پیسے بہت' اس کی آپ فکر نہ کریں۔''

''تم بہت امیر آدمی ہو؟''

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے میرے پاس۔"

"تو چلو' سکنجبین پلا دو۔"

وہ ایک ٹھیلے کی طرف بڑھ گئے۔ "آؤ باؤ جی آؤ بزرگو!" ٹھیلے والے نے انہیں سکنجبین کے دو گلاس تھما دیے۔ دونوں وہیں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر پینے لگے۔ عبدالحق افضال صاحب کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ انہیں ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ شربت انہیں بہت اچھا لگا ہے۔ وہ بہت چھوٹے چھوٹے گھونٹ' مگر بہت جلدی جلدی لے رہے تھے۔ جیسے صبر سے پینا چاہتے ہوں' لیکن اندر بے صبری ہو۔

عبدالحق نے آدھا گلاس پیا ہوگا کہ افضال صاحب نے اپنا گلاس خالی کر کے شربت والے کی طرف بڑھا دیا۔

"اور دوں بزرگو؟" شربت والے نے پوچھا۔

افضال صاحب ایک پل ہچکچائے۔ پھر بڑی بے نیازی سے بولے۔ "ارے نہیں میاں' شربت کوئی پیٹ بھرنے کی چیز تھوڑا ہی ہے۔"

"لیکن دل چاہے تو زیادہ پینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" عبدالحق نے کہا۔

"اب میاں تم اصرار کرتے ہو تو ایک گلاس اور سہی۔"

عبدالحق کو ان کا رکھ رکھاؤ بہت اچھا لگا۔ وہ یقیناً کسی بہت اچھے گھرانے کے تھے اور خوش حالی دیکھے ہوئے تھے۔ تبھی تو یہ وضع داری تھی ان کے پاس۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ شربت انہیں اچھا لگا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیے تھے۔ حالانکہ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیں۔ پھر دل نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے دوسرے گلاس سے انکار کر دیا۔

عبدالحق نے اپنا گلاس افضال صاحب کے دوسرے گلاس کے ساتھ خالی کیا۔ اس دوران وہ انہیں بہت غور سے دیکھتا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ابھی وہ سیر نہیں ہوئے ہیں۔

عبدالحق نے گلاس شربت والے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دو گلاس اور دو۔"

"ارے میاں' اب کیا حلق تک بھروا دو گے۔" افضال صاحب نے احتجاج کیا۔

"میری خاطر۔" عبدالحق نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "دیکھیں نا' میرا دل چاہ رہا ہے اور شربت پینے کو۔"

"تو تم پی لو۔"

"اکیلے پینا تو اچھا نہیں لگے گا۔ آپ کا احسان ہو گا مجھ پر۔"

"ارے میاں اس میں احسان کیسا۔" افضال صاحب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر بے

ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔ "احسان تو تم نے کیا ہے ہم پر۔"

عبدالحق کو اس لمحے ان پر بہت شدت سے پیار آیا۔ وہ ہر روز ان سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہوں گے لیکن ان کی جیب میں پیسے نہیں ہوتے ہوں گے۔ شربت پینے کو...... اور نجانے کس کس کو ان کا دل چاہتا ہوگا۔ اور وہ اپنی محرومی کا بوجھ ہر قدم پر بڑھاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہوں گے۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں۔ یہ سوچتے ہوئے اسے احساس بھی نہیں تھا کہ ابھی اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا ہے۔ کیسے کیسے لوگ دیکھنے ہیں اسے...... بھانت بھانت کے۔

شربت پینے کے بعد اس نے شربت والے سے پوچھا۔ "کتنے پیسے ہوئے؟"

"ڈھائی آنے بنتے ہیں باؤ جی' پر تسی دوانی دو۔"

"دوّنی کیوں پورے پیسے لو نا۔" عبدالحق نے جیب سے چونی نکال کر اسے دی۔

شربت والے نے دوّنی اس کی طرف بڑھائی۔ "اپنی خوشی سے چھوڑ رہا ہوں باؤ جی۔"

عبدالحق کو اچھا نہیں لگا۔ "میں کوئی ضرورت مند نہیں ہوں۔ پیسے ہیں میرے پاس۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم پورے پیسے کاٹو۔"

"برا مان گئے باؤ جی۔" شربت ولے نے دل گرفتگی سے کہا۔ "میں تو بہت غریب آدمی ہوں جی۔ ادھر سے جو لوگ لٹ کٹ کے آئے ہیں' ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ پر دل تو تڑپتا ہے نا کچھ کرنے کو۔ تو بس ایسے ہی کر لیتا ہوں۔ دل خوش ہو جاتا ہے تھوڑا سا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

عبدالحق کے دل پر اثر ہوا تھا۔ پھر افضال صاحب نے اس کا ہاتھ تھام کر دبایا' جیسے کہہ رہے ہوں' اس سے بحث نہ کرو۔ اس نے شربت والے سے کہا۔ "شکریہ بھائی' بہت شکریہ۔"

وہ دونوں کچھ دور نکل آئے تو افضال صاحب نے کہا۔ "دلوں کو پہچاننا سیکھ بیٹے۔ یہ بڑے مخلص' بڑے دردمند لوگ ہیں۔ حیثیت کے چھوٹے' دل بہت بڑے۔ یہ جو دو پیسے اس نے چھوڑے' تمہارے لیے ان کی کوئی وقعت نہیں لیکن اس کے نزدیک ہے۔ یہ اس کا ایثار ہے...... پاکستان کے لیے۔ وہ تمہاری بے عزتی نہیں کر رہا تھا۔ اپنی نظر میں اپنی عزت بحال کر رہا تھا۔"

عبدالحق دہل کر رہ گیا۔ افضال صاحب کا کہا ہوا ایک ایک لفظ سچا بھی تھا اور اہم بھی۔ نوکروں کی' رعیت کی وفاداری تو اس کے لیے جانی پہچانی تھی لیکن عام' آزاد لوگوں کا یہ جذبۂ ایثار اس کے لیے بالکل نیا تھا۔

"مجھے معاف کر دیجیے۔ میں اسے سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔"

"دیکھو گے تو سمجھو گے نا۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ میرے ساتھ چلتے رہو اور دیکھتے رہو۔"

"فی الحال تو بیٹھنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"تو یہ کون سا مسئلہ ہے۔ چلو میرے ساتھ۔"

وہ افضال صاحب کے ساتھ چلتا رہا۔ آگے ایک پارک تھا۔ وہ پارک میں داخل ہوئے اور ایک بینچ پر جا بیٹھے۔ پارک میں اچھے خاصے لوگ تھے۔ زیادہ تر گھاس پر پاؤں پھیلائے نیم دراز تھے۔ کچھ ان کی طرح بینچوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ درختوں کے سائے میں گھاس پر لیٹے بے سدھ سو رہے تھے۔

"یہ بھی ایک بڑا غیر سرکاری کیمپ ہے۔" افضال صاحب نے کہا۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ رات کو یہاں لوگ بہت بڑی تعداد میں سوتے ہیں۔"

عبدالحق نے سوچا، گھر سے...... چھت سے محرومی کتنی بڑی ہوتی ہے۔ اور یہ پاکستان بنا ہے تو اس اعتبار سے یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اس کے نتیجے میں لاکھوں افراد بے گھری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اب یہ اسی نومولود ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان افراد کی نوآبادکاری کا اہتمام کرے، انہیں گھر فراہم کرے۔

مگر وہ کوئی یک جہتی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی تو کئی جہتیں تھیں۔ وہ تو بہت بڑا انسانی المیہ تھا۔ لاکھوں افراد زندگی سے محروم ہو گئے تھے۔ لاکھوں افراد کا مر جانا چھوٹی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ لاکھوں انسان قتل ہوئے تھے، انہی جیسے لوگوں نے انہیں قتل کیا تھا۔ یہ بہت بڑے پیمانے پر خون ریزی تھی اور دونوں طرف سے ہوئی تھی۔ ایک طرف سے زیادہ اور دوسری طرف سے کم سہی، دوسری طرف والے چاہے اسے ردعمل کہیں، لیکن خوں ریزی دونوں طرف سے ہوئی تھی۔ اور جب کسی خطے میں اتنے بڑے پیمانے پر قتل عام ہو، لوگ بغیر ذاتی عناد کے، بغیر کسی پہچان کے لوگوں کو قتل کرنے لگیں تو یہ بہرحال مقام فکر ہوتا ہے۔ اس کے کھلے نتائج تو سامنے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس خطے میں لوگ بڑی تعداد میں وحشت کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ نارمل نہیں رہے۔ تب ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ان نفسیاتی عوامل اور بیماریوں کو کھوجا جائے، جس میں لوگ مبتلا ہو گئے ہیں۔ تاکہ ان کا علاج، ان کا مداوا کیا جا سکے۔

یہ سب کچھ سوچ کر عبدالحق کو پاکستان پر ترس آنے لگا۔ ہندوستان تو اپنی جگہ جما ہوا، مستحکم اور بہت بڑا ملک تھا۔ وہاں نہ وسائل کی کمی تھی، نہ سسٹم کی۔ ادارے بھی وہاں قائم اور مستحکم تھے۔ ذرائع اور وسائل تمام انہی کے کنٹرول میں تھے۔ بلکہ ان کے وسائل اور بڑھ گئے تھے۔ نقل مکانی تو ادھر بھی ہوئی تھی۔ مگر اس کی نوعیت مختلف تھی...... سود مند تھی...... جو علاقے پاکستان میں تھے، وہاں سے نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد وہاں سے ہجرت کرنے والوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ اور وہ جو زمینیں اور وسائل پاکستان میں چھوڑ گئے تھے، اس سے کہیں

زیادہ، بہت زیادہ زمینیں اور وسائل مسلمان ہندوستان میں چھوڑ کر گئے تھے۔ لہٰذا ان کی نوآبادکاری کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جبکہ پاکستان میں صورت حال بالکل برعکس تھی۔ وہاں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زمینیں، املاک اور وسائل آنے والے مسلمانوں کے لحاظ سے کم، بہت ہی کم تھے۔

وہ موازنہ بہت عجیب، بہت تکلیف دہ تھا۔ ہندوستان ایک ملک تھا، جسے آزادی ملی تھی۔ وہ ہر اعتبار سے ایک Established ملک تھا۔ اس میں بڑے بڑے شہر تھے، بندرگاہیں تھیں۔ ضرورت کی ہر چیز ان کے پاس تھی...... نہ صرف اپنے لئے، بلکہ پاکستان کے لیے بھی۔ جبکہ پاکستان میں لے دے کر ایک بڑا شہر تھا...... لاہور! پاکستان کے پاس تو اس وقت اپنے لوگوں کے لیے بھی وسائل موجود نہیں تھے۔ اس پر مستزاد لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان سے لٹے پٹے تباہ حال مہاجرین کی آمد، اور ان کی نوآبادکاری کے مسائل۔ نوآبادکاری تو بعد کا مسئلہ تھی، پہلے تو انہیں رکھنا اور بنیادی ضرورت یعنی ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا ہی بہت بڑا مسئلہ تھا۔

اور وسائل تمام ہندوستان کے قبضے میں تھے۔ پہلے تو وسائل کی تقسیم میں بے انصافی کی گئی۔ پھر جو نام نہاد حصہ طے پایا، اسے پاکستان کے حوالے کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا گیا۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے مل کر پاکستان کو محتاج اور معذور بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان جو اپنی جگہ جما کھڑا تھا، تیزی سے مستحکم ہونے لگا...... اپنے پیروں پر کھڑا ہونے لگا۔ وہاں استحکام تھا۔ جبکہ پاکستان میں انتشار تھا، افراتفری تھی۔ انگریزوں اور ہندوؤں کو بجا طور پر امید تھی کہ پاکستان چند ماہ سے زیادہ نہیں جی سکے گا اور آخر میں ہاتھ جوڑ کر ہندوستان میں شامل ہونے کی استدعا کرے گا۔

لیکن عبدالحق نے پاکستان میں ٹوٹے پھوٹے بدحال لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ پاکستان اللہ نے بنایا ہے...... اور بنایا ہے تو قائم رہنے کے لیے بنایا ہے۔ اللہ ہی اسے قائم رکھے گا۔ اور یہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں بڑا یقین ہوتا تھا۔

تو یہ ہے صورت حال عبدالحق نے سوچا۔ ایک طرف اَن دیکھا اللہ ہے اور دوسری طرف انگریز اور ہندوستان۔ اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ کون جیتے گا۔

"میاں، کہاں کھو جاتے ہو تم۔"

افضال صاحب نے اسے چونکا دیا۔

"اب چلیں؟"

"جی...... ضرور۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

❁ ❁ ❁

چلتے چلتے عبدالحق نے افضال صاحب سے کہا۔ "آپ کو بھوک نہیں لگتی؟ آپ کھانا نہیں

کھاتے؟"

"بھوک بھی لگتی ہے' مگر کم کم۔ اور کھانا بھی کھاتا ہوں مگر اس لیے کہ یہ جینے کے لیے ضروری ہے۔" افضال صاحب نے کہا۔ پھر چونک کر بولے۔ "کیوں...... تمہیں بھوک لگی ہے؟"

"جی ہاں۔ مگر اس کی برداشت مجھ میں ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ "دراصل میں آپ کے خیال سے کہہ رہا تھا۔"

"ابھی چل کر کھانا کھائیں گے لیکن اس سے پہلے میں ایک کام کرتا ہوں۔"

کچھ آگے جا کر سامنے عبدالحق کو ایک عمارت نظر آئی' جس کا گنبد سبز رنگ کا تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم بہت زیادہ تھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ داتا دربار ہے۔" افضال صاحب نے کہا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اسے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں' وضاحت کی۔ "یہ مزار ہے حضرت سید علی ہجویریؒ کا یہ بہت بڑے بزرگ اور اللہ کے ولی تھے۔"

عبدالحق نے صوفیائے کرام کے بارے میں خاصا پڑھا تھا۔ گو کہ داتا دربار اس کی سمجھ میں نہیں آیا' لیکن سید علی ہجویریؒ کا حوالہ اسے یاد آ گیا۔ "یہاں اتنا ہجوم کیوں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہاں ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ اس ہجوم میں سائل بھی ہیں اور زائرین بھی۔"

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔"

"میں تو ہر روز یہاں آتا ہوں۔ دل کو بڑا سکون ملتا ہے یہاں۔" افضال صاحب نے کہا۔

وہ آگے بڑھے تو انہیں نیچے زمین پر بیٹھے سائل نظر آئے۔ مزار کی دیوار سے لے کر تاحدِ نظر تک سائل ہی سائل تھے' جو آوازیں بھی لگا رہے تھے۔ افضال صاحب ایک سائل کی طرف بڑھے۔ "کھلا ہے تمہارے پاس؟" انہوں نے پوچھا۔

"آہو جی...... اک رپئے داتے ہوسی۔"

افضال صاحب نے جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر اسے دے دیا۔ اس نے گن کر 64 پیسے ان کے حوالے کر دیے۔

عبدالحق کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کا تو خیال تھا کہ افضال صاحب کے پاس پیسے ہوتے ہی نہیں ورنہ وہ شربت کو ایسے کیوں ترستے۔ ایک روپیہ کوئی چھوٹی رقم تو نہیں ہوتی۔

اب وہ افضال صاحب کے ساتھ مزار کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ افضال صاحب کہیں رکتے اور کسی سائل کو ایک پیسہ دے دیتے' عبدالحق نے غور سے دیکھا۔ سائلوں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ مرد' عورتیں' بوڑھے' جوان اور بچے۔ ان میں محتاج اور معذور بھی تھے۔ کوئی اندھا تھا' کوئی ہاتھوں سے' کوئی ٹانگوں سے محتاج۔ عبدالحق نے محسوس کیا کہ افضال صاحب بچوں اور معذور

افراد کو خاص طور پر نواز رہے ہیں۔ اور ایک بات طے تھی جوان اور خاص طور پر خوش شکل جوان لڑکیوں کو وہ نظر انداز کر رہے تھے۔

پھر ایک بار انہوں نے سر گھما کر عبدالحق کو دیکھا۔ "کھانے کے پیسے تو ہیں نا تمہارے پاس؟"

"پیسوں کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں نے کہا نا' پیسوں کی کوئی کمی نہیں۔" عبدالحق نے انہیں یقین دلایا۔

افضال صاحب پھر مصروف ہو گئے۔ عبدالحق گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں چند دکانیں تھیں' جن کے باہر دیگیں رکھی تھیں۔ عبدالحق کو جمیل کا خیال آ گیا۔ "تو جمیل کھانے کی دیگیں ان لوگوں کو بیچتا تھا؟" اس نے افضال صاحب سے پوچھا۔

"ہاں یہاں۔"

"آؤ باؤ جی آؤ۔ لنگر کرو گے؟"

عبدالحق کی سمجھ میں بات تو نہیں آئی۔ تاہم وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ "کیا ریٹ ہے تمہارا؟"

"او جی بریانی کی دیگ پانچ روپے کی ہے' زردے کی چھ روپے کی ہے اور سو روٹیاں دال کے ساتھ تین روپے کی۔"

"کوئی سالن نہیں ہے گوشت کا؟"

"نہیں باؤ جی۔"

"ابھی کچھ دن پہلے تو میں نے کھایا تھا یہاں سے۔"

"او مجھیں باؤ جی۔" دکان دار نظریں چرانے لگا۔ "کوئی بھول ہوئی ہے تم کو۔"

عبدالحق کی سمجھ میں بات آ گئی۔ وہ سپلائی تو منقطع ہو گئی تھی۔ اتنے میں افضال صاحب نے اسے آواز دی۔ "ارے میاں' کہاں پھنس گئے۔ آؤ نا۔"

وہ افضال صاحب کی طرف بڑھا۔ "دیکھو نا' ہم تو خالی ہو گئے۔" افضال صاحب نے کہا۔

"تو اب؟"

"اب دربار چلیں گے۔ فاتحہ پڑھیں گے۔"

"مجھے تو فاتحہ پڑھنی آتی بھی نہیں۔"

"یہ کون سا مشکل ہے۔ الحمد شریف پڑھو اور تین بار قل ھواللہ پڑھ لو' بس......"

واہ...... یہ تو بڑا آسان ہے۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔

وہ دربار میں داخل ہوئے۔ مزار تک تو جانا ممکن نہیں تھا۔ بہت بڑا ہجوم تھا وہاں...... وہ

دونوں پیچھے ہی کھڑے ہو گئے اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد عبدالحق نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ کچھ لوگ مزار پر سجدہ بھی کر رہے تھے۔

اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ ”یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے افضال صاحب سے پوچھا۔

”ماتھا ٹیک رہے ہیں۔“ انہوں نے سادگی سے کہا۔

”ماتھا ٹیکنے کو سجدہ کہا جاتا ہے۔“ عبدالحق کے لہجے میں تلخی تھی۔

”سنو میاں، یہ عقیدت سے بھرے لوگ ہیں، اور یہ ان کا اظہارِ عقیدت ہے۔“

”سجدہ عقیدت کا نہیں، بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور بندگی صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے۔“

”اس الجھن میں کیوں پڑتے ہو میاں۔ اب چلو۔“

”لیکن افضال صاحب، یہ شرک ہے۔ اور مجھے بتایا گیا ہے کہ شرک اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔“

”تو تم کہاں کر رہے ہو۔ دیکھو نا، بس میں بھی نہیں کر رہا ہوں۔“ افضال صاحب نے بڑی معصومیت سے کہا۔ آؤ اب چلیں۔“

وہ مزار سے نکلے۔ عبدالحق کے ذہن میں بڑی الجھنیں تھیں۔ وہ انہی پر غور کرتا رہا۔ افضال صاحب نے یہ بات بھانپ لی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر اچانک انہوں نے نعرہ لگایا۔ ”لو، ہم پہنچ گئے۔ اب کھانا کھائیں گے۔“

عبدالحق نے چونک کر دیکھا۔ وہ ایک ٹھیلا تھا۔ چاروں طرف کچھ بنچیں تھیں۔ جن پر لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

”بھئی ہم تو سمجھتے تھے کہ چھولے بس چاٹ کے لیے ہوتے ہیں۔“ افضال صاحب نے کہا۔ ”لیکن یہاں تو اس کا سالن بھی بنایا جاتا ہے۔ اور یہ پہلوان صاحب تو ایسے مزے کا سالن بناتے ہیں کہ بس انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ۔“

ٹھیلے پر ایک بہت بڑا دیگچا رکھا تھا۔ ساتھ ہی تین چار چھوٹی دیگچیاں بھی تھیں۔ بھاری جسم کا ایک شخص بڑی پھرتی سے بڑے دیگچے میں سے پلیٹ میں سالن نکالتا، پھر کسی جادوگر کی طرح چھوٹی دیگچیوں میں سے کچھ نکال کر اس پلیٹ میں شامل کرتا اور پکارتا...... یہ لو جی، کوفتہ چھولے۔ اور نان چاہیے جناب؟ پانی اِدھر گھڑے میں سے لے لیں۔ وہ ایک مشین کی طرح سے ہاتھ چلا رہا تھا۔ اور یہی صورتِ حال زبان کی بھی تھی۔

اور اسے دیکھ کر ذہن میں لفظ پہلوان ہی گونجتا تھا۔

پہلوان کی نظر افضال صاحب پر پڑی تو اس نے آواز لگائی۔ ”آ گئے ہو بزرگو...... بھاگاں والیو آج کچھ دیر نہیں کر دی۔“ پھر اسے اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ عبدالحق بھی ہے تو وہ کام چھوڑ، لپک کر ان کی طرف آیا۔ عبدالحق کا ہاتھ تھام کر اس نے بڑے زور سے مصافحہ کیا۔ ”تسی کدوں

آئے او جی؟ جم جم آؤ جی، جم جم آؤ۔ اللہ کی رحمت ہو جی آپ تو۔ میرے نصیب......“

عبدالحق اُس کے تپاک پر حیران ہو رہا تھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا، جیسے برسوں سے اسے جانتا ہو۔

”او پولے، کپڑا مار اس بنچ تے، اور پانی کا جگ لا کر رکھ۔“ پہلوان نے ایک دس بارہ سال کے لڑکے کو پکارا، جو وہاں ویٹر کا کام کر رہا تھا۔

”ہو جی تسی آرام نال۔“ یہ کہہ کر پہلوان واپس چلا گیا۔

وہ دونوں بنچ پر بیٹھ گئے۔ عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے افضال صاحب کو دیکھا...... مگر وہ وضاحت کے موڈ میں نہیں تھے۔

”آہو جی بزرگو، کی دیواں تو انوں۔ اج پائے چھولے وڈے چنگے نیں۔ کھاؤ گے تو سواد آ جائے گا۔“

”نہیں پہلوان جی۔ آپ ہمیں سادہ چھولے ہی دے دیں۔“ افضال صاحب نے کہا۔

پہلوان نے شک آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔ ”او جی تسی تکلف شکلف تو نہیں کر دے او میرے نال۔ میں تو جی پتر ہوں تواڈا۔“

”آپ جانتے ہو پہلوان کہ مجھے کیا اچھا لگتا ہے۔ تکلف کروں تو پھر یہاں آؤں ہی کیوں۔“

”اے گل تو اڈی سولہ آنے سچی ہے۔“ پہلوان نے کہا اور جلدی جلدی پلیٹوں میں چھولے نکال کر لڑکے کو پکارا۔ ”او پولے...... انہیں گرم نان دینا۔ لے...... یہ لے جا چھیتی نال۔“

وہ کھانا عبدالحق کے لیے بڑی نعمت تھا۔ ایک تو بھوک بہت زور کی لگ رہی تھی۔ اس پر چھولے اتنے مزے دار تھے کہ لطف آ گیا۔ مگر یہ وی آئی پی ٹریٹ منٹ اُس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سب لوگ خود اٹھ کر مٹکے سے پانی نکال کر پیتے ہیں۔ مگر ان کے بنچ پر جگ اور گلاس رکھے تھے۔ نان انہیں صرف دو دو دیے گئے تھے۔ وہ ختم ہوئے تو لڑکا بڑی مستعدی سے دو اور گرم نان ان کے لیے لے آیا۔

وہ کھانا کھا کر اٹھ رہے تھے کہ پہلوان نے ہانک لگائی۔ ”او پولے، ہاتھ دھلا اناں دے۔“ پولا اُس سے پہلے ہی حرکت میں آ چکا تھا۔ اُس نے ان کے ہاتھ دھلوائے، پھر انہیں ہاتھ خشک کرنے کے لیے تولیا پیش کیا، جو ذرا میلا تو تھا، لیکن ان کے سوا کسی کو پیش نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی وہ ایک اعزاز تھا، جو خاص گاہکوں کے لیے مخصوص تھا۔

یہ بات طے تھی کہ افضال صاحب پہلوان کے خاص گاہک ہیں۔

افضال صاحب نے سرگوشی میں عبدالحق سے کہا۔ ”اب میاں یہ تمہارا امتحان ہے۔ کوشش

کرو پیسے دینے کی۔ ورنہ تمہیں سکون نہیں ملے گا۔"

"کیا مطلب؟" عبدالحق نے حیرت سے دیکھا۔

"زیادہ بحث نہ کرنا۔ دلوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ بڑے نازک ہوتے ہیں۔ لفظوں کو سننے سے زیادہ ان کی روح کو محسوس کرنا۔ ورنہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکو گے۔"

عبدالحق دل ہی دل میں الجھتا پہلوان کی طرف بڑھ گیا۔ "کتنے پیسے ہوئے پہلوان جی۔"

پہلوان کے چہرے پر صدمے کا حقیقی تاثر ابھرا۔ "نا باؤ جی نا۔ تُسی تے ساڈے مہمان ہو...... اللہ دی رحمت ہو۔"

"دیکھو پہلوان جی' یہ تمہارا روزگار ہے۔"

پہلوان ایک دم سے جیسے چرمرا کر رہ گیا۔ چہرے پر خفت برسنے لگی۔ وہ ٹھیٹھ پنجابی بولنے والا تھا۔ مگر اردو پر آ گیا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہو باؤ جی۔ یہ میرا ٹھیا ہے روزی کا۔ پر جی مہمانوں کے لیے یہ گھر ہے میرا۔ گھر آئے مہمان سے میں پیسے لوں گا۔" اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔

عبدالحق نے شرمساری سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ "لیکن پہلوان......"

"جانتا ہوں باؤ جی' جانتا ہوں۔" پہلوان کو اردو بولنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ "تیس سال سے اوپر ہو گئے بیچ بجار میں اس ٹھیلے پر بیٹھے۔ آدمی کی پہچان ہے مجھے۔ جانتا ہوں' آپ بڑے آدمی ہو' حاکم ہو۔ مجھے بھی خرید سکتے ہو۔ پر بڑا آدمی ہی تو چھوٹے کی عزت رکھتا ہے نا۔ دیکھو باؤ جی' اس میں تمہاری بے عزتی نہیں' پر میری عزت ہے۔ آپ عزت نہیں دو گے مجھے؟"

"کیا مطلب؟ تمہاری عزت کیسے ہے اس میں۔"

"میں اَن پڑھ جاہل ہوں باؤ جی' پر سمجھتا سب کچھ ہوں۔ صبح سویرے جب میں اٹھتا ہوں تو خود سے کہتا ہوں' اوئے ماجھے' اب تُو ہندوؤں کا غلام نہیں' آزاد ہے۔ اپنے سوہنے پاکستان میں ہے۔ پر تُو نے کچھ نہیں کیا پاکستان کے لیے۔ اوئے تُو تو سویا تھا ہندوستان میں اور جاگا پاکستان میں۔ تُو اپنے گھر میں تھا' اپنے گھر میں ہے۔ تیرے بچے خیر سے ہیں۔ تیرے کسی پتر کو سکھوں نے نہیں مارا۔ تیری کسی دھی کو ہندو نہیں اٹھا کے لے گئے۔" یہ کہتے کہتے پہلوان کی آواز رندھ گئی۔ "جو وہاں سے آئے ہیں' انہیں دیکھ کر میرا دل روتا ہے۔ سوہنے رب دی سوں' میرا دل کرتا ہے کہ اپنا گھر اُدھر سے آنے والے کسی کنبے کو دے دوں اور اپنے بچوں کو لے کر کیمپ میں چلا جاؤں۔ پر جانتا ہوں' بچے کہیں گے' پیو پاگل ہو گیا ہے۔" اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "جو میں آپ لوگوں کی مہمانی کر لوں تو آپ بے عزتی سمجھتے ہو۔" اُس نے پھر ہاتھ جوڑ لیے۔ "میں تو اور کچھ کر بھی نہیں

سکتا۔"

عبدالحق تو سن ہو کر رہ گیا تھا۔ پہلے شربت والا اور اب یہ پہلوان۔ اور وہ دونوں کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ جذبے اس کے لیے بے حد انوکھے' طاقت ور اور پاکیزہ تھے۔ اس کے دل میں کسی نے کہا...... پاکستان انشاء اللہ قائم رہے گا۔ جہاں لوگوں میں ایسا ایثار' ایسی محبتیں ہیں' ان زمینوں پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔

"کچھ بولو نا باؤ جی۔" پہلوان نے اسے چونکا دیا۔

"کیا بولوں۔ میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"نا جی' ایسے نہیں کہتے باؤ جی۔" پہلوان نے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ "بس ایک وعدہ کرو۔ اس طرف جب بھی آؤ گے تو میرے پاس ضرور آؤ گے۔ آپ آؤ گے تو میرے لیے مبارک ہو گا۔ رب سوہنا میرے رزق میں برکت دے گا۔"

وہ وہاں سے چل دیے۔ "اب میاں' میں تو کھانے کے بعد قیلولہ کرتا ہوں۔" افضال صاحب نے کہا۔

"میں تو بس آپ کے ساتھ ہوں۔ جہاں چاہیں' لے چلیں۔"

وہ چلتے رہے۔ عبدالحق کسی گہری سوچ میں غلطاں تھا۔ افضال صاحب نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ عبدالحق کو پتا بھی نہیں چلا کہ وہ ایک باغ میں داخل ہو گئے ہیں۔ "چلو...... یہاں گھاس پر بیٹھتے ہیں۔" افضال صاحب نے کہا۔

عبدالحق نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ بہت بڑا باغ تھا۔ لہلہاتی ہوئی گھاس' جھومتے ہوئے درخت' پھولوں کی روشیں' جا بہ جا سلیقے اور ترتیب سے بچھی ہوئی بنچیں۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔ اتنا بڑا باغ اور سلیقے کا یہ حال۔ پھر اسے خیال آیا کہ ابھی تو اس نے اس باغ کو صرف ایک نظر دیکھا ہے۔ اسے پوری طرح دیکھنے میں تو اسے کئی گھنٹے لگیں گے۔

افضال صاحب گھاس پر نیم دراز ہو گئے تھے۔ "آؤ میاں' بیٹھ جاؤ۔"

عبدالحق ان کے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ لارنس گارڈن ہے۔"

"لارنس گارڈن؟"

"ہاں میاں۔ انگریزوں نے یہاں جو کچھ بھی بنایا' اسے اپنے کسی نام کی یادگار بنا دیا۔ لیکن ایک بات ہے۔ یہ انگریز لوگ ہر کام بڑی سچائی' لگن اور سلیقے کے ساتھ کرتے ہیں۔"

"میں بھی یہی بات کہنے والا تھا۔"

"لیکن مغلوں کو باغوں سے بڑی محبت تھی' اور ان کا ذوق بھی بہت اعلیٰ تھا۔ یہ باغ مغلوں

کی روایت سے ہٹ کر ہے۔ اس میں انگریزوں کا مزاج جھلکتا ہے۔'' افضال صاحب کسی محقق کی طرح بول رہے تھے۔

''وہ کیسے؟''

''میں نے اس باغ کو پوری طرح دیکھا ہے۔ اس میں گوشہ ہائے خلوت بڑی کثرت سے ہیں۔ شاید اسی لیے اسے بڑے رقبے پر بنایا گیا ہے۔''

عبدالحق نے باغ کو دیکھا نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس پر تبصرہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس کی ذہنی رَو ان معاملات کی طرف مڑ گئی' جو اس کے ذہن میں سراسرا رہے تھے۔ اس نے افضال صاحب سے کہا۔ ''آپ برا نہ مانیں تو آپ سے ایک بات پوچھوں؟''

ایک لمحے میں افضال صاحب کا چہرہ بدل گیا۔ وہ وحشت زدہ نظر آنے لگے۔ ''ہندوستان سے یہاں آنے کے دوران جو گزری ہے' اس پر میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔'' انھوں نے درشت لہجے میں کہا۔

بات عبدالحق کی سمجھ میں آ گئی۔ افضال صاحب اس سلسلے میں بس اتنا بتاتے تھے کہ سب شہید ہو گئے۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ ان کے ساتھ کون کون تھا' کتنے لوگ تھے۔ اور کس پر کیا گزری' یہ تفصیل بھی انھوں نے کبھی نہیں بتائی تھی۔ شاید وہ تفصیل ہی تھی' جس کی وجہ سے وہ نیند سے محروم ہو گئے تھے۔ اور شاید اسی کی وجہ سے وہ کسی کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ جبکہ خود ان کے بہ قول ان کا کوئی بچا ہی نہیں تھا۔

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں پوچھ رہا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

افضال صاحب کے چہرے کی وحشت دور ہو گئی اور اس کی جگہ نرمی نے لے لی۔ ''تو پوچھو نا؟''

''آپ ہندوستان سے کچھ لے کر آئے تھے؟''

''صرف ایک بے قیمت' بے وقعت چیز بچا کر لا سکا تھا'' افضال صاحب نے کہا۔ ''اور وہ ہے یہ جسم' مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو میاں؟''

''آپ کے پاس پیسے نہیں ہوتے......''

''یہ تم نے کیسے سمجھا؟''

''شربت پینے کو دل چاہ رہا تھا آپ کا۔ اور پتا نہیں' کب سے چاہ رہا ہوگا۔''

''تو پیسے تو تھے میرے پاس۔''

''ہاں' آج تو تھے۔''

''آج نہیں' ہر روز ہوتے ہیں۔''

''جب آپ ساتھ کچھ لائے نہیں تو پھر یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں؟''

افضال صاحب کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''پہلے کبھی کسی نے پوچھا نہیں۔ میں نے بتایا بھی نہیں۔ تم نے پوچھا ہے تو بتا دیتا ہوں۔'' وہ رازدارانہ انداز میں اس کے قریب ہو گئے اور سرگوشی میں بولے۔ ''ہر صبح بڑے صاحب مجھے ایک روپیہ دیتے ہیں۔ کبھی دو روپے بھی دے دیتے ہیں۔'' پھر اچانک ان کے لہجے میں بے نیازی آ گئی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ مجھے ضرورت بھی نہیں لیکن میں لے لیتا ہوں۔''

''اس پر بھی ایک سوال ہے میرے ذہن میں۔ لیکن وہ میں بعد میں پوچھوں گا۔ پہلے یہ بتائیں کہ جب آپ کے پاس پیسے بھی ہوتے ہیں تو پھر آپ کھانے کے لیے پہلوان کے پاس ہی کیوں آتے ہیں۔ جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ پیسے نہیں لے گا۔''

افضال صاحب نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا اور دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''میاں' میں تمھاری بات پوری طرح سمجھ گیا ہوں۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں خوددار اور عزت والا نہیں ہوں......''

''یقین کریں' ایسی کوئی بات میں نے نہیں سوچی۔'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے صدمہ بھی ہوا تھا اور شرمندگی بھی۔ صدمہ اس لیے کہ اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ اُس نے خود دیکھا تھا کہ افضال صاحب نے اس روپے کا ایک ایک پیسہ بھکاریوں کو دے دیا تھا اور شرمندگی اس لیے کہ جس انداز میں اس نے پوچھا تھا' اس کا یہی مطلب نکالا جا سکتا تھا۔

''میں نے برا نہیں مانا میاں۔ نجانے کیوں' تم مجھے اپنے بیٹے کی طرح لگتے ہو۔ اب میں تمھیں جو کچھ بتاؤں گا' اس میں تمھارے ہر سوال کا جواب موجود ہے' غور سے سننا۔'' وہ چند لمحوں کے لیے رکے' پھر ایک گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔ ''ہندوستان میں بہت زمین تھی ہماری۔ بہت بڑی جاگیر تھی۔ بلا مبالغہ بیسیوں مزارعے کام کرتے تھے ہماری زمین پر۔ اور ہم بڑے مغرور تھے میاں۔ اللہ کی دی ہوئی عزت' دولت اور حاکیت پر جی بھر کر اکڑتے تھے۔ بہت برس پہلے جب میرا بیٹا چھوٹا تھا تو ایک مزارعے کے بیٹے نے کھیل کھیل میں اسے مارا۔ مجھے پتا چلا تو میں نے اس لڑکے کے کپڑے اتروا کر اسے درخت سے لٹکوا کر اتنے بید لگوائے کہ اس کا جسم سوج گیا۔ ہفتوں اس کا ہلدی چونا ہوتا رہا۔ اور جس دوران اس بچے کی مرمت ہو رہی تھی' اس کا باپ میرے پاؤں پکڑے زار و قطار رو رہا تھا۔ معافی مانگ رہا تھا۔ مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر وہ ہماری عزت اور آن کا مسئلہ تھا۔ یہ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے عہد کے فرعون تھے۔

''تو جب پاکستان بنا تو ہم پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ میں نے کچھ بھی نہیں لیا تھا...... سوائے زمینوں کے کاغذات کے۔ مگر ہوا یہ کہ میں اکیلا ہی پاکستان پہنچا۔ میرے چاروں بیٹے

میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیے گئے۔ کچھ بھی نہیں بچا' میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں زندہ تھا' مگر زندہ نہیں تھا۔

"پھر ایک دن اس کیمپ میں ایک شناسا سے ملاقات ہو گئی۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟ اس مزارعے کا بیٹا' جسے میں نے ننگا کر کے پٹوایا تھا۔ میرا بس چلتا تو اسے پہچاننے سے انکار کر دیتا۔ مگر وہ تو میرے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا...... سرکار' آپ یہاں...... اس حال میں؟ قصہ مختصر اس نے بڑے صاحب کو میرے بارے میں بتا دیا۔ بڑے صاحب نے مجھے بلوالیا۔ بس اُس دن سے میں مجبور ہو گیا۔ ان سے وعدے کے مطابق ہر صبح میں ان کے پاس جاتا ہوں' اور وہ مجھے کبھی ایک اور کبھی دو روپے دے دیتے ہیں۔

"اب تم سوچو گے کہ میں مجبور کیسے ہو گیا۔ ایک تو بڑے صاحب نے مجھے میرے شہیدوں کی قسم دی تھی۔ مگر اندر کی وجہ اور تھی۔ میں شریف سے ملا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کیسا آدمی تھا۔ میں نے اپنی حاکمیت کے زعم میں لڑکپن میں شریف کے ساتھ کیسا غیر انسانی سلوک کیا تھا۔ اب وہی شریف مجھے کیمپ میں ملا تو میں اور وہ برابر تھے۔ بلکہ اسے مجھ پر فوقیت حاصل تھی۔ پناہ گزین اور مہاجر تو ہم دونوں ہی تھے۔ لیکن اب میں بوڑھا تھا اور وہ جوان۔ میں کمزور تھا اور وہ طاقتور۔ وہ مجھ سے بدلہ لے سکتا تھا۔ لیکن اُس نے مجھے وہی پرانا والا مرتبہ اور مقام دیا۔ میری سمجھ میں آیا کہ بحیثیت انسان وہ کتنا بلند ہے اور میں کتنا پست ہوں۔ میں نے سمجھ لیا کہ میں جس غرور میں مبتلا تھا' وہ بے جا تھا۔ میری آن جھوٹی تھی۔ مجھے اس کا حق نہیں تھا' کیونکہ وہ سب کچھ تو اللہ کا دیا ہوا تھا۔ اللہ نے واپس لے لیا تو سب کچھ ختم ہو گیا نا۔ گھر بار' مال جائیداد' اولاد...... کچھ بھی تو نہیں رہا۔

تو میں نے اپنی انا کو ذلیل کرنے کے لیے بڑے صاحب سے پیسے لینا گوارا کر لیا۔ گو کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر میں خود کو اپنی اوقات یاد دلانا چاہتا تھا اور پچھلے غرور کی سزا دینا چاہتا تھا۔

پھر ایک دن پہلوان سے واسطہ پڑ گیا۔ اس کا رویہ تو تم نے بھی دیکھ لیا ہے۔ اس کے سچے خلوص کے سامنے مزاحمت ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کے باوجود خودداری کا تقاضا تھا کہ آئندہ میں وہاں کھانا ہی نہیں کھاؤں لیکن اُس نے بھی مجھے میرے شہیدوں کی قسم دے دی۔ پھر بھی میں اس کے پاس آتا ہوں تو خالی ہاتھ نہیں آتا' اور ہر بار پیسے دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی لیے تو آج فقیروں کو تمام پیسے دینے سے پہلے میں نے تم سے پوچھ لیا تھا کہ تمہارے پاس پیسے ہیں نا۔ بس یہ ہے ساری بات۔"

عبدالحق کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں۔ اُسے اَن دیکھے شریف پر بہت پیار آیا۔ ویسے انسانوں کی اس قسم سے تو وہ پہلے ہی خوف واقف تھا۔ اسے اس وقت زبیر بڑی شدت سے یاد آیا۔ اور زبیر کے ساتھ دوسرے تمام لوگ...... اور نور بانو بھی۔ اُس نے جلدی سے

اپنی سوچ کا رخ بدلا۔

افضال صاحب کا معاملہ وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا' اور ان کے بارے میں اپنی بدگمانی پر شرمندہ تھا۔ وہ خود کو سزا دے رہے تھے۔ حالانکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ تلافی تو وہ کر چکے تھے۔

"آپ بے کار کے احساسِ جرم میں مبتلا ہیں۔" اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "آپ اپنی دولت' جائیداد' گھر بار اور اپنی حاکمیت چھوڑ کر پاکستان کی محبت میں چلے آئے اور اس کوشش میں آپ کے تمام لوگ شہید ہو گئے۔ اللہ قبول کرنے والا ہے......"

"تم کچھ بھی نہیں جانتے میاں عبدالحق۔ کچھ جان بھی نہیں سکتے۔" افضال صاحب نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "کوئی انسان کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ کسی کی گٹھری میں گناہوں کا کتنا بوجھ ہے' صرف اللہ جانتا ہے یا پھر کسی حد تک خود وہ آدمی۔"

عبدالحق نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

"نجانے کیوں' تمہیں اتنا کچھ بتا دیا۔ جو میں کسی کو بھی نہیں بتانا چاہتا۔ سب کچھ تو تمہیں بھی نہیں بتا سکتا۔ میاں' میں بہت گھٹیا' بہت برا آدمی ہوں۔ دل میں ہر وقت توبہ کرتا رہتا ہوں۔ مگر میرا دل کہتا ہے' صرف توبہ سے کچھ نہیں ہوگا۔ تلافی بہت ضروری ہے۔ سو میں ہر وقت تلافی کے موقع کی تلاش میں پھرتا ہوں۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ کبھی کامیاب ہو سکوں گا۔ اور میاں' اگر تلافی کی شدید آرزو نہ ہوتی تو شاید میں خودکشی کر لیتا۔ خود سے اتنی شدید نفرت ہے مجھے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اب میں تمہیں سب کچھ تو نہیں بتا سکتا۔" افضال صاحب نے بے بسی سے کہا۔ "میں بہت خودغرض' موقع پرست اور خود پسند آدمی ہوں۔ سنو میاں' مجھے پاکستان سے کوئی محبت نہیں تھی۔ پاکستان آنے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا میں نے۔ میں جانتا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ہندوستان میں ہندوؤں کا رویہ کیسا ہوگا۔ وہاں میری حاکمیت' میرا اقتدار قائم رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ سب کچھ چھن جاتا۔ اور میں نے غلط کہا کہ میں زمینوں کے کاغذات کے سوا کچھ نہیں لایا۔ میرے پاس بہت بھاری نقد رقم بھی تھی اور کثیر قیمتی زیورات بھی۔ میں نے سوچا تھا کہ پاکستان میں ہم ہندوستان سے بھی زیادہ طاقتور رہوں گے لیکن راستے میں سب کچھ لٹ گیا' ختم ہو گیا۔ کاغذات بھی صرف اس لیے محفوظ رہے کہ میرے سینے پر بندھے ہوئے تھے۔"

عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اب وہ افضال صاحب کے نفسیاتی مسائل کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ آدمی کتنے بڑے بڑے بوجھ اٹھائے پھرتا ہے...... ایسے بوجھ جن کے بارے میں کسی کو بتا بھی سکتا۔

"تو آپ کو زمین کا کلیم تو بھرنا چاہیے تھا۔ وہ سب کچھ تو آپ کو اب بھی مل سکتا ہے۔"

"جوان اولاد آنکھوں کے سامنے ختم ہو گئی تو سمجھ میں آیا کہ کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم بلاوجہ اہمیت دے کر ان کی قدر و قیمت بڑھا دیتے ہیں۔"

"تو پھر آپ نے ان کاغذات کا کیا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں تو انھیں بھول ہی گیا تھا۔ مجھے تو صرف تلافی کی فکر تھی۔ کیمپ میں شریف مجھے ملا تو کاغذات یاد آئے۔ میں نے سوچا' کم از کم شریف کے ساتھ زیادتی کی تلافی تو کر دوں۔ میں نے کاغذات بڑے صاحب کو دیے اور کہہ دیا کہ اب شریف میرا وارث ہے۔ وہ نہیں مان رہے تھے لیکن میں نے انھیں مجبور کر دیا۔ اس معاملے کو میں نے تحریری اور قانونی شکل دے دی۔"

"تو تلافی تو ہو گئی۔ اب آپ کیوں پریشان ہیں؟"

"تم نہیں سمجھ سکتے میاں۔ میں نے کہا نا کہ تلافی تو صرف شریف کے ساتھ زیادتی کی ہوئی ہے۔ میرے گناہوں کی فہرست تو بہت طویل ہے اور گناہ بھی بہت بڑے ہیں۔ میں تو بس موقع ڈھونڈتا پھرتا ہوں تلافی کا۔ خیر' چھوڑو اب اس بات کو۔"

دونوں دیر تک اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے رہے۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ باغ میں قمقمے روشن ہونے لگے۔

"آؤ' اب چلیں۔" افضال صاحب نے کہا۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور باغ سے نکل آئے۔

❁ ❁ ❁

سیکرٹری وزارتِ داخلہ شفاعت بھٹی ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ کوٹھی اس کی ملکیت نہیں تھی' اور وہ وہاں رہتا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ہندو بنیے کی کوٹھی تھی' جو اسے جوں کا توں چھوڑ بھاگا تھا۔ ڈرائنگ روم کے فرنیچر ہی کی بات نہیں' جس وقت اس ہندو فیملی نے ہندوستان کے لیے رختِ سفر باندھا تھا تو ساتھ کچھ بھی نہیں لے کر گیا تھا...... سوائے نقدی کے۔ حد یہ ہے کہ بجھے ہوئے چولہے پر دودھ کی دیگچی بھی رکھی رہ گئی تھی' اور کھانا بھی تیار تھا۔ بس کھایا نہیں جا سکا تھا۔ اور یہ کہانی صرف اس کوٹھی کی نہیں تھی۔ بے شمار گھر ایسے ہی تھے' جہاں گھر چھوڑ کر بھاگنے والوں کا پورا سامان یونہی رکھا تھا' جیسے وہاں گھر کے لوگ موجود ہوں۔ صندوقوں اور الماریوں میں زیورات تک موجود تھے۔ لوٹ مار کرنے والوں کے گھر بھر گئے تھے۔ کچھ لوگ تو ایسے مکانات پر قابض بھی ہو گئے تھے۔

لیکن شفاعت بھٹی کا یہ معاملہ نہیں تھا۔ ہندو بنیے نے وہ کوٹھی خود اسے سونپی تھی اور ہاتھ جوڑ

کر بنتی کی تھی کہ اسے اور اس کے بچوں کو بہ حفاظت سرحد پار کرا دے۔ وزارتِ داخلہ کا سیکرٹری ہونے کے ناتے یہ شفاعت بھٹی کے لیے بڑی بات نہیں تھی۔ اُس نے اس کا بندوبست کر دیا تھا۔ کسی کی مجال تھی کہ اس کے حکم سے انکار کرتا۔

ہندو بنیا رام داس خوش تھا کہ جان بچ رہی ہے۔ بھٹی کے اصرار کے باوجود اس نے تجوری میں رکھے زیورات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ "اَن داتا' ان کی وجہ سے جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" اُس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن اس وقت رام داس کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ ایک ہار...... انسانی ہار جو وہ ساتھ لیے جا رہا ہے' وہ بھی اسے چھوڑنا پڑے گا...... اور وہ انسانی ہار تھا' اس کی بے حد حسین بیٹی شوبھا' جو شفاعت بھٹی کو اتنا پسند آ گیا تھا کہ اسے اپنے گلے میں ڈالنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

بھٹی نے ایک چھوٹے افسر کو رام داس کے سامنے حکم دیا تھا کہ وہ سرکاری جیپ میں خود اس فیملی کو سرحد پار کرا کے آئے لیکن ایک حکم ایسا تھا' جو اس نے اس افسر کو تنہائی میں دیا تھا۔

اس حکم کے نتیجے میں شوبھا واپس آ گئی اور روتا پیٹتا رام داس سرحد پار کر گیا۔

شفاعت بھٹی نے انگریزوں کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا اور ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ حکومت کرنے والوں کو کبھی انکار نہ کیا جائے تو پھر آپ خود حکمران بن جاتے ہیں' یہ وہ دیکھ چکا تھا۔ اصل حکمران محض چند سو یا ہزار دو ہزار افسروں پر حکومت کرتے ہیں۔ اور ان افسروں میں سے جو عقل مند ہوتے ہیں' وہ لاکھوں پر حکمران ہوتے ہیں۔ سو وہ لاکھوں پر حکومت کرنے والا تھا۔ اسے دو ہی شوق تھے...... ایک ولایتی شراب اور دوسرا دیسی شباب۔

اور شفاعت بھٹی دوست بھی سوچ سمجھ کر بناتا تھا۔ دو دوست تو اس کے ہم پلہ افسر تھے۔ پھر ایک بہت بڑے زمین دار تھے' جن کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ بھٹی دولت کی اہمیت کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ اُس کے علاوہ کچھ چھوٹے افسروں کے ساتھ بھی وہ بالادستی کے ساتھ شفقت اور مروت کا تعلق رکھتا تھا۔ وہ سب ایسے ہوتے تھے کہ کسی نہ کسی معاملے میں اس کے کام آ سکتے تھے۔

کچھ دن تو شوبھا اُس کی ذاتی خوشی بنی رہی۔ پھر اس نے اس خوشی میں دوستوں کو بھی شریک کر لیا۔ لیکن کھیلنے والوں کے دل کھلونوں سے بہت جلدی بھر جاتے ہیں۔ شوبھا بھی ان کے دل سے اتر گئی۔

ایسے میں ایک چھوٹے افسر نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے ایک راستہ دکھا دیا۔ "سر...... اس وقت تو کیمپوں میں بہار آئی ہوئی ہے۔" اس چھوٹے افسر نے کہا۔ "اور سیکرٹری داخلہ ہونے کی حیثیت سے آپ ان کیمپوں کے بادشاہ ہیں۔"

اس کے نتیجے میں جمیل کی کیمپ میں تعیناتی ہو گئی اور یوں یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہت تھوڑے

وقت میں جمیل، بھٹی کے لیے ناک کا بال بن گیا۔ اس سے پہلے بھٹی نے اس لیول کے کسی آدمی کو منہ نہیں لگایا تھا لیکن جمیل کی بات اور تھی۔ وہ بہت تیز و طرار تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی ضرورت بخوبی پوری کر رہا تھا۔

شوبھا کی اہمیت اب محض ایک ساقی کی سی رہ گئی تھی۔ پھر ایک دن جمیل نے بھٹی سے شوبھا کو مانگ لیا۔

بھٹی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟"

"آپ کے در کا کتا ہوں سرکار۔" جمیل نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ "گوشت نہیں مانگتا۔ چھوڑی ہوئی ہڈی کی اوقات ہے میری۔ اسی لیے اسے مانگ رہا ہوں۔ اب یہ تو آپ کو شراب پلانے کے لائق بھی نہیں رہی۔ میں تو کہتا ہوں سرکار، ساقی بھی بدلتے رہا کیجیے۔ نشہ اور بڑھ جاتا ہے۔"

بھٹی کو اس کی بات بھا گئی اور اس نے شوبھا کو جمیل کے حوالے کر دیا......

قدموں کی آہٹ سن کر بھٹی نے چونک کر دیکھا۔ چوہدری صاحب اپنے تین ملازموں کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے ساتھ سامانِ ناؤ نوش بھی تھا۔ "لو جی بھٹی صاحب، ہم تو آ گئے۔ تم سناؤ، کیا حال ہے؟"

ملازمین شراب کی بوتلوں کو برف میں لگانے میں معروف ہو گئے تھے۔ "سب ٹھیک ہے جی چوہدری صاحب۔" بھٹی نے کہا۔

تھوڑی دیر میں اکبر صاحب اور چیمہ صاحب بھی آ گئے۔ محفل جم گئی۔ شراب کا دور شروع ہو گیا۔ ان دنوں زرینہ نام کی ایک لڑکی ان کی خدمت کرتی تھی۔

"اس زرینہ سے کب تک کام چلے گا بھٹی صاحب۔" چوہدری نے کہا۔ "لگتا ہے، مجھے پنڈ ہی جانا پڑے گا۔ تمہاری تو بادشاہت ختم ہو گئی۔"

"میں نے جمیل کو بڑی سختی سے کہلوایا ہے چوہدری صاحب۔ آپ فکر نہ کریں۔" بھٹی نے قدرے کھسیا کر کہا۔ اسے جمیل پر بڑی شدت سے غصہ آیا تھا۔

کچھ دیر بعد جمیل بھی آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔

"اتنی دیر میں آئے اور وہ بھی اکیلے۔" بھٹی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کیا کروں سرکار۔ ہاتھ پاؤں تو آپ نے ہی کٹوا دیے ہیں۔" جمیل نے جواب دیا۔ اس کے انداز میں بے خوفی تھی۔

"اس سے تو اچھا تھا، میں تمہیں ڈسمس ہی کرا دیتا۔" بھٹی نے بہت غصے سے کہا۔

جمیل ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا تھا، بولنے سے پہلے ہر لفظ کو تولتا تھا۔ "واقعی سرکار، یہی اچھا

ہوتا۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "نوکری کی تو مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے زیادہ تو گھوم پھر کر کما لیتا ہوں۔ یہ تو بس آپ جیسوں کی خدمت کے لیے نوکری کر رہا ہوں۔"

"تو پھر خدمت تو کرو نا۔" بھٹی نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہی تو کہہ رہا ہوں سرکار کہ اس تبادلے سے ہاتھ پاؤں کٹ گئے میرے۔ خزانہ تو اس کیمپ میں ہی تھا سرکار۔"

"تمہارا تبادلہ دفتر میں نہیں کیا گیا جمیل۔" بھٹی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "تمہیں دوسرے کیمپ میں بھیج دیا گیا ہے۔"

"اب وہاں جمنے میں وقت تو لگے گا صاب جی۔ اور پھر اس کیمپ جیسی بات کہاں۔" جمیل نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "پھر سرکار، آپ کی خدمت کر کے ہم نے عزت کے سوا کیا کمایا تھا۔ وہ بھی آپ کے ہوتے ہوئے لٹ گئی مسعود صاب کے ہاتھوں۔ سچ تو یہ ہے سرکار کہ اب تو میں ڈر گیا ہوں۔"

"میری بات غور سے سن جمیل۔ تیرے پاس دو گھنٹے ہیں۔ خالی ہاتھ آیا یا نہیں آیا، دونوں صورتوں میں تیری خیر نہیں۔ ہماری محفل خراب مت کر۔ جا جلدی سے آ۔" بھٹی کا لہجہ نرم تھا۔ لیکن تیور بہت کڑے تھے۔

"آپ کا نمک خوار ہوں سرکار۔ آپ کے لیے کیا کچھ کیا ہے میں نے۔ اور آپ مجھے دھمکا رہے ہیں۔"

"تو کیا احسان مانوں تیرا۔ اور میرے لیے کچھ نہیں کیا ہے تو نے، اپنے ہی لیے کیا ہے۔"

"اب تو کچھ بھی نہیں رہ گیا جناب۔ آپ نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ میں استعفا ہی دے دیتا ہوں۔"

بھٹی پہلی بار مسکرایا۔ لیکن وہ مضحکہ اڑانے والی مسکراہٹ تھی۔ "ضرور دے دینا۔ مگر اس سے پہلے ہمارے لیے آج کا بندوبست کرنا ہو گا۔"

"میں کیسے کروں۔ بے بس ہوں سرکار۔ میں یہ نوکری ہی چھوڑ رہا ہوں۔" جمیل کے لہجے میں بے رخی آ گئی۔

"تو ایک اور کام کر۔ شوبھا کو واپس لا دے......"

"شوبھا؟" جمیل کا انداز ایسا تھا جیسے کچھ سمجھ ہی نہ پایا ہو۔

"ہاں شوبھا...... وہ ہڈی جو تو میرے دسترخوان سے مانگ کر لے گیا تھا۔"

"وہ...... وہ ہندو لڑکی؟ وہ تو اب میرے پاس نہیں ہے سرکار۔"

"کہاں گئی؟" بھٹی کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

"کچھ دن میرے پاس رہی۔ پھر بھاگ گئی جناب۔"

"بھاگ گئی یا تُو نے بازار میں لے جا کر بیچ دیا اسے۔"

جمیل کا تو چہرہ فق ہو گیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکا' پھر اُس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کک...... کیا...... کک...... کہہ رہے ہیں سرکار۔"

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کس کوٹھے پر بیٹھی ہے۔" بھٹی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "میں ایسے ہی اتنی بڑی کرسی پر نہیں بیٹھا ہوں۔ رعایا سے باخبر رہتا ہوں تو حکمرانی کرتا ہوں۔ اب تو سمجھا جمیل۔ مجھے آنکھیں کبھی نہیں دکھانا۔ ورنہ نوکری تو بہت چھوٹی چیز ہے۔ عمر بھر کے لیے جیل میں سڑوا دوں گا تجھے۔ وہ شوبھا خود تیرے کالے کرتوت بیان کر دے گی۔ اور یہ بھی یاد رکھنا' میری طرف کوئی انگلی نہیں اٹھے گی۔ جا...... بس اب دفع ہو جا۔ دو گھنٹے ہیں تیرے پاس۔"

جمیل وہاں سے نکلا تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

اس کے جانے کے بعد چیمہ نے بھٹی سے کہا۔ "مان گئے یار' استاد ہو۔ مگر تمہیں پتا کیسے چلا؟"

"ادھر کیمپ میں ایک جاسوس ہے میرا۔ یہ جمیل اسے اپنا بندہ سمجھتا ہے۔ اب یار' خبر تو رکھنی پڑتی ہے۔"

"مگر اس کے تبادلے کا کیا چکر ہے۔ تم اپنے محکمے میں بھی بے بس ہو گئے۔" اکبر نے حیرت سے کہا۔

"مجبوری تھی۔ جانتے ہو اس کیمپ کا انچارج کون ہے؟ مسعود احمد خان!"

"وہ؟ وہ وہاں کہاں جھک مار رہا ہے۔ وہ تو آئی سی ایس ہے۔" چیمہ نے بے ساختہ کہا۔

"وہاں جھک نہیں مار رہا ہوتا تو شاید تمہاری جگہ بیٹھا ہوتا۔" بھٹی نے چڑ کر کہا۔

"کیا پتہ تمہاری جگہ ہوتا۔" چیمہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں' کیوں نہیں' بہرحال وہ وہاں خدمتِ خلق کر رہا ہے۔ وہ تو اس جمیل کو معطل کرانے پر تلا بیٹھا تھا۔ بڑی مشکل سے تبادلے پر بات ٹلی۔"

"لیکن یار وہ تمہیں ڈکٹیٹ تو نہیں کرا سکتا۔" اکبر بولا۔

"کرا سکتا ہے اور کرایا ہے۔ وہ استعفا دینے جا رہا تھا۔"

"تو جانے دیتے۔ خس کم جہاں پاک۔"

"اس کا استعفا قبول ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت تو کمی ہے افسروں کی۔ اور پھر احتجاجی استعفا۔"

"اوہ۔ ہاں یہ تو ہے۔"

"اویار چھوڑو ان باتوں کو۔ جام بنواؤ۔" چوہدری نے کہا۔ "اور سنو' یہ تمہارا جمیل اب آئے گا بھی یا نہیں۔"

"آئے گا چوہدری صاحب...... جم جم آئے گا۔" بھٹی نے ہنستے ہوئے کہا۔

❁ ❁ ❁

شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد دیکھ کر عبدالحق کو دہلی یاد آ گیا۔ مغل دور کا طرزِ تعمیر کس قدر منفرد ہے۔ اس نے سوچا' ایک نظر ڈالو تو پتا چل جائے کہ یہ مغل دور کی عمارت ہے۔

اس کا جی چاہا کہ اندر جا کر دیکھے لیکن افضال صاحب کے انہماک کو توڑنا اچھا نہیں لگا۔ اس نے سوچا' بعد میں کبھی اکیلا آئے گا۔

افضال صاحب کا انہماک بھی عجیب تھا۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے چلتے تھے۔ بلکہ ان کے انہماک کا مرکز چہرے تھے۔ وہ ہر شخص کو یوں دیکھتے' جیسے وہ ان کا شناسا ہے' اور وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلتا رہا۔ اتنے ہی غور سے وہ انھیں دیکھ رہا تھا۔

اچانک...... بالکل ہی اچانک جیسے دنیا بدل گئی۔ موڑ مڑتے ہی وہ ایک بارونق علاقے میں داخل ہو گئے۔ وہاں راہ گیروں کی تعداد بھی زیادہ تھی' اور آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ بھانت بھانت کی آوازیں۔ سڑک کے دونوں طرف کئی منزلہ پرانے مگر پختہ مکانات کا سلسلہ تھا۔ نچلی منزل پر دکانیں ہی دکانیں تھیں' جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ بازار ہے۔ وہاں ہر طرح کی دکانیں تھیں۔ چائے خانے بھی تھے اور کھانوں کے ریستوران بھی۔ مگر وہاں ہار پھول بیچنے والوں اور پان بیڑی والوں کی دکانیں بڑی کثرت سے تھیں۔

ہار پھول والوں کی دکانیں دیکھ کر عبدالحق کو داتا دربار کا خیال آ گیا۔ اُس نے سوچا' یہاں بھی قریب ہی کوئی مزار ہو گا۔ مگر ایک فرق تھا۔ وہاں لوگ ہار' پھول اور چادریں لے کر مزار کا رخ کرتے تھے۔ جبکہ یہاں لوگ ہار خرید کر خود اپنے ہی گلے میں ڈالتے اور مستانہ چال چلتے آگے بڑھ جاتے یا کسی نیم تاریک زینے میں گھس جاتے۔

"یہاں کوئی مزار ہے؟" اُس نے افضال صاحب سے پوچھا۔

"نہیں میاں' یہ قبرستان ہے...... زندہ روحوں کا قبرستان۔" انھوں نے افسردگی سے کہا۔

عبدالحق نے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ جواب سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی ذہنی رو بہک گئی ہے۔

وہ آگے بڑھتے رہے۔ پھر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے عبدالحق کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ آگے چند شراب خانے بھی تھے۔ پھر مکانوں کے بالا خانوں پر اسے جا بہ جا عورتیں بیٹھی نظر آئیں۔ یہ

ظاہر تو وہ بنی سنوری بیٹھی تھیں۔ ہونٹوں پہ سرخی' چہرے پر غازہ' آنکھوں میں کاجل اور کلائیوں میں گجرے لیکن اس بناؤ سنگھار کے باوجود نجانے کیوں وہ اسے اجڑی اجڑی لگ رہی تھیں۔ اور ان سے کچھ اشارے کر رہی تھیں۔ کچھ کی نگاہوں میں بلاوے تھے۔ کچھ ساکت بیٹھی تھیں۔ مگر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ الگ بات کہ عبدالحق کو لگ رہا تھا کہ وہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر چپکا دی گئی ہے۔

عبدالحق نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ اس وقت کوئی لڑکھڑاتا ہوا شرابی اُس سے ٹکرا گیا۔

''ایں...... دیکھ کیں چل۔'' شرابی لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں منمنایا اور اِدھر اُدھر ڈولتا آگے بڑھ گیا۔

''یہ کون سی جگہ ہے افضال صاحب؟''

لیکن افضال صاحب بالا خانوں پر عورتوں کو دیکھنے میں ایسے منہمک تھے کہ انھوں نے اُس کی آواز سنی ہی نہیں۔

چند لمحوں میں عبدالحق کو احساس ہو گیا کہ اس سڑک پر بعض راہگیر مستقل ہیں۔ بلکہ انہیں راہگیر نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ راہگیر تو راستے سے گزر کر کسی منزل کی طرف جاتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ اسی سڑک پر مستقل اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر چل رہے تھے۔

عبدالحق نے اُن میں سے ایک کو غور سے دیکھا تو اسے کوّے کا خیال آیا۔ وہ اپنے چہرے اور وضع قطع سے کوئی لفنگا لگ رہا تھا۔ انگلیوں میں دبی ہوئی بیڑی' جس کا کش لیتے وقت وہ مٹھی بنا لیتا تھا۔ اور اُس کی آنکھیں ایسی متحرک تھیں' جیسے ٹھہرنا ہی نہیں جانتی ہوں۔ اور وہ کسی چیز یا کسی شخص کو براہِ راست نہیں دیکھتا تھا۔ اسی صفت پر عبدالحق کو کوّے کا خیال آیا تھا کہ کوّا اپنی پسندیدہ کسی چیز کو نظر بھر کر نہیں دیکھتا' چپکے چپکے کن انکھیوں سے دیکھتا ہے' اور آہستہ آہستہ اُس کی طرف کھسکتا ہے۔ ذرا سی آہٹ ہو تو بھڑک کر اُڑ جاتا ہے' ورنہ اُس چیز کو چپکے سے چونچ میں دبا کر اُڑ جاتا ہے' اور کہیں دور جا کر اسے کھاتا ہے۔

اُس شخص کو عبدالحق کی نگاہوں کا احساس ہوا تو وہ مسکرایا۔ اس کے پیلے پیلے دانت نمایاں ہو گئے۔ اس لمحے اسے دیکھ کر عبدالحق کو کراہت کا شدید احساس ہوا اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ شخص اُس کے پاس آ گیا ہے اور اُس کے ساتھ چل رہا ہے۔ ''مال چاہیے باؤ صیب؟''

''مال' کیسا مال؟'' عبدالحق نے گھبرا کر پوچھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ کوئی بہت بری بات کی جا رہی ہے۔ اس نے امداد طلب نظروں سے افضال صاحب کو دیکھا لیکن وہ بدستور حالتِ استغراق میں تھے۔

وہ شخص ہنسا...... اور اس کی ہنسی بھی بڑی مکروہ تھی۔ پیلے دانت پھر نمایاں ہو گئے۔ ''مال کا پوچھتے ہو۔ باؤ جی ہیرا منڈی میں کیا لینے آئے ہو۔ یہاں تو ہیرے ملیں گے نا۔ کہو تو نیلم دلوا دوں' کہو تو یاقوت۔ چکنے نگ ہیں...... بے داغ بھی ہیں۔ میرے جیسا مال یہاں کوئی نہیں دلوائے گا......''

اچانک افضال صاحب چونکے۔ انھوں نے خشمگیں نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور مضبوطی سے عبدالحق کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ہمیں تم سے کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ تند لہجے میں بولے۔

کوّے جیسی فطرت کا شخص اسی لمحے پلٹ گیا۔

''یہ کون سی جگہ ہے افضال صاحب؟''

''اسے شاہی محلّہ بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ یہاں نہ بکنے والا شاہ ہے' نہ خریدنے والا۔ اور اسے ہیرا منڈی بھی کہتے ہیں۔ یہ نام ٹھیک ہے اس کا۔''

''کیا یہاں واقعی ہیرے ملتے ہیں؟''

''منڈی تو یہ کنکروں کی ہے۔ مگر یہاں بدنصیب ہیرے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ انھی کو تو ڈھونڈتا ہوں میں۔''

عبدالحق کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ ''کبھی کبھی آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔''

''ارے میاں' یہ بازارِ حسن ہے۔'' افضال صاحب کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور جھنجھلاہٹ بھی۔ ''اب یہ نہ کہنا کہ تم بازارِ حسن کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔''

''جی...... میں واقعی نہیں سمجھتا۔'' عبدالحق نے شرمندگی اور عاجزی سے کہا۔

''میاں' تم ہندوستان سے آئے ہوئے تو نہیں لگتے۔ لگتا ہے' ماں کے پیٹ سے سیدھے یہاں چلے آئے ہو۔'' افضال صاحب نے غصے سے کہا۔ پھر اچانک ان کا لہجہ نرم ہو گیا۔

''یہاں عورت کو سب سے برے روپ میں بٹھا کر اس کا کاروبار کیا جاتا ہے۔ یہ عورتیں دیکھ رہے ہو نا۔'' انھوں نے بالا خانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ بکنے کے لیے بیٹھی ہیں۔ گاہکوں کو بلا رہی ہیں۔''

اگر حمید سے بات نہ ہوئی ہوتی تو شاید عبدالحق یہ بات بھی نہ سمجھتا۔ اور جب اُس کی سمجھ میں آئی تو اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ ''تو آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''میں ہر شام یہاں آتا ہوں...... اس یقین کے ساتھ کہ ان کنکروں پتھروں میں رُلتا ہوا کوئی ہیرا مجھے ضرور ملے گا۔ بس یہی تلاش ہے میری۔''

اسی لمحے ایک نسوانی آواز نے جیسے ان کے قدم تھام لیے۔ کوئی عورت بڑے دلنشیں انداز میں گا رہی تھی۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ

آواز میں بلا کا لوچ تھا......اور لہجے میں وہ غرور و تمکنت جو اس شعر کے شایانِ شان تھی۔ ساتھ ہی ڈھولک کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار بھی تھی۔ پھر گانے والی نے دوسرے مصرع کی تکرار شروع کر دی' جیسے شمع کو چیلنج کر رہی ہو اور پروانے کو لبھا رہی ہو۔

افضال صاحب نظریں اُٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ عبدالحق کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ سب کچھ جاننے کے بعد عبدالحق میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہاں سر اٹھاتا۔ مگر چند لمحے بعد جب افضال صاحب کی گرفت اچانک سخت ہو گئی تو اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر اضطراب تھا' اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ مگر آواز واضح نہیں تھی۔

''کیا ہوا افضال صاحب؟ کیا بات ہے؟''

''زرینہ......زرینہ......'' ان کے لہجے میں بھی اضطراب تھا۔

''کون زرینہ......کہاں؟''

''چپ۔'' انھوں نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے اشارہ کیا۔ پھر دھیمی آواز میں بولے۔ ''وہ سامنے کوٹھے پر دیکھو۔ وہ زرینہ ہے۔''

عبدالحق نے اس طرف دیکھا۔ وہاں کئی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟''

''وہ......وہ ہرے دوپٹے والی۔'' افضال صاحب نے ہیجانی آواز میں کہا۔ ''اسے غور سے دیکھ لو اور یاد رکھو۔''

''کیوں؟''

''تاکہ پہچان سکو۔''

''مگر کیوں؟''

''اب یہاں سے چلو۔ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' وہ عبدالحق کا ہاتھ تھام کر چل پڑے۔

''اب چلنا کہاں ہے؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''کیمپ جائیں گے میاں۔''

عبدالحق نے تانگہ روک لیا۔ افضال صاحب نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ عبدالحق کا تجسس سے برا حال تھا۔ وہ زرینہ کون تھی' جسے وہاں دیکھ کر افضال صاحب مضطرب ہو گئے تھے۔ کیا وہ اسے ہی ڈھونڈنے کے لیے ہر روز نکلتے تھے؟ کون تھی وہ ان کی؟ اور وہاں کیسے پہنچ گئی؟

کیمپ میں افضال صاحب نے عبدالحق کو زرینہ کے بارے میں بتایا۔ اس بدنصیب لڑکی کے

گھر کے تمام لوگ امرتسر میں شہید کر دیے گئے تھے۔ وہ اکیلی نجانے کیسے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''تو وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟''

''یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔''

''تو ہمیں اس سے ملنا چاہیے تھا۔''

''ایسے نہیں میاں۔ اسے وہاں سے نکال کر لانا ہے۔''

''یہ بات وہاں کہتے تو وہ اس وقت ہمارے ساتھ ہوتی۔''

''دیکھو میاں' تم کم عمر اور ناسمجھ ہو۔ کوٹھوں کے ماحول سے ناواقف ہو۔'' افضال صاحب اسے بچوں کی طرح سمجھانے لگے۔ ''کوٹھے پر بیٹھی عورت کو نکال لانا آسان ہوتا تو ایسے تمام بازار کب سے اجڑ چکے ہوتے۔ جبکہ تمہیں سب سے زیادہ رونق انہی بازاروں میں نظر آئے گی۔ کوئی لڑکی ایک بار اس ماحول میں پہنچ جائے تو اس سے نکل نہیں سکتی۔ کوئی لاکھوں میں ایک بچ نکلتی ہے۔ مگر انجام اس کا بھی اچھا نہیں ہوتا۔''

عبدالحق حیران تھا۔ اسے تو لگ رہا تھا کہ اس نے دنیا کو دیکھا اور سمجھا ہی نہیں۔ اب اُس کی سمجھ میں بات پوری طرح نہیں آئی تھی۔ ''اسے وہاں سے نکال لانے میں دشواری کیا تھی۔''

''کوٹھوں پر ہر طرح کے لوگ آتے ہیں میاں۔ شریف بھی اور بدمعاش بھی۔ دکان جو ٹھہری۔ اب دکان دار کی گاہک منتخب کرنے کی حیثیت تو نہیں ہوتی نا۔ ایسے لوگ بھی کوٹھوں پر جاتے ہیں' جنھیں کوئی لڑکی زیادہ پسند آ جائے تو وہ اسے جبراً یا اس کی مرضی سے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں سے نمٹنے کے لیے بازار میں بدمعاشوں کو ملازم رکھا جاتا ہے۔ بعض کوٹھوں پر اپنے پہرے دار بھی ہوتے ہیں۔ اور ان کے پاس ہتھیار بھی ہوتے ہیں۔ چاقو تو سبھی کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے میاں۔''

عبدالحق نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ ''بس اتنی سی بات ہے۔ آپ ابھی کہیں تو میں اس لڑکی کو اکیلا جا کر لے آؤں۔ نہ اُس کے خراش آئے نہ میرے۔''

افضال صاحب نے سر اٹھا کر بڑی بے بسی سے اُسے دیکھا۔ ''یہ سب کچھ تمہاری سمجھ میں اتنی آسانی سے کیسے آئے گا میاں۔ میں نے کہا نا کہ وہاں غنڈے......''

عبدالحق نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے لٹھیا چلانی آتی ہے افضال صاحب۔ دس بیس کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں اللہ کے فضل و کرم سے۔''

''دیکھو میاں' ایک وعدہ کرو مجھ سے۔ اس معاملے میں تم بس اتنا ہی کرو گے' جتنا میں کہوں۔ یہ طاقت سے حل کرنے والا مسئلہ نہیں ہے۔''

عبدالحق کو ان کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ اسی وقت جا کر اس زرینہ کو اپنے ساتھ لے آتا لیکن ایک دشواری اور بھی تھی۔ اُس نے زرینہ کو دیکھا ضرور تھا۔ لیکن یقینی طور پر اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ وہاں کوٹھے پر اتنی روشنی بھی نہیں تھی کہ وہ اس کی صورت دیکھ کر پوری طرح ذہن نشین کر سکتا۔ البتہ افضال صاحب اسے پہلے سے جانتے...... پہچانتے تھے۔ ''تو ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ حکم کیجیے کہ کیا کرنا ہے۔''

افضال صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔ چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

چند لمحے بعد انھوں نے سر اٹھایا اور عبدالحق کو بہت غور سے دیکھا۔ ''اپنی مالی حیثیت کے بارے میں بتاؤ ذرا۔''

''جی...... اللہ کا بڑا فضل ہے۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''پاکستان آنے کے بعد پہلی بار مجھے افسوس ہو رہا ہے اپنی تہی دامنی کا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی مجھے روپے پیسے کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔''

''ارے...... آپ بتائیں تو۔'' عبدالحق نے تڑپ کر کہا۔ ''کیا ضرورت ہے آپ کی؟''

''میری ضرورت تو بس زرینہ ہے۔''

''کہیں تو اسے میں ابھی لے آؤں۔ چلیں میرے ساتھ۔''

''تم نے وعدہ کیا ہے کہ میرے کہنے پر عمل کرو گے۔''

''جی ہاں۔ اور میں وعدہ کبھی نہیں توڑتا' آپ بتائیں تو' کرنا کیا ہے۔''

''ہمیں زرینہ کو خرید کر واپس لانا ہوگا۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری مالی حیثیت کیا ہے۔''

عبدالحق پھر بحث کرنا چاہتا تھا لیکن اسے یہ مناسب نہیں لگا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ آپ کی زرینہ کتنے میں ملے گی؟'' اُس نے پوچھا۔

''کون جانے' سو روپے میں...... اور کیا پتا' پانچ سو میں۔'' افضال صاحب کے لہجے میں تشویش تھی۔

''بس تو بے فکر ہو جائیں۔'' عبدالحق نے بے پروائی سے کہا۔ ''اگر وہ کوئی اچھی جگہ ہوتی تو میں آپ کی خاطر وہ پورا کوٹھا خرید لیتا۔''

پہلی بار افضال صاحب کے چہرے پر طمانیت نظر آئی۔ ''اللہ کا شکر ہے۔'' انھوں نے آہستہ سے کہا۔

''لیکن آپ مجھے یہ ضرور بتائیں کہ جب ہم زرینہ کو ویسے بھی لا سکتے ہیں تو اس خرید و

فروخت کی کیا ضرورت ہے۔'' عبدالحق کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''کیونکہ مجھے تو کسی لڑکی کو خرید کر لانا نہایت شرم ناک لگتا ہے۔''

''میں تمہیں بتاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم سمجھ جاؤ گے۔'' افضال صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو...... اپنی عزت اور آبرو کی وجہ سے لڑکیاں کانچ سے زیادہ نازک ہوتی ہیں۔ زرینہ تو جوان ہے۔ اُس کے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ ہم جانتے بوجھتے اسے اس جہنم میں جلنے کے لیے چھوڑ دیں۔ اور بہ زور اسے لے کر آئیں تو ہنگامہ تو ہوگا نا۔ اور سب کو پتا چل جائے گا کہ زرینہ اتنے دن کوٹھے پر رہی ہے۔ پھر کون اس سے شادی کرے گا۔ تم کرو گے؟''

عبدالحق بہت غور سے سن رہا تھا۔ آخری بات سن کر اُس نے سر ہلایا۔ ''اگر میرے ساتھ ایک اور معاملہ نہ ہوتا تو بالکل کر لیتا۔ اس لیے کہ میرے نزدیک وہ گناہگار نہیں' معصوم ہے۔ وہ تو مظلوم ہے۔ اس پر جبر ہوا ہے۔''

''ایسی منطق زیادہ دن نہیں چلتی۔'' افضال صاحب نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''اول تو تمہارے انداز میں سوچنے والا کروڑوں میں ایک ہوتا ہے۔ کہاں ڈھونڈتے پھریں گے ہم۔ پھر فرض کر لو کہ کوئی تم جیسا مل گیا اور اُس کی شادی ہو بھی گئی تو جب بھی کسی بات پر غصہ آیا تو شوہر اسے یہ طعنہ دے گا۔ کبھی اس پر شک بھی کرے گا۔ اس کا کسی بھی وقت خراب نتیجہ نکل سکتا ہے۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''نہیں...... یہ بات تو چھپانی ہی ہوگی۔ بس جیسا میں کہتا ہوں' تم ویسا ہی کرو۔''

''تو بتائیں مجھے' کیا کرنا ہے۔''

افضال صاحب اسے سمجھانے لگے۔ ان کی باتیں سن کر اُس کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ تاہم اُس نے مداخلت نہیں کی۔

افضال صاحب کی بات پوری ہو گئی تو اس نے کہا۔ ''افضال صاحب' یہ سب تو بہت مشکل ہے میرے لیے۔ میں کیسے کر سکوں گا۔''

''ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ ہونے سے بچانے کے لیے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن میں...... میں گاہک کی حیثیت سے...... میرے انداز سے سب کو......''

''سنو میاں' اس کوچے میں گاہکوں کے چہرے اور انداز نہیں دیکھے جاتے' صرف ان کی جیب پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اور پھر وہاں جانے والوں میں سے ہر شخص کی زندگی میں یہ دن ضرور آتا ہے جب وہ پہلی بار اس کوچے میں قدم رکھتا ہے۔ سبھی گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں پہلی بار۔''

عبدالحق پر اسی لمحے سے گھبراہٹ سوار ہو گئی۔ جبکہ وہاں جانے کا مرحلہ 24 گھنٹے دور تھا۔

❁ ❁ ❁

اُس روز حمیدہ سے گفتگو کے نتیجے میں نور بانو میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ بنیادی تبدیلی یہ تھی

کہ عبدالحق کے بارے میں اس کے سوچنے کا انداز مثبت ہو گیا تھا۔ یہ احساس کہ عبدالحق خود کو اُس کے قابل نہیں سمجھتا، پہلے تو ناقابلِ یقین لگا۔ مگر پھر ذہن بتدریج اسے تسلیم کرنے لگا۔ پھر اس خیال سے اسے خوشی ملی، اور اس کے نتیجے میں وہ خوش بھی رہنے لگی اور خوش مزاج بھی ہو گئی۔

دن تو کاموں میں گزر جاتا تھا۔ کام میں بھی اب اُس کا دل زیادہ لگتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ خوش رہنے کی کتنی اہمیت ہے۔ آدمی خوش ہو تو کام بھی اچھی طرح کرتا ہے، اور کام کرنے سے بھی خوشی ملتی ہے۔

یہ احساس بھی اسے پہلی بار ہوا کہ زندگی میں پہلی بار وہ صحیح معنوں میں خوش ہوئی ہے۔ وہ پلی میں گزری ہوئی زندگی پر وہ نظر ڈالتی تو سمجھ میں آتا کہ وہ خوش کبھی نہیں رہی تھی۔ اس کے پاس تو شکایتوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ اور شاکی لوگ کبھی خوش نہیں ہوتے۔ اور شکایت اسے سبھی سے تھی، خود سے بھی اور اللہ میاں سے بھی۔ اللہ میاں سے تو بہت بڑی شکایت تھی۔ اُس کے ماں باپ خوبصورت تھے، دونوں بہنیں خوبصورت تھیں، تو پھر وہ اتنی بدصورت کیوں تھی۔ وہ بری طرح احساسِ کمتری میں مبتلا تھی۔ اور اپنے اندر کی جھنجلاہٹ وہ دوسروں پر اتارتی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ زندگی میں محبت کی کتنی اہمیت ہے۔ بلکہ اصل میں محبت سے زیادہ محبت کو تسلیم کرنے اور اس کے اظہار کی اہمیت ہے۔ اور وہ اپنے اندر موجود محبتوں کو تسلیم ہی نہیں کرتی تھی۔ اظہار تو بہت دور کی بات ہے۔

کوئی انسان ایسا نہیں ہو سکتا، جو محبت نہ کرتا ہو۔ وہ بھی محبت کرتی تھی...... امی سے، باجی سے، گلنار سے، بوا سے اور آ کا میاں سے، لیکن اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے وہ ان میں سے کسی سے بھی قریب نہیں تھی۔ بہنوں کی باہمی محبت تو قدرتی ہوتی ہے۔ باجی اور گلنار میں کیسی محبت تھی۔ وہ انھیں دیکھتی اور کڑھتی تھی کہ وہ ان جیسی نہیں ہے۔ اس احساس نے اسے تنہا رہنے کا عادی بنا دیا۔ سب کچھ چھوڑ کر اُس نے کتابوں سے دوستی کر لی۔ اب جو آدمی اپنے اندر کی محبتوں سے منہ موڑے گا، وہ جھنجلائے گا بھی اور جو جھنجلائے گا، وہ ناخوش بھی رہے گا۔

اب اُس کی سمجھ میں آیا تھا کہ محبت کو تسلیم کرنے اور اُس کا اظہار کرنے میں بہت بڑی خوشی ہے۔ عبدالحق کے آنے کے بعد سے باجی کو اُس نے ایسی خوشی، ایسی سرشاری میں دیکھا تھا کہ وہ حیران ہوتی تھی۔ ان کی وہ کیفیت اس لیے تھی کہ انھوں نے اپنے دل میں موجود ٹھاکر اوتار سنگھ کی محبت کو تسلیم بھی کیا تھا، اور وہ اپنے تئیں اس کے اظہار کی کوشش بھی کرتی تھیں...... کبھی کُرتے کاڑھ کر اور کبھی اس کے لیے کچھ پکا کر۔

اور اب زندگی میں پہلی بار وہ خوش تھی۔ اس لیے کہ اُس نے عبدالحق کی محبت کو تسلیم کر لیا تھا۔ بلکہ اس نے اماں کے سامنے اس محبت کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اس نے اماں سے کہا تھا کہ اسے

عبدالحق سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن وہ عبدالحق کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ کیونکہ وہ اس کے قابل نہیں ہے۔ یہ کہتے وقت اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اس کا اظہارِ محبت ہے۔ مگر اب وہ سمجھ سکتی تھی۔ اور اس کے بعد وہ ایسی ہلکی پھلکی ہو گئی تھی، جیسے دل پر رکھا ہوا کوئی بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔

تو اب وہ سرشاری کی اس کیفیت میں تھی، جس میں باجی کو دیکھ کر وہ حسد کرتی تھی۔ کوئی کام کرتی تو لگتا کہ کسی خوبصورت دھن کی لے پر حرکت کر رہی ہے۔ چلتی تو لگتا کہ بادلوں پر اُڑ رہی ہے۔

مصروفیت کم نہیں تھی۔ دو بکری کے بچے اُس نے خود لیے تھے۔ اب وہ خاصے بڑے ہو گئے تھے۔ اُدھر مینو تھا، جو اس کے لیے بہت اہم ہو گیا تھا۔ بلکہ وہ ہر وقت اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے کام الگ تھے۔

پھر اس کا جی یہ چاہتا کہ وہ اماں کے پاس جا کر بیٹھے۔ صرف اس لیے کہ وہ عبدالحق کے بارے میں باتیں کریں گی، اور اسے اچھا لگے گا۔ وہ نہ بولتیں تو وہ خود کسی بہانے سے اُس کا تذکرہ نکال لیتی۔

اور رات...... رات کا تو وہ بے صبری سے انتظار کرتی تھی۔ رات اسے اتنی اچھی کبھی نہیں لگی تھی۔ رات کی تنہائی اور اندھیرے میں عبدالحق کی چادر جسم پر لپیٹ کر وہ جاگتی آنکھوں اُس کے سپنے دیکھتی۔ اُس سے باتیں کرتی، وہ سب کچھ کہہ دیتی، جو شاید اس کی موجودگی میں وہ کبھی نہیں کہہ سکے گی۔ اور وہ اس کی زبان سے وہ سب کچھ سنتی، جو شاید وہ اس سے کبھی نہیں کہے گا۔ اور اس دوران وہ از خود رفتہ ہوتی۔ وہ شبنم جیسی خوشی تھی، جس میں وہ بھیگ بھیگ جاتی تھی۔

اور پھر اسی کیفیت میں وہ سو جاتی...... گہری خوب صورت نیند۔ اور پھر وہ عبدالحق کو خواب میں دیکھتی۔ صبح اٹھتی تو وہ پھول کی طرح تر و تازہ اور خوش ہوتی۔ اور جس رات وہ عبدالحق کو خواب میں نہ دیکھتی، اس صبح اسے دن بھر کسی کمی کا اک احساس ستاتا رہتا۔ مگر ناخوش وہ تب بھی نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

اس روز وہ اماں کے پاس گئی تو اماں نے اسے ایک نئی بات بتائی، بات کیا، وہ تو خوشخبری تھی۔

''سن نور بانو، اب تو رابعہ کا بہت خیال رکھنا۔'' حمیدہ نے کہا۔

''جی اماں، کوشش تو میں کرتی ہوں۔'' نور بانو نے جواب دیا۔ گو کہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''دھی میری، اب اسے بوجھ بالکل نہ اٹھانے دینا۔''

''اس معاملے میں تو الٹا وہ میرا خیال رکھتی ہیں۔'' نور بانو نے شرمندگی سے کہا۔ ''وہ مجھے بہت کمزور اور نازک سمجھتی ہیں۔''

"تب تو تجھے اس کا زیادہ خیال رکھنا ہوگا دھیے۔" حمیدہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "کسی قیمت پر بھی اسے زیادہ وزن نہ اٹھانے دینا۔ پہلی بار کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ خدانہ کرے کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو نقصان بھی ہوسکتا ہے۔"

نور بانو کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ مگر وہ ڈر گئی تھی۔ "کیسی اونچ نیچ اماں؟" اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

حمیدہ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ پہلی بار اسے خیال آیا کہ معصوم نور بانو یہ بات کیسے سمجھ سکتی ہے۔ وہ اسے بتانا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن مجبوری تھی۔ گھر میں اور تھا ہی کون۔ "وہ ماں بننے والی ہے میری بچی۔" اُس نے بہت نرم لہجے میں کہا۔

نور بانو کی نگاہیں جھک گئیں۔ "جی اماں۔"

"تو سمجھ گئی ہے نا؟" حمیدہ نے زور دے کر پوچھا۔ "زیادہ وزن نہ اٹھانے دینا اسے۔"

"میں سمجھ گئی اماں۔ آپ اب فکر نہ کریں۔ میں خیال رکھوں گی۔"

"اور یہ بتا تُو عبدالحق کے لیے دعا بھی کرتی ہے کہ وہ کامیاب واپس آئے۔"

"جی اماں، ہر وقت کرتی ہوں یہ دعا۔" نور بانو کی نظریں اور جھک گئیں۔

"اب ڈر تو نہیں لگتا اس دعا سے؟" حمیدہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ پھر دلاسہ دینے والے انداز میں بولی۔ "تُو فکر نہ کر۔ اب میں تجھے جانے نہیں دوں گی یہاں سے۔"

نور بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر جلدی سے سر کو تفہیمی جنبش دی اور وہاں سے اٹھ گئی۔

اس دن نور بانو بہت خوش تھی۔ شاید وقت کا مزاج بدل رہا ہے۔ اس نے سوچا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ زندگی کی ہری بھری شاخ پر ایک اور شگوفہ پھوٹنے والا ہے۔ خوشی کو ترسی ہوئی، اپنے اندر گھٹ گھٹ کر جینے والی لڑکی کے لیے وہ بہت بڑی خوشی تھی۔ اس نے تو کبھی کسی چھوٹے بچے کو گود میں لیا ہی نہیں تھا۔ بلکہ دیکھا بھی نہیں تھا۔ ارے...... کتنا اچھا لگے گا۔ وہ نہال ہو گئی۔

یوں اس کی مصروفیت اور بڑھ گئی۔

مگر رابعہ سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔ کیونکہ معاملہ الٹا تھا۔ رابعہ اس کا خیال رکھتی تھی۔ وہ تو اسے بہت نازک۔ بہت بلند سمجھتی تھی۔ چنانچہ اسے مزاحمت تو کرنا تھی۔ اگلے روز رابعہ پانی گرم کرنے کے لیے بڑی دیگچی اٹھانے کے لیے بڑھی تو نور بانو نے اسے روک دیا۔ "نہیں آپا، یہ میں اٹھاؤں گی۔"

"ارے نہیں مجھلی بی بی......"

"مجھے اماں نے بتا دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے نور بانو کی نگاہیں جھک گئیں۔ "اب آپ بوجھ

ذرا سا بھی نہیں اٹھائیں گی۔"

"کچھ فرق نہیں پڑتا ہم گاؤں کے لوگوں کو۔ آپ چنتا نہ کرو مجھلی بی بی۔"

بے بس ہوتی ہوئی نور بانو کو اچانک ایک نکتہ سوجھ گیا۔ ان لوگوں کی عبدالحق کے ساتھ وفاداری اور فرمانبرداری وہ دیکھ چکی تھی۔ اس وقت اس کمزوری ہی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ "تو آپ میری بات نہیں مانیں گی آپا؟" اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"یہ کیسے مان لوں مجھلی بی بی۔ خدمت کرنا تو میرا کام ہے۔ مالک کو کیا جواب دوں گی۔"

"یہ میرا حکم ہے۔" نور بانو نے لہجہ اور سخت کر لیا۔

رابعہ ہچکچانے لگی لیکن ابھی اُس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔

"نہیں مانو گی تو آپ کی شکایت کر دوں گی ان سے۔"

"نا مجھلی بی بی...... ایسا نہ کرنا۔" رابعہ گھگھیانے لگی۔

"تو پھر آپ کو میرا ہر حکم ماننا ہوگا۔"

"ہم تو ہیں ہی حکم ماننے والے جی۔"

"مانو گی نا۔"

رابعہ نے مرے مرے انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر غور سے سنو۔ تم کبھی کوئی بوجھ نہیں اٹھاؤ گی۔ ایسے موقع پر مجھے آواز دو گی۔"

"ٹھیک ہے مجھلی بی بی۔"

لیکن جب نور بانو نے دیگچی اٹھائی تو رابعہ نے نظریں جھکا لیں۔ چہرے سے لگتا تھا کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو رہی ہے۔ نور بانو کو اندازہ ہوگیا کہ ہر روز یہ سب کچھ برداشت کرنا رابعہ آپا کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

اور ہوا بھی یہی۔ اگلے روز صبح سویرے ہی ایک عورت کام کرنے کے لیے گھر آگئی۔

"یہ کیا......؟" نور بانو نے رابعہ سے پوچھا۔

"زبیر صاحب نے بندوبست کیا ہے۔ اب یہ ہر روز آکر کام کرے گی۔" رابعہ نے شرماتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھلی بی بی، کھانا آپ ہی پکایئے گا۔ آپ کے ہاتھ کے کھانے کے بنا اب اپنا گزارا نہیں۔"

نور بانو کو اس پر...... ان لوگوں پر بہت پیار آیا۔ کیسے عزت کرنے والے اور دھن کے پکے تھے یہ لوگ۔ یہ گوارا کر ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی ان کی معمولی سی خدمت بھی کرے۔ خدمت جیسے صرف انہی پر فرض تھی۔

❁ ❁ ❁

گاؤں میں پانی آ گیا۔ ہر طرف جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ہر دل میں خوشی' لیکن زبیر پریشان ہو گیا تھا۔ عبدالحق ابھی تک واپس نہیں آیا تھا' اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہاں کے معاملات کس طرح سنبھالے۔

اس شام چوپال میں تقریباً قصبے کے تمام مرد جمع تھے۔ کچھ بڑے بوڑھے بھی تھے' جو چارپائیوں پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ یہ چوپال کا بندوبست خود عبدالحق کر کے گیا تھا۔

''اللہ کی مہربانی سے آج حق نگر میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔'' ایک بوڑھے شخص نے کہا۔

''اور اس کے ساتھ ہی ذمہ داریاں بھی بڑھ رہی ہیں۔'' دوسرے نے کہا۔ ''اب پنچایت بنانا ضروری ہو گیا ہے۔''

''بالکل۔ پانی کی تقسیم کے معاملات طے ہو جانے چاہئیں۔ تاکہ بعد میں جھگڑا اور نااتفاقی نہ ہو۔''

''ویسے یہاں یہ سب کچھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ یہ حق نگر ہے۔ ہم سب پر احسان عبدالحق صاحب نے کیا ہے' جس کا صلہ ہم مر کر بھی نہیں چکا سکتے۔ تو کم از کم یہ تو کریں کہ امن' سکون اور محبت سے رہیں۔''

''یہ تو انشاء اللہ ہو گا۔ لیکن چھوٹے موٹے اختلافات تو گھر میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کے تصفیے کے لیے پنچایت ضروری ہے۔''

''جی ہاں' یہ تو برسوں کی ریت ہے۔''

''اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ تھانے کچہری سے دور رہتے ہیں۔''

''معاملات تھانے کچہری میں جائیں تو دشمنی پیدا ہوتی ہے' نفرتیں بڑھتی ہیں۔''

سب لوگ اپنے اپنے طور پر اظہار خیال کرتے رہے۔ بالآخر پنچ منتخب کر لیے گئے۔

''اور سرپنچ کون ہو گا؟'' ایک جوان نے سوال اٹھایا۔

''سرپنچ اپنے عبدالحق کے سوا کون ہو سکتا ہے۔'' نیاز نے جلدی سے کہا۔

''مگر سرپنچ تو کسی بوڑھے' تجربہ کار اور عقل مند آدمی کو بنایا جاتا ہے۔'' ایک جوان نے اعتراض کیا۔

''دیکھو...... یہ گیارہ گاؤں تھے۔ مگر اب ایک قصبہ ہے۔'' بوڑھے اللہ یار نے کہا۔ ''اور اس قصبے کا نام ہے حق نگر۔ تو یہاں تو وہی ہو گا' جس کا حکم عبدالحق دیں گے۔ یہاں سرپنچ کی ضرورت نہیں۔''

اب زبیر سے چپ نہیں رہا گیا۔ ''میں ما......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ عبدالحق نے اسے

سمجھایا تھا کہ مالک تو صرف اللہ ہے' تو پھر وہ اسے کیا کہے۔ عمر بھر اسے چھوٹے ٹھاکر یا مالک کہہ کر پکارتا رہا تھا۔ پھر اسے ان لوگوں کے تخاطب سے ایک مناسب لفظ مل گیا۔ وہ اسے صاحب کہہ سکتا ہے۔ وہ مسکرایا اور بات پھر سے شروع کی۔ ''میں صاحب کا مزاج سمجھتا ہوں۔ وہ بڑوں کی عزت کرنے والے ہیں۔ سرپنچ بننا کبھی پسند نہیں کریں گے۔''

''تو پھر۔''

''میں کہہ تو رہا ہوں کہ یہاں سرپنچ کی ضرورت نہیں۔'' اللہ یار نے زور دے کر کہا۔

''لیکن سرپنچ تو ضروری ہے۔''

''میں ایک بات کہوں۔'' زبیر بولا۔ ''آپ سرپنچ منتخب کر لیں۔ کبھی کوئی مسئلہ ہو' کسی کو پنچایت کا فیصلہ زیادتی لگے یا پنچایت کوئی فیصلہ نہ کر پائے تو صاحب سے فیصلہ کرا لیں۔ لیکن انھیں سرپنچ بنائے بغیر۔''

یہ بات سب کے دل کو لگی۔ بابا رحیم بخش کو سرپنچ بنا دیا گیا۔

''اب دیکھیں اس کا فائدہ۔'' زبیر نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''اب آپ لوگ پانی کی باریاں مقرر کر سکتے ہیں۔ پانی کی تقسیم کے معاملات طے کر سکتے ہیں۔ دیکھیں صاحب تو اس وقت بھی موجود نہیں۔''

اس کی بات پر اللہ یار کو ایک اور خیال آ گیا۔ ''اور ہاں' صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی حیثیت زبیر صاحب کے پاس ہو گی۔''

زبیر نے بہت احتجاج کیا۔ مگر یہ فیصلہ بھی متفقہ طور پر قبول کر لیا گیا۔

''اب زمین کی لکھا پڑھی بھی ضروری ہے۔''

زبیر کو حسن دین کی بات یاد آ گئی۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ پٹواری حسن دین کے پاس چلے جائیں۔ وہ کاغذات تیار کرا دیں گے اور حد بندی بھی کر دیں گے۔''

وہاں ایسے لوگ بھی تھے' جنھیں عبدالحق پہلے ہی زمین دے چکا تھا' اور اب وہ ان کے نام تھی۔ ان کا یہ مسئلہ تھا ہی نہیں۔

سو زبیر اب بہت ہراساں تھا۔ وہ حکم ماننے والا' کام کرنے والا آدمی تھا۔ یہ حاکم کا کردار اس کے بس کا نہیں تھا۔ اسے ایک ہی راہ سجھائی دی۔ یہ کہ وہ لاہور جائے اور صاحب کو ساتھ لے آئے۔ لیکن اس کے لیے اماں کی اجازت ضروری تھی۔

چوپال سے اٹھ کر وہ سیدھا حمیدہ کے پاس گیا اور اسے سارا احوال سنا کر لاہور جانے کی اجازت مانگی۔

''تو اب تُو لہور جا کر اسے کہاں ڈھونڈتا پھرے گا۔''

"وہ کوئی مسئلہ نہیں اماں۔ حسن دین سے پتا لے کر جاؤں گا۔"

"لیکن میں جانتی ہوں' وہ کام پورا کیے بغیر آنے والا نہیں۔"

"پھر بھی اماں' کوشش تو کرلوں۔ یہاں کے معاملات میرے بس کے نہیں۔"

"اچھا' چلا جا۔ اللہ تیری مدد کرے۔"

"تو پھر اماں' میں صبح نکل جاؤں گا...... حسن دین کی طرف ہوتا ہوا۔"

حمیدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

❁ ❁ ❁

اگلے روز عبدالحق نے افضال صاحب سے پوچھا۔ "آج کہیں جا نہیں رہے ہیں آپ؟"

"نہیں میاں' بس رات کو چلیں گے۔ اپنے اس کام کے لیے۔"

عبدالحق دیکھ رہا تھا کہ وہ کتنے مضطرب ہیں۔ اور ہر پل ان کا اضطراب بڑھ رہا ہے۔ بس وہ چاہتے تھے کہ جلدی سے رات ہو جائے اور وہ کسی طرح زرینہ کو واپس لے آئیں۔

لیکن آنے والے وقت کے بارے میں سوچ سوچ کر عبدالحق بری طرح ہول رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے صاف اور کھرا آدمی رہا تھا۔ زندگی میں کبھی اُس کو اداکاری کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ مگر اب اسے ایک ایسا کردار ادا کرنا تھا' جو اسے پسند بھی نہیں تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اسے جو کردار ادا کرنا تھا' وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ کوئی اور صورت حال ہوتی تو وہ صاف انکار کر دیتا لیکن یہاں ایک معصوم لڑکی کی زندگی اور عزت بچانے کا معاملہ تھا۔

وہ افضال صاحب کو دیکھتا رہا' جنھیں کسی کل چین نہیں تھا۔ انھوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ لیکن عبدالحق انہیں ایسے تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اُس نے کہا۔ "افضال صاحب' کھانا تو آپ کو کھانا ہوگا۔"

"بالکل بھوک نہیں ہے میاں۔"

"آپ شاید بھول گئے۔ کھانا آپ بھوک لگنے کی وجہ سے نہیں' زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں۔"

افضال صاحب کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "بالکل دل نہیں چاہ رہا ہے میاں۔"

"دیکھیں...... پروگرام کے مطابق ہمیں وہاں پیٹ بھرے تماش بینوں کی حیثیت سے جانا ہے۔ جبکہ آپ کو اس وقت دیکھ کر بھی لگ رہا ہے کہ تین دن کے فاقے سے ہیں۔ تو پھر اپنا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا۔"

اس دھمکی کے نتیجے میں افضال صاحب نے تھوڑا بہت زہر مار کر لیا۔

شام ہوئی تو افضال صاحب نے عبدالحق سے کہا۔ "میاں' اب تیاری کے لیے نکلیں۔"

"جی' ٹھیک ہے۔"

افضال صاحب اپنے اس صندوق کی طرف بڑھ گئے' جسے شاید انھوں نے کیمپ میں آنے کے بعد کبھی کھولا بھی نہیں تھا۔ اس میں سے انھوں نے اپنے لیے ایک شیروانی' کرتا اور پاجامہ نکالا۔ پھر سلیم شاہی جوتے بھی برآمد کیے۔ پھر وہ پُرتشویش نظروں سے ان چیزوں کو دیکھنے لگے۔

عبدالحق نے دیکھا اور سمجھ گیا۔ کپڑے بری طرح مسکے ہوئے تھے۔ "فکر نہ کریں۔ استری ہو جائیں گے۔"

عبدالحق کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کیمپ سے ہی تیار ہو کر نکلا۔ البتہ افضال صاحب کو تیار کرانا تھا۔ باہر نکلتے ہی سب سے پہلے تو اُس نے بگھی کی فکر کی۔ تانگوں کی تو وہاں کثرت تھی۔ مگر بگھیاں ذرا کم تھیں۔ اور وہ بہت اچھی بگھی منتخب کرنا چاہتا تھا۔

بالآخر ایک بگھی اسے پسند آگئی۔ گھوڑا بھی بہت شاندار تھا۔ "ہمیں یہ بگھی صبح تک کے لیے چاہیے۔"

"جی ضرور باؤ جی۔" بگھی والا بھی خوش ہو گیا۔

"کیا لو گے؟"

بگھی والے نے اسے تولنے والی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "پانچ روپے لوں گا باؤ جی۔"

اُس نے سوچا جیسے ہی انکار ہوگا' جھٹ پیسے کم کر دے گا۔ اب رات بھر کے گاہک کو تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔

"میں دس دوں گا۔" عبدالحق نے کہا۔ "لیکن تمہیں اس بگھی کو ایسا سجانا ہوگا کہ لگے' کسی شوقین کی بگھی ہے۔"

"میں سمجھ گیا باؤ جی۔ ہو جائے گا۔" کوچ بان نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

عبدالحق نے جیب سے پانچ روپے نکال کر اسے دیئے' اور افضال صاحب سے کہا۔ "چلیے...... بیٹھ جائیے۔"

"بولو باؤ جی' کہاں چلنا ہے۔"

"پہلے تو تم ہمیں کسی حمام کی طرف لے چلو۔"

مگر راستے میں عبدالحق نے اسکیم بدل دی۔ سبب افضال صاحب کا لباس تھا۔ "سنو...... تم ہمیں کسی ہوٹل لے چلو۔"

کوچ بان نے پلٹ کر معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ "ٹھیک ہے باؤ جی۔ جو حکم آپ کا۔"

ہوٹل میں کمرا لینے کے بعد عبدالحق نے کوچ بان سے کہا۔ "جاؤ' اب بگھی سجا کر لے آؤ۔ کتنی

دیر لگے گی؟"

"بس ایک گھنٹا باؤ جی۔"

"آؤ تو یہیں کھڑے ہو جانا۔"

واپس کمرے میں جا کر اُس نے ویٹر کو بلایا۔ جسے ٹپ [illegible] دے کر وہ پہلے ہی رام کر چکا تھا۔ "کپڑے استری ہو سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں باؤ جی۔ سب کچھ ہوگا' جو آپ کہو۔"

عبدالحق نے اسے افضال صاحب کے کپڑے دے دیے۔

افضال صاحب بگھی میں بیٹھنے کے بعد سے اب تک ایک [illegible] نہیں بولے تھے۔ "آپ کو کیوں چپ لگ گئی؟" عبدالحق نے انہیں چھیڑا۔

"کچھ نہیں میاں' تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"میرے بارے میں!" عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں میاں' آج تمہیں دیکھ کر اپنی جوانی یاد آ گئی۔" [illegible] حب نے آہ بھر کے کہا۔ "خاندانی لگتے ہو۔ ضرور کسی بڑے گھر کے ہو۔"

"پیسے کی افراط دیکھ کر کہہ رہے ہیں؟" عبدالحق نے آزر[illegible] پوچھا۔

"نہیں میاں' پیسہ تو اب یہاں' ان لوگوں کے پاس بھ[illegible]نہیں بات کرنے کی تمیز نہیں۔" افضال صاحب نے جلدی سے کہا۔ "میں تو تمہارا [illegible] ارے طور طریقے دیکھ کر رشک کر رہا تھا۔ میں نے تم سے جو کردار ادا کرنے کو کہا' وہ تو تم وا[illegible]تمہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم نواب زادے نہیں ہو۔ وہی سخاوت اور دریا دلی' وہی وق[illegible]"

"لیکن اس کے باوجود جو کچھ آگے مجھے کرنا ہے' وہ میرے [illegible] مشکل ہے۔"

"یہ اضافی خوبیاں ہیں۔ یعنی نیک اور شریف بھی ہو۔"

ویٹر استری کیے ہوئے کپڑے لے آیا۔ "آپ اب نہا دھو[illegible] جائیں۔" عبدالحق نے افضال صاحب سے کہا۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس گیا اور باہر جھانکا۔ [illegible] ہوئی بگھی ان کے لیے تیار تھی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق افضال صاحب کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ شیروانی [illegible] وہ بہت وجیہہ لگ رہے تھے۔ ایسی شخصیت تھی ان کی کہ آدمی کی بات کرنے کی بھی ہمت [illegible] سوچنے لگا کہ لباس سے آدمی کی شخصیت پر کتنا اثر پڑتا ہے۔ اس نے نوٹوں کی خاصی مو[illegible] ان کے حوالے کر دی۔ افضال صاحب وہ لیتے ہوئے ایک لمحے کو جھجکے۔

وہ باہر نکلے اور بگھی میں جا بیٹھے۔ کوچ بان اب بہت زیادہ مؤدب ہو گیا تھا۔ یقیناً وہ افضال صاحب سے مرعوب ہوا تھا۔ "اب بتاؤ باؤ جی' کہاں جانا ہے؟" اُس نے عبدالحق سے پوچھا۔

لیکن جواب افضال صاحب نے دیا۔ اب مرکزی کردار انہیں ادا کرنا تھا۔ "شاہی بازار چلو میاں۔"

کوچ بان کو یہ اندازہ پہلے ہی سے تھا۔

افضال صاحب نے بگھی عین اس کوٹھے کے سامنے رکوائی' جہاں زرینہ کو دیکھا تھا۔ "اب بس تمہیں میرے اشاروں پر چلنا ہوگا۔" انہوں نے سرگوشی میں عبدالحق سے کہا۔ "تم یہیں بیٹھے رہو۔" یہ کہہ کر وہ بگھی سے اترے اور پان کی دکان کی طرف چل دیے۔

عبدالحق غور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار ان کی چال ڈھال سے یہ اعتماد جھلکتا نظر آیا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ بازار میں تقریباً سبھی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہ سجی ہوئی خوب صورت بگھی' اس پر افضال صاحب کا لباس اور ان کی شخصیت۔ یہ سب کچھ ان کے منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔

اگلے چند منٹوں میں کئی لوگ اس کی طرف آئے۔ "آؤ باؤ جی۔ تمہیں پرستان لے چلوں۔ باؤ جی نئی نئی کلیاں بھی ہیں۔" وہ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے' اور اس چکر میں تھے کہ اسے گھیر کر لے جائیں۔ عبدالحق نے جواب کسی کو نہیں دیا۔ بس منہ پھیر لیا۔ یہ اس منظرنامے کا وہ حصہ تھا' جس میں اسے اداکاری کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا ردِعمل قدرتی تھا۔

اُس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ لوگ افضال صاحب کو تاکنے لگے۔

افضال صاحب کا پان کی اُس دکان پر جانا بھی بے سبب نہیں تھا۔ پان کی یہ دکان اس بالا خانے پر جانے والے زینے کے ساتھ تھی' جس پر انہوں نے زرینہ کو دیکھا تھا۔ اور بگھی رکوانے کے بعد بھی وہ چند منٹ بگھی میں ہی بیٹھے رہے تھے۔ انداز ایسا تھا' جیسے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہوں' اور ہچکچا رہے ہوں کہ وہاں اتریں یا نہ اتریں۔ مگر درحقیقت وہ کن انکھیوں سے اس کوٹھے کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت زرینہ تو وہاں موجود نہیں تھی۔ مگر دوسری لڑکیاں بگھی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے ایک لڑکی کو اندر جاتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک ادھیڑ عمر عورت کو ساتھ لے کر آئی۔ ادھیڑ عمر عورت نے ایک نظر انہیں اور بگھی کو دیکھا اور پلٹ کر چلی گئی۔ افضال صاحب سمجھ گئے کہ تیر کارگر ہوا ہے۔ تب وہ بگھی سے اترے۔

اس وقت بھی وہ پان بنانے کا کہنے کے بعد کن انکھیوں سے اس زینے کو دیکھ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سے آنے والے دلالوں کو وہ جھڑک رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ زرینہ کے کوٹھے سے کوئی ان کے پاس ضرور آئے گا۔

ان کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس زینے سے ایک شخص اترا۔ نگران سے رابطہ کرنے کے بجائے وہ ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ افضال صاحب نے دیکھا، وہ روایتی دلال نہیں لگ رہا تھا۔ گو انہیں توقع کے مطابق خصوصی اہمیت دی جا رہی تھی۔ کوٹھے سے خاصے نستعلیق آدمی کو بھیجا گیا تھا۔

وہ پان لے کر پلٹے اور بگھی کی طرف بڑھے۔ اسی وقت کوٹھے سے اترنے والے شخص نے دھیمی آواز میں انہیں پکارا۔ ''حضرت، ذرا سنیے۔''

افضال صاحب رکے اور اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''جی...... فرمائیے۔''

''اوپر، باجی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔'' اس نے آنکھ سے کوٹھے کی طرف اشارہ کیا۔

''ضروری تو نہیں کہ ہم جائیں بھی۔'' افضال صاحب نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔

''ان کی التجا ہے لیکن مرضی تو آپ کی ہی چلے گی۔ ویسے میں یہ عرض ضرور کروں گا کہ پورے بازار میں آپ کو بائی جی کے بالا خانے جیسا ماحول کہیں نہیں ملے گا۔''

''اچھا'' افضال صاحب نے لفظ کو ذرا کھینچتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہم ایک بات بتا دیں۔ ہم یہاں صرف اپنے سب سے چھوٹے بھائی کی خاطر آئے ہیں۔'' انہوں نے بگھی میں بیٹھے عبدالحق کی طرف اشارہ کیا۔ ''ورنہ ہم بازار آنا پسند نہیں کرتے۔ یہ لڑکا بہت شرمیلا ہے اور ہم اس کے شرمیلے پن سے عاجز آ چکے ہیں۔ اس کی جھجک دور کرنے کی یہی ایک صورت سمجھائی دی تھی۔ ورنہ تو میاں، ہم وہ پیاسے ہیں، جس کے پاس ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے خود چل کر آتے ہیں۔''

''ہماری بائی جی نے یہ بات سمجھ کر ہی مجھے بھیجا ہے آپ کی پیشوائی کے لئے۔''

''اور ہمیں عزت بہت عزیز ہے۔ اور انکار سننے کے بھی ہم عادی نہیں۔ اپنی بائی جی سے ایک بار جا کر پوچھ آؤ۔''

''جو حکم سرکار کا۔'' اس شخص نے کہا اور الٹے پاؤں کوٹھے کی طرف چلا گیا۔

افضال صاحب وہیں کھڑے رہے۔ دو منٹ بعد ہی وہ شخص واپس آ گیا۔ ''بائی جی کہتی ہیں کہ آپ کی عزت و تکریم میں کوئی کمی نہیں ہو گی، اور وہ کہتی ہیں کہ کنیزوں کو انکار کرنا زیب نہیں دیتا۔''

افضال صاحب نے عبدالحق کو آنے کا اشارہ کیا......

❀ ❀ ❀

سب کچھ منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ بائی جی تو ان لوگوں کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ ان کی تواضع تو افضال صاحب نے رد کر دی تھی۔ ''ہمارے پاس پان موجود ہیں۔'' انہوں نے بڑی بے نیازی سے کہا تھا۔

''تو لڑکیوں کو بلواؤں۔''

''ایسے نہیں۔ ہمارے نزدیک ان لڑکیوں کی بھی عزت ہے۔'' افضال صاحب نے قدرت سخت لہجے میں کہا۔ ''انہیں بکاؤ مال سمجھ کر ہم ان کی عزت کم کریں گے تو ان سے خوشی بھی نہیں پا سکیں گے، اور ہم یہاں خوشی کے لئے آئے ہیں۔''

''سبحان اللہ'' بائی جی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''ایک عمر ہو گئی کوٹھے پر۔ آپ جیسا وضع دار آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ تو پھر آپ ہی بتائیے۔''

''آپ یہی لڑکیاں ایسے دکھائیں کہ لڑکیوں کو پتا نہ چلے۔ پھر منتخب ہم کر لیں گے۔'' افضال صاحب نے کہا۔ اب وہ نروس ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زرینہ نے انہیں دیکھا اور پہچان لیا تو ان سے لپٹ جائے گی اور معاملہ خراب ہو جائے گا۔ حالانکہ موجودہ وضع قطع میں اس بات کا امکان بہت کم تھا۔ وہ تو آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر خود کو بھی نہیں پہچان سکے تھے۔ مگر وہ ذرا سا خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

بائی جی نے اس کا اہتمام بھی کر دیا۔ افضال صاحب اور عبدالحق نے بغیر کسی دشواری کے زرینہ کو منتخب کر لیا۔

''اب آپ ان لڑکیوں کو واپس بھیج دیجئے۔'' افضال صاحب نے کہا۔ پھر بائی جی کو ایک الگ گوشے میں لے گئے اور سرگوشیوں میں اسے سمجھایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ اہتمام صرف لڑکیوں کی خواب گاہوں میں ہی ممکن ہے اور ویسے بھی آپ لوگوں کے شایانِ شان وہی کمرے ہیں۔ لیکن نواب صاحب، آپ نے اپنے لیے کچھ پسند نہیں فرمایا۔''

''ہم تو یہاں صرف بھائی کی خاطر آئے ہیں۔ ورنہ ہم تو اپنا شوق اپنے گھر میں ہی پورا کرنے کے قائل ہیں۔''

''تو کبھی دل چاہے تو ہمیں پکار لیجئے گا۔'' بائی جی نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

''ضرور۔ ہم آپ سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ آپ پنجاب میں بیٹھ کے لکھنؤ کے انداز میں کام کر رہی ہیں۔''

''بازار نہ علاقوں کا پابند ہوتا ہے نواب صاحب، نہ علاقوں تک محدود ہوتا ہے۔ اچھا، اب میں آپ کی خوش نودی کا بندوبست کرتی ہوں۔''

❀ ❀ ❀

عبدالحق بہت خوش تھا۔ اب تک اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ افضال صاحب نے سنبھالے رکھا تھا، اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے کمال کر دیا تھا۔ وہ ان کی پلاننگ پر حیران تھا۔ کیسی مکمل اور بے داغ پلاننگ کی تھی انہوں نے۔

اب بائی جی نے اسے اس کمرے میں بھیج دیا تھا۔ اُس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ ایک آراستہ کمرا تھا۔ بڑی سی مسہری، اُس کے سامنے سنگھار میز، پتا چلتا تھا کہ وہ ایک آباد کمرا ہے۔ پہلو والی دیوار میں شاید ایک دروازہ ہوگا، جس پر بھاری پردہ پڑا تھا۔

قدموں کی چاپ سن کر اُس نے سر گھمایا اور دروازے کی طرف دیکھا۔ زرینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ عبدالحق نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ بہت حسین لڑکی تھی لیکن ناخوش ہونے کی وجہ سے اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ اُس کے بجھے بجھے چہرے پر اداسی کی گہری تہ تھی۔

وہ آئی اور اُس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔

عبدالحق دروازے کی طرف گیا اور اسے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر وہ واپس آیا، اور مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ زرینہ اب بھی اسی طرح کھڑی تھی۔ ''آؤ زرینہ، یہاں آ کر بیٹھو۔'' اُس نے نرم لہجے میں کہا۔

''جی......'' زرینہ نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر اچانک سے احساس ہوا کہ گاہک نے اسے اُس کے اصل نام سے پکارا ہے۔ ورنہ بائی جی نے تو اس کا نام زہرہ رکھ دیا تھا۔ اور وہ اس میں خوش تھی کہ کم از کم اُس کے اصل نام کی آبرو تو بچ گئی۔

وہ تیزی سے اُس کے قریب آئی۔ مگر مسہری پر بیٹھی نہیں۔ ''آپ کون ہیں؟ آپ کو میرا نام کیسے معلوم؟ میں نے تو آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''ہاں۔ میں بھی تمہیں نہیں جانتا تھا لیکن افضال صاحب تو جانتے ہیں۔''

''کون افضال صاحب......''

''وہ مہاجروں کے کیمپ والے......''

''ارے چچا صاحب...... کہاں ہیں وہ۔'' وہ ایک دم پُرجوش ہوگئی۔

''اتنے زور سے مت بولئے۔'' عبدالحق نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ابھی تم ان سے ملو گی۔''

زرینہ کے چہرے پر بے یقینی تھی اور آنکھوں میں خوشی......

❁ ❁ ❁

ملحقہ کمرے میں افضال صاحب چند منٹ تو مسہری پر بیٹھے رہے۔ پھر وہ اٹھے اور انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ وہاں سے پلٹ کر وہ اس دروازے کی طرف گئے، جس پر پردہ پڑا تھا۔ انہوں نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ دروازہ بند تھا لیکن چٹخنی گری ہوئی تھی۔

انہوں نے دروازے کو اپنی طرف کھینچا۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ اس دوسرے کمرے میں داخل ہوگئے۔

زرینہ اور عبدالحق کی نظریں اسی دروازے پر جمی تھیں۔ زرینہ نے افضال صاحب کو دیکھا۔

چند لمحے تو وہ انہیں پہچان ہی نہیں سکی۔ پھر جب پہچان لیا تو سکتے کی سی کیفیت میں انہیں دیکھتی رہی۔

افضال صاحب آگے آئے اور اُس کے سامنے آ کر رک گئے۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی نگاہوں سے دلی اذیت جھلک رہی تھی۔

بالآخر زرینہ کا سکوت ٹوٹا۔ ''چچا صاحب، یہ سچ مچ آپ ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''یہ میں ہی ہوں میری بچی۔''

''آ...... آپ...... آپ یہاں کیسے؟''

''حالانکہ یہ سوال مجھے تم سے پوچھنا چاہئے۔'' افضال صاحب کے لہجے میں سنگینی در آئی۔

اتنا سننا تھا کہ زرینہ پھٹ پڑی۔ وہ اتنا روئی اور ایسے روئی کہ لگتا تھا، اب چپ نہیں ہوگی۔ اس گریے کو روکنا جیسے اُس کے اختیار میں نہیں تھا اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

عبدالحق تو اُس کے رونے سے بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ افضال صاحب نے بڑھ کر زرینہ کو لپٹا لیا تھا اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اسے خود پر قابو رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ''خود کو سنبھالو زرینہ۔ تمہارے رونے کی آواز باہر نہیں جانی چاہئے۔'' انہوں نے اسے سمجھایا اور پھر نرمی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

زرینہ کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ اور طبیعت جیسے ہی سنبھلی تو اُس نے پھر وہی سوال کیا۔ ''چچا صاحب، آپ یہاں کیسے؟''

''ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔''

زرینہ کو پھر رونا آنے لگا۔ ''یہ ناممکن ہے چچا صاحب۔ میں نے یہاں سے بھاگنے کی بہت کوشش کی اور ناکام ہونے پر بہت پٹی۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں آنے کے سو دروازے ہیں، اور باہر جانے کا ایک بھی نہیں۔''

''تم فکر نہ کرو میری بچی۔ ہم تمہیں اسی دروازے سے باہر لے کر جائیں گے، جس سے تم اندر آئی ہو۔'' افضال صاحب نے کہا۔ ''مگر تم یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں پہنچیں کیسے؟''

زرینہ پھر رونے لگی۔ افضال صاحب نے سہارا دے کر اسے مسہری پر بٹھا دیا۔ وہ دیر تک تکیے میں منہ چھپائے روتی رہی۔

جب دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو اس نے سر اٹھایا۔ افضال صاحب پاس بیٹھے اسے متوقع نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُس نے سر گھما کر دیکھا۔ عبدالحق ایک طرف کھڑا تھا۔ ایسا لگا کہ عبدالحق کی وہاں موجودگی کا اسے پہلی بار احساس ہوا ہے۔ ''یہ...... یہ کون ہیں چچا صاحب۔''

''سمجھ لو، میرا بیٹا ہے یہ...... تمہارا بھائی۔''

اس لمحے عبدالحق کے اندر جیسے کوئی کیمیاوی تبدیلی رُونما ہوئی۔ وہ اکیلا تھا...... والدین کی واحد اولاد۔ نہ کوئی بھائی نہ بہن۔ اس بات کا اسے بڑی شدت سے احساس ہوتا تھا۔ محرومی سی محسوس ہوتی تھی۔ بھائی کے لئے نہیں، البتہ بہن کے معاملے میں اسے بہت تجسس ہوتا تھا۔ کیسی ہوتی ہوگی بہن کی محبت؟ اور اکثر وہ سوچتا، کاش میری کوئی بہن ہوتی۔

اور اب افضال صاحب نے کسی ارادے کے بغیر اُس کے اور اس اجنبی لڑکی کے درمیان وہی رشتہ ٹانک دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ افضال صاحب نے یہ بات محض اُس بے بس اور مظلوم لڑکی کی دل جوئی کے لئے کی لیکن وَہ الفاظ سنتے ہی اُس کے دل میں جیسے محبت کا کوئی چشمہ سا پھوٹ نکلا۔ اُس نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا اور اس کے دل نے ایک پل میں اعلان کر دیا کہ وہ اُس کی بہن ہے۔

اسے یاد تھا، افضال صاحب نے بتایا تھا کہ اپنے گھر والوں میں یہ واحد لڑکی ہے، جو پاکستان پہنچ پائی ہے۔ اس کے تمام گھر والے شہید ہو گئے تھے۔ اب اُس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ اور اب بدقسمتی سے وہ اس دلدل میں آ پھنسی تھی۔ اگر ایسے میں اسے ایک بھائی مل جائے تو......

اسے احساس ہوا کہ زرینہ اسے دیکھ رہی ہے۔ ''جو کچھ افضال صاحب نے کہا، وہ میرے نزدیک رسمی بات نہیں۔'' اُس نے جلدی سے کہا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم مجھے ہمیشہ بھائی جیسا ہی پاؤ گی۔ میری کوئی بہن تھی بھی نہیں۔ آج اللہ کی رحمت سے وہ بھی مل گئی۔''

زرینہ کی آنکھیں ایک دم ڈبڈبا گئیں۔ ''ایسا نہ کہیں بھائی۔ میں اس قابل نہیں رہی۔ میرا سگا بھائی بھی زندہ ہوتا تو مجھے بہن کی حیثیت میں قبول نہ کرتا۔ آپ ایسا نہ کہیں بھائی۔''

''میں نے سوچ سمجھ کر کہی ہے یہ بات۔ میں ہر قیمت پر تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ اور میرا وعدہ ہے کہ آج کے بعد تم ایک باعزت زندگی گزارو گی۔''

زرینہ پھر رونے لگی۔

وہ چپ ہوئی تو افضال صاحب نے کہا۔ ''اب یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچیں۔''

زرینہ نے ایک پل عبدالحق کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

عبدالحق سمجھ گیا کہ وہ حجاب کی وجہ سے اُس کی موجودگی میں کچھ نہیں بتا سکے گی۔ ''میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آپ اطمینان سے بات کر لیں۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

وہاں مسہری پر بیٹھ کر وہ زرینہ کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ اور اسے حیرت ہوئی۔ کیا جوان بہن کا بھائی بن کر آدمی اتنا سمجھدار اور عقل مند ہو جاتا ہے۔ وہ اُس کے مستقبل کے بارے میں

با قاعدہ منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

وہ اُس وقت چونکا، جب افضال صاحب کمرے میں آئے اور اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ اُس نے دیکھا، ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔

''کیا معلوم ہوا؟'' اُس نے ان سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ کوئی اسے دھوکہ دے کر یہاں لایا تھا اور نائیکہ کے ہاتھوں بیچ کر چلا گیا۔''

عبدالحق کو لگا کہ افضال صاحب اپنی آواز پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''کسی نے اس سے کہا کہ ایک گھر ایسا ہے، جہاں اسے کام مل سکتا ہے۔ یہ اس آسرے میں آئی اور یہاں پھنس گئی۔''

''وہ تھا کون؟''

افضال صاحب نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔ ''یہ تو اسے بھی معلوم نہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔ ''وہ کوئی جاننے والا ہی ہوگا۔ کسی اجنبی کے ساتھ تو وہ نکلنے سے رہی۔''

''میں نے کہا نا کہ اسے معلوم نہیں۔'' افضال صاحب نے جھنجلا کر کہا۔ پھر کچھ احساس ہوا تو لہجہ نرم کرتے ہوئے بولے۔ ''ممکن ہے، وہ بتانا نہیں چاہتی ہو۔ میں نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔ تم بھی اس سے کچھ مت پوچھنا۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ پھر بھی میں اتنا جانتا ہوں کہ کوئی بھائی اپنی بہن سے اس طرح کی بات نہیں پوچھتا۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''اب یہ بتایئے؟ کرنا کیا ہے؟''

''کرنا کیا ہے؟ بس اسے یہاں سے لے کر نکلتے ہیں۔''

''اور کہاں جائیں گے؟''

''کیمپ جائیں گے، اور کہاں۔''

''تو کیمپ میں زرینہ اپنے اتنے دن غائب رہنے کے بارے میں کیا بتائے گی۔ دیکھیں نا، لوگ تو پوچھیں گے۔''

''ہاں، یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد بھی یہ بچی رسوا ہو، یہ تو میں نہیں چاہوں گا۔''

''اور ویسے بھی میں اپنی بہن کو کیمپ میں تو نہیں رکھوں گا۔'' عبدالحق کے لہجے میں قطعیت تھی۔

افضال صاحب نے اسے بہت غور سے دیکھا، جیسے اسے تول رہے ہوں۔

”جی ہاں، اب وہ میری بہن ہے۔ میں نسلاً راج پوت ہوں، جو کہتا ہوں، وہ کرتا بھی ہوں۔ اور غیرت کی ہمارے نزدیک بڑی اہمیت ہے۔“

افضال صاحب اب بھی اسے گھور رہے تھے۔

بات عبدالحق کی سمجھ میں آ گئی۔ جہاں دیدہ افضال صاحب اس پر شک کر رہے تھے کہ کہیں وہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا تو نہیں۔ توہین کے احساس سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا لیکن اُس نے خود کو روک لیا۔ افضال صاحب اِس پر بھی شک کر رہے تھے تو یہ ان کے خلوص اور دردمندی کا ثبوت تھا۔ بس اس نے اتنا کیا کہ ان کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتا رہا۔

چند لمحے اسی طرح گزرے۔ پھر اچانک افضال صاحب کی آنکھوں سے جیسے شک کا غبار دھل گیا۔ وہ خفت آمیز انداز میں مسکرائے۔ ”مجھے معاف کر دینا میاں، میں تم پر شک کر رہا تھا۔ مگر اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ یہ لڑکی خوش قسمت ہے کہ اسے تم مل گئے۔ اب یہ انشاء اللہ محفوظ رہے گی۔“

عبدالحق نے ان کی معذرت کو نظرانداز کر دیا۔ ”تو پھر اسے لے کر کہاں جائیں گے؟“

”اب تو ہوٹل ہی رہ جاتا ہے۔“

”تو ہوٹل کے لوگ بھی کچھ اچھا تو نہیں سوچیں گے...... نہ اس کے بارے میں، نہ ہمارے بارے میں۔“

”واقعی، یہ تو بڑا مسئلہ ہے۔“

”جب آپ زرینہ سے بات کر رہے تھے تو میں اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر میں کوئی عہد کر کے گھر سے نہ نکلا ہوتا تو میں اسی وقت اسے اپنے گھر لے جاتا۔ وہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اب ایک ہی صورت ہے۔ جب تک میں گاؤں واپس نہیں جاتا، یہ ہماری امانت کے طور پر مسعود صاحب کے پاس، ان کے گھر میں رہے گی۔“

”بڑے صاحب کے گھر؟“

”جی ہاں...... وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ رہے گی...... چبھتے ہوئے سوالوں سے بھی۔ اور جب میں گاؤں جاؤں گا تو اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

افضال صاحب نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”اس عمر میں تم مجھ سے زیادہ عقلمند ہو میاں۔“

”یہ بات نہیں۔ اصل میں آپ تو صرف ایک نکتے پر مرتکز تھے، اور اس میں خوش تھے...... کہ زرینہ کو یہاں سے نکالنا ہے۔ آگے کے بارے میں خیال ہی نہیں آیا آپ کو۔ اچھا...... اب یہ بتائیں کہ اگر آج ہم زرینہ کو یہاں چھوڑ دیں تو کوئی حرج تو نہیں؟“

افضال صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیوں...... ایسی کیا بات ہے؟“

”رات ہو گئی ہے۔ مجھے مسعود صاحب کے گھر کا پتا بھی نہیں معلوم۔ وہ کیمپ جا کر اخلاق سے معلوم کرنا ہو گا۔ اس میں بھی وقت لگے گا۔ تو اتنا بے وقت مسعود صاحب کے ہاں جانا اچھا نہیں لگے گا۔ ہمیں ان کو سوتے سے اٹھانا ہو گا۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔“ افضال صاحب نے کہا اور کچھ سوچنے لگے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا اور بولے۔ ”لیکن میاں، زرینہ کو مزید یہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ یہ بازارِ حسن ہے۔ یہاں جو پل آپ کے پاس ہے، بس وہی آپ کا ہے۔ کون جانے، کل ہم یہاں آئیں تو زرینہ یہاں موجود ہی نہ ہو۔ اور میاں، ابھی تو بڑے سخت مرحلے سے گزرنا ہے۔ یہ لوگ ہر روز سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو بیچنا خسارے کا سودا سمجھتے ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ عبدالحق نے کہا۔ ”تو آپ اسی مرحلے کی فکر کریں۔ میں آگے کی سوچتا ہوں۔“

”بس تم اس کمرے میں چلے جاؤ۔“ افضال صاحب بولے۔

عبدالحق دوسرے کمرے میں چلا گیا اور پردہ برابر کر دیا۔ افضال صاحب نے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

❁ ❁ ❁

مشتری بیگم بہت خوش تھی۔ دھندا اچھا چل رہا تھا۔ مگر ایسا گاہک مدت کے بعد نصیب ہوا تھا۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھی۔ آدمی کو ایک نظر میں تول لیتی تھی۔ کوٹھے پر سے نواب صاحب کو ایک نظر دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ تگڑی اسامی ہے۔ مستقل ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔ یہی سوچ کر اُس نے بشارت کو نیچے بھیج دیا تھا۔

اور نواب صاحب اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اوپر آئے تو اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ دونوں بھائیوں میں عمر کا فرق بہت زیادہ تھا۔ چھوٹے کو ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ نیا پنچھی ہے۔ بہت شرمیلا تھا۔ نظر ہی نہیں اٹھ رہی تھی اس کی۔

اور نواب صاحب واقعی بڑے وضع دار آدمی تھے۔ مشتری بیگم کو ان کا لڑکی منتخب کرنے کا انوکھا انداز بہت بھلا لگا۔ ورنہ زندہ گوشت کے اس بازار میں تو بس بھیڑیے ہی آتے ہیں۔ اور بھیڑیوں کی بھوک کا تہذیب سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

لیکن ایک بات اسے عجیب لگی۔ انہوں نے الگ لے جا کر جو اُس سے فرمائش کی، اُس نے اسے چونکا دیا۔ ایسا کمرا، جس کا دروازہ دوسرے کمرے میں بھی کھلتا ہو۔ تاکہ وہ اپنے بھائی کو دیکھ سکیں۔ اس کی وضاحت کے طور پر انہوں نے اپنے بھائی کے شرمیلے پن کو پیش کیا لیکن تجربہ کار

مشتری بیگم سمجھ سکتی تھی۔ کہ پس پردہ اور بھی کچھ ہے، اور وہی اصل بات ہے۔

پھر ایک بات مشتری بیگم کو اور کھٹکی وہ یہ کہ نواب صاحب نے اپنے لئے کوئی لڑکی منتخب نہیں کی۔ ایک لمحے میں مشتری بیگم نے یہ بات سمجھ لی کہ دونوں باتوں کا آپس میں کچھ تعلق ہے۔ اور پھر وہ تعلق بھی اُس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہاں دو امکانات تھے، اور دونوں ہی اتنے قوی تھے کہ وہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دے سکتی تھی۔

مرد کی نفسیات کو طوائف سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ مشتری بیگم نے سمجھ لیا کہ پسِ پردہ دو میں سے ایک بات ضرور ہے۔ یا تو دونوں بھائی ایک ہی کشتی میں سفر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ایک ٹکٹ میں دو مزے والی بات نہیں۔ نواب صاحب پیسے نہیں بچا رہے تھے، بلکہ لطف دوبالا کر رہے تھے۔ اور یہ بات ایک طوائف ہی سمجھ سکتی تھی۔ عیش کی کثرت اور تواتر مرد کو تنوع پر اکساتا ہے، اور وہیں سے بے راہ روی کا آغاز ہوتا ہے۔ ایسے میں آدمی بھائی کیا، اپنے بیٹے کے ساتھ بھی شاملِ تفریح ہو جاتا ہے۔ دونوں بھائی ایک ساتھ دادِ عیش دیں، ایک ہی لڑکی کے ساتھ، تو بڑے بھائی کے لے وہ سنسنی خیز تجربہ ہوگا۔ البتہ چھوٹے بھائی کو خفت اور کوفت ہوگی۔ اور کیا پتا، یہی چھوٹے بھائی کے شرمیلے پن کا سبب ہو۔

لیکن مشتری بیگم کو دوسرا امکان زیادہ قوی لگا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ نواب صاحب کثرتِ عیش کی وجہ سے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ ایسے میں آدمی اس حال کو بھی پہنچ جاتا ہے کہ کسی دوسرے کو مشغول دیکھ کر اُس کی تسکین ہو جائے۔ اور پھر وہ دوسرا اپنا ہی بھائی ہو تو سونے پر سہاگہ۔

دوسری طرف مشتری بیگم اس میں بھی خوش تھی کہ نواب صاحب نے زرینہ کو منتخب کیا۔ زرینہ بلاشبہ بہت حسین تھی لیکن بازار میں روتا بسورتا حسن نہیں چلتا۔ اُس نے زرینہ کو بہت سمجھایا، سختی بھی کی لیکن بات نہیں بنی۔ جس عمر میں لڑکیاں جوالا مکھی ہوتی ہیں، زرینہ برف کی مورت تھی۔ ہر گاہک خوش خوش اس کے ساتھ جاتا، مگر مشتعل واپس آتا۔ پروانہ تو جلنا پسند کرتا ہے۔ برفستان میں وہ کب پہنچتا ہے۔ ایک گاہک نے تو جھنجھلا کر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ بائی، مجھے تو لگ رہا تھا، میں اپنے ساتھ ہی زیادتی کر رہا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ پرانے گاہک تو اب زرینہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ وہ زیادہ تر فارغ بیٹھی رہتی۔ کبھی کوئی نیا گاہک آتا تو پہلی اور آخری بار اسے ساتھ لے جاتا۔ اب تو مشتری کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ جمیل سے 50 روپے میں اس لڑکی کو خرید کر اُس نے خسارے کا سودا کیا تھا۔

"بائی جی......"

اُس نے چونک کر دیکھا۔ دروازے میں بشارت کھڑا تھا۔ "کیا بات ہے بشارت؟"

"وہ بائی جی، نواب صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"

مشتری بیگم پریشان ہوگئی کہ کہیں زرینہ نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کر دی۔ اُس نے دل میں سوچ لیا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ اسے صحیح معنوں میں اس بازار کے کسی قسائی کے ہاتھ بیچ دے گی۔ جان تو چھوٹے۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو نواب صاحب گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے مسہری پر نیم دراز تھے۔ وہ ان کے سامنے دست بستہ کھڑی ہوگئی۔ "کیا حکم ہے نواب صاحب۔"

"بیٹھ جاؤ تو سکون سے بات کریں۔"

مشتری بیگم کا دل اور زور سے دھڑکا۔ تاہم اُس نے کرسی کھینچی اور بیٹھ گئی۔ "جی فرمایئے۔"

"بھئی......اس لڑکے نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔"

مشتری بیگم کو پہلے تو لگا کہ نواب صاحب نے لڑکی کہا ہے، گویا زرینہ کی شکایت ہے۔ "کیا ہوا؟ کچھ فرمایئے تو۔"

"اس کا شرمیلا پن ختم ہی نہیں ہوتا کسی طرح۔ ویسے اتنا تو ہوا کہ اس لڑکی سے مانوس ہو گیا ہے وہ۔"

اب مشتری بیگم کی سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے بھائی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ اُس نے سکون کی سانس لی۔ "چلیں، اتنا تو ہوا۔" اُس نے دلاسہ دینے والے انداز میں کہا۔ "آتے رہیں گے یہاں تو کھل ہی جائیں گے۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ لڑکی سے تو وہ کھل گیا ہے لیکن یہ جگہ اسے قبول نہیں۔"

"اوہ......" بات کچھ کچھ مشتری بیگم کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ "تو میرے لئے کیا حکم ہے۔"

"حکم کا تو یہاں موقع نہیں۔ ایک استدعا ہے۔"

"میرے لئے تو وہ بھی حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

"آپ اس لڑکی کو ہمیں دے دیں۔"

مشتری بیگم کا دماغ سرپٹ دوڑنے لگا۔ یہ تو وہ سمجھ چکی تھی کہ زرینہ اس کے مطلب کی نہیں۔ یہ بات تو اسے پہلی نظر میں ہی سمجھ لینی چاہئے تھی لیکن وہ اُس کے حسن پر ریجھ گئی تھی۔ اب یہ جان چھڑانے کا موقع مل رہا تھا لیکن بہرحال کاروبار کی وہ پکی تھی۔ اس نے منہ پکا کر کے کہا۔ "آپ تو جانتے ہی ہیں نواب صاحب کہ ہم اپنا مال کرائے پر دیتے ہیں۔ ایسے بیچنے لگیں تو پھر خالی دکان میں بیٹھ کر مکھیاں ہی ماریں گے۔"

"تو یہاں خریدنے کے لئے آتا ہی کون ہے۔" نواب صاحب نے بھی بے رخی سے کہا۔ "مجبوری نہ ہوتی تو ہم بھی یہ بات نہ کرتے۔ خیر...... یہ تو معلوم ہو گیا کہ صاحبزادے کا شرمیلا پن کیسے ختم ہوگا۔ لڑکیاں تو بازار میں بہت۔ اس سے بھی اچھی مل جائیں گی۔" وہ اٹھ کر بیٹھے۔

جیسے جانے کے لئے تیار ہو رہے ہوں۔

مشتری بیگم گڑبڑا گئی۔ "آپ خفا کیوں ہوتے ہیں نواب صاحب......"

"ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم انکار سننے کے عادی نہیں۔"

"تو میں نے انکار کب کیا ہے۔"

"تو پھر بتاؤ، کیا پیش کریں۔"

"کوئی اور ہوتا تو میں اس لڑکی کو ایک لاکھ میں بھی نہ دیتی۔ پر معاملہ آپ کا ہے۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ چاہتی ہوں کہ آپ سے تعلق ہمیشہ بنا رہے۔ آپ جیسے قدردان تو قسمت سے ملتے ہیں۔"

نواب صاحب کچھ مضطرب نظر آنے لگے۔ "میری بات کا جواب دو بائی جی۔"

"آپ ایک ہزار دے دیجئے۔"

نواب صاحب کا ہاتھ بے ساختہ شیروانی کی اندر والی جیب کی طرف لپکا لیکن پھر رک گیا، اور وہ شیروانی کے بٹن کو انگلی سے تھپتھپانے لگے۔ "ایک ہزار روپے کا مطلب بھی سمجھتی ہو بائی جی؟" انہوں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

مشتری بیگم نے ہاتھ کی وہ حرکت دیکھ لی تھی۔ چنانچہ وہ ڈٹ گئی۔ "عزت کے علاوہ سب کچھ دے رکھا ہے حضور اللہ نے......عزت ہوتی تو ہم بھی نواب ہوتے نواب صاحب۔"

"بہت گستاخانہ جواب دیا ہے تم نے۔" نواب صاحب نے بہت نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن ہم تمہیں بتا دیں، ایک چیز اور ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے......عزت کے علاوہ۔ اور وہ ہے طاقت۔ طاقت سمجھتی ہو تم؟ اس کوٹھے کو اجڑنے میں ایک گھنٹا بھی نہیں لگے گا لیکن ہم خریدنے کی چیز کو خریدنے کے قائل ہیں، چھیننے کے نہیں۔"

لفظ منہ سے نکلتے ہی مشتری بیگم کو غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ نواب صاحب کی بات سن کر تو وہ دہل گئی۔ اُس نے جلدی سے نواب صاحب کے پاؤں پکڑ لئے۔ "مجھ سے بے دھیانی میں بہت بڑی بھول ہو گئی نواب صاحب۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔"

"معاف تو جب کریں کہ سزا دینے کا کوئی ارادہ ہو۔ ہمارا مقام یہ نہیں کہ تم جیسوں سے الجھیں۔"

"آپ کا ناراض ہونا ہی میری سزا ہے۔ جب تک آپ معاف نہیں کریں گے، میں آپ کے پاؤں نہیں چھوڑوں گی۔"

"جاؤ، معاف کیا۔ اس لئے کہ غلطی ہماری بھی ہے۔ کچھ خریدتے ہوئے مول تول ہم کبھی نہیں کرتے۔ بس، یہ لڑکی ہمیں کچھ اتنی زیادہ پسند نہیں، اس لئے اتنی بات بھی ہو گئی۔"

"مگر میں اب آپ سے دھیلا بھی نہیں لوں گی۔ اور لڑکی آپ کی ہوئی۔"

"تم پھر گستاخی کر رہی ہو۔ اب تو ہم تمہیں ایک ہزار ہی دیں گے۔" نواب صاحب نے شیروانی کی اندر کی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ایک ہزار گن کر اس کے سامنے ڈال دیے۔

مشتری بیگم نے دکھاوے کی خاطر خاصی بحث کی اور بالآخر نواب صاحب کے احترام میں رقم قبول کر لی۔ "اس سے بہتر ہوتا نواب صاحب کہ آپ اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر لے جاتے۔ دل بھر جاتا تو مجھے ہی واپس دے جاتے۔ آخر ایک دن اس سے دل تو بھر ہی جائے گا نا چھوٹے سرکار کا۔"

"تم نے پھر گستاخی کی بائی جی۔ دل بھر جانے پر بھی ہم کوئی چیز نہ پھینکتے ہیں، نہ دکاندار کو واپس دیتے ہیں۔ دل بھر جائے گا اس سے تو یہ ہمارے گھر میں کام کاج کرے گی۔ ویسے بھی کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آ ہی جاتا ہے۔ اب تم ایسا کرو، ایک بڑی چادر لا دو ہمیں۔"

مشتری بیگم نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ اب کچھ پوچھنے کی ہمت تو اُس میں نہیں رہی تھی۔

"دیکھو نا، ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔ یہاں رونقیں شباب پر ہوں گی۔ ہم اس لڑکی کی نمائش تو نہیں کریں گے۔ ہم تو یہ بھی نہیں چاہیں گے کہ اب اس پر کسی کی بری نظر بھی پڑے۔"

"سوائے ہمارے"۔ مشتری نے دل ہی دل میں گویا ان کی بات مکمل کی۔ "جی...... بہت بہتر۔" اُس نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ اس نے ایک بار بھی درمیانی دروازے پر پڑے پردے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتی تو شاید اسے وہ دو بڑی بڑی آنکھیں نظر آ جاتیں، جو پردے کی جھری سے جھانک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں حیرت تیر رہی تھی۔ اور تیر اس لیے رہی تھی کہ ان میں آنسو بھرے تھے۔

❁......❁......❁

بگھی والے کے اندازے کے مطابق اسے وہاں کھڑے تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ اس دوران وہ بس ایک بار بگھی سے اترا تھا، جب اسے بھوک لگی تھی۔ مدت سے اسے دودھ جلیبی کی آرزو تھی۔ آج پیسوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اُس نے سامنے دودھ کی دکان پر دودھ جلیبی کا آرڈر دیا۔ پھر سیر ہو کر کھایا پیا۔ اُس کی روح تک خوش ہو گئی تھی۔

پھر اُس نے اپنی سواریوں کو زینے سے نکلتے دیکھا تو نیچے اتر آیا۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی...... بڑی سی چادر میں لپٹی۔ اور اسی چادر کا گھونگھٹ سا نکالے۔ بڑے میاں نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

وہ تینوں بگھی میں بیٹھے تو کوچ بان نے جلدی سے پردے کھینچ دیے۔ عبدالحق نے اسے

کیمپ کا پتا بتایا۔ ٹیکسی چل دی۔
عبدالحق نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بجے تھے۔ اُس نے سوچا، مسعود صاحب کے گھر پہنچتے پہنچتے گیارہ بج جائیں گے۔
بازار میں تو رونق پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن رات ہونے کا احساس بازار سے نکلنے کے بعد ہوا۔ ہر طرف سکوت تھا۔ کبھی کوئی اکا دکا راہ گیر یا تانگہ نظر آ جاتا تھا۔
عبدالحق نے کیمپ کے باہر ٹیکسی رکوائی اور کیمپ کے دفتر کی طرف لپکا، جو رات کے وقت اخلاق کی خواب گاہ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اخلاق جاگ رہا ہے۔
"ارے...... تم ابھی سوئے نہیں؟"
"ہاں...... کام میں لگا ہوا تھا۔" اخلاق نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "بس اب سونے جا رہا ہوں۔"
"مجھے مسعود صاحب کا پتا چاہئے۔"
"بڑے صاحب کا پتا؟ اتنی رات کو! خیر تو ہے؟"
"سب خیریت ہے۔ بس مجھے اسی وقت ان سے ملنا ہے۔"
"ایسی کیا بات ہے۔ صبح مل لینا۔"
"نہیں اخلاق بھائی، بہت ضروری بات کرنی ہے ان سے۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر اسے پریشان دیکھ کر تسلی دی۔ "یقین کرو، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بلکہ خوش خبری ہی ہے۔"
اخلاق سے مسعود صاحب کا پتا اچھی طرح سمجھنے کے بعد وہ واپس آیا اور کوچ بان سے کہا۔
"اب مغل پورے چلنا ہے۔"
مسعود صاحب کے مکان تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مکان کیا، وہ وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ گیٹ بند تھا لیکن اندر چوکی دار موجود تھا۔ عبدالحق نے اُس سے کہا۔ "ہم مسعود صاحب کے مہمان ہیں......"
"صاحب تو سو چکے ہوں گے۔" چوکی دار نے کہا۔
عبدالحق ایک لمحے کو ہچکچایا۔ اخلاقی طور پر یہ زیادتی تھی۔ مگر وہ جس طرح کی صورت حال میں تھے، اس میں یہ جائز لگ رہی تھی۔ اُس نے چوکی دار سے بارعب لہجے میں کہا۔ "ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ تم صاحب کو جگا دو۔ میرا وعدہ ہے کہ صاحب ناراض نہیں ہوں گے۔"
"آپ کا نام؟"
"کہنا کہ عبدالحق آیا ہے۔"
چوکی دار اندر چلا گیا۔ عبدالحق کو ایک بات کا خیال آیا تو اُس نے ٹیکسی میں بیٹھے افضال

صاحب سے پوچھا۔ "بڑے صاحب زرینہ کو پہچانتے تو نہیں ہیں؟"
افضال صاحب نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ وہ اسے پہچان سکیں گے۔ کیمپ میں ہزاروں افراد ہوتے ہیں...... اور پھر لڑکی......" تاہم اتنا کہہ کر انہوں نے سوالیہ نظروں سے زرینہ کو دیکھا۔
"میرا ان کا سامنا دو ایک بار ہی ہوا ہوگا۔ وہ مجھے کیسے پہچان سکتے ہیں۔"
چوکی دار کوئی پانچ منٹ بعد واپس آیا اور اُس نے گیٹ کھول دیا۔ اُس کے ساتھ مسعود صاحب بھی تھے۔ عبدالحق نے انہیں سلام کہا۔ جواب دیتے ہوئے انہوں نے اسے لپٹا لیا۔
"مجھے شرمندگی اور افسوس ہے کہ ناوقت آپ کو زحمت دی۔" عبدالحق نے معذرت کی۔
"ارے نہیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ تو اپنے گھر تو آدمی جب چاہے آ سکتا ہے۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "یہ بتاؤ، خیریت ہے نا؟"
"جی الحمد للہ۔ بلکہ میں تو اچھی خبر کے ساتھ آیا ہوں مگر اسی سلسلے میں آپ کی فوری مدد کی ضرورت ہے۔"
"میں حاضر ہوں۔"
"مجھے میری بچھڑی ہوئی بہن مل گئی ہے مسعود صاحب۔ میں کچھ دن کے لئے اسے آپ کے پاس چھوڑنا چاہتا ہوں۔ گاؤں جاتے ہوئے ساتھ لے جاؤں گا۔"
"یہ تو میرے لئے اعزاز ہوگا کہ میں تمہارے کسی کام آیا۔" مسعود صاحب نے کہا۔ پھر غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "لیکن تم تو یہاں کسی رضوان صاحب کی تلاش میں آئے تھے۔"
"جی ہاں، ان کی بھی تلاش ہے مجھے لیکن بہن کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ اُس کا اعلان بھی نہیں کیا جا سکتا۔"
مسعود صاحب مطمئن نظر آنے لگے۔ "ہاں۔ یہ تو ہے۔ خیر...... تم بہن کو لے کر آؤ۔ میں بچوں کو جگاتا ہوں۔"
یوں عبدالحق کے لئے اور آسانی ہو گئی۔ پروگرام کے مطابق افضال صاحب ٹیکسی میں ہی بیٹھے رہے۔ زرینہ اتر کر عبدالحق کے ساتھ کوٹھی میں چلی گئی۔

❀ ❀ ❀

"اب ہمیں ہوٹل لے چلو۔" عبدالحق نے باہر آ کر ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔
"ہوٹل کیوں......" افضال صاحب نے معترضانہ انداز میں کہنا چاہا۔
عبدالحق نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔
افضال صاحب زرینہ کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتے تھے لیکن خاموش رہے۔
ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رکی۔ وہ دونوں نیچے اترے۔ عبدالحق نے کوچ بان کو دس روپے

دیے۔ ''یہ کیا باؤ جی، پانچ روپے تو آپ نے پہلے ہی دے دیے تھے۔'' کوچ بان نے کہا۔

''رکھ لو۔ خوشی سے دے رہا ہوں۔ تم نے ہمارا ساتھ بھی تو دیا ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔ پھر بولا۔ ''ایک بات مانو گے میری؟''

''بولا باؤ جی۔''

''آج جو کچھ بھی دیکھا ہے، سنا ہے اور سمجھا ہے، اسے بھول جانا، کبھی زبان پر نہ لانا۔''

''آپ لوگوں کو تو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا باؤ جی۔'' کوچ بان آب دیدہ ہو گیا۔ ''اور یہ وعدہ کہ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں کچھ بھی نہیں جانتا باؤ جی، پر اتنا سمجھتا ہوں کہ آپ نے آج مجھے ایک نیکی میں شریک کر لیا ہے۔''

''بس اب تم جاؤ۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے آئے۔ وہاں عبدالحق نے افضال صاحب کو سمجھایا کہ نواب کی حیثیت میں وہ کیمپ میں جاتے تو چہ میگوئیاں ہوتیں۔ اور یہ کہ اسی لئے اس نے مسعود صاحب سے ان کا سامنا نہیں ہونے دیا۔

افضال صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تم بہت عقل مند ہو میاں۔ اور تم نے ہر لمحہ زرینہ کی عزت کا خیال رکھا ہے۔''

''بھائیوں کو بہنوں کی عزت کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اب آپ سو جائیے۔''

عبدالحق بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ صبح چار بجے وہ تہجد کے لئے اٹھا تو افضال صاحب جاگ رہے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کیمپ میں بھی کہاں سوتے تھے۔

صبح انہوں نے ہوٹل میں ہی ناشتہ کیا۔ پھر عبدالحق نے کہا۔ ''اب کیمپ چلیں گے۔ مسعود صاحب سے زرینہ کی خیریت بھی پوچھنی ہے۔''

افضال صاحب نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ''تو اب میں زرینہ کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں؟''

''بالکل۔ اب وہ میری بہن ہے، اور زندگی کی آخری سانس تک میری ذمہ داری ہے۔''

باہر آ کر عبدالحق نے کیمپ کے لئے تانگہ کیا۔ مگر افضال صاحب نے کیمپ جانے سے انکار کر دیا۔ ''میں تو اپنی روز کی آوارہ گردی پر نکلوں گا میاں، یہ میرے کپڑے میرے ٹرنک میں رکھ دینا۔ بلکہ اب یہ سب کچھ تمہارا ہے۔''

عبدالحق نے زبردستی ان کی جیب میں دس روپے ڈال دیے۔ ''تو پھر شام کو ملاقات ہو گی؟''

''دیکھو میاں، کیا ہوتا ہے۔ آدمی کو تو آنے والے پل کا علم بھی نہیں ہوتا۔''

ان کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔ عبدالحق نے غور سے انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کہیں گہرائی میں اسے وحشت سی مچلتی نظر آئی۔ یا پھر وہ اُس کا وہم تھا۔ اگلے ہی لمحے افضال صاحب پلٹے اور مخالف سمت میں چل دیے۔ ان کی چال میں تیزی تھی۔

عبدالحق چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر تانگے میں بیٹھ گیا۔ ''چلو بھائی۔''

❁ ❁ ❁

زبیر کو حسن دین سے معلومات حاصل کر کے نکلنے میں دیر ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں لاہور پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ اس وقت کیمپ جانا مناسب نہیں تھا۔ اسٹیشن کے باہر اُس نے چار پائی، تکیہ اور چادر لے کر رات گزاری، اور صبح ہوتے ہی کیمپ کا رخ کیا۔

کیمپ میں عبدالحق موجود نہیں تھا، وہ سیدھا مسعود صاحب کے پاس چلا گیا۔

''رات عبدالحق کافی دیر سے میرے پاس آئے تھے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ پھر زبیر کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ان کی کھوئی ہوئی بہن مل گئی ہے۔''

زبیر اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔ مگر اگلے ہی لمحے اُس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر صاحب نے کسی کو اپنی بہن کے بارے میں بتایا ہے، جبکہ ان کی کوئی بہن ہی نہیں، تو یہ ضروری ہی ہوگا۔ اسے کوئی بات بنانی ہوگی۔

''تم تو ایسے چونکے، جیسے اس بات سے بھی بے خبر ہو کہ ان کی کوئی بہن بھی ہے۔'' مسعود صاحب نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ رات سے ہی بے چین تھے۔ یہ بات نہیں کہ انہیں عبد الحق پر اعتبار نہیں تھا۔ لیکن وہ اتنا کچھ دیکھ چکے تھے کہ ہر بات پر شبہ کرنا ان کی عادت بن گیا تھا۔ عبد الحق بہر حال جوان آدمی ہے، اور اس دور میں بدنصیب لڑکیاں کٹی ہوئی پتنگوں کی طرح ڈولتی پھر رہی ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ عبدالحق پوری طرح خود مختار آدمی ہے۔ کون جانے، وہ اس لڑکی کو...... بہر حال وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی انہیں کسی ایسے ویسے معاملے میں استعمال کرے۔

''میں اس پر حیران ہوں کہ انہوں نے آپ کو یہ بات کیسے بتا دی۔ یہ بات تو وہ کسی کو بھی نہیں بتا سکتے تھے۔'' زبیر کو بھی نکتہ سوجھ ہی گیا۔

مسعود صاحب ایک دم مطمئن نظر آنے لگے۔ ''ارے...... وہ میرا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اور مجھے بھی وہ بہت عزیز ہیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب دیکھو نا، انہوں نے صرف مجھے بتایا ہی نہیں، بلکہ زرینہ کو میرے گھر پر چھوڑ گیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ ابھی گاؤں واپس نہیں جا سکتے۔ اب زرینہ کو وہ کیمپ میں تو نہیں رکھ سکتے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے اپنا سمجھا۔''

زبیر کے لئے وہ انکشاف پر انکشاف تھا۔ مگر اب وہ پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ ''تب تو ٹھیک ہے۔ انہیں آپ کو بتانا ہی تھا۔''

"اور سناؤ...... تمہارے گاؤں میں پانی پہنچ گیا؟"

"جی ہاں جناب۔"

"اب اسے گاؤں نہیں، قصبہ کہنا چاہئے۔ آنے والے وقتوں میں وہ اچھا خاصا شہر ہوگا۔"

"جی...... جی ہاں۔"

وہ دونوں حق نگر کی صورت حال کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ عبدالحق آ گیا۔ زبیر کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ "ارے زبیر...... تم کب آئے۔" پھر وہ پریشان ہو گیا۔ "گھر میں سب خیریت ہے نا؟"

"سب ٹھیک ہے صاحب۔ بس مجھے اماں نے بھیجا ہے۔" زبیر نے معذرت طلب نگاہوں سے مسعود صاحب کو دیکھا۔ "آپ اجازت دیں تو......"

مسعود صاحب مسکرائے۔ "تم ان سے بات کرلو۔ میرے پاس فرصت سے آنا۔"

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ زبیر نے سکون کی سانس لی۔ وہ صحیح معنوں میں بڑی مشکل میں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسعود صاحب اس کی موجودگی میں اس کے صاحب سے اُس کی بہن کے بارے میں بات کریں، اور صاحب کو شرمندگی ہو۔ دوسری طرف وہ صاحب سے بھی اس سلسلے میں کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ خود ہی بتائیں تو بتائیں۔

وہ ایک تنہا گوشے میں جا بیٹھے۔ عبدالحق کو اس پر حیرت تھی کہ زبیر بہت بدلا بدلا لگ رہا ہے۔ جس انداز میں اُس نے مسعود صاحب سے معذرت کی تھی، وہ اُس کی پرانی شخصیت سے متصادم تھا۔

"صاحب، اماں نے کہا ہے کہ آپ اب گھر واپس آجائیں۔" زبیر نے کہا۔

عبدالحق کو دوسری حیرت ہوئی...... صاحب! اُس نے بات جیسے سنی ہی نہیں۔ "میں دیکھ رہا ہوں زبیر کہ آپ بہت بدل گئے ہیں۔ جس طرح آپ نے میرے ساتھ علاحدگی میں بات کرنے کے لئے مسعود صاحب سے بات کی اور اب آپ مجھے صاحب کہہ رہے ہیں۔"

"بس سیکھ رہا ہوں صاحب۔ اب دیکھیں نا، مالک تو بس اللہ کی ذات ہے۔ میری عادت تھی آپ کو مالک کہنے کی۔ کسی سے میں نے یہ لفظ سنا اور آپ کے لئے پسند کرلیا۔ آپ کو برا تو نہیں لگا۔"

"مجھے تو یہی اچھا لگے گا کہ آپ میرا نام لیں۔"

"یہ تو میرے لئے ممکن نہیں صاحب۔" زبیر گڑگڑانے لگا۔ "اور صاحب، اب آپ رابعہ کو سنیں گے تو بھی حیرت ہوگی۔ ہم لوگوں نے منجھلی بی بی سے بہت کچھ سیکھا ہے اور سیکھ رہے ہیں۔"

نور بانو کے تذکرے پر عبدالحق کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔ "کیسی ہیں وہ؟" اس نے

بے ساختہ پوچھا۔

"جی ٹھیک ہیں۔"

"اور سب لوگ؟" عبدالحق نے جلدی سے اپنے پچھلے سوال کی اہمیت زائل کرنے کی کوشش کی۔

زبیر اسے گاؤں کی خبریں سنانے لگا۔ اُس نے پانی کے...... پنچایت کے قیام کے اور نئے آنے والوں کے بارے میں بتایا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ "صاحب، ایک بڑی خوش خبری بھی ہے۔" پھر اُس نے اٹک اٹک کر بتایا کہ رابعہ ماں بننے والی ہے۔

عبدالحق نے گرم جوشی سے اسے لپٹا لیا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ یہ پاکستان کی برکت ہے۔ انشاء اللہ ہمارے علاقے میں پیدا ہونے والا پہلا خالص پاکستانی تمہارا بچہ ہوگا۔" اُس نے کہا پھر اسے خیال آیا تو اُس نے پوچھا۔ "میرے مینو کا کیا حال ہے؟"

"ارے صاحب، وہ تو بس بچ ہی گیا اللہ کی رحمت سے۔ ورنہ تو وہ مر ہی جاتا۔"

عبدالحق گھبرا گیا۔ "ہوا کیا تھا؟"

"ارے صاحب، آپ نے اُس کی عادتیں بگاڑ دی تھیں۔ وہ چارہ آپ کے ہاتھ سے کھانے کا عادی تھا۔ پھر ہر وقت آپ کے آگے پیچھے گھومتا رہتا تھا۔ آپ چلے آئے تو اُس نے کھانا پینا، دوڑنا کھیلنا چھوڑ دیا۔ پیٹ پیٹھ سے لگ گیا۔ میں تو پریشان تھا کہ آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ پھر پتا نہیں کیسے، منجھلی بی بی نے اسے رام کرلیا۔ اب وہ سارے لاڈ ان سے کرتا ہے۔ وہ پہلے جیسا ہو گیا ہے صاحب۔"

عبدالحق کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ خود پر افسوس بھی ہوا کہ اسے بے سوچے سمجھے اس طرح چھوڑ آیا۔ اگر وہ مر جاتا تو......؟

اس کے بعد زبیر نے مطلب کی بات چھیڑی۔

"زبیر بھائی، آپ جانتے ہیں کہ میں ابھی واپس نہیں آسکتا۔ میں یہاں ایک کام سے آیا ہوں اور وہ کر کے ہی جاؤں گا۔"

"مگر وہاں آپ کی ضرورت ہے صاحب۔"

"وہاں آپ موجود ہیں زبیر بھائی، اب آپ کو ہی سب کچھ سنبھالنا ہوگا۔"

"لیکن صاحب، یہ میرے بس کا نہیں۔ میں تو نوکر آدمی......"

"یہ ذہن سے نکال دیجئے زبیر بھائی۔ آپ اب کسی کے نوکر نہیں، آزاد اور خود مختار آدمی ہیں، فیصلے کرسکتے ہیں۔"

"فیصلے کرنے مجھے کہاں آتے ہیں۔" زبیر نے بے بسی سے کہا۔

"کریں گے تو آجائیں گے۔ دیکھیں زبیر بھائی، اس وقت سب کو پاکستان کے استحکا
کے لئے بڑھ چڑھ کر کام کرنا ہے۔ یہ بات عرفان صاحب اور مسعود صاحب جیسے لوگ مجھ سے
کہتے ہیں، اور بات میرے دل کو لگتی بھی ہے۔ اب آپ کو میں ترکیب بتاتا ہوں۔ میرے پتا جی یا
ہیں نا آپ کو۔"

"ان کو کیسے بھول سکتا ہوں صاحب۔"

"انہیں بہت زیادہ دیکھا تھا آپ نے، اور بہت غور سے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں صاحب۔"

"بس تو زمین کے معاملات میں آپ اسی طرح بات کریں، عمل کریں، فیصلے کریں، جیسے وہ
کرتے تھے۔"

زبیر دونوں رخسار ہاتھوں سے پیٹنے لگا۔ "میں کہاں صاحب......"

عبدالحق نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "مجھلی بی بی سے اتنا اچھا بولنا سیکھ لیا آپ نے۔
حالانکہ اُنہیں اتنا دیکھا بھی نہیں۔ پتا جی کے ساتھ اور قریب تو آپ نے برسوں گزارے تھے۔
آپ کو نہیں پتا، لیکن آپ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور سن لیں، یہ میرا حکم ہے۔"

"جی...... جی صاحب۔" زبیر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"ابھی میرے ساتھ کچہری چلیں، میں آپ کے نام مختار نامہ بنوا دیتا ہوں۔ پھر میرے تمام
اختیارات قانونی طور پر آپ کے ہوں گے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ یہاں رکنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ تو کیا آپ......"

"نہیں، نہیں۔ میں واپس آؤں گا یہ کام کر کے۔" عبدالحق نے جلدی سے کہا۔ اس نے سمجھ
لیا کہ زبیر کو اس وقت ٹھکانے کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصہ وہ معاملات سنبھالے گا تو اس میں اعتماد
آجائے گا لیکن ابھی ڈر گیا تو کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ اس لئے اُس نے اسے یہ نہیں بتایا کہ مسعود
صاحب کی بات اُس کے ذہن نے قبول کی ہے۔ اور کچھ نہیں تو اُس نے تعلیم مکمل کرنے کا مصمم
ارادہ کر لیا ہے۔ "بس آپ اس وقت تک میرے حکم کی تعمیل کریں۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔" زبیر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

وہ دونوں کچہری جانے کے لئے کیمپ سے نکل آئے۔

❁ ❁ ❁

کچہری سے مختار نامہ بنوا کر انہوں نے باہر ہی کھانا کھایا، اور پھر کیمپ واپس آئے۔ انہیں
وہاں بیٹھے ذرا دیر ہی ہوئی ہوگی کہ مجید ہانپتا کانپتا کیمپ میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں
اُڑ رہی تھیں۔ اُسے دیکھ کر عبدالحق کو کسی سنگین گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ اس نے متلاشی نظروں

سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر وہ اپنے دوستوں نذیر اور نعمان کو دیکھ کر ان کی طرف لپکا۔

درمیانی فاصلہ خاصا تھا۔ عبدالحق کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا لیکن اتنا اُس نے دیکھا کہ مجید
ہیجانی انداز میں اپنے دوستوں کو کچھ بتا رہا ہے۔ ہیجان اُس کے ایک ایک عضو کی حرکت سے جھلک
رہا تھا۔ نذیر اور نعمان کا ردِعمل اتنی دور سے بھی واضح تھا۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور چہروں پر
بے یقینی کا تاثر تھا۔ پھر وہ کچھ بولے بھی......

ذرا سی دیر میں وہ خبر پورے کیمپ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ عبدالحق کو اپنی
سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ افضال صاحب...... افضال صاحب جیسا آدمی...... یہ...... یہ کیسے
ممکن ہے۔

وہ خود مجید کے پاس گیا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے سب، افضال چچا نے جمیل بھائی کو قتل کر دیا۔" اُس
کی آواز میں اب بھی ہیجان تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں وہاں موجود تھا، اور جمیل بھائی سے بات کر رہا تھا کہ اچانک افضال چچا آئے۔ جمیل
بھائی نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو بولے، آپ یہاں کیسے؟ افضال چچا نے کہا...... میں
تیرے لیے ہی آیا ہوں کمینے افضال، آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کام تو مجھے پاکستان
آنے سے پہلے ہی کر دینا چاہئے تھا۔ بس پھر انہوں نے ایک ہاتھ نکالا جیب سے اور جمیل بھائی پر
وار کرنے شروع کر دیے......"

عبدالحق کو کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر بات اُس کی سمجھ میں آگئی۔ "افضال صاحب
نے جمیل کو افضال تو نہیں کہا ہوگا۔"

"ارے...... وہ تو اب بھی انہیں افضال کہہ رہے ہیں، اور گالیاں بھی دے رہے ہیں۔
مارتے وقت بھی وہ انہیں افضال کہہ رہے تھے۔"

بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ "جمیل اسپتال میں ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں بتا رہا ہوں، وہ مر چکے ہیں۔ اسپتال لے جانے کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ افضال چچا
نے انہیں بُری طرح کاٹ ڈالا تھا۔ اور آخر میں تو ذبح ہی کر دیا انہیں۔"

عبدالحق جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس کے لئے یہ تصور بھی محال تھا...... اور وہ بھی افضال
صاحب کے لئے۔

مسعود صاحب کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ بھی باہر آگئے۔ مجید کہانی پھر دہرانے لگا۔

"میرے حلق سے نہیں اتر رہی ہے یہ بات۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "وہ عبدالحق سے

مخاطب تھے۔ ”چلو...... تھانے چل کر معلوم کرتے ہیں۔“

عبدالحق نے زبیر کو وہیں رکنے کو کہا اور مسعود صاحب کے ساتھ کیمپ سے نکل آیا۔ مسعود صاحب کی فیاٹ میں وہ تھانے پہنچے تو تھانے دار مسعود صاحب کے آگے بچھ گیا۔ وہ انہیں جانتا تھا۔

”ہم کیمپ میں ہونے والے قتل کے سلسلے میں آئے ہیں۔“ مسعود صاحب نے اُس سے کہا۔

وہاں مجید کی ہر بات کی تصدیق ہوگئی۔ افضال صاحب نے جمیل کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا تھا۔

”ہم افضال صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔“ مسعود صاحب نے کہا۔

”ضرور سر۔ پر پہلے چائے پی لیں۔“

مسعود صاحب کچھ ہچکچائے۔ مگر پھر شاید افضال صاحب کی بہتری کی خاطر چائے پینے پر آمادہ ہوگئے۔

عبدالحق اس دوران بہت تیزی سے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ افضال صاحب جیسا آدمی اور ایسا بے رحمانہ قتل! پھر سوال یہ تھا کہ انہوں نے اس دوسرے کیمپ جا کر بالارادہ جمیل کو قتل کیوں کیا۔ اور وہ بالارادہ قتل تھا، کیونکہ چاقو وہ اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔

جمیل کے بارے میں عبدالحق کو ایک بات یاد آئی...... وہ بڑے بڑے افسران کو لڑکیاں سپلائی کرتا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی کڑیاں ملنے لگیں۔ اگر جمیل کا یہ دھندا تھا تو وہ کسی لڑکی کو ہیرا منڈی لے جا کر بھی بیچ سکتا تھا۔ تو ممکن ہے، زرینہ کو بھی اُس نے ہی بیچا ہو۔

اب عبدالحق نے کوٹھے پر زرینہ سے ہونے والی ملاقات کو ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے وہاں افضال صاحب سے پوچھا تھا کہ زرینہ کو کون دھوکا دے کر لایا اور بیچ گیا تو وہ جھنجلا گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ زرینہ نے انہیں نہیں بتایا، اور یہ کہ اس سے پوچھنا بھی نہیں چاہئے۔ عبدالحق نے دلیل بھی دی تھی کہ آدمی دھوکہ کسی پہچان والے سے ہی کھاتا ہے۔

اب کہانی عبدالحق کی سمجھ میں آنے لگی۔ زرینہ نے افضال صاحب کو یقیناً بتایا ہوگا کہ جمیل اسے دھوکہ دے کر وہاں لے آیا تھا۔ اور وہ کیوں نہ بتاتی۔ یہ کوئی چھپانے والی بات تھی ہی نہیں۔ تو افضال صاحب نے اسی وقت جمیل کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے موذی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس لیے صبح افضال صاحب اُس کے ساتھ کیمپ نہیں آئے۔ اُس نے انہیں دس روپے دیے تھے۔ لہٰذا چاقو خریدنے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی ہوگی۔ پھر وہ دوسرے کیمپ گئے اور انہوں نے جمیل کو ختم کر دیا۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ جمیل کو افضال کیوں کہہ رہے تھے۔ عبدالحق کی سمجھ میں ایک ہی بات آتی تھی۔ افضال صاحب اس معاملے میں زرینہ کا نام آنے سے بچانے کے لئے، اسے رسوائی سے بچانے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ وہ پاگل بن رہے ہیں۔ تاکہ ان سے تفتیش ہی نہ کی جائے۔ یقیناً یہی بات ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ یہ صورتِ حال زرینہ کے لئے بہت خطرناک تھی۔ مشتری بائی کو بھی کسی طرح اس واقعے کا علم ہوسکتا تھا۔ پھر وہ افضال صاحب کو پہچان لیتی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ کسی وقت افضال صاحب کی زبان سے زرینہ کا نام پھسل جاتا۔ اس لحاظ سے زرینہ کو فوری طور پر گاؤں بھجوانا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ افضال صاحب کب تک پاگل بنے رہ سکتے تھے اور زرینہ اب اُس کی بہن تھی...... اُس کی عزت......

”چائے پی لو برخوردار۔“

مسعود صاحب نے اسے چونکا دیا۔ اُس نے جلدی سے چائے پی لی۔

تھانے دار انہیں اس حوالات تک لے گیا، جہاں افضال صاحب بند تھے۔ انہوں نے سلاخوں والے دروازے کے پار دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑوں پر خون کے دھبے تھے اور آنکھیں مندی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں اکیلے تھے۔

”دروازہ کھول دو۔ ہم ان سے اندر جا کر ملیں گے۔“ مسعود صاحب نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”یہ مناسب نہیں سر۔ ملزم پر وحشت طاری ہے۔ وہ کسی پر بھی حملہ کر سکتا ہے۔“ تھانے دار نے معذرت طلب لہجے میں انہیں سمجھایا۔

”ارے...... وہ ہمیں جانتے ہیں۔ وہ میرے ہی کیمپ میں رہتے ہیں۔“

”سر، میرا تو خیال ہے، وہ اس وقت خود کو بھی نہیں پہچانتے۔ ایسا کریں، آپ پہلے دور سے بات کر لیں۔ پھر آپ حکم کریں گے تو میں دروازہ بھی کھول دوں گا۔“

”افضال صاحب...... افضال صاحب۔“ مسعود صاحب نے انہیں پکارا۔

”افضال صاحب بدستور اونگھتے رہے، جیسے انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔“

”زحمت نہ ہو تو ذرا یہاں آئیے۔“

افضال صاحب اٹھے اور دروازے تک آئے۔ وہ انہیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن نگاہیں اب بھی شناسائی سے محروم تھیں۔

”افضال صاحب، یہ کیا ہوگیا۔ یہ کیا کر دیا آپ نے؟“ مسعود صاحب نے دردمندی سے کہا۔

افضال صاحب نے حیرت اور تشویش سے اِدھر اُدھر دیکھا، جیسے افضال صاحب کو تلاش کر

رہے ہوں پھر وہ مطمئن نظر آنے لگے۔

"میں آپ سے بات کر رہا ہوں افضال صاحب۔" مسعود صاحب نے اُن سے کہا۔

افضال صاحب اچانک غضبناک ہو گئے۔ ان کا ہاتھ جارحانہ انداز میں سلاخوں سے باہر آیا۔ مسعود صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ "تم نے مجھے گالی دی۔ تم نے مجھے اتنی بری گالی دی۔" افضال صاحب نے کف اُڑاتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ کو گالی نہیں دی افضال صاحب۔" مسعود صاحب نے ان کی پہنچ سے دور ہوتے ہوئے مدافعانہ انداز میں کہا۔

"میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔ مجھے افضال کے نام سے پکارتے ہو۔ یہ تو بدترین گالی ہے۔ ارے میں نے زمین کا سب سے بڑا اور سب سے ذلیل بوجھ کم کر دیا۔ میں نے اس حرام زادے افضال کو قتل کر دیا۔ ٹکڑے کر دیے میں نے اُس کے اور تم مجھے افضال کہتے ہو۔"

مسعود صاحب دم بخود تھے۔ عبدالحق نے افضال صاحب سے پوچھا۔ "تو آپ کا کیا نام ہے جناب؟"

"میں...... میرا نام؟" افضال صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ جیسے ذہن پر زور دے رہے ہو۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو زور زور سے مسلنے لگے۔

"اچھا، مجھے تو جانتے ہیں نا آپ۔ اور یہ بڑے صاحب ہیں۔"

"میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا...... اور نہ ان بڑے صاحب کو۔ مجھے...... مجھے اپنا نام کیوں یاد نہیں آتا۔" ان کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔

"چلیں چھوڑیں۔ آپ آرام کریں۔" عبدالحق نے کہا۔ افضال صاحب دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھے۔

وہ لوگ دوبارہ تھانے دار کے کمرے میں آ گئے۔ "آپ نے مار پیٹ تو نہیں کی ان کے ساتھ؟" عبدالحق نے تھانے دار سے پوچھا۔

"اوتوبہ کریں جی۔ اپنے بندے تو الٹا ڈرتے ہیں اس سے۔"

"سنو...... میں ان کے لئے کپڑے بھجواؤں گا اور وکیل کا بندوبست بھی کروں گا۔ اس سے تعاون کرنا۔"

"لیکن سر، یہ 302 کا کیس ہے......"

"میں نے تمہیں انہیں رہا کرنے کو تو نہیں کہا۔" مسعود صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ "جو کچھ میں کر رہا ہوں، یہ ان کا حق ہے۔ اور تمہیں ان کا خیال رکھنا ہوگا۔ یہ کوئی عادی مجرم نہیں۔ لگتا ہے، کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہیں۔ اور ہاں، ان کے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔"

"جو حکم آپ کا سر۔"

مسعود صاحب نے کھانے کی مد میں تھانے دار کو پانچ روپے دینے چاہے لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ "یہ تو ان کا سرکاری حق ہے جناب...... اور آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں ہر طرح سے ان کا خیال رکھوں گا۔"

مسعود صاحب اور عبدالحق تھانے سے نکل آئے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق صرف پریشان ہی نہیں متوحش بھی تھا۔ یہ جمیل کے قتل کا معاملہ اسے بہت خطرناک لگ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ خدانخواستہ کسی بھی وقت زرینہ اس معاملے میں ملوث ہو جائے گی۔ اور یہ اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ جس لڑکی کو اُس نے بہن کہا اور اسے بازار سے نکالا، وہ اب اس کی رسوائی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب اس کے لیے سب سے اہم کام زرینہ کی شادی کرانا ہے۔

زبیر نے یہ بات محسوس کر لی کہ عبدالحق بہت پریشان ہے۔ اس سے کچھ پوچھنا تو اُس کے نزدیک گستاخی تھی۔ بس وہ اس کے لئے دعا ہی کر سکتا تھا۔ اسے اس حال میں چھوڑ کر جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر وہ خود فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔

فجر کی نماز کے بعد اس نے عبدالحق سے کہا۔ "میرے لئے کیا حکم ہے صاحب؟"

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا، اور اس لمحے اسے اپنے دل کا بوجھ ہٹتا محسوس ہوا۔ ارے...... یہ معاملہ تو آسان ہے۔ زرینہ کو منظر سے ہٹا دیا جائے۔ فوری طور پر اسے گاؤں بھجوا دیا جائے۔

پریشان ہونے کی وجہ سے اسے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ورنہ تو یہ اس کا طے شدہ لائحہ عمل تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب تک اس کے گاؤں واپس جانے کا وقت نہیں ہوتا، زرینہ مسعود صاحب کے ہاں رہ لے گی۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ گاؤں لے جائے گا۔ اب وہ غور کر رہا تھا کہ یہ تو تائید غیبی ہے...... اللہ کا فضل ہے کہ زبیر یہاں چلا آیا۔ بس زرینہ کو زبیر کے ساتھ بھیج دینا ہے۔

سوال یہ تھا کہ زبیر کو اس سلسلے میں کس طرح بتایا جائے۔ اس کی ذہنی کیفیت عجیب سی تھی۔ ایک تو وہ افضال صاحب کی طرف سے پریشان تھا۔ پہلے تو اس نے یہی سوچا تھا کہ افضال صاحب جان بوجھ کر پاگل بن رہے ہیں، تاکہ زرینہ کا راز چھپا سکیں لیکن حوالات میں ان کی حالت دیکھنے کے بعد اسے اس پر یقین نہیں رہا تھا۔ ان کی دماغی حالت تو سچ مچ خراب لگ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر اسے دو طرح کی پریشانیاں لاحق ہو گئیں۔ ایک تو خود ان کے بارے میں تھی۔ وہ دعا کرتا کہ اللہ کرے، وہ ٹھیک ہو جائیں۔ مگر دوسری پریشانی یہ تھی کہ اگر یہ واقعی پاگل پن ہے،

اور آگے کسی مرحلے پر دور ہو جاتا ہے تو عین ممکن ہے کہ افضال صاحب جمیل کے قتل کا محرک بیان کرتے ہوئے زرینہ کا نام بھی لے دیں۔ تو صورت حال یہ ہوئی کہ وہ ان کے لئے دعا کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر سکتا تھا۔

مگر اب اتنا آسان حل نظر آ گیا تھا۔ اس سے ایک پریشانی تو کم ہو جائے گی۔ البتہ دوسری باقی رہے گی۔ اگر افضال صاحب ہوش و حواس میں آ کر زرینہ کے بارے میں بیان دیں گے تو وہ اسے سنبھال لے گا۔ سب سے بڑی بات کہ زرینہ کی رسوائی اگر ہوئی تو یہاں ہوگی۔ وہاں گاؤں میں وہ خود تو رسوائی سے محفوظ ہوگی۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو سنبھال ہی لے گا۔

اسے اچانک احساس ہوا کہ اُس کی اپنی ذہنی کیفیت بھی ٹھیک نہیں۔ وہ ایک ہی بات بار بار سوچ رہا ہے...... نئی بات سمجھ کر......

"صاحب...... آپ نے بتایا نہیں۔"

زبیر نے اسے چونکا دیا۔ "ارے ہاں...... بس وہاں کے معاملات تمہیں سنبھالنے ہیں میرے آنے تک۔ مختار نامے کی رُو سے تم میرے قائم مقام ہو۔ آج ہی تم گاؤں واپس چلے جاؤ۔"

"جو آپ کا حکم صاحب۔"

عبدالحق نے سوچا کہ زرینہ کو زبیر کے ساتھ بھجوانا ہے تو زبیر کا اب کیمپ میں ایک لمحے رکنا بھی ٹھیک نہیں۔ "تم ایسا کرو کہ لاری اڈے چلے جاؤ۔ میں وہاں آ کر تم سے ملوں گا۔ تمہارے ساتھ کسی کو بھیجنا بھی ہے۔"

زبیر کو یاد آ گیا، مسعود صاحب نے بتایا تھا کہ صاحب کو ان کی بہن مل گئی ہے۔

اب زبیر کو زرینہ کے بارے میں کیا بتائے، عبدالحق نے سوچا۔ ایک تو اس ذہنی کیفیت میں بات ہی نہیں کی جا رہی ہے...... اور پھر یہ بات...... وہ جھنجلا گیا۔ زرینہ کے بارے میں سب کچھ تو وہ کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ اس نے سوچا، زبیر نے پوچھا بھی تو وہ اسے ٹال دے گا۔ اس کی ذہنی کیفیت اتنی خراب تھی کہ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ زبیر حکم کا بندہ ہے۔ کچھ پوچھنے کا تو قائل ہی نہیں۔

"ٹھیک ہے صاحب، تو میں جاؤں؟"

"ہاں، تم جاؤ۔ اڈے پر میرا انتظار کرنا۔"

اُس کے جانے کے بعد عبدالحق مسعود صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ سویرے ہی آ جاتے تھے، تاکہ کیمپ والوں کا ناشتہ ان کے سامنے ہو۔

"سر...... آپ کو ایک زحمت دینی ہے۔" اُس نے مسعود صاحب سے کہا۔

"بھئی تم تکلف بہت کرتے ہو۔"

"وہ گاؤں سے زبیر آیا ہوا ہے نا۔ آج واپس جا رہا ہے۔ میں زرینہ کو اس کے ساتھ گاؤں بھجوانا چاہتا ہوں۔"

"ابھی سے! ارے کچھ دن ہمارے ساتھ گزارنے دو اسے۔ میری بچیاں بہت مانوس ہو گئی ہیں اس سے۔"

عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں کوئی مؤثر دلیل کہاں سے لائے۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے سوجھ گئی۔ "میں آپ کی بات ٹال نہیں سکتا سر لیکن وہاں اماں اس سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہوں گی۔"

"اماں......؟ ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تو ہے۔" مسعود صاحب کی سمجھ میں اس بات کی اہمیت آ گئی۔ واقعی جو ماں مہینوں سے بیٹی سے ملنے کی امید آس لگائے بیٹھی ہو، جو کبھی ٹوٹے اور کبھی جڑے، جسے یہ بھی نہیں معلوم ہو کہ اُس کی بیٹی زندہ بھی ہے یا نہیں، اس کے لیے بیٹی کا اچانک آ جانا کتنی بڑی خوشی کا سبب ہوگا۔ "تو برخوردار، زحمت کیسی۔ زبیر کب جا رہا ہے واپس۔"

"ابھی...... ذرا دیر میں۔"

"تو چلو۔"

وہ باہر آئے۔ عبدالحق مسعود صاحب کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ایک اور خیال اسے ستانے لگا۔ یہ تو وہ جانتا ہے کہ اُس نے زرینہ کو زبان سے کہا ہی نہیں، دل سے بھی اپنی بہن سمجھتا ہے۔ تو کیا اب وہ اپنی بہن کو خالی ہاتھ، تین کپڑوں میں گھر بھیجے گا۔ مگر وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

مسعود صاحب نے گاڑی پورچ میں روکی، اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اندر چلے گئے۔ دو منٹ بعد ایک ملازم اس کے لئے لسی لے آیا۔ وہ اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا، لیکن وہ بہت مضطرب تھا۔ جب تک زرینہ گاؤں کے لئے روانہ نہ ہو جاتی، اسے سکون نہیں آ سکتا تھا۔ اُس کے پاس سلیمانی ٹوپی ہوتی تو وہ اس کی مدد سے زرینہ کو پوری دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیتا۔

مسعود صاحب کوئی آدھے گھنٹے کے بعد واپس آئے تو زرینہ ان کے ساتھ تھی۔ "معاف کرنا برخوردار، بچیاں اسے چھوڑ ہی نہیں رہی تھیں۔ بلکہ اب بھی روئے جا رہی ہیں۔ اس لئے اتنی دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں جناب۔"

وہ باہر آئے۔ عبدالحق اگلی سیٹ پر بیٹھا اور زرینہ پچھلی سیٹ پر۔ پھر ملازم نے ایک سوٹ

کیس لا کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ گاڑی چل دی۔

"کہاں جانا ہے؟" مسعود صاحب نے پوچھا۔

"لاری اڈے چھوڑ دیجئے ہمیں۔"

"تو تم میرے ساتھ واپس نہیں چلو گے؟"

"مجھے کچھ دیر لگے گی۔ میں خود ہی آجاؤں گا۔"

مسعود صاحب نے انہیں لاری اڈے پر اتار دیا۔ پھر انہوں نے پچھلی سیٹ سے سوٹ کیس اتارا اور زرینہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "خدا حافظ بیٹی۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ یہ تمہارا بھائی عبدالحق ہمیں بہت عزیز ہے۔ اب اسے ہم چھوڑیں گے تو کبھی نہیں۔ اپنی اماں سے میرا اسلام کہنا۔"

عبدالحق نے سوٹ کیس کو حیرت سے دیکھا۔ "یہ کیا ہے سر؟"

"ارے کچھ نہیں۔ کل بچیاں زرینہ کو بازار لے گئی تھیں۔ وہاں ان لوگوں نے خریداری کی تھی اپنے لئے۔ یہ زرینہ کی چیزیں ہیں۔"

عبدالحق کے دل سے ایک ملال ڈھل گیا۔ کیا ہوا کہ وہ اپنی بہن کو کچھ نہیں دلا سکا۔ اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اہتمام فرما دیا۔

وہ زرینہ کی کیفیت سے بے خبر تھا، جو خوف زدہ ہو رہی تھی۔ زندگی نے اسے کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا۔ پچھلا دن اس کی زندگی کا سب سے خوش گوار دن تھا۔ مسعود صاحب کے گھر میں اسے بڑی عزت، بہت محبت ملی تھی۔ مگر آج پھر زندگی اس کے لئے ایک تبدیلی لئے کھڑی تھی۔ اسے خیال آرہا تھا کہ کچھ پتا نہیں، وہ ایک بار پھر بکنے جا رہی ہو۔ یہ ایک اور دھوکہ ہو۔ مگر اسے یاد تھا کہ افضال چچا نے بڑے یقین سے عبدالحق کو اُس کا بھائی کہا تھا۔ اور گھر بار والے، بیٹیوں والے، مسعود صاحب عبدالحق کی کتنی عزت کرتے تھے۔ وہ برا آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر اُس نے جھنجھلا کر سوچا، جہنم میں تو میں رہ آئی ہوں۔ اب ہر جگہ اس سے بہتر ہی ہوگی۔ اس سے بری جگہ تو کوئی نہیں ہو سکتی۔

عبدالحق نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ زبیر کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اُس نے سوچا، جلدی سے کچھ باتیں کر لے۔ "سنو زرینہ، میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں خود اپنے ساتھ تمہیں گھر لے کر جاؤں گا لیکن صورت حال ایسی ہوگئی ہے کہ تمہیں فوری طور پر بھجواتا ہے......"

دور کھڑے زبیر نے انہیں دیکھا اور سمجھ لیا کہ مداخلت مناسب نہیں۔

"...... خوش قسمتی سے زبیر بھائی آگئے۔ اللہ نے مشکل آسان کر دی۔ اب تم ان کے ساتھ گاؤں چلی جاؤ۔ میں اپنا کام نمٹا کر ہی گھر واپس آؤں گا۔"

یہ سنتے ہی زرینہ کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک بار پھر بیچی جا رہی ہے۔

عبدالحق نے اُس کی کیفیت بھانپ لی۔ "ڈرو مت۔ اب تم میری بہن ہو۔ تمہیں ایک باعزت زندگی اور ہر وہ نعمت ملے گی، جس کی تمہیں آرزو ہے۔ اور سنو زبیر بھائی کو میں اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں، لیکن وہ خود کو میرا جاں نثار سمجھتے ہیں۔ میری ناکارہ ترین چیز کی حفاظت کے لئے وہ اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔ تم تو میری بہن ہو...... سگی بہن۔"

زرینہ کچھ بول نہ سکی۔ اس کے چہرے پر اب بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پھر بڑی مشکل سے اُس نے پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہو گئی بھائی کہ میں آپ کے ساتھ جانے سے محروم ہو گئی؟"

عبدالحق نے ایک گہری سانس لی، چند لمحے سوچا، پھر اسے افضال صاحب کے ہاتھوں جمیل کے قتل کے بارے میں بتا دیا۔

زرینہ کی آنکھوں میں نفرت دہک اٹھی۔ "بہت اچھا کیا چچا نے۔ وہ منحوس اسی قابل تھا۔" اُس کا لہجہ بے حد تند تھا۔

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ "یہ بات کیوں کہی تم نے؟ جمیل بھی انسان تھا۔"

"میں اسے انسان نہیں سمجھتی۔ پتا ہے آپ کو، وہی تو مجھے وہاں دھوکے سے لے گیا تھا...... اور مجھے بیچ آیا تھا۔"

چلو...... یہ بات بھی کھل گئی۔ عبدالحق نے گہری سانس لی۔ پھر اُس نے زرینہ سے کہا۔ "اب تم یہ سب کچھ بھول جاؤ۔ میرے گھر میں میری اماں تمہیں اتنی محبت دیں گی کہ تم ہر دکھ بھول جاؤ گی۔" اُسی وقت عبدالحق کی نظر زبیر پر پڑ گئی۔ زبیر بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔

"مگر بھائی، میں انہیں اپنے بارے میں بتاؤں گی کیا؟" بے خبر زرینہ نے پوچھا۔

اب زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ "تمہیں کسی کو بھی اس سے زیادہ نہیں بتانا ہے کہ تمہارے گھر والوں میں سے کوئی نہیں بچا۔ اور تم مجھے کیمپ میں ملی تھیں۔ باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دینا۔ کچھ بھی نہ بتانا کسی کو۔"

اتنی دیر میں زبیر قریب آگیا تھا۔ "صاحب...... یہ لاری بس جانے ہی والی ہے۔ دو سیٹیں میں نے روک رکھی ہیں۔" پھر اُس کی نظر سوٹ کیس پر پڑی۔ اس نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔

لاری واقعی روانگی کے لئے تیار تھی۔ زبیر نے سوٹ کیس اندر رکھا اور زرینہ کو اپنی روکی ہوئی سیٹ پر بٹھا دیا۔ پھر وہ عبدالحق کے پاس آیا۔ "اور کوئی حکم صاحب؟"

عبدالحق کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کنڈکٹر نے چیخ کر کہا۔ "او بس جا چا جی...... گڈی پئی جا ری اے۔ لیتی اے کہ نئیں۔"

زیادہ کچھ کہنے کا موقع نہیں تھا۔ عبدالحق نے جلدی سے کہا۔ ''بس زبیر بھائی، زرینہ کا خیال ایسے رکھنا، جیسے میرا رکھتے ہو۔ سمجھنا کہ یہ یہ نہیں، میں ہوں اور سب لوگوں کو یہ بات بتا دینا۔''

لاری چل پڑی تھی۔ زبیر کو بھاگ کر اسی میں سوار ہونا پڑا۔ عبدالحق جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔

❁ ❁ ❁

مسعود صاحب نے افضال صاحب کے لئے وکیل کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ ان کے ایک جاننے والے تھے۔

افتخار صاحب تھانے جا کر افضال صاحب سے ملے۔ پھر انہوں نے تھانے دار سے بھی بات کی اور ایف آئی آر بھی دیکھی۔ وہاں سے وہ سیدھے مسعود صاحب کے پاس کیمپ چلے آئے۔

''آپ کا کیا خیال ہے افتخار صاحب؟'' مسعود صاحب نے ان سے پوچھا۔

''ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ افضال صاحب کو سزا نہیں ہو سکتی لیکن ان کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی۔''

''وہ کیوں؟''

''جس بنیاد پر سزا نہیں ہو سکتی، وہی ان کی ضمانت کی راہ میں مانع ہے۔ اور وہ ہے ان کا پاگل پن۔''

''ذرا وضاحت تو کریں۔''

''دیکھیں نا، مقتول کا نام ایک بار بھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔ مقتول کی جگہ وہ اپنا نام لیتے ہیں، اور اپنا نام لیتے ہوئے ان کے لہجے میں شدید نفرت ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں، ہاں میں نے افضال کو قتل کیا۔ وہ تھا ہی اسی قابل۔ اگر مجھے سو بار موقع ملے اور وہ سو بار زندہ ہو جائے تو میں سو بار اسے قتل کروں گا۔''

''جی ہاں، یہ تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ مگر بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' مسعود صاحب نے سوچ میں ڈوبی آواز میں کہا۔

''یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ یہ کوئی نفسیاتی مرض بھی ہو سکتا ہے۔ اور ہم اسی بنیاد پر کیس لڑیں گے۔ دماغی خلل ثابت ہو گیا تو عدالت انہیں سزا ہرگز نہیں دے گی۔''

''مگر ان کی ضمانت کیوں نہیں ہو سکتی۔''

''بہ ظاہر ان کی ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ کوئی انہیں افضال کہہ کر پکارے تو وہ اسے قتل کر دیں۔ وہ اپنے لئے یہ نام سن کر بپھر جاتے ہیں، متشدد ہو جاتے ہیں تو اس اعتبار سے وہ خطرناک پاگل ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ نارمل لگتے ہیں۔ لیکن ان سے ان کا نام پوچھا جائے تو گم صم ہو جاتے ہیں، بے بسی سے کہتے ہیں مجھے یاد نہیں۔ اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ نفسیاتی مرض ہے یا

کسی نوع کا پاگل پن۔ یا پھر......'' افتخار صاحب کہتے کہتے رک گئے۔

''یا پھر؟'' مسعود صاحب نے انہیں بغور دیکھا۔

''یا پھر وہ بن رہے ہیں...... خود کو سزا سے بچانے کے لئے۔''

''نہیں...... وہ ایسے آدمی نہیں ہیں۔'' مسعود صاحب تڑپ گئے۔ ''وہ خاندانی آدمی ہیں۔ نعمتوں میں زندگی گزری ہے ان کی۔ اپنے علاقے میں حکم چلتا تھا ان کا۔ میں نے ہمیشہ انہیں دو ٹوک بات کرتے دیکھا ہے۔ پھر دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ان پر۔ وہ پاگل تو ہو سکتے ہیں، مگر مکار نہیں ہو سکتے۔''

''معاف کیجئے گا مسعود صاحب، آپ انسان کو سمجھنے کا دعوا نہیں کر سکتے۔ کوئی بھی آدمی بہ وقتِ ضرورت کوئی روپ بھی دھار سکتا ہے۔ اور وہ روپ اور اُس کی آگہی پہلے سے اُس کے اندر موجود ہوتی ہے۔''

''اس کیمپ میں مَیں نے بھی انسانوں کی بے شمار قسمیں دیکھی ہیں افتخار صاحب۔ اور بات یہ ہے کہ آپ کے پیشے کا تقاضا ہے کہ آپ ہر شخص کو شبہے کی نظر سے دیکھیں۔''

''جی ہاں، یہ تو ضروری ہوتا ہے وکیل کے لئے۔''

''تو آپ کہتے ہیں کہ انہیں سزا نہیں ہو سکتی۔ سزا نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بری ہو جائیں گے۔ تو جب ضمانت نہیں ہو سکتی تو عدالت انہیں رہا کیسے کرے گی؟''

''رہائی کا میں نے کب کہا۔ اگر وہ پاگل ثابت ہو گئے تو انہیں سزا نہیں ہوگی۔ عدالت انہیں دماغی امراض کے کسی ہسپتال میں بھیجنے کا حکم دے گی' اور وہ وہاں رہیں گے۔''

''اور وہ وہاں کب تک رہیں گے۔''

''ممکن ہے' تمام عمر۔''

''اور اگر وہ ٹھیک ہو گئے......''

''دیکھیے' اسی بنا پر تو میں شک کر رہا تھا۔'' افتخار صاحب نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''کچھ مجرم جو خود کو اس طرح سزا سے بچا لیتے ہیں' سال دو سال پاگل بن کر گزارتے ہیں' بتدریج پاگل پن کم کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر انہیں سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے کہ اب وہ نارمل ہیں۔ پھر انہیں رہائی مل جاتی ہے۔''

''اس جرم کی سزا انہیں ملتی ہے۔''

''کسی سے پاگل پن کی حالت میں جو جرم سرزد ہوا اس کی دنیا کے کسی قانون میں سزا کی گنجائش نہیں۔'' افتخار صاحب نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اب مجھے اجازت دیجئے۔''

''افضال صاحب کا خیال رکھیے گا۔''
''ان کی طرف سے بے فکر رہیں۔''

❁ ❁ ❁

عبدالحق کا ذہن بری طرح منتشر تھا۔ وہ سکون سے بیٹھ کر سوچنا چاہتا تھا۔ گزشتہ 36 گھنٹوں کے دوران اتنا کچھ ہوا تھا' اور اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

ایسے میں اسے لارنس گارڈن کا خیال آ گیا۔ وہاں تنہائی اور سکون کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

وہ لارنس گارڈن میں داخل ہوا۔ صبح کا وقت تھا۔ پارک میں بہت تھوڑے لوگ تھے۔ وہ ایک سنسان گوشے کی طرف چلا گیا اور وہاں گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

لیکن وہاں بھی ابتدا میں وہ ارتکاز سے محروم ہی رہا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے افضال صاحب بری طرح یاد آئے۔ ابھی پرسوں ہی کی تو بات ہے کہ وہ ان کے ساتھ سڑکوں پر پھر رہا تھا...... دنیا' اور طرح طرح کے لوگ دیکھ رہا تھا۔ اور وہ یہاں بھی آتے تھے۔

کچھ دیر وہ انہی سوچوں میں غلطاں رہا۔ پھر بالآخر وہ سوچنے کے قابل ہو گیا۔ ذہن میں بے شمار سوال تھے' جن کے جواب انہیں تلاش کرنے تھے' اور پھر کڑیاں ملانی تھیں۔

پہلا سوال یہ تھا کہ افضال صاحب جیسے آدمی نے جمیل کو اس بے رحمی سے کیوں قتل کیا۔ وہ تو دردمند آدمی تھے۔ کسی کی ذرا سی تکلیف پر بھی تڑپ جانے والے۔

اسی لمحے اسے یاد آیا کہ جمیل کے قتل کی خبر پر زرینہ کا کیا ردعمل تھا۔ اس نے اس فعل پر افضال صاحب کی تحسین کی تھی۔ اس نے بتا دیا تھا کہ جمیل ہی اسے دھوکہ دے کر کوٹھے پر لے گیا تھا اور اسے بیچ ڈالا تھا۔

پھر اسے یاد آیا کہ کوٹھے پر اس نے افضال صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ زرینہ کو اس حال پر پہنچانے والا کون تھا تو وہ جھنجلا گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ زرینہ نے انہیں نہیں بتایا۔ انہوں نے اسے منع بھی کیا تھا کہ وہ زرینہ سے اس سلسلے میں کچھ نہ پوچھے۔ اور اس نے پوچھا بھی نہیں تھا۔ اس نے تو زرینہ کو جمیل کے قتل کی اطلاع دی تھی' اور بات کھل گئی تھی۔ اور زرینہ کے لہجے میں کیسی نفرت تھی جمیل کے لیے۔

تو یہ تو طے تھا کہ زرینہ نے اس رات کوٹھے پر افضال صاحب کو جمیل کے متعلق بتا دیا تھا۔ اور افضال صاحب نے دانستہ طور پر اسے بے خبر رکھا تھا۔ وہ یقیناً اسی وقت جمیل کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لیکن افضال صاحب جیسا آدمی اور ایسا بے رحمانہ قتل! گو کہ عبدالحق کے خیال میں جمیل اس کا مستحق تھا۔ مگر افضال صاحب......

اس لمحے اسے ایک اور بات یاد آئی۔ اسی باغ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر باتوں ہی باتوں میں افضال صاحب نے اسے اپنی ماضی کی کتاب سے چند اوراق پڑھ کر سنائے تھے۔ وہ ایسی باتیں تھیں' جو ان کے ضمیر پر بوجھ تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بہت برے آدمی رہے ہیں۔ وہ زندہ تھے تو صرف اپنے اعمال کی تلافی کے کسی موقع کی تلاش میں' ورنہ وہ خودکشی کر لیتے۔

تو جمیل کو قتل کر کے اپنی دانست میں انہوں نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیا تھا۔ جبکہ جمیل کے بارے میں انھیں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس نے زرینہ کو دھوکہ دیا تھا نوکری دلانے کا' اور اسے کوٹھے پر لے جا کر فروخت کر دیا تھا۔ شریف گھر کی ایک لڑکی کو بازار میں بٹھا دیا تھا......

ایسی مظلوم لڑکی کو' جو ہجرت کے دوران اپنے ہر محافظ رشتے سے محروم ہو گئی تھی۔ بس اتنا ہی جانتے تھے وہ جمیل کے بارے میں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ جمیل اب تک ایسی نجانے کتنی مظلوم لڑکیوں کی زندگی تباہ کر چکا ہے۔ جمیل تو نہایت مکروہ اور قابل نفرت انسان تھا۔ اگر وہ سب کچھ افضال صاحب کو بتا دے تو شاید افضال صاحب کو زیادہ خوشی ہو اور شاید ان کا زیادہ بوجھ کم ہو جائے۔

ایک سوال یہ تھا کہ افضال صاحب یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے افضال کو مارا ہے۔ ایک تو اس کے ذہن میں یہی بات آتی تھی کہ وہ زرینہ کو رسوائی سے بچانے کے لیے پاگل پن کی اداکاری کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے جمیل کو کیوں قتل کیا۔ وجہ بتائیں گے تو زرینہ کا نام لینا پڑے گا۔ اس لیے انہوں نے پاگل بن جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

لیکن نجانے کیوں' عبدالحق کو لگتا تھا کہ افضال صاحب اداکاری نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے انداز میں ذرا بھی تو بناوٹ نہیں تھی۔ انہیں اگر افضال صاحب کہہ کر پکارا جاتا تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتے۔ اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے افضال کو مارا ہے' اور ان سے ان کا نام پوچھا جاتا تو وہ کھو سے جاتے۔ گو وہ خود کو بھول چکے تھے۔

اب یہ بات عبدالحق کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ افضال صاحب کی اس ذہنی کیفیت کا جواز موجود ہے۔ اسی پارک میں بیٹھ کر تو انہوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ بہت گھٹیا اور برے آدمی ہیں' انہیں خود سے شدید نفرت ہے۔ تلافی کی آرزو نہ ہوتی تو وہ خودکشی کر لیتے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتے۔ اسے نجانے کیوں اتنا بتا دیا۔ اور انہوں نے کہا تھا...... سب کچھ تو میں تمہیں بھی نہیں بتا سکتا۔

خودکشی خود کو قتل کرنا ہی تو ہے۔ افضال صاحب نے خودکشی کا کہا اور اب وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے افضال کو قتل کر دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے لاشعور میں دبی ہوئی خواہش پوری کر لی۔ کم از کم وہ یہی سمجھتے ہیں۔ اور اگر یہ درست ہے تو وہ دیوانگی حقیقی ہے۔

افضال صاحب نے کہا تھا' کوئی نہیں جانتا کہ کس کی گٹھڑی میں گناہوں کا کتنا بوجھ ہے۔

عبدالحق یہ بات سمجھ سکتا تھا۔ جو بوجھ کسی کے ساتھ شیئر نہ کیے جائیں' وہ نفسیاتی مسائل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ افضال صاحب کے اندر یقیناً کوئی بہت بڑی کہانی چھپی ہوئی ہے۔

اسے زرینہ کا خیال آیا تو اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اللہ نے کیسی آسانی پیدا فرمائی کہ زبیر بھائی کو بھیج دیا اور زرینہ ان کے ساتھ گھر چلی گئی۔ وہ یہاں ہوتی تو نہ جانے کتنی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔

مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سے گھر میں کتنی پیچیدگیاں جنم لیں گی!

❁ ❁ ❁

اس روز صبح ہی سے نور بانو کا دل اڑا اڑا سا تھا۔ بار بار اسے عبدالحق کا خیال آرہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ زبیر بھائی عبدالحق کے پاس لاہور گئے ہوئے تھے۔ اور اماں نے زبیر بھائی سے تاکید کی تھی کہ ان کی طرف سے عبدالحق کو خود واپسی کا حکم دیں۔

اب زبیر بھائی کو گئے تیسرا دن تھا۔ نجانے کیوں اس کے دل کو یقین تھا کہ آج وہ واپس آئیں گے۔ اور کون جانے' ان کے ساتھ عبدالحق بھی ہوں۔ وعدہ پورا کرنے کا عبدالحق کا مزاج اپنی جگہ' لیکن وہ اماں کا فرماں بردار بھی تو تھا۔

یہ تاویلیں اپنی جگہ' مگر درحقیقت یہ اس کے اندر کی خواہش تھی کہ وہ واپس آجائے۔

دوپہر کو اس نے کھانا پکایا اور اماں کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ لیکن کھانا کیا تھا' وہ بس ٹونگتی رہی۔ جب اندر ہیجان مچل رہا ہو تو کھانا کس سے کھایا جاتا ہے۔ اماں کے پاس تو وہ اس لیے آتی تھی کہ وہ عبدالحق کی باتیں ضرور کرتی تھیں۔ اور یہ اسے اچھا لگتا تھا۔

''زبیر ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' کھانے کے دوران حمیدہ نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''آج شاید آجائیں۔ پرسوں ہی تو گئے ہیں۔''

''دیکھو کیا ہوتا ہے۔ عبدالحق بھی آتا ہے یا نہیں۔''

اس روز حمیدہ زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد نور بانو وہاں سے اٹھ آئی۔

کچھ دیر کے لیے وہ مینو کے شیڈ میں چلی گئی۔ وہاں اس کی بکریاں بھی تھیں۔ جب سے زبیر بھائی نے سامنے چھوٹے سے قطعہ زمین میں ترکاریاں کاشت کی تھیں' مینو اور بکریوں کا کھلنا موقوف ہو گیا تھا۔ انہیں کچھ دیر کے لیے باہر نکالا جاتا۔ لیکن بالکل کھلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ ان کی رسّی کسی نہ کسی کے ہاتھ میں ہوتی۔ حالانکہ قطعے کے چاروں طرف زبیر بھائی نے کانٹوں کی باڑھ ہی لگا دی تھی۔ لیکن بکریاں اسے بھی پھلانگ جاتی تھیں۔ البتہ مینو کی بات اور تھی۔ وہ تو بس نور بانو کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اور وہ ہاتھ سے کھانے کا عادی ہونے کی وجہ سے میر چشم بھی تھا۔ ہر جگہ منہ

مارنے کا قائل نہیں تھا۔

اس نے اپنی بکریوں کے آگے چارہ ڈالا پھر مینو کی طرف چلی گئی۔ اسے ہتھیلی پر رکھ کر چارہ کھلاتے ہوئے وہ اس سے باتیں کرتی رہی۔ ''ایک بات بتاؤ مینو' وہ آجائیں گے تو تم مجھے چھوڑ دو گے؟''

مینو نے کھاتے کھاتے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ لیکن خاموش رہا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

''مصلحت سے کام لے رہے ہو۔ اس لیے جواب نہیں دے رہے ہو۔ یہی بات ہے نا؟''

مینو سر جھکائے کھاتا رہا۔

''لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ آخر تم ہو تو انہی کے۔'' نور بانو نے کہا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اس کی بات سن تو نہیں رہا ہے۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے کہا۔ ''اور جو اماں سوچتی ہیں' وہ ہو گیا تو پھر وہ...... میرا مطلب ہے تم میرے بھی ہو جاؤ گے۔'' یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔ وہ جو کہنا چاہتی تھی' مینو کے سامنے کہتے ہوئے بھی حیا آتی تھی کہ جب وہ میرے ہو جائیں گے تو تم بھی میرے ہو جاؤ گے۔

شام کو وہ ترکاریوں والے قطعے میں چلی گئی۔ وہاں اس نے کچھ دیر وقت گزارا لیکن اس کی نظروں کا مرکز راستہ ہی تھا۔

رات ہوئی تو اسے صبر آگیا۔ اب آج کچھ نہیں ہونے والا۔ رات کو نیند نہیں آئی تو وہ قرآن پڑھنے بیٹھ گئی۔ درمیان میں اسے احساس ہوا کہ گھر میں ہل چل سی مچی ہے۔

پھر دروازے سے رابعہ نے جھانکا اور بولی۔ ''منجھلی بی بی' اماں آپ کو بلا رہی ہیں۔''

❁ ❁ ❁

زبیر زرینہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو رابعہ حیران رہ گئی۔ ''یہ کون ہے؟''

''آتے ہی سوال جواب شروع کر دیے۔'' زبیر کچھ جھنجلا گیا۔ دن بھر کے سفر کی تھکن اور گھر میں گھستے ہی یہ استقبال۔ یہ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔

''اماں سو تو نہیں گئیں؟''

''تسبیح پڑھ رہی ہوں گی۔'' رابعہ نے کھسیا کر کہا۔ اسے غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ''آؤ بی بی!''

اس نے زرینہ کا ہاتھ تھام لیا۔

حمیدہ اپنے بستر پر دراز تسبیح پڑھ رہی تھی۔ زبیر کو دیکھا تو جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی نظریں زبیر کے عقب میں دیکھ رہی تھیں۔ مگر وہاں اسے رابعہ کے ساتھ چادر میں خوب اچھی طرح لپٹی ایک لڑکی نظر آئی۔ ''آؤ...... آجاؤ۔'' اس نے پکارا۔

وہ تینوں اندر چلے گئے اور حمیدہ کے سامنے تخت پر بیٹھ گئے۔ زبیر اور زرینہ نے سلام کیا

حمیدہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "عبدالحق کا کیا حال ہے؟"

"صاحب بالکل ٹھیک ہیں اماں۔"

"وہ آیا کیوں نہیں۔"

"جب تک ان کا کام نہیں ہوگا' وہ نہیں آئیں گے اماں۔"

"ضدی کہیں کا۔" حمیدہ نے بڑے لاڈ سے کہا۔ "اور یہ لڑکی کون ہے۔"

"صاحب نے کہا ہے کہ ان کا ایسے خیال رکھنا' جیسے میں ہوں۔" زبیر نے کہا اور عبدالحق کی بات لفظ بہ لفظ دہرا دی۔

حمیدہ نے زرینہ کو بہت غور سے دیکھا۔ چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی کا چہرہ پوری طرح کھلا ہوا نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود حمیدہ کو اس کی خوب صورتی کا احساس ہو گیا۔ "ماشاء اللہ"۔ اس نے کہا۔ "لگتا ہے کہ ہمارے گھر میں چاند اتر آیا ہے۔" پھر وہ رابعہ کی طرف مڑی۔ "زبیر تھکا ہوا بھی ہوگا اور بھوکا بھی۔ جاؤ اسے کھانا کھلاؤ۔ اور سنو' نور بانو کو بھیج دینا۔"

وہ لوگ کمرے سے گئے تو حمیدہ نے زرینہ سے کہا۔ "چادر اتارو اور یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو اطمینان سے۔"

زرینہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ اسے اپنا پچھلا تجربہ یاد آ رہا تھا۔ وہاں بھی پہلے دن ایسے ہی آؤ بھگت ہوئی تھی' اور اسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تولا گیا تھا۔ اس نے چادر تو نہیں اتاری' لیکن حمیدہ کے پاس جا بیٹھی۔

حمیدہ چند لمحے تو اسے بڑے غور سے دیکھتی رہی' پھر اسے خود سے لپٹا لیا۔

زرینہ نے الگ ہونے کے بعد حیرت اور خوف کے ملے جلے اثرات سے حمیدہ کو دیکھا۔ مگر اس چہرے پر محبت ہی محبت تھی۔ وہ قدرے پُرسکون ہو گئی۔ حمیدہ نے اس کی حیرت بھانپتے ہوئے کہا۔ "حیران کیوں ہو۔ میرے بیٹے نے کہلوایا ہے کہ تم عبدالحق ہو۔ تو وہ آتا تو میں ایسے ہی اسے لپٹاتی نا۔ تو اب تم اس کی جگہ آئی ہو......"

اسی لمحے نور بانو کمرے میں آئی اور زرینہ کو دیکھ کر ہکا بکا ہو گئی۔ اتنی خوبصورت لڑکی! اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکا۔ "جی اماں۔"

"دھی میری' اس بچی کے لیے کھانا لاؤ۔" حمیدہ نے نور بانو سے کہا۔

نور بانو الٹے قدموں کمرے میں سے نکل آئی۔ وہ متوحش ہو گئی۔ وہ تو دن بھر عبدالحق کے آنے کی آس میں تھی' اور آئی تو یہ لڑکی۔ اسے اس لڑکی کی آمد خالی از علت نہیں لگ رہی تھی۔

اندر حمیدہ نے زرینہ سے پوچھا۔ "بیٹی نام کیا ہے تیرا۔"

"زرینہ۔"

"اچھا تو جا کر ہاتھ منہ دھو' کھانا کھا لے' پھر بات کریں گے۔"

زرینہ کمرے سے نکل آئی۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے جائزہ لیا تھا۔ بہت بڑے صحن کے ایک طرف باورچی خانہ تھا۔ اور اس کے برابر غسل خانہ۔ اسی طرف جاتے ہوئے اس نے دوسری لڑکی کو دیکھا' جو باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔

نور بانو نے بھی اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے ٹرے پر کھانا رکھ کر باہر آئی اور کمرے کی طرف چل دی۔ لڑکی کی غیر موجودگی میں وہ حمیدہ سے اس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔

کمرے میں اس نے ٹرے اماں کے سامنے والے تخت پر رکھی اور دھیمی آواز میں بولی۔

"اماں' یہ لڑکی کون ہے؟"

"آ یہاں بیٹھ میرے پاس۔" حمیدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ "ابھی تو بس اتنا معلوم ہے کہ اسے عبدالحق نے یہاں بھیجا ہے یہ کہہ کر کہ اس کا ایسے ہی خیال رکھا جائے' جیسے اس کا رکھا جاتا ہے۔"

نور بانو کا تو دل جیسے بیٹھ گیا۔ ایک تو لڑکی کا حسن' اس پر اماں کا تپاک۔ اس نے اسے اماں سے لپٹے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ "پر اماں' یہ ہے کون؟"

"اب وہ تھکی ہوئی آئی ہے۔ اتنی دور سے۔ کھانا کھا کر کچھ دم لے تو پوچھیں گے اس سے۔ تو بیٹھی رہ۔ نیند تو نہیں آ رہی ہے تجھے؟"

نور بانو کہنا چاہتی تھی کہ نیند تو اب اُڑ گئی ہے۔ اسے ان پر...... ان کی توتا چشمی پر شدت سے غصہ آ رہا تھا۔ وہ اجنبی لڑکی...... کیسے اس کی تھکن کی فکر ہو رہی ہے۔

"زرینہ نام ہے اس کا۔ ہے کتنی خوبصورت۔ لگتا ہے چاند اتر آیا ہے گھر میں۔" حمیدہ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

نور بانو کے وجود میں غصے کی تند لہر اٹھی۔ چاند اتر آیا ہے گھر میں' تو اب اسے بہو بھی بنا لیں اس نے جل کر سوچا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے نکل جائے لیکن لڑکی کے بارے میں جاننے کا تجسس بھی تھا۔ اس لیے بیٹھی رہی۔

"وہ خود اب بھی نہیں آیا۔" حمیدہ نے افسردگی سے کہا۔

اچھا ہی ہوا۔ نور بانو کو اپنی سوچوں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ اندر آگ سی دہک اٹھی تھی' اس نے سوچا' اچھا ہی ہوا' وہ نہیں آئے۔ ورنہ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہو جاتا۔ لیکن منہ سے اس نے کچھ نہیں کہا۔

زرینہ ہاتھ منہ دھو کر آئی تو اور نکھر گئی تھی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس کا خوف بھی دور ہو گیا تھا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ محبت کرنے والے محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

"چل...... پہلے تو بیٹھ کر کھانا کھالے۔ پھر بات کریں گے۔"

"آپ لوگ کھانا نہیں کھائیں گے؟" زرینہ نے کہا اور خاص طور سے نور بانو کی طرف دیکھا۔

نور بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حمیدہ نے کہا۔ "ہمیں تو دیر ہوگئی کھانا کھائے۔"

زرینہ چند لمحے جھجکی لیکن بھوک بہت تھی۔ کھانا کھانے لگی۔

کھانا کھانے کے بعد نور بانو برتن سمیٹ کر لے گئی۔ واپس آئی تو دیکھا کہ نئی لڑکی حمیدہ کے پاس لحاف میں پاؤں ڈالے بیٹھی ہے۔ اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اس نے سوچا' اماں نے اس کے آتے ہی کتنی آسانی سے اسے میری جگہ دے دی ہے۔

"آ دھیئے تُو بھی آ جا لحاف میں۔" حمیدہ نے بڑی محبت سے اس سے کہا۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں اماں۔" اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ اور تخت پر بیٹھ گئی۔

"اس کا نام زرینہ ہے...... ہے نا پیارا نام۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر وہ زرینہ کی طرف مڑی۔

"ہاں دھیے...... اب اپنے بارے میں بتا۔ تُو عبدالحق کو کہاں ملی؟"

"جی...... وہ میں انہیں کیمپ میں ملی تھی...... وہ لاہور میں کیمپ ہے نا مہاجروں کا...... وہاں۔"

حمیدہ کو معلوم تھا کہ عبدالحق کس کیمپ میں رہ رہا ہے۔ "تیرے ماں باپ' بہن بھائی؟"

زرینہ کا دل ایک دم بھر آیا۔ "سب تھے اماں۔ بھرا گھر تھا ہمارا۔ مگر پاکستان آتے ہوئے گاڑی پر حملہ ہوا۔ سب میری آنکھوں کے سامنے ختم ہوگئے کوئی بھی نہیں بچا...... سوائے مجھ بد نصیب کے۔" وہ رونے لگی۔

"نا دھیئے ایسے نہیں کہتے۔" حمیدہ نے شفقت سے اسے سمجھایا۔ "اللہ تیرے نصیب اچھے کرے۔ موت تو اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اور پتا ہے' شہید کا رتبہ کتنا بڑا ہوتا ہے۔ ان کا غم نہیں کرتے۔ ادھر نور بانو کو دیکھ۔ یہ میری بچی تو اپنے سب لوگوں کو اپنے گھر میں ہی کھو کر آئی ہے۔ مگر پھر اللہ نے اسے کتنے لوگ دے دیے۔ اب یہ گھر اس کا ہے۔ ایسے ہی اب تم بھی اکیلی نہیں ہو۔"

نور بانو کے دل کا غبار کسی حد تک ڈھل گیا۔ اماں نے اس گھر کو اس کا قرار دیا تھا اور زرینہ کو دلاسہ دے رہی تھیں۔

"یہاں اپنے گھر کی طرح رہ دھیے۔" حمیدہ زرینہ سے کہہ رہی تھی۔ "یہ نور بانو اور رابعہ تیری بہنیں ہیں' زبیر تیرا بڑا بھائی ہے...... باپ کی جگہ اور مجھے تو تُو اپنی ماں ہی سمجھ۔ اللہ نے مجھے بیٹی نہیں دی تھی۔ پھر یہ نور بانو ملی تو مجھے لگا کہ میری کمی پوری ہوگئی۔ اور اب تُو بھی میری بیٹی ہے۔"

حمیدہ کے لہجے میں ایسی محبت اور خلوص تھا کہ زرینہ پھر رونے لگی۔ حمیدہ نے اس کے آنسو

پونچھ دیے۔ "سفر میں تھکن ہوگئی ہوگی۔ چل اب جا کر سوجا۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر نور بانو کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ نور بانو نجانے کیوں بجھی سی گئی ہے اور چپ چپ ہے۔ "ایسا کر نور بانو کہ جب تک عبدالحق واپس نہیں آتا' اس کا کمرہ زرینہ کو دے دے۔" حمیدہ نے کہا۔

نور بانو کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ "اس کی ضرورت نہیں اماں۔ میرے کمرے میں ایک اور پلنگ ہے نا۔ ہم دونوں ساتھ ہی رہیں گی۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ اسے تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوگا۔" حمیدہ نے کہا۔ پھر جلدی سے وضاحت کی۔ "میں نے تو عبدالحق کے کمرے کا اس لیے کہا تھا کہ تجھے کوئی تکلیف نہ ہو۔"

تکلیف تو ان کے کمرے میں اس کے رہنے پر تھی۔ نور بانو نے دل میں سوچا۔ پھر وہ زبردستی مسکرائی۔ "تکلیف کیسی اماں۔ تنہائی تو مجھے بھی اچھی نہیں لگتی۔ پھر میرے اور زرینہ کے دکھ بھی ایک جیسے ہیں۔" اور شاید طلب بھی ایک ہی ہے۔ اس کے دل نے ٹکڑا لگایا۔ "پھر ہم دونوں بہنیں ہی ہوئیں نا بس ہم ساتھ ہی رہیں گی۔"

"جاؤ پھر' آرام کرو۔"

اپنے کمرے میں آ کر نور بانو نے زرینہ کو اپنے بستر پر بٹھایا اور خود دوسرے پلنگ پر اس کے لیے بستر بچھانے لگی۔ "لو اب آرام سے لیٹ جاؤ۔" زرینہ بستر پر دراز ہوگئی۔ نور بانو بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ لڑکی تو باجی سے بھی خوبصورت ہے۔ اس نے سوچا۔

چند لمحے خاموش رہی۔ پھر نور بانو نے پوچھا۔ "وہ کیسے ہیں؟"

"کون؟" زرینہ کسی سوچ سے چونکی۔

نور بانو کو بہت غصہ آیا۔ ارے...... وہ اس سے کس کے بارے میں پوچھے گی۔ کیا اس کے رشتہ دار موجود ہیں اس کیمپ میں۔ "میں عبدالحق صاحب کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اسے حیرت ہوئی' کیونکہ اس نے کبھی عبدالحق کا نام نہیں لیا تھا۔

زرینہ گڑبڑا گئی۔ "جی...... وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"کیمپ میں ان سے کیسے جان پہچان ہوئی تمہاری؟"

"جی میں...... میں تو انہیں نہیں جانتی۔ افضال چچا کے ساتھ تھے وہ۔"

"افضال چچا کون؟"

"وہ بہت اچھے ہیں۔ ان کے گھر میں بھی کوئی نہیں بچا۔ اکیلے ہیں وہ۔ سب کا خیال رکھتے ہیں۔"

"عبدالحق صاحب کیسے لگے تمہیں؟"

"میں انہیں کہاں جانتی ہوں۔ میں تو یہاں آتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی۔ یہ تو آپ لوگوں کو

دیکھ کر ڈر دور ہوا ہے میرا۔"

"حیرت ہے ان سے بھی کوئی ڈر سکتا ہے۔" نور بانو نے سخت معترضانہ لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا کہ میں انہیں ٹھیک سے جانتی نہیں ہوں۔"

"بھئی کیمپ میں انہیں دیکھتی تو رہی ہو گی نا؟"

"نہیں...... ابھی دو دن پہلے ہی تو میں نے پہلی بار دیکھا تھا انہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ ایک ہی کیمپ میں رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے تو رہے ہوں گے۔ دور سے دیکھ کر بھی آدمی سمجھ جاتا ہے۔"

عبدالحق نے زرینہ سے کہا تھا کہ گھر میں کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ اس وقت یہ کام اسے بہت آسان لگا تھا۔ مگر اب اس لڑکی کے سامنے جو ایسے جرح کر رہی تھی جیسے کوئی وکیل ہو تو زرینہ کو اندازہ ہوا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ اب ایک سچی بات تو اس کی زبان سے پھسل گئی تھی کہ اس نے عبدالحق کو دو دن پہلے ہی پہلی بار دیکھا تھا۔ اور اب اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی تھی کہ جو کچھ اس پر گزری ہے وہ کسی کو نہیں بتا سکتی۔ عبدالحق منع نہ بھی کرتا تو بھی وہ اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاتی۔

"اور وہ تو ایسے ہیں کہ ماشاءاللہ ہزاروں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم نے دو دن پہلے انہیں دیکھا۔"

"اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ وہ کیمپ تو ایک پورا شہر ہے۔"

"کتنے لوگ ہوں گے اس کیمپ میں۔"

"ہزاروں لوگ ہوں گے۔"

"اور تم جیسی لڑکیاں کتنی ہوں گی؟"

"سینکڑوں؟"

نور بانو ٹھوڑی کو ہاتھوں کے پیالے میں رکھ کر کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "اتنی لڑکیوں میں انھوں نے تمہیں ہی کیوں منتخب کیا۔ جبکہ صرف دو دن پہلے ہی دیکھا تھا تمہیں؟"

زرینہ پریشان ہو گئی۔ سوالوں کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے والا لگتا تھا۔ اب وہ دو دن کی بات منہ سے نکال کر پھنس گئی تھی۔ باتیں بنانے کے لیے وقت بہت مختصر رہ گیا تھا۔ ادھر عبدالحق نے بڑے یقین سے اسے اپنے گھر بھیجا تھا کہ وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ زبیر کے ساتھ تو وہ یہاں تک آئی تھی۔ اماں کا رویہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ مگر یہ لڑکی مختلف تھی۔ یہ تو پولیس والوں کی طرح تفتیش کر رہی تھی۔ "بات یہ ہے کہ وہاں میری عزت خطرے میں تھی۔" اس نے کہا۔

"تو کیمپ میں تحفظ کا بندوبست ہو گا۔"

اس بار زرینہ جھنجلا گئی۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کیمپ دیکھا بھی ہے آپ نے۔ اللہ نہ دکھائے آپ کو۔ وہاں لاوارث رہتے ہیں جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہاں آپ تحفظ کی بات کرتی ہیں۔ وہ گھر نہیں ہے میری بہن اور لاوارث لوگ تو اپنے گھر میں بھی محفوظ نہیں ہوتے۔"

چند لمحوں کے لیے نور بانو تھرا گئی۔ اللہ نے اس پر کرم کیا تھا ورنہ وہ خدا جانے کہاں ہوتی۔ لیکن پھر غور کرنے پر زرینہ کا جواب اسے تسلی بخش نہیں لگا۔ "میں تو کہہ رہی ہوں کہ تمہارے تحفظ کا بندوبست وہاں بھی تو کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے یہاں کیوں بھیجا تمہیں؟"

"کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ یہ بات آپ ان سے پوچھیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی زرینہ کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "اور یہ بھی سن لیں کہ میں نے ان سے تحفظ نہیں مانگا تھا۔ انہوں نے خود پیش کش کی تھی بلکہ اصرار کیا تھا۔"

اس سخت جواب سے نور بانو کو شاک لگا۔ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اس لڑکی سے ایسے بات نہیں کر رہی تھی جیسے دو اجنبی جنہیں ساتھ وقت گزارنا ہو ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کے لیے کرتے ہیں۔ اس کا انداز تفتیشی تھا۔ اگر وہ اس لڑکی کی جگہ ہوتی تو اسے بھی برا لگتا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ اگر یہ لڑکی اس کی جگہ ہوتی تو شاید یہ بھی اس کی اسی طرح تفتیش کرتی۔

چند لمحے بعد زرینہ نے بہت شکستہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا میں آپ کو بوجھ لگ رہی ہوں؟ میرا آنا برا لگا ہے آپ کو؟"

"ارے نہیں...... ہرگز نہیں۔" نور بانو نے بڑی سچائی سے اس کے پہلے سوال کا جواب دیا۔ دوسرے سوال کا جواب البتہ اثبات میں تھا...... اسے وہ پی گئی۔ "معاف کرنا شاید میرا لہجہ تمہیں برا لگا ہو۔ دراصل نیند کی وجہ سے میں چڑ چڑی ہو جاتی ہوں۔ تم بھی تھکی ہوئی ہو۔ سو جاؤ صبح بات کریں گے۔"

زرینہ نے سکون کی سانس لی اور لحاف میں منہ چھپا لیا لیکن تھکن کے باوجود اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ اگر اسے یہاں رہنا ہے تو اس لڑکی کا سامنا ہر روز کرنا ہو گا۔ اور یہ آسان نہیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔

اس گفتگو پر غور کرتے ہوئے ایک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ لڑکی عبدالحق سے محبت کرتی ہے اور یہ اس کے اور عبدالحق کے بارے میں غلط نظریے سے سوچ رہی ہے۔ اسے اپنی بے پروائی پر افسوس ہونے لگا۔ اسے خیال ہی نہیں آیا کہ عبدالحق کا تذکرہ کرتے وقت اسے بھائی کہنا چاہیے۔ اور یہ نور بانو کتنی عقل مند ہے۔ اس نے تو انہیں عبدالحق صاحب کہہ کر اپنا تعلق واضح کر دیا تھا۔

خیر...... جو ہوا اچھا ہوا۔ آئندہ کے لیے بات سمجھ میں آ گئی۔ اب وہ عبدالحق کو بھائی ہی کہے

گی۔ اور یہ سچ بھی ہے۔ عبدالحق نے اسے بہن ہی کہا تھا۔ اور وہ سچا آدمی ہے۔ سچا اور اچھا نہ ہوتا تو بازار میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو بہن کیوں بناتا۔ اس کی عزت بچانے کے لیے اسے گاؤں کیوں بھیجتا۔ اسے ڈر تھا کہ جمیل کے قتل کے معاملے میں اس کا نام نہ آجائے۔ جبھی تو اس نے زبیر بھائی کے ساتھ اسے گاؤں بھیجا۔ ورنہ وہ خود اسے لے کر یہاں آتا۔ ایک بات اور اس کی سمجھ میں آگئی۔ یہ لڑکی بھائی سے یک طرفہ محبت کرتی ہے۔ جبھی تو ایسی بے یقینی کا شکار ہے۔

ادھر نور بانو کی نیند بھی اُڑ گئی تھی۔ وہ بھی زرینہ اور عبدالحق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کا لہجہ بے شک خراب تھا' لفظ بھی بے شک بھونڈے تھے۔ لیکن اس کی کہی ہوئی ہر بات سچی تھی۔ کیمپ میں سینکڑوں لڑکیاں تھیں۔ کیمپ میں ان میں سے بیشتر کی عزت کو خطرہ لاحق ہوگا۔ مگر اس مسئلے کا حل وہیں تو تلاش کیا جائے گا۔ ان سب کو یہاں تو نہیں بھیجا جائے گا۔ سیدھی سی بات بھی ہوسکتی ہے کہ عبدالحق کو بے حد حسین لڑکی بھا گئی ہو اسے اس نے اپنے لیے منتخب کرلیا ہو۔ تبھی تو اسے یہاں بھیجا ہے۔

ایک اور بات یہ تھی کہ اسے یقین تھا کہ اس لڑکی نے کئی جھوٹ بولے ہیں۔ اور وہ عادی جھوٹی بھی نہیں ہے۔ ورنہ جھوٹ بولتے ہوئے نہ ایسے گڑبڑاتی' نہ پکڑی جاتی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک کیمپ میں رہتے ہوئے عبدالحق اور اس لڑکی کی ملاقات صرف دو دن پہلے ہوئی ہو' اور یہ لڑکی اس سے پہلے عبدالحق کو جانتی ہی نہ ہو۔ ارے اس کیمپ میں تو عبدالحق ایسا نمایاں نظر آتا ہوگا' جیسے آسمان پر ستاروں کے درمیان چاند......

اس رات نور بانو نے دو خواب دیکھے۔ ایک خواب میں تو اس نے عبدالحق کی شادی زرینہ سے ہوتے ہوئے دیکھی۔ اور دوسرے خواب میں دیکھا کہ چچا اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔ دونوں بار اس کی آنکھ کھلی تو سردی کے باوجود پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

❁ ❁ ❁

پولیس نے افضال صاحب کو عدالت میں پیش کردیا تھا اور عدالت نے انہیں پانچ دن کے ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کردیا تھا۔ عبدالحق مسعود صاحب کے دفتر میں ان کے وکیل افتخار صاحب سے ملا تھا اور ان سے اس کیمپ کے بارے میں بات کی تھی۔

"میری رائے میں عدالت زیادہ سے زیادہ تین پیشیوں میں اس کیس کا فیصلہ کردے گی۔" افتخار صاحب نے کہا۔ "وہ جس حال میں ہیں' انہیں سزا دی ہی نہیں جاسکتی۔ انہیں دماغی امراض کے کسی اسپتال میں بھیج دیا جائے گا۔"

یہ سن کر عبدالحق کو کچھ اطمینان ہوا۔

افتخار صاحب کے جانے کے بعد مسعود صاحب دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔

پھر بولے۔ "میں ایسا سوچنا تو نہیں چاہتا لیکن مجھے لگتا ہے کہ افضال صاحب پاگل بن رہے ہیں۔"

"نہیں جناب' یہ ممکن نہیں ہے۔" عبدالحق نے جلدی سے کہا۔ "ان کے ساتھ نفسیاتی مسائل تو پہلے سے تھے۔ مگر اب تو ان کی یادداشت ہی ختم ہوگئی ہے دیکھیں نا' وہ آپ کو اور مجھے بھی نہیں پہچانتے۔"

"ان کے نفسیاتی مسائل اپنی جگہ۔ لیکن یادداشت ایسی چیز نہیں کہ یونہی بیٹھے بٹھائے زائل ہوجائے۔ کسی بہت بڑے سانحے کے بغیر یہ ممکن نہیں۔"

"تو کیا پتا' ایسا کوئی واقعہ......کوئی سانحہ انہیں پیش آیا ہو۔" عبدالحق نے دھیرے سے کہا۔

مسعود صاحب نے ایک دم موضوع بدل دیا۔ "جس دن جمیل کا قتل ہوا' مجھے یقین ہے کہ اس رات افضال صاحب کیمپ واپس نہیں آئے تھے' اور نہ ہی وہ اس صبح کیمپ سے گئے تھے۔"

"یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟" عبدالحق بری طرح چونکا۔

"وہ صبح کیمپ سے نکلنے سے پہلے میرے پاس آتے تھے۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "میں نے بڑی مشکل سے ان سے یہ وعدہ لیا تھا۔ اور وعدہ کرنے کے بعد سے اس صبح کو چھوڑ کر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے ملے بغیر کیمپ سے باہر گئے ہوں۔"

یہ بات عبدالحق کو بھی معلوم تھی۔ خود افضال صاحب نے بھی اسے بتائی تھی۔

"اور جس رات تم اپنی بہن کو لیے میرے گھر آئے تھے' وہ اسی رات کی صبح تھی۔ یعنی وہ اسی رات کیمپ میں نہیں تھے' اور یہ غیر معمولی بات ہے۔ افضال صاحب کبھی کیمپ سے دور نہیں رہے..... کم از کم رات میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اب تم بتاؤ برخوردار کہ اس رات وہ کہاں تھے۔"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔" عبدالحق گڑبڑا گیا۔

"کیونکہ وہ تمہارے ساتھ تھے۔ اگلی صبح تمہارا ملازم۔ کیا نام ہے اس کا... ہاں زبیر وہ کیمپ آیا تو تم موجود نہیں تھے۔ اسی لیے تو وہ میرے پاس چلا آیا تھا۔"

یہ ایسا ثبوت تھا' جو ناقابلِ تردید تھا۔ عبدالحق نے گہری سانس لی۔ اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ مسعود صاحب نے اسے اسی روز کیوں نہیں پکڑا۔ اس سے رہا نہیں گیا' اس نے یہ بات مسعود صاحب سے پوچھ لی۔

"تم پر بہت بھروسہ کرتا ہوں۔ تم جھوٹ بولنے والے نہیں ہو۔ اگر جھوٹ بولا تو کوئی بہت بڑی بات ہوگی۔ اب جبکہ تمہاری الجھن دور ہوچکی ہے تو مجھے سب کچھ بتا دو۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ زرینہ تمہاری بہن نہیں ہے۔"

عبدالحق نے احترام آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔ واقعی' وہ اس کی عزت بھی کرتے تھے

اوراس پر اعتبار بھی اس نے اس دن کی پوری کہانی تفصیل کے ساتھ انہیں سنادی۔

مسعود صاحب بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔اس کی بات مکمل ہونے کے بعد وہ چند لمحے خاموش بیٹھے رہے جیسے ذہن میں سب کچھ ترتیب دے رہے ہوں۔ پھر وہ بولے۔"تو یہ وجہ تھی زرینہ کوفوری طور پر گاؤں بھیجنے کی۔تمہیں ڈر تھا کہ افضال صاحب زبان کھول دیں گے تو زرینہ کا معاملہ کھل جائے گا؟"

"جی ہاں سر میں نے زرینہ کو بہن کہا ہے تو اب اس کی عزت میری عزت ہے۔میں اس کی رسوائی برداشت نہیں کر سکتا اور اس لیے بھی کہ وہ مظلوم ہے۔اوراس کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔وہ رسوائی کی نہیں ایک اچھی زندگی کی مستحق ہے۔"

"ہاں......تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اور سر اب میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔اس وقت تو مجھے مدد کی ضرورت تھی۔میں خود غرض ہو گیا تھا۔میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔"

"کس بات پر؟"

"اس بات پر کہ میں بازار سے ایک لڑکی لے کر آیا اور دھوکے سے اسے آپ کے ہاں مہمان ٹھہرایا۔آپ کی بچیاں بھی تو میری بہنیں ہیں۔اگر میں آپ کو سچ بتا دیتا......"

"واقعی یہ تو تم نے بہت بری حرکت کی۔"مسعود صاحب نے اس کی بات کاٹ دی"مگر معافی سے کیا ہوتا ہے برخوردار۔بس زبان سے کہہ دیا اور قصہ ختم۔تلافی کرو تو بات ہے۔"

"آپ حکم کریں میں انشااللہ تلافی کروں گا۔"

"سوچ لو۔"

"وعدہ کر رہا ہوں۔"

"تو اس زیادتی کی تلافی یہ ہوگی کہ تم میری بات مان لو اور لاہور آکر سول سروس کی تیاری کرو بولو تیار ہو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں لیکن......"

"بس باقی معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔میں نے سب سوچ رکھا ہے۔اس پر بعد میں بات کریں گے۔"مسعود صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔"ویسے یہ بتا دوں کہ زرینہ کے معاملے میں تم سے مجھے شکایت نہیں بلکہ میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے مجھے تلافی کا موقع دیا۔"عبدالحق کی نگاہوں میں الجھن دیکھ کر انہوں نے وضاحت کی۔"دیکھو میرے کیمپ میں ہی اس کے ساتھ یہ دھوکہ ہوا۔اور نجانے کتنی لڑکیوں کے ساتھ ہوا ہوگا۔تو کیمپ کا

انچارج ہونے کی حیثیت سے اس کا ذمہ دار میں ہوں۔میں کیوں بے خبر رہا۔میں رات کو اپنے گھر میں سکون سے سوتا رہا اور یہاں جمیل یہ سیاہ کارنامے انجام دیتا رہا۔"اتنا کہتے کہتے وہ چونکے۔"لیکن جمیل اکیلا تو نہیں ہوگا۔"

"جی......کیمپ میں ایک شخص ہے مجید......وہ اس کا ساتھی تھا۔"

"اسے فوری طور پر کیمپ سے نکالنا ہوگا بلکہ بلیک لسٹ کرنا ہوگا اسے۔اور ہاں اب مجھے یقین ہو گیا کہ افضال صاحب بن رہے ہیں۔وہ بھی تمہاری طرح زرینہ کو رسوائی سے بچانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔"

"نہیں سر مجھے یقین ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔"

"خیر...... یہ بات تو کھل جائے گی۔پولیس کی مار کے سامنے تو گونگے بھی بول پڑتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"عبدالحق بری طرح بھڑ کا۔"کیا تھانے میں ان پر تشدد کیا جائے گا۔"

"تو اور کیا۔ریمانڈ کا یہی تو مطلب ہوتا ہے برخوردار۔مگر ہمیں ان کے نیچے کچھ ..."وہ بات پوری نہیں کر پائے۔کیونکہ اسی لمحے ان کا ڈرائیور اندر آیا۔اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا......خیریت تو ہے؟"

"صاحب جی بیگم صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی۔میں انہیں اسپتال چھوڑ کر آرہا ہوں۔"

"وہاں ان کے ساتھ کون ہے۔"

"بڑی بی بی ہیں صاحب جی۔"

مسعود صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔"میں چلتا ہوں برخوردار تم دعا کرنا ہماری اہلیہ کے لیے۔"

عبدالحق ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے ایک اور اہم کام کرنا ہے۔وہ افضال صاحب کی طرف سے پریشان تھا۔

❀......❀......❀

اس بار تھانے دار کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔اس کی رعونت دیکھ کر عبدالحق حیران رہ گیا۔وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تھانے دار نے اسے بری طرح جھڑکتے ہوئے کہا۔"اوئے یہاں کیا منہ اٹھائے چلے آرہے ہو۔اُدھر جاؤ۔ہیڈ محرر سے بات کرو۔"اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

عبدالحق کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ خاموشی سے اس طرف چلا گیا۔

ہیڈ محرر سر جھکائے رجسٹر میں کچھ اندراج کر رہا تھا۔ عبدالحق نے کہا۔"سنیے......"

"ذرا صبر کرو دیکھتے نہیں کام کر رہا ہوں۔"

عبدالحق کو چند منٹ انتظار کرنا پڑا پھر ہیڈ محرر نے سر اٹھایا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں
کہا۔ ''کیا ہے؟'' مگر پھر اس نے عبدالحق کو غور سے دیکھا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ تگڑی
اسامی ہے۔ ''کوئی رپٹ لکھوانی ہے؟'' اس نے نسبتاً نرم لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... مجھے افضال صاحب سے ملنا ہے۔''

''کون افضال صاحب؟ اس تھانے میں تو اس نام کا کوئی افسر نہیں۔''

''وہ افسر نہیں ہیں۔ قتل کے الزام میں حوالات میں ہیں۔''

''تو ملزم کو صاحب بولتے ہو''...... ہیڈ محرر برا مان گیا۔ ''اور وہ بھی قاتل۔ تمہیں کیوں
ہے اس سے۔ رشتہ دار ہے تمہارا۔''

''یہی سمجھ لیں۔ اور ان کی دماغی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ کسی کو بھی نہیں پہچانتے۔ انہیں اپنا نا
بھی نہیں معلوم۔''

''ہیڈ محرر نے سامنے بیٹھے کانسٹیبل سے پوچھا'' وہ بڈھا کہاں ہے...... قتل کے کیس والا؟''

''وہ تو جی تفتیش والے کمرے میں ہے۔''

ہیڈ محرر نے قہقہہ لگایا۔ ''اب اسے سب یاد آ جائے گا۔ سب کو پہچاننے لگے گا۔''

عبدالحق کا دل ڈوبنے لگا۔ ''تفتیش والے کمرے میں کیا ہوتا ہے؟''

''تفتیش کی جاتی ہے۔ سچ اگلوایا جاتا ہے۔''

''مار پیٹ ہوتی ہے؟''

''اوئے بھولے بادشاہ، چھتروں کے بغیر کوئی سچ بولتا ہے۔'' ہیڈ محرر نے تمسخرانہ انداز میں
کہا۔

''یہ تو غلط ہے۔'' عبدالحق تڑپ گیا۔ ''وہ تو ویسے ہی دماغی خلل میں مبتلا ہیں۔''

''تم ان کے رشتہ دار تو نہیں ہو سکتے۔''

''یہ کیسے کہہ رہے ہیں آپ۔''

''میں نے پہلے بھی پوچھی تھی یہ بات۔ تم نے بولا، یہی سمجھ لو۔ اس کا مطلب ہے، رشتہ دار نہیں
ہو۔ اور رشتہ دار ہوتے تو ان کی بھلائی کی فکر کرتے۔''

''کس طرح؟''

''اوئے کوئی چائے پانی کا خرچہ دیتے، کچھ اس کی فکر کرتے۔ تم نے تو اس کے کھانے کی فکر
بھی نہیں کی۔''

''کی تھی۔ بڑے صاحب تھانے دار صاحب کو پیسے دے رہے تھے۔ انہوں نے منع کر دیا۔''

''کون بڑے صاحب؟'' ہیڈ محرر کچھ محتاط نظر آنے لگا۔

''مسعود احمد خان صاحب۔ رفوجی کیمپ کے انچارج ہیں۔ بڑے افسر ہیں وہ۔''

اچانک تھانے دار اٹھا اور باہر چلا گیا۔ عبدالحق کو لگا کہ وہ مسعود صاحب کا نام سن کر دانستہ
ادھر گیا ہے۔

ادھر ہیڈ محرر مزید محتاط ہو گیا۔ لہجے میں بھی کچھ شائستگی آ گئی۔ ''دیکھو جی، ہمیں تفتیش تو کرنی
ہے نہیں تو کیس کیسے چلے گا عدالت میں اور پھر معاملہ قتل کا ہے۔''

''مگر وہ تو تقریباً پاگل ہیں۔'' عبدالحق نے احتجاج کیا۔

''ایسے کیسوں میں لوگ پاگل بھی بن جاتے ہیں۔ اب سچ اگلوانے کے لیے چھتر ول نہ
کریں تو کیا کریں۔ کسی سے ہاتھ باندھ کر پوچھیں کہ بابا سچ بول، تو سچ مچ پاگل ہے یا بن رہا ہے۔ تو
وہ سچ بول دے گا کیا۔''

عبدالحق کو اس کی بات معقول لگی۔ اس سے انکار تو ممکن نہیں تھا۔

اتنے میں ایک تجیم شحیم پولیس والا ہانپتا ہوا اندر سے آیا۔ ''صاحب کہاں ہیں؟'' اس نے
ہیڈ محرر سے پوچھا۔

''باہر گئے ہیں۔ کیا بات ہے؟''

''بڈھا بڑا پکا ہے۔ میں نے سارے حربے آزما لیے۔ کچھ نہیں اگلا۔ بولتا ہے، میں نے
افضال کو قتل کیا ہے۔ اور سالے کا اپنا نام پوچھو تو بولتا ہے، معلوم نہیں۔''

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ تو یقیناً افضال صاحب کے بارے میں بات ہو رہی
تھی۔ ''اب تو آپ اس سلسلے کو روکیں......''

''آپ کو تھانے کے آداب نہیں آتے باؤ جی۔ یہاں مال ڈھیلا کرو تو سب ہو جاتا ہے۔
تمہارا بندہ دو دن سے بھوکا ہے۔ تمہیں اس کی فکر نہیں۔''

''تھانے دار صاحب نے کہا تھا کہ یہ سرکاری ذمہ داری ہے۔ انہوں نے پیسے لینے سے
انکار کر دیا تھا۔''

''آپ بھی بھولے بادشاہ ہو۔ اب ایک بڑا افسر اپنے سے بڑے افسر سے پیسے تو نہیں لے
سکتا۔ اور تھانے دار صاحب خود بھی کسی سے کچھ نہیں لیتے۔ یہ کام تو ہم جیسے نیچے کے لوگوں کا
ہے۔''

''مگر یہ تو رشوت ہوئی......''

''اوئے ہمیں نہیں پڑھاؤ باؤ صاحب۔ پتا ہے، تنخواہ کتنی کم ہے ہم لوگوں کی۔ گھر کی دال
روٹی بھی نہیں چلتی اس میں۔''

عبدالحق کو افضال صاحب کی فکر تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ بحث کا فائدہ نہیں، بلکہ نقصان

ہوگا...... وہ بھی افضال صاحب کو۔" اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو تم۔"

"اب مجھے تمہاری حیثیت کا کیا پتا۔"

"میری حیثیت کو چھوڑو۔ اپنی ضرورت کی بات کرو۔"

"پہلے آپ بتاؤ' آپ ہم سے کیا چاہتے ہو۔"

"میں چاہتا ہوں کہ افضال صاحب پر تشدد بالکل نہ ہو' کوئی انہیں ہاتھ بھی نہ لگائے۔ ان کی ہر ضرورت اچھی طرح پوری کی جائے۔"

"آخری بات تو آسان ہے۔" ہیڈ محرر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "پر پہلی دو باتیں مش ہیں۔ اب دیکھو نا' تفتیش تو ہمیں کرنی ہے نا۔"

"تو تفتیش کرو' تشدد کے بغیر۔"

"یہ تو کیس ہی ٹھپ کرانے والی بات ہے باؤ جی۔" اب ہیڈ محرر کا لہجہ بالکل تبدیل ہو تھا۔ "اس کام میں بڑا خرچہ ہوگا۔ آپ نہیں کر سکتے۔"

"تم بولو تو۔"

ہیڈ محرر چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا "پانچ نوٹ دے سکو گے۔"

"یہ بہت زیادہ ہیں۔"

"کیس قتل کا ہے باؤ صاحب۔ اور اس میں پورے تھانے کا حصہ ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" عبدالحق نے جیب سے تین سو روپے نکال کر اسے دیے۔ "دو سو کام پورا ہونے پر دوں گا۔ شرط یہ ہے کہ افضال صاحب کو کوئی انگلی بھی نہ لگائے۔ اور انہیں تم کھانا اچھا دو۔"

"آپ بے فکر ہو جاؤ صاحب۔" ہیڈ محرر کی باچھیں کھل گئیں۔ "سمجھ لو اب وہ ہمارا وی آئی پی ہے۔ پر ایک بات ہے باؤ صاحب۔ اس بات کا نہ آپ کے بڑے صاحب کو پتہ چلے اور ہمارے بڑے صاحب کو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب مجھ افضال صاحب سے ملا دو۔"

"ابھی یہ مناسب نہیں۔ آپ شام کو آنا باؤ جی۔ ابھی تو اس کا حال اچھا نہیں۔ شام تک اسے سجا سنوار دیں گے تمہارے لیے' پیٹ میں کچھ پڑے گا تو چہرے پر رونق آئے گی۔" عبدالحق کا دل کٹنے لگا لیکن وہ افضال صاحب کو ابتر حال میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

❁ ❁ ❁

مسعود صاحب شام تک بھی واپس نہیں آئے۔ ان سے رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ عبدالحق ان کی طرف سے بھی پریشان تھا کہ نجانے ان کی اہلیہ اب کس حال میں ہوں۔ ویسے اگر

کچھ بہتر ہوگئی ہوتیں تو مسعود صاحب کیمپ ضرور آتے۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو وہ کیمپ سے نکلا اور تھانے کی طرف چل دیا۔ وہاں تھانے دار صاحب موجود تھے۔ اس بار ان کا انداز مختلف تھا۔ انہوں نے خود ہی اپنی طرف بلا لیا۔ "ارے...... تم وہی ہو نا' جو اس دن خان صاحب کے ساتھ آئے تھے؟"

عبدالحق ان کے تجاہلِ عارفانہ کو سمجھ گیا۔ ابھی دوپہر کو ہی اس نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا' جیسے اسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ "جی ہاں' میں وہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں دوپہر کو بھی آیا تھا۔ مگر......"

"اوہ تو وہ تم تھے۔ معاف کرنا' میرا ذہن اس وقت الجھا ہوا تھا' تمہیں پہچان نہیں سکا۔" تھانے دار نے کہا۔ "آؤ بیٹھو۔ میں نے اپنے اسٹاف سے افضال کا خاص طور پر خیال رکھنے کو کہہ دیا ہے۔"

عبدالحق کہنا چاہتا تھا کہ دوپہر کو اسے بتا دیا گیا تھا کہ کس طرح ان کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ مگر اسے خیال آیا کہ شاید یہ مناسب نہیں ہوگا۔ "جی...... ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔"

"ایسے نہ کریں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔ مگر دیکھیں نا' یہ قتل کا کیس ہے۔ اور سنائیں' خان صاحب کیسے ہیں؟ وہ تشریف نہیں لائے۔"

"ان کی اہلیہ بیمار ہیں اور اسپتال میں ہیں۔ اسی لیے وہ نہیں آ سکے۔ شاید کل آئیں۔"

"تم انہیں بتا دینا کہ افضال صاحب خیریت سے ہیں۔" تھانے دار نے کہا اور پھر آواز لگائی "نبی داد...... او نبی داد' ادھر آ۔"

ایک کانسٹیبل لپکا ہوا ان کی طرف چلا آیا۔ "ان صاحب کو لے جا کر افضال صاحب سے ملا دے۔ اور ہاں' وقت کی کوئی قید نہیں ہے ان کے لیے۔ ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنا۔ یہ خان صاحب کے آدمی ہیں۔ اور اب میں گھر جا رہا ہوں۔" تھانے دار نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔

نبی داد بھی تھانے دار کے ساتھ باہر چلا گیا۔ عبدالحق تھانے کے معاملات پر غور کر رہا تھا۔ اسے پولیس والوں کی ڈھٹائی پر حیرت ہو رہی تھی۔ خان صاحب بڑے افسر تھے۔ تھانہ داران سے ڈرتا تھا' ان کا لحاظ بھی کرتا تھا' مگر اس کے باوجود اس نے دوپہر کو اسے جھڑک دیا تھا...... پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ اور سوچی سمجھی سکیم کے تحت اس سے رشوت وصول کی گئی یہ سب کچھ تھانے دار کے حکم کے مطابق ہوا ہوگا' اور اب وہ خود کو اس سے بے تعلق ظاہر کر رہا تھا۔ انہیں یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ بات مسعود صاحب تک پہنچ سکتی ہے۔

"ارے صاحب' ادھر آئیں نا۔" کسی نے اسے پکارا۔

وہ ہیڈ محرر تھا' جو اس وقت اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا تھا۔ عبدالحق اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔

"آپ کا مہمان سو رہا ہے اس وقت۔ کھانا کھا کر جیسے نشہ ہو گیا اسے۔"

عبدالحق نے کچھ نہیں کہا اس کا موڈ خراب تھا۔

"ہمارے بیچ جو کچھ ہوا' اس کے بارے میں مسعود خان صاحب کو نہیں بتایئے گا۔"

"کیوں؟ اس میں کیا حرج ہے؟" عبدالحق کے لہجے میں چیلنج تھا۔

ہیڈ محرر کے تیور اچانک بدل گئے۔ "کوئی حرج نہیں۔ بس لحاظ کی بات ہے۔ ورنہ ہمارا ا[ن] سے کیا تعلق۔"

"ایک بات بتائیں۔ کیا انگریز کے دور میں بھی یہ سب ہوتا تھا۔"

"دیکھو برخوردار' میں بیس سال سے اس محکمہ میں ہوں۔ اور پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ تر[قی] صرف اس لیے نہیں ہو سکی کہ میں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ اب میں آپ کو بتاؤں' تاریخ گواہ [ہے] کہ جن لوگوں کے پاس اختیارات ہوتے ہیں' انہیں نذرانے بھی ملتے ہیں۔ بادشاہوں کے دو[ر] میں بھی یہ ہوتا آیا ہے لیکن بڑے پیمانے پر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ انہیں سرکار بہت کچھ دیتی تھی۔ ضرورت کے تحت کوئی رشوت نہیں لیتا تھا۔ صرف جمع کرنے کی حرص میں مبتلا لوگ رشوت لیتے او[ر] پکڑے جاتے تو سزا بھی بہت ملتی تھی۔ اس لیے یہ عام نہیں رہی۔ پر یہ انگریز بڑا چالاک ہے۔ [و]ہ جانتا ہے کہ یہ سدا یہاں حکومت نہیں کر سکتا۔ ایک نہ ایک دن اسے رخصت ہونا ہو گا۔ اور یہ بہت دور تک کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ اس نے بہت پہلے سے اس سلسلے میں کام شروع کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ رشوت ہمارے ہاں حرام ہے' اور بہت بڑی خرابیوں کا سبب بنتی ہے۔ اس نے تمام محکموں میں جہاں رشوت کی گنجائش تھی' ملازمین کی کم تنخواہیں مقرر کیں...... رشوت کے فروغ کے لیے۔ تو برخوردار' رشوت تو انگریز نے ہی عام کی۔ ہمیں بس اتنا خیال رکھنا ہوتا تھا کہ انگریزوں اور ان کے حواریوں کے خلاف نہ جائیں۔ باقی ہم آزاد تھے۔ لیکن بڑے آدمی کی سفارش پر عمل کرنا ضروری تھا۔ اور بڑا آدمی وہ تھا' جو انگریزوں کا منظورِ نظر ہو۔"

عبدالحق حیران تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس شخص میں اتنی گہرائی ہو گی۔ وہ ہیڈ محرر تو خالص علمی گفتگو کر رہا تھا۔ "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" اس نے کہا۔ اس بار اس کے لہجے میں اس کے لیے احترام تھا۔

"میں جواب دے رہا ہوں۔ میں نے تمہیں غلامی کے دور کی رکاوٹوں کے بارے میں بتایا۔ لیکن یہ طے ہے کہ حرام خوری ہمارے مزاج میں رچ گئی ہے۔ اور اب ہم آزاد ہیں۔ آزادی کا مطلب ہم سے پوچھو' اب کسی بڑے آدمی کے کہنے پر تمہیں نکالا نہیں جا سکتا۔ یہاں کی ہے پولیس کی' زیادتی نہیں ہے۔ اب تم مجھے نکلوا دو تو مجھ جیسے تربیت یافتہ پولیس والے کا متبادل کہاں سے لاؤ گے۔ یہاں تو اضافے کی فکر کرنی ہو گی۔ تو اب ہم تمہارے خان صاحب سے کیوں [نہ] ڈریں۔"

"لیکن رشوت تو حرام ہے۔"

"انسان بن کر سوچو برخوردار۔ جانتے ہو' میری تنخواہ سات روپے ہے۔ بچے ہیں میرے۔ بیٹے ابھی چھوٹے ہیں میرے دو بیٹیاں جوان ہو چکی ہیں۔ دو جوانی کی سرحد پر کھڑی ہیں۔ خیر' یہ تو بعد کی فکر ہے۔ یہ سوچو' تیرہ پیٹ ہیں میرے ساتھ۔ کیا میرا گزارا ہو سکتا ہے۔ اس تنخواہ میں؟"

عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔ واقعی...... یہ ممکن ہی نہیں تھا۔

اسی لمحے نبی داد آ گیا۔ ہیڈ محرر نے اس سے کہا۔ "ذرا ان کے بندے کو جا کر دیکھو۔ اٹھ گیا ہے یا نہیں۔"

نبی داد گیا' اور واپس آ کر اسے بتایا کہ افضال صاحب ابھی سو رہے ہیں۔

"بولو تو جگا دیا جائے اسے۔ ویسے ہم کسی کو حوالات میں ایسے آرام سے سونے نہیں دیتے۔"

عبدالحق کو خیال آیا کہ افضال صاحب تو کبھی آسانی سے سوتے ہی نہیں تھے۔ ان کی نیند خراب کرنا ٹھیک نہیں۔ "نہیں...... میں صبح آؤں گا۔" اس نے کہا۔

"چاہو تو انہیں دیکھ لو۔ ہم نے انہیں چادر اور تکیہ تک دیا ہے۔"

عبدالحق نے دیکھا اور مطمئن ہو گیا۔ "ایک بات پوچھوں آپ سے؟" اس نے ہیڈ محرر سے کہا۔ "آپ تجربہ کار پولیس افسر ہیں۔ یہ بتائیں' آپ کے خیال میں افضال صاحب بن رہے ہیں یا وہ سچ مچ ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت ان کی یادداشت مٹ چکی ہے۔ چاہے یہ وقتی طور پر ہو۔ جتنا کچھ آج ان کے ساتھ ہوا ہے' اس کے بعد تو مُردے بھی بول اٹھتے ہیں۔"

عبدالحق تھانے سے نکل آیا۔

❁ ❁ ❁

زرینہ بہت خوش تھی۔ اس نے بھرا پُرا گھر کھویا تھا۔ مگر یہاں اللہ نے اسے بھرا پُرا گھر دے دیا تھا۔ سب لوگ بہت محبت کرنے والے تھے۔ اماں تو بہت ہی اچھی تھیں۔ محبت کے سوا کچھ جانتی ہی نہیں تھیں۔

زرینہ نے جب سے ہجرت کے وقت اپنا گھر چھوڑا تھا' تب سے دکھوں کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ آنکھوں کے سامنے گھر کے تمام لوگ ختم کر دیے گئے پاکستان پہنچی تو گھر سے محروم ہو چکی تھی۔ کیمپ ہی اس کا گھر تھا' جو کہ گھر ہرگز نہیں تھا لیکن ایک لحاظ سے کیمپ میں رہنے کا بہت فائدہ ہوا۔ آدمی جب کسی کو اپنے جیسے دکھ میں مبتلا دیکھتا ہے تو اس کا دکھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس نے تو وہاں کیمپ میں اپنے جیسے بے شمار لوگ دیکھے' جو پاکستان آتے ہوئے اپنا سب کچھ

لٹا آئے تھے ان میں بعض تو ایسے تھے کہ ان کے دکھوں کے سامنے اس کا اپنا دکھ بھی ہیچ تھا۔ چنانچہ وہ بہت آسانی سے اپنے دکھ بھول گئی۔ اور زندگی کی تازہ حقیقتوں کو اس نے قبول کر لیا۔

بس ایک پریشانی اسے تھی...... مستقبل کی فکر یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آدمی زندہ ہو اور مستقبل کے بارے میں نہ سوچے۔ مگر وہاں کیمپ میں مستقبل کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ بس ایک ہی زندگی' ایک سے صبح و شام۔ لگتا تھا زندگی اس کیمپ میں ہی ختم ہو جائے گی۔ لگتا تھا کہ دنیا ختم ہو گئی ہے۔ بس ایک کیمپ ہی بچا ہے۔ جیسے کیمپ سے باہر کچھ بھی نہیں۔

وہ بار بار سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتیں۔ دن ہو یا رات' آسمان بھی اسے آسمان نہیں' محض بڑا سا ایک شامیانہ لگتا تھا۔ جس میں رات کو ستاروں کے قمقمے روشن ہو جاتے تھے۔

لوگ باہر جاتے تھے۔ اس کا بھی دل چاہتا کہ باہر جائے لیکن وہ نہیں جا سکتی تھی۔ پھر جمیل نے اسے لالچ دیا کہ وہ ایک اچھے گھر میں اسے ملازمت دلا دے گا' جہاں اسے پیسے بھی ملیں گے اور ضرورت کی ہر چیز بھی۔ وہ ہر قیمت پر کیمپ سے نکلنا چاہتی تھی' اس لیے اس جھانسے میں آ گئی۔

باہر نکل کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ یہ دنیا بہت بڑی تھی۔ آسمان اتھاہ تھا اور ہر طرف گھما گھمی تھی' اس کا اعتماد بحال ہونے لگا مگر وہ بس تھوڑی دیر کی بات تھی۔ اس کے بعد اسے پتا چلا کہ اب وہ جہاں قید ہے' کیمپ کے مقابلے میں تو اسے بہت چھوٹا سا پنجرہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

مگر یہاں وہ پوری طرح آزاد تھی۔ زمین بھی اپنی' چلتے چلتے تھک جاؤ تو بھی زمین ختم نہ ہو۔ اور پھر اپنائیت ایسی' اور ایسی عزت کہ اتنی تو اسے ہندوستان میں اپنے پہلے گھر میں بھی نہیں ملی تھی۔ بس ایک نور بانو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ ابھی اپنائیت اور محبت سے بات کر رہی ہے' اور ابھی ایک دم سے بے مہر ہو جائے گی۔ اس کے نتیجے میں زرینہ اس سے دور ہو گئی۔ اور یوں وہ رابعہ سے قریب ہو گئی۔

گھر میں کام کرنے والی موجود تھی۔ اس کے باوجود چھوٹے چھوٹے کام کم تو نہیں ہوتے۔ زرینہ نے وہ سب سنبھال لیے۔ رابعہ کو تو وہ ہلنے ہی نہیں دیتی تھی۔ رابعہ نے ابتدا میں بڑی مزاحمت کی۔ اماں کا کہنا تھا کہ صاحب نے اس کا خیال رکھنے کو کہا ہے۔ ایسے جیسے وہ صاحب ہو۔ زرینہ نے نتیجہ لیا کہ اس حوالے سے وہ یہاں بالادست ہے۔ اس نے رابعہ کو بتا دیا کہ وہ جو چاہے کرے گی' اور وہ اسے روک نہیں سکتی۔

کیمپ میں بے کار ساکت و جامد زندگی گزارنے والی زرینہ کو زندگی گزارنے کا موقع ملا تو وہ اس میں کھو گئی۔ اس نے خود کو مصروف کر لیا۔ گھر سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ لوگ عبدالحق کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ اس کا رہا سہا خوف بھی دور ہو گیا۔

لیکن سوتی تو وہ نور بانو کے کمرے میں تھی۔ اور نور بانو ہمیشہ اسے عبدالحق کے سلسلے میں

ٹٹولنے کی کوشش کرتی' معلومات حاصل کرنا چاہتی۔ جبکہ زرینہ عبدالحق کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔ تنگ آ کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عبدالحق کے بارے میں بلا جھجک بات کیا کرے گی۔

❁......❁......❁

نور بانو کے لیے سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا...... مینو کے سوا۔ عبدالحق کی چادر اور مینو کے سوا اس کا کوئی مونس و دمساز نہیں تھا۔ زرینہ کے آنے کے بعد وہ پہلے کی طرح خود اعتمادی سے محروم ہو گئی تھی۔ وہی پہلے جیسے خدشے اور وسوسے اسے ستانے لگے تھے۔ اب تو نیند میں بھی وہ لذت نہیں رہی تھی۔ کیونکہ وہ عبدالحق کے خوابوں سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں چڑچڑاپن اور بدمزاجی تو آنی ہی تھی۔

زرینہ کو وہ مکار سمجھتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اگلے دن اس نے عبدالحق کو بھائی کہنا شروع کر دیا تھا۔ نور بانو کا خیال تھا کہ زرینہ نے اپنے ساتھ اس کے تفتیشی رویے کا سبب جان لیا تھا۔ اور اطمینان دلانے کے لیے اسے بھائی کہنے لگی تھی۔ ویسے وہ کوشش کرتی تھی کہ اس کا رویہ زرینہ کے ساتھ خراب نہ ہو۔ کچھ بھی ہو' وجہ کوئی بھی ہو' عبدالحق نے بہرحال واضح ہدایت کے ساتھ اسے یہاں بھیجا تھا۔ تو عبدالحق کی بات کا بھرم رکھنا تو ضروری تھا۔

دوپہر کا کھانا وہ دونوں حمیدہ کے ساتھ کھاتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ رات کو لازمی طور پر یکجا ہوتی تھیں۔ کھانے کے وقت نور بانو حمیدہ کے حجاب کی وجہ سے عبدالحق کا تذکرہ کبھی نہیں چھیڑتی تھی۔

اس روز کھانے پر حمیدہ نے زرینہ سے پوچھا۔ ”عبدالحق تو بہت کمزور ہو گیا ہوگا؟“

زرینہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ”میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں اماں میں نے تو بھائی کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں۔“

”اور کیمپ میں بھی زیادہ کہاں دیکھا ہے۔ بس دو ہی دن تو دیکھا تھا۔“ نور بانو نے موقع پا کر جلدی سے ٹکڑا لگایا۔

حمیدہ نے چونک کر زرینہ کو دیکھا۔ ”دو دن کیوں؟ وہ کیمپ میں ہی تو رہتا ہے نا۔ اور تو بھی وہیں تھی۔“

زرینہ جھنجلا گئی۔ یہ دو دن کا حوالہ تو اس کے لیے عذاب بن چکا تھا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے سوچا کہ عبدالحق تو نجانے کب واپس آئے گا۔ اس کے آنے تک نجانے اسے کتنے جھوٹ بولنے پڑیں گے۔ البتہ ایک سچ اسے ہر جھوٹ سے بچا سکتا ہے۔ یوں اسے نور بانو کی ہر وقت کی تفتیش سے بھی نجات مل جائے گی۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ”اماں...... کیمپ میں ہزاروں لوگ ہوتے ہیں یہ سچ ہے کہ بھائی سے صرف دو دن پہلے ملی تھی۔ پھر انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ اور ہاں اماں چلتے

ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے بارے میں آپ لوگوں کو وہ خود یہاں آ کر بتائیں گے۔"

یہ سنتے ہی نور بانو کا چہرہ فق ہو گیا۔ یہ بات تو بڑی معنی خیز تھی۔ زرینہ کبھی عبدالحق کے بارے میں لگاوٹ سے گفتگو نہیں کرتی تھی' جیسے اسے اس کی پرواہی نہ ہو لیکن عبدالحق کا اس سے یہ کہلوانا...... اور کون جانے' یہ بھی زرینہ نے خود ہی گھڑ لیا ہو۔ "یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟" اس نے اعتراض کیا۔

"یہ کہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔"

حمیدہ بچی نہیں تھی۔ یہ تو پہلے ہی دیکھ چکی تھی کہ ان دونوں کے درمیان یک طرفہ کشیدگی ہے...... صرف نور بانو کی طرف سے۔ اور اس کا مطلب عبدالحق ہے لیکن اس وقت تو یہ بات کھل کر واضح ہو گئی تھی۔ خود اسے اس بارے میں ذرا بھی تردد نہیں تھا لیکن اس وقت کی بات نے اسے بھی چونکا دیا کہ کوئی خلاف توقع بات بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے زرینہ کے چہرے پر ردعمل دیکھنے کے لیے نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "اچھا دھیے یہ بتا کہ تیرے بھائی نے واپسی کے بارے میں کچھ کہا تھا۔" تیرے بھائی کہتے ہوئے اس نے خاص طور پر دیکھا لیکن زرینہ کا چہرہ بے تاثر رہا۔

"بس اماں' بھائی نے اتنا کہا کہ وہ اپنا کام کر کے ہی آئیں گے۔" اس جانچ پڑتال سے بے خبر زرینہ نے سادگی سے کہا۔

حمیدہ پوری طرح مطمئن ہو گئی۔ لیکن نور بانو پوری طرح بھڑک چکی تھی۔

زرینہ نے برتن سمیٹے اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اماں...... میں ذرا آپا کو دیکھ لوں' اس نے جاتے جاتے کہا۔

نور بانو اٹھنے لگی تو حمیدہ نے ہاتھ تھام لیا۔ "تو کہاں چلی۔ یہاں بیٹھ نا میرے پاس۔"

نور بانو بیٹھ گئی لیکن وہ حمیدہ سے نظریں چرا رہی تھی۔

"تو تو اب میرے پاس بیٹھتی ہی نہیں۔ کچھ ناراض ہے مجھ سے۔"

"ارے نہیں اماں۔ آپ سے میں کیسے ناراض ہو سکتی ہوں" نور بانو نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر اتنی دور دور کیوں رہتی ہے؟"

"یہ بات نہیں اماں۔ دور تو آپ ہوئی ہیں۔" نور بانو کو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا موقع مل گیا۔ "نئی اور خوبصورت بیٹی جو مل گئی ہے آپ کو۔"

"لے...... وہ کب آتی ہے میرے پاس وہ تو ہر وقت رابعہ کی فکر میں لگی رہتی ہے بے چاری۔ اور رہی بات خوبصورتی کی تو مجھے تو تُو زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔"

"میں ہر روز آئینہ دیکھتی ہوں اماں۔ مجھے حقیقت معلوم ہے۔ آپ میرا دل رکھنے کے لیے

کہہ رہی ہیں نا۔" نور بانو کا دل بھر آیا۔

حمیدہ کو اس پر پیار بھی آیا اور غصہ بھی۔ "سن میری دمی' آج میں تجھے وہ بات سمجھاؤں گی' جو شاید تجھے تیری ماں بھی کبھی نہ سمجھاتی۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اس لیے کہ تیری ماں نے بھی تجھے اتنا نہیں سمجھا ہوگا' جتنا میں سمجھ گئی ہوں۔ تُو دیے کی طرح ہے' جو روشن اسی وقت ہوتا ہے' جب جلتا ہے۔ اس کی زندگی ہی جلنا ہے' اس کا کام بھی یہی ہے۔ نہ جلے تو اسے چین نہیں آئے۔ تُو اس بچے کی طرح ہے' جسے ہر وقت سردی لگتی ہے۔ اور وہ ہاتھ تاپنے کے لیے آگ جلاتا ہو' اور پھر تاپتے تاپتے اپنے ہاتھ جلا بیٹھتا ہو۔ ظاہر میں تو جلنے سے ڈرتی ہے' پر اندر ہی اندر تجھے جلنے کا شوق ہے......"

نور بانو سن ہو کر رہ گئی۔ غور کیے بغیر بھی وہ جان گئی تھی کہ اماں سچ کہہ رہی ہے۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اماں کتنی عقل مند ہیں۔

"اب تجھے ایک کام کی بات بتاؤں۔ جیسے یقین میں بڑی طاقت ہوتی ہے' ویسے ہی شک میں بھی ہوتی ہے۔ بلکہ شک چاہے طاقت میں یقین سے کم ہو' اثر میں اس سے تیز ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یقین نیکی ہے اور شک بدی۔ اور بدی نیکی سے آسان ہوتی ہے۔ تو دمی میری' تُو یقین تو کرتی نہیں' پر گمان کرتی ہے۔ اور گمان کا یہ ہے کہ کیے جاؤ تو پھر پورا ہو کر رہتا ہے۔ آدمی کو بڑی طاقت دی ہے اللہ نے۔ پر وہ اس طاقت کے ساتھ الٹے راستے پر چل پڑے تو یہ اس کا نصیب۔"

نور بانو اندر ہی اندر لرز گئی۔ اماں تو جیسے اسے اندر سے دیکھ رہی تھی...... آر پار۔ واقعی امی نے کبھی اسے نہ اس طرح محسوس کیا تھا' نہ اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ سوچنے کا تو ابھی اسے موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن کی گرہیں کھل رہی ہیں۔

"میری بات تیری سمجھ میں آ رہی ہے؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"جی اماں لیکن میں کیا کروں' میں شاید ایسی ہی ہوں"

"ایسا کوئی ہوتا نہیں۔ ہاں خود کو بنا لیتا ہے ایسا۔ میں نے دیکھا ہے' تُو اپنی صورت شکل کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ مجھے یہ تو پتا ہے کہ تیری بہنیں تھیں۔ تُو مجھے یہ بتا کہ کیا وہ بہت...... بہت زیادہ خوبصورت تھیں؟"

"ہاں اماں......" نور بانو نے فوراً کہا۔

"جبھی تو۔ اب تجھے ایک بات بتاؤں۔ یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ بہت خوب صورت ہوتے ہیں اور کچھ بدصورت۔ ان کے علاوہ لوگ عام سے ہوتے ہیں۔ پر خوب صورتی دو طرح کی ہوتی ہے بچی۔ ایک باہر کی' اور ایک اندر کی۔ باہر کی خوبصورتی وقتی ہوتی ہے' جیسے پھول مرجھا جاتا ہے۔ اور اندر کی خوب صورتی دیرپا ہوتی ہے۔ اندر کی خوبصورتی نظر نہیں آتی لیکن محسوس

کی جاتی ہے۔ اور محسوس کرنے پر باہر کی خوبصورتی سے زیادہ صاف نظر آتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ بہت خوبصورت لڑکی بھی سب کو اچھی نہیں لگتی۔ اور بہت بدصورت لڑکی بھی بہت سوں کو اچھی لگتی ہے۔ دنیا میں آج تک کوئی لڑکی اس لیے شادی سے محروم نہیں رہی کہ وہ بدصورت ہے۔ اللہ نے کسی کو بھی محبت سے محروم نہیں رکھا۔ اور میاں بیوی کے رشتے کا تو یہ حال ہے کہ میاں کو اپنی بیوی سے خوبصورت کوئی نہیں لگتا اور بیوی کو اپنے میاں سے زیادہ کوئی نہیں بھاتا۔ یہ اللہ کی رحمت ہے اس رشتے پر۔ ہاں جن کے دل خراب ہوتے ہوں' ان کی بات اور ہوتی ہے۔"

نور بانو کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ حمیدہ کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھی۔

"تُو نے یہی سمجھا ہے نا کہ میرے پتر نے اس زرینہ کو اپنے لیے پسند کر کے یہاں بھیجا ہے؟" حمیدہ کا لہجہ کچھ سخت ہو گیا۔ "اور تُو نے یہ بھی سمجھا ہے کہ مجھے بھی زرینہ تجھ سے زیادہ اچھی لگی ہے۔ اس لیے کہ وہ تجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اور آگے جا کر تُو رابعہ اور زبیر کے بارے میں بھی یہی سوچے گی۔ اب یہ دیکھ کہ زرینہ اتنی دور سے زبیر کے ساتھ اکیلی آئی ہے۔ ہے نا؟ اب جا کر رابعہ سے پوچھ کہ اس کے دل میں ان دونوں کے لیے کوئی برا خیال بھی آیا۔ بھروسہ اور یقین بڑی چیز ہوتا ہے دھی میری۔ یہی تو رشتوں کو پکا کرتا ہے۔ نہیں تو رشتے کچے دھاگوں کی طرح ہوتے ہیں۔ میں تجھے عبدالحق کی ماں بن کر نہیں' تیری ماں بن کر سمجھا رہی ہوں۔"

نور بانو کے منہ میں آواز نہیں تھی' بولتی کیا۔ ایسی شرمندگی اسے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

"اب تجھے بتاؤں' میں عبدالحق کو ایسے جانتی ہوں' جیسے اپنے اس ہاتھ کو۔" حمیدہ نے اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "دودھ پلایا ہے اسے' میری گود میں پلا ہے وہ۔ اس نے اس زرینہ کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اسے مصیبت میں دیکھا ہوگا' تو اس کے کام آنے کا سوچا ہوگا۔ اور رہی میں تو میں زرینہ کے دکھوں کی وجہ سے اس سے ہمدردی کرتی ہوں۔ اور اس لیے کہ میرے بیٹے نے اسے اپنا مقام دے کر یہاں بھیجا ہے۔ مجھے اس کی خوبصورتی سے غرض نہیں۔ میں نے تجھے بہو بنانے کا کہا تو تیری صورت شکل نہیں دیکھی۔ تیرے اندر کی خوب صورتی دیکھی اور یہ دیکھا کہ عبدالحق تجھے پسند کرتا ہے' تجھے بہت بلند سمجھتا ہے۔ پر مجھے پتا نہیں تھا کہ تیرے اندر یہ بدصورتی موجود ہے۔ تُو اس سے پیچھا چھڑا لے بیٹی ورنہ اس کے ساتھ شادی کے بعد تیری زندگی بھی جہنم بن جائے گی اور میرے پتر کی بھی۔ جو تُو برا سوچے گی تو وہ تیرے سوچنے ہی کی وجہ سے آخر سچ ہو جائے گا۔ تُو اپنے شک اور گمان کی وجہ سے چڑچڑی اور کھنچی کھنچی سی رہے گی تو ایک دن زبیر اور رابعہ بھی اکتا جائیں گے' اور میں بھی۔ پھر وہی سچ ہو جائے گا نا جو تُو نے سوچا تھا۔ تو نقصان کس کا ہوگا؟ تیرا اپنا! بیٹی یاد رکھ برا گمان رکھنے والے کے ہاتھوں میں بس شرمندگی ہی آتی ہے...... اور کبھی کبھی وہ بھی وقت نکل جانے کے بعد۔"

نور بانو سر جھکائے بیٹھی رہی۔ حمیدہ کی ہر بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ کبھی کسی نے اسے ایسے سمجھایا ہی نہیں تھا۔ اور امی کیسے سمجھا سکتی تھیں اسے۔ وہ اسے سمجھتیں تو اسے سمجھاتیں نا۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں ابھی آئی تھی کہ کسی کو کچھ سمجھانے کے لیے اس کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

تو وہ سمجھ گئی جس نقصان کی طرف اماں اشارہ کر رہی ہیں۔ وہ اس کے بہت قریب پہنچ چکی ہے۔ اسے خود کو سنبھالنا ہوگا' بدلنا ہوگا۔ "اماں...... میں بہت شرمندہ ہوں......" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں یہ نہیں چاہتی دھیے۔ میں تو تجھے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"آپ میری ماں ہیں نا اماں۔"

"ہاں' اور اس میں کبھی شک نہ کرنا۔"

نور بانو نے اب تک بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ اپنی کمزوریاں بھی وہ جان گئی تھی۔ اور اظہار کی اہمیت سے بھی وہ واقف ہو چکی تھی۔ پھر اسے حمیدہ جیسی شفیق اور عقل مند عورت بھی مل گئی تھی۔ "تو اماں بیٹیاں ماں سے دل کی ہر بات کہہ سکتی ہیں نا؟"

"ہاں...... اور اس سے دل بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔"

"تو اماں' آج میں آپ کو دل کی بات بتاتی ہوں۔ میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں اماں۔" یہ کہتے ہی اسے احساس ہوا کہ دل پر رکھی کوئی بھاری چٹان ہٹ گئی ہے۔

حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ حیرت اس کی بات پر نہیں تھی' کیونکہ یہ تو وہ جبلی طور پر جان چکی تھی کہ نور بانو کو عبدالحق سے محبت ہے' حیرت اسے اس بات پر تھی کہ نور بانو اپنی زبان سے کہہ رہی ہے۔

"اور اماں' میرے اندر کی ساری خرابیاں میری بے اعتمادی' اور بے یقینی کی وجہ سے ہیں۔ اور بے اعتمادی اور بے یقینی کا سبب یہ ڈر ہے کہ وہ مجھے کبھی نہیں ملیں گے۔ اس لیے کہ وہ بہت اچھے ہیں اور میں اتنی ہی بری ہوں۔ میں ان کے قابل ہوں ہی نہیں' لیکن اماں' اگر اللہ کی مہربانی سے وہ مجھے مل گئے تو میں بالکل بدل جاؤں گی۔ انہی سے میرا اعتماد ہے' اور انہی سے میرا یقین۔"

حمیدہ نے محبت سے اسے لپٹا لیا۔ "تو سمجھ لے کہ وہ تجھے مل گیا۔ بس تُو اس کے آنے کی دعا کر۔ باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔ تُو تو میری دولت ہے۔ تُو میری بیٹی ہے اور بہو بھی۔ اور تیری وجہ سے عبدالحق میرا جوائی ہوگا۔"

نور بانو کمرے سے نکلی تو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ گویا ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔

❊ ❊ ❊

افضال صاحب کی حالت ویسی ہی تھی۔ ان کا کیس عدالت میں گیا۔ عدالت نے دماغی امراض کے کسی ڈاکٹر سے ان کے معائنے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ان کی یادداشت کھو چکی ہے۔ ہجرت کے عرصے میں اس طرح کے کیس بہت عام ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اتنا کچھ دیکھا ہے اور ایسا کہ وہ کچھ یاد رکھنا ہی نہیں چاہتے۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی بھی وقت' کسی بھی واقعے کے نتیجے میں اس کی یادداشت واپس آ سکتی ہے۔ لیکن یہ بات یقینی نہیں۔ ممکن ہے کہ چند دن میں ایسا ہو جائے' اور ممکن ہے' پوری زندگی اسی حال میں گزر جائے۔

اس کے بعد عدالت نے کیس کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ افضال صاحب نے جس ذہنی کیفیت میں قتل کیا تھا' اس میں انہیں ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا اس لیے انہیں دماغی امراض کے اسپتال میں بھیج دیا گیا۔

عبدالحق ہفتے میں کم از کم ایک بار ان سے ملنے ضرور جاتا تھا۔ ایک بات اس نے سمجھ لی تھی۔ وہ انہیں ان کے نام سے کبھی نہیں پکارتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس بات پر وہ بری طرح بھڑ کتے تھے لیکن اس کا تجسس بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ ان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اب وہ انہیں چچا کہہ کر پکارتا تھا اور ان کے سامنے افضال صاحب کو برا بھلا کہتا تھا۔ اس بات سے وہ بہت خوش ہوتے تھے۔

ایک عجیب بات تھی۔ وہ تازہ باتیں بھی فوراً ہی بھول جاتے تھے۔ موجودہ ملاقات میں انہیں پچھلی ملاقات کے بارے میں کچھ یاد نہیں ہوتا تھا۔ اور ہر بار وہ ان سے پوچھتا کہ ان کا نام کیا ہے۔

اور وہ کھو سے جاتے۔ ''یہی تو یاد نہیں آتا۔'' وہ بے بسی سے کہتے۔

''یاد کرنے کی کوشش تو کریں۔''

''کرتا ہوں...... بہت یاد کرتا ہوں۔ ارے آدمی کے لیے اس کا نام بہت اہم ہوتا ہے۔ پر ذہن پر زیادہ زور دوں تو جی متلانے لگتا ہے' اور چکر آنے لگتے ہیں۔ میں گھبرا جاتا ہوں۔''

''پھر آپ یہ کوشش نہ کیا کریں۔''

''مگر میاں' یہ بہت ضروری ہے دیکھو نا' کوئی نام تو ہوگا میرا۔ نام تو آدمی کی پہچان ہوتی ہے۔'' وہ بولے۔ پھر بہت اداس ہو کر کہا۔ ''میری کوئی بھی پہچان نہیں میاں۔''

''صرف نام سے کیا ہوتا ہے۔ آپ کے اپنے بھی تو ہوں گے۔ بچے بھی آدمی کی پہچان ہوتے ہیں۔''

وہ کچھ دیر سوچتے رہے جیسے ذہن پر زور دے رہے ہوں پھر انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بہت یقین سے کہا۔ ''نہیں میاں' میرے بچے نہیں ہیں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں۔ میری کوئی

پہچان نہیں۔''

عبدالحق کو ان پر بہت ترس آیا۔ ''میں ہوں نا آپ کی پہچان۔ آپ میرے چچا ہیں۔ میں بھتیجا ہوں آپ کا۔''

وہ ایک دم خوش ہو گئے۔ ''ہاں...... تم میری پہچان ہو۔ اچھا یہ تو بتاؤ' تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام عبدالحق ہے۔''

''اب کوئی پوچھے گا کہ میں کون ہوں تو میں کہہ دوں گا کہ میں عبدالحق کا چچا ہوں۔'' انہوں نے خوش ہو کر بہت معصومیت سے کہا۔

مگر اگلی ملاقات پر انہوں نے پھر اس کا نام پوچھا۔ ''آپ کو بتایا تو تھا پچھلی بار۔''

''ہاں...... بتایا تو تھا یہ میں ہر بات بھول کیوں جاتا ہوں۔'' وہ ہتھیلی سے پیشانی کو بری طرح مسلنے لگے۔

عبدالحق نے جلدی سے انہیں دوسری باتوں میں لگا لیا۔

مگر اس بار جو وہ آیا تو ایک اور ہی بات ہوئی۔ ''میاں' تم میرے بھتیجے ہو نا؟''

''جی ہاں۔''

''تو تمہیں میرا نام بھی معلوم ہوگا آخر میں تمہارا چچا ہوں۔''

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ ''ج...... جی ہاں...... مجھے معلوم ہے۔''

''تو مجھے بتاؤ نا' میرا نام کیا ہے۔''

عبدالحق نے جلدی سے کوئی نام گھڑنے کی کوشش کی۔ ''آپ کا...... آپ کا نام جمال ہے۔''

افضال صاحب بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔ ''واہ...... بہت اچھا نام ہے۔'' انہوں نے کہا۔ مگر پھر سے گئے۔ ''اچھا ہے...... مگر اس منحوس افضال کے نام سے ملتا جلتا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' عبدالحق نے انہیں تسلی دی۔

''اچھا میرے بھائی کا کیا نام ہے؟''

''آپ کے بھائی کا نام......'' عبدالحق بوکھلا گیا۔ ''م...... مجھے کیا معلوم؟''

''ارے بھئی' میرا بھائی تمہارا باپ ہی تو ہوا۔ تمہیں اپنے باپ کا نام نہیں معلوم!''

عبدالحق کی زبان پر بے ساختہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا نام آیا تھا' مگر اس نے بروقت خود کو روک لیا۔ یہ تو سب گڑبڑ ہو جاتا۔ اپنے بھائی کا ہندوانہ نام سن کر افضال صاحب بھڑک سکتے تھے۔

اگلے ہی لمحے وہ اداس ہو گیا۔ کاش...... کاش پتا جی کا کچھ اور نام ہوتا۔ کاش وہ مسلمان ہو گئے ہوتے۔ پھر اسے شرمندگی ہونے لگی۔ ایسے محبت کرنے والے عظیم انسان تھے اس کے پتا جی اور آج وہ ان سے تعلق پر شرمندہ ہو رہا ہے۔

"بتاؤ نا' میرے بھائی کا کیا نام تھا؟" افضال صاحب نے اسے چونکا دیا۔

"جی..... وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" عبدالحق نے ان کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

"اوہ..... مگر ان کا نام کیا تھا۔"

اب عبدالحق بتا جی کا نام تو نہیں بتا سکتا تھا لیکن راج پوت بچہ اپنی ولدیت مصلحتاً بھی نہیں تبدیل کر سکتا تھا۔ "مجھے یاد نہیں ہے چچا۔"

وہ ڈر رہا تھا کہ یہ مرحلہ بہت دشوار ہو جائے گا لیکن معاملہ برعکس ہوا۔ افضال صاحب بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگے۔ "دیکھا تم بھی بھول گئے۔ ارے نام تو کوئی بھی بھول سکتا ہے۔ میں یونہی پریشان ہوتا تھا۔"

عبدالحق نے سکون کی سانس لی۔

"چچا..... یہ بتائیں' آپ اس افضال کو کیسے جانتے ہیں؟" عبدالحق نے پوچھا۔ وہ عزت سے نام لیتا تو افضال صاحب بھڑک اٹھتے۔

افضال صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ "تعلق کی نوعیت یاد نہیں آتی۔" چند لمحے بعد انہوں نے کہا۔ "لیکن یہ جانتا ہوں کہ تعلق بہت گہرا تھا۔ اس لیے تو اس تعلق پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔"

"بہت گہرا تعلق تھا آپ کا اس سے؟"

"گہرا ہی ہوگا..... بہت گہرا۔ کیونکہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ مجھے یاد ہے۔ میں اس میں شریک تھا۔"

"آپ پاکستان اس کے ساتھ ہی آئے تھے؟"

"ہاں۔ اور اسی دوران تو میں نے اس کا اصل چہرہ دیکھا۔ اسی دوران تو مجھے اس سے شدید نفرت ہوئی۔" افضال صاحب کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"ایسی کیا بات ہوگئی اس سفر میں۔"

"بتانے والی بات نہیں ہے میاں۔" افضال صاحب نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی نہیں بتائیں گے چچا۔ میں تو بھتیجا ہوں آپ کا۔" عبدالحق نے انہیں اکسایا۔ "اور آپ بتائیں گے نہیں تو میں یہ کیسے مانوں گا کہ وہ بہت برا آدمی تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ آپ بلاوجہ اس سے نفرت کرتے ہیں....."

"بلاوجہ؟" افضال صاحب بھڑک گئے۔ "تم تو یہ سوچ سکتے ہو۔ مگر حقیقت میں جانتا ہوں۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور کانوں سے سنا ہے۔ اس کمینے کو تو سو بار قتل کر دیا جائے تو بھی کم ہے۔"

"تو پھر مجھے بتائیں نا۔ ورنہ میں تو آپ کو ہی غلط سمجھتا رہوں گا۔"

افضال صاحب نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ "میں کسی کو کچھ بتاؤں تو اس میں افضال کی ذلت اور رسوائی ہے۔ مگر نجانے کیا بات ہے کہ اتنی شدید نفرت کے باوجود اس کی ذلت اور رسوائی مجھے گوارا نہیں۔" ان کے لہجے میں اذیت تھی۔ "اب اسے تو اس کے کیے کی سزا مل گئی نا۔ تو پھر مزید ذلت اور رسوائی کیوں۔ وہ آخر میرا اپنا ہے۔ کوئی بہت قریبی تعلق ہے میرا اس سے۔"

عبدالحق کا دل بھر آیا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس وقت لوہا گرم ہے۔ اس نے کہا۔ "لیکن چچا' میں بھی تو آپ کا اپنا ہوں۔ مجھ سے کیا پردہ۔ اور میرا سینہ بہت گہرا ہے۔ ان کی ذلت اور رسوائی تو نہیں ہوگی۔ جیسے وہ آپ کا اپنا ہے' ویسے ہی میرا بھی ہے۔"

افضال صاحب نے سر اٹھا کر شکر گزاری سے دیکھا۔ پھر بولے۔ "نجانے کیا بات ہے میاں تم میں کہ تمہیں تو میں سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ تو سنو وہ افضال پشتینی رئیس تھا۔ اس کے علاقے میں اس کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ علاقے میں رہنے والے اس کی رعایا تھے۔ وہ مغرور اور متکبر تھا..... اپنے نام و نسب پر بھی' اپنی دولت پر بھی' اپنی زمین جائیداد پر بھی اور اپنی اولاد پر بھی۔ حالانکہ خطاب اور زمین انگریزوں کی غلامی کے صلے میں ملے تھے۔

"جب یہ پاکستان کا سلسلہ شروع ہوا تو اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں' اسے تو رعایا پر راج ہی کرنا تھا۔ اور اس کی رعیت میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ مگر جب اس کی رعایا میں ہندوؤں کے تیور بگڑنے لگے تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اب مزید وہاں رہنا اپنے غلاموں کی غلامی قبول کرنے کے برابر تھا۔ چنانچہ اس نے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"اب ہجرت کے وقت وہ کچھ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی یہی حکومت پاکستان میں قائم کرنا چاہتا تھا اس کا بس چلتا تو اپنی ساری زمین بھی اٹھا کر لے جاتا۔ بہرحال زمین نہ سہی' اس کے کاغذات اس نے رکھ لیے۔ زیورات اور نقدی الگ تھی۔ آگے کی اسکیم اس کے ذہن میں تھی۔ چار بیٹے تھے اس کے' اور اس دولت کے زور پر تو وہ پاکستان میں بھی وہی سب کچھ بنا سکتے تھے۔

"لیکن جب انہوں نے جانے کا ارادہ کیا تو پتا چلا کہ یہ اتنا آسان نہیں رہا ہے۔ اپنی حویلی میں بیٹھے اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ باہر کی فضا کتنی تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ تو اپنے زعم میں پہلے کی طرح حاکم بنا بیٹھا تھا۔ وہ تو اسے اس کے ایک وفادار نے بتایا کہ ہندوؤں نے آہستہ آہستہ کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔ اور اب وہاں سے نکلنا بھی مخدوش ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہندوؤں کی نظریں اس کی حویلی پر ہیں۔

"اب میں تمہیں تفصیل کیا بتاؤں۔ مختصر بتا دیتا ہوں۔ شہر میں فسادات شروع ہوئے اور افضال کی بادشاہت ختم ہو گئی۔ ایک دن اسے حویلی بھی چھوڑنی پڑی۔ فوجیوں نے اسے اس کی فیملی کے ساتھ کالج میں قائم کیمپ میں پہنچا دیا۔ راستے میں اس نے جو کچھ دیکھا' اس نے پہلی با

اسے لرزا دیا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ فرعونوں پر لرزہ چڑھے تو وہ بودے ہو جاتے ہیں۔ اندر سے کھوکھلے' لیکن جسم پر رعونت کا لبادہ۔ کیمپ تک پہنچنے سے پہلے اس نے راستے میں تین لڑکیوں کی خون میں نہائی ہوئی بے لباس لاشیں دیکھیں...... تین مختلف مقامات پر...... درختوں سے لٹکی ہوئی۔ اور ان کے جسموں کے نازک حصوں پر پینٹ سے...... پاکستان کے لیے تحفہ...... لکھا ہوا تھا۔ ان مناظر نے اسے لرزا دیا۔ لاشیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ ان پر کیا گزری ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔"

عبدالحق سحرزدہ سا سن رہا تھا۔ افضال صاحب جو کچھ بیان کر رہے تھے' ظاہر ہے کہ وہ ان کا آنکھوں دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ ان پر بیتی تھی لیکن اس بارے میں وہ ایسے بتا رہے تھے' جیسے وہ کوئی اور ہوں' اور افضال صاحب کو دیکھتے رہے ہوں۔ اس نے درمیان میں ہوں ہاں بھی نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیان کا وہ طلسم ٹوٹے......

"......افضال کے چار بیٹے تھے۔ بیٹی ایک ہی تھی۔ وہی تو ایک تھی' جس کے لیے اس نے گڑگڑا کر برسوں دعائیں کی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے کبھی کوئی دعا نہیں کی تھی۔ دعا کے بغیر ہی سب کچھ میسر تھا۔ تو چار بیٹوں کے بعد کئی برس کے انتظار کے بعد پیدا ہونے والی اس بیٹی سے اسے بہت محبت تھی۔ مگر اس وقت وہ پریشان ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے...... اس کی بیٹی کے ساتھ۔

"اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اسے طمانیت ہوئی کہ اس کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ چاروں بیٹوں کے پاس بھی برچھیاں تھیں اس کے علاوہ سامان میں بندوقیں بھی تھیں اور میگزین بھی۔

"کیمپ اس کی شخصیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ وہاں تو محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں موجود لوگ اپنے مقام' مرتبے اور اپنی حیثیتیں باہر ہی چھوڑ آئے ہیں۔ وہاں نفسا نفسی کا عالم تھا۔ اس کا مزارع بھی اسے نہیں پہچانتا تھا' اور برا یہ ہوا کہ وہ وہاں بہت دیر میں پہنچا۔ جو پہلے سے آئے ہوئے تھے' وہ نسبتاً بہتر حال میں تھے۔

"اب مزاج کی رعونت ایسے تو نہیں جاتی۔ دولت کا گھمنڈ اتنا ہی دیرپا ہوتا ہے' جتنی دولت۔ جب تک دولت' تب تک گھمنڈ۔ کیمپ میں غذا کی بہت شدید قلت تھی۔ کبھی اشیائے خورد و نوش کا ایک ٹرک آ جاتا۔ لیکن وہ اتنے لوگوں کے لیے کافی نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہاں ڈسپلن نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہاں وہ لوگ فائدے میں تھے' جو ہاتھ پھیلانے کے عادی تھے۔ جنہیں مانگتے ہوئے شرم آتی تھی' وہ خالی ہاتھ ہی رہ جاتے تھے۔ بس یوں کہو کہ چھٹ بھیئوں کی بن آئی تھی۔ بسکٹ کے پچاس پیکٹ لے لیتے۔ پھر ضرورت مندوں کو دس دس روپے کا بیچتے تھے۔ افضال کے لیے تو خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن میں نے وہاں بھوک سے بلکتے بچوں کی ماؤں کو اپنے کانوں

کے بُندوں کے بدلے بسکٹ کے وہ پیکٹ خریدتے دیکھا تھا۔

"وہ کیمپ افضال کے لیے ایک بھیانک خواب کی حیثیت رکھتا تھا۔ تکلیفیں تو وہاں ہر نوع کی تھیں لیکن سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ وہاں کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ غیر محفوظ ہونے کا یہ عالم تھا کہ فوج کی حفاظت میں ہونے کے باوجود کیمپ پر تقریباً ہر روز حملہ ہوتا تھا۔ اس کے نتیجے میں کیمپ میں خوف و ہراس مستقل تھا۔

"ایک دن افضال نے ایک فوجی سے پوچھا۔ "کیا اب ہماری زندگی یہیں گزرے گی؟"

فوجی نے غیر معمولی تحمل کا مظاہرہ کیا۔ "بڑے صاحب' گاڑی آئے گی تبھی تو آپ سب کو اسٹیشن پہنچائیں گے۔ ابھی سے لے جا کر وہاں ڈال دیں آپ لوگوں کو تو فسادیوں کے ایک ہی حملے میں سب ختم ہو جائیں گے۔"

"تو گاڑی کب آئے گی؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا بڑے صاحب۔"

"وہ بے بسی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو گیا۔ اب تو اقتدار بس اسے پاکستان میں ہی مل سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اُڑ کر پاکستان پہنچ جاتا۔ لیکن پاکستان جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

"خیر' بالآخر ایک دن ٹرک آ گئے۔ اس وقت تک افضال کا دماغ درست ہو چکا تھا۔ وہ اپنی نوابی بھول گیا۔ ورنہ وہ لوگ پیچھے ہی رہ جاتے کیونکہ ٹرکوں کی تعداد پناہ گزینوں کی ضرورت سے بہت کم تھی۔ ٹرکوں کی روانگی کے بعد آدھے سے زیادہ لوگ کیمپ میں رہ گئے تھے۔

"راستے میں ٹرکوں کے اس قافلے پر بھی سکھوں نے حملہ کر دیا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ ٹرک روک دیے گئے۔ اس دوران لاڈلی بیٹی نے افضال سے کہا۔ "ابا میاں، آپ کے پاس طمنچہ تو ہے نا؟"

"ہاں بیٹی!" افضال نے جیب تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "کیوں پوچھ رہی ہو تم؟"

"میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں ابا میاں۔"

"مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔"

""وعدہ کریں کہ آپ مجھے ان لڑکیوں کی طرح مرنے نہیں دیں گے' جن کی لاشیں ہم نے کیمپ آتے ہوئے دیکھی تھیں۔"

"افضال تھرا گیا۔ گویا سر جھکا کر بیٹھی ہوئی بیٹی نے وہ منظر دیکھ لیا تھا۔ "تم پریشان نہ ہو جانِ پدر۔ ایسی نوبت نہیں آئے گی۔" اس نے کہا۔

"جانتی ہوں ابا میاں۔ آپ بہت بہادر ہیں۔ مگر جب کچھ بھی بس میں نہ رہے تو ایک گولی میرے دل میں اتار دیجیے گا۔"

''ایسی باتیں نہ کرو......''

''نہیں ابا میاں' آپ مجھ سے وعدہ کریں۔''

''اچانک افضال کی غیرت جوش میں آ گئی۔ اس کام کے لیے وعدے کی ضرورت نہیں جانِ پدر ایک گولی تمہارے لیے ہوگی اور آخری گولی میرے لیے۔ ہم عزت سے جیتے آئے ہیں' مریں گے بھی عزت سے۔'

ٹرکوں کی حفاظت کے لیے آنے والے فوجی تعداد میں کم تھے۔ کیمپ کی حفاظت کے لیے بھی وہ خاصی نفری چھوڑ آئے تھے۔ کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ طاقت تقسیم ہو جانے پر بلوائی کیمپ پر حملہ کر سکتے ہیں۔ پھر بھی وہ بڑی بے جگری سے لڑے اور بلوائیوں کو مار بھگا دیا۔ دو فوجی البتہ شہید ہو گئے۔

''اسٹیشن پر سکھ فوجی بھی موجود تھے۔ ان کی نگاہوں میں عناد تھا۔ تاہم انہوں نے تعرض نہیں کیا۔ ہزاروں کا مجمع پلیٹ فارم پر ٹرین کا منتظر تھا۔ بالآخر ٹرین آئی اور بھگدڑ مچ گئی۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا نہ صرف وہ اور اس کے اہلِ خانہ سب سے پہلے ڈبے میں گھس جائیں' بلکہ اپنا سامان بھی چڑھا دیں۔ افضال کو اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ پھر چار جوان بیٹے اس کی طاقت تھے۔ وہ لوگ ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔

''وہاں صورت حال یہ تھی کہ ڈبے میں 32 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور سو سے زیادہ افراد سوار ہو چکے تھے۔ دونوں پیروں پر کھڑے ہونے کی جگہ ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ تاہم افضال اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

''گاڑی روانہ ہوئی لیکن اس کی رفتار اتنی کم تھی کہ کوئی بھی بہ آسانی ایک ڈبے سے اتر کر آگے والے ڈبے میں سوار ہو سکتا تھا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ ڈرائیور سکھ ہے اور جان بوجھ کر گاڑی آہستہ چلا رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ گاڑی پر اس کی بساط سے زیادہ وزن ہے۔ اس لیے انجن پوری رفتار سے چلنے سے قاصر ہے۔

''چند گھنٹے گزرے تو خوشی اور عافیت کا وہ احساس ہوا ہوگا' جو ٹرین پر سوار ہونے کے بعد انہیں ملا تھا۔ اس وقت تو لوگوں کو یہی لگا تھا کہ بس اب خیریت ہی خیریت ہے' بس سمجھ لو اب پاکستان پہنچ گئے لیکن چند گھنٹوں میں جو مسائل سامنے آئے' انہوں نے مسافروں کے ہوش اُڑا دیے۔ ڈبے میں چھوٹے بچے بھی تھے اور کسی کے پہلو بدلنے کی گنجائش تک نہیں تھی۔ ایسے میں پیشاب پاخانہ کا کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر ستم ٹرین کی رفتار' لگتا تھا کہ حشر کے روز ہی پاکستان پہنچے گی۔ بدبو سے دماغ پھٹنے لگا۔ تدارک کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ لیکن اللہ نے انسان میں سمجھوتا کرنے کی زبردست صلاحیت رکھی ہے۔ مزید چند گھنٹوں میں لوگ اس کے عادی ہو گئے۔ لیکن وہ سلسلہ رکنے والا نہیں' مسلسل بڑھنے والا تھا۔ مسائل کی وہاں کوئی حد نہیں تھی۔ نکلتے

وقت تو صرف جان بچانے کی فکر تھی۔ مگر اب بھوک اور پیاس کا سامنا بھی تھا۔ بچے بھوک سے بلکنے لگے۔ مائیں چمکارتیں اور جھنجلائے ہوئے بے بس باپ بچوں کی پٹائی کر دیتے' اور پھر اس پر دل گرفتہ ہو کر ایک طرف بیٹھ جاتے۔

''رات کے اندھیرے میں ٹرین رک گئی۔ سب سہم گئے کہ شاید حملہ ہونے والا ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جھانکنے پر پتا چلا کہ گاڑی ایک ویرانے میں کھڑی ہے۔ گاڑی وہاں کئی گھنٹے رکی رہی۔

''اس وقت سب کو یقین تھا کہ گاڑی رکی ہے تو حملہ بھی ہوگا۔ بیٹی نے افضال کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ افضال کے ہاتھ میں اس وقت طمنچہ تیار تھا۔ اس نے کہا...... میں نے کہا تا جانِ پدر کہ اس کام کے لیے وعدہ لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو میں فرض کے طور پر خود ادا کر دوں گا۔

''سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ٹرین درمیان میں کسی اسٹیشن پر رکتی تو مسافر سرکاری نلکوں سے پانی بھر لاتے۔ کھانے کی البتہ کوئی سبیل نہیں تھی۔ اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں تھا۔ ڈبے کا ماحول اس قدر بدبودار تھا کہ کچھ کھا لینا اور عذاب ہو جاتا۔ بہت لوگوں کو الٹیاں ہو رہی تھیں۔ یوں ڈبے کی گندگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ چوتھے دن تک سب نڈھال ہو گئے۔ کسی میں جان باقی نہیں رہی تھی۔ کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ یہ سفر کبھی ختم ہوگا۔ اور وہ پاکستان کی زمین پر قدم رکھ سکیں گے۔

''چوتھی رات قیامت کی رات تھی۔ ٹرین حسب معمول رکی۔ تین راتیں اسی معمول میں مگر خیر و عافیت سے گزری تھیں۔ اس لیے مسافر مطمئن تھے۔ ادھر ڈرائیور کا کہنا تھا کہ اگلے روز دوپہر تک وہ پاکستان پہنچ جائیں گے۔ ایسے میں اچانک گاڑی پر حملہ ہو گیا۔

''حملہ آور بہت بڑی تعداد میں تھے' اور ان کے پاس ہر طرح کا اسلحہ تھا۔ اس ڈبے میں افضال اور اس کے بیٹوں کے سوا کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ افضال تو اپنی سیٹ پر یوں بیٹھا تھا' جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ اس کے چاروں بیٹے البتہ بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ حملہ آوروں کو صرف اسی ڈبے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بلکہ ان کا جانی نقصان بھی ہوا تھا۔ انہوں نے پوری طاقت وہیں لگا دی۔

''گھپ اندھیرے میں فائروں کی روشنی کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی۔ افضال کو احساس تھا کہ بیٹی ملتجیانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ مگر اسے اپنا طمنچے والا ہاتھ بے جان محسوس ہو رہا تھا۔

''پھر صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ تب افضال نے دیکھا کہ مزاحمت کرنے والا بس اس کا منجھلا بیٹا بچا ہے۔ اس کے علاوہ تینوں بیٹے شہید ہو چکے تھے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن جسم بے جان ہو رہا تھا' اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اسی لمحے اپنے اس بیٹے کو بھی گرتے دیکھا اور ٹوٹتے لفظوں میں اس

کے کلمہ پڑھنے کی آواز سنی۔ پھر اوپر چڑھتے ہوئے ڈبے میں داخل ہوتے ہوئے بلوائیوں کے ست سری اکال کے نعرے گونجے۔

''باباجان......'' بیٹی نے سہمی ہوئی آواز میں بہ مشکل پکارا۔

''اسی لمحے ڈبے پر سکھوں کی یلغار ہوگئی......اوئے بھون ڈالو سب کو......کوئی چلایا۔ ایک گولی چلی......اور اس ڈبے میں افضال کے بیٹوں کے بعد سب سے پہلے شہید ہونے والی اس کی بیوی تھی۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح اس پر گری اور وہ نیچے دب گیا۔ چند ہی ثانیوں میں اس کا لباس ہی نہیں' اس کا چہرہ بھی بیوی کے خون سے نہا گیا۔ طپنچہ اب اس کے بے جان ہاتھ میں لٹک رہا تھا۔

''چند فائر اور ہوئے' چند چیخیں اور ابھریں۔ پھر ایک سکھ چلایا۔ اوئے بے وقوفو' فائر مت کرو۔ اوئے زنانیاں نوں تے چکنا اے۔' اور فائرنگ رک گئی اب حملہ آور کرپانیں اور بلم استعمال کر رہے تھے۔ مزاحمت کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ قتلِ عام ہو رہا تھا۔

''افضال کے لیے اس وقت بیوی کا موٹاپا ڈھال بن گیا۔ وہ بیوی کے نیچے دبا' خون میں نہایا ہوا زندہ ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اور ان میں دہشت جیسے منجمد ہوگئی تھی۔

''مردوں کو ختم کرنے کے بعد سکھ عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے' اور بربریت کا وہ کھیل شروع ہوا' جس پر انسانیت ہمیشہ شرمندہ رہے گی۔ بیوی کے نیچے دبے ہوئے افضال نے دو سکھوں کو اپنی بیٹی کی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھا۔ بیٹی نے درد بھری فریاد میں اسے پکارا......
باباجان' ہمیں بچا لیجیے......اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیجیے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا......''

''افضال کے جسم کا ایک ہی حصہ بیوی کی لاش کے بوجھ سے آزاد تھا......اور وہ تھا اس کا طپنچے والا ہاتھ۔ اور اسے یاد تھا کہ اس نے بیٹی سے کیا کہا تھا۔ ایک گولی تمہارے لیے جانِ پدر' اور آخری گولی اپنے لیے۔ مگر وہ اچھے وقت کی بات تھی۔ اب صورتِ حال کچھ اور تھی۔ اس کا دماغ بھی جسم کی طرح شل ہو رہا تھا۔ جسم کے شل ہونے کا سبب تو یہ تھا کہ وہ بیوی کی لاش تلے دبا ہوا تھا۔ مگر دماغ خوف اور محبت کی وجہ سے شل ہو رہا تھا۔ خوف تھا محبت کا......اور محبت زندگی کی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ یادداشت نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ بیٹی نے جو وعدہ اس سے لیا تھا' وہ بھی اسے یاد تھا اور اس نے خود سے جو عہد کیا تھا وہ بھی نہیں بھولا تھا۔

''خوف سے شل دماغ نے کمزور سی آواز میں ہاتھ کو حکم دیا...... فائر کر......لبلبی دبا۔ لیکن وہ آزاد ہاتھ تو دبے ہوئے جسم سے کہیں زیادہ شل تھا۔ اس میں تو جنبش ہی نہیں تھی۔

''بے لباس ہوتی ہوئی بیٹی نے اسے پکارا......باباجان' وعدہ پورا کریں......''

''اس کی بیٹی سے الجھے ہوئے سکھوں میں سے ایک نے اپنے ایک ساتھی سے کہا......
اوئے دیکھ تو' یہ کس بابے کو پکار رہی ہے؟''

''دوسرے سکھ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نظر افضال پر جم گئی۔ خون میں نہائے ہوئے افضال کی آنکھوں میں زندگی کی چمک سی محسوس ہوئی۔ خطرناک بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں طپنچہ نظر آ رہا تھا۔' اوئے سکھ ویر' ادھر ہے تو ایک بندہ' اس نے اپنے ساتھی کو اطلاع دی۔' لگتا تو مرا ہوا ہے۔ ہاتھ میں پستول بھی ہے۔ پر آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔' پھر وہ محتاط انداز میں افضال کی طرف بڑھا۔

''اس کے ساتھی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مرتے وقت آنکھیں بند کرنے کی مہلت نہیں ملی ہوگی۔ چل اچھا ہے' یہی بابا ہے تو اپنی بیٹی کا خال مرنے کے بعد بھی دیکھ سکے گا۔'

''افضال نے یہ باتیں سنیں تو اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس پر غشی سی طاری ہوگئی۔ سکھ اس کے پاس آ کر رکا اور اس کی آنکھوں میں بہت غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اس وقت طپنچے کی رینج میں ہے۔

''مگر افضال تو ان لمحوں میں دہشت سے ساکت ہوگیا تھا' جیسے سانس بھی لینا بھول گیا تھا۔ اس وقت اگر اس کی انگلی لبلبی پر دباؤ ڈال دیتی تو کم از کم وہ سکھ تو جہنم رسید ہو جاتا۔ مگر وہ تو موت کے خوف سے جیسے پتھر ہوگیا تھا۔ جسم میں سانس تک کی جنبش نہیں تھی۔

''اس کا معائنہ کرنے والے سکھ نے پلٹ کر اپنے ساتھی سے کہا۔' اوئے سکھ ویر' یہ تو مر چکا ہے۔ پر ایک بات ہے۔ پکی بات......آدمی تھا نامرد پستول ہاتھ میں لیے بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ اوئے ایک فیر بھی تو نہیں کیا نامرد نے۔' پھر وہ افضال کی طرف مڑا۔' اب اس پستول کا کیا کرنا ہے ٹو نے۔ لا یہ مجھے دے دے۔ تیرے بھائیوں کے ہی کام آئے گا۔ یہ کہہ کر اس نے افضال سے پستول لینے کی کوشش کی۔

''افضال کے بس میں ہوتا تو وہ فوراً ہی طپنچہ چھوڑ دیتا لیکن خوف کی شدت سے اس کا جسم سچ مچ کسی مردے کی طرح اکڑ گیا تھا۔ گرفت کم کرنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ تو سچ مچ کسی مردے کی گرفت تھی۔

''سکھ نے تھوڑی دیر زور لگایا' پھر پیچھے ہٹ گیا۔

''ادھر بربریت کا وہ کھیل شروع ہوگیا۔ افضال کی معصوم اور اچھوتی بیٹی اس کی آنکھوں کے سامنے پامال کی جا رہی تھی' اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے وہ منظر دیکھنے پر مجبور تھا۔ وہ نگاہیں ہٹانے پر بھی قادر نہیں تھا۔ اندر' کہیں بہت گہرائی میں زندگی کی محبت نے بزدلی کا روپ دھار کر اسے پتھر کا بت بنا دیا تھا...... پتھر کا بت' جو نہ جنبش کرتا ہے اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے

ہیں۔

"اس کے اندر کوئی جذبہ' کوئی احساس نہیں بچا تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ پامال ہونے والی اس کی بیٹی' اس کی آبرو ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی بیٹی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں شکایت لیے اسی کو تک رہی ہے۔ جیسے اسے اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کا ادراک ہی نہ ہو۔ بس یہ طے تھا کہ بری طرح روندے جانے کے باوجود وہ زندہ ہے لیکن پتھر بنے افضال کو اس بات پر حیرت بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک سانس لیتا ہوا مردہ تھا' جو نہ سوچ سکتا تھا' نہ کچھ محسوس کر سکتا تھا۔

"اس کے نزدیک وہ چند منٹ قیامت کے دن کی طرح تھے' جس کی طوالت سے اللہ کے پسندیدہ بندے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ اس کے لیے وہ یوم حساب تھا۔ اس کی روح میں بڑے بڑے گھاؤ پڑ رہے تھے۔

"بالآخر کھیلنے والوں کا کھلونے سے دل بھر گیا۔ چلو...... اب اسے چھوڑو اور باہر نکلو۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ لیکن دوسرا اب بھی بے لباس بکھری ہوئی افشاں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ یہ کوئی چھوڑنے والی چیز ہے۔ اسے تو ساتھ لے کر چلیں گے یارا۔ اس کے ایک ساتھی نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔ گھر میں ڈالے گا کیا؟ اس پر وہ برا مان گیا۔ او نہیں یارا...... کچھ دن عیش کریں گے سب یار۔ پھر بیچ دیں گے سالی کو۔

"افشاں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ خدا کے لیے...... مجھے مار دو۔"

"اس کو پسند کرنے والے سکھ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ 'ہم خدا کے لیے نہیں مارتے' واہگورو کے لیے مارتے ہیں۔ خدا کے لیے مارنے کو اپنے بابا سے کہنا تھا۔ پر وہ تو آپ ہی مر گیا خدا کے لیے۔" پھر اس نے بے لباس افشاں کو کھلونے کی طرح اٹھایا اور کندھے پر ڈال کر ڈبے سے نکل گیا۔

"افضال اسی طرح پتھر بنا پڑا رہا۔ اسے نہیں پتا کہ کب ٹرین پاکستان پہنچی۔ لاہور کے اسٹیشن پر رضا کاروں نے اس کی بیوی کی لاش ہٹائی تب بھی وہ اسی طرح پڑا رہا۔ کیمپ میں دو دن بعد اسے ہوش آیا۔ اور ہوش آیا تو اسے پتا چلا کہ کوئی انسان پتھر نہیں بن سکتا۔ اسے تو سب کچھ یاد تھا۔ اور وہ منظر تو اس کے حافظے پر پوری جزئیات سمیت نقش تھا۔ یہ کہانی ہے اس بے غیرت افضال کی۔" یہ کہہ کر افضال صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

❀ ❀ ❀

افضال صاحب کی کہانی نے عبدالحق کو اداس کر دیا تھا۔ آدمی غلطیاں کرتا ہے' پھر اپنے باطن میں کیسے کیسے عذاب جھیلتا ہے۔ اب وہ افضال صاحب کے کرب کو سمجھ سکتا تھا۔ ساری گرہیں کھل

گئی تھیں۔ افضال صاحب کا دنیا میں کوئی بھی تو نہیں بچا تھا۔ پھر بھی وہ ہر روز کسی جستجو میں مارے مارے پھرتے تھے۔ وہ کہتے تھے' ان کے لوگ کھو گئے ہیں۔ وہ کہتے تھے' شہید کبھی نہیں مرتے' کون جانے کہاں' کس روپ میں مل جائیں۔ اسی لیے وہ انہیں ڈھونڈتے ہیں۔

اب عبدالحق سمجھ سکتا تھا کہ افضال صاحب کی اپنے بارے میں یادداشت پوری طرح تو اب کھوئی ہے۔ لیکن نارمل تو وہ پہلے بھی نہیں تھے۔

جو کچھ ان پر گزری تھی' اس کے بعد وہ نارمل تو رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ شعوری طور پر ان واقعات کو انہوں نے بھلا دیا تھا۔ مگر وہ انہیں یاد رکھتے تو یقیناً خودکشی کر لیتے یا پاگل ہو جاتے۔ اور انہوں نے ایسا کیا تو صرف اس لیے کہ وہ اپنے کیے کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جن واقعات کو اپنی دانست میں انہوں نے بھلا دیا تھا' وہ درحقیقت ان کے لاشعور میں محفوظ تھے۔

افضال صاحب کے لیے ان کا اپنا وجود بے غیرتی کی علامت تھا۔ صرف تلافی ہی ان کے داغ کو کسی حد تک دھو سکتی تھی۔ مگر پوری طرح تو وہ داغ مٹنے والا نہیں تھا

عبدالحق کو اس روز بڑی حیرانی ہوئی تھی کہ افضال صاحب ہیرا منڈی کیوں گئے تھے۔ اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ وہاں آتے رہتے ہیں۔ اب عبدالحق اس کا سبب سمجھ سکتا تھا افضال صاحب کو تلافی کا موقع ملا تو خوش قسمتی سے وہ ان کے ساتھ تھا۔ بلکہ اس نے ان کے کام کو بھی آسان کر دیا تھا ورنہ نجانے کیا کرتے۔ بہرحال اس روز ان کی جستجو بارآور ثابت ہوئی۔

تو وہ بازار حسن میں اپنی بیٹی کی تلاش میں آتے تھے۔ وہ سب سے کہتے تھے کہ ان کے گھر میں کوئی زندہ نہیں بچا۔ سب شہید ہو گئے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں تھی۔ مگر وہ کسی کو اپنی بیٹی کے بارے میں کیسے بتا سکتے تھے۔ وہ تو ان کی روح کا ناسور تھا۔ انہوں نے وہ منظر دیکھا تھا جو کسی بیٹی کا باپ نہیں دیکھ سکتا۔ مگر انہوں نے دیکھا تھا۔ وہ بڑی آن بان والے تھے۔ لیکن آزمائش کے ایک کمزور لمحے میں ان پر زندگی سے بے غیرتی کی حد تک محبت کا اور موت کے خوف کا عذاب اترا تھا۔ پھر اگر وہ بیٹی ان کی آنکھوں کے سامنے مر جاتی' تب بھی شاید انہیں کسی حد تک قرار آ جاتا۔ لیکن ظالم سکھ نہ صرف ان کی زندہ بیٹی کو اٹھا کر لے گئے تھے' بلکہ یہ اعلان بھی کر گئے تھے کہ وہ اسے بازار کی جنس بنا دیں گے۔

عبدالحق حساس اور دردمند تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ افضال صاحب کس کس طرح سوچتے ہوں گے' کیسے بے یقینی میں مبتلا رہتے ہوں گے۔

وہ یہ یقین کرنا چاہتے ہوں گے کہ ان کی بیٹی مر گئی ہو گی۔ لیکن یہ امکان انہیں ڈستا ہو گا کہ وہ زندہ ہو گی اور کسی بازار میں کسی کوٹھے پر بے غیرتی کی زندگی گزار رہی ہو گی...... صرف ان کی بزدلی اور بے غیرتی کی وجہ سے۔ ان کا جی چاہتا ہو گا...... بلکہ ان کی زندگی کا یہی واحد مقصد ہو گا اور یہی

واحد آرزو کہ کسی طرح وہ انہیں مل جائے اور وہ اسے ذلت کی اس دلدل سے نکال لائیں۔

انہیں یہ خیال بھی ستاتا ہو گا کہ قوی امکان یہی ہے کہ وہ ہندوستان میں ہی کہیں ہو گی۔ کیا پتا' انہوں نے سوچا ہو کہ افشاں تو اب انہیں نہیں مل سکتی۔ وہ کسی لڑکی کو اس طرح کی زندگی سے نجات دلا سکیں تو شاید ضمیر کا بوجھ کچھ کم ہو۔ شاید اسی لیے وہ ہر شام بازارِ حسن جاتے ہوں گے اور کوٹھے پر بیٹھی بجی سنوری لڑکیوں میں کوئی شناسا چہرہ تلاش کرتے ہوں گے۔

اور بالآخر وہ کامیاب ہو گئے۔ انہیں زرینہ مل گئی' اور اسے بازار سے نکال بھی لائے۔

اس تلافی سے افضال صاحب کا بوجھ ہلکا ہوتا لیکن زرینہ کو بازار تک پہنچانے میں جمیل کا کردار آڑے آ گیا۔ تلافی کی خوشی دھری رہ گئی۔ جمیل کے کردار نے انہیں ان کا ماضی یاد دلا دیا۔ لاشعور میں دبی ہوئی یادیں ابھر آئی ہوں گی۔ اپنی ذلت کا زخم ہرا ہو گیا ہو گا۔ اسی لیے تو جمیل انہیں جمیل نہیں' افضال لگا۔ افضال جوان کے نزدیک اس دنیا میں بے غیرتی کی علامت تھا۔ اور انہوں نے افضال کو قتل کر کے جیسے دنیا کو پاک کر دیا اور خود کو بری کرا لیا۔

عبدالحق کا جی چاہا کہ افضال صاحب کو یاد دلائے کہ انہوں نے ایک نیکی کی ہے' تلافی کی ہے۔ یوں وہ انہیں واپس لانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں فوراً ہی یہ بات آ گئی کہ یہ اور زیادہ مخدوش ثابت ہو سکتا ہے۔ امکان یہی تھا کہ اگر افضال صاحب نے خود کو افضال مان لیا تو وہ خودکشی کر لیں گے۔ ان کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ کسی شناخت کے بغیر' دماغی امراض کے اس اسپتال میں اپنی باقی ماندہ زندگی بے نام گزار دیں۔ کم از کم اذیت سے تو بچے رہیں گے۔ یہ سوچتے ہوئے اس کا دل بہت دکھا لیکن زندگی کے حقائق کو سمجھنا اور قبول کرنا وہ سیکھ چکا تھا۔

بہرحال افضال صاحب کے اس راز کو اس نے اپنے سینے میں دفن کر لیا۔ اس سلسلے میں اس نے مسعود صاحب کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ”میں نہیں سمجھتا سر کہ ان کی یادداشت کبھی بحال ہو گی۔“ اس نے اداس لہجے میں ان سے کہا۔

”میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ انہوں نے جمیل پر خود کو قیاس کیوں کیا۔“ مسعود صاحب نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ”ان کے اور جمیل کے درمیان کوئی قدر مشترک ہی نہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ عبدالحق نے گڑگڑا کر کہا۔ مسعود صاحب جس نہج پر سوچ رہے تھے' وہ انہیں درست نتیجے تک پہنچا سکتی تھی۔ ”لیکن سر' انسانی دماغ عجیب بھول بھلیاں ہے......“

”پھر بھی' اگر وہ جمیل کو افضال سمجھے اور افضال سمجھ کر ہی انہوں نے اسے قتل کیا تو ان کے اور جمیل کے درمیان کوئی مماثلت ہو گی ہی۔“

”نہیں سر' آپ خود سوچیں۔ کہاں افضال صاحب کہاں جمیل۔ نہ تو ان کی ذہنی سطح ایک ہے

اور نہ ہی اسٹیٹس' دونوں کا پس منظر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔“ عبدالحق نے جلدی سے تردید کی۔

”میں کسی باطنی مماثلت کے امکان پر غور کر رہا ہوں۔“

”انہیں موضوع سے ہٹانے کے لیے عبدالحق کو ان کے پسندیدہ موضوع پر بات چھیڑنا پڑی۔ ”اور سر آپ کے سول سروس کے اسٹرکچر کا کیا حال ہے؟ کچھ بہتری نظر آئی؟“ اس نے کہا۔

”فی الحال تو نہیں لیکن بہتری تو انشاء اللہ آئے گی۔“ مسعود صاحب ایک دم پُرجوش ہو گئے۔ ”ارے ہاں' میرا ابھی تبادلہ ہونے والا ہے۔“

”کہاں؟“

”اکنامک پلاننگ ڈویژن میں۔“

”اور آپ خوش ہیں اس میں؟“

”ہاں میاں' میرا اصل شعبہ تو وہی ہے۔ اور اس وقت تو بڑی اہمیت ہے اس کی۔ یہاں تو میں اپنی مرضی سے بیٹھا تھا۔ مقصد خدمتِ خلق بھی تھا اور آنے والوں کی تعداد' ان کے دکھوں اور ان کے مسائل کو سمجھنا بھی۔ مگر اب پاکستان کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ طے ہے کہ پاکستان کی بقا کے لیے اس کا معاشی استحکام بہت ضروری ہے۔ معیشت کے لیے طویل پلاننگ کرنی ہو گی۔“ وہ کہتے کہتے رکے۔ ”ارے ہاں' تم سے بھی تو میں نے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ اور تم نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔“

”جی ہاں۔ لیکن......“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ انہوں نے کہا اور ہنسنے لگے۔ ”وہ تو تم نے میرے ایک احسان کے صلے میں وعدہ کیا تھا۔ پورا تو کرنا پڑے گا۔“

عبدالحق جانتا تھا کہ وہ زرینہ کا حوالہ دے رہے ہیں...... اور وہ بھی سنجیدگی سے نہیں۔ ”وعدہ کر کے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹتا سر' لیکن میرا ایک بار گاؤں واپس جانا ضروری ہے۔ اور گاؤں میں اس وقت تک نہیں جا سکتا' جب تک یہاں آنے کا مقصد پورا نہ ہو جائے۔“

”مجھے یاد ہے' تمہیں کسی کی تلاش ہے۔ مگر میاں' صرف ایک نام کے حوالے سے کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں۔“ مسعود صاحب نے کہا۔ ”ویسے لاہور میں سیٹل ہو گئے تو شاید یہ کام آسان ہو جائے گا۔“

”آپ کا میرے سلسلے میں ارادہ کیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ کم از کم فی الحال پیسہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ یہاں میں نے ایک کوٹھی تمہارے لیے پسند کر لی ہے۔ وہ خریدو اور گھر والوں کو یہاں لے آؤ۔ تعلیم مکمل کرو' مقابلے کا امتحان پاس کرو'

اوراس ملک کی خدمت کرو۔"

"کوٹھی بھی پسند کر چکے ہیں آپ؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"ہاں میاں۔ وہ کلیم ڈیپارٹمنٹ میں میرا ایک دوست ہے اچھے عہدے پر۔ اس سے بات کی تھی۔ وہ کوٹھی مشتاق نے ہندوستان سے آئے ہوئے ایک مہاجر کو الاٹ کی تھی' جو وہاں صاحب حیثیت ہوتے تھے۔ اب وہ صاحب چاہتے ہیں کہ اس کوٹھی کو بیچ کر کوئی چھوٹا سا مکان لیں اور باقی رقم سے کوئی کاروبار شروع کریں' تاکہ آمدنی کا سلسلہ شروع ہو۔ کوٹھی بہت شان دار تھی۔ دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔"

مگر عبدالحق کوٹھی سے آگے کچھ دیکھ رہا تھا۔ "آپ کے دوست تو میرے کام بھی آسکتے ہیں۔

"کیسے؟ کیا مطلب؟"

"دیکھیں نا' میں رضوان صاحب کی تلاش میں ہوں۔ رضوان صاحب بھی آگرہ میں صاحب حیثیت تھے اور وہ پاکستان بننے سے پہلے یہاں آگئے تھے انہوں نے بھی تو اپنی وہاں کی املاک کے بدلے یہاں کچھ لیا ہوگا...... اور کلیم ڈیپارٹمنٹ سے ہی لیا ہوگا۔ تو وہاں ریکارڈ میں ان کا نام یقیناً ہوگا...... ان کا موجودہ پتا بھی۔" یہ کہتے کہتے اس کا لہجہ ہیجانی ہو گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ جو بات اس نے ایک موہوم سے امکان کے خیال سے شروع کی تھی' وہ درحقیقت ایک فیصلہ کن پیش رفت ثابت ہو سکتی ہے۔

ادھر مسعود صاحب بھی سنبھل کر بیٹھ گئے...... بیٹھ کیا گئے' گرتے گرتے بچے۔ "کمال ہے۔ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔" انہوں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "حالانکہ یہ تو سامنے کی بات تھی۔"

"بعض اوقات سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔" عبدالحق نے کہا۔ "بس اب آپ مجھے مشتاق صاحب سے ملوا دیجیے۔"

❁ ❁ ❁

زرینہ حیران تھی۔ نور بانو اس کے لیے یکسر بدل گئی تھی۔ اب نہ تو وہ اس سے تفتیش کرتی تھی اور نہ ہی اس کا انداز طنزیہ ہوتا تھا۔ عبدالحق سے دو روزہ شناسائی کا جو طعنہ اس کے لیے وبال جان بن گیا تھا' اب وہ بھی نور بانو کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ پہلے دو دن تو وہ یہ سوچ کر اور محتاط ہو گئی کہ کہیں یہ بھی کسی نئی حکمت عملی کا حصہ نہ ہو۔ لیکن پھر اسے نور بانو کے خلوص کا اندازہ ہو گیا۔ وہ تو سچ مچ اس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آنے لگی تھی۔ البتہ انداز اُس کا مربیانہ تھا۔ مگر زرینہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ اس سے تو اسے مزید تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ پھر زرینہ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ نور بانو کے خدشات دور ہو گئے ہیں اور اب وہ عبدالحق کے معاملے میں اسے اپنا حریف نہیں سمجھتی۔ یہ کیسے ہوا' اس کا اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ اور اس بات کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔

اس رات وہ سونے کے لیے لیٹیں تو نور بانو نے بالکل اچانک اُسے کہا۔ "سنو زرینہ' تم مجھے میرے پچھلے رویے پر معاف کر دو۔"

زرینہ کو بہت حیرت ہوئی۔ "مگر مجھے تو آپ سے کوئی شکایت نہیں۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔

"لیکن تمہیں تکلیف تو پہنچی ہوگی میرے رویے سے۔ میں سچ مچ بہت شرمندہ ہوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ اس کا سبب ایک غلط فہمی تھی۔"

"نہیں...... وہ میرا چھوٹا پن تھا۔ اس کا سبب میرے دل کی تنگی تھی۔" نور بانو کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ "مگر بعد میں مَیں نے غور کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ تم اور میں تو دو سگی بہنوں کی طرح ہیں' جن کے دکھ درد مشترک ہیں۔ تم بھی اپنا سب کچھ کھو کر آئی ہو' اور میرے پاس بھی کچھ نہیں بچا۔ ہم دونوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ لٹتے دیکھا ہے۔ مجھے تو تم سے صرف محبت کرنی چاہیے۔"

اُس کے لہجے کی سچائی نے زرینہ کے دل کو چھو لیا۔ "میرے دل میں تو آپ کے لیے عزت اور محبت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔" وہ بولی۔

مگر نور بانو اس وقت کسی رو میں بہہ رہی تھی۔ اس نے جس طرح اپنی بہنوں کو پامال ہوتے دیکھا تھا' اور اُس کی اپنی جو کیفیت تھی' وہ سب زرینہ کو سنا ڈالی۔ پہلی بار اسے ایسا لگا' جیسے قلب اور روح پر سے ہر بوجھ پوری طرح ہٹ گیا ہے۔ "میں خوش نصیب تھی کہ ان لوگوں کی پناہ میں آ گئی۔" عبدالحق کا نام لیتے لیتے رک گئی۔ "اور ان لوگوں کے روپ میں مجھے سب کچھ مل گیا۔ ہر رشتہ مل گیا۔ ورنہ میرا کیا حشر ہوتا۔" اس خیال سے ہی اسے جھرجھری آ گئی۔

لیکن مجھ پر جو گزری ہے' وہ تو میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی۔ زرینہ نے دل میں سوچا۔ پھر بڑے خلوص سے نور بانو سے بولی۔ "چلیں...... اب میری صورت میں آپ کو بہن بھی مل گئی۔ اور میری اپنی محرومی بھی دور ہو گئی۔"

اس رات کے بعد وہ دونوں بہت قریب ہو گئیں۔ دن میں بھی ان کا وقت ساتھ گزرنے لگا۔

زرینہ نے مینو کو نور بانو کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ یہ بات اسے اور عجیب لگی کہ نور بانو اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے۔ ویسے تو نور بانو کے پاس بکروں کی ایک جوڑی بھی تھی' اور وہ ان کا بھی خیال رکھتی تھی۔

"حیرت ہے' آپ کو جانور پالنے کا شوق ہے۔" ایک دن زرینہ نے اُس سے کہا۔ "آپ تو بول چال سے مجھے شہری لگتی ہیں۔"

"ہاں، میں دہلی کی ہوں۔" نور بانو نے کہا۔ "اور شاید اسی لیے مجھے جانور پالنے کا شوق ہوا۔ کیونکہ اپنے گھر میں تو میں نے ایسا دیکھا ہی نہیں تھا۔ زبیر بھائی ان دنوں بکریوں کی فارمنگ کر

رہے تھے۔ ایک بکری نے یہ دو بچے دیے......" نور بانو نے اپنی جوڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "...... تو میں نے ان سے مانگ لیے۔ یہ چھوٹے تھے تو اتنے خوب صورت تھے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

"میں سوچ سکتی ہوں۔" زرینہ نے آہستہ سے کہا۔ "ہمارے گھر میں بھی بکریاں پالی جاتی تھیں۔" ایک لمحے کو وہ اداس ہو گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ "لیکن آپ ان سے زیادہ توجہ اس مینڈھے کو دیتی ہیں۔"

نور بانو کی نگاہیں جھک گئیں۔ "یہ مجبوری ہے۔ اس کے نخرے بہت ہیں۔"

زرینہ نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اچانک چھانے والی سرخی اس نے دیکھ لی تھی۔ "کیا مطلب؟"

"ایسے نہیں سمجھو گی تم۔ اچھا اسے کچھ کھلا کر دکھاؤ۔"

زرینہ نے کوشش کی لیکن مینو نے اس طرف دیکھا بھی نہیں۔ زرینہ نے اسے بادام کا لالچ بھی دیا لیکن ناکام رہی۔ "واقعی...... یہ تو بڑے نخرے والا ہے۔ لگتا ہے' صرف آپ کے ہاتھ سے کھاتا ہے۔ آپ نے اس کی عادتیں بگاڑ دی ہیں۔"

"نہیں...... یہ میرا نہیں ہے' اور اس کی عادتیں بھی میں نے نہیں بگاڑی ہیں۔"

"تو پھر؟"

"اسے عبدالحق صاحب لائے تھے۔" نور بانو کی نگاہیں پھر جھک گئیں۔ "وہ اس کا ہر کام خود کرتے تھے۔ اور یہ ہر وقت ان کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ پھر وہ اچانک لاہور چلے گئے۔ انہیں تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ اس بے چارے پر کیا گزری۔"

زرینہ کی دلچسپی بڑھ گئی۔ مینو بڑی محبت سے نور بانو کے گھٹنے سے سر رگڑ رہا تھا۔ "مجھے بتائیں نا۔" زرینہ نے کہا۔

"ان کے جانے کے بعد اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پاگلوں کی طرح انہیں ڈھونڈتا پھرتا تھا' اس لیے باندھنا پڑ گیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔"

"تو پھر آپ سے یہ کیسے رام ہو گیا؟"

"مجھ سے نہیں' اس چادر سے۔" نور بانو نے اپنی چادر کی طرف اشارہ کیا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

نور بانو چند لمحے جھجکتی رہی۔ پھر سر جھکا کر بولی۔ "یہ چادر اس کے مالک کی ہے۔ اس میں ان کی خوشبو ہے۔ اس کی وجہ سے اس نے مجھے ان کا مقام دے دیا۔"

"اللہ..... اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ بھوکا مر جاتا۔" زرینہ نے کہا۔

"اللہ نہ کرے۔ یہ تو ان کی امانت ہے۔" نور بانو نے بے ساختہ کہا۔

اس لمحے زرینہ پر نور بانو کی محبت پوری طرح واضح ہو گئی۔ یہ لڑکی عبدالحق کو دیوانہ وار چاہتی ہے۔ اس نے سوچا۔ "یہ تو بتائیں کہ بھائی لاہور کیوں گئے ہیں؟"

"ایک کام سے گئے ہیں' اور جب تک کام نہ ہو جائے' واپس نہیں آئیں گے۔" نور بانو نے اداسی سے کہا۔

"ایسا کیا کام ہے وہاں۔"

"وہ میرے چچا کو تلاش کرنے گئے ہیں' تاکہ مجھے ان کے سپرد کر کے سرخرو ہو جائیں۔"

"اللہ نہ کرے کہ وہ کامیاب ہوں۔"

نور بانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "یہ کیوں کہا تم نے؟"

"کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ آپ یہاں سے جائیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ یہاں سے نہیں جانا چاہتیں۔" زرینہ نے کہا۔ "سنیں نور بانو' بھائی آپ کو اچھے لگتے ہیں نا۔"

نور بانو چند لمحے خاموش رہی۔ پھر بولی۔ "چاند کسے اچھا نہیں لگتا۔ وہ تو ساری دنیا کو اچھا لگتا ہے۔"

"بے شک' لیکن ویسے نہیں' جیسے چکور کو اچھا لگتا ہے۔"

"لیکن ملتا تو چکور کو بھی نہیں۔" نور بانو نے اداسی سے کہا۔

"یہ تو قصے کہانیوں والی بات ہے۔ ورنہ وہ بھی انسان ہیں اور آپ بھی انسان ہیں۔" زرینہ نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے نور بانو کہ آپ جان بوجھ کر اداس رہنا چاہتی ہیں۔ اچھی باتیں سوچا کیجیے۔ دیکھیں نا' میں اور آپ...... ہم لوگ اتنا کچھ دیکھ چکے ہیں کہ مایوس تو ہمیں ہونا ہی نہیں چاہیے۔"

"مگر جب صورت حال ہی مایوس کن ہو تو......"

زرینہ نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "ویسی مایوس کن تو نہیں ہو سکتی' جس سے آپ ہندوستان میں گزری ہوں گی۔"

"ہاں...... یہ تو ہے۔" نور بانو نے اعتراف کیا۔

"اور اللہ آپ کو عزت کے ساتھ وہاں سے نکال لایا نا...... اور اب آپ عافیت میں ہیں۔"

اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔ نور بانو نے کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"تو اب ہم مایوس ہوں تو یہ ناشکرا پن ہی ہوا نا۔ اور ناشکرا پن تو خود مایوسی کا سبب ہوتا

ہے۔"

اس لمحے نور بانو کو اس پر بہت پیار آیا۔ اس نے لفظ ہم استعمال کر کے اس کی شرمندگی کم کر دی تھی۔ بلکہ خود کو بھی اس کے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اور یہ احساس تو اسے پہلے ہی سے تھا کہ اس کا مسئلہ ہی ناشکرا پن ہے۔

"دیکھیں نور بانو! آپ نے تو اپنی کہانی مجھے سنا دی لیکن میں تو آپ کو بتا بھی نہیں سکتی کہ مجھ پر کیا گزری۔ بس یہ سمجھ لیں کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اب میں یہاں ہوں تو بہت خوش ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ اللہ نے مجھے جہنم سے نکالا اور جنت میں پہنچا دیا۔ اُنہوں نے میری بہتری کی فکر کی' جبکہ میری فکر کرنے والا کوئی نہیں بچا تھا۔ ہاں کبھی مجھے مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ یہ تو فطرت ہے۔ مگر میں چند لمحوں میں اسے جھٹک دیتی ہوں۔ جو اللہ مجھے کیمپ کی بے گھری سے نکال کر ایک گھر میں لایا' اس نے میرے مستقبل کا معاملہ بھی طے کر دیا ہوگا۔ اتنا کچھ دیکھنے کے بعد میرا کام اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا نہیں۔ مجھے تو صرف اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے' بلکہ اس سے بھی پہلے مجھے ناشکرے پن سے بچنا چاہیے۔ آگے جو ہوگا' انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ کیونکہ اس سے برا تو نہیں ہو سکتا' جو پہلے ہو چکا ہے۔"

نور بانو چند لمحے اُس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتی رہی۔ اُس کی نگاہوں میں زرینہ کے لیے محبت تھی۔ پھر اُس نے زرینہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم بہت اچھی ہو زرینہ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ میں شرمندہ ہوں۔"

"اس میں آپ کی غلطی نہیں تھی۔ صورت حال ہی ایسی تھی۔" زرینہ نے بے حد خلوص سے کہا۔

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر محمود واسطی حق نگر میں آباد وہ واحد آدمی تھے' جو وہاں مہاجر کی حیثیت سے نہیں آئے تھے۔ وہ حیثیت میں بھی کم نہیں تھے۔ ہجرت سے پہلے الٰہ آباد میں ان کی بڑی کامیاب پریکٹس تھی اور ان کا شمار وہاں کے خوشحال لوگوں میں ہوتا تھا۔ ہجرت کر کے وہ لاہور پہنچے تو ان کے پاس کثیر نقد رقم بھی تھی اور زیورات بھی۔ بیوی کے علاوہ ان کے بس دو بیٹے تھے' اور دونوں جوان تھے۔ اس کے باوجود وہ لاہور میں مہاجر کیمپ میں رہے۔ وہ اپنے بچوں کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ہجرت کے دوران اور ہجرت کے بعد لوگوں پر کیا کیا گزری ہے۔ کیمپ کے انچارج مسعود صاحب ان کے گرویدہ ہو گئے۔ مسعود صاحب کے توسط سے وہ عرفان صاحب سے ملے۔

پاکستان میں اپنی پریکٹس کا آغاز انہوں نے مہاجر کیمپ سے کیا تھا۔ ان کے نظریات کچھ عجیب تھے۔ ان کا سوچنا یہ تھا کہ پیسے مقصد نہیں۔ دونوں بیٹے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں

گے۔ چنانچہ اب انہیں پیسہ کمانے سے زیادہ اپنے مقدس پیشے کے ذریعے خدمت کرنے کی فکر تھی۔ اور وہ سوچتے تھے کہ کسی بڑے شہر کی بجائے دیہی علاقے میں پریکٹس کریں۔

محکمۂ زراعت کے افسر عرفان احمد کے دفتر میں پٹواری حسن دین سے اتفاقاً ان کی ملاقات ہوئی۔ حسن دین سے انہوں نے عبدالحق کا تذکرہ سنا۔ انہوں نے حسن دین سے کہا کہ وہ اس گاؤں کو دیکھنا اور عبدالحق سے ملنا چاہتے ہیں۔

یوں وہ حق نگر آئے اور عبدالحق سے ملے۔ ان دنوں ریت ہٹانے کا کام اپنے آخری مرحلے میں تھا۔

عبدالحق سے مل کر انہیں حیرانی ہوئی۔ جو کچھ انہوں نے اس کے بارے میں سنا تھا' اس کی روشنی میں انہوں نے اس کی عمر کا جو اندازہ لگایا تھا وہ اس سے بہت چھوٹا تھا۔ وہ تقریباً ان کے چھوٹے بیٹے کی عمر کا تھا۔ وہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں لگا کہ وہ اس نوجوان کے روپ میں مستقبل کے ایک بہت بڑے آدمی کو دیکھ رہے ہیں۔

انہوں نے عبدالحق سے بات کی کہ وہ یہاں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ عبدالحق تو نہال ہو گیا۔ گاؤں والوں کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہو رہی تھی۔ گاؤں کو ایک اچھا اور مستند ڈاکٹر میسر آ رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ جہاں جتنی زمین چاہیں' انہیں مل جائے گی۔

"دیکھیے عبدالحق صاحب' ہم زمین دار تو ہیں نہیں۔ زرعی زمین کی تو ہمیں ضرورت نہیں۔ اور ایک بات یہ کہ میں زمین کی قیمت ادا کروں گا' ایسے نہیں لوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ صاحبِ حیثیت ہیں۔" عبدالحق نے قدرے حیرت سے کہا۔

"الحمدللہ! اللہ کے فضل و کرم سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے میرے پاس۔"

"تو پھر آپ لاہور میں آباد ہونے کے بجائے یہاں کیوں آ رہے ہیں۔"

"ایک وجہ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر کی ضرورت یہاں زیادہ ہے۔ لاہور میں تو ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میری نگاہیں مستقبل میں آگے تک دیکھ رہی ہیں۔ میں کسی بڑے آدمی سے جڑنا...... اس کے سائے میں رہنا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں آپ کو سمجھاؤں گا بھی نہیں۔ بس میں پاکستان میں مختلف زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"تو بسم اللہ ڈاکٹر صاحب' حق نگر آپ کے لیے حاضر ہے۔"

"آپ نے یہاں رہائشی علاقے کے لیے تو جگہ مختص کی ہوگی۔" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"دیکھیں...... یہاں اس وقت دو ہی پیشے ہیں۔ زراعت اور فارمنگ۔ دونوں میں آدمی اپنی زمین کے پاس ہی گھر چاہتا ہے۔"

"مگر میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں عبدالحق صاحب۔" ڈاکٹر محمود نے کہا۔ "آپ اسے گاؤں دیکھتے ہیں۔ جبکہ مجھے یہ کچھ اور نظر آرہا ہے...... چھوٹا شہر کہہ لیجئے یا بڑا قصبہ۔ اس لئے یہاں رہائشی اور تجارتی علاقے کے لئے کافی زمین مختص کی جانی چاہئے۔"

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔ بات اُس کے دل کو لگی تھی۔

"اب سوچیں' آبادی بڑھنے کے بعد کیا یہاں کے لوگ' اپنی ضرورت کی خریداری کے لئے قریبی شہر جایا کریں گے۔ سب کچھ یہیں ہونا چاہئے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ رہنمائی کا شکریہ۔"

ان کی اس بات نے عبدالحق کو ایک نیا وژن دیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے ان کے ہی نظریے کے تحت پلاننگ کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے ایک مکان کی زمین کے علاوہ عبدالحق سے دس ایکڑ زمین معقول قیمت پر خریدی تھی۔ عبدالحق کو حیرت تھی کہ وہ اتنی زمین کا کیا کریں گے۔ اس نے ان سے پوچھ ہی لیا تھا۔

"یہ آپ کے مستقبل کے حق نگر کا تجارتی علاقہ ہوگا۔" ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ "اور زندگی رہی تو میں یہاں ایک بہت اچھا ہسپتال بھی قائم کروں گا۔ دیکھیں نا عبدالحق صاحب' یہ ضروری ہے۔"

اور عبدالحق ان کی فراست اور دوراندیشی کا قائل ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے بڑے بیٹے کا رجحان تجارت کی طرف تھا۔ اس دس ایکڑ زمین پر انہوں نے اپنے لئے ایک مطب بنالیا تھا۔ مطب کے ساتھ چھوٹا سا اسپتال تھا' جس میں فی الحال صرف دس بیڈ تھے۔ وہ بھی خالی ہی رہتے تھے۔ اسی لئے علاقے کے لوگ انہیں سنکی سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک دکان بنائی تھی...... کریانے کی دکان۔ وہ ان کا بڑا بیٹا اکبر چلاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک اچھے جنرل اسٹور کا روپ دھار گیا۔ اُس کی افادیت ابتدا ہی میں ثابت ہو گئی تھی۔ وہ علاقے کے لوگوں کے لئے بڑی نعمت تھا۔

چھوٹے بیٹے کا رجحان ڈاکٹری کی طرف تھا۔ اسے ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کے لئے لاہور چھوڑ دیا تھا۔

اپنے مطب سے اٹھ کر ڈاکٹر صاحب اکبر کی دکان پر ضرور جا کر بیٹھتے تھے۔ وہاں بیٹھ کر وہ بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتے۔ اکبر کی طرف سے وہ مطمئن تھے۔ وہ محنتی بھی تھا اور عقل مند بھی۔ یہی وجہ تھی کہ دکان مال کے اعتبار سے پھیل رہی تھی۔ کسی نئی چیز کی ڈیمانڈ آتی تو وہ فوراً وہ چیز لے آتا۔ ابھی تو اس دکان سے زیادہ آمدنی نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ مستقبل بہت روشن

ہے۔

اس روز وہ دکان پر پہنچے تو وہاں رابعہ موجود تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک بہت حسین لڑکی بھی تھی۔ وہ بڑے سلیقے سے چادر لئے ہوئے تھی اُس کے چہرے کی پاکیزگی اور معصومیت نے انہیں بہت متاثر کیا۔

مگر انہیں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اکبر بہت نروس نظر آرہا تھا۔ پھر اس کی وجہ بھی ان کی سمجھ میں آگئی۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور اس کی بے دھیانی کا یہ عالم تھا کہ وہ حساب بھی ٹھیک سے نہیں کر پا رہا تھا۔

"ارے...... آپ دکان لٹانے کے لئے بیٹھے ہیں۔" لڑکی نے اکبر کو ٹوکا۔ "دو روپے دس آنے بنتے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں ایک روپیہ دس آنے' اتنا تو شاید آپ کا منافع بھی نہیں ہوگا۔"

اکبر نے باپ کو دیکھا تو اور نروس ہو گیا۔ "جی...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میرے سر میں درد ہے نا' اس وجہ سے......"

رابعہ نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا۔ لڑکی نے بھی اُس کی تقلید کی۔

"کیسی ہو رابعہ؟ اماں کا کیا حال ہے؟ اور عبدالحق واپس آئے یا نہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے سوالات کی بوچھار کر دی۔

رابعہ نے ترتیب سے جواب دیے۔ "صاحب تو ابھی نہیں آئے۔" اُس نے آخر میں کہا۔

"اور یہ بچی کون ہے؟"

"بہن ہے ہماری۔ اماں کی بیٹی جو ہوئی۔" رابعہ نے بڑے فخر سے کہا۔

"بہت اچھی ہے ماشاءاللہ۔"

ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب سوچتے رہے۔ وہ یہاں بے مقصد نہیں آتے تھے۔ اکبر شادی کے قابل تھا' جوان تھا۔ اور دکان پر لڑکیاں بھی آتی تھیں وہ بیٹے سے بے خبر نہیں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے انہوں نے اکبر کو کسی لڑکی کو اس طرح دیکھتے نہیں دیکھا تھا۔ اور سچی بات یہ تھی کہ لڑکی انہیں بھی بہت اچھی لگی تھی۔ یہ وہ جانتے تھے کہ وہ اماں کی بیٹی نہیں ہو سکتی لیکن یہ حوالہ کافی تھا کہ اماں اسے بیٹی سمجھتی ہیں۔

اُس روز وہ دکان سے اٹھے تو فیصلہ کر چکے تھے۔ گھر پہنچتے ہی انہوں نے بیوی سے کہا۔

"صفیہ...... آج میں نے ایک بہت پیاری لڑکی دیکھی۔"

"اب تو باز آجائیں ڈاکٹر صاحب۔" ان کی بیگم نے شوخی سے کہا۔ "آنکھیں بند کر کے نبض دیکھا کیجئے۔"

"ارے نہیں بھئی' مریضہ تھوڑا ہی تھی وہ۔"

"لو......تو اب راستہ چلتے بھی دیکھنے لگے۔ مطلب ہی کیا کم تھا آپ کا۔"

"تم تو ہر بات مذاق میں اُڑا دیتی ہو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔ مجھے وہ لڑکی اکبر کے لئے اچھی لگی ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے بے حد معصومیت سے کہا۔

"لو تو اب اسے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔"

"ارے وہ رابعہ کے ساتھ تھی۔"

"اوہ......زرینہ ہوگی۔ سچ کہتی ہوں' وہ تو میرے دل میں بھی اتر گئی تھی۔ مجھے بھی اکبر کا خیال آیا تھا اسے دیکھ کر۔"

"بس تو جا کر اماں سے بات کرو رشتے کی۔"

"جی تو میرا بھی چاہا تھا۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ شاید وہ صاحب کے لئے......" زبیر کی دیکھا دیکھی اب پورا گاؤں عبدالحق کو صاحب کہنے لگا تھا۔

"ارے نہیں بیگم' یہ نہیں ہوسکتا۔" ڈاکٹر صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔

"کیوں؟"

"عبدالحق کی شادی تو بس نور بانو سے ہوگی۔ دیکھ لینا۔" ڈاکٹر صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تم کل ہی جا کر اماں سے بات کرلو۔"

"ٹھیک ہے۔ چلی جاؤں گی۔ اب آپ کھانا تو کھالیں۔"

"ہاں' لے آؤ۔"

"اور ہاں۔ اکبر سے تو پوچھ لیں۔"

"بھئی بیٹا ہے ہمارا۔ اس کی شادی تو ہماری پسند سے ہی ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں اس کی۔"

"آپ جانیں۔" صفیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ویسے وہ بھی بہت خوش تھیں۔

❁......❁......❁

مشتاق صاحب عمر میں مسعود صاحب سے بڑے تھے۔ انہوں نے مسعود صاحب کا دیا ہوا تعارفی خط پڑھا' اسے تہ کر کے ایک طرف رکھا اور عبدالحق کی طرف متوجہ ہوئے۔ "یہ بتاؤ بیٹے کہ میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟" ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

"مجھے کسی کی تلاش ہے۔ شاید اس سلسلے میں آپ میری مدد کرسکیں۔"

"میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔ تم مجھے ان کے بارے میں بتاؤ۔"

"جی ان کا نام رضوان ہے......رضوان احمد۔"

مشتاق صاحب ہکا بکا رہ گئے۔ "صرف نام! اس نام کے تو درجنوں افراد سے واسطہ پڑا ہے ہمارا۔" انہوں نے کہا۔ "ان کی ولدیت تو بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ وہ ہندوستان میں کہاں رہتے تھے۔ اور کیا کرتے تھے۔"

عبدالحق کو شرمندگی ہونے لگی۔ "جی......نام کے علاوہ میں بس یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ آگرہ میں رہتے تھے۔"

"اپنے کسی ایسے رشتہ دار کے بارے میں اتنی محدود معلومات حیران کن ہیں بیٹے۔ جبکہ وہ تمہیں بہت عزیز بھی ہوں گے۔ ورنہ تم انہیں یوں تلاش کیوں کرتے۔"

"دراصل میں انہیں کسی اور کے لئے تلاش کررہا ہوں۔"

"اوہ......تو ان کے بارے میں اور کچھ نہیں بتا سکتے تم؟"

عبدالحق نے ذہن پر زور دیا۔ "جی ایک بات اور ہے۔ اللہ کرے کہ وہ اہم ثابت ہو۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان بننے سے شاید ڈیڑھ دو ماہ پہلے ہی پاکستان آگئے تھے۔"

"ہاں...... یہ ہے کام کی بات۔" مشتاق صاحب نے کہا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ "ایک رضوان احمد جون میں یہاں پہلی بار آئے تھے میرے پاس......کلیم کے سلسلے میں۔ مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ بہت شائستہ انسان تھے۔ اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی ان سے۔ پھر میرے پاس ان کا آنا جانا رہا۔ یہاں تک کہ اگست میں ان کا کلیم منظور ہوگیا۔"

عبدالحق کی آنکھوں میں امید چمکنے لگی۔ اس تلاش میں وہ صرف اللہ کے بھروسے پر نکلا تھا۔ اور اللہ اس کی مدد کررہا تھا۔

"......مگر مجھے یہ یاد نہیں کہ ان کا تعلق ہندوستان میں کہاں سے تھا۔"

عبدالحق کا دل ایک دم جیسے بجھ سا گیا۔

"لیکن یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ ان کی فائل نکلواتے ہیں۔ ابھی پتا چل جائے گا۔"

امید کا دیا پھر سے جل اُٹھا۔

مشتاق صاحب نے گھنٹی بجائی تو چپراسی اندر آگیا۔ "وہ رضوان صاحب آتے تھے نا میرے پاس' ذرا ان کی فائل نکلوا کرلاؤ۔"

"یس سر۔" چپراسی نے کہا اور باہر چلا گیا۔

عبدالحق کے دل میں ایک بے یقینی نے سر اٹھایا۔ "اگر یہ وہ رضوان صاحب نہیں ہوئے تو؟" اُس نے مشتاق صاحب سے پوچھا۔

"تب تو ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔" مشتاق صاحب نے کہا۔ "ہم پورا ریکارڈ چیک

کریں گے۔ ہر رضوان کو دیکھیں گے۔ اگر تمہارے مطلوبہ رضوان صاحب نے کلیم کیا ہوگا تو ان کا پتا چل جائے گا۔ اور اگر انہوں نے یہاں کلیم کیا ہی نہیں تو پھر بات ختم اور بیٹے' اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو تمہارے ان کو تلاش کرنے میں کامیابی کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا۔"

عبدالحق کے لئے ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ وہ امید و بیم کے درمیان معلق تھا۔

بالآخر چپراسی فائل لے آیا۔ مشتاق صاحب نے فائل کھولی اور نظر ڈالتے ہی مسکرائے۔ انہیں مسکراتے دیکھ کر عبدالحق کی جان میں جان آئی۔ "لگتا ہے بیٹے' تمہارا کام ہو گیا۔ ان کا تعلق آگرہ ہی سے ہے۔"

عبدالحق پر پھر بے یقینی کا حملہ ہوا۔ "کیا پتا' آگرہ سے بھی اس نام کے کئی لوگ آئے ہوں۔ اور یہ رضوان صاحب وہ نہ ہوں جنہیں میں تلاش کر رہا ہوں۔"

"بہر حال تم ان سے مل لو۔ پتا چل جائے گا۔" مشتاق صاحب نے ایک کاغذ پر رضوان صاحب کا پتا لکھ کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"بہت شکریہ جناب۔" عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکریے کی کوئی بات نہیں۔ مسعود صاحب کو میرا اسلام کہہ دینا۔"

عبدالحق باہر نکل آیا۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

عبدالحق اللہ کی قدرت پر غور کر رہا تھا۔ رضوان صاحب کو تلاش کرنے کے لئے وہ لاہور آیا تھا۔ مگر اتنے عرصے قیام کرنے کے باوجود اسے اپنے مقصد میں موہوم سی کامیابی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ کھلی بات سامنے آ گئی تھی کہ صرف نام سے کسی کو تلاش کرنا ناممکن ہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی امکان نظر ہی نہیں آیا تھا۔ اور وہ ناکام واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

اور اب...... بالکل اچانک...... محض چند لمحوں میں ناکامی کی دیوار میں اللہ نے اپنی قدرت سے ایک امکان کا دروازہ کھول دیا تھا...... ایسا دروازہ جو ابتدا ہی سے مسعود صاحب کی نگاہوں کے سامنے تھا' لیکن انہیں نظر نہیں آیا۔ اور نظر بھی وہ اسی کو آیا تھا۔ مسعود صاحب تو آخر تک اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔

ایک دن میں جیسے دنیا بدل گئی تھی۔ ایک دن پہلے وہ مایوس تھا' اور آج ایک دن بعد اس کی جیب میں رضوان صاحب کا پتا موجود تھا اور اُس کی اپنی کیفیت عجیب تھی۔ نجانے کیسے' مگر اس کے دل کو یقین تھا کہ یہ رضوان صاحب نور بانو کے چچا ہی ہیں لیکن وہ اس پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مشتاق صاحب کے دفتر سے نکلتے ہی اُس نے سوچا تھا کہ ابھی اس پتے پر جا کر چیک کرے گا لیکن اس کے بجائے وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ بالآخر وہ لارنس گارڈن میں جا کر بیٹھ گیا۔

وہاں بیٹھ کر وہ سوچتا رہا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ لارنس گارڈن آئے اور اسے افضال صاحب یاد نہ آئیں۔ افضال صاحب اور ان جیسے لوگوں کے حوالے سے اُس نے پاکستان کو سمجھا تھا۔ اور یہ صرف اس لئے ممکن ہوا کہ وہ لاہور آیا اور کیمپ میں رہا۔ اور لاہور وہ صرف رضوان صاحب کی تلاش میں آیا تھا۔ گویا وہ تلاش بہانہ تھی۔ اصل میں اسے وسعتِ نظر عطا کی جا رہی تھی۔

دہلی میں' اپنے کالج میں وہ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں نظریات سے آگاہ ہوا تھا۔ لیکن یہاں لاہور میں اُس نے انسانوں کے رنگا رنگ روپ دیکھے تھے...... عملی پیکر۔ اور وہ اتنے مختلف اور اتنے متنوع تھے کہ دیکھ کر عقل حیران ہوتی تھی۔ خود افضال صاحب ہی ایک چیستان تھے۔ ان کی کہانی سن کر پتا چلتا تھا کہ انسان کی حقیقت کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں! وہ کھلونا ہے مشیت کے ہاتھوں میں۔ اللہ نے اسے طاقت دی تو وہ اپنی طاقت کے خیال سے پھول گیا۔ اور جب وہ طاقت واپس لے لی تو وہ اتنا کمزور اور بے بس ہو گیا کہ حد نہیں۔ تو شاید یہ آزمائش ہے' طاقت بھی آزمائش ہے اور کمزوری بھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون کس حال میں اللہ کو یاد رکھتا ہے۔ اسے ظفر کا شعر یاد آیا......

ظفر آدمی اُس کو نہ جانیے گا' ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی' جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

تحریکِ پاکستان سے اُس کے باطن کا گہرا تعلق تھا۔ وہ جو بچپن سے ہی سوچتا رہا تھا' ذہن میں ابھرنے والے سوالات پر غور کرتا تھا' وہ جو خدائے واحد کی جستجو میں تھا' اسے روشنی ملی تو اس عرصے میں' جب پاکستان بن رہا تھا۔ وہ قرآن کی تین آیات سن کر اور سمجھ کر مسلمان ہوا۔ یہ سچائی اُس کے دل میں پوری طرح اتر گئی تھی کہ اسلام دینِ کامل ہے۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ زندگی میں اس کا واسطہ جتنے بھی مسلمانوں سے پڑا تھا' وہ سب کے سب بہت اچھے مسلمان تھے۔ سب سے پہلے حمیدہ' چاچا جمال دین اور وصال دین۔ سادہ محبت کرنے والے سچے لوگ۔ پھر مولوی صاحب' ماں جی' کاکا' بوا' محمود اور نادرہ سب کے سب اہلِ ایمان تھے...... شک سے دور اور یقین سے آراستہ۔ سبھی سے اُس نے کچھ نہ کچھ سیکھا تھا' اور بہت اہم سیکھا تھا۔ مولوی صاحب سے اُس نے عربی سیکھی تھی۔ اور عربی قرآن کی زبان تھی۔ وہ زبان نہ سیکھی ہوتی تو اُس رات وہ آیات اُس کی سمجھ میں نہ آئی ہوتیں۔ وہ آیات سن کر ہی تو وہ ایمان لایا تھا۔ اور کلمہ...... وہ اس پر اُس کی کلاس فیلو نادرہ کا احسان تھا۔ اس رات پارٹی میں اُس نے سمجھ لیا تھا کہ اگر وہ مسلمان ہوتا تو نادرہ نے اس سے اظہارِ محبت کر دیا ہوتا۔ لیکن وہ کسی مشرک سے محبت کے باوجود جڑ نہیں سکتی تھی۔ یعنی اُس کے لئے اللہ کے حکم کے سامنے اپنی خوشی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اور محمود' جس نے اس پر وحدانیت کا تصور بالکل واضح کر دیا تھا۔ اسے بتا دیا تھا کہ عقیدۂ تثلیث بدترین شرک ہے۔ اور ماں جی اور آکا میاں اور چھمن بوا' جن میں اُس نے اعلیٰ انسانی

اوصاف دیکھے تھے۔

تو جس وقت اُس نے اسلام قبول کیا' وہ جانتا تھا کہ اسلام دینِ کامل ہے۔ اور مسلمان کامل انسان۔ اسے پاکستان بننے کی بہت زیادہ خوشی تھی۔ اُس کے نزدیک وہ خدا کی سرزمین تھی...... کامل انسانوں کی سرزمین۔ یہ سن کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی کہ اُس کا آبائی گاؤں پاکستان میں ہے۔ اس تصور کے ساتھ وہ پاکستان آیا تھا۔ اپنے گاؤں اور اردگرد کے گاؤں دیکھ کر اُس کے ذہن میں ایک ہی لفظ گونجا تھا...... مردہ زمین۔ پھر اُس نے اپنی آنکھوں سے اس مردہ زمین کو زندہ ہوتے دیکھا تھا...... اللہ کی قدرت!

لیکن رضوان صاحب کی تلاش میں لاہور آنے کے بعد اُس نے جو کچھ دیکھا' اُس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اندر مسلسل ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہی تھی' جس کا اندازہ اسے اب ہوا تھا۔ یہاں اُس نے جمیل کو دیکھا' جو پناہ گزینوں کے حصے کا کھانا بیچ کر اپنی جیب گرم کرتا تھا' جو معصوم لڑکیوں کو بازار میں جسم فروشی کے لئے بیچ دیتا تھا۔ اور تو اور اللہ کی اس پاک سرزمین پر ہیرا منڈی بھی تھی' جہاں بکنے والے جسم تھے۔ اور صرف اس لئے تھے کہ ان کے خریدار بھی موجود تھے۔ اور اس کاروبار کو چلانے والی عورتیں ہی تھیں۔ اور گھیر کر لانے والے دلال تھے۔ وہاں جمیل کی پشت پناہی کرنے والے بڑے افسر بھی تھے' جنہوں نے مجرم ہونے کے باوجود اسے معطل نہیں ہونے دیا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ انہیں لڑکیاں سپلائی کرتا تھا...... لڑکیاں...... ہندوستان سے لٹ پٹ کر آنے والے مہاجروں کی مظلوم اور معصوم بچیاں۔ اسی پاک زمین پر وہ لوگ بھی تھے' جو ایک ولی کے مزار کے زیرِ سایہ بیٹھے لنگر کی دیگوں کا کاروبار کر رہے تھے' جو جمیل سے سستے میں کیمپ والوں کے حصے کا کھانا خرید کر زائرین کو بیچ دیتے تھے۔

اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ لیکن اس وقت تنہائی اور فرصت میں سوچنے کا موقع ملا تو اسے اندازہ ہوا کہ مایوسی قطرہ قطرہ اس کے اندر گرتی رہی ہے' اور اچھا خاصا ایک تالاب سا بن گیا ہے۔

اللہ کو واحد ماننے والے' اس پر ایمان رکھنے والے' شرک سے بچنے والے ایسے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس نے سوچا۔

اندر کا موسم بہت خراب ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا' مجھے اچھی باتیں سوچنی چاہئیں۔ اسے نور بانو کا خیال آیا۔ نور بانو جو اس کے لئے محض آواز تھی۔ وہ آواز سنتے ہی اسے اس آواز والی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ لیکن اب وہ اس کی اہمیت سمجھ سکتا تھا۔ اللہ نے اسے اس کے لئے نشانِ راہ بنایا تھا۔ وہ آواز سن کر اس نے عربی سیکھی۔ عربی نہ سیکھتا تو قرآن سن کر وہ اس کا مطلب کیسے سمجھتا۔ اور مطلب نہ سمجھتا تو اسلام کیسے قبول کرتا۔

تو اس کے لئے تو نور بانو بہت مبارک تھی۔ اور وہ ملی بھی کیسے۔ اس کی دونوں بہنیں ظالموں

کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئیں لیکن اللہ نے اسے بچا لیا۔ یہ تو اُس نے لڑکپن میں ہی سمجھ لیا تھا کہ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اُس نے دیکھا تھا کہ کسی چھوٹے سے کام کے لئے بھی اسباب کا سلسلہ بہت دور سے...... بہت پیچھے سے جاری ہوتا ہے۔ کوئی سمجھ بھی نہیں پاتا کہ یہ کس لئے ہو رہا ہے۔ اور شاید اس کے معاملے میں تو یہ سلسلہ اور دور سے چل رہا تھا۔ بلکہ اس کے لئے اس کا سرا پکڑنا ممکن ہی نہیں تھا۔

اُس نے نور بانو کا تصور کرنے کی کوشش کی۔ اُس کی نگاہوں میں تو کوئی سراپا نہیں ابھرا...... کوئی پرچھائیں بھی نہیں ابھری' ہاں سماعت میں مترنم آواز اور آنکھیں کھول دینے والے اللہ کے الفاظ ضرور گونجے...... فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرىٰ مِنْ فُطُوْر۔ اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپی دوڑ گئی۔ نور بانو کئی بار اُس کے سامنے آئی تھی۔ لیکن اُس نے کبھی اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ تو اس کی غیر مشروط اور حتمی محبت تھی۔ جیسے محبت کے لئے وجود کی ضرورت ہی نہ ہو۔ آواز ہی کافی ہو۔

اور یہ سچ تھا...... بہت بڑا سچ۔ اس کی محبت میں نہ کوئی شک تھا' نہ شرط۔ وہ حتمی اور غیر متزلزل محبت تھی۔ اور اس کی بنیاد صرف آواز تھی...... اور آواز بھی قرآن پڑھنے والی آواز۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ خوب صورتی کا معیار کیا ہے' تو وہ کہتا۔ جس کے پاس ایسی آواز ہو' وہ خوب صورتی کی دنیاوی حد ہے۔ کبھی وہ سوچتا کہ نور بانو سے اُس کی شادی ہو جائے تو بس وہ اُس سے قرأت ہی سنتا رہے گا۔

کسی پھیری والے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اسے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ چند لمحے تو اُس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ وہ یہاں کیوں بیٹھا ہے۔

پھر اسے یاد آ گیا!

وہ گھر سے...... سب لوگوں سے دور' یہاں ایک کام سے آیا تھا۔ اور اب وہ کام ہو گیا تھا تو وہ اداس تھا۔ نور بانو کے چچا کا پتا اُس کی جیب میں تھا۔ فطری طور پر تو اسے پتا ملتے ہی اُس طرف لپکنا چاہئے تھا۔ لیکن اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ شام کو وہاں جائے گا۔

کیوں؟

اس کیوں کا جواب نوکِ زباں پر موجود تھا۔ لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں گھر سے نکلتے ہیں اور شام کو گھر لوٹتے ہیں لیکن بجھا بجھا دل گواہی دے رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

آدمی جھوٹ بولتا ہے۔ مگر اس کا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ عبدالحق نے دل کی آواز کی طرف سے کان بند کر لئے تھے۔ مگر اس وقت دل کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وعدے کا پاس نہ ہوتا تو وہ کاغذ کے اس ٹکڑے کو چاک کرتا اور گاؤں واپس چلا جاتا۔

پہلی بار اُس نے شعور کے ساتھ اس صورتِ حال کے بارے میں سوچا۔ تو اب نور بانو اپنے چچا کے پاس چلی آئے گی۔ اور اُس کا گھر سُونا ہو جائے گا۔ اُس کا دل بوجھل ہو گیا۔ پھر اُس نے خود سے کہا...... یہ تو ہونا ہی تھا۔ کہاں میں کہاں وہ' کہاں زمین کہاں آسمان۔ ہم دونوں کا کیا میل' کیا جوڑ۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ وہ آواز سماعت میں محفوظ ہے۔

تو پھر اُداسی کیسی؟ اندر سے کسی نے کہا۔ تیرا تعلق صرف آواز سے ہی تو تھا۔ سو وہ تیرے پاس ہے اور رہے گی۔

لیکن اداسی پھر بھی نہیں چھٹی۔

⊛......⊛......⊛

دستک کے جواب میں دروازہ کھلا اور دس بارہ سال کے ایک لڑکے نے باہر جھانکا۔

"جی...... فرمایئے؟"

"رضوان صاحب یہیں رہتے ہیں؟" عبدالحق نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ وہ سوچ رہا تھا' کاش انکار میں جواب ملے۔

"جی ہاں۔"

مایوسی کی وجہ سے چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اُس نے سنبھل کر پوچھا۔ "وہ موجود ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"مجھے ان سے ملنا ہے۔"

"آپ کا نام؟"

"عبدالحق۔"

"آپ یہاں رکیں۔ میں ابا جان کو بلاتا ہوں۔"

لڑکا اندر چلا گیا۔ عبدالحق وہیں کھڑا رہا۔ ذرا دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص باہر آیا۔ اُس کے چہرے سے شرافت اور متانت عیاں تھی لیکن مزاج کا سخت لگتا تھا۔

عبدالحق نے اسے سلام کیا۔ "جی...... فرمایئے۔" اُس نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

"میرا خیال ہے' میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"جی ہاں۔ میں آپ کے لئے اجنبی ہوں لیکن آپ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

وہ خشک لہجہ' وہ بے مہری عبدالحق کے لئے بہت دل شکن تھی...... اور وہ بھی ٹوٹے ہوئے دل کے لئے۔ "آپ کا تعلق آگرہ سے ہی ہے نا؟"

"آپ کا اس سے کیا تعلق؟" رضوان صاحب نے مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھیے...... میں بہت دنوں سے آپ کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ مگر سب سے پہلے مجھے تصدیق کرنی ہے کہ آپ وہی رضوان صاحب ہیں یا نہیں۔"

"بات کیا ہے؟"

"آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس۔"

"حیرت ہے' جبکہ آپ مجھے جانتے ہیں' نہ میں آپ کو جانتا ہوں۔"

"آپ میرے سوال کا جواب تو دیجئے۔ آپ ہندوستان میں آگرہ میں ہی رہتے تھے نا؟"

رضوان صاحب کچھ ہچکچائے۔ پھر انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کے ایک بھائی دہلی میں رہتے تھے۔"

اچانک رضوان صاحب کا انداز بدل گیا۔ "آپ اندر آیئے......" انہوں نے کہا۔

وہ عبدالحق کو بیٹھک میں لے گئے۔ "بیٹھیے۔" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ چائے پئیں گے یا شربت؟"

"جی کچھ نہیں۔" عبدالحق نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

رضوان صاحب نے اصرار بھی نہیں کیا۔ "یہ باتیں باہر کرنا مناسب نہیں تھا۔" وہ بولے۔ "دہلی میں میرے بڑے بھائی رہتے تھے لیکن ان کا تو ہندوستان بننے سے دس سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔"

"آپ کی بھابی اور ان کی تین بیٹیاں......"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔"

عبدالحق کا دل ڈوبنے لگا۔ آس کا کچا دھاگا بھی ٹوٹ رہا تھا۔

"آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس میری ایک امانت ہے۔"

"جی ہاں۔ دیکھیے' میں نے اپنے ملازم کو آپ کی تلاش میں آگرے بھیجا تھا۔ مگر آپ ہجرت کر چکے تھے۔"

"ہاں...... ہم جون میں ہی یہاں آ گئے تھے......"

"اب میں کئی ماہ سے آپ کو یہاں تلاش کر رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ کا پتا ملا ہے۔"

"آپ مجھے بھابی جان اور بچوں کے متعلق بتایئے نا۔" رضوان صاحب کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔ کوئی اچھی خبر نہیں ہے آپ کے لئے۔ ان کے گھر پر شرپسندوں نے حملہ کیا تھا۔ آ کا میاں' چھمن بوا' ماں جی اور ان کی دو بیٹیوں کو شہید کر دیا گیا۔ ان کی ایک بیٹی نور بانو

البتہ بچ گئی۔ وہی آپ کی امانت ہے میرے پاس۔"

"نور بانو...... وہ بچ کی لڑکی۔" رضوان صاحب نے بے ساختہ کہا۔ پھر چونکے۔ "آ کا میاں اور چھمن بوا کا جس طرح آپ نے تذکرہ کیا ہے' اُس سے لگتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے بہت قریب تھے۔"

"جی...... ہم لوگ انہی کے مکان میں اوپر والے حصے میں کرائے دار تھے۔"

رضوان صاحب کی رنگت متغیر ہوگئی۔ "میرے بچے نے تو......" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام عبدالحق ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بھائی جان کے کرایہ دار تو ہندو تھے۔ اور میں نے بھائی جان کو خط لکھا تھا کہ حالات اچھے نہیں ہیں۔ آپ ان لوگوں سے چھٹکارا پالیجئے۔" رضوان نے تلخی سے کہا۔ "مگر وہ کہاں سنتی تھیں کسی کی۔"

"میں انہی میں سے ہوں۔ ہم سب پاکستان بننے سے پہلے ہی مسلمان ہوگئے تھے۔" عبدالحق نے بے حد تحمل سے کہا۔

"نور بانو کیسے بچ گئی؟" رضوان صاحب نے شک آمیز لہجے میں کہا۔ "جبکہ گھر کے تمام لوگ ختم ہوگئے۔"

"زندگی اور موت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔"

"ابھی تمہیں مسلمان ہوئے چند ماہ ہوئے ہیں اور تم مجھے دین پڑھا رہے ہو۔ بہت خوب...... ماشاء اللہ۔ چلو زندہ تو بچ گئی۔ مگر ویسے تو نہیں بچی ہوگی...... ایک بات بتاؤ' جب کی یہ بات ہے' تم مسلمان ہوچکے تھے؟"

"جی نہیں۔"

"تو ہندوؤں نے اُس کی جان اور آبرو کی حفاظت کی۔ یہی باور کرانا چاہ رہے ہو تم۔" رضوان صاحب نے زہریلے لہجے میں کہا۔

عبدالحق کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "اللہ ہی سب کا محافظ ہے۔ جان و مال کا بھی اور عزت آبرو کا بھی۔" اُس نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ "اور میں آپ کو کچھ باور نہیں کرا رہا ہوں۔ میں تو آپ کو آپ کی امانت لوٹانے کے لئے آیا ہوں۔"

"میری کوئی امانت تمہارے پاس نہیں تھی۔ وہ میری امانت نہیں۔" رضوان صاحب کا لہجہ بہت سخت ہوگیا۔

"وہ آپ کا خون ہے۔ آپ کی بھتیجی ہے۔ آپ سے ملنے کو' آپ کے سائے میں آنے کو

کب سے ترس رہی ہے۔"

"وہ میرے لیے مرگئی ہے...... اپنی ماں اور بہنوں کی طرح۔"

"جسے اللہ نے بچالیا' وہ کیسے مرسکتا ہے...... محض آپ کے کہنے پر۔"

"تم مجھ سے بے کار بحث مت کرو۔" رضوان صاحب اب واضح طور پر مشتعل ہوگئے تھے۔ "ہمارے لئے ہر چیز سے زیادہ اہم عزت ہے۔"

"اور عزت ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ تم بار بار اللہ کو بیچ میں لاکر کیا جتا رہے ہو مجھے۔"

"میں کچھ جتا نہیں رہا ہوں۔ اللہ کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ آپ کے خدشے بے بنیاد ہیں۔ نور بانو پہلے جیسی معصوم اور پاکیزہ ہیں۔ ان پر تو کسی کی میلی نگاہ بھی نہیں پڑی۔"

"تمہیں پارسائی کی سند جاری کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے۔"

"میں تو صرف حقیقت بتا رہا ہوں۔"

"میری بات سنو۔ میرے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔ میں ان پر ایسی کسی لڑکی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔"

"یہ بتائیں' میں ان سے جاکر کیا کہوں؟"

"یہی کہ وہ ہمارے لئے مرچکی ہے۔"

"تاکہ وہ جیتے جی مرجائیں۔"

"جیتے جی تو وہ پہلے ہی مرچکی ہے۔" رضوان صاحب نے بے مہری سے کہا۔ "سنو میاں' مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا ہی بوجھ ہے۔ تمہیں ہی اٹھانا چاہئے اپنا بوجھ۔ تو ایسا کرلو کہ اُس سے شادی کرلو۔"

عبدالحق کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا' مٹھیاں بھنچ گئیں لیکن اُس نے تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ "یہ کام آپ کے گھر سے ہوتو میں آپ کا بہت شکرگزار رہوں گا۔" اُس نے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے جو کہنا تھا' کہہ چکا۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

عبدالحق اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اللہ نے آپ کی بچیوں کی حفاظت فرمائی۔ آپ وہ کچھ دیکھنے سے بچ گئے' جو ہزاروں لوگوں کا مقدر بنا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آپ شکرگزار ہوتے لیکن آپ تو اپنے خون سے بھی منہ پھیر لینے والے بن گئے۔ آپ اپنی بن ماں باپ کی بھتیجی کے لئے باپ بننے کے بجائے بے رحم ہوگئے۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے......"

"بس اب یہ بکواس بند کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ......" رضوان صاحب کہتے کہتے

رک گئے۔

عبدالحق یوں کھڑا رہا' جیسے ان کا جملہ پورا ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔ چند لمحے وہ اُن کی آنکھوں میں دیکھتا رہا' پھر بولا۔ "اس 'ورنہ' کے بعد آپ کے پاس نہ کہنے کے لئے کچھ ہے اور نہ کرنے کے لئے۔ آپ مجھے یہاں سے نہ نکال سکتے ہیں' نہ نکلوا سکتے ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھ پر جو تہمت لگائی' اُس کی تو مجھے پروا نہیں۔ البتہ آپ نے اپنی بھتیجی پر جو تہمت لگائی' وہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی' کیونکہ میرے نزدیک وہ بہت عظیم اور بہت محترم ہے۔ میں نے صرف اس لئے اسے برداشت کر لیا کہ آپ اس کے چچا ہیں۔" اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھائے۔ "......ورنہ میں اپنے ان ہاتھوں سے آپ کو ختم کر دیتا۔"

رضوان صاحب کے چہرے سے رعونت ہوا ہو گئی۔ وہ ایک دم سے سہم گئے۔ ان کی نگاہوں میں خوف تھا۔

عبدالحق پلٹا' بیٹھک سے نکلا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

❁ ❁ ❁

رابعہ حمیدہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ "اماں......وہ صفیہ باجی آئی ہیں۔"

حمیدہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ یہ نام ان کے لئے اجنبی تھا۔

"ارے اماں......ڈاکٹر صاحب کی بیوی۔" رابعہ نے وضاحت کی۔

"انہیں بٹھایا تُو نے؟" حمیدہ نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ وہ علاقے کے سب سے پڑھے لکھے آدمی تھے' انہیں بہت بڑی نعمت سمجھا جاتا تھا۔

"جی اماں۔ وہ آپ کے پاس آئی ہیں۔"

"چل......میں آتی ہوں۔ اور ہاں' زرینہ یا نور بانو سے کہنا کہ چائے بنا لائے ان کے لئے' وہ تو شہری لوگ ہیں نا۔"

رابعہ چلی گئی۔ حمیدہ اٹھی اور بیٹھک کی طرف چل دی۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا کہ کوئی عورت مہمان آئے اور اسے بیٹھک میں بٹھایا جائے۔ لیکن رابعہ نے بھی مہمان کے شہری مزاج کا خیال رکھتے ہوئے انہیں وہاں بٹھایا تھا۔ بیٹھک کی آرائش عبدالحق نے شہری انداز میں ہی کی تھی۔

حمیدہ بیٹھک میں داخل ہوئی تو صفیہ بیگم اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ "ارے اماں......آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں خود آپ کے کمرے میں آ جاتی۔"

"تکلیف کیسی بیٹی۔ تم یہاں تک آئی ہو۔ تکلیف تو تم نے کی ہے۔ بیٹھ جاؤ آرام سے۔" حمیدہ نے بے حد شفقت سے کہا۔

صفیہ بیٹھ گئی۔ "اور اماں' طبیعت کیسی ہے آپ کی؟" اماں تو اس پورے علاقے کی اماں تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹی۔ تمہارے میاں کے ہاتھ میں اللہ نے شفا دی ہے۔ جب سے وہ آئے ہیں' میرے تو سارے مسئلے حل ہو گئے۔ ایک خوراک میں فائدہ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ اور اماں' صاحب ابھی واپس نہیں آئے لاہور سے؟"

حمیدہ مسکرائی۔ زبیر کی دیکھا دیکھی سب لوگ عبدالحق کو صاحب کہنے لگے تھے' کیا چھوٹے کیا بڑے' کیا مرد کیا عورت۔ "نہیں بیٹی' وہ بہت ضدی ہے۔ کسی کام کا سوچ لے تو ادھورا کبھی نہیں چھوڑتا۔"

"وہ تو ہم نے دیکھا ہے۔ ریت میں دبے ہوئے اس علاقے کو سنوارنا آسان کام نہیں تھا۔"

اتنی دیر میں نور بانو چائے اور بسکٹ لے آئی۔ ٹرے اُس نے ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔

"لو بیٹی' تم نے تو اہتمام کر ڈالا۔"

"کوئی اہتمام نہیں خالہ۔" نور بانو نے کہا اور چلی گئی۔

حمیدہ صفیہ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کی آمد کی کوئی وجہ تو ہو گی۔

صفیہ نے دو ایک بسکٹ لیے' پھر چائے کے دو گھونٹ۔ "اماں' اس وقت تو میں اپنی ایک غرض سے آئی ہوں۔"

"کہو نا...... کیا بات ہے۔"

"انہیں اب اکبر کی شادی کی فکر لگ گئی ہے۔" صفیہ نے کہا۔ "مگر سچ پوچھو تو اماں' بہو کی اصل ضرورت تو مجھے ہے۔ اصغر لاہور میں ہے۔ یہ اپنے مطب چلے جاتے ہیں۔ اور اکبر دن بھر دکان میں لگا رہتا ہے۔ میں اکیلی دن بھر کیا دیواروں سے بات کروں۔"

حمیدہ کی سمجھ میں کچھ کچھ بات آ رہی تھی۔ "تو کوئی لڑکی دیکھی اس کے لئے۔"

"جی دیکھی۔ اسی لئے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"مگر بیٹی' نور بانو کو تو میں عبدالحق کے لئے پسند کر چکی ہوں۔" حمیدہ نے کہا۔

"میں نور بانو کی بات نہیں کر رہی ہوں اماں۔"

"تو پھر؟" حمیدہ نے حیرت سے کہا۔ اسی لمحے اُس کے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ اسے افسوس بھی ہوا کہ اسے زرینہ کا خیال ہی نہیں آیا۔ اور ادھر اس پگلی نور بانو کا یہ حال ہے کہ زرینہ سے جلتی رہی...... یہ سوچ کر کہ زرینہ کی خوب صورتی کے آگے میں اسے بھول گئی ہوں۔

"میں تو زرینہ کے لئے آئی ہوں اماں۔" صفیہ نے اسے چونکا دیا۔ "وہ آپ کے لئے بیٹی

ہی کی طرح تو ہے۔"

"ہاں بھئی، عبدالحق کی بہن میری بیٹی ہی تو ہوئی۔" حمیدہ نے کہا۔ وہ تیزی سے سوچنے کی کوشش کررہی تھی۔ عبدالحق نے اسے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ اس کے بارے میں خود آ کر بتائے گا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔

"ڈاکٹر صاحب کو بھی وہ بہت اچھی لگی ہے اکبر کے لئے۔" صفیہ نے کہا۔

"دیکھو بیٹی! اس کا فیصلہ تو عبدالحق ہی کرے گا آ کر۔ اس کی بہن ہے۔ فیصلہ بھی اسی کو کرنا ہے۔"

"مگر اماں، صاحب آپ سے پوچھے بغیر تو کچھ بھی نہیں کریں گے۔"

"یہ تو اُس کی لیاقت ہے۔ ورنہ فیصلہ تو اسی کو کرنا ہے۔"

"تو اماں، آپ تو ہمارے حق میں ہی رائے دیں گی نا۔"

"اودھی میری، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" حمیدہ نے بہت جوش سے کہا۔ "تیرے گھر سے اچھا کوئی گھر ہے اس علاقے میں۔ وہ تو نصیبوں والی ہوگی، جو تیرے گھر میں بسے گی۔"

"بس تو اماں، میں مطمئن ہوں۔ ہم صاحب کے آنے کا انتظار کریں گے۔"

دروازے کی اوٹ میں کھڑی نور بانو تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اُس نے اپنا نام سنا تو ٹھٹک گئی تھی۔ مگر اماں کی بات سن کر اس کے تمام اندیشے ڈھل گئے تھے۔

پہلی بار اسے یقین آیا کہ اماں سچ مچ اُس کے حق میں فیصلہ کیے بیٹھی ہیں۔

❁ ❁ ❁

نور بانو نے حیرت سے زرینہ کو دیکھا۔ "تم خوش نہیں ہوئیں یہ سن کر؟"

"میرے لئے خوش ہونا بہت آسان ہے لیکن خوشی پر یقین کرنا مشکل ہے۔" زرینہ نے جواب دیا۔

"کہیں تم پہلے سے کسی کو پسند تو نہیں کرتیں؟"

"میں اور پسند۔" زرینہ نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تو یہ حق حاصل ہی نہیں۔ اور مجھے کوئی بھی پسند کرے، وہ کیسا ہی ہو، تو یہ اُس کا مجھ پر احسان ہوگا۔"

"ایسی کیا بات ہے۔"

"ایسی بات ہے کہ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔"

"مجھے بھی نہیں۔"

"آپ کو کیا، میں تو خود کو بھی نہیں بتانا چاہتی لیکن مجبور ہوں۔ کیونکہ گزری تو مجھ پر ہی ہے۔"

"مجھے بتاؤ، کیا بات ہے۔" نور بانو نے اصرار کیا۔

"نہیں بتا سکتی۔ آپ خدا کے لئے مجھ سے اصرار مت کیجئے۔"

"اچھا...... نہیں کرتی اصرار۔ مگر تم یہ مجھ سے آپ آپ کیوں کرتی ہو۔ میں تم سے اتنی بڑی تو نہیں ہوں۔"

"وہ تو میں بھائی کے رشتے سے آپ کا ادب کرتی ہوں۔ یہی بہت ہے کہ میں آپ کا نام لیتی ہوں۔ بھابی نہیں کہتی آپ کو۔"

نور بانو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اُس نے جلدی سے موضوع بدلا۔ "یہ اکبر بھائی بہت اچھے ہیں...... بہت نیک ہیں۔"

"جانتی ہوں۔ دیکھ چکی ہوں انہیں۔"

"وہ تمہیں اچھے نہیں لگے۔"

"وہ تو ہیں ہی اچھے لیکن سچ یہ ہے کہ میں ان کے قابل نہیں ہوں۔" زرینہ نے افسردگی سے کہا۔

"لیکن خالہ کے انداز سے تو لگتا ہے کہ وہ تمہیں بہو بنا کر ہی چھوڑیں گی۔"

اچانک زرینہ کا انداز بدل گیا اور وہ مسکرانے لگی۔ "اتنی خرابیوں کے باوجود اب تک سب ٹھیک ہی ہوتا رہا ہے۔ تو اللہ نے چاہا تو آگے بھی اچھا ہی ہوگا۔" اُس نے اپنی کہی ہوئی بات دہرا دی۔ "تو میں ناشکرا پن کیوں کروں۔ نہیں نور بانو! اللہ جو کچھ بھی مجھے دے گا، وہ مجھے قبول ہوگا...... اور میرے لئے اچھا بھی ہوگا۔"

نور بانو نے حیرت سے اسے دیکھا اور سوچا...... یہ کتنی اچھی ہے...... کاش میں بھی ایسی ہی ہوتی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کی ذہنی کیفیت اس وقت بڑی عجیب تھی۔ وہ اس حال میں کیمپ نہیں جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ وہاں اُس نے رہنے کے لیے ایک کمرہ لیا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کلرک اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

"آپ رات بھر رکو گے یا تھوڑی دیر؟" کلرک نے اُس سے پوچھا۔

"تھوڑی دیر کا کیا مطلب ہے۔ مجھے رات گزارنی ہے۔"

"وہ جی آپ کے پاس سامان نہیں تھا نا، اس لیے......"

"سونے کے لیے آدمی کو سامان کی ضرورت بھی پڑتی ہے؟" عبدالحق نے چڑچڑے پن سے کہا۔ "کمرے میں بستر نہیں ہوگا کیا؟"

کلرک نے اُس کا نام پوچھ کر رجسٹر میں اندراج کیا اور چابی اسے دے دی۔ ''کمرہ نمبر 101 ہے صاحب جی۔ زینے سے اوپر جائیں گے تو بئے ہاتھ والا پہلا کمرہ ہے۔''

''شکریہ۔'' عبدالحق نے کہا اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ تھکن کا احساس بہت شدید تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ درحقیقت تھکن نہیں ہے۔ رضوان صاحب سے ملاقات کا نتیجہ ہے۔ ان سے مل کر اسے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ کوئی اتنا بے حس بھی ہو سکتا ہے۔ سگے بھائی کی بیٹی اپنی ہی بیٹی ہوتی ہے...... خاص طور پر جبکہ بھائی مر چکا ہو۔ لیکن انہوں نے کس طرح نور بانو کو رد کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا...... مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا ہی بوجھ ہے...... اور تمہیں ہی اٹھانا چاہیے۔ اور وہ لفظ بوجھ انہوں نے گالی کی طرح استعمال کیا تھا۔ وہ لفظ درحقیقت مہذب آدمی کی گالی تھا۔ اور وہ عزت کی بات کر رہے تھے۔ اور اپنے خون کو گالی دے رہے تھے۔ یہ عزت کا کون سا معیار تھا!

اس لمحے عبدالحق کی سمجھ میں اپنے اضمحلال کی وجہ آ گئی۔ درحقیقت اسے بہت شدت سے غصہ آیا تھا۔ ایسا شدید غصہ کہ اسے ضبط کرنے میں اُس پر قیامت گزر گئی تھی۔ بلکہ اسے تو اس پر حیرت تھی کہ اُس نے برداشت کیسے کر لیا۔ نور بانو کو تو وہ اپنی عزت سمجھتا تھا۔ وہ اس کے لیے گالی سن کر کیسے برداشت کر سکتا تھا لیکن برداشت کرنا پڑا۔ کیونکہ گالی دینے والا نور بانو کا چچا تھا، جس کا حق نور بانو پر سچا تھا، اس کے حق کی طرح خود ساختہ نہیں۔

یہ عزت کیا چیز ہے، جسے یہ لوگ اتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ یہ جو اتنے بڑے پیمانے پر ہجرت ہوئی، اور اس کے دوران بہیمیت اور درندگی کے جو اجتماعی مظاہرے دیکھنے میں آئے، وہ تو شاید انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ انسان نے مذہب کے نام پر جس طرح اپنے جیسے انسانوں کو کاٹا اور روندا اور معصومیت کو پامال کیا، وہ تو پوری انسانیت کے لیے شرم ناک ہے۔ تو اس پُر آشوب عہد میں جن ہزاروں معصوم لڑکیوں کی عصمت دری ہوئی، کیا وہ اس بات کی حق دار نہیں کہ ان کے لوگ انہیں زیادہ عزت دیں، ان کے زخموں پر مرہم رکھیں، انہیں جینے کا حوصلہ دیں، انہیں عزت کے ساتھ بسائیں، آباد کریں۔ یہ کیسے عزت دار لوگ ہیں، جو اپنی ہی مجبور اور مظلوم بچیوں کو آبرو باختہ قرار دے کر دھتکارتے ہیں۔ جو انہیں ایسی مکروہ اور متعدی بیماری میں مبتلا حقیر مخلوق سمجھتے ہیں، جو ان کی اچھوتی بچیوں کو بھی اس بیماری میں مبتلا کر دیں۔ یہ کیسے عزت دار لوگ ہیں، اپنی عزت پر گھمنڈ کرنے والے، جو عزت کو اپنی کمائی سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ یہ مسلمان ہو کر بھی قرآن میں اللہ کے اس فرمان کو بھول جاتے ہیں کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے، اور عزت اور ذلت اللہ ہی کی طرف سے ہے، اور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ زندگی کی محبت کے ایک کمزور لمحے میں آدمی اپنی اس نام نہاد عزت اور غیرت سے کتنی آسانی سے

دست بردار ہو جاتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں بے عزتی اور بے غیرتی کا طوق پہن لیتا ہے۔ افضال صاحب کی مثال اس کے سامنے تھی۔ وہ بلاشبہ مضبوط آدمی تھے لیکن زندگی کی محبت ان پر حملہ آور ہوئی تو ان میں ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالنے کی سکت بھی نہیں رہی۔ وہ مسلح بھی تھے، انہوں نے صرف بیٹی سے ہی نہیں، خود سے بھی وعدہ کیا تھا، مگر زندگی کی محبت نے ان سے جسم کی جنبش چھین لی، اور وہ کھلی آنکھوں سے اپنی غیرت کی دھجیاں اُڑتے دیکھتے رہے۔ اس کے نتیجے میں وہ ذہنی توازن کھو بیٹھے، اپنا نام بھی ان کے لیے نفرت کا نشان بن گیا۔ اور جس زندگی کی محبت میں یہ سب کچھ ہوا، وہ زندگی بھی ان کے لیے قابلِ نفرت بن گئی۔

افضال صاحب کے برعکس یہ رضوان صاحب اسے بہت کمزور آدمی لگے۔ افضال صاحب پر جو گزری، وہ ان پر گزرتی تو شاید وہ جھیل بھی نہ پاتے۔ اور ان کی رعونت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اپنے خون کو ہی حقیر کر دیا۔ اپنی معصوم اور پاکیزہ بھتیجی کو بھی مسترد کر دیا۔ صرف اپنے گمان کی بنیاد پر اسے اپنے لیے باعثِ ننگ قرار دے دیا۔ وہ افضال صاحب کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹے، بہت حقیر آدمی تھے۔ افضال صاحب نے اپنی بزدلی کی تلافی تو بڑی شان سے کی۔ اپنی بیٹی، اپنی آبرو گنوانے کے بعد انہوں نے عملی کوشش تو کی کہ جس صورت حال میں ان کی بیٹی پھنسی، اس سے کسی اور کی بیٹی کو بچا لائیں لیکن یہ رضوان صاحب! اسے یقین تھا کہ ان میں تو اخلاقی جرأت ہے ہی نہیں۔ دوسروں کو زبان کے زور پر مطعون کرنے والے عملاً کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

کیا مسلمان بھی موت سے ڈرتے ہیں...... یہ جاننے کے باوجود کہ موت اللہ کا حکم ہے، اور مقررہ وقت پر آتی ہے۔ اس نے سوچا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس نے جمیل کو بھی دیکھا ہے۔ وہ بھی تو مسلمان تھا۔ کیا اسے رزقِ حلال اور رزقِ حرام کی تمیز نہیں تھی اور وہ لوگ، جنہیں وہ نہیں جانتا، جن کے دم سے ہیرامنڈی کی رونق ہے، کیا وہ مسلمان ہو کر بھی نہیں جانتے کہ زنا گناہِ کبیرہ ہے۔ اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ مسلمان ہونا صالح اعمال کی ضمانت نہیں......

دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ ''آ جاؤ۔'' اس نے پکارا۔

دروازہ کھلا اور ویٹر اندر آ گیا۔ ''صاحب...... کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔''

''ابھی تو مجھے بھوک نہیں ہے۔ ضرورت ہوگی تو بلاؤں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''مجھے بلانا ہو تو یہ بٹن دبا دیجیے گا۔'' ویٹر نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔ چند لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ ویٹر اب بھی کھڑا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''میں آپ کی ہر ضرورت پوری کر سکتا ہوں صاحب۔''

”کیا مطلب؟“

”پینا چاہیں تو دیسی بھی مل سکتی ہے اور ولایتی بھی۔“

عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ نگاہوں میں الجھن لیے ویٹر کو دیکھ رہا تھا۔

”اور صاحب‘ تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔ بس آپ حکم کریں۔ جیسی آپ چاہیں گے‘ مل جائے گی۔ آج کل تازہ مال بہت آیا ہوا ہے۔“

اس بار عبدالحق کی سمجھ میں پوری بات آ گئی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور بڑی شدت سے غصہ آیا تھا۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ ایک وہ ویٹر ہی تو نہیں تھا۔ یہاں کا پورا سسٹم تھا۔ ”مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”کھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو تمہیں بلا لوں گا۔“

ویٹر نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور کمرے سے چلا گیا۔

عبدالحق ’تازہ مال‘ کی اصطلاح پر سوچنے اور کڑھنے لگا۔ مال! یعنی عورتیں کاروباری جنس ہیں...... جیسے پھل‘ سبزی‘ ترکاری اور تازہ مال! گویا ہجرت کا انسانی المیہ کاروبار چمکانے کا سبب بنا ہے۔ جسموں کے بیوپاریوں سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہیں گے کہ بازار میں اتنی ورائٹی پہلے کبھی نہیں آئی۔ واقعی...... اس نئے مال میں وہ ہندو اور سکھ لڑکیاں بھی ہوں گی‘ جو ہندوستان جانے کی کوشش میں پکڑ لی گئی ہوں گی۔ اور وہ مسلمان لڑکیاں بھی ہوں گی‘ جو اپنے گھر والوں کو کھو کر‘ یا ان سے بچھڑ کر پاکستان پہنچی ہوں گی۔ اور کسی جمیل کے ہتھے چڑھ گئی ہوں گی۔ جسموں کے ان بیوپاریوں کے نزدیک ان کے ہندو‘ سکھ یا مسلمان ہونے کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کے نزدیک تو وہ محض ورائٹی ہو گی۔

عبدالحق کو افسوس ہونے لگا۔ وہ نور بانو کی خاطر رضوان صاحب کی تلاش میں یہاں آیا تو اس نے پایا تو کچھ نہیں‘ البتہ کھو بہت کچھ گیا۔ اس کے آئیڈیل ٹوٹ پھوٹ گئے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا اس کا۔

یہ وہ پاکستان تو نہیں‘ جو میرے تصور میں تھا۔ اس نے سوچا۔ مایوسی کی ایک تند لہر اٹھی اور اس کے وجود پر چھانے لگی۔ یہاں جسم فروشی بھی ہو رہی ہے‘ بے ایمانی بھی ہے‘ رشوت ستانی بھی ہے اور ظلم بھی۔

مگر پھر اچانک دل میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن پھوٹی اور پھیلنے لگی۔ اسے ہیڈ محرر کی گفتگو یاد آ گئی۔ وہ رشوت لیتا تھا‘ لیکن جانتا تھا کہ یہ بڑا گناہ ہے اور اس نے جو کچھ بتایا تھا‘ وہ دل کو لگتا تھا۔ انگریز بلاشبہ سازشی ذہن کے لوگ تھے۔ اور ہندوؤں کے ساتھ ان کی ملی بھگت تھی۔ وہ اس ریاست کو ناکام دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لیے انہوں نے اہتمام بھی کیا تھا۔ اس ننھے

منے نوزائیدہ پاکستان کو انہوں نے معاشی کمزوری بھی دی تھی اور اخلاقی خرابیاں بھی مروج کی تھیں۔ جو کسی بھی معاشرے کے لیے تباہ کن ہوتی ہیں۔ جو لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ وہ سب اندر سے زخمی اور غم زدہ بھی تھے اور بے سروساماں بھی۔ ایسے میں مایوس ہونا کتنا آسان ہے۔ اور مایوسی کے نتائج تو اچھے ہوتے ہی نہیں۔

اس نے اپنی مایوسی کو ذہن سے جھٹکا۔ وہ جمیل اور رضوان صاحب جیسے لوگوں کو دیکھ کر مایوس ہو رہا تھا۔ مگر وہاں حسن دین‘ عرفان صاحب اور مسعود صاحب جیسے لوگ بھی تو تھے‘ جو پاکستان کے مستقبل کے لیے سوچ ہی نہیں رہے تھے‘ عمل بھی کر رہے تھے۔ اور تھانے کا وہ معمولی سا ہیڈ محرر بھی تو تھا‘ جو سب کچھ سمجھتا تھا۔ اور وہاں عام لوگوں میں چھولے والے پہلوان جیسے لوگ بھی تھے۔ برائی اور خرابی بہت بڑی تھی‘ اور جتنی بڑی تھی‘ اس سے بہت زیادہ بڑی نظر آتی تھی۔ اور نیکی تو بہت خاموش طبع ہوتی ہے۔ اس لیے نظر کم آتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس ملک کا قیام اللہ کی طرف سے تھا‘ اور ایک معجزہ تھا۔ تو اگر اللہ کی مرضی ہے کہ یہ قائم رہے تو تمام سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود‘ اور تمام تر خرابیوں کے باوجود قائم رہے گا۔ مایوسی تو صرف کمزور ہی کرے گی۔ مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

اس لمحے مسعود صاحب کی بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اسے بھی اس ملک کی بہتری کے لیے کچھ کرنا ہو گا۔ اسے سول سروس کی طرف آنا ہو گا۔ یہ اس کی ضرورت نہیں لیکن ملک و قوم کی ضرورت تو ہے۔ ویسے بھی وہ ان سے وعدہ کر چکا ہے۔

لاہور وہ جس مقصد کے تحت آیا تھا‘ وہ پورا ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ ناکام رہا تھا۔ تاہم فی الحال یہاں قیام کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اب گاؤں واپس جانا تھا۔ اماں اسے یاد آ رہی تھیں‘ اور اماں بھی اس کے لیے تڑپ رہی ہوں گی۔ اور نور بانو......!

نور بانو کا خیال آتے ہی وہ پھر فکر مند ہو گیا۔ وہ نور بانو کو کیا جواب دے گا؟ اور کیا بتائے گا اسے؟ اگر وہ سچ بولتا ہے تو نور بانو کو کتنا دکھ ہو گا اور وہ شرمندہ بھی ہو گی۔ یہ تو کچھ ٹھیک نہیں، پھر وہ کیا کرے۔ جھوٹ تو بہتر ی چیز ہے۔

وہ سوچنے اور الجھنے لگا۔ پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اسے یاد تھا کہ نور بانو ابتدا ہی سے اپنے چچا کے پاس جانے کے لیے بے تاب تھی۔ اس کے خیال میں وہ صرف وہیں محفوظ ہو سکتی تھی۔ اور ان لوگوں کے بارے میں تو وہ تھی ہی بدگمان۔ اسے یاد تھا‘ یہاں آنے سے پہلے وہ خود اس کے پاس آئی تھی...... یہ یاد دلانے کے لیے کہ اس نے اس کے چچا کو تلاش کرنے کا وعدہ ابھی تک پورا نہیں کیا ہے۔ یعنی اس کا دل اب بھی اپنے چچا کے گھر میں اٹکا ہوا تھا۔

تو اب اگر وہ اسے سچ بتاتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ اس پر یقین نہ کرے...... بدگمانی کرے

کہ وہ...... اس بدگمانی کے بارے میں سوچنا بھی اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ جانتی اور سمجھتی بھی ہی نہیں کہ وہ اس کے لیے کتنی محترم ہے۔ وہ اسے نجانے کیا سمجھتی ہے۔

خیر...... اس کا آسان حل یہ تھا کہ وہ اسے رضوان صاحب کے گھر لے جائے اور اسے ان سے ملوا دے لیکن وہ جانتا تھا کہ رضوان صاحب کا ردعمل کتنا شدید ہوگا۔ نور بانو کو صرف شرمندگی نہیں ہوگی' بلکہ سخت ذلت بھی اٹھانی ہوگی۔ وہ تو کبھی خود سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔ نہیں...... وہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے نور بانو کو جیتے جی نہیں مار سکتا۔

اس کا مطلب تھا کہ اسے جھوٹ بولنا ہوگا۔ اور جھوٹ بولنے کے لیے اس کا دل آمادہ نہیں تھا۔

بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہوگیا۔ سچ اسے اماں کو بتانا تھا۔ اور نور بانو سے وہ بس اتنا ہی کہتا کہ رضوان صاحب کو وہ تلاش نہیں کر سکا۔ اس کے بعد وہ اسے جو چاہے سمجھے لیکن وہ بہت بڑی اذیت سے بچ جائے گی۔

دل مطمئن ہوا تو بھوک جاگ اٹھی۔ اس نے ویٹر کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبا دیا......

❁ ❁ ❁
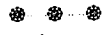
''تو تمہارا کام نہیں ہوا؟'' مسعود صاحب نے پوچھا۔

''مجھے یقین تھا سر کہ وہ میرے مطلوبہ رضوان صاحب ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔'' عبدالحق نے جواب دیا۔

''یعنی تمہاری تلاش جاری رہے گی؟''

''نہیں سر!'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں برسوں مارا مارا پھرتا رہا ہوں' تب بھی انہیں تلاش نہیں کر سکوں گا۔ تو بے سود جستجو کا کیا فائدہ۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ اب کیا ارادہ ہے۔''

''گاؤں واپس جاؤں گا۔''

''لیکن واپس آنے کے لیے۔''

''جی ہاں۔''

''تو چلو...... میں تمہیں کوٹھی دکھا دوں۔''

''جلدی کیا ہے سر۔ واپس آؤں گا تب دیکھ لوں گا۔''

''نہیں میں چاہتا ہوں کہ تم آؤ تو سیدھے اپنی کوٹھی میں قیام کرو۔''

مسعود صاحب کے انکار کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ مسعود صاحب اپنی گاڑی میں اسے کوٹھی دکھانے لے گئے۔

''یہ تو وہی علاقہ معلوم ہوتا ہے' جہاں آپ کا گھر ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''ہاں...... یہ کوٹھی بھی مغل پورے میں ہی ہے۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''پیدل تمہارے گھر آنا چاہوں تو زیادہ سے زیادہ سات منٹ کا راستہ ہے۔''

میرے گھر! عبدالحق نے حیرت سے سوچا۔ یہ ابھی سے اسے میرا گھر کہہ رہے ہیں۔ ایسا خلوص بھی کہیں ملتا ہے! مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ابھی اسے اس خلوص کا اور بڑا مظاہرہ دیکھنا ہے۔

مسعود صاحب نے گاڑی جس بنگلے کے سامنے رکوائی' اسے دیکھ کر عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ مسعود صاحب کی کوٹھی سے کافی مختلف تھا۔ مسعود صاحب کی پرانی طرز کی کوٹھی تھی جبکہ یہ جدید طرز کا بنگلہ تھا۔ پھر باہر سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ رقبے میں بھی مسعود صاحب کی کوٹھی سے کافی بڑا ہے۔

ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور دونوں نیچے اترے۔ مسعود صاحب نے گیٹ کے پہلو میں لگا اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چند ہی لمحے بعد ادھیڑ عمر چوکی دار لپکتا ہوا گیٹ کی طرف آیا۔ مسعود صاحب کو دیکھ کر اس نے فرشی سلام کیا اور پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔

''آؤ عبدالحق۔'' مسعود صاحب نے عبدالحق کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

وہ اندر داخل ہوئے۔ سامنے ہی بہت بڑا' بہت وسیع و عریض لان تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ پچھلے کچھ عرصے سے وہ نگہ داشت سے محروم ہے۔ تاہم وہ بے ترتیب ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ اسے دیکھ کر سلیقے کا احساس ہوتا تھا۔

مسعود صاحب نے پلٹ کر چوکی دار کو دیکھا۔ ''صادق...... یہ ہیں اس بنگلے کے اصل مالک۔'' انہوں نے کہا۔ ''ان کا نام عبدالحق ہے۔''

''سلام صاحب!'' صادق نے عبدالحق کو یوں سلام کیا جیسے پہلی بار اس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔

''صادق' ڈرائیور سے کہو کہ گاڑی اندر لے آئے۔'' مسعود صاحب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

صادق پلٹا اور گیٹ کی طرف واپس چلا گیا۔

''مبین صاحب کے لیے یہ بنگلہ مصیبت بن گیا تھا۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''اس کی مینٹے نینس بھی ان کے لیے ممکن نہیں تھی۔ بنگلہ ان کے پاس تھا' مگر پیسہ نہیں۔ نہ وہ مالی رکھ سکتے تھے' نہ چوکی دار۔ کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہیں تھا ان کا۔ ان کا اپنا گزارہ مشکل سے ہی ہوتا تھا انہوں نے مشتاق سے بات کی اور مشتاق نے مجھ سے۔ یوں ان کا مسئلہ حل ہوگیا اب وہ خوش ہیں۔''

''تو یہ بنگلہ بک گیا؟''

''ہاں۔ اسی لیے تو خالی ہے اس وقت۔'' مسعود صاحب نے صدر دروازہ کھولا۔

بنگلہ دیکھ کر عبدالحق کی آنکھیں کھل گئیں۔ بات یہ نہیں تھی کہ بنگلہ بڑا تھا۔ اس کی آبائی حویلی اس سے بہت زیادہ بڑی تھی لیکن اس بنگلے کی آرائش قابلِ دید تھی۔ ڈرائنگ روم کو ملا کر وہاں آٹھ کمرے تھے۔ ڈرائنگ روم کے علاوہ ایک اسٹڈی تھی۔ چھ بیڈروم تھے' جن میں سے ہر ایک کا اپنا باتھ روم تھا۔ بہت بڑا کچن تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ فرنیچر بہت اعلیٰ تھا۔ ایسا فرنیچر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک دروازہ پچھواڑے کی طرف کھلتا تھا۔ مسعود صاحب نے دروازہ کھولا۔ "یہ سرونٹ کوارٹر ہیں۔" انہوں نے بتایا۔ "دیکھو گے؟"

"نہیں۔"

"کیسا لگا تمہیں؟"

"میں حیران ہوں۔ کوئی ہندو کیسے......"

"غلط سمجھ رہے ہو تم۔" مسعود صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ ایک بڑے انگریز افسر کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ ہمارے ہاں کون ایسا بنگلہ بنواتا اور کون ایسی آرائش کرتا۔"

"اوہ۔"

"کہیں بیٹھنا چاہو گے کچھ دیر۔"

عبدالحق کو اسٹڈی بہت پسند آئی تھی...... کشادہ' روشن اور ہوادار۔ وہ مسعود صاحب کے ساتھ وہاں چلا آیا۔ وہاں ایک بڑی میز اور اس کے ساتھ آرام دہ کرسی بھی تھی۔ میز کے ساتھ ریک لگے تھے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ چھ کرسیاں تھیں۔ پہلو والی دیوار کے ساتھ ایک بڑا دیوان تھا۔ دو دیواروں پر شیلف تھے۔ ایک طرف ایک بڑی راکنگ چیئر تھی لیکن وہ کمرا بہت خالی خالی لگ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں فرنیچر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کتابوں سے محروم خالی شیلف اجڑے اجڑے اور سوگوار لگ رہے تھے۔ یہی حال میز کا اور اس کے ساتھ لگے ریکس کا تھا۔

عبدالحق جانتا تھا کہ لاہور میں قیام کے لیے اتنے بڑے بنگلے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ کمرا اسے بہت پسند آیا تھا۔ اس نے سوچا' اگر میں یہ بنگلا لیتا تو اس کمرے کو اپنا عبادت اور مطالعے کا کمرا بناتا۔ وہاں بڑا سکون تھا۔

"تو یہ چوکی دار......؟"

"میں نے ہی رکھا ہے۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "کیمپ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ صادق اپنی فیملی کو بھی لے آیا تھا۔ وہ لوگ یہاں زیادہ بہتر رہیں گے۔ انہیں روزگار بھی مل گیا اور سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی۔ مالی کے لیے میں نے بات کر لی ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں لان کی صورت نکل آئے گی۔"

"اب چلیں؟" عبدالحق نے کہا۔

وہ باہر نکلے۔ ڈرائیور گاڑی پورچ میں لے آیا تھا۔ اس نے ان کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

اس بار گاڑی مسعود صاحب کی کوٹھی کے باہر رکی۔ "یہاں چائے پئیں گے۔ اور کچھ کام کی باتیں بھی ہو جائیں گی۔" انہوں نے وضاحت کی۔

اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر مسعود صاحب اندر چلے گئے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ وہ فائل انہوں نے اس کی طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے سر؟"

"تمہارے بنگلے کے کاغذات۔"

"میرا بنگلہ؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا' اور فائل کھولی۔ سب سے اوپر سیل ایگریمنٹ تھا۔ اس کی رُو سے محمد مبین صاحب نے وہ بنگلہ عبدالحق کے ہاتھوں بیس ہزار روپے میں فروخت کیا تھا۔ نیچے بیس ہزار روپے کی وصولی کی رسید بھی تھی' اور اس کے نیچے بنگلے کے کاغذات تھے۔

"یہ آپ نے......"

"مبین صاحب بے تاب ہو رہے تھے۔ میں یہ قدم نہ اٹھاتا تو بنگلہ ہاتھ سے نکل جاتا۔" مسعود صاحب نے جلدی سے وضاحت کی۔ "اور نقصان مبین صاحب کا بھی ہوتا' جو مجھے گوارا نہیں تھا۔ وہ تو اسے ہاتھی قرار دیتے تھے' جسے پالنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ اونے پونے اسے کسی کو بھی بیچ دیتے۔ میری آفر سن کر ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔" وہ کہتے کہتے رکے۔ "اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں نے بنگلہ مہنگا خریدا ہے تو تم اس میں حق بہ جانب ہو۔"

"نہیں سر' یہ بات نہیں......"

"اور ایک بات کہوں۔ تم اسے میری طرف سے تحفہ بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"آپ کا شکریہ سر' لیکن یہ بنگلہ میری ضرورت کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔ میرے نزدیک یہ اسراف ہے۔"

مسعود صاحب نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ "تمہاری آبائی حویلی سے تو یہ بہت چھوٹا ہوگا۔"

عبدالحق کی آنکھوں میں اپنی حویلی کا نقشہ پھر گیا۔ اس نے بے بسی سے سر کو اثباتی جنبش دی۔

"اور تمہارے خاندان میں کتنے افراد ہیں۔"

میری پیدائش سے پہلے صرف دو تھے...... اور میری پیدائش کے بعد تین عبدالحق نے دل میں سوچا۔

مسعود صاحب نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی۔ "تو کیا تمہاری حویلی سنسان رہتی تھی؟ رونق نہیں ہوتی تھی۔"

عبدالحق کو حویلی کی رونقیں یاد آ گئیں۔ "نہیں سر۔"

"ایک بات بتاؤں' دسترخوان کو جتنا بڑھاؤ گے' رزق اتنا ہی بڑھے گا۔ جتنے لوگ تمہار دسترخوان سے فیض یاب ہوں گے' اتنی ہی نعمتیں بڑھیں گی۔ اور عبدالحق' معیشت بھی دسترخوان طرح ہوتی ہے۔ جتنے لوگوں کا روزگار تم سے وابستہ ہوگا' اتنی ہی تمہاری معیشت مستحکم ہوگی۔ چ دار' مالی' گھر میں کام کرنے والے ملازمین' پھر ڈرائیور۔ جب وہ بنگلہ تم آباد کرو گے تو یقین کر تمہیں اتنا بڑا نہیں لگے گا۔ بلکہ ممکن ہے' چھوٹا لگنے لگے۔"

"لیکن سر میں اپنی ذات پر اتنا خرچ نہیں کرنا چاہتا۔"

"ہے تو خرچ کرو' خود پر بھی اور دوسروں پر بھی۔ اللہ کی عطا سے منہ موڑنا اچھا نہیں ہوتا۔ یہ سوچو کہ اس بنگلے کی وجہ سے کتنے بے گھروں کو گھر ملے گا۔ اور کتنے بے روزگاروں کو روزگار میسر آئے گا۔ بس آدمی کے دل میں خوف خدا ہو' اور وہ خود غرض اور عیش پسند نہ ہو تو سب ٹھیک ہے۔ اللہ تو نیت کا حال جانتا ہے نا۔"

"آپ نے مجھے قائل کر لیا سر۔" عبدالحق نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "لیکن آخری فیصلہ اماں کریں گی۔"

"اگر وہ کوئی چھوٹا مکان چاہیں گی تو وہ بھی مل جائے گا۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "اس صورت میں یہ بنگلہ تمہارے لیے بہت اچھا سرمایہ کاری ثابت ہوگا۔ چند ہی برس میں اس کی قیمت کہیں کی کہیں پہنچ جائے گی۔"

"ایک بات بتائیں سر۔ آپ نے یہ بنگلہ اپنے لیے کیوں نہیں خرید لیا؟"

"میرے پاس سب کچھ تو ہے۔ اپنے آبائی مکان سے مجھے محبت ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو سرمایہ کاری سمجھ کر خرید لیتے۔"

"میں سرکاری افسر ہوں۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کاروبار نہیں کرنا چاہتا۔ اسے بددیانتی سمجھتا ہوں۔"

"تو میرے لیے......"

"تم ابھی سرکاری ملازم نہیں ہو۔" مسعود صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اور لاہور میں قیام کرو گے تو گھر بھی تو چاہیے ہوگا تمہیں۔ اور پھر میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں نے صرف تمہارا فائدہ نہیں سوچا۔ بلکہ مبین صاحب کے فائدے کی بھی فکر کی ہے۔ ان کے لیے یہ بنگلا

مصیبت بن گیا تھا۔ وہ تو اسے پانچ ہزار میں بیچ دیتے۔ جو کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ اب انہیں گھر بھی مل گیا اور کاروبار کے لیے بھی معقول رقم مل گئی وہ دعائیں دیں گے ہمیں۔ اور زیادتی تمہارے ساتھ بھی نہیں ہوئی۔ بیس ہزار میں یہ بنگلہ مہنگا نہیں۔"

"تو یہ بنگلا وہ خالی کب کریں گے؟"

"وہ تو کر چکے۔ قبضہ بھی ہمیں دے چکے۔"

عبدالحق کا منہ کھل گیا۔ "اور یہ سامان...... فرنیچر......؟"

"انہیں بنگلہ جس حال میں ملا تھا' اسی حال میں ہم نے ان سے لیا ہے۔"

"تب تو یہ زیادتی ہی ہوئی سر۔ میرے خیال میں بیس ہزار سے زیادہ کا تو سامان ہے بنگلے میں۔"

"اور سوچو' وہ پانچ ہزار میں بنگلا سامان سمیت بیچنے کے لیے تیار تھے۔"

"مجھے مبین صاحب کا پتا ضرور دیجئے گا سر۔ کسی وقت خدانخواستہ وہ پریشان ہوئے تو ان کا حق ہوگا ہم پر۔"

"تم بہت اچھے انسان ہو بیٹے۔ یقین کرو' یہ بات میں نے بھی نہیں سوچی تھی۔"

"اور سر' آپ کی رقم میں واپس آنے کے بعد ہی دے سکوں گا۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے میرا تحفہ سمجھ لو۔"

"اس کے باوجود بھی میرے لیے آپ کا تحفہ ہی ہے۔"

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔"

"ابھی لاہور میں دو دن اور رکوں گا۔ کچھ خریداری کرنی ہے۔ گھر خالی ہاتھ تو نہیں جاؤں گا۔"

"اچھا...... اب چلیں۔"

وہ پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مسعود صاحب نے ڈرائیور کو کچھ ہدایات دیں' پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "اب تمہیں خریداری کرنی ہے' تو روانگی تک کیمپ میں قیام تو تمہارے لیے مناسب نہیں ہوگا۔"

"جی سر کسی ہوٹل میں کمرا لے لو کروں گا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے...... اپنا گھر ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہرنا' مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

عبدالحق جھجکا۔ "اسٹیشن کے پاس گھر لوں گا سر تو روانگی میں آسانی ہوگی۔"

"ارے اس کی کیوں فکر کرتے ہو۔ گاڑی ہے نا اپنے پاس۔"

عبدالحق لاجواب ہو گیا۔ اب وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

گاڑی ایک بینک کے سامنے رکی۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ مسعود صاحب نے اتر تے ہوئے کہا۔

وہ بینک میں گئے۔ مسعود صاحب نے پانچ ہزار روپے نکلوائے اور عبدالحق کی طرف بڑھا دیے۔ ”یہ کیا سر؟“

”گھر کے لیے خریداری کرنی ہے۔ واپس آؤ گے تو مجھے دے دینا۔“

عبدالحق انکار کرنے والا تھا لیکن اس کی نگاہوں میں زرینہ کی صورت پھر گئی۔ کیوں نہ وہ اس کی شادی کو ذہن میں رکھ کر خریداری کرے۔ آخر وہ اس کی بہن ہے۔ اور پھر نور بانو...... اب اس کی شادی بھی تو اسی کو کرنا ہوگی۔ اور ویسے بھی انکار کرنے میں مسعود صاحب کے خلوص کی توہین ہوتی۔ اس نے رقم لے لی۔

”مجھے کیمپ اتار کر تم صاحب کے ساتھ چلے جاؤ۔ اور ان کے ساتھ ہی رہنا۔“ مسعود صاحب نے ڈرائیور سے کہا۔

❁ ❁ ❁

خریداری مکمل ہوتے ہوتے شام ہوگی۔ عبدالحق نے زیورات اور کپڑوں پر زیادہ زور دیا تھا۔ دو سوٹ کیس بھی خرید لیے تھے۔ ان میں ایک نور بانو کا تھا اور دوسرا زرینہ کا۔

یہ کام مکمل ہونے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ لاہور سے رخصت ہو رہا ہے۔ لاہور میں اس نے زندگی کے کئی روپ دیکھے تھے۔ ایک طرح سے یہ شہر اس کے لیے درس گاہ ثابت ہوا تھا۔

اسے افضال صاحب کا خیال آیا اور وہ اداس ہو گیا۔ اسے یاد آیا' اس نے افضال صاحب کے ساتھ ایک پورا دن گزارا تھا...... بھرپور دن! اور اس دن کے بعد افضال صاحب کی زندگی بدل گئی تھی۔ وہ افضال صاحب ہی نہیں رہے' اور اب وہ دماغی امراض کے اسپتال میں تھے۔

اس نے سوچا' آج وہ لاہور کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرے گا۔

اسٹیشن جا کر اس نے اپنے لیے اگلے روز کی سیٹ بک کرائی۔ پھر اس نے ڈرائیور سے کہا وہ سامان لے کر گھر چلا جائے۔ اسے چند ضروری کام ہیں۔ وہ خود ہی گھر پہنچ جائے گا۔

”لیکن صاحب نے کہا تھا......“ ڈرائیور نے احتجاج کیا

”...... کہ تمہیں میرے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔“ عبدالحق نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ڈرائیور نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔ بات ماننے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

گاڑی کے جانے کے بعد عبدالحق نے گہری سانس لی۔ اب وہ آزاد تھا۔ یہ وقت وہ اس طرح گزارنا چاہتا تھا' جیسے ایک دن افضال صاحب کے ساتھ گزارا تھا۔ اس دن کی طرح' جب اسے بہن مل گئی تھی۔

وہ چل دیا۔ اس کے سامنے نہ کوئی سمت تھی نہ مقصد۔ اس نے اپنے قدموں کو آزاد چھوڑ دیا۔ اور اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ افضال صاحب اس کے ساتھ موجود ہیں...... بلکہ اس کی رہ نمائی کر رہے ہیں۔

❁ ❁ ❁

نادرہ دوپہر کو سو کر اٹھی تو ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ نہا دھو کر اس نے نماز پڑھی اور قرآن کی تلاوت کرنے بیٹھ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ننھی ارجمند اس کے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ پھر جیسے اس کی برداشت جواب دے گئی۔ ”پھپھو...... پھپھو...... مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ قریب آ کر روتی آواز میں بولی نادرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”تو تمہیں نہیں پتا کہ بھوک لگے تو کیا کرتے ہیں۔“

”پتا ہے لیکن میں آپ کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گی۔“

”اچھے بچے ضد نہیں کرتے میری شہزادی۔“

”بس یہی ایک وقت تو آپ ملتی ہیں مجھے۔“ ارجمند کے لہجے میں شکایت تھی۔ ”رات آپ کے کمرے کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ اور صبح ناشتہ کے وقت آپ سو رہی ہوتی ہیں۔ اور پھپھو' مجھے رات کو اکیلے سوتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔“

نادرہ کو اس پر پیار آ گیا۔ چھ سال کی بچی' جو ہمیشہ ماں باپ کے درمیان سوتی رہی۔ اسے ڈر تو لگے گا ہی۔ اور اسے سمجھایا کیسے جا سکتا ہے۔ وہ خوش قسمت تھی کہ اس نے اپنے والدین' دادا دادی اور چچاؤں کو سکھوں کے ہاتھوں شہید ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اور اس نے ظالموں کے ہاتھوں اپنی پھپھو کی پامالی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے لیے افیون کی ایک چٹکی نعمت بن گئی تھی' جو اس کی دادی نے بھوک سے بلکتے دیکھ کر اسے دے دی تھی۔ نادرہ کو یاد تھا' اماں نے کہا تھا...... اسے ہوش آئے گا تو ان شاء اللہ پاکستان میں ہوگی' اور کھانا بھی مل جائے گا۔ اماں کو تو خود بھی نہیں معلوم ہوگا کہ وہ اسے بھوک سے نہیں' بے شمار بڑی بڑی بلاؤں سے بچا رہی ہے۔ سو جس وقت اس کے خاندان پر قیامت ٹوٹی' وہ افیون کے زیر اثر بے خبر سو رہی تھی...... اور سوتی رہی۔

”کیا سوچ رہی ہیں پھپھو' مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“

ارجمند نے اسے چونکا دیا۔ ”تم بوا سے کھانا لگانے کا کہو۔ میں بھی آتی ہوں۔“

نادرہ نے قرآن پاک طاق پر رکھا۔ واپس آئی تو ارجمند دستر خوان پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

مگر اس روز نوالے نادرہ کے حلق میں پھنس رہے تھے۔ کھانے کی رغبت تو پاکستان آنے کے بعد اسے رہی ہی نہیں تھی۔ وہ تو بس جینے کے لیے کھاتی تھی۔ ذائقے سے بھی غرض نہیں تھی' جو

کچھ بھی ہوا اور جیسا بھی ہو' چاہے نمک تیز ہو' وہ کھا لیتی تھی۔ مگر جب پرانے زخم ہرے ہوتے تو نوالہ حلق سے اترتا ہی نہیں تھا۔

اس وقت بھی کھانے کے بجائے وہ ان زہریلی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سب لوگ ختم کر دیے گئے۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ قیامت ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ قیامت تو ابھی اس پر گزرنی ہے۔ وہ جس کا آنچل بھی کبھی سر سے نہیں ڈھلکتا تھا' لباس اس کے جسم سے نوچ کر علیحدہ کر دیا گیا۔ پھر تسلسل کے ساتھ اس پر قیامت گزرتی رہی۔ وہ کتنے تھے' یہ بھی اسے یاد نہیں رہا۔ بس وہ تو دل ہی دل میں مرنے کی دعا کرتی رہی...... اور پھر شاید مر بھی گئی۔ کیونکہ اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ مگر ہوش کھونے سے پہلے آخری یاد یہی تھی کہ گدھ اسے نوچ رہے تھے۔ بھنبھوڑ رہے تھے۔

''آپ تو کھا ہی نہیں رہی ہیں پھپھو۔'' ارجمند نے اسے ٹوک دیا۔

نادرہ پھر چونکی۔ نوالہ نہ جانے کب سے اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''کھا تو رہی ہوں۔'' اس نے نوالہ منہ میں لے جاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو بہت بھوک لگتی ہے پھپھو۔'' ارجمند نے کہا۔

''لگنی بھی چاہیے۔ کھاؤ گی نہیں تو بڑی کیسے ہو گی۔''

''تو آپ کیوں نہیں کھاتیں۔''

''میں تو بڑی ہو چکی ہوں ناگڑیا۔ اب اور بڑی تو نہیں ہو سکتی۔''

کھانا زہر مار کر کے وہ ارجمند سے باتیں کرتی رہی۔ ارجمند بہت باتونی تھی۔ ''کہانی سنائیں نا پھپھو۔''

''کہانی تو رات کو سناتے ہیں گڑیا۔''

''رات کو تو آپ مجھے ملتی ہی نہیں۔'' ارجمند نے کہا۔ پھر بولی۔ ''مجھے اکیلے سونا اچھا نہیں لگتا۔ بہت ڈر لگتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ سونا چاہتی ہوں پھپھو۔''

''سوری گڑیا' یہ ممکن نہیں۔ اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔''

''کیسے پھپھو۔''

''اکیلے سوؤ گی تو ہر ڈر نکل جائے گا۔ تم بہادر ہو جاؤ گی۔''

''گھر میں تو میں امی اور بابا جان کے ساتھ سوتی تھی۔'' ارجمند نے اعتراض کیا۔

''اس وقت تم چھوٹی تھیں۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔''

''اتنے سے دن میں میں بڑی ہو گئی؟'' اور ایک اور اعتراض......

''کبھی کبھی تو بچے ایک دن میں بھی بڑے ہو جاتے ہیں لیکن تم نہیں سمجھو گی … ت۔ ابھی

اتنی بڑی نہیں ہو۔''

ارجمند کچھ دیر خاموش ہو کر سوچتی رہی۔ ''چلیں ٹھیک ہے۔ مجھے بہادر بنانے کے لیے آپ رات کو اکیلے سلاتی ہیں۔ تو پھر کہانی مجھے دن میں سنایا کریں۔ میرا کہانی سننے کو دل بہت چاہتا ہے۔''

اب تو ایک ہی کہانی یاد رہ گئی ہے۔ نادرہ نے دل میں سوچا۔ اور وہ سنا دی تو تمہارا دل پھٹ جائے گا گڑیا۔ ''دن میں کہانی سناؤں تو تمہارے ماموں راستہ بھول جائیں گے۔'' اس نے کہا۔

''مگر میرے ماموں تو سب لوگوں کے ساتھ اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ اللہ میاں کے پاس جا کر تو کوئی راستہ نہیں بھولتا ہو گا۔''

کبھی کبھی ارجمند کے سوالوں کا جواب دینا نادرہ کے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ مگر اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ نیلم بائی نے دروازے سے جھانکا۔ ''چلو ارجی...... تمہارے استاد جی آگئے ہیں۔''

''میں ارجی نہیں ہوں۔ میرا نام ارجمند ہے۔'' ارجمند نے بڑے وقار سے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

❀ ❀ ❀

نیلم بائی کی پوری زندگی کوٹھے پر گزری تھی۔ مگر اس نے اپنی زندگی میں نادرہ جیسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ کوٹھے پر آنے والی ہر نئی لڑکی اپنی بساط کے مطابق زبردست مزاحمت کرتی ہے۔ اس مزاحمت کو توڑنا ایک فن ہے' جس میں ہر نائیکہ طاق ہوتی ہے۔ اس مزاحمت کو توڑنے کا اپنا ایک لطف ہوتا ہے۔ مزاحمت جتنی شدید ہو' اسے توڑنے میں نائیکہ کو اتنی ہی لذت ملتی ہے۔

کوٹھا بھی ایک طرح سے صدیوں سے قائم ایک ادارہ ہے۔ ہر نائیکہ ابتدا میں ایک مزاحمت کرنے والی لڑکی ہوتی ہے۔ اور مزاحمت ٹوٹنے کے بعد طوائف بننے والی ہر لڑکی کو مستقبل میں نائیکہ بننا ہوتا ہے۔ اور طوائف کے پاس اپنی مزاحمت توڑنے والی نائیکہ کا دیا ہوا صدیوں کا تجربہ ہوتا ہے۔

لیکن نادرہ ابتدا ہی سے مختلف تھی۔ اسے شیدا نیلم بائی کے پاس لایا تھا۔

پاکستان بنتے ہی شیدے کا دھندا خوب چمکا تھا۔ ہندوستان سے کوئی گاڑی آتی تو شیدا اسٹیشن کا رخ کرتا اور ہر بار کوئی نہ کوئی نگینہ اس گاڑی سے نکال لاتا۔ بعض اوقات تو کئی لڑکیاں لے آتا تھا۔

نیلم کو یاد تھا' نادرہ بہت برے حال میں آئی تھی لیکن نیلم جوہری تھی۔ کتنی ہی کیچڑ لگی ہو' گرد چھپی ہو' ہیرے کو وہ ہر حال میں پہچان لیتی تھی۔ نادرہ کو بچی کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچا کر وہ

واپس آئی اور شیدے کو گن کر سو روپے دیے۔

شیدے نے وہ روپے اس کی طرف پھینک دیئے "یہ کیا پکڑا رہی ہو بائی؟"

"تجھے معلوم ہے کہ مجھ سے زیادہ قیمت دینے والا اس بازار میں کوئی نہیں۔ لڑکی کا حال دیکھو۔"

"میں سب دیکھ بھال چکا ہوں بائی۔ تم جانتی ہو یہ بات۔ دیکھو بائی، یہ تمہارے لیے زندگی بھر کی کمائی ہے۔ زندگی رہی تو چالیس سال ان کی کمائی کھاؤ گی۔ سونا ہے سونا۔"

"چالیس سال!" نیلم نے آنکھیں نکالیں۔ "اب تُو دن میں بھی چڑھانے لگا ہے۔ چالیس سال کوئی چلی ہے آج تک۔"

"بنومت بائی۔ میں تمہارے پاس صرف حال نہیں لایا، مستقبل بھی لایا ہوں۔ شراب کی بند بوتل ہے۔ بارہ سال بعد کھلے گی تو لوگ کھنچے چلے آئیں گے اس کی خوشبو پر۔ بیس سال بڑی والے کے ہیں۔ تو اس سے زیادہ اچھے بیس سال چھوٹی کے ہوں گے۔ تم جانتی ہو یہ بات۔"

"اچھا چل، پچاس اور لے لے۔"

"تم پیسے اپنے پاس رکھو اور ان دونوں کو لے آؤ میں کوئی اور گھر دیکھتا ہوں۔"

اور شیدا دو سو روپے لے کر ہی ٹلا۔

نادرہ نیلم کے لیے حیران کن ثابت ہوئی۔ اس نے تو نام کو بھی مزاحمت نہیں کی۔ کوٹھے کی حقیقت کو اس نے ایسے قبول کر لیا، جیسے پہلے سے اس کے لیے تیار بیٹھی ہو۔ ورنہ ابتدا میں تو لڑکیاں بہت ستاتی ہیں۔

پہلے تو نیلم کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کبھی اس طرح کی لڑکیاں بھی آجاتی ہیں۔ کوئی کہے کہ یہ بہت بے رحمانہ بات ہے، بہت بڑی زیادتی ہے، لیکن بازار میں عمر گزارنے والی نیلم جانتی تھی کہ پیدائشی طور پر تو کوئی لڑکی طوائف نہیں ہوتی لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنسی بے راہ روی میں مبتلا لوگ بعض اوقات چھوٹی بچیوں تک کو لتوں میں لگا دیتے ہیں۔ پھر ان بے چاریوں کے لیے زندگی میں اور کچھ نہیں رہتا وہ کوٹھوں پر ایسے آتی ہیں، جیسے ریت پر پھڑکتی ہوئی مچھلی کو کوئی اٹھا کر پانی میں پھینک دے۔ اور وہ یہ بات اس لیے سمجھتی تھی کہ وہ خود بھی ایسی ہی تھی۔

بہ ظاہر تو نادرہ ایسی لگتی تھی، لیکن کبھی نیلم کو شبہ ہوتا تھا کہ نادرہ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ وہ کم بولتی تھی، اور بہت شائستہ طبیعت کی تھی۔ گفتگو سے پڑھی لکھی لگتی تھی، اور یہ بھی طے تھا کہ وہ کسی اچھے گھر کی ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بے راہ روی تو اچھے گھروں میں بھی راہ بنا لیتی ہے لیکن نادرہ کے رویے میں کہیں گہرائی میں ایک دبا دبا اکراہ تھا، جو اوپر بہرحال نظر نہیں آیا تھا۔

اور جب نیلم نے نادرہ سے کہا کہ کوٹھے کے لحاظ سے اس کے لیے کوئی اور نام ہونا چاہیے تو

وہ کھل اٹھی تھی۔ "ٹھیک ہے بوا، یہ تو بہت اچھا ہے۔" اس نے کہا تھا۔ "میں تو خود اپنا نام یاد نہیں رکھنا چاہتی۔"

وہ پہلا موقع تھا کہ نیلم کے اندازے کی تصدیق ہوئی۔ نادرہ نے بہت بڑا سمجھوتہ کیا تھا اپنے آپ سے۔ "کوئی نام ہے تمہارے ذہن میں؟" اس نے نادرہ سے کہا۔

نادرہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "نرگس کیسا رہے گا؟" تاہم اس کے لہجے میں اعتماد نہیں تھا۔

نیلم تو پھڑک گئی۔ "بہت شان دار۔ اس نام کے تو لوگ دیوانے ہیں آج کل۔"

یوں نادرہ نرگس بن گئی۔

تین مہینے گزر گئے۔ نیلم کو نرگس سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ وہ اس کی لاڈلی بن گئی۔ دوسری لڑکیاں حسد کرنے لگیں کہ بوا نرگس کی کوئی بات نہیں ٹالتیں۔ وہاں نیلم بائی کے بعد نرگس کا ہی حکم چلتا تھا۔

پھر ایک دن نیلم بائی کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ نرگس نے سمجھوتہ کیا ہے۔ اور وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ سمجھوتہ کیوں کیا ہے۔

اس روز نرگس نے کہا۔ "بوا، میں چاہتی ہوں کہ ارجمند کو تعلیم دلائی جائے۔ آپ اسے اسکول میں داخل کرا دیں۔"

گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی نیلم بائی ایک لمحے میں بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ "دیکھ بٹی، یہاں قریب میں کوئی اچھا سکول ہے بھی نہیں۔ اور ویسے بھی میں بچی کو باہر نکالنا پسند نہیں کرتی۔"

"کیوں بوا؟" نرگس نے بہت دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس بات کی قائل ہوں کہ نئے چاند کو چودھویں رات سے پہلے گھٹاؤں میں چھپا کر رکھنا چاہیے۔ تبھی تو دیکھنے والوں کی آنکھیں چکاچوند ہوں گی۔"

اس نے نرگس کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

نرگس کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا۔ نیلم کے اندازے کی مزید تصدیق ہو گئی۔

"چلو ٹھیک ہے بوا۔ گھر پر تو پڑھایا جا سکتا ہے۔ اسے۔"

نیلم بائی نے سکون کی سانس لی۔ کوٹھے کے ماحول میں تناؤ اسے پسند نہیں تھا۔ تناؤ کاروباری لحاظ سے نقصان دہ ہوتا ہے۔ تماش بین پھولے ہوئے منہ دیکھنے کے لیے تو نہیں آتے انہیں تو ہنستے مسکراتے چہرے اچھے لگتے ہیں، چاہے مسکراہٹ جھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ بات ماننے میں کوئی حرج نہیں۔ ساتھ ہی وہ اچھے ماحول میں اپنی ایک بات منوا سکتی ہے۔

"دیکھو بیٹی ہمارے ہاں تو تعلیم ہی اور دی جاتی ہے۔ ابھی سے رقص اور گانے کی تعلیم دی جائے گی تو بچی بڑی ہوتے ہوتے طاق ہو جائے گی۔ میں نے استاد جی سے بات کر لی ہے ارجمند کے لیے۔ سہ پہر کے وقت وہ آیا کریں گے۔"

نرگس کے چہرے پر پھر رنگ دوڑ گیا۔ شاید سمجھوتے کی کچی ڈور پر دباؤ بڑھ گیا تھا۔ یعنی اب وہ کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتی تھی۔

نیلم بائی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "لیکن نرگس! سچی بات ہے کہ میں تجھے اپنی بیٹی سمجھتی ہوں۔" اس نے لہجے میں محبت سموتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔ "تیری فرماں برداری نے میرا دل جیت لیا ہے۔ تیری بات میں نہیں ٹال سکتی۔ میں ارجمند کے لیے بہت اچھا استاد لگا دوں گی پڑھانے کے لیے۔"

نرگس خوش ہوئی...... "شکریہ بوا۔ اسے قرآن پاک میں خود پڑھاؤں گی۔"

نیلم اپنی ناگواری کو پی گئی۔ آخر نرگس نے بحث مباحثے کے بغیر کوٹھے کی تعلیم قبول کر لی تھی۔

یوں ارجمند کی دونوں طرح کی تعلیم شروع ہو گئی لیکن نیلم نے نرگس کو اور اس کے سمجھوتے کو پوری طرح سمجھ لیا تھا۔ نرگس کا خواب اس پر کھل گیا تھا، وہ ارجمند کو بچانے کے لیے اپنی قربانی دے رہی تھی۔ نیلم نے سمجھ لیا کہ ارجمند ان دونوں کے درمیان وجہ نزاع بن سکتی ہے لیکن ابھی اس میں بہت وقت پڑا ہے۔ اس وقت تک نرگس کو تو نچوڑا جائے۔ الجھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ نیلم بائی جانتی تھی کہ کوٹھے کے ماحول میں کیسا سحر ہوتا ہے۔ کوٹھے پر پلنے بڑھنے والی کچی عمر کی لڑکیاں تو اس سحر سے بچ ہی نہیں سکتیں۔ نرگس کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔ کوئی لڑکی رقص سیکھے گی تو اسے رقص دکھانے کا شوق بھی ہو گا۔ اور جوانی کی سرحد میں قدم رکھنے والی لڑکی کے لیے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر سراہنا کافی نہیں ہوتا۔ وہ مردوں سے تعریف سننے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ نیلم بائی مطمئن تھی۔ مناسب وقت پر چپکے چپکے ارجمند کو پر پُرزے نکالنے میں مدد دے گی۔ نرگس سے الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کسی کو گڑ کھلا کر مارا جا سکتا ہو تو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔

نیلم بائی پلٹی اور اس کمرے کی طرف چل دی، جہاں استاد جی ارجمند کی تربیت کر رہے تھے۔

❁ ❁ ❁

وہ وقت نادرہ کے لیے بہت سخت ہوتا تھا، جب زخم ہرے ہوتے تھے۔ تب وہ پہلے کی طرح مرنے کی آرزو کرتی تھی۔ مرنا اس کے لیے بڑی بات نہیں تھی۔ بلکہ مرنا تو اس کے لیے بہت آسان تھا۔ درحقیقت تو وہ اس دن ٹرین میں ہی مر گئی تھی۔ اس کے بعد مرنا تو اس کے لیے محض ایک رسم تھا لیکن ایک ذمہ داری ایسی آ پڑی کہ موت سے ہزار گنا بدتر زندگی جینا اس کے لیے

ضروری ہو گیا۔

ٹرین کے پاکستان پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے اسے ہوش آیا تھا۔ ڈبے کا منظر دیکھتے ہی اسے اُبکائی آئی لیکن پیٹ میں کچھ تھا ہی نہیں۔ پھر اچانک اسے اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے کپڑے اس قابل نہیں تھے کہ اس کی برہنگی کو مکمل طور پر ڈھانپ سکتے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ یہ تصور بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھا کہ وہ مکمل برہنہ حالت میں پاکستان پہنچے۔ چنانچہ اس نے وہی کپڑے پہن لیے۔ پھر اسے اماں کی چادر نظر آئی۔ خون کے دھبے سوکھ چکے تھے۔ اس نے وہ چادر اوڑھ لی۔

ٹرین کی رفتار کم تھی لیکن وہ چل رہی تھی۔

اسے یاد آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ایک لمحے کو تو اسے لگا کہ اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا لیکن دکھتا ہوا بدن گواہی دے رہا تھا کہ وہ حقیقت تھی۔ پھر ڈبے کی صورت حال دیکھی تو سب کچھ واضح ہو گیا۔ اس لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وجود کی اس ناپاکی کے ساتھ پاکستان کی سرزمین پر قدم نہیں رکھے گی۔ وہ چلتی ٹرین سے کود کر جان دے دے گی۔

یہ سوچ کر وہ دروازے کی طرف چلی۔ اسی لمحے اس کی نظر ارجمند پر پڑی۔ جو بے سدھ ایک طرف پڑی تھی۔ اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ ارے...... یہ ابھی تک سو رہی ہے۔ کہیں امی نے افیون زیادہ تو نہیں دے دی تھی۔ ننھی بچی کے لیے تو ایک چٹکی بھی بہت ہے۔

وہ گھبرا کر ارجمند کی طرف بڑھی۔ سینے کے تموج سے اندازہ ہو گیا کہ وہ زندہ ہے۔ اور اس کی سانسیں بڑی ہموار تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اسے ہلانے لگی۔ "اٹھو گڑیا......" ارجمند کسمسائی، کچھ منمنائی لیکن شاید آنکھیں کھولنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ وہ پھر بے سدھ ہو گئی۔

وہ کچھ دیر ارجمند کا سر اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھی رہی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ ٹرین کی رفتار کم ہو رہی ہے۔ پھر رفتار بتدریج کم ہوتے ہوتے ٹرین ٹھہر گئی۔ اس کے ساتھ ہی باہر آوازیں آنے لگیں۔

وہ خوف زدہ ہو کر دبک گئی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مر جانا چاہتی تھی لیکن ارجمند کو اس طرح چھوڑنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ مشکل اپنی جگہ تھی کہ وہ اس حال میں کسی کا سامنا کیسے کرے گی۔

قریب آتی ہوئی آوازیں ابھریں۔ دروازے سے کچھ لوگ ڈبے میں آئے۔ اس نے اماں کی خون آلودہ چادر اپنے منہ میں ڈال لی اور سانس روک لی۔

"اس ڈبے میں تو کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔" ایک مردانہ آواز ابھری۔

''پھر بھی اندر چل کر دیکھنا تو چاہیے۔''

''او یار' پہلے زندوں کی فکر کرنی ہے ہم نے۔ یہ بے چارے تو ہر فکر سے بے نیاز ہیں۔ انہیں بعد میں دیکھ لیں گے۔''

''ضمیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' تیسری آواز میں تحکم تھا۔

ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ لوگ۔ نادرہ نے دل میں سوچا۔ میں زندہ کب ہوں۔

وہ لوگ نیچے اترے اور دوسرے ڈبے کی طرف بڑھ گئے۔ نادرہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ پھر اس نے سوچا کہ ٹرین سے اترنا تو ہوگا۔ اس نے سوچا کہ پلیٹ فارم پر اترنے کے بجائے دوسری طرف اترے گی۔ کیوں؟ اور اس کے بعد کیا ہوگا' یہ سب کچھ سوچنے کے وہ قابل نہیں تھی۔

اس نے ارجمند کو جگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ تھک ہار کر اس نے اسے گود میں اٹھانے کا فیصلہ کر کیا۔

اس نے ارجمند کو اٹھا لیا۔ پانچ سال کی لاڈلی بھتیجی کو اس نے بارہا گود میں اٹھایا تھا لیکن اس وقت جسم جس طرح نڈھال تھا' اس کی وجہ سے وہ اسے بہت بھاری لگی۔ اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں لیکن ایک احساس اور بھی تھا۔ ارجمند نے جیسے اس کی برہنگی کو اوڑھ ڈھانپ لیا تھا۔ ورنہ تو وہ اماں کی چادر کے باوجود خود کو برہنہ ہی سمجھ رہی تھی۔

اس نے لڑکھڑاتے ہوئے قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔

اسی لمحے دروازے کی آہٹ ابھری اور وہ جوان آدمی اچانک ہی سامنے آ گیا۔ نادرہ کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

جوان آدمی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا' اور وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔ پھر جوان آدمی آگے بڑھا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''ڈریے مت۔ اب آپ اپنے لوگوں کے درمیان ہیں۔'' اس نے بے حد شائستگی سے کہا۔

نادرہ نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی عمر 30، 35 کے درمیان ہوگی۔ وہ بشرٹ اور پینٹ پہنے تھا۔ پیروں میں شوز تھے۔ صورت شکل اور طور طریقے سے بھی شائستہ معلوم ہوتا تھا۔ نادرہ قدرے پُرسکون ہو گئی۔

''مجھے بس اتنا بتا دیں' آپ کا کوئی اپنا بچہ ہے یا نہیں۔''

نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گے۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

''میں سمجھ گیا۔ آپ غم نہ کریں۔ میں موجود ہوں نا۔ آیئے میرے ساتھ۔ لایئے' بچی کو مجھے دے دیں۔''

''آ...... آپ...... آپ کون ہیں؟''

''میں عبدالرشید...... دہلی سے تعلق ہے میرا۔ ہم لوگ پہلے ہی ہجرت کر آئے تھے۔ اب یہاں ہمارا اپنا گھر ہے۔'' وہ کہتے کہتے رکا اور اس نے غور سے نادرہ کو دیکھا۔ ''آپ بھی شاید دہلی کی ہیں۔''

نادرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب ارجمند کو اٹھا کر کھڑے رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھا۔ لگتا تھا' کسی بھی لمحے وہ گر جائے گی۔

رشید نے یہ بات بھانپ لی۔ ''لایئے...... بچی کو مجھے دے دیں۔'' اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

نادرہ نے ارجمند کو اس کی گود میں دے دیا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

نادرہ کو لگا کہ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے...... جیسے اس کی نظریں چادر کے آرپار ہو رہی ہیں۔ ''میرا نام نادرہ ہے۔'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''اور یہ بچی؟''

''میری بھتیجی ہے...... ارجمند۔''

''مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ پر کیا گزری ہے' اور آپ کس حال میں ہیں۔'' رشید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ایسے میں آپ کو لاوارث کی حیثیت سے کسی کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔''

نادرہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ مگر اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ بات کڑوی ہے اور اسے بری بھی لگی ہے لیکن ہے سچی۔ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی اس حال میں اس ایک آدمی کے سامنے آنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ تو وہ بہت سارے لوگوں کا سامنا کیسے کر سکتی ہے۔

''آپ میری بات غور سے سنیں۔'' رشید نے کہا۔ ''ہم پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ دوسری طرف اتریں گے۔ میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ وہاں آپ کو میری بہن کے کپڑے مل جائیں گے۔ راستے میں کوئی پوچھے تو مجھے اپنا رشتہ دار بتایئے گا۔ یوں آپ زیادہ تکلیف دہ پوچھ گچھ سے بچ جائیں گی۔''

''لیکن آپ...... آپ کو تو میں جانتی بھی نہیں۔''

''جانتی تو آپ کسی کو بھی نہیں یہاں۔ میں تو پھر بھی آپ کے شہر کا ہوں۔ اور اس وقت تو آپ کی پہلی ضرورت معقول لباس ہے۔''

لباس نادرہ کی کمزوری بن گیا تھا۔ اس کے حوالے کے بعد وہ انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ بغیر کسی رکاوٹ کے باہر نکلے۔ رشید نے انہیں تانگے پر بٹھایا۔ تانگے کو اس نے سڑک پر

رکوایا۔ نجانے کتنی گلیوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک کچے مکان کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ دروازے پر تالا تھا۔ رشید نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا اور انہیں اندر لے گیا۔

ارجمند اب بھی اس کی گود میں تھی۔

اندر سامنے چھوٹا سا صحن تھا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ رشید انہیں ایک کمرے میں لے گیا۔

نادرہ نے پہلی بار سکون کی سانس لی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک چارپائی پر کچھ کپڑے بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ ان میں مردانہ بھی تھے اور نسوانی بھی۔ چارپائی کے نیچے ٹین کا ایک صندوق تھا۔

رشید نے ارجمند کو دوسری چارپائی پر لٹا دیا۔

نادرہ کے اوسان کچھ بحال ہو گئے تھے۔ وہاں نسوانی کپڑے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا تھا لیکن یہ سوچ کر وہ پریشان ہو رہی تھی کہ دروازے پر تالا کیوں تھا۔ رشید نے تو بتایا تھا کہ اس کے گھر میں اس کی ماں اور بہنیں بھی ہیں۔ اس نے یہ بات اس سے پوچھ بھی لی۔

"وہ لوگ تو اس وقت کیمپ میں ہوں گی۔" رشید نے کہا۔ "آج ٹرین آئی ہے نا۔ کیمپ میں تو قیامت کا سماں ہوگا۔ ہم سب رضا کارانہ طور پر مہاجرین کے سلسلے کام کر رہے ہیں۔ اماں اور بہنیں کیمپ میں لٹ کر آنے والی عورتوں کی دل جوئی کر رہی ہوں گی۔"

نادرہ مطمئن ہو گئی۔

"چارپائی کے نیچے صندوق میں سے آپ اپنے مطلب کے کپڑے نکال لیں۔ اب مجھے کیمپ جانا ہے۔ آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ بھوک لگے تو باورچی خانے میں سب کچھ موجود ہے۔ پکانا آپ کو خود پڑے گا۔ اور آپ آرام کر لیں۔ میں جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

نادرہ نے صندق باہر کھینچ کر اسے کھول دیا تھا۔

رشید جاتے جاتے پلٹا۔ "اور ہاں، آپ گھبرائیے گا نہیں۔ میں باہر سے دروازے پر تالا ڈال کر جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچے۔ آج کل تو لوگ کسی کے گھر میں بے دھڑک گھس جاتے ہیں...... ہندو کا گھر سمجھ کر۔ ہندو عورتوں کی تو خاص طور پر تلاش ہوتی ہے انہیں۔"

نادرہ سہم گئی۔ رشید کے جانے کے بعد اس نے کپڑے بدلے اور ارجمند کے ساتھ لیٹ گئی۔ نیند اور بھوک دونوں سے برا حال تھا اس کا، اٹھ کر کچھ پکانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے سونے کو ترجیح دی۔

لیکن نیند کے باوجود سونا آسان نہیں تھا۔ وہ جیسے چارپائی پر نہیں ٹرین پر تھی۔ جسم کو بار بار جھٹکے لگتے، اور پھر آنکھوں کے سامنے وہ قیامت کے منظر سامنے آ جاتے۔ بار بار وہ اٹھ بیٹھتی۔

پھر ارجمند جاگی اور اس نے سب سے پہلے کھانا مانگا۔ تب اسے افسوس ہوا کہ اس نے کچھ پکا کیوں نہیں لیا۔ وہ ارجمند کو لے کر باورچی خانے میں گئی۔ دال چاول موجود تھے۔ کھچڑی پکنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اس نے لکڑیاں جلائیں اور کھچڑی چڑھا دی۔

ارجمند کے پاس سوالات ہی سوالات تھے۔ نادرہ نے بہلانے کی بجائے اسے حقیقت بتا دی کہ سب لوگ اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں، اور اب وہ پاکستان میں ہیں، اور خوش قسمتی سے اللہ نے انہیں یہ ٹھکانہ دے دیا ہے۔

کھانا کھا کر وہ دونوں پھر چارپائی پر لیٹ گئیں۔

شام ہوئی، پھر اندھیرا ہو گیا۔ نادرہ نے لالٹین جلائی۔ ارجمند چپکے چپکے روئے جا رہی تھی۔ نادرہ جانتی تھی کہ چھوٹی بچی ہے۔ حقیقت کو ایک دم قبول نہیں کر سکتی۔ قسطوں میں قبول کرے گی۔ ایک ایک کو یاد کر کے بار بار رویا کرے گی۔

ارجمند کو پھر بھوک لگی۔ کھچڑی بچی ہوئی تھی۔ نادرہ نے وہ اسے کھلا دی۔ دیر تک وہ دونوں بیٹھی رہیں۔ پھر ارجمند سو گئی۔ اسے دیکھ کر نادرہ کو رونا آنے لگا۔ نرم بستر پر سونے کی عادی بچی کھری چارپائی پر بھی کیسے بے سدھ سو رہی ہے۔ شاید افیون کے اثرات ابھی باقی تھے۔

ارجمند کے سونے کے بعد نادرہ کے پاس سوچنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اور وہ اذیتوں کو دہرانا، ان سے دوبارہ گزرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ مثبت انداز میں سوچے، اور ایسا سوچنے کے لیے اس کے پاس مثبت مواد بھی موجود تھا۔ جو ہو چکا تھا، اس کا تو کچھ کیا نہیں جا سکتا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ پاکستان میں تھی...... پاکستان...... برصغیر میں مسلمانوں کا اپنا وطن، جہاں آبروؤں کے لٹیرے ہندو اور سکھ موجود نہیں تھے۔

نجانے کب تک وہ پاکستان کی عظمت کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز سے چونکی۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا۔ پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا ہیولہ اسے کمرے کے دروازے میں نظر آیا۔

"بچی سو گئی ہے؟" کسی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ آواز رشید کی تو نہیں لگتی تھی۔ "کک...... کون......؟" ڈر کے مارے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"ارے میں ہوں شیدا...... اور کون۔"

وہ اور ڈر گئی۔ "کون شیدا؟"

"ارے بھئی ...... عبدالرشید ...... رشید ...... شیدا۔ چلو ...... ادھر دوسرے کمرے میں دیکھو میں کیا لایا ہوں تمہارے لیے۔"

وہ اٹھی اور کمرے سے نکلی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ کمرا اس نے دیکھا نہیں تھا۔ وہاں جو چار پائی تھی' اس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ لالٹین بھی روشن تھی۔ "کہاں ہیں آپ؟"

"آؤ ...... یہاں آجاؤ۔" رشید نے کہا۔ وہ بستر پر بیٹھا تھا۔ "دیکھو ...... میں تمہارے لیے کباب لایا ہوں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"تو رکھو لو۔ بھوک لگے تو کھا لینا۔"

وہ کاغذ کی تھیلی تھی' جو نم بھی ہو رہی تھی اور گرم بھی۔ نادرہ اسے لے کر جانے لگی تو رشید نے کہا۔ "یہ رکھ کر آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

نادرہ نے کباب باورچی خانے میں رکھے' اور کمرے میں واپس آئی۔ مگر اسے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ چار پائی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ "آپ کے گھر والے نہیں آئے ...... آپ کی اماں ......"

"ان سے لڑائی ہوگئی میری ...... تمہاری وجہ سے۔"

"میری وجہ سے؟"

رشید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ "ہاں ...... میں نے تمہارے بارے میں انہیں بتایا تھا۔ اس پر وہ بہت ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں کہ لوگ باتیں بنائیں گے۔ محلے میں عزت خراب ہوگی۔ میں نے کہہ دیا کہ میں تم سے شادی کرلوں گا۔ یہ انہیں برا لگا ......"

"ش ش شادی ...... شادی۔"

"ہاں۔ اور کیسے جیو گی یہاں۔ دیکھو جو کچھ تمہارے ساتھ ہو چکا ہے' اس کے بعد ......"

"میں جانتی ہوں یہ بات لیکن ......"

"میں تمہیں عزت بھی دوں گا اور گھر بھی۔ تم غم نہ کرو۔" وہ اسے لپٹانے لگا۔

"آپ کے منہ سے بو آرہی ہے۔ آپ نے شراب پی ہے۔" نادرہ نے اسے دھکیلنے کی کوشش کی۔

"تو اس جھگڑے کے بعد اور کیا کرتا۔" رشید نے کہا۔ اس کی دست درازی بڑھنے لگی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔" نادرہ نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔

"فکر نہ کرو کل میں تمہیں خالہ کے گھر لے چلوں گا۔ کل ہی ہم شادی کرلیں گے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"شادی پر تو نادرہ کو اعتراض نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے لیے تو یہ احسان ہی ہوتا لیکن اس کی

دست درازی پر اسے ضرور اعتراض تھا۔ "وہ تو ٹھیک ہے لیکن شادی سے پہلے یہ اچھا نہیں۔"

"مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ تم بہت خوبصورت ہو ......"

"لیکن شادی سے پہلے ......"

"چھوڑو اس بات کو۔ تم کون سی کنواری کنیا ہو۔"

طعنہ سن کر نادرہ کی مزاحمت میں شدت آگئی لیکن رشید نے اسے بے بس کر دیا۔ "خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ یہ گناہ ہے۔"

رشید ایک دم سے بپھر گیا۔ اس کا لب ولہجہ اور انداز ہی بدل گیا۔ "وہاں سے کس حال میں آئی تھی سالی گشتی۔ میں نے دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے اور سب سے چھپا کر یہاں لے آیا کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ اور تو مجھے گناہ اور ثواب سکھاتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پوری قوت سے نادرہ کے رخسار پر تھپڑ مارا۔ انگلیوں کے نشانات اس کے رخسار پر جیسے چھپ گئے۔

ایک لمحے کو نادرہ پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔ اس عالم میں بھی اس نے سوچا کہ رشید کی بات تو درست تھی۔ اگر وہ اس حال میں سب کے سامنے جاتی تو کتنی رسوائی ہوتی۔ مر جانے کا مقام ہوتا۔ یہ تو واقعی اس نے احسان کیا تھا اس پر۔ لیکن ایک بات اور بھی اس کی سمجھ میں آگئی۔ رشید وہ ہرگز نہیں تھا' جو اس نے ریل کے ڈبے میں خود کو ظاہر کیا تھا۔ کہاں وہ شائستگی اور کہاں یہ گالیاں۔ آپ سے تم' اور اس کے بعد تو تک آنے میں اس نے دیر نہیں لگائی تھی۔ اور یہ جو غصے اور اشتعال میں نظر آیا تھا' یہی اس کا اصلی روپ تھا۔

"وہاں جو میرے ساتھ ہوا' میں تو اس کے بعد زندہ ہی نہیں رہنا چاہتی تھی۔" اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"مگر میں تلافی تو کر رہا ہوں۔ شادی کا وعدہ تو کر رہا ہوں تم سے۔ کل ہماری شادی ہو جائے گی۔"

"تو آپ ایک دن صبر کرلیں۔ آج جو گناہ ہوگا' کل وہ گناہ نہیں ہوگا۔"

"تمہیں اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو کچھ وہاں ہوا' اس کے بعد تمہارے لیے سب برابر ہے۔"

اس لمحے نادرہ کا دل چھلنی ہوگیا۔ "وہاں جو کچھ ہوا' وہ ظلم تھا ...... زبردستی تھی۔ میں گناہ گار نہیں' مظلوم ہوں۔ آپ اس فرق کو کیوں نہیں سمجھتے۔" اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

"میری بات سن نادرہ۔ عورت کی عزت شیشے کی طرح ہوتی ہے۔ اور شیشے پر بال بھی آجائے تو وہ بے قیمت ہو جاتا ہے۔ تیرا شیشہ تو چور ہو چکا ہے۔ اب تو یہ ٹوٹنے سے رہا۔ اس لیے کہتا ہوں' کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

''آپ مجھ سے شادی کریں گے! زندگی بھر یہی طعنے دیتے رہیں گے۔ اگر میری جگہ آپ کی بہن ہوتی تو کیا کرتے۔''

اس بار تھپڑ اتنا زور کا تھا کہ نادرہ کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون نکل آیا۔ ''اب میں تجھے سبق سکھاؤں گا گشتی۔ یہ کہہ کر رشید اس پر ٹوٹ پڑا۔ ریل کے ڈبے میں نادرہ پر جو جسمانی قیامت گزری تھی' اس کے سامنے یہ اذیت بے حیثیت تھی لیکن یہاں جو اذیت اس کی روح نے سہی' ریل کے ڈبے میں ان گنت غیر مسلموں کے ہاتھوں پامال ہوتے ہوئے وہ اس پر بالکل نہیں گزری تھی۔ وہاں تو ظالم تھے...... غیر مسلم اور وہ سرزمین ہی کافروں کی تھی۔ مگر پاکستان آ کر اسے تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا' اس پاک سرزمین پر دیر سے سہی' لیکن اس کے سارے زخم بھر جائیں گے۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں بھی لوٹ لی جائے گی...... اور لوٹنے والا کوئی مسلمان ہوگا...... وہ مسلمان جو پناہ دینے کا کہہ کر اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔

رشید اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ وہ کپڑے پہن کر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ وہ واپس آ گیا ''میں دروازے پر تالا ڈال آیا ہوں باہر جانے کا خیال دل میں نہیں لانا۔ ویسے باہر مجھ سے بھی زیادہ لوگ ملیں گے۔'' اس نے کہا۔ پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم جا کہاں رہی ہو؟''

''دوسرے کمرے میں...... اپنی بھتیجی کے پاس۔'' نادرہ نے بکھرتی آواز میں کہا۔

''تم یہیں سوؤ گی میرے پاس۔'' رشید نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''رات کو پھر تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

''لیکن ارجمند کی آنکھ کھلے گی تو وہ ڈرے گی۔''

''ڈرے گی تو یہاں آ جائے گی۔''

''میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے اس حال میں دیکھے۔'' نادرہ کی نظریں جھک گئیں۔

''اس کا حل ہے میرے پاس۔ ہم دروازہ بند کر لیں گے۔ چلو لیٹ جاؤ۔''

رشید نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ نادرہ کو ایسا لگا' جیسے وہ کوئی پرندہ ہے' جسے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہے۔

اس رات وہ دو بار پامال ہوئی۔ پھر رشید سو گیا۔ وہ خود نجانے کب تک نیند سے محروم رہی۔ نیند سے اس کا برا حال تھا۔ جسم الگ نڈھال تھا۔ لیکن وہ اس خوف سے نہیں سوئی کہ ارجمند کی آنکھ کھلے اور وہ ڈرے تو وہ اس کی آواز سن لے۔ رات بھر اس کے کان باہر لگے رہے۔ ایک بار جی چاہا کہ وہ اٹھے اور دوسرے کمرے میں چلی جائے لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ رشید وہاں آئے' ارجمند کے سامنے اسے مارے' اس پر دست درازی کرے۔ اللہ نے ارجمند کو بہت کچھ دیکھنے سے

بچا لیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ بچی رہے۔

وہ نیند سے لڑتی' جاگتی اور سوچتی رہی۔ اس کے سامنے اب امید کی کوئی چھوٹی سی کرن بھی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ رشید اس سے ہرگز شادی نہیں کرے گا۔ ایسے لوگ شادی نہیں کرتے۔

مگر جب آدمی امید سے محروم ہو جائے تو امید تخلیق کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ رشید نے کہا تھا کہ اس کی ماں اور بہنوں کو اس کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے۔ وہ شادی قبول نہیں کریں گی۔ اور رشید نے کہا تھا کہ وہ اسے خالہ کے گھر لے جائے گا۔ خالہ شادی کرا دیں گی۔ ان میں سے کوئی بات بھی جھوٹ نہیں لگتی تھی۔ اس کی ماں اور بہنوں کا ردِعمل فطری تھا۔ تو ممکن ہے کہ یہ سچ ہی ہو۔

لیکن پھر اسے دوسری فکر ستانے لگی۔ رشید شراب پیتا ہے۔ گالیاں بھی بدمعاشوں کی طرح دیتا ہے۔ کیا ایسا آدمی ہے اس کے نصیب میں؟ اس لمحے اس کے اندر کسی نے ڈانٹا۔ اب تیری شان کہاں رہ گئی ہے نادرہ کہ تجھے شایانِ شان شوہر ملے۔ جو مل جائے' غنیمت ہے۔ تجھ جیسی بدبخت لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ تو تو اب بس ارجمند کے مستقبل کی فکر کر۔ اس کا...... اس کے تحفظ کا خیال کر۔

صبح ہو گئی دن چڑھ آیا۔ رشید سوتا رہا اور وہ نیند سے لڑتی رہی تھی۔ ایک بار اٹھی اور دوسرے کمرے میں جھانک آئی۔ ارجمند اب بھی سو رہی تھی۔

پھر رشید سو کر اٹھا تو اسے لگا کہ زندگی کی صبح ہو گئی ہے۔ جیسے اس کی سوئی ہوئی قسمت جاگ گئی ہے۔

رشید نے آنکھیں کھولیں تو وہ اس کے برابر لیٹی ہوئی تھی۔ رشید کی آنکھوں میں حیرت جھلکی۔

''ارے...... آپ یہاں؟'' اس کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔ نادرہ کو حیرت ہوئی۔ وہ اسے آپ کہہ رہا تھا۔ ''آپ ہی تو مجھے یہاں لائے تھے۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''تو...... تو وہ سب سچ تھا...... خواب نہیں تھا۔'' رشید نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ پھر بالکل اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''میں...... میں بہت برا ہوں...... میں کمینہ ہوں...... یہ میں نے کیا کر دیا......''

نادرہ حیران رہ گئی۔ رشید پھر سے وہی شائستہ آدمی بن گیا تھا۔

''ارے...... میں تو آپ سے محبت کرتا ہوں۔ یہ میں نے کیا کر دیا...... یہ آپ کے ساتھ ظلم......'' رشید سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا پھر اس نے نادرہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''یہ شراب بڑی کمینی چیز ہے۔ میں پیتا نہیں ہوں لیکن اماں سے لڑنے کے بعد غم غلط کرنے کے لیے پی لی تھی۔ آپ مجھے معاف کر دیں...... خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں' ورنہ میں خود کو ختم کر لوں گا...... خدا

کی قسم' میں خودکشی کرلوں گا۔"

امید نادرہ کی ضرورت تھی' سو پھر سے بندھنے لگی۔ "ایسی باتیں نہ کریں۔ یہاں ہمارا کون ہے آپ کے سوا۔ اوپر اللہ ہے اور نیچے آپ ہیں۔" اس نے کہا پھر ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔

"آپ نشے میں تھے سب کچھ خواب سمجھ رہے تھے۔ یہ بتائیں' آپ کو اپنا وعدہ بھی یاد ہے؟"

"کون سا وعدہ؟"

نادرہ کا دل ڈوبنے لگا۔ "آپ کو یاد نہیں ہے کہ آپ نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔"

"وہ کیسے بھول سکتا ہوں میں۔ اسی کی وجہ سے تو سب کچھ ہوا ہے۔ نہ میں اماں سے لڑتا آپ کی خاطر' نہ شراب پیتا۔ اور شراب نہ پی ہوتی تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوتا۔" رشید کی نظریں جھک گئیں۔ "آپ مجھے معاف کردیں...... خدا کے لیے مجھے معاف کردیں، ورنہ میں......"

"میں نے آپ کو معاف کردیا۔ بس آپ اپنا وعدہ......"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ابھی ناشتے کے بعد ہم خالہ کے ہاں چلیں گے۔ خالہ کا بہت بڑا گھر ہے۔ وہاں آرام ہی آرام ہے۔ آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ نجانے کب سے سوئی نہیں ہیں۔ وہاں آرام سے سو جائیے گا۔ میں اماں کے پاس جاؤں گا اور آخری بار انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ نہیں مانیں تو بس شام کو ہم شادی کرلیں گے۔"

نادرہ بےفکر ہوگئی۔ ارجمند اٹھی تو اس بار پوری طرح ہوش میں تھی۔ اُس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے پھپھو؟"

گزشتہ روز کی باتیں اسے یاد نہیں تھیں۔ نادرہ کو دوبارہ اس مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اور اس بار وہ مرحلہ زیادہ سخت تھا۔ ننھی بچی نے جو کچھ نہیں دیکھا تھا، وہ تو شاید وہ سہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اللہ نے رحم کیا کہ اسے اس سے بچا لیا لیکن اس کے لیے تو یہ بھی قیامت سے کم نہیں تھی۔ یہ اجنبی گندا سا، کچا گھر جہاں پھپھو کے سوا کوئی نہیں تھا، اور دادا، دادی، ماں، باپ، چچا...... سب اللہ کے پاس چلے گئے۔ تو وہ اور پھوپھو یہاں اکیلے کیا کریں گے۔ "پھوپھو...... ہم اللہ میاں کے پاس چلیں۔"

اسے سمجھانا آسان نہیں تھا، جبکہ اس دکھ سے نادرہ کا اپنا دل پھٹا جارہا تھا۔ دیر لگی لیکن بالآخر ارجمند کو قرار آ گیا۔ نادرہ جانتی تھی کہ ارجمند پر یہ وقت بار بار آئے گا...... مہینوں آتا رہے گا۔ آنکھ دیکھے کو تو صبر آ ہی جاتا ہے، لیکن جو دیکھا نہ ہو، اس پر یقین کرنا آسان نہیں ہوتا۔ آس لگی ہی رہتی ہے۔

ناشتے کے بعد رشید انہیں لے کر نکل آیا۔ وہ تانگے میں بیٹھے اور یوں وہ بوا کے پاس پہنچ گئی۔

رشید نے اپنی خالہ کو ان کے بارے میں بتایا، اپنی ماں سے جھگڑے کا بتایا۔ "خالہ، میں ان

سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... آج ہی۔"

خالہ اسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ وہاں گھر جیسی مسہری تھی۔ خالہ نے اسے لپٹا کر خوب پیار کیا۔ "تم فکر نہ کرو۔ آرام سے یہاں رہو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔ لگتا ہے، مہینوں سے نہیں سوئی ہو۔"

وہ اسے اور ارجمند کو کمرے میں چھوڑ کر چلی گئیں۔ نیند کو ترسی ہوئی نادرہ چند لمحوں میں ہی سو گئی۔ اور وہ ایسی بےسدھ ہوکر سوئی کہ آنکھ کھلی تو رات ہوچکی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھی تو ہارمونیم اور طبلے کی آواز سنائی دی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا، ارجمند بھی موجود نہیں تھی۔ وہ کمرے سے نکلی۔ اس گھر کے جغرافیے کا تو ابھی اسے علم نہیں تھا۔ وہ موسیقی کی آواز کی طرف بڑھتی رہی۔ باہر گھر میں برقی روشنی تھی۔

بالآخر اسے ارجمند نظر آ گئی۔ وہ دروازے سے ٹک کر کھڑی اندر دیکھ رہی تھی، اور اتنی منہمک تھی کہ اسے اُس کے آنے کا بھی پتا نہیں چلا۔ نادرہ نے اندر جھانکا تو وہاں رقص کی محفل سجی تھی۔ تماش بین بیٹھے داد دے رہے تھے اور سکے اور نوٹ اچھال رہے تھے۔

ایک لمحے میں نادرہ کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ ارجمند کو لے کر دوبارہ اس کمرے میں آئی۔ وہاں بیٹھ کر وہ سوچتی رہی۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے سمجھوتہ کرنا ہوگا...... ارجمند کی خاطر۔ ارجمند نہ ہوتی تو وہ ٹرین میں ہی خود کو ختم کرلیتی۔ لیکن اسے ارجمند کی خاطر جینا تھا، چاہے اس میں کتنی ہی ذلت ہو۔ اسے بس کسی طرح ارجمند کو ذلت اور گندگی سے بچانا ہے۔

وہ عقل مند تھی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ جو ہونا ہے، وہ تو ہوکر رہے گا۔ خواہ وہ مزاحمت کرے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہنسی خوشی سب کچھ قبول کرلیا جائے۔ اس خالہ کو خوش رکھا جائے، تاکہ اس سے اپنی بات منوائی جائے۔ ارجمند کے تحفظ کی یہی ایک صورت تھی۔

اس نے ہر پہلو سے سوچا اور لائحہ عمل طے کرلیا۔ ارجمند کے لیے یہ ماحول بہت ہی خراب تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ وہ ابھی دیکھ چکی تھی کہ وہ کتنی رغبت سے رقص دیکھ رہی تھی وہ اسے خوب سمجھتی تھی۔ ارجمند کو قدرت سے فنکارانہ فطرت ملی تھی۔ چھوٹی سی تھی تو تصویریں بنانے لگی تھی، اس عمر میں، جب بچے سے پنسل بھی نہیں تھامی جاتی۔ پڑھنے سے زیادہ اسے ڈرائنگ میں دلچسپی تھی، اور موسیقی بھی اسے مسحور کرلیتی تھی۔ یہاں اس کوٹھے پر یہ بات اس کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

یوں کوٹھے کی اس زندگی کا آغاز ہوا، جہاں وہ نادرہ سے نرگس بن گئی۔ ارجمند کے لیے اس نے سب سے پہلے رنگین پنسلوں اور ڈرائنگ کی کاپیوں کا بندوبست کردیا۔ پھر بہت تھوڑے

عرصے میں اُس نے نیلم بائی کا دل جیت لیا۔ اُس کی بات سنی اور مانی جانے لگی۔

فنون کی طرف ارجمند کا فطری میلان تھا۔ رقص اور موسیقی میں اُس کی دلچسپی نادرہ کے لیے پریشان کن تھی لیکن اس کا ایک فائدہ بھی ہوا تھا۔ اس دلچسپی کی وجہ سے اس کے زخم جلدی مندمل ہو گئے تھے۔ ابتدا میں وہ سب کو یاد کر کے دن میں کئی کئی بار روتی تھی لیکن جہاں موسیقی کی آواز ابھرتی، وہ مسحور ہو جاتی۔ وہ وہاں جا کھڑی ہوتی اور دیکھتی رہتی۔ یوں وہ جلد ہی پچھلی زندگی کو بھول گئی۔

اس دلچسپی کے توڑ کے لیے نادرہ نے ڈرائنگ کے رجحان کو مہمیز کیا۔ ارجمند ڈرائنگ کی طرف ویسے ہی راغب تھی۔ اُس کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں ڈرائنگ اس کا مشغلہ بن گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ غیر معمولی تصویر بنا لیتی تھی۔ وہ صلاحیت اس کی فطری تھی۔ تین سال کی تھی تو پھلوں کی تصویریں ایسی بناتی تھی کہ اصلی لگتے تھے۔ اب وہ اور آگے نکل گئی تھی۔ ایک دن تو اس نے نادرہ کی تصویر بنا ڈالی...... ایسی کہ نادرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس روز نادرہ نے اسے واٹر کلرز منگوا دیے۔

کچھ وقت گزرا، اور نیلم بائی کا اعتماد بحال ہوا تو نادرہ نے ارجمند کی تعلیم کا تذکرہ چھیڑا۔ وہ اسے اسکول تو نہ بھجوا سکی، لیکن گھر پر اُس کی تعلیم کا بندوبست ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ بھی ایک سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ارجمند کو رقص اور موسیقی کی باقاعدہ تعلیم دی جانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی نادرہ نے خود ارجمند کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا۔

حقیقت پسند تو نادرہ پہلے بھی تھی۔ مگر حالات نے اور زیادہ حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ وہ صورتِ حال کا جائزہ لیتی تو مایوسی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔ اس کا اپنا کوئی نہیں تھا، اور وہ اس کوٹھے کی محدود دنیا میں قید تھی۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ارجمند کو بچا پاتی...... اسے ماحول سے نکال دیتی۔ اُس کا سہارا تو بس اللہ کی ذات تھی۔ صورتِ حال کے انتہائی مایوس کن ہونے نے اس رابطے کو اور گہرا...... اور پکا کر دیا تھا۔ قرآن وہ باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ جب بھی موقع ملتا، نماز بھی پڑھتی اور اللہ سے ایک ہی دعا کرتی...... اپنے لیے نہیں، ارجمند کے لیے۔ اللہ کوئی رحمت کا فرشتہ بھیج دے جو اس معصوم بچی کو لعنت کی اس دنیا سے نکال لے جائے...... اور ایسا جلدی ہو جائے...... ارجمند پر یہاں کا رنگ چڑھنے سے پہلے! نادرہ کو احساس تھا کہ یہ ماحول بہت خطرناک ہے...... اور بچی پر یہاں کا رنگ چڑھنا بہت آسان ہے۔

پھر روزانہ اس کی دعا پہلے سے شدید ہو جاتی۔ روتے روتے اس کا دامن تر ہو جاتا۔ پھر روح میں ایسا اطمینان اور سکون اتر جاتا، جیسے اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی ہے۔ یہ نعمت حاصل نہ ہوتی تو شاید وہ گھل گھل کر ختم ہو جاتی۔

"میں آ گئی پھپھو۔"

ارجمند کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ماضی کی یادوں سے نکل آئی......

❁ ❁ ❁

ارجمند نے سمجھ لیا تھا کہ آج پھپھو کی وہی کیفیت ہے...... پرانی والی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا۔ اور جب ایسا ہوتا تو پھپھو کو چپ لگ جاتی تھی۔ وہ بہت اداس ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں وہ پھپھو کا خیال رکھتی، اور انھیں خوش کرنے کی کوشش کرتی۔

لیکن آج وہ خود بہت اداس تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسے چچا جان کی شادی یاد آ گئی تھی۔ کیسے ڈھولک بجی تھی، کیسے گیت گائے گئے تھے۔ ہاتھوں میں مہندی لگی تھی اور نئے کپڑے بنے تھے۔ اُس کے لیے غرارہ......

"پھپھو...... یہاں کسی کی شادی نہیں ہوتی؟"

نادرہ نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ "یہ خیال کیوں آ گیا تمھیں؟"

"چچا جان کی شادی ہوئی تھی تو کتنا مزہ آیا تھا۔ میرے لیے کتنا خوبصورت غرارہ سیا تھا آپ نے۔"

"غرارہ تو میں اب بھی سی دوں گی تمہارے لیے۔"

"لیکن شادی میں تو اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔"

نادرہ کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ "شادی تو اب یہاں انشاء اللہ تمہاری ہی ہو گی۔"

"واہ...... تب تو مجھے بہت سارے کپڑے ملیں گے...... گوٹے والے، سلمہ ستارے والے اور بہت سارے زیور بھی...... چچی جان کی طرح۔" ارجمند نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ "کب ہو گی میری شادی پھپھو۔"

"میں تو چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد ہو جائے لیکن ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو۔" یہ کہتے ہوئے نادرہ کے لہجے میں اداسی در آئی۔

"تو میں کب تک بڑی ہو جاؤں گی۔"

"بارہ پندرہ سال تو لگیں گے۔"

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ "کس سے ہو گی میری شادی۔"

"دیکھیں گے کوئی اچھا سا لڑکا...... شہزادوں جیسا، خوبصورت، رعب والا، لیکن نرم دل۔"

"مجھے تو کسی کی پسند پر اعتبار نہیں۔"

"میری پسند پر بھی اعتبار نہیں؟"

"نہیں پھپھو۔" ارجمند نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا۔ "آپ اُس رات جس بڑی بڑی مونچھوں والے کے ساتھ کمرے میں جا رہی تھیں، مجھے تو وہ بہت برا لگا تھا، جیسے...... جیسے کوئی

ڈاکو۔"

نادرہ تھرا کر رہ گئی۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"اچھا ہوا، آپ نے اُس سے شادی نہیں کی۔ بوا کہہ رہی تھیں کہ آپ اپنے لیے دولہا تلاش کر رہی ہیں لیکن اب تک کوئی پسند نہیں آیا ہے۔ مگر پھپھو، اُس مونچھوں والے کو تو آپ کو منہ بھی نہیں لگانا چاہیے تھا۔"

"تو اس وجہ سے تمہیں میری پسند پر اعتبار نہیں رہا۔" نادرہ اور اداس ہوگئی۔

"جی پھپھو، اپنے لیے تو میں خود ہی دولہا پسند کروں گی۔"

"ٹھیک ہے گڑیا۔ اب میں اللہ سے ہر روز دعا کیا کروں گی کہ تمہیں تمہاری پسند کا دولہا دے۔"

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔ "پھپھو...... ایک بات مانیں گی میری؟"

"بولو میری گڑیا، کیا بات ہے۔"

"آج مجھے بھی اپنے ساتھ کوٹھے پر لے چلیں۔"

نادرہ کو اپنا وہاں بیٹھنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ارجمند کو تو وہ وہاں ذرا دیر کے لیے بھی لے جانا گوارا نہیں کرتی تھی۔ خود تو وہ مجبور تھی اور وہاں بیٹھ کر اس سے نظر بھی نہیں اٹھائی جاتی تھی۔ یہ احساس اب بھی سوہانِ روح ہوتا تھا کہ ہر گزرنے والا اسے میلی، تولنے والی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، جیسے وہ کوئی لڑکی نہیں، ٹھیلے پر رکھا ہوا کوئی پھل یا ترکاری ہے۔

لیکن وہ ارجمند کی بے کلی بھی سمجھ سکتی تھی۔ بچی کا دل باہر جانے کو چاہتا ہوگا۔ وہ خود بھی باہر جانے کو کیسے ہڑکتی تھی۔ اس کے اور نیلم بائی کے درمیان بہ ظاہر کیسا ہی اعتماد ہو، لیکن اندر گہرائی میں بے اعتمادی موجود تھی، اور وہ بھی دوطرفہ۔ بائی نے کبھی اسے باہر جانے کو منع کیا، نہ ارجمند کے جانے پر پابندی لگائی لیکن ان دونوں کو ایک ساتھ اس نے کبھی باہر نکلنے نہیں دیا۔ شاید اس کے نزدیک وہ دونوں ایک دوسری کی واپسی کی ضمانت تھیں۔ وہ کبھی کہتی...... بوا، ارجمند کو کتاب دلا لاؤں، تو بوا کہتی، تم چلی جاؤ۔ ارجمند تو میرا سر دبائے گی۔ بہت درد ہو رہا ہے سر میں۔ یا وہ کہتی...... تم ذرا یہ کام کر لو نرگس۔ ارجمند اچھو میاں کے ساتھ چلی جائے گی۔ اور یہ دوسری بات نادرہ کو قبول نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارجمند ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو۔ اور وہ سوچتی کہ ابھی تو ارجمند صرف چھ سال کی ہے تو اس کی پریشانی کا یہ حال ہے۔ وہ سولہ سال کی ہوگی تو کیا ہوگا۔ ایک لمحے کو خوف سے اس کا جسم سرد ہو جاتا۔ مگر اگلے ہی لمحے اندر سے ایک آواز ابھرتی...... اس وقت تک انشاء اللہ وہ یہاں ہوگی ہی نہیں۔ کیسے؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ ہوگا یہی۔

اس وقت اسے تنگ پنجرے میں قید ننھی چڑیا جیسی اپنی بھتیجی پر ترس بھی آیا اور پیار بھی۔ کبھی کبھی پنجرے کی تیلیوں کے پار باہر کی دنیا کو دیکھنے کا موقع تو ملنا چاہیے اسے۔

جواب ملنے میں اتنی دیر ہوئی تو ارجمند بے تاب ہوگئی۔ "اچھی پھپھو، آج مجھے لے چلیں۔ پھر بہت دن تک نہیں کہوں گی چلنے کو۔" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

نادرہ کو اس کی سادگی اور سچائی پر پیار آ گیا۔ بچے کتنے سچے ہوتے ہیں۔ ارجمند نے اپنی بات منوانے کے لیے بھی جھوٹ نہیں بولا۔ یہ نہیں کہا کہ آج لے چلیں، پھر کبھی چلنے کو نہیں کہوں گی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ بات وہ آئندہ بھی کہے گی...... کہتی رہے گی۔

"ٹھیک ہے گڑیا، چلی چلنا۔" پہلی بار وہ مسکرائی۔

ارجمند خوش ہوگئی۔ "میں ڈرائنگ کی کاپی بھی لے چلوں گی۔"

"ضرور میری شہزادی۔"

❋ ❋ ❋

عبدالحق کو اندازہ بھی نہیں ہوا کہ وہ ہیرا منڈی میں داخل ہو چکا۔ اس کے قدم خودکار انداز میں اٹھ رہے تھے۔ وہ عجیب سی کیفیت میں تھا۔ ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک حصے پر اداسی مسلط تھی...... اداسی کہ وہ لاہور شہر سے رخصت ہو رہا تھا۔ لاہور جو زندگی کے مضمون میں اُس کے لیے درس گاہ ثابت ہوا تھا۔ یہاں اُس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ یہاں سے اس نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا تھا۔ اور ذہن کے دوسرے حصے میں خوشی ہی خوشی تھی...... خوشی کہ وہ گھر واپس جا رہا تھا...... اماں کے پاس...... زبیر بھائی اور رابعہ کے پاس...... اور...... اور...... اور وہاں نور بانو بھی تو تھی۔

نور بانو کا خیال آیا تو اس کے کانوں میں نور بانو کی آواز گونجنے لگی۔ قرأت کی آواز، تبارك الّذی بیدہِ الملك...... وہ آواز، جس نے اسے محبت سے روشناس کرایا تھا۔ وہ آواز جو اسے کھینچ کر صراطِ مستقیم کی طرف لے گئی تھی۔ کیسی عجیب بات ہے؟ اس نے اداسی سے سوچا۔ دہلی میں اس رات کے بعد اب تک اس نے نور بانو کی قرات نہیں سنی تھی۔ یہ تو چراغ تلے اندھیرے والی بات ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ کثرت سے اس کی آواز سنتا۔

اس کی پرانی قرأت کا تو کوئی حوالہ اس کے پاس نہیں تھا، کیونکہ وہ اس وقت اس زبان سے ہی نابلد تھا۔ اس کے پاس تو بس اسی رات کی قرأت کا حوالہ تھا...... تبارك الذی...... اور کمال یہ تھا کہ وہ جب بھی قرآن کھول کر یہ سورۃ پڑھتا تو اسے اپنی آواز سنائی نہ دیتی۔ بلکہ وہ نور بانو ہی کی آواز سنتا تھا۔

اچانک ناگواری کے بہت شدید احساس نے اس ٹھٹکا دیا۔ اس کے قدم رک گئے۔ اندر ایک تند کراہت ابھری تھی لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنی منقسم کیفیت کا

اسیر تھا...... خوشی اور اداسی کے بین بین...... اسے گرد و پیش کا احساس ہی نہیں تھا۔

قدم رکے تو ناگواری کی وجہ سمجھنے میں اسے محض چند لمحے لگے۔ وہ ہارمونیم اور طبلے کی آواز تھی، اور کوئی عورت کچھ گا رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار بھی بے حد نمایاں تھی۔

ناگواری کی وجہ تو سمجھ میں آ گئی۔ مگر وہ اتنی گہری محویت سے باہر آیا تھا کہ گرد و پیش کو اب بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

اسی لمحے ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''مال چاہیے باؤ جی؟...... ایسی کچی کلیاں ہیں موگرے کی......''

اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہی کوے جیسی چپکے چپکے اِدھر اُدھر چاروں طرف دیکھتی ہوئی آنکھیں۔ مٹھی میں دبا ہوا سگریٹ......

''میرے ساتھ آؤ باؤ جی، دل خوش ہو جائے گا تمہارا...... ایسا کورا مال کہیں نہیں......''

عبدالحق نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ ''مجھے نہیں چاہیے تمہارا مال۔ ہٹو ایک طرف۔''

''تو یہاں کیا کر رہے ہو باؤ صاب، مسجد تو پیچھے رہ گئی ہے۔'' اس شخص نے طنزیہ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

عبدالحق کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اسے افضال صاحب یاد آ گئے اور ان کی باتیں۔ یہ کنکر منڈی ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہاں وہ ہیرے بھی مل جاتے ہیں، جو مٹی میں رُلتے رُلتے یہاں پہنچتے ہیں۔ افضال صاحب نے کہا تھا کہ وہ ہر روز یہاں آتے ہیں، اس امید پر کہ شاید کوئی ہیرا انہیں مل جائے، اور واقعی انہیں ہیرا مل گیا تھا۔ وہ ہیرا...... زرینہ اب اُس کے پاس تھی۔

عبدالحق ایک بار پھر گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہزاروں کنکروں اور پتھروں میں کسی ہیرے کو تلاش کرنا کتنا مشکل، لیکن بڑا کام ہے۔ افضال صاحب نجانے کب سے یہاں آتے ہوں گے۔ کتنی مشقت کے بعد انھوں نے وہ ہیرا تلاش کیا، تو صرف اس لیے کہ وہ اس کی حیثیت جانتے تھے، اسے پہچانتے تھے۔ ویسے خود سے ہیرے کو پہچاننا تو اور مشکل ہوتا ہوگا۔ کوئی کیسے پہچان سکتا ہے۔ اللہ نگاہ عطا فرماوے تو اور بات ہے۔

لیکن اس کا اجر کتنا ہوگا۔ اللہ کتنا خوش ہوا ہوگا افضال صاحب سے۔ کون جانے، اللہ کے ہاں اس ایک عمل سے ان کی تمام خطائیں دھل گئی ہوں۔

اس وقت عبدالحق کی سمجھ میں ایک بات آئی۔ حقارت اچھی چیز نہیں ہوتی۔ نہ کسی شخص کے لیے، نہ کسی چیز کے لیے اور نہ کسی مقام کے لیے۔ اب کہنے کو یہ گناہوں کی بستی ہے لیکن افضال صاحب کو یہاں سے ایک نیکی مل گئی...... بہت بڑی نیکی۔

اس کا دل جیسے پگھلنے لگا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے اس دلال کو کیسے دھتکارا تھا۔ نہایت حقارت سے...... اسے حقیر سمجھ کر۔ اور اسے حقیر سمجھا تو گویا خود پر غرور کیا۔ جبکہ غرور اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ اور کون جانے کہ اس دلال کو اللہ کسی لمحے ہدایت دے اور اسے کوئی مرتبہ مل جائے۔ اپنی اوقات تو دیکھو۔ اس نے خود سے کہا۔ تم مشرک تھے نا۔ اللہ نے تمہیں ہدایت دی، راستہ دکھایا، اور آج تم مسلمان ہو......

وہیں کھڑے کھڑے اس نے دل میں توبہ کی۔ اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ کوئی اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے...... دو موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں اس کے چہرے کی تمام جزئیات کو محفوظ کر رہی ہیں...... آنکھیں ہی نہیں، انگلیاں بھی۔

اس نے سوچا، میں بھی کوشش کروں۔ کیا پتا، اللہ کی مہربانی سے مجھے بھی کوئی ہیرا مل جائے۔ مگر اس کے لیے نظر اٹھا کر چلنا ضروری ہے۔ اور نظر بھی ٹٹولنے والی ہو۔

وہ آگے بڑھ گیا۔

اب اس کا انداز مختلف تھا۔ وہ نظر اٹھا کر بالا خانوں پر چہروں کو ٹٹولتا تھا لیکن یہ بہت مشکل کام تھا۔ اس کی اٹھی ہوئی نظر کے جواب میں اداؤں، عشوؤں اور غمزوں کے روپ میں فحش اشارے اور گناہگار بلاوے اسے ستا رہے تھے لیکن اس تکلیف کی افادیت بھی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ تو کنکروں پتھروں کی پہچان تھی۔ یعنی ہیرا ہوگا تو الگ نظر آ جائے گا۔

وہ پورے بازار میں گھومتا پھرا...... بالا خانوں کو نگاہوں سے کھوجتا ہوا۔ کبھی کوئی دلال اسے روکتا، پیش کش کرتا تو وہ بڑی نرمی سے، حلیمی سے اسے منع کر دیتا۔ اس کے اندر جیسے میٹھے پانی کا کوئی چشمہ پھوٹ نکلا تھا۔

وہ تھک گیا۔ لیکن کہیں کوئی ہیرا اسے نظر نہیں آیا۔ پھر اچانک اسے بہت شدید بھوک کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ صبح کے ناشتے کے بعد اس نے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے چھوٹا سا ایک ہوٹل تھا۔ باہر چار پائیاں بچھی تھیں۔ وہ ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ یہ وہی جگہ ہے، جہاں اس نے دلال کو جھڑکا تھا۔ جہاں کھڑے ہو کر وہ سوچتا رہا تھا اور جہاں سے اس نے اپنی اس ناکام تلاش کا آغاز کیا تھا۔

تپائی پر رکھا جگ اٹھا کر اُس نے ہاتھ دھوئے اور ایک چار پائی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے ہوئے اس کی نظر بورڈ پر پڑی...... اللہ مالک ہوٹل لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں کا مرکز۔ اسی لمحے بیرا اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''کیا کھاؤ گے باؤ جی؟''

عبدالحق کو اس بار بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں اس بار بھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اگر اس کی نظریں ہوٹل کے بورڈ سے تھوڑا اوپر اٹھی ہوتیں تو اسے وہ بالا خانہ نظر آ

جاتا......اور چھ سال کی وہ بچی بھی، جو اسے بڑی توجہ اور محبت سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کے نقش دل میں اتار رہی ہو۔ ویسے وہ اس کے نقوش کاغذ پر تو ابھار ہی رہی تھی۔

لیکن اس کی نگاہیں بالا خانوں کو کھنگالتے کھنگالتے اتنی تھک گئی تھیں کہ اب اس میں انھیں اٹھانے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ہیرے کی تلاش نہیں کر سکا لیکن ایک ناتراشیدہ ہیرے نے اسے ضرور تلاش کرلیا ہے۔

❁ ❁ ❁

نادرہ بالا خانے پر یوں نظریں جھکا کر بیٹھی تھی، جیسے اس کی نظریں جھکی ہونے کی وجہ سے باہر سڑک پر موجود تماش بینوں میں سے کوئی بھی اسے نہیں دیکھ پائے گا لیکن اردگرد موجود دوسری لڑکیوں میں وہ ایسے نمایاں نظر آتی تھی، جیسے ستاروں کے درمیان چاند۔ اور جھکی ہوئی نظریں شاید اس کی کشش میں اور اضافہ کردیتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور پر سب سے پہلا گاہک اسے ہی لگتا تھا۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ اس کا بلاوا آگیا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ کیونکہ اس کے ساتھ ارجمند بھی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارجمند اسے کسی کے ساتھ کمرے میں جاتے دیکھے۔

اُس نے کن انکھیوں سے ارجمند کو دیکھا۔ وہ نیچے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے انداز میں ایسا انہماک تھا، جیسے اسے گردو پیش کی خبر ہی نہ ہو۔ ہاتھ میں ڈرائنگ کی کھلی کاپی اور دوسرے ہاتھ میں پنسل تھی لیکن اسے ان کا بھی ہوش نہیں تھا۔

ارجمند کی وہ محویت نادرہ کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ چپکے سے وہاں سے کھسک لی۔

ایک منٹ بعد ارجمند نے سر گھما کر دیکھا تو پھپھو موجود نہیں تھیں۔ اسے تھوڑی سی مایوسی ہوئی، کیونکہ وہ پھپھو کو بہت اہم بات بتانا چاہتی تھی۔ یہ اہم بات کہ اُس نے اپنے لیے دولہا پسند کرلیا ہے۔

مگر اس مایوسی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے وہ دوبارہ اُس شہزادے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اتنی سی دیر میں اس نے شہزادے کے کتنے رنگ دیکھ لیے تھے۔

جب پہلی بار اس کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس لمحے چلتے چلتے ٹھٹک کر رکا تھا اور حیرت سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی۔ اسی لمحے ایک بدمعاش نے اس سے کچھ کہا۔ اس نے کچھ جواب دیا اور اس کے جواب میں بدمعاش نے کچھ کہا، اور پھر بدمعاش آگے بڑھ گیا۔

وہ بہت قریب تھے۔ لیکن موسیقی کی تیز آواز کی وجہ سے وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن سکی۔ مگر اسے اندازہ ہوگیا۔ بدمعاش نے شاید کوئی اچھی بات نہیں کہی تھی۔ لیکن شہزادے نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔ بدمعاش کو یہ بات بری لگی، اس نے جواب میں کچھ کہا اور آگے

آگیا۔

شہزادہ اب وہیں کھڑا تھا۔ اور اس کے چہرے پر ایسی نرمی تھی کہ اس کی خوبصورتی اور بڑھ گئی تھی۔

ارجمند کا پنسل والا ہاتھ حرکت میں آگیا۔ پنسل کاغذ پر پھسلنے لگی۔ کاغذ پر نقش ابھرنے لگے۔

وہ بس لمحوں کی بات تھی۔ پھر شہزادہ آگے بڑھ گیا۔ ارجمند کی نگاہیں دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد ارجمند نے اپنی کاپی کا جائزہ لیا۔ کاغذ پر شہزادے کا خاکہ موجود تھا۔ اس نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں۔ اس کے تصور میں تو وہ جیسے جیتا جاگتا، سانس لیتا شہزادہ تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر پھر خاکے کو دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ خاکے کے نقوش میں بھدا پن تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس کی ڈرائنگ بہت اچھی نہیں ہے۔

اس نے پھر خاکے کو دیکھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ پھر اس نے سوچا۔ یہ محض خاکہ ہی تو ہے اس میں رنگ بھروں گی تو اور اچھا ہو جائے گا۔ اور پھر بھی اچھا نہیں ہوا تو کیا۔ وہ اس کی یادداشت میں محفوظ ہے۔ وہ اسے بناتی رہے گی۔ نقوش کی اصل خوبصورتی اجاگر کرنے کی کوشش کرتی رہے گی۔

"اللہ...... کتنی خوبصورت تصویر بناتی ہے یہ۔" بالا خانے پر موجود لڑکیوں میں سے ایک نے کہا۔

ارجمند نے جلدی سے کاپی بند کرلی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس تصویر کو کوئی دیکھے۔

"واقعی...... اتنی سی ہے۔ مگر اس کے ہاتھ میں کمال ہے۔" دوسری بولی۔

"ادھر دکھانا ارجی۔" تیسری نے ہاتھ بڑھایا۔

"میں ارجی پرجی نہیں ہوں۔ میرا نام ارجمند ہے۔" ارجمند نے بڑے وقار سے کہا۔

"اچھا ارجمند بانو، ذرا ہمیں بھی دکھا دو یہ تصویر۔"

"ابھی نہیں۔ ابھی یہ مکمل نہیں۔ رنگ بھر دوں گی تو دکھا دوں گی۔" ارجمند نے انہیں ٹالنے کے لیے کہا۔

"ارے اتنی سی ہے۔ مگر نخرے دیکھو، پٹاخا ہے پٹاخا۔" ایک لڑکی نے کہا۔ "میں تو ابھی دیکھوں گی۔"

ارجمند کے لیے مشکل ہو جاتی۔ مگر اسی وقت مائی شاداں آگئی۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ بالا خانے پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں پر نظر رکھے۔ "یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ باہر تک بھی آواز جا رہی ہوگی تم لوگوں کی۔ ڈانٹ مجھے کھانی پڑے گی۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم لوگ یہاں گاہکوں کو لبھانے کے لیے بیٹھی ہو۔ گپ شپ کے لیے نہیں۔"

تمام لڑکیاں بازار کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ مائی شاداں سے وہ سب ڈرتی تھیں۔ کہنے کو تو وہ

عورت تھی لیکن مردوں کی طرح مضبوط تھی۔ اور ہاتھ تو ایسا بھاری تھا اُس کا کہ دن میں تارے نظر آجاتے تھے اس کے ایک تھپڑ میں۔ وہ کوٹھے پر پولیس کی حیثیت رکھتی تھی۔ کوئی لڑکی نافرمانی کرتی تو بائی اسے شاداں کے حوالے کر دیتی۔ بڑی بڑی ضدی اور تگڑی لڑکیاں مائی شاداں کی پانچ منٹ کی مرمت بھی نہیں جھیل سکی تھیں۔ ایک نادرہ ہی ایسی تھی، جس کا کبھی مائی شاداں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

ارجمند کا جی چاہا کہ اندر چلی جائے اور شہزادے کی تصویر کو سنوارنے کی کوشش کرے۔ لیکن نجانے کیسے اسے اس بات کا یقین تھا کہ شہزادہ واپس آئے گا۔ چنانچہ وہ وہیں بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کاپی کھولی اور کاغذ پر بازار کی چہل پہل کا منظر بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

مگر درحقیقت وہ انتظار کی کیفیت میں تھی۔ اور وہ کیفیت اتنی گہری تھی کہ اس نے اسے کچھ سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ بس بے دھیانی میں وہ پنسل چلائے جا رہی تھی۔ انتظار کی وہ محویت ایسی تھی کہ اسے پھپھو کے اچانک چلے جانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ ورنہ وہ ضرور جڑتی اور کڑھتی۔ بے چاری پھپھو۔ انہیں کبھی کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ملتا کہ جس سے شادی کریں۔ پھر بھی ہر روز کوشش کرتی رہتی ہیں۔ اور ان کے لیے ایسے لوگ آتے ہیں، جو دیکھنے سے ہی برے لگتے ہیں...... کہانیوں والے دیو اور جادوگروں جیسے۔

دیر ہوگئی۔ وہ بازار کا خاکہ بناتی رہی۔ پھر اچانک شہزادہ واپس آ گیا۔ اس بار وہ پہلے سے بہت زیادہ قریب تھا۔ نیچے جو ہوٹل تھا، وہ اس کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ پھر اس نے اٹھ کر ہاتھ دھوئے۔

ارجمند اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پنسل والا ہاتھ تھم گیا تھا۔ اس بار وہ شہزادے کی تصویر گردوپیش کی تمام جزئیات کے ساتھ دل کے کینوس پر اتار رہی تھی۔ ایک بات اس نے سمجھ لی تھی۔ آنکھوں سے دیکھ کر کاغذ پر تصویر بنانا یقیناً آسان ہے۔ لیکن یادداشت میں محفوظ کرنے کے بعد تصویر بنانا بہت زیادہ آسان ہوگا۔ اور وہ تصویر زیادہ درست اور زیادہ مکمل ہوگی۔ اس بات کا ابھی اسے تجربہ تو نہیں تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ یہ سچ ہے...... اسی طرح جیسے شہزادے کے جانے کے بعد اسے یقین تھا کہ وہ واپس آئے گا۔

اور اس کا یقین سچا تھا۔ وہ واپس آ گیا تھا!

❁ ❁ ❁

عبدالحق مسعود صاحب کے گھر پہنچا تو بہت رات ہو چکی تھی۔ مسعود صاحب گھر کے باہر بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکے۔ ”کہاں چلے گئے تھے تم؟ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔“

”میں ایسے ہی گھومنا چاہتا تھا...... کل واپس جا رہا ہوں نا۔ لیکن آپ پریشان کیوں تھے؟“

”ارے...... اتنی رات ہو گئی...... اور تم نہیں آئے۔ پریشانی کی تو بات تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی دے کر بھیجا کہ تمہیں ڈھونڈ کر لائے۔ اب اتنا بڑا شہر ہے۔ کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا وہ تمہیں۔ زیادتی ہو گئی بے چارے کے ساتھ۔“

عبدالحق کو شرمندگی ہونے لگی۔ وہ تو اپنی دانست میں آزادی اور بے فکری کے ساتھ لاہور کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے کون کون کتنا پریشان ہوگا۔ کیسی خودغرضی سرزد ہوئی ہے اُس سے۔

”میں شرمندہ ہوں سر۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی دیر ہو جائے گی۔ وقت کا خیال ہی نہیں رہا مجھے۔“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ مسعود صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ لاہور کو الوداع کہہ رہے تھے تم۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں۔ ارے بھئی لوٹ کر یہیں تو آنا ہے تمہیں۔“

”جی...... جی ہاں سر۔“

”اچھا، اب جلدی سے اندر چلو۔ تمہارے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا۔ بھوک سے برا حال ہے میرا۔“

عبدالحق کی شرمندگی اور بڑھ گئی۔ یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ کھانا وہ کھا چکا ہے۔

مسعود صاحب کا ساتھ دینے کے لیے وہ بھوک نہ ہونے کے باوجود دھیرے دھیرے کھاتا رہا۔

”تو کل واپس جا رہے ہو تم۔“

”جی ہاں۔“

”اور واپسی کب ہوگی؟“

”اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ کچھ پتا نہیں، وہاں کے کام نمٹانے میں کتنا وقت لگے گا۔“

”کام کیا ہیں، سب کچھ تو نمٹا چکے ہو تم۔ مختار نامہ بھی بنوا دیا ہے زبیر کے نام۔“

”کچھ لوگ میری ذمہ داری ہیں۔ اور سر، زرینہ کی شادی کی بھی فکر ہے مجھے۔“

”زرینہ کی شادی تو لاہور میں بھی ہو سکتی ہے۔“

”نہیں سر۔ یہاں کوئی اسے اس کے ماضی کے حوالے سے پہچان سکتا ہے۔ میں چاہوں گا کہ اس کی شادی یہاں سے کہیں دور ہو۔“

”بات تمہاری ٹھیک ہے۔ تم عقل مند ہو، اور دور تک سوچنے اور دیکھنے والے......“ مسعود صاحب نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ چونکے، جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔

"ارے ہاں...... خریداری کیا کی تم نے؟"

عبدالحق نے انہیں تفصیل بتائی۔

"اور تم نے وہ سب میرے ڈرائیور کے ہاتھ بھجوایا۔ یہ عقلمندی کے خلاف ہے۔ اور زیادتی بھی ہے ڈرائیور کے ساتھ۔"

"میں سمجھا نہیں سر۔"

"ارے بھئی، اگر وہ گاڑی کہیں کھڑی کرتا اور تمہارا سامان لے کر نکل بھاگتا تو۔ تین ساڑھے تین ہزار کے تو صرف زیورات ہی ہوں گے۔"

"میں نے سوچا کہ آپ کا ڈرائیور ہے تو قابلِ اعتبار ہی ہوگا۔"

"دیکھو بھئی، یہ آدمی کو بلاوجہ کی آزمائش میں ڈالنا ہوا۔" مسعود صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔ "بھئی آدمی تو خطا کا پتلا ہے۔ اللہ نے ایسا ہی بنایا ہے اسے کہ گناہ اس کے لیے فطری ہوتا ہے۔ میری بات یاد رکھنا۔ ترغیب گناہ کا دروازہ ہوتی ہے۔ آدمی کو خود کو ترغیبات سے دور رکھنا چاہیے۔ یہی نہیں، دوسروں کو بھی ترغیبات سے بچانا اُس کی ذمہ داری ہے۔ کبھی کبھی نہایت ایمان دار آدمی مجبوریوں کی وجہ سے بھی ہار جاتا ہے۔ ایسے میں اس بات کو سمجھ کر درگزر سے کام لینا چاہیے۔ سرکاری ملازمت میں، اور ویسے بھی عملی زندگی میں ان سب باتوں کا خیال رکھنا چاہیے آدمی کو۔ اب آج اگر میرے ڈرائیور کی نیت خراب ہو جاتی تو وہ تو گناہ گار ہوتا ہی، لیکن اس میں قصوروار تم بھی ہوتے۔"

"شکریہ سر۔ میرا خیال ہے، آج آپ نے مجھے بہت اہم بات سمجھائی ہے۔"

"ایک بات اور۔ اللہ نے آدمی کو فرشتہ نہیں بنایا، اور فرشتوں سے افضل قرار دیا ہے۔ تو آدمی کو آدمی ہی سمجھنا چاہیے۔ اور اُس کو فطری کمزوریوں کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ خطاؤں پر، لغزشوں پر، گناہوں پر مطعون کرنا اور سزا دینا تو بہت آسان ہے، معاف کرنا اور درگزر کرنا بہت مشکل ہے۔ اور رہی بات اعتبار کی تو وہی بات ہے کہ آدمی کو آدمی سمجھو۔ اعتبار کرو تو اس حد تک کہ اُس کی اور اپنی بساط کو ذہن میں رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ اعتبار ٹوٹے تو عمر بھر کسی پر اعتبار کرنے کے قابل ہی نہ رہو۔ یہ اور بڑا نقصان ہوتا ہے۔"

"شکریہ سر۔ میں آپ کی یہ باتیں یاد رکھوں گا۔"

اُس وقت ڈرائیور یہ خبر لے کر آ گیا کہ مہمان کہیں نہیں ملا۔ عبدالحق مسکرا دیا۔ ڈرائیور نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ مہمان ہیرا منڈی میں ملے گا۔

❀ ❀ ❀

ارجمند اس روز صبح ہی سے تصویریں بنانے میں منہمک تھی!

گھر میں یہ وقت اسے عجیب لگتا تھا۔ سبھی لوگ سو رہے ہوتے تھے۔ سناٹا ایسا ہوتا تھا، جیسے رات کو ہوا کرتا ہے۔ مگر اس وقت میں ایک خوبی تھی۔ ارجمند کو ایسا لگتا تھا کہ یہ اس کی حکمرانی کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت وہ جو چاہتی، کر سکتی تھی...... ایک کام کے سوا۔ بس وہ گھر سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ ایک دن اسے خیال آیا تھا کہ سب سو رہے ہیں۔ کیوں نہ وہ باہر جائے اور سیر کرنے کا اپنا ارمان پورا کرے۔ یہ سوچ کر وہ دروازے کی طرف گئی۔ مگر دروازے پر تو یہ بڑا تالا لگا تھا۔

اُس نے تصویر مکمل کر کے دیکھا۔ اس تصویر سے وہ مطمئن تھی۔ اس نے سوچا، اب رنگ بھرنے کے بعد تو یہ بالکل شہزادہ ہی لگے گا۔

رنگ بھرنے کے بعد اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے شہزادے کی ویسی ہی تصویر بنا لی تھی، جیسا کہ وہ تھا۔ تصویر کو نظر بھر کر دیکھنے کے بعد اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شہزادے کا چہرہ اب بھی اس کے سامنے تھا، ویسا ہی، جیسا اس نے دیکھا تھا۔ اب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو احساس ہوا کہ تصویر میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔

کمی کا احساس اپنی جگہ، لیکن وہ تصویر شہزادے ہی کی تھی۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی۔ وہ یہ تصویر پھپھو کو دکھانے کے لیے بے تاب ہو گئی۔

لیکن پھپھو سو رہی تھیں!

وہ جھنجھلا گئی۔ یہ پھپھو اتنی دیر تک کیوں سوتی ہیں؟ جب دیکھو، دوپہر کو اٹھتی ہیں۔

اس پر اسے دادی یاد آ گئیں۔ وہ کہتی تھیں، گھر میں کوئی دیر تک سوئے تو نحوست چھا جاتی ہے پورے گھر پر۔ مگر یہاں تو سب کے سب دوپہر تک سوتے رہتے ہیں۔ یہاں تو نحوست بہت ہی زیادہ ہوگی۔ اس نے اِدھر اُدھر، چاروں طرف دیکھا۔ نحوست تو کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ البتہ سناٹا ضرور تھا، جو بہت برا لگتا تھا۔ پتا نہیں، نحوست کیسی ہوتی ہے؟ اس نے سوچا، مجھے نظر کیوں نہیں آتی؟

ذہن کی رو بدلی تو اسے ایک اور بات یاد آئی۔ چچا جان کی شادی کی اگلی صبح وہ چچی جان سے بات کرنے کو بے تاب ہو رہی تھی۔ رات دلہن بنی ہوئی وہ کتنی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ ناشتہ وہ ان کے ساتھ کرے گی، اور پھر خوب باتیں کرے گی ان سے۔

صبح دادی نے اسے ناشتہ دیا تو اس نے انکار کر دیا۔ "میں تو چچی جان کے ساتھ ناشتہ کروں گی۔"

"اب بھی کر لو۔ اور دلہن کے ساتھ بھی کر لینا۔" دادی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"پیٹ بھرا ہوگا تو ناشتہ کرنے میں کیا مزہ آئے گا۔" وہ بولی۔

دادی کے اصرار کے باوجود اس نے ناشتہ نہیں کیا۔ مگر نہ تو چچا جان اٹھے، نہ چچی جان۔ بھوک سے اس کا برا حال ہو گیا۔ "دادی...... کب اٹھیں گی چچی جان۔" اس نے فریاد کی۔

"انہیں چھوڑو، تم ناشتہ کر لو۔"

مگر وہ نہ مانی۔ وہ چچا جان کے کمرے کی طرف گئی اور دروازے کو دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ غصے میں اس نے دروازہ پیٹنے کا ارادہ کرلیا۔

"نہیں میری شہزادی، بری بات۔" عقب سے اسے دادی کی آواز سنائی دی۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔

"یہ لوگ اٹھتے کیوں نہیں دادی۔"

"تم چلو، ناشتہ کرلو۔ آؤ میرے ساتھ۔" دادی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں......"

دادی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں نے کہا نا، تم ان کے ساتھ بھی کرلینا ناشتہ۔"

بھوک سے مجبور ہو کر وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ لہٰذا ناشتے پر ٹوٹ پڑی۔ لیکن پیٹ بھرتے ہی اس کا دماغ پھر کام کرنے لگا۔ "توبہ کیسی نحوست پھیلی ہوئی ہے گھر میں۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

دادی ہنسنے لگیں۔ "کوئی بھی نہیں۔ آج تو گھر میں برکت ہی برکت ہے۔"

اُس نے حیرت سے دادی کو دیکھا۔ "دن چڑھے تک سونے سے نحوست نہیں ہوتی گھر میں؟ آپ ہی تو کہتی تھیں۔"

"ہوتی ہے لیکن گھر میں کسی کی شادی ہو جائے تو چالیس دن تک نحوست اس گھر میں گھس ہی نہیں سکتی۔"

"اتنی اچھی چیز ہے شادی۔"

"تو اور کیا۔ کسی کی شادی ہوتی ہے تو اللہ میاں خوش ہوتے ہیں۔"

اللہ میاں پر اسے خیال آیا کہ اب تو اس کے اور پھپھو کے سوا سب لوگ اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔ اور پھپھو کہتی ہیں کہ وہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ وہ اداس ہوگئی۔ اب وہ ان سے کبھی نہیں مل سکے گی۔ ہاں وہ بھی اللہ میاں کے پاس چلی جائے تو اور بات ہے۔ لیکن ابھی تو یہ پسند نہیں کرے گی۔ ابھی تو اسے شہزادے سے شادی کرنی ہے۔

وہ ان سب لوگوں کے بارے میں سوچنے لگی...... دادا، دادی، ماں باپ، چچا چچی۔ اب وہ سب اللہ میاں کے پاس ہیں۔ اللہ...... اللہ میاں کا گھر کیسا ہوگا۔ یقیناً بہت بڑا ہوگا...... اور بہت خوبصورت۔ وہاں بھی وہ سب لوگ صبح سویرے اٹھتے ہوں گے۔ اور کبھی کوئی دن چڑھے تک سوا ہوگا تو گھر میں نحوست...... نہیں، دادی کہتی تھیں کہ اللہ کے ذکر سے، اس کے کلام سے نحوست دور ہوتی ہے۔ تو اللہ کے گھر میں نحوست کیسے ہو سکتی ہے۔ ہاں اللہ میاں دیر تک سونے والے کو ڈانٹ کر اٹھاتے ہوں گے......

اس کی نظر شہزادے کی تصویر پر پڑی۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ پھپھو کو یہ تصویر دکھانی ہے۔ پھپھو کتنی خوش ہوں گی۔

وہ پھپھو کے کمرے کی طرف چل دی۔ یہ پھپھو اتنے لوگوں کو دیکھتی ہیں، ملتی ہیں، ان سے باتیں کرتی ہیں لیکن شادی کسی سے نہیں کرتیں۔ کوئی پسند ہی نہیں آتا انھیں۔ اس نے سوچا۔ پھر خود ہی بڑبڑائی۔ کوئی اچھا ہوتا بھی نہیں۔ اچھے لوگ کیوں نہیں آتے۔ مگر پھر پھپھو دیر تک کیوں سوتی ہیں۔ بلکہ یہاں تو سبھی دیر تک سوتے ہیں، اور شادی کسی کی نہیں ہوتی۔

وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اندر کا منظر عجیب تھا۔ چار لڑکیاں تو مسہری پر سوئی ہوئی تھیں۔ دو نیچے فرش پر بچھے بستر پر پھیلی ہوئی تھیں۔ پھپھو کا بستر الگ تھا۔ ان کے ساتھ کوئی نہیں سوتا تھا۔

اب پھپھو کو جگانا، ایسے کہ کسی اور لڑکی کی نیند خراب نہ ہو، آسان کام نہیں تھا۔ یہاں نیند خراب کرنے پر لوگوں کو بہت غصہ آتا تھا۔ اس پر بہت ڈانٹ پڑ چکی تھی اسے۔ بلکہ ایک بار تو اس منحوس بوا نے اس کے کان اتنے زور سے کھینچے تھے کہ دو دن تک درد ہوتا رہا تھا کانوں میں۔ صرف اس بات پر کہ ایک لڑکی نے بوا سے اس کی شکایت کردی تھی نیند خراب کرنے پر۔

بوا چاہتی تھی کہ وہ اسے نانی کہا کرے لیکن اس نے یہ بات کبھی نہیں مانی۔ وہ تو بوا کو سخت ناپسند کرتی تھی...... بغیر کسی وجہ کے۔ اور بعد میں تو وجوہات بھی مل گئی تھیں اسے۔ ایک تو وہی کان کھینچنے والی بات تھی۔ پھر اس نے پھپھو کا نام نرگس رکھ دیا تھا۔ جبکہ پھپھو کا اتنا اچھا نام تھا...... نادرہ۔ اس نے یہ بات پھپھو سے بھی کہی تھی۔

"یہ سب لوگ اچھے نہیں ہیں گڑیا...... بہت برے ہیں۔" پھپھو نے اسے سمجھایا تھا۔ "اس لیے میں نہیں چاہتی کہ یہ میرا نام لیں۔ میں نے خود انہیں اپنا نام نرگس بتایا ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی تھی۔ اس لیے پھپھو اسے بہت اچھی لگی تھیں۔ انھیں اپنے اچھے نام کی کتنی فکر تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "تو پھپھو، مجھے بھی اپنا نام ارجمند بہت اچھا لگتا ہے۔ تو میں انہیں ارجی کہنے دوں خود کو۔"

"ہاں...... کیوں نہیں۔" پھپھو نے کہا تھا۔

مگر اب بھی کبھی کبھی اپنے لیے ارجی سن کر وہ بھڑک اٹھتی تھی......

اُس نے پھپھو کے کان سے ہونٹ ملائے اور سرگوشی میں اسے پکارنے لگی۔ ساتھ ہی وہ ہاتھوں سے اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ "پھپھو...... اچھی پھپھو...... جلدی سے اٹھ جائیں۔ ایک زبردست خبر ہے۔ اٹھ جائیں نا پھپھو......"

❀ ❀ ❀

گڑھا بہت گہرا تھا۔ اور ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ نادرہ کو احساس تھا کہ وہ کمر تک کیچڑ میں پھنسی ہوئی ہے۔ بدبو اور تعفن اتنا شدید تھا کہ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ محض کیچڑ نہیں ہے۔ بلکہ بدترین نوعیت کی غلاظتوں کا آمیزہ ہے۔ بدبو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اور وہ ناک بھی بند نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ بھی لتھڑے ہوئے تھے۔

اس نے پہلو بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی ٹانگوں کو حرکت ہی نہیں دے سکی۔ اس سے اسے اندازہ ہوا کہ غلاظتوں کا وہ آمیزہ کیچڑ نہیں' بلکہ دلدل ہے۔ اور وہ یہاں سے نکل ہی نہیں سکتی۔

بے بسی کے شدید احساس سے اس کا دماغ شل ہو گیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر سیاہی مائل نیلگوں آسمان اسے کسی کنٹر کے ڈھکنے کی طرح لگا۔ اور وہ ڈھکنا بہت چھوٹا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ جتنا چھوٹا لگ رہا ہے' اتنا ہوگا نہیں۔ کیونکہ اس نے گڑھے میں کھڑے اپنے دونوں ہاتھ پوری طرح سے پھیلا کر دیکھا تھا' اور وہ گڑھے کی دیواروں کو نہیں چھو سکے تھے۔ اس سے گڑھے کے قطر کا وہ اندازہ لگا سکتی تھی۔ جبکہ ستاروں سے محروم آسمان کا وہ ڈھکنا بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔

اس ڈھکنے کی وجہ سے گڑھے کی گہرائی اسے لامتناہی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا ہے نہیں۔ جہاں آسمان کے سوا کچھ دکھائی نہ دے' وہاں تو فاصلہ زیادہ ہی لگے گا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ گڑھا بہت کم گہرا ہو' تب بھی وہ اس میں سے نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ وہ اپنے قدموں کو حرکت ہی نہیں دے سکتی۔ اور نہ ہی وہ کسی دیوار کا سہارا لے سکتی ہے۔

بدبو اور تعفن کی وجہ سے اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ زور سے پکار کر اللہ سے مدد مانگنا چاہتی تھی لیکن اتنی گندگی میں یہ مناسب نہیں تھا۔ ہاں...... دل میں وہ دعا کر سکتی تھی۔

سو وہ دل میں دعا کرتی رہی کہ اللہ اسے اس گڑھے سے نجات دے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر بلند آواز میں پکارا۔ ''کوئی ہے...... ارے کوئی ہے...... میری مدد کرو۔ مجھے یہاں سے نکالو۔''

وہ بار بار پکارتی رہی۔

پھر اچانک جیسے آسمان کے اس ڈھکنے میں رخنہ نمودار ہوا...... ایک انسانی ہیولا' جس نے جھک کر اسے دیکھا۔

''پلیز...... پلیز مجھے نکالو یہاں سے۔'' وہ گڑگڑائی۔ اب زور سے چیخنے کی ضرورت نہیں تھی۔

جواب میں ایک ہاتھ نیچے کی طرف آیا۔ ''لو...... میرا ہاتھ تھام لو۔''

ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے ایک خیال کے تحت اس نے واپس کھینچ لیا۔ وہ آواز جانی پہچانی تھی۔ ''کون ہو تم؟''

''تمہیں اس سے کیا؟ تم باہر نکلنا چاہتی ہو اور میں تمہاری مدد کر رہا ہوں۔''

''نہیں...... میرے لیے اس کی بھی اہمیت ہے۔ پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو۔'' وہ اس آواز کو پہچان چکی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ وہ اس صورت کو بھولی تھی نہ اس آواز کو۔

پھر جواب سے اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ ''میں اوتار سنگھ ہوں۔'' آواز نے کہا۔

''میں نہیں چاہتی کہ تم مجھے نکالو۔''

''لیکن کیوں؟''

''کیونکہ تم مشرک ہو۔''

''اوہ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ''اور اس گڑھے میں تمہیں کس نے گرایا ہے۔ وہ کوئی مشرک تو نہیں تھا۔''

''مگر یہ سب کچھ ہوا تو تم مشرکوں ہی کی وجہ سے ہے۔''

''وہاں کی چھوڑ' یہاں کی بات کرو۔ تم تو وطن میں' اپنوں کے ہاتھوں غلاظت کے اس گڑھے میں گری ہو۔''

وہ خاموش رہی۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''لاؤ...... ہاتھ دو مجھے۔''

''نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔''

پھر اچانک اوتار سنگھ کی آواز بدل گئی۔ وہ کسی چھوٹی سی بچی کی آواز میں بولنے لگا۔

''پھپھو...... اچھی پھپھو......''

''وہ حیران رہ گئی۔ ''یہ کیا......؟''

''اچھی پھپھو...... جلدی سے اٹھ جائیں۔''

''یہ تمہاری آواز کو کیا......؟''

''ایک زبردست خبر ہے...... اٹھ جائیں نا پھپھو۔''

اور اوتار سنگھ کا ہاتھ جیسے لمبا ہوتا گیا...... اتنا لمبا کہ اس تک پہنچ گیا' اور اسے جھنجوڑنے لگا۔

''ہاتھ ہٹاؤ...... مت چھوؤ مجھے۔''

''پھپھو...... پھپھو...... آپ تکلیف پہنچا رہی ہیں مجھے۔''

اور نادرہ کی آنکھ کھل گئی۔ اسے احساس ہوا کہ ارجمند کی کلائی اس کے ہاتھ میں ہے' اور اس کی گرفت بہت سخت ہے۔ ارجمند کے چہرے پر تکلیف کا تاثر تھا۔ ''کیا ہوا گڑیا؟''

''آپ میرا ہاتھ تو چھوڑیں نا پھپھو۔''

نادرہ نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''اب بولو کیا بات ہے۔''

"دوسرے کمرے میں چلیں۔ میں آپ کو کچھ دکھاؤں گی۔"

نیند تو اب بھی آ رہی تھی لیکن اس خواب کے بعد اب وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ "اچھا...... تم چلو۔ میں منہ دھو کر آتی ہوں۔"

منہ پر پانی کے چھپکے مارتے ہوئے وہ اس خواب کے بارے میں سوچتی رہی۔ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ یہ خواب وہ ہر دوسرے تیسرے دن دیکھتی تھی۔ اس کی وجہ بھی وہ سمجھتی تھی۔ اوتار سنگھ اس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ اس کے بارے میں وہ ہمیشہ ایک ہی بات سوچتی تھی۔ کاش...... کاش وہ مسلمان ہوتا۔ وہ اپنی محبت سے تو لڑتی رہی۔ لیکن وہ اسے بھلا کبھی نہیں سکی۔

اس وقت بھی اس نے سوچا...... کاش وہ مسلمان ہوتا۔

لیکن ابھی دیکھے ہوئے خواب کا اثر شاید تازہ تھا۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا...... چاہے رشید جیسا مسلمان ہوتا!

اس نے آئینے سے نظریں چرالیں اور تولیے سے چہرہ پونچھنے کے بعد کمرے کی طرف چل دی' جہاں ارجمند اس کی منتظر تھی۔

❁ ❁ ❁

"ہاں' اب بتاؤ' وہ کیا بڑی خبر ہے' جس کے لیے تم نے میری نیند خراب کی؟" اس نے ارجمند کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت بڑی خبر ہے پھپھو۔"

"بتاؤ تو۔"

"خبر یہ ہے پھپھو کہ مجھے میرا دولہا مل گیا۔"

فرطِ حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ "ارے...... کیا واقعی؟ لیکن کیسے؟ اور کہاں؟"

"آپ تو اندر چلی گئی تھیں۔ میں کوٹھے پر تھی۔ تب میں نے انہیں دیکھا۔ وہ نیچے تھے۔"

نادرہ کو ہنسی آ گئی۔ ارجمند اسی لہجے میں بات کر رہی تھی' جیسے لڑکیاں کسی کو اپنے منگیتر کے بارے میں بتاتی ہیں۔ "یہ بتاؤ' کیا وہ اوپر بھی آئے تھے؟"

اس نے اسی انداز میں اس سے پوچھا۔

"نہیں پھپھو' اوپر تو نہیں آئے وہ۔" ارجمند نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تم بھی پگلی ہو۔ ضروری نہیں کہ آئندہ وہ تمہیں نظر بھی آئیں۔"

"نہیں پھپھو۔ بس کچھ بھی ہو' میں تو شادی انہی سے کروں گی۔"

"ارے بے وقوف' اب تم انہیں دوبارہ دیکھو گی تو پہچان بھی نہیں سکو گی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں۔ انہیں تو میں کبھی نہیں بھولوں گی۔" ارجمند نے خفا ہو کر کہا۔

نادرہ کو ہنسی آ گئی۔ مدت کے بعد ایسی بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ ارجمند کی معصومیت نے اس دل میں سچی خوشی کا ایسا پھول کھلایا تھا' جسے وہ ترس ہی نہیں رہی تھی۔ بلکہ بھول ہی چکی تھی۔ اس نے ارجمند کو لپٹا کر پیار کیا۔ "تو تم انہیں کہیں بھی دیکھو گی تو پہچان لو گی۔ اور وہ تمہیں ملیں گے بھی۔ ورنہ اچھا' یہ بتاؤ' کیسے تھے وہ۔ یہ تو یاد ہو گا تمہیں۔"

ارجمند کھل اٹھی۔ "دکھاؤں آپ کو۔"

نادرہ حیران رہ گئی۔ "تو کیا اب بھی نیچے کھڑے ہیں وہ؟"

"ارے پھپھو' آپ بھی پگلی ہیں بس۔" ارجمند نے ہنسی کے انداز میں کہا۔ "میں نے تصویر بنائی تھی ان کی۔"

نادرہ کا دل دکھنے لگا۔ معصوم بچی کو جانے کن کن مرحلوں سے گزرنا تھا زندگی میں۔ اور وہ ابھی سے دکھوں کا سامان کر رہی تھی۔

"دکھاؤں آپ کو؟"

"ہاں ضرور۔"

ارجمند نے ڈرائنگ کی کاپی کھولی اور تصویر والا صفحہ اس کے سامنے کر دیا۔

نادرہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اوتار سنگھ!"

نادرہ نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ "نہیں گڑیا۔ البتہ ان کی صورت ملتی ہے اوتار سنگھ سے۔"

"اوتار سنگھ کون تھے؟"

"میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے...... میری کلاس میں۔ لیکن یہ وہ نہیں ہو سکتے۔ ہاں شکل بہت ملتی ہے۔"

"یہ اوتار سنگھ وہی ہیں نا' جن کے بارے میں آپ بہت باتیں کرتی ہیں مجھ سے۔ ہے نا؟"

"ہاں گڑیا۔" نادرہ نے جھجکتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کو یہ بہت اچھے لگتے تھے؟"

"اچھا تو یہ تھا۔ مگر ہندو تھا۔ بہت اچھا کیوں لگتا مجھے۔"

"لیکن یہ ہندو نہیں ہیں۔" ارجمند نے زور دے کر کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو گڑیا۔ ہندو ہوتو یہاں کیوں ہوتا۔" نادرہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا گڑیا' اب میں سو جاؤں۔ بہت نیند آ رہی ہے مجھے۔"

"دن چڑھتے تک سونا نحوست ہوتا ہے پھپھو۔ یاد ہے' دادی کہتی تھیں۔"

نادرہ اداس ہو گئی۔ "نحوست سے بھاگنا ہی تو چاہتے ہیں ہم۔ مگر راستہ ہی نہیں ملتا۔"

❁ ❁ ❁

نیند کا تو بس بہانہ تھا۔ نیند اب کیسے آسکتی تھی۔ وہ تو بس سکون سے اوتار سنگھ کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

لفظ محبت ایک اسی نام کے ساتھ تو جڑا تھا۔ لفظ اس لیے کہ محبت تو وہ کر کے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بس وہ بار بار یہی سوچتی کہ کاش ...... کاش وہ مسلمان ہوتا۔ لیکن لفظ کاش دنیا کا سب سے بے فیض لفظ ہے۔ اس سے معاملات درست کبھی نہیں ہوتے اور حسرت پکی ہو جاتی ہے۔

اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگی۔

تصویر تو وہ اوتار سنگھ کی ہی لگتی تھی۔ کہیں بال برابر بھی فرق نہیں تھا لیکن عقلی طور پر اس کا یہاں ہونا ممکن نہیں تھا۔ اوتار سنگھ تو دہلی میں تھا۔ تقسیم کے بعد وہ یہاں کیوں آتا۔ ہندو تو الٹا یہاں سے بھاگ رہے تھے۔ ایسے میں ہندو کا دہلی سے لاہور آنا خلاف عقل تھا۔

دوسری بات ...... اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ لاہور آ گیا تھا' تو اس کا یہاں ...... اس بازار میں ...... ہیرا منڈی میں کیا کام؟ یہ دوسری بات تو پہلی سے بھی زیادہ ناممکن تھی۔ اس نے اوتار سنگھ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ریٹا پارسن کے گھر ہونے والی پارٹی اسے یاد تھی۔ اسے ریٹا کی نظریں بھی یاد تھیں۔ وہ اوتار سنگھ کو پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اور پھر جس طرح' بالکل اچانک وہ انگلینڈ واپس گئی تھی' حالانکہ اس سے پہلے اس کا یہی کہنا تھا کہ وہ یہاں سے واپس نہیں جائے گی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اوتار سنگھ نے اسے مایوس کر دیا تھا۔

اوتار سنگھ عجیب آدمی تھا۔ اس میں تعصب کی بجائے وسیع النظری تھی۔ نفرت تو وہ کسی سے کرتا ہی نہیں تھا۔ شراب وہ نہیں پیتا تھا۔ کردار کی مضبوطی ایسی تھی کہ ایک نہایت آزاد خیال انگریز لڑکی بھی اسے ورغلا نہیں سکی۔ محمود کی موت پر کالج میں ہونے والے تعزیتی جلسہ اسے یاد تھا۔ اس روز اس نے اوتار سنگھ کا ایک نیا روپ دیکھا تھا۔

رام گوپال ہمیشہ کی طرح ہرزہ سرائی کر رہا تھا۔ شاید اس نے اوتار سنگھ کو کوئی طعنہ دیا تھا۔ جواب میں اوتار سنگھ نے جس جارحیت کا مظاہرہ کیا' اس نے سبھی کو حیران کر دیا۔ رام گوپال تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ اوتار سنگھ نے اس سے کہا تھا...... تم بزدل ہو رام گوپال اور مجھے فخر ہے کہ محمود جیسا بہادر آدمی میرا دوست تھا۔ میں تم جیسے تیس چالیس مسلح افراد سے اکیلا ہی نمٹ سکتا ہوں۔ یاد رکھنا رام گوپال' میں راجپوت ہوں اور بزدلوں سے دوستی نہیں رکھتا۔

وہ آخری موقع تھا کہ نادرہ نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔ کیونکہ کالج میں ہندوؤں کے تعصب کے اس مظاہرے کے بعد کہ رام گوپال نے محمود کے قتل کا بلاواسطہ اعتراف کر لیا تھا، اسے کالج جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ ڈر گئی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ یہی سب کچھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے

تو اس آخری دن اس نے دل میں سوچا تھا کہ اوتار سنگھ ایمان سے محروم ہے' لیکن اس میں ساری خوبیاں مومنوں والی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بیشتر مسلمانوں سے اچھا ہی تھا۔

لیکن وہ بہرحال مسلمان نہیں تھا!

نادرہ کبھی اوتار سنگھ کو نہیں بھلا سکی...... اس کی محبت کو دل سے نہیں نکال سکی۔ اور اسے کسی اور سے محبت نہیں ہوئی' شاید اس لیے کہ اسے موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن شاید موقع ملنے پر بھی وہ کسی سے محبت نہیں کر پاتی۔

اسے یاد تھا۔ ٹرین میں جب وہ لٹ رہی تھی تو اسے خیال آیا تھا کہ یہ لوگ اوتار سنگھ ہی کے تو ہم مذہب ہیں۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہونے والا ہے تو وہ اوتار سنگھ کی محبت سے کبھی نہ لڑتی۔ یوں کم از کم ایک سچی خوشی تو مل جاتی اسے۔

پھر لاہور میں وہ رشید کے ہاتھوں لٹی...... اور ایسی لٹی کہ ہر روز لٹنا اس کا مقدر ہو گیا۔ ہندوؤں سے کہیں زیادہ بڑی ذلت اسے مسلمان سے ملی تھی۔ اس کے بعد وہ اوتار سنگھ کی محبت پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئی۔ بلکہ ذلت بھرے اس ماحول میں وہی اس کے لیے نشانِ عزت ٹھہری۔ ...بھی کر دینے والے اس ماحول میں وہی تو ایک سچی خوشی تھی اس کے لیے۔

کوٹھے پر آنے کے بعد اس نے اپنے لیے ڈائری منگوائی تھی' اور وہ باقاعدگی سے ڈائری لکھتی رہی تھی۔ اور اس ڈائری میں اوتار سنگھ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک اچھی یاد کی طرح تھا' جیسے وہ ہر روز لکھ سکتی تھی۔ اور تو وہ کچھ یاد کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اوتار سنگھ؟ اور لاہور میں! یہ بھی تو ممکن ہے کہ تصویر بناتے ہوئے ارجمند سے نقوش کچھ تبدیل ہو گئے ہوں۔ آخر بچی ہی ہے وہ اور ہم شکل ہونا بھی ایسا ناممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ سچ مچ اوتار سنگھ ہی ہو۔ وہ ہر روز اللہ سے دعا کرتی تھی...... ایک نجات دہندہ بھیجنے کے لیے التجا کرتی تھی، جو اسے اور ارجمند کو ...... بلکہ صرف ارجمند کو یہاں سے نکال کر لے جائے۔ کیونکہ اب اس کے لیے بھری دنیا میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس پر غلاظت کی ایسی تہیں چڑھ چکی ہیں کہ اسے کبھی کوئی عزت نہیں دے گا۔

اور یہ سوچنے میں بڑی خوشی ...... بڑی لذت تھی کہ وہ اوتار سنگھ ہی تھا ...... اس کا محبوب' جسے اللہ نے اس کی دعاؤں کے جواب میں نجات دہندہ بنا کر بھیج دیا تھا۔

اگر وہ وہاں موجود ہوتی اور اسے دیکھ لیتی تو کیا ہوتا؟ اس نے سوچا۔

اسے احساس ہوا کہ اس کے سامنے امکانات کے کئی دروازے ہیں۔ سوچنا یہ تھا کہ اس کا فطری ردِعمل یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اسے پکارتی ...... جسم و جاں کی پوری قوت اور شدت سے آواز دیتی ...... اوتار سنگھ! آخر اس کے لیے ارجمند کے بعد روئے زمین پر اوتار سنگھ وہ واحد شناسا شخص

تھا' جو اس کے ماضی سے حال میں آ سکتا تھا اس کے نظر آنے پر اس کا فطری اور یقینی ردِعمل یہی ہو سکتا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا؟

یہ امکان بہت قوی تھا کہ اوتار سنگھ کے نام کی پکار بازار میں ہلچل مچا دیتی۔ سب دیکھتے کہ اشارہ کس طرف ہے۔ کون ہے وہ اوتار سنگھ اور شاید کوئی بھی نہیں سمجھتا کہ وہ پکار مدد کے لیے ہے۔ اس نام کے ساتھ سننے والے تو یہی سمجھتے کہ کوئی مظلوم کسی ظالم کی نشان دہی کر رہا ہے...... خاص طور پر اس صورت میں کہ پکارنے والی کوٹھے پر سے پکار رہی ہو۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ اوتار سنگھ کی تکا بوٹی ہو جاتی۔ ابھی تو ہندوؤں اور سکھوں کے لگائے ہوئے زخموں پر پہلے کھرنڈ سے پہلے کی جھلی بھی نہیں آئی تھی۔

دوسری بات یہ کہ اگر وہ کسی طرح اشارہ بھی کر دیتی تو اوتار سنگھ اوپر آ بھی جاتا تو وہ کیا کرتی۔ اور اوتار سنگھ بھی کیا کر سکتا تھا۔ وہ کوئی دعویٰ تو نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس بازار میں تو ورثا کا دعویٰ بھی سچا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر اوتار سنگھ تماش بین کی حیثیت میں آتا تو وہ اسے اپنی صورتِ حال کے بارے میں بتاتی۔ خود تو وہ اب یہاں سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو زندگی کی سرحد پار کرنے کی خواہاں تھی۔ بشرطیکہ ارجمند کو یہاں سے نجات مل جائے اور باہر کی دنیا میں اچھے مستقبل کی ضمانت بھی۔ لیکن اوتار سنگھ ارجمند کو یہاں سے کیسے نکال سکتا تھا۔ وہ بے چارہ تو یہاں خود بھی غیر محفوظ ہو گا۔ اور نیلم بائی بھلا ارجمند کو نکلنے دے گی۔

پہلی بار اسے احساس ہوا کہ خواب دیکھنا کتنا آسان ہے۔ اور تعبیر پانا کتنا دشوار ہے۔ وہ دعا کرتی رہی تھی کہ کوئی نجات دہندہ آئے اور ارجمند کا نکال کر لے جائے۔ یہ اس کا خواب تھا۔ مگر اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ اللہ کی خاص رحمت ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ بہ ظاہر ارجمند کی نجات کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

مایوسی دھیرے دھیرے اس کے وجود میں سرایت کرنے لگی۔ مگر یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ مایوسی کو وہ قبول کر لیتی تو زندہ نہ رہ پاتی۔ اس لیے مثبت انداز میں سوچنا اس کی مجبوری تھی۔

اس کا واحد آسرا اللہ تھا۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ اللہ نے ٹرین کے سفر سے لے کر آج تک کبھی اسے نہیں بچایا۔ کبھی اس کی مدد نہیں کی۔ مگر پھر وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر دل ہی دل میں توبہ کرتی۔ اللہ کی مرضی۔ اس کی مصلحت کون سمجھ سکتا ہے۔ اس میں کوئی بہتری ہو گی...... ہاں اسے نظر نہیں آ سکتی۔ تقدیر بھی کوئی چیز ہے۔ لیکن اللہ کی قدرت تو ایسی ہے کہ صرف کن فرمانے سے زمین آسمان جیسی تخلیقات وجود میں آ گئیں۔ جہاں کوئی راستہ نظر نہیں آتا باہر نکلنے کا' وہاں وہ جیسے چاہے راستہ بنا دے۔

اس نے مثبت انداز میں سوچنے کی کوشش کی۔ اگر وہ اوتار سنگھ ہی ہے تو یہ ناممکن نہیں کہ دوبارہ نظر نہ آئے۔ اب یہ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اسے پکار نہیں سکتی اس کے نام سے' ورنہ اسے نقصان پہنچے گا۔ تو اب اسے دیکھ کر اسے اپنے فطری اور یقینی ردِعمل کو قابو میں رکھنا ہو گا۔ اور اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوئی اور ترکیب سوچنی ہو گی۔

اسے احساس ہوا کہ اور کچھ نہیں تو زادِ سفر کے لیے اسے ایک اور خواب مل گیا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے ڈائری لکھنے کا خیال آ گیا تھا۔ ڈائری کا موضوع تو پہلے بھی اوتار سنگھ ہی تھا۔ مگر تب وہ قصۂ پارینہ تھا' اور اب ایک داستانِ تازہ!

❁ ❁ ❁

نور بانو اور زرینہ بکریوں کے شیڈز میں تھیں۔ مینو کی نازبرداریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے ناشتے کا آخری آئیٹم شروع ہو رہا تھا' جو اسے بہت پسند تھا۔ نور بانو نے ہتھیلی پر بادام کی گری رکھ کر اس کی طرف بڑھائی۔

مینو بے تابی سے بادام کی طرف تھوتھنی لایا۔ اس کی گرم سانسیں نور بانو کی ہتھیلی کو چھونے لگیں۔ مگر اسی لمحے ایک عجیب بات رُونما ہوئی۔ بادام سے منہ اٹھا کر مینو نے سر اٹھایا اور زور زور سے جیسے کچھ سونگھنے لگا۔

"ارے...... اسے کیا ہوا۔" زرینہ نے بے ساختہ کہا۔

نور بانو بھی حیران تھی۔ "لو مینو...... یہ کھاؤ نا۔"

مگر مینو کا ردِعمل اس بار عجیب تر تھا۔ وہ پلٹا اور اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے میں وہ شیڈ سے باہر تھا' اور پوری رفتار سے ایک طرف دوڑا جا رہا تھا۔

زرینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے نور بانو کو دیکھا۔ "اسے کیا ہو گیا؟"

نور بانو کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ "شاید میں سمجھ گئی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

نور بانو کے تاثرات کی وہ تبدیلی بھی زرینہ کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے اچانک کیا ہو گیا ہے۔ مگر اس نے یہ بات پوچھی نہیں۔ "مجھے بھی بتائیں۔" اس نے کہا۔

"ہو سکتا ہے' میرا اندازہ غلط ہو۔ لیکن...... لیکن میرا خیال ہے کہ وہ واپس آ گئے ہیں۔ مینو اس طرح سب کچھ چھوڑ کر کسی کے لیے بھاگ ہی نہیں سکتا۔"

ایک لمحے تو زرینہ کچھ بھی نہیں سمجھی۔ پھر اچانک بات سمجھ میں آ گئی۔ لفظ 'وہ' اس پر روشن ہو گیا۔

"مگر اس کی بے وفائی تو دیکھو۔ اتنے عرصے ہم اس کی ناز برداری کرتے رہے' اور یہ بھی ایسا ہتا رہا جیسے دنیا میں ہم سے زیادہ کسی کو چاہتا ہی نہیں۔ لیکن اب وہ آ گئے تو تُو کون اور میں کون۔"

نور بانو کے لفظوں میں تو شکایت تھی' لیکن لہجے میں خوشی اور فخر۔ زرینہ کو ہنسی آ گئی۔ وہ بہت تیزی سے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت وہاں رکنا کباب میں ہڈی بننے کے مترادف تھا۔ نور بانو کو بھائی سے بات کرنے کا موقع دینا بہت ضروری تھا۔ یہ ضروری تھا کہ سب سے پہلے وہی بھائی سے ملے۔

"میں جاتی ہوں اماں کو خوش خبری سنانے۔" اس نے کہا اور نور بانو کے جواب کا انتظار کیے بغیر بھاگ کھڑی ہوئی۔

نور بانو کھڑی ہو گئی' اور چند لمحے سوچتی رہی۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس کا حق تھا کہ وہ عبدالحق کا خیر مقدم کرے۔ یہی نہیں' اسے اس سے بڑی سنگین شکایت تھی۔

شیڈ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سوچا کہ ضروری تو نہیں کہ اس کا اندازہ درست ہو' اور عبدالحق ہی آئے ہوں کوئی اور بات بھی تو ہو سکتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ آس لگا بیٹھی۔

مگر شیڈ سے نکلتے ہوئے خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے تھی!

تھوڑے ہی فاصلے پر عبدالحق تھا۔ اس کے کندھے سے ایک بیگ لٹکا ہوا تھا' اور دونوں ہاتھوں میں دو سوٹ کیس تھے۔ اور مینو نے اس کا قدم بڑھانا دوبھر کر رکھا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے جسم سے سر رگڑنا چاہ رہا تھا۔ مگر اسے جگہ نہیں مل رہی تھی' کیونکہ دونوں جانب سوٹ کیس تھے۔ اور سامنے آ کر ٹانگوں سے سر رگڑنے کا شوق پورا کرتے ہوئے وہ عبدالحق کے بڑھنے میں مزاحمت کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ زور زور سے میں میں کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ کبھی کبھی تو آواز میں رونے کا تاثر آ جاتا تھا۔

نور بانو تیزی سے اس طرف لپکی۔ مینو کی حرکتوں میں الجھے ہوئے عبدالحق نے ابھی اسے دیکھا نہیں تھا۔

"رک جائیے...... نیچے رکھ دیجیے یہ سامان۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

عبدالحق ٹھٹک گیا۔ اس نے رک کر اسے دیکھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسے براہ راست نظر بھر کر دیکھ رہا تھا۔ اور چاہنے کے باوجود وہ نظر نہیں ہٹا سکا۔ پھر اسے یقین نہیں تھا کہ یہ وہی ہے۔

بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ طلسم ٹوٹا۔ لیکن مینو کی میں میں اس دوران بھی جاری تھی۔ "آپ...... آپ منجھلی بی بی ہیں نا؟"

نور بانو نے ملامتی نظروں سے اسے دیکھا اور تیز لہجے میں بولی۔ "میں نور بانو ہوں اور کئی برس سے آپ کے گھر میں رہ رہی ہوں۔ اب اتنے دن گھر سے دور رہنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ

[گھ]ر کے لوگوں کو پہچان نہ سکیں۔"

عبدالحق سن ہو کر رہ گیا۔ وہ اسے باقاعدہ ڈانٹ رہی تھی۔ مگر اس ڈانٹ میں بڑی اپنائیت [تھی] اور اس نے اسے اتنا بولتے بھی کبھی نہیں سنا تھا۔ "جی...... وہ میں...... دراصل مینو......" وہ [بُری] طرح گڑبڑا گیا۔

مینو کو اب موقع مل گیا تھا اور وہ اس کی ٹانگوں سے سر رگڑ رہا تھا۔

نور بانو نے مینو کا کان پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ "ہٹ جاؤ مینو۔"

مگر مینو نے ایک جھٹکے میں خود کو چھڑا لیا۔ اب وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

نور بانو کھسیا گئی۔ اب تو یہ اسے پہچان ہی نہیں رہا تھا۔ عبدالحق ہاتھ سے مینو کو سہلا رہا تھا۔

"اور یہ سامان اٹھا کر آپ پیدل چلے آ رہے ہیں۔" نور بانو نے اسے پھر ڈانٹا۔

عبدالحق نے نظریں اٹھا کر اسے ایک پل دیکھا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ ارے...... یہ تو [غ]صہ ور ہو گئی ہیں۔ بات بات پر ڈانٹ رہی ہیں۔ شاید اندر کی جھنجلاہٹ کی وجہ سے...... اور [ا]ب میں ناکامی کی خبر سناؤں گا تو...... تو کیا ہو گا۔ شاید کھا ہی جائیں گی مجھے......

"بتائیے نا پیدل آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"میں بیل گاڑی میں تھا۔ مینو کی وجہ سے اترنا پڑا۔ یہ پاگل ہو رہا تھا۔ گاڑی کے نیچے بھی [گھس]تا تھا۔" عبدالحق نے وضاحت پیش کی۔ نور بانو نے غصے سے مینو کو دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ وہ [ا]س خاطر میں لا ہی نہیں رہا تھا۔ اور توہین کرانے کا کیا فائدہ۔ محبوب کی جدائی میں ایک دوسرے کی غم [گس]اری کرنے والے آخر تھے تو رقیب ہی۔ محبوب کے واپس آنے پر تو رقابت ہی ہو گی۔

"جانتے ہیں میں یہاں کیوں آئی ہوں؟"

عبدالحق اس پر تو حیران ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے آپ سے لڑنا ہے۔ آپ بہت برے ہیں۔"

عبدالحق کا جھکا ہوا سر اور جھک گیا۔ "جی...... مجھے معلوم ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ وجہ نہیں پوچھیں گے۔ پتا ہے' آپ کے جانے کے بعد اماں مجھ سے کتنا خفا رہیں۔ [ک]بھی نہیں بتاتی تھیں۔ پھر ایک دن پتا چلا کہ آپ نے لاہور جانے سے پہلے کہا تھا کہ آپ میری [وج]ہ سے جا رہے ہیں۔ اور جب تک چچا جان نہیں مل جاتے' واپس نہیں آئیں گے۔ اماں سوچتی تھی [ک]ہ چچا جان کا ملنا ممکن ہی نہیں' اور آپ وعدہ کے مطابق واپس نہیں آئیں گے۔ کتنا شرمندہ کرایا [آ]پ نے مجھے۔"

"مگر یہ تو سچ ہے۔ میں آپ ہی کے لیے لاہور گیا تھا۔ میں تو خود شرمندہ تھا اور ہوں......"

"لیکن میں نے تو آپ سے نہیں کہا تھا کہ لاہور جا کر چچا جان کو ڈھونڈیں۔"

عبدالحق کو وہ منظر اچھی طرح یاد تھا۔ ''مجھے یاد ہے اس دن آپ نے مجھے روک کر کہا تھا کہ آپ کو ایک بہت اہم اور ضروری بات کرنی ہے مجھ سے اور آپ نے کہا تھا کہ یہ بات تو آپ کو بہت پہلے کرنی چاہیے تھی لیکن میری مصروفیت کی وجہ سے نہیں کر سکیں۔ کہا تھا نا آپ نے۔ اور آپ مجھے یہی یاد دلانا چاہ رہی تھیں نا کہ آپ کے چچا جان کو تلاش کر کے آپ کو ان کے سپرد کرنا میری ذمے داری ہے۔ میں تو پہلے ہی اپنی کوتاہی اور وعدہ خلافی پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ تو میں چلا گیا۔۔۔۔''

نور بانو بھی وہ دن کیسے بھول سکتی تھی۔ عبدالحق نے اسے بات پوری کرنے ہی نہیں دی۔ بس اس نے کہا۔۔۔۔ اب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں اب آپ کا کام کر کے ہی واپس آؤں گا۔ تو یہ تھا وہ کام۔ جبکہ وہ اس سے اس کی باپ کی کتابوں اور ڈائری کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی، اسے سونپ دینا چاہتی تھی۔

''آپ کیسے آدمی ہیں اپنے ہی گمان میں رہتے ہیں۔ کسی کی کسی بات سے جو نتیجہ چاہیں، اخذ کر لیں۔'' وہ اس پر برس پڑی۔ ''میں اس روز آپ سے یہ بات کر ہی نہیں رہی تھی۔ مجھے تو چچا جان یاد بھی نہیں تھے۔ میں انہیں تلاش کرنے کا کیوں کہتی آپ سے۔''

''آپ ہمارے پاس خود کو محفوظ نہیں سمجھتی تھیں۔۔۔۔''

''وہ وہاں کی بات تھی۔۔۔۔ دلی کی۔ یہاں آپ نے کب مجھے ناخوش دیکھا، کب سہا ہوا دیکھا۔ مگر آپ تو آنکھیں بند کر کے اپنے گمان میں جیتے ہیں۔ ورنہ دیکھ لیتے کہ میں یہاں کتنی خوش ہوں۔۔۔۔''

عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ واقعی یہ تو سچ تھا۔ نور بانو تو یہاں گھل مل گئی تھی۔ ارے۔۔۔۔ وہ تو تہ خانے میں بھی ان کے ساتھ گئی تھی۔ یہ سوچ کر اس کے دل کا بوجھ کم ہونے لگا۔ اب نور بانو کو اتنا صدمہ تو نہیں ہوگا چچا کے نہ ملنے کا۔

اُدھر نور بانو اپنی کہے جا رہی تھی۔ ''آپ کچھ دیکھتے ہی نہیں۔ جب تک کوئی بات منہ سے نہ کہی جائے، سمجھیں گے ہی نہیں۔ بلکہ مجھے تو شک ہے کہ سننے کے بعد بھی نہیں سمجھیں گے۔ غور سے سن لیں کہ میں۔۔۔۔''

عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا اس نے یہ بات سنی نہیں تھی۔

''۔۔۔۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔۔۔۔''

اس وقت زبیر کی پکار سنائی دی۔ ''ارے صاحب۔۔۔۔ آ گئے۔'' وہ اس کی طرف دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔

''۔۔۔۔ اور یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتی۔'' نور بانو نے اپنی بات مکمل کی۔

مگر عبدالحق نے نہیں سنا۔ وہ زبیر کی طرف متوجہ تھا، جو ان تک آ پہنچا تھا۔

''لائیے۔۔۔۔ سامان مجھے دیجیے۔''

بحث سے بچنے کے لیے عبدالحق نے جلدی سے دونوں سوٹ کیس اسے دے دیے۔ اب یہ میتو سے نمٹنا تھا۔

نور بانو مطمئن ہو گئی۔ اب اس سے بڑھ کر اظہار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس نے قدم ہلکے کیے اور گھر میں جانے کی بجائے شیڈ میں چلی گئی۔ اپنی جرأت پر اسے خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ خیال بھی تھا کہ زبیر نے اسے عبدالحق سے باتیں کرتے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ دیر تک گھر میں جو لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ عبدالحق نے اصل بات اب بھی نہیں سنی!

❁ ❁ ❁

عبدالحق کی واپسی پر اپنی بے پناہ خوشی خود حمیدہ کے لیے بھی حیران کن تھی!

نہ تو اس نے عبدالحق کو جانے سے روکا تھا اور نہ ہی اس کی غیر موجودگی کے دن شمار کیے تھے۔ وہ اسے خاص طور پر یاد بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ ہر وقت اسے یاد کرتا رہتا تھا۔ کچھ یہ تھا کہ اللہ نے اسے بنایا ہی ایسا تھا۔ صبر کی نعمت اسے کثیر ملی تھی۔ اور کیوں نہ ملتی۔ جب اللہ کسی کو آزمائش سے دوچار کرتا ہے تو اس سے پہلے ہی اس کے مطابق اسے صبر و برداشت عطا کر دیتا ہے۔ لال آندھی کے بعد وہ جس دور سے گزری تھی، اس نے اس کے ایمان کو پختہ کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس پر اللہ کی عنایت ہے۔ ورنہ کوئی اتنا اکیلا اس طرح جی نہیں سکتا۔ اس نے تو اپنی اندھی آنکھوں سے معجزے دیکھتے تھے۔ عبدالحق کا اس کے پاس واپس آنا تو سب سے بڑا معجزہ تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ تڑپنے اور واویلا کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر کسی کو ملنا ہے تو وہ ضرور ملے گا۔ اور اگر نہیں ملنا تو کسی طرح بھی نہیں ملے گا۔

اور اس سے پہلے کی زندگی میں بھی کیا تھا۔ اس نے تو ہر موسم سے بڑھ کر ہجر کا موسم ہی دیکھا تھا۔ بیٹے کی تعلیم کے لیے دلی گئے تھے۔ سال بھر بعد چھٹیوں میں گھر واپس آئے تھے۔۔۔۔ اور وہ بھی پھر چلے جانے کے لیے۔ اور پھر وصال وہیں چلا گیا تھا۔۔۔۔ وہ بھی واپس نہ آنے کے لیے۔

عبدالحق اس کے سامنے آیا تو بے ساختہ اسے لپٹا لیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے دل میں اتار کر چھپا لے۔ کہیں جانے نہ دے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اسے علیحدہ کر دیا۔ ''اب تو واپس آ گیا ہے نا پتر؟'' اس نے اس سے پوچھا۔

عبدالحق اتنی جلدی دور کیے جانے پر زخمی ہوا تھا اور حیران بھی۔ ''جی اماں۔''

''اب تو کہیں نہیں جانا ہے نا؟''

''ہو سکتا ہے، جانا ہو اماں۔ لیکن تمہارے بغیر نہیں۔''

''بس تو پھر کیا ہے۔ وقت اپنا ہی ہے نا۔'' حمیدہ نے بے فکری سے کہا۔ ''تو جا۔۔۔۔ نہا دھو کر

کپڑے بدل۔ آرام سے مردانے میں بیٹھ۔ سب لوگ تیرا انتظار کرتے رہے ہیں۔ تجھ سے ملنے آئیں گے۔ کچھ تھکن بھی اتر جائے گی۔"

"لیکن اماں، ابھی تو میں آپ کی گود میں لیٹنا چاہتا ہوں۔ اتنے دن کے بعد تو ملی ہیں آپ......"

"اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ رات کو سکون سے آنا میرے پاس۔ مجھے بھی باتیں کرنی ہیں تجھ سے۔ مگر پہلے دوسروں کے حق ادا کر دے۔ تُو صرف میرا ہی تو نہیں، سبھی کا ہے نا۔"

عبدالحق کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن اماں کی بات ٹالنا بھی ممکن نہیں تھا۔

اماں کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس سے ملنے کے لیے لوگ آئیں گے...... کتنے لوگ۔ اس کا واپس آنا ایسی کون سی خاص بات ہے۔ اسے واپس تو آنا ہی تھا۔

وہ نہا دھو کر، تازہ دم ہو کر نکلا تو زبیر موجود تھا۔ "صاحب، اب آپ لیٹ جائیں تھوڑی دیر۔ آرام کر لیں۔"

"میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا ہوں زبیر بھائی۔"

مگر اس وقت اماں کی بات سچی ہو گئی۔ چاچا رحیم بخش اس سے ملنے آئے تھے۔ زبیر اسے بتا چکا تھا کہ رحیم داد کو سرپنچ بنا دیا گیا ہے۔ وہ اس سے، ملنے مردانے میں چلا گیا۔ اس کے بعد مغرب تک اسے وہاں سے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مردانہ پورے دن بھرا رہا۔

اس سے پہلے عبدالحق کو اندازہ ضرور تھا کہ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں لیکن جو محبت اس کے سامنے آئی، وہ اس کے تصور سے بھی بہت بڑھ کر تھی...... شاید ہی کوئی، شخص ایسا ہو، جو اس سے ملنے نہ آیا ہو۔ اور کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اور سب ہی اسے صاحب کہہ رہے تھے...... کیا چھوٹا کیا بڑا۔ اسے زبیر پر غصے آنے لگا۔

ملنے آنے والوں میں ڈاکٹر واسطی واحد آدمی تھے، جنہوں نے صاحب کہنے کی بجائے عبدالحق صاحب کہا تھا۔

عبدالحق کو اطمینان ہو گیا۔ زبیر نے اس کے مشورے پر پوری طرح عمل کیا تھا، اور علاقے کے معاملات اس کے پتا جی کے انداز سے سنبھالے تھے۔ تبھی تو لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ لوگوں کے نزدیک اس کے بعد سب سے معزز زبیر ہی ہے۔ یہ واقعی زبیر کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زبیر پہلے کے مقابلے میں بہت پُر اعتماد نظر آ رہا تھا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے ہی اس کا مسئلہ حل کیا۔ "ارے بھئی، کیسی محبت کرتے ہو تم لوگ اپنے صاحب سے۔" انہوں نے کمرے میں موجود لوگوں سے کہا۔ "سفر کی تکان اتارنے کا موقع بھی نہیں دے رہے ہو انہیں۔ ایسے موقع پر تو بس پانچ منٹ بیٹھ کر اٹھ جاتے ہیں لوگ۔ اور ہاں، کل

صاحب کو پنچایت میں بلا لو نا۔"

اس کے نتیجے میں لوگ رخصت ہونے لگے۔ پھر ڈاکٹر صاحب بھی اٹھے۔ "یہ تو میں رسما آیا تھا عبدالحق صاحب۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن آپ سے ایک ضرورت بھی آ پڑی ہے مجھے۔ دو تین دن میں حاضر ہوں گا آپ کے پاس سوالی بن کر۔"

عبدالحق تو تڑپ گیا۔ "تکلف کیسا ڈاکٹر صاحب۔ ابھی حکم کریں نا۔"

"نہیں عبدالحق صاحب۔ یہ تکلف کی بات نہیں، آداب کی ہے۔ ضرورت مند بن کر آؤں گا تو ضرورت کی بات کروں گا۔"

عبدالحق کا ذہن الجھنے لگا لیکن ڈاکٹر صاحب نے مزید بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ادھر نماز کا وقت بھی ہو گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو شیڈ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکی۔ حالانکہ مینو کی بے وفائی کے بعد وہ اپنی بکریوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ مینو کی خاطر اس نے اپنی بکریوں سے بے وفائی کی تھی۔ اب وہ اس کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔

لیکن شیڈ میں ایک بھولی بسری یاد نے اسے تڑپا دیا۔

یہ اُس وقت کی بات ہے، جب اوتار سنگھ کے لیے باجی کی محبت اس پر پوری طرح کھل گئی تھی۔ بلکہ ایک دن باجی نے بڑے فخر سے اسے لے جا کر دکھایا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر کسی سے عربی پڑھ رہا ہے۔ اور پھر پڑھانے والے نے یٰسین شریف کی تلاوت بھی کی تھی۔

یہ اس کے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے کہ ایک دن اب کی رابعہ اور اس وقت کی رنجنا اماں کے پاس ایک فرمائش لے کر آئی تھی...... کھانا پکا کر بھیجنے کی فرمائش۔ چھوٹے ٹھاکر کا کوئی مسلمان دوست آ رہا تھا، وہ اس کے لیے کھانا پکوانا چاہ رہا تھا۔ جس وقت وہ بات ہوئی، وہ اماں کے پاس ہی تھی۔ اماں نے تو بڑی خوشی سے وعدہ کر لیا تھا۔ بلکہ انہوں نے اس سے ہاتھ بٹانے کو بھی کہا تھا۔ مگر اس نے روایتی نخوت کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ اماں کو بھی اس سے امید نہیں تھی۔

مگر اگلی صبح اسے باجی کو باورچی خانے میں دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ باجی کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر تلاوت کر کے وہ آرام ضرور کرتی تھیں اور کھانا پکانے میں بالکل دلچسپی تھی ہی نہیں۔ اماں کے اصرار کے باوجود وہ پکانے سے جی چراتی تھیں۔ مگر اس وقت وہ نہ صرف باورچی خانے میں موجود تھیں، بلکہ اصرار کر رہی تھیں کہ کھانا وہی پکائیں گی۔ اماں نے کہا بھی آج زیادہ چیزیں ہیں، پھر کسی دن پکا لینا۔ لیکن باجی نے کہا یہ اور بھی اچھا ہے، ایک ہی دن میں وہ اتنا کچھ سیکھ لیں گی۔

نور بانو کو حیرت ہوئی تھی۔ جس وقت رنجنا فرمائش لے کر آئی تھی' باجی بہ ظاہر تو کہیں قریب نہیں تھی لیکن یہ طے تھا کہ انہوں نے یہ بات سن لی تھی۔ اسی لیے وہ کھانا پکانے میں گھس رہی تھیں۔

نور بانو کو بہت غصہ آیا۔ جی تو چاہا کہ انہیں باتیں سنائے لیکن بدنیتی کے تحت خاموش رہی۔ اس سے بہتر سزا اور کیا ہوتی کہ چھوٹے ٹھاکر اور اس کے دوست کو باجی کا پکایا ہوا تجرباتی کھانا نصیب ہوتا۔ سو وہ اس میں خوش ہوگی

لیکن جب اس نے کھانا کھایا تو حیران بھی ہوئی اور مایوس بھی۔ باجی نے ہر چیز بہت لذیذ بنائی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تا کہ وہ کسی کی پہلی بار پکائی ہوئی چیز ہو سکتی ہے۔ شاید وہ محبت کا کمال تھا۔

پھر جب رنجنا نے نیچے آ کر بتایا چھوٹے ٹھاکر کو کھانا اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے رات بھی وہی کچھ کھایا...... تازہ کھانے کی بجائے ...... اور انہوں نے بہت شکریہ ادا کیا ہے تو اسے اور اذیت ہوئی۔ اس لمحے باجی اسے بہت بری لگی تھیں۔

اور اب اسے یہ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ یہاں آنے کے بعد آج تک وہ چیزیں پکانے کا خیال کیوں نہیں آیا' جبکہ اسے معلوم تھا کہ عبدالحق کو وہ کھانا اچھا لگا تھا۔

اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ وہ شروع ہی سے ایسی ٹیڑھی ہے۔ ساری خرابی یہ ہے کہ اس کے لیے کائنات کا مرکز محض اپنی ذات ہے۔ وہ صرف اپنے لیے سوچتی ہے۔ اپنی خوشی میں خوش اور اپنے دکھ میں دکھی۔ کسی اور کی خوشی اور دکھ کا خیال ہی اسے نہیں آتا۔ اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ ایسا آدمی کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ اسے تو خوشی ملے گی بھی تو شاید اسے گنوا دے گی۔

لیکن نہیں...... اب وہ خود کو بدل بھی سکتی ہے۔ اور وقت آ گیا ہے کہ وہ خود کو بدل لے۔ اب نہیں بدلا تو شاید آئندہ موقع نہیں ملے گا۔ اس خیال نے اسے ڈرا دیا۔ لیکن پھر اسے اماں سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آیا...... اس نے کہا تھا...... میرے اندر کی ساری خرابیاں میری بے اعتمادی اور بے یقینی کی وجہ سے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ خوف ہے کہ وہ مجھے کبھی نہیں ملیں گے۔ اس لیے کہ وہ بہت اچھے ہیں۔ اور میں بہت بری ہوں۔ میں ان کے قابل ہوں ہی نہیں۔ لیکن اللہ کی مہربانی سے وہ مجھے مل جائیں گے تو میں بالکل بدل جاؤں گی۔

حیرت ہے...... یہ میں نے کہا۔ اس نے سوچا۔ میں اتنا کھل کر بھی بات کر سکتی ہوں۔ اس کا تو مطلب ہے کہ میں بدل رہی ہوں۔ تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

اس لمحے اس نے خود سے ایک عہد کر لیا...... وہ اب اپنے بارے میں نہیں' دوسروں کے...... اور خاص طور پر عبدالحق کے بارے میں سوچا کرے گی۔ وہ دوسروں کی خوشیوں اور ان کے دکھوں کے بارے میں سوچا کرے گی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ جلدی سے اٹھی اور شیڈ سے نکل آئی۔ وقت ضائع کرنے کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔ اسے

رات کے کھانے کی...... خاص الخاص کھانے کے اہتمام کی فکر کرنی تھی۔ اور وہ سب کچھ خود ہی کرے گی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو اس بات پر حیرت تھی کہ مینو تقریباً تمام وقت بیٹھک میں اس کے پاس بیٹھا رہا تھا' لیکن اس نے وہاں کوئی گندگی نہیں کی تھی۔ وہ اس کے قدموں میں بیٹھا رہا تھا۔ کبھی اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے وہ اس کا پاؤں چاٹ لیتا۔ اور اس نے جب بھی سر جھکا کر دیکھا تو مینو کو اپنی ہی طرف دیکھتے پایا۔ کیا جانور اتنے سمجھدار بھی ہوتے ہیں؟

سب لوگوں کے جانے کے بعد عبدالحق اٹھا۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ ''چلو مینو...... گھر چلیں۔'' اس نے مینو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

مینو نے مَیں مَیں کر کے باقاعدہ جواب دیا۔

وہ شیڈ کی طرف چل دیا۔ مینو اس کے پیچھے نہیں' بلکہ ساتھ ساتھ تھا۔ کبھی تو وہ اس سے آگے بھی نکل جاتا' جیسے جانتا ہو کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ مگر وہ فوراً پلٹ بھی آتا تھا۔

شیڈ میں پہنچ کر عبدالحق اسے باندھنے لگا تو مینو نے باقاعدہ مزاحمت کی

''بس...... کھلے رہنے کا وقت ختم۔ اب تمہیں سونا ہے۔'' عبدالحق نے محبت بھرے لہجے میں ڈانٹا۔

مینو نے سر جھکا لیا اور بہت کمزور سی آواز میں ممیانے لگا۔

اس کی آواز کی کمزوری سے عبدالحق کو خیال آیا اور اس نے مینو کے پچکے ہوئے پیٹ کو دیکھا۔ اپنی غفلت اور بے پروائی پر اسے شدید غصہ آیا۔ معصوم جانور تمام وقت اس کے قدموں میں بیٹھا رہا' اور اس نے سوچا تک نہیں کہ وہ بھوکا ہوگا۔ شاید صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔

اس نے شیڈ کا جائزہ لیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا' جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ کترے کی مشین کے پاس چارے کا ڈھیر تھا۔ وہیں بادام اور اخروٹ کی تھیلیاں بھی موجود تھیں۔

اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہو گئی۔ عبدالحق جلدی سے چارہ لے کر آیا' کھلی ملائی اور چارے کا برتن مینو کے سامنے کر دیا۔

لیکن مینو نے منہ پھیر لیا۔

''اوہو' میرے ہاتھ سے کھانا ہے۔ لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔ کھالو۔'' عبدالحق نے زبردستی اس کا منہ برتن کی طرف دھکیلا۔ مگر مینو کھانے پر آمادہ نہیں تھا۔

''ابھی تم خود کھالو۔ نماز پڑھ آؤں۔ پھر تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔ ''میرے آنے تک یہ سب کھا لینا۔'' اس نے پھر مینو کو ڈانٹا لیکن اس بار مینو کی مَیں مَیں میں واضح انکار تھا۔

اس وقت کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ عبدالحق شیڈ سے نکلا اور مسجد کی طرف چل دیا۔

لیکن نماز کے دوران بھی اسے یہی خیال ستا رہا تھا کہ مینو نے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔

نماز کے بعد وہ مولوی مہر علی سے ملا۔ ''تم کب آئے پتر؟'' انہوں نے پوچھا۔

''آج ہی آیا ہوں حضرت۔''

''مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ ورنہ میں تم سے ملنے ضرور آتا۔''

''مگر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ کبھی ایسا نہ کیجئے گا۔ آپ سے ملنے کے لیے آنا میرا فرض ہے۔''

''اور سناؤ لاہور کیسا رہا۔ تمہارا کام ہوا۔''

''ہوا بھی اور نہیں بھی ہوا۔ میں نے وہاں بہت کچھ دیکھا مولوی صاحب۔ بہت الجھنیں لے کر آیا ہوں میں وہاں سے۔ آپ سے بہت باتیں کرنی ہیں مجھے۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔''

مولوی صاحب نے پُرتشویش نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تو پتر' میں حاضر ہوں۔ ہلکا کر دو دل کا بوجھ۔''

''اس وقت نہیں مولوی صاحب۔'' عبدالحق نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ ''فرصت میں آؤں گا آپ کے پاس۔'' پھر اس نے انہیں مینو کے بارے میں بتایا۔

مولوی صاحب ہنسنے لگے۔ ''اب سمجھ میں آیا کیسی ہوتی ہے محبت۔ جاؤ پتر جاؤ' صبح بات کریں گے۔''

عبدالحق بہت تیز قدموں سے شیڈ کی طرف گیا۔ اس کا بس چلتا تو اُڑ کر وہاں پہنچ جاتا۔

شیڈ کا منظر اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ مینو نے چارے کو منہ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سنی تو سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ ''بہت ضدی ہو یار۔ ہاتھ سے ہی کھاؤ گے۔''

عبدالحق نے ہتھیلی پر چارہ ڈال کر مینو کی طرف بڑھایا۔ مینو نے ایک گہری سانس کی پھونک سے اسے اُڑا دیا۔ وہ گویا اس کا اظہار ناراضگی تھا۔

''اوہو...... خفا ہو۔ تو پہلے منانا پڑے گا۔'' عبدالحق نے کہا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ چند لمحوں میں اسے احساس ہوا کہ مینو کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہوگیا ہے۔ اس نے مینو کی تھوتھنی کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ''اب مان بھی جاؤ یار۔''

اور مینو اس کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ وہ گویا قبولیت کا اظہار تھا۔

اب عبدالحق اسے کھلا رہا تھا اور مینو کھا رہا تھا۔ ''یہ بتاؤ' اتنے دن تمہارا گزارا کیسے ہوا میرے بغیر؟'' پھر اسے یاد آیا' زبیر نے بتایا تھا کہ مینو نجانے کیسے منجھلی بی بی سے مانوس ہو گیا تھا۔ اور سارے لاڈ اسی سے کرنے لگا تھا۔

''ہوں...... تو نور بی بی سے دوستی کر لی تھی۔ بڑے خوش نصیب ہو یار۔''

مینو نے جیسے مَیں مَیں کر کے تائید کی۔

''تو اب میرے ہاتھ سے کھانے میں کیا مزہ آ رہا ہوگا تمہیں۔''

جواب میں مینو نے اس کے سینے پر ہلکی سی ٹکر رسید کر دی۔

''اچھا چلو...... اب بادام اور اخروٹ بھی کھا لو۔''

❁ ❁ ❁

''ارے' کھانے کا وقت ہوگیا۔ یہ عبدالحق نہیں آیا ابھی تک۔'' حمیدہ نے کہا۔ وہ بے قرار ہو کر کمرے سے نکل آئی تھی۔ ''رابعہ...... زبیر کو مسجد بھیج۔ وہ مولوی صاحب کے پاس بیٹھا ہوگا۔''

''نہیں اماں۔ وہ بتا رہے تھے کہ صاحب نماز پڑھتے ہی مسجد سے چلے گئے تھے۔'' رابعہ نے کہا۔

باورچی خانے میں موجود نور بانو بھی سن رہی تھی۔ یہ اس کے لیے خلاف توقع بھی نہیں تھا۔ عبدالحق جیسا کوئی اتنے عرصے کے بعد واپس آئے تو ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔ سہ پہر میں اس سے ملنے والوں کا سلسلہ وہ دیکھ چکی تھی۔ اسی لیے اس نے پلاؤ کو ٹھنڈا ہونے سے بچانے کے لیے یخنی تیار کر کے رکھ لی تھی مگر پلاؤ چڑھایا نہیں تھا۔ ذرا سی دیر ہو جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مگر پلاؤ ٹھنڈا ہو کے بے مزہ نہ ہو۔

زرینہ باورچی خانے میں ہی تھی۔ اس نے کیا تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن نور بانو کو کھانے پکاتے ہوئے بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی۔ حمیدہ اور رابعہ کی گفتگو سن کر جو اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ وہ نور بانو نے بھی دیکھ لی تھی۔

پھر زرینہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

نور بانو کے دل کو کچھ ہوگیا۔ چند لمحے تو وہ سوچتی رہی۔ پھر باورچی خانے سے نکل آئی۔ اپنے کمرے سے اس نے چادر لی اور خاموشی سے گھر سے نکل آئی۔ کچھ فاصلے پر زرینہ اسے جاتی دکھائی دی۔ اس کا رخ شیڈ کی طرف تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔

❁ ❁ ❁

وہ دونوں...... ایک انسان اور دوسرا جانور...... ایک دوسرے سے یوں ٹوٹ کر ملے تھے' جیسے برسوں کے بچھڑے محبت کرنے والے ملتے ہیں۔ مینو کا پیٹ بھر چکا تھا۔ مگر وہ عبدالحق کا ہاتھ چاٹے جا رہا تھا۔ عبدالحق جب اٹھنے لگتا' تو وہ زوردار آواز میں مَیں مَیں کرنے لگتا۔ اور اس کے بیٹھتے ہی چپ ہو جاتا۔ مطلب صاف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عبدالحق ابھی اس کے پاس سے اٹھے۔

عبدالحق کو بھوک لگ رہی تھی۔ مگر وہ وہاں بیٹھا رہا۔ یہ مینو کا اس پر حق تھا۔ اس نے پورے دن مینو کو بھوکا رکھا تھا...... اس کی بھوک کی فکر نہیں کی تھی' تو اب اسے خود بھی ہنسی خوشی بھوک

برداشت کرنی چاہیے تھی۔

اسی عالم میں جانے کتنی دیر ہوگئی۔ مینو اب اونگھنے لگا تھا۔ دروازے کے طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی تو عبدالحق نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا شیڈ کے دروازے میں ایک ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔ "کون؟" اس نے پکارا۔

"میں ہوں بھائی۔"

پہلے تو عبدالحق کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا۔ یہ کون لڑکی ہے جو اسے اتنی اپنائیت سے بھائی کہہ رہی ہے۔ وہ الجھتا رہا۔ پھر جب بات سمجھ میں آئی تو وہ شرمندگی سے پانی پانی ہوگیا۔ یہ مینو والی شرمندگی سے بھی بڑی تھی۔ ارے...... وہ اس لڑکی کو بھول گیا' جیسے اس نے پوری ذمہ داری کے ساتھ یہاں بھیجا تھا۔ ارے اس نے تو یہاں آ کر پوچھا بھی نہیں......

"آؤ...... اندر آ جاؤ زرینہ۔" بالآخر اس نے اسے پکارا۔ لہجے میں شرمندگی تھی۔

زرینہ اندر چلی آئی۔ "بھائی...... وہ میں......"

"میں جانتا ہوں' تمہاری شکایت بجی ہے......"

"نہیں بھائی مجھے کوئی شکایت نہیں۔" زرینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "شکایت کیسی' یہاں مجھے اتنے سارے لوگ ملے۔ سب مجھ سے محبت کرتے ہیں...... میری عزت کرتے ہیں سب آپ کی وجہ سے پر بھائی' آج مجھے ڈر لگ رہا ہے یہاں۔"

"بھائی کے ہوتے ہوئے ڈر کیسا؟"

"مجھے لگتا ہے' کہ آپ شرمندہ ہو رہے ہیں مجھے بہن بنا کر۔ میں ہوں ہی ایسی۔"

عبدالحق تڑپ کر اٹھا کھڑا ہوا۔ "یہ کیسی بات کرتی ہو زرینہ۔ میں رشتے بے سوچے سمجھے نہیں بناتا۔ میں شرمندہ ہوں کہ مجھے تمہارا خیال نہیں رہا۔ مگر ایک تو ملنے کے لیے آنے والوں کی وجہ سے موقع ہی نہیں ملا۔ دوسرے میری تو کبھی کوئی بہن تھی ہی نہیں۔ تو شاید مجھے بھائی ہونے کے آداب نہیں آتے۔ بہن کے لاڈ کرنا نہیں جانتا میں۔ لیکن میں تمہارے لیے جو کچھ لایا ہوں' دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔"

"میرے لیے تو آپ کا واپس آنا بہت خوشی کی بات ہے بھائی۔"

"اور یہ کبھی نہ سوچنا کہ میں تمہارے اس رشتے پر کبھی شرمندہ ہوں گا۔ اور شرمندگی کی تو کوئی بات ہے ہی نہیں۔ ایسا کبھی سوچا تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی' نہیں سوچوں گی۔"

"اور تم نے یہاں کسی کو بتایا تو نہیں اپنے بارے میں۔"

"کوئی اچھی بات ہوتی تو بتاتی بھائی۔" زرینہ نے اداسی سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

"وہ بھائی اماں' آپ کو کھانے کے لیے بلا رہی ہیں۔"

"اب عشاء کا وقت ہو رہا ہے۔ نماز پڑھ کر ہی آؤں گا۔ تم لوگ کھانا کھا لو۔"

باہر کھڑی نور بانو تیزی سے واپسی کے لیے پلٹی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کر رہی تھی۔ تُو کبھی نہیں سدھرے گی نور بانو۔ یہ کیسا شک' کیسی بے اعتمادی ہے تیرے اندر۔ تُو تو فرشتے پر بھی شک کرنے سے باز نہ آئے......

بس ایک بار یہ میرے ہو جائیں۔ پھر دیکھنا...... اس کے اندر کسی نے چپکے سے کہا۔

مگر اس کے اندر کی شرمندگی کم نہیں ہو سکی۔ بس ایک بات کی خوشی تھی اسے۔ کھانے کا درست وقت معلوم ہوگیا تھا۔ اب اس کا پلاؤ خراب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ نماز پڑھ کر آئیں گے۔ تو پلاؤ دم پر ہوگا۔

اندر زرینہ کہہ رہی تھی۔ "نہیں بھائی' اماں کہہ رہی تھیں' آج کھانا سب لوگ ساتھ ہی کھائیں گے۔"

❁ ❁ ❁

وہ پہلا موقع تھا کہ سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ابتدا میں تو نور بانو بہت گھبرائی اور شرمائی' لیکن پھر اس نے سمجھ لیا کہ یہ اس کے لیے مثبت تبدیلی کا نکتہ آغاز ہو سکتا ہے۔ بہرحال پہلا موقع تھا۔ اس سے ٹھیک طرح سے کھایا تو نہیں گیا۔ البتہ وہ چپکے چپکے عبدالحق کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جس رغبت سے کھا رہا تھا' وہ اس کے لیے بہت بڑی خوشی کی بات تھی۔ اس کی محنت اور محبت کامیاب ہوگئی تھی۔

"واہ نور بانو' تُو نے تو کمال کر دیا ہے۔" حمیدہ نے داد دی۔

"ایسا کھانا میں ایک بار پہلے بھی کھا چکا ہوں۔" عبدالحق نے سر اٹھائے بغیر بے دھیانی سے کہا۔

"کہاں پتر؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"دہلی میں اماں۔"

"آپ کو یاد ہے وہ کھانا؟" نور بانو نے بے ساختہ پوچھا۔

اس کی آواز سن کر عبدالحق نے سر اٹھایا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ "وہ کھانا کیسے بھول سکتا ہوں میں۔"

ایک لمحے کو نور بانو کو ایسا لگا' جیسے وہ سمجھ رہا ہو کہ وہ کھانا اس نے پکایا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی خوش فہمی دور ہوگئی۔ "اور مجھے معلوم ہے کہ وہ کھانا اس کی بڑی بہن حور بانو نے پکایا تھا۔" عبدالحق نے کہا۔ فوراً ہی اسے احساس ہوگیا کہ اس کے منہ سے غلط بات نکل

گئی ہے۔ دستر خوان پر رابعہ بھی موجود تھی۔

"آپ کو کیسے معلوم؟" نور بانو نے پوچھا اس کے دل میں جیسے پھانس سی چبھ کر اٹک گئی تھی۔ تو کیا باجی سے بھی ہوتی تھی ان کی ظاہر ہے باجی ہی بتا سکتی تھیں انہیں یہ بات۔

"جی..... وہ..... مں..... یہ تو مجھے یاد نہیں....." عبدالحق بری طرح گڑبڑا گیا۔

اسی وقت رابعہ بول اٹھی۔ "مجھے یاد ہے۔ میں نے بتایا تھا صاحب کو۔ صاحب نے بوا کا شکریہ ادا کرنے کو کہا تھا۔ پھر میں نے بتایا کہ کھانا بڑی بی بی حور بانو نے پکایا تھا تو صاحب بڑے حیران ہوئے تھے۔ اور واقعی ہر چیز تو بڑی بی بی نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ حالانکہ مجھے یاد ہے کہ کھانے پکانے میں وہ کبھی دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔"

نور بانو جانتی تھی کہ باجی نے وہ محنت اوتار سنگھ کی محبت میں کی تھی۔ اور اب پتا چل گیا تھا کہ وہ محبت اور محنت سراہی بھی گئی تھی۔ عبدالحق چور سا ہو گیا تھا۔ اس بات سے سب سمجھ گئے ہوں گے کہ اس نے تفتیش کیوں کی تھی۔

"اچھا رابعہ یہ بتا کہ اس دن کا کھانا زیادہ اچھا تھا یا آج زیادہ اچھا ہے؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"میں کیا جانوں اماں۔ میں نے تو کھایا ہی نہیں تھا۔ ہم دونوں ماس مچھلی کہاں کھاتے تھے۔ ہاں یہ مجھے یاد ہے کہ صاحب نے اس دن رات کو بھی وہی کھانا مانگ کر کھایا تھا۔"

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ یہ رابعہ راز پر راز کھولے جا رہی ہے۔

حمیدہ عبدالحق کی طرف مڑی۔ "تو پھر تُو ہی بتا پتر' کون سا کھانا زیادہ اچھا تھا؟"

"سچ تو یہ ہے اماں کہ اس کھانے کے سامنے میں اُس کھانے کو بھول ہی گیا۔ نور بی بی نے تو کمال ہی کر دیا۔"

"دل رکھنے کو منہ دیکھے کی تعریف۔" نور بانو چڑ سی گئی تھی۔

عبدالحق نے سر اٹھایا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ براہِ راست نور بانو کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا نور بی بی۔" اس نے کہا' اور اس کے بعد بھی نظریں نہیں جھکائیں۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا' جیسے چیلنج کر رہا ہو۔

نور بانو کی آنکھوں میں اپنی اماں کا چہرہ پھر گیا اور سماعت میں ان کی آواز گونجی..... چھوٹا ٹھاکر جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا۔

"شکریہ..... آپ کی تعریف مل گئی۔ میری محنت وصول ہو گئی۔" یہ کہہ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

کھانے کے بعد عبدالحق نے حمیدہ سے کہا۔ "اماں..... ایک بات کہوں؟"

"تجھے بھی مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہے پتر۔"

"سب کے ساتھ کھانا بہت اچھا لگا اماں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ رات کا کھانا اسی طرح کھایا

جائے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے پتر۔ ساتھ بیٹھ کر کھانے سے برکت ہوتی ہے۔ اب رات کا کھانا سب ساتھ ہی کھایا کریں گے۔" حمیدہ نے کہا' پھر سب سے مخاطب ہو کر بولی۔ "سن لیا نا سب نے۔"

سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نور بانو کو ایسا لگا کہ بہت اچھے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔

سب لوگ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عبدالحق دونوں سوٹ کیس لے کر حمیدہ کے کمرے میں چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے پہلا سوٹ کیس کھولا اور ایک ایک چیز نکال کر حمیدہ کو دکھانے لگا۔ حمیدہ کھلی جا رہی تھی۔ "یہ سب کس کے لیے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ زرینہ کے لیے ہے اماں۔"

پھر اس نے اماں کے لیے لائی ہوئی چیزیں نکالیں۔ "یہ آپ کے لیے ہے چادر۔" اس نے چادر اماں کے کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب اپنا ہاتھ بڑھائیں۔"

حمیدہ نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ عبدالحق نے سونے کی چار چوڑیاں اس کے ہاتھ میں پہنا دیں۔

"یہ کیا ہے پتر۔ اب مجھے اس کی کیا....."

"جوان بیٹے کی ماں ہو اماں۔ تمہارے ہاتھ سُونے ہوں گے تو بیٹے کی عزت کم ہو گی۔"

حمیدہ لاجواب ہو گئی۔

پھر عبدالحق نے زبیر اور رابعہ کی چیزیں دکھائیں۔

"سب کچھ بہت اچھا ہے پتر۔ پر تُو مجھے زرینہ کے بارے میں تو بتا....."

"بتانا کیا ہے اماں۔ اس کے سب لوگ پاکستان آتے ہوئے راستے میں شہید ہو گئے۔ کوئی بھی نہیں بچا۔ میں نے دیکھا تو خیال آیا کہ میں بہن سے محروم ہوں اور تم بیٹی سے۔ کیوں نہ یہ محرومی دور کر لی جائے..... اپنی بھی اور اس کی بھی۔" عبدالحق نے کہا' پھر پُرتشویش لہجے میں بولا۔ "مگر تم نے ایسے کیوں پوچھا ہے اماں؟ کیا تمہیں اچھی نہیں لگی؟"

"ارے نہیں پتر' وہ تو بہت اچھی ہے۔ بس اس نے خود اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہنے لگی' بھائی آ کر بتائیں گے۔"

"میں نے ہی کہا تھا اس سے۔ بار بار زخم کریدے جائیں تو ہر بار پہلے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔"

حمیدہ نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔ "تُو کتنا عقل مند ہے پتر۔"

تعریف سن کر عبدالحق ہمیشہ کھسیا جاتا تھا۔ اس نے جلدی سے بات بدلی۔ ''جو میری سمجھ میں آیا' وہ میں زرینہ کے جہیز کے لیے لے آیا۔ آگے تم خود دیکھ لینا۔ بس کوئی اچھا سا رشتہ آجائے تو......''

''رشتہ تو آ بھی گیا ہے اس کا...... اور وہ بھی بہت اچھا۔''

عبدالحق کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''کیا کہہ رہی ہو اماں؟'' اس نے کہا۔ ''کہاں سے آیا ہے اس کا رشتہ۔''

حمیدہ نے اسے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کی آمد کے بارے میں بتایا اور اپنا جواب بھی۔ ''پر وہ جلدی چاہتی ہیں پتر۔''

اب عبدالحق کی سمجھ میں ڈاکٹر واسطی کی بات آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگلی بار وہ سوالی بن کر آئیں گے۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس سے اپنے بیٹے کے لیے زرینہ کا رشتہ مانگنے آئیں گے۔

لیکن اتنی جلدی! عبدالحق نہ چاہتے ہوئے بھی اداس ہو گیا۔ بہن...... اور بہن کی محبت سے وہ ناواقف تھا۔ اب اللہ نے اسے بہن دی تھی۔ یہ سچ ہے کہ سب سے پہلے اسے اس کی شادی کی فکر ہی ہوئی تھی۔ مگر اندر کہیں یہ خواہش بھی تھی کہ وہ زرینہ کے ساتھ وقت گزارے' دیکھے کہ بہن کی محبت کیسی ہوتی ہے۔ ابھی تو اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بھائی بہنوں سے کیسی محبت کرتے ہوں گے۔

لیکن نہیں...... یہ تو اسے ابھی معلوم ہوا تھا۔ یہ اداسی اس محبت کا نتیجہ تھی۔ یہ احساس کہ وہ زرینہ کے ساتھ وقت نہیں گزار سکے گا اور وہ ایسی پرائی ہو جائے گی کہ اس کے گھر کبھی آئے گی بھی تو مہمان بن کر' اس احساس نے ہی تو اسے اداس کر دیا تھا۔ اور اس احساس کے پیچھے' بہن کی محبت ہی تو تھی' جس سے وہ ناواقف تھا۔ مگر محبت تو کسی بھی وقت چپکے سے کسی کے پاس بھی آجاتی ہے' وہ خواہ اس سے واقف ہو یا ناواقف ہو۔ محبت تو اللہ کی عطا ہوتی ہے نا......

''تو کہاں کھو گیا پتر؟'' حمیدہ نے اسے ٹوکا۔

وہ چونکا۔ ''اتنی جلدی اماں۔''

''لے' خود ہی اس کے جہیز کا سامان لے کر آیا ہے اور اب کہتا ہے' اتنی جلدی! اور پتر' بیٹیاں اور بہنیں تو ہوتی ہی مہمان ہیں۔ وہ اپنے گھر کی ہو جائیں اور وہاں خوش رہیں' اسی میں ماں باپ اور بھائیوں کی خوشی ہوتی ہے۔''

''پر اماں' میں تو اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ تم نے تو گزار لیا۔''

''تو پتر' شادی دو دن میں تو نہیں ہو جائے گی نا۔ وقت تو لگے گا۔ تو پریشان کیوں ہوتا ہے۔''

''زرینہ سے بھی پوچھنا پڑے گا۔''

اس بار گفتگو کا رخ حمیدہ نے بدلا۔ ''چار دن کی بہن تو تجھے خوب یاد رہی۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''لیکن نور بانو کا خیال نہیں آیا تجھے۔''

عبدالحق تو جیسے تڑپ گیا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو اماں۔ ان کے لیے بھی پورا سامان لایا ہوں جہیز کا۔'' یہ کہہ کر اس نے دوسرا سوٹ کیس کھولا اور ایک ایک چیز حمیدہ کو دکھانے لگا۔

حمیدہ کی تو خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''یہ جہیز لایا ہے یا بری؟''

''کیا مطلب اماں؟'' عبدالحق کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔

''کچھ نہیں پتر۔ تو ابھی کیسے سمجھ سکتا ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔ پھر اچانک اسے اصل بات یاد آگئی۔ ''ارے ہاں' یہ بتا کہ تو جس کام کے لیے لاہور گیا تھا' اس کا کیا بنا؟''

عبدالحق نے گہری سانس لی۔ وہ مرحلہ آگیا تھا' جس سے وہ گھبرا رہا تھا......

❋ ❋ ❋

نور بانو کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم بدلی ہے...... اور بہت زیادہ بدلی ہے۔ اس کی بزدلی کم ہو گئی تھی۔ آتے ہی اس نے جس طرح عبدالحق کا سامنا کیا تھا' وہ اس کی پرانی شخصیت سے تو میل نہیں کھاتا تھا۔ اس طرح سے دو ٹوک اور بے حجابانہ گفتگو کرنا...... اسے یقین تھا کہ عبدالحق بھی حیران ہوا ہوگا۔

پھر اس کے بعد اسے یہ ادراک بھی ہو گیا کہ وہ سب کچھ اس نے کسی وقتی جوش کے تحت نہیں کیا تھا۔ یعنی وہ تبدیلی عارضی نہیں' مستقل تھی پھر ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے نے اس کی تبدیلی کو اور مہمیز کر دیا تھا۔ عبدالحق کی تعریف کے جواب میں' اگر وہ پرانی والی نور بانو ہوتی تو خاموش ہی رہتی۔ مگر اس نے جارحانہ انداز میں تعریف پر تنقید کی تھی' ایسی کہ عبدالحق جیسا نرم خو آدمی جارحانہ جواب دینے پر مجبور ہو گیا تھا مگر اس جواب سے اسے خوشی ہوئی تھی۔ یہ جو پتا چل گیا تھا کہ وہ تعریف سچی تھی۔

اور اب وہ ایک قدم اور آگے بڑھ رہی تھی!

اس نے عبدالحق کے والد کی کتابیں اور ڈائریاں سمیٹ کر یک جا کیں' پھر اس کی چادر اٹھائی اور کمرے سے نکل آئی۔ نکلتے ہوئے اس نے زرینہ کو دیکھا۔ اسے بستر پر لیٹے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ قوی امکان یہی تھا کہ وہ سو چکی ہے۔

وہ اماں کی طرف بڑھ گئی لیکن دروازے پر پہنچ کر ٹھٹک گئی۔ اندر اسی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اس نے وہیں پلٹنے کا فیصلہ کیا۔ بلکہ اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اب وہ عبدالحق کو یہ چیزیں اس کے کمرے میں ہی لے جا کر دے گی۔ اسے یہ خیال بھی حیرت انگیز لگا...... اتنی جرأت اس میں؟ اور اس کا جواب اثبات میں تھا۔ اب وہ سب کچھ کر سکتی تھی...... یہاں تک کہ اظہار محبت بھی!

وہ پلٹنے لگی۔ مگر اسی لمحے اندر عبدالحق نے جو نام لیا' اس نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ رضوان صاحب...... وہ تو اس کے چچا کا نام تھا' جن کی تلاش میں عبدالحق لاہور گیا تھا۔

تو کیا چچا چل گئے؟ عبدالحق کی واپسی کا تو ویسے یہی مطلب تھا۔ تو کیا اب اسے یہاں سے جانا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے بڑی اذیت ہوئی مگر اگلے ہی لمحے اس کے وجود میں بغاوت کی لہر اٹھی۔ نہیں...... میں واپس نہیں جاؤں گی۔ اس نے سوچا۔ میں یہ بات کسی کے سامنے بھی کھل کر کہہ سکتی ہوں' خواہ وہ چچا جان ہوں۔ اس کے اندر پیدا ہونے والی جرأت حقیقی ہے' اس بات کا اسے پہلی بار صحیح معنوں میں احساس ہوا۔

ان سوچوں کی وجہ سے اندر ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ وہ نہیں سن سکی تھی۔ اور وہ بہت اہم گفتگو تھی...... کم از کم اس کے مستقبل کے لیے یہ احساس ہوتے ہی اس نے اپنی توجہ اندر کی گفتگو پر مرکوز کردی۔

''...... میں ان سے ملا ہوں اماں۔'' اندر سے عبدالحق کہہ رہا تھا۔ ''اور وہ وہی رضوان صاحب تھے۔ انہوں نے گھر کے سب لوگوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں نور بی بی کے بارے میں بتایا......''

نور بانو سنتی رہی۔ جو کچھ سن رہی تھی' وہ اس پر بہت گہرا اور تند و تیز تاثر مرتب کر رہا تھا۔ بلکہ اسے تاثر کہنا غلط ہوگا۔ کیونکہ وہ دو الگ الگ' ایک دوسرے سے یکسر برعکس اور متصادم تاثرات تھے۔ ایک طرف اس کے اندر شدید غصہ اور شدید نفرت ابل رہی تھی اور دوسری طرف اسے بے پایاں سکون اور اطمینان کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں خوشی تھی اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ چچا نے اسے ایسا کہا تھا...... کیسے...... کس دل سے! کیا ان کی اپنی بیٹیاں نہیں ہیں...... اور کیا وہ ان کی بیٹی جیسی نہیں ہے۔ اور انہوں نے تو اس پر تہمت ہی لگا دی۔ نہ صرف اس پر' بلکہ عبدالحق پر بھی۔

اس خیال نے اسے اور تڑپا دیا...... اور مشتعل کر دیا کہ چچا جان نے عبدالحق کی کتنی توہین کی۔ کیسے برداشت کیا ہوگا انہوں نے۔ یہ راج پوت بے عزتی کہاں برداشت کرتے ہیں۔ مگر صرف اس کی خاطر...... اسے شرمندگی ہونے لگی۔

مگر دوسری طرف دل تھا کہ جیسے خوشی سے ناچ رہا تھا۔ سارے مسئلے حل ہو گئے تھے۔ اب اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

وہ پلٹی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ زرینہ بے سدھ سو رہی ہے۔ وہ اپنے بستر پر دراز ہو کر سوچنے لگی۔ لیکن اس کے کان باہر عبدالحق کے متوقع قدموں کی چاپ پر لگے تھے۔ وہ اس پر ظاہر نہیں ہونے دے گی کہ وہ اس کی بات سن چکی ہے۔ اور اس کی بات سننے سے پہلے ہی وہ اسے پوری سچائی کے ساتھ بتا دے گی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اگر وہ اس کی بات سننے کے بعد یہ سب کچھ کہے گی تو وہ سوچے کہ شاید وہ مروت میں...... اس کا دل رکھنے کے لیے یہ کہہ رہی ہے۔ وہ اظہار محبت کرے گی...... وہ لڑکی ہو کر پہل کرے گی' اور اس میں کوئی حرج

نہیں۔ بلکہ یہ ضروری ہے۔ جو شخص آن والا ہو کر اس کی خاطر اتنی بے عزتی کرا کے آیا ہے' وہ اس کا مستحق ہے' چاہے وہ اس سے محبت نہ کرتا ہو۔ لیکن وہ تو اس سے محبت کرتی ہے نا!

اب وہ اس کے قدموں کی چاپ کی منتظر تھی!

❁ ❁ ❁

''توبہ ہے میری ربا...... خون پانی ہو گیا ہے لوگوں کا۔'' حمیدہ نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اماں' یہ سچ صرف تمہارے لیے ہے۔''

''کیا مطلب ہے تیرا پتر؟''

''نور بی بی کو میں یہ سب کچھ نہیں بتاؤں گا۔ خواہ مخواہ ان کو عمر بھر کا دکھ دینے کا فائدہ۔ ایک تو ویسے ہی آدمی سب کچھ کھو کر آیا ہو۔ اوپر سے اسے اور زخم لگایا جائے۔''

حمیدہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''تو پھر تُو کیا بتائے گا اسے؟''

''یہی کہ میں انہیں تلاش نہیں کرسکا۔ اور اب ان کے ملنے کا کوئی امکان ہے بھی نہیں۔''

''تو...... تُو جھوٹ بولے گا اس سے۔''

''مجبوری ہے اماں۔ انہیں دکھ دینے سے بچانے کے لیے جھوٹ بولنا پڑے گا مجھے۔''

''اور جو میں تجھے بتاؤں کہ سچ سے اسے دکھ نہیں ہوگا' بلکہ خوشی ہوگی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو اماں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ سگے چچا کا ایسے الفاظ کہنا......''

''مانتی ہوں' اس بات سے دکھ ہوگا اسے۔ لیکن اس سے بہت زیادہ خوشی ہوگی۔''

''کیوں ہوگی خوشی؟''

''یہاں سے نہ جانے کی خوشی اس دکھ سے بڑی ہوگی۔'' حمیدہ نے کہا۔

''نہیں اماں' میری عقل نہیں مانتی یہ بات۔''

''یہ عقل کے نہیں' دل کے سمجھنے کی بات ہے پتر۔'' حمیدہ نے بڑے پیار سے کہا۔ ''تجھے دل سے سوچنا اور کسی کے دل میں جھانکنا کہاں آتا ہے پگلا۔''

''نہیں اماں۔ یہ خطرہ میں مول نہیں لے سکتا۔''

''تو ٹھیک ہے جو جی میں آئے کر۔'' حمیدہ نے سوچا' اس میں نقصان ہی کیا ہے۔ ''خود ہی پتا چل جائے گا تجھے۔''

عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تم یہ سب چیزیں سنبھال کر رکھو میں آتا ہوں اماں۔ اب میں چلتا ہوں۔''

''ہاں...... اب سو جا جا کر دن بھر کا تھکا ہارا ہے۔''

❁ ❁ ❁

وہ کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی' حالانکہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس

نے پلٹ کر دیکھا تو دروازے میں نور بانو کھڑی نظر آئی۔ عبدالحق کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ تو وہ مرحلہ آ ہی گیا۔ اس نے دل میں سوچا۔

"آ جائیے نور بی بی۔"

نور بانو اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چادر اور کچھ پرانی کتابیں تھیں۔

عبدالحق نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھیے۔"

نور بانو بیٹھ گئی۔

"مجھے موقع نہیں ملا کہ آپ......" الفاظ عبدالحق کے گلے میں پھنس رہے تھے۔

نور بانو نے بہت تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا۔ اور وہ اسے اس کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہ ضروری تھا کہ اس سے پہلے ہی وہ اپنے دل کی بات اس پر واضح کر دے۔ "آپ کو شاید یہ بدتمیزی لگے اس لیے میں پہلے ہی آپ سے معذرت کر رہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "مگر اتنی رات کو دن بھر کی تھکن کے بعد آپ کو زحمت دے رہی ہوں تو اس لیے نہیں کہ آپ سے کچھ سننا چاہتی ہوں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں......"

عبدالحق کا چہرہ فق ہو گیا۔ معاملہ اس کی توقع سے زیادہ سنگین تھا۔ "جی...... میں سمجھتا ہوں لیکن......"

"نہیں...... آپ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔" نور بانو نے تیز لہجے میں پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "مختصراً بات یہ ہے کہ آپ کو بولنا نہیں ہے صرف سننا ہے۔ جب تک میری بات پوری نہ ہو جائے آپ کچھ بھی نہیں کہیں گے۔"

"جی بہتر۔" عبدالحق نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ یہ تو اس نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ گم صم رہنے والی اس کم گو لڑکی میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ اس کے مزاج میں جارحیت آ گئی ہے اور اس کا نشانہ خاص طور پر وہ ہے۔ ایک لحاظ سے یہ اسے بہتر لگا کہ وہ اسے بولنے سے روک رہی ہے۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ایک ابتدائی تاثر کی وجہ سے آپ مجھے غلط سمجھتے رہے ہیں۔" نور بانو نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات شروع کی۔ "آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میرا ردِعمل اور آپ پر قائم ہونے والا تاثر ایک خاص ہنگامی صورتِ حال کے تحت تھا۔ ایسے حالات میں تو مضبوط اور طاقت ور لوگ بھی ہل جاتے ہیں میں تو ایک کمزور اور اکیلی لڑکی تھی جس کا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے فطری ردِعمل کی بنیاد پر اسے احسان فراموشی سمجھ لینا بڑی زیادتی ہے......"

"میں نے آپ کو ایسا کبھی نہیں......" عبدالحق نے تڑپ کر کہنے کی کوشش کی۔

"پھر بولے آپ۔ آپ میری بات کیوں نہیں مانتے۔" نور بانو نے سخت لہجے میں کہا۔

"معافی چاہتا ہوں۔ اب نہیں بولوں گا۔" عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

"میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں کم ظرف اور احسان فراموش نہیں ہوں۔ صورتِ حال بہتر ہوئی میں یہاں آئی اور مجھے مکمل تحفظ ملا تو میری سمجھ میں آیا کہ آپ نے زبیر بھائی اور رابعہ آپا نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ سگے رشتہ دار بھی نہیں کرتے۔ یہ آپ لوگوں کا وہ احسان ہے جو جان دے کر بھی نہیں اتارا جا سکتا۔ پھر یہاں اماں کی صورت میں مجھے میری مری ہوئی ماں مل گئی۔ سچ کہوں تو یہاں میں اتنی خوش رہی کہ دہلی میں اپنے گھر میں اپنے لوگوں کے درمیان بھی کبھی اتنی خوش نہیں رہی تھی۔ آپ سب لوگ میرے لیے میرے سگے رشتہ داروں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ مگر آپ کو میری اس تبدیلی کو دیکھنے اور سمجھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ آپ میرے بارے میں اسی پہلے تاثر پر ڈٹے رہے کہ میں آپ لوگوں سے خوف زدہ ہوں اور یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ اس روز لاہور جانے سے پہلے جو میں آپ کے پاس آئی تھی تو اس لیے نہیں کہ چچا کی تلاش کا وعدہ یاد دلا کر آپ کو لاہور بھیجوں۔ میں تو آپ کی کچھ چیزیں دینے اور ان کی بے پناہ اہمیت کے بارے میں بتانے آئی تھی۔ آپ نے اپنے اس پہلے تاثر اور میرے بارے میں اپنے مفروضے کے تحت میری بات سنی ہی نہیں اور مجھ سے ملے اور بات کیے بغیر ہی لاہور چلے گئے۔ اگر آپ مجھے بتا دیتے کہ آپ کس لیے لاہور جا رہے ہیں تو پتا ہے میں کیا کہتی آپ سے......" وہ کہتے کہتے رکی۔ "اب یہ پوچھیے مجھ سے۔"

عبدالحق کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ مگر اس نے بڑی فرماں برداری سے پوچھا۔ "کیا کہتی آپ؟"

"میں کہتی کہ آپ کو لاہور جانے اور میرے چچا جان کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ پچھلے سب رشتے ختم ہو چکے...... بے معنی ہو چکے۔ اب میرے تمام رشتے اس زمین پر اس گھر میں موجود ہیں۔" یہ کہتے ہوئے نور بانو کی نظریں جھک گئیں۔ "میں خود کو آپ پر تھوپنا نہیں چاہتی۔ لیکن اماں، زبیر بھائی اور رابعہ آپا کے لیے میری اہمیت ہے۔ وہ نہیں چاہیں گے کہ میں یہاں سے جاؤں۔"

"یہ تو میں بھی نہیں چاہتا۔" عبدالحق نے دل میں سوچا۔

"میں آپ سے کہتی کہ چاہے آپ مجھے خود پر بوجھ سمجھیں، مگر مجھے یہاں رہنے دیں۔ اب اگر چچا جان یہاں آ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں تو بھی میں انکار کر دوں گی۔ میں یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتی۔ مگر آپ تو ہر چیز کو اپنی مرضی کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں نا اس لیے مجھے بتائے بغیر چلے گئے۔ اب مجھے بتائیے اتنا عرصہ گھر سے دور، گھر کے سکون اور آسائشوں سے محروم رہ کر آپ نے کیا پایا۔"

"اب میں بول سکتا ہوں؟" عبدالحق نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"جی ہاں۔ کیونکہ میرا خیال ہے میں اپنی بات واضح کر چکی ہوں۔"

"تو میں آپ کے آخری سوال کا جواب دیتا ہوں۔ میں نے ناکامی کے سوا کچھ نہیں پایا۔ میں سرتوڑ کوشش کے باوجود آپ کے چچا جان کو تلاش نہیں کر پایا۔ میں شرمندہ ہوں۔ کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی انہیں تلاش کر سکوں گا۔"

نوربانو کی حیرت اتنی شدید تھی کہ چند لمحوں کے لیے تو وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔"

نوربانو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ بولنے والا اس سے جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔

"مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ آپ یہی سمجھ رہی ہیں نا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"اور میں ایسا کیوں سوچوں گی؟"

"اس خیال سے کہ میں آپ کو یہاں روکنا چاہتا ہوں...... آپ کو یہاں سے جانے نہیں دینا چاہتا۔"

"اور میرے خیال میں آپ ایسا کیوں کریں گے؟" نوربانو نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اب یہ تو آپ ہی جانتی ہوں گی۔"

"میں تو جانتی ہوں گی۔ آپ بتائیں، آپ کا کیا خیال ہے۔ اس سلسلے میں۔"

عبدالحق چند لمحے ہچکچاتا رہا، بالآخر بولا۔ "کیونکہ آپ کے خیال میں میں برا آدمی ہوں۔ شاید آپ یہ بھی سمجھتی ہیں کہ آپ کے سلسلے میں میرے عزائم کچھ اچھے نہیں ہیں۔"

یہ سن کر نوربانو نے عملاً سر پیٹ لیا۔ "آپ کس طرح کے آدمی ہیں۔" وہ جھنجھلا کر بولی۔

"اتنے بڑے بڑے نظریات قائم کر لیتے ہیں اور ان کو عمل کی کسوٹی پر پرکھتے تک نہیں۔ ارے اللہ کے بندے، میں تو آپ کو روئے زمین پر موجود سب سے اچھا اور سچا انسان سمجھتی ہوں...... نہیں، یوں کہنا چاہیے کہ سمجھتی تھی۔" عبدالحق کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ لیکن نوربانو کے آخری جملے نے اسے پھر سہادیا۔ "اب نہیں سمجھتیں! اس لیے نا کہ آپ کے خیال میں میں آپ کے چچا جان کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"یہ میرا خیال نہیں، مجھے پورا یقین ہے...... بلکہ میں جانتی ہوں کہ آپ اس معاملہ میں جھوٹ بول رہے ہیں۔"

عبدالحق کی یہ کیفیت ہو گئی کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔ نوربانو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پہلے تو اس نے یہ باور کرایا کہ وہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتی۔ چچا مل جائیں تو بھی نہیں

جائے گی۔ یہ سن کر اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کا کام آسان ہو گیا ہے۔ مگر یہ سنتے ہی کہ وہ چچا کو تلاش نہیں کر سکا، اس کا رویہ ہی تبدیل ہو گیا۔ وہ بغیر کسی معقول وجہ کے اسے جھوٹا سمجھنے لگی۔ اور اتنے یقین کے ساتھ اسے جھوٹا کہہ رہی ہے۔ تو کیا دراصل وہ اپنے چچا کے پاس جانا چاہتی ہے۔ اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا۔

"تو پھر بات تو وہی ہوئی نوربی بی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کے خیال میں میرے عزائم اچھے نہیں۔ اور جھوٹ بولنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"

"نہیں، ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی آپ کے بارے میں۔ مگر میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ آپ جھوٹ کیوں بول رہے ہیں۔ خیر اس بات کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ چچا ملیں یا نہ ملیں، مجھے ان کے ساتھ جانا ہی نہیں ہے۔ میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔"

عبدالحق جھنجلا گیا۔ جی چاہا کہ سر کے بال نوچنے لگے۔ عجیب لڑکی تھی...... کبھی تولہ کبھی ماشہ!

"آپ خود ہی بتا دیں نا کہ آپ چچا جان کے معاملے جھوٹ کیوں بول رہے ہیں۔" نوربانو نے اچانک کہا۔

"بتانا ہو تو جھوٹ ہی بولتا ہی کیوں۔" عبدالحق نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اچھا چھوڑیں، اب آپ کی ان چیزوں کی بات ہو جائے، جو میں اس دن کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آپ نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔ یہ کچھ کتابیں اور دو ڈائریاں ہیں آپ کے والد، جو تہ خانے میں ملی تھیں۔ آپ کو یاد ہے، میں نے آپ سے انہیں پڑھنے کی اجازت لی تھی؟"

"جی...... مجھے یاد ہے۔"

"اس کے باوجود آپ سے معافی کی خواستگار ہوں۔ ڈائریاں مجھے نہیں پڑھنی چاہیے تھیں۔ کیونکہ ان میں بہت ذاتی باتیں تحریر ہیں۔"

ایک لمحے کو عبدالحق کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کو اجازت دی تھی نا۔"

"شکریہ۔" نوربانو نے کتابیں اور ڈائریاں اس کی طرف بڑھائیں۔ "اب ایک خوش خبری سناؤں آپ کو۔ ان ڈائریوں میں ایک اتنی بڑی خوشی ہے آپ کے لیے کہ جو آپ کے گمان میں بھی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے میری پیشگی مبارک باد قبول کیجیے۔"

"وضاحت نہیں کریں گی آپ؟" عبدالحق کے چہرے پر حیرت تھی۔

"جی نہیں، خود پڑھ کر جو خوشی آپ کو حاصل ہو گی، وہ بہت...... بہت بڑی ہو گی۔ اور میں اسے خراب نہیں کرنا چاہتی۔"

عبدالحق عجیب سی نظروں سے کتابوں کو دیکھنے لگا۔

''اور یہ چادر ہے آپ کی' جو میں نے آپ کے کمرے سے بلا اجازت لے لی تھی۔'' نور بانو نے گود میں رکھی چادر کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن چادر اس کی طرف بڑھائی نہیں۔ ''اس لیے میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔''

''تو یہ تو ہے ہی آپ کے پاس۔ آپ نے واپس کب دی ہے۔''

نور بانو نے چادر اب بھی اس کی طرف نہیں بڑھائی۔ ''تو مجھے یہ چادر رکھنے کی اجازت دے رہے ہیں نا آپ۔''

''چلیے......اجازت دی۔''

''شکریہ......شب بخیر۔'' نور بانو اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

عبدالحق کتابوں کی طرف متوجہ تھا۔ نور بانو کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نور بانو دروازے میں کھڑی تھی۔

''اس چادر میں آپ کی خوشبو تھی۔ اس کی وجہ سے آپ دور رہ کر بھی میرے قریب رہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

عبدالحق کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ کیا یہ سب کچھ وہی ہے' جو سمجھ میں آ رہا ہے' اسے محسوس ہو رہا ہے؟ کیا یہ اظہارِ محبت ہے؟

''اور یہ چادر لے کر میں نے ایک طرح سے آپ پر احسان کیا۔'' نور بانو نے مزید کہا۔ ''ورنہ آپ کا مینو مر گیا ہوتا۔ اس چادر اور اس کی خوشبو کی وجہ سے ہی اس نے میرے ہاتھ سے کھانا گوارا کیا۔''

عبدالحق سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

''اور اب آخری بات۔ شاید اس کے بعد آپ مجھے کبھی اچھی لڑکی نہ سمجھیں۔ لیکن میں پھر بھی کہوں گی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی......اتنی......اتنی زیادہ کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی اور ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق ساکت و صامت بیٹھا تھا......یوں جیسے سانس لینا بھی بھول گیا ہو!

لیکن نہیں۔ وہ وہاں موجود ہی کب تھا۔ وہ گویا ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ یہ سب کچھ حقیقت تو نہیں ہو سکتا۔ شاید وہ خواب دیکھ رہا ہے۔

حقیقت میں تو یہ ممکن ہی نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آسمان زمین پر اتر آئے اور اسے چھو کر کہے......مجھے تم سے محبت ہے۔ ہاں......اور کیا......اس کے اور نور بانو کے درمیان اگر کوئی نسبت تھی' وہ یہی تھی۔ وہ آسمان تھی اور وہ زمین۔

ایک لمحے کو سچ مچ اسے ایسا لگا کہ آسمان نیچے......نیچے......اور نیچے چلا آ رہا ہے' اور اس کے بہت قریب پہنچ گیا۔ درمیان کی سب چیزیں اوجھل ہوتی جا رہی ہیں۔ کمرے کی چھت بھی جیسے اوجھل ہو گئی۔ آسمان جیسے اسے چھونے لگا۔ درمیان سے جیسے آخری چیز' ہوا بھی سلب ہو گئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ سانس بھی نہیں لی جا رہی تھی۔ پھیپھڑوں میں جیسے آگ بھر گئی۔

شدید گھبراہٹ کے عالم میں اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہاں آسمان نہیں تھا' کمرے کی چھت تھی۔ اس نے جینے کے لیے......پکے یقین کے لیے گہری سانس لی۔ اس سانس نے اسے یقین دلا دیا کہ اس نے خواب دیکھا تھا۔

مگر اس نے نظریں جھکائیں تو اسے اپنی گود میں رکھی پتاجی کی کتابیں' ان کی ڈائریاں نظر آئیں۔ اگر وہ خواب تھا تو یہ کتابیں کہاں سے آئیں اس کے پاس۔ ذہن پھر الجھنے لگا۔

لیکن اس بار عبدالحق کی الجھن مختصر تھی۔ اب وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ نور بانو آئی تھی۔ یہ کتابیں' یہ ڈائریاں اس کا ثبوت تھیں۔ اس نے جو باتیں کی تھیں' وہ بھی اسے یاد تھیں لیکن اس نے جاتے ہوئے جو کچھ کہا تھا' اس پر اسے یقین نہیں تھا۔ وہ شاید اس کے اندر کی خواہش تھی' وہ شاید اس کا تصور تھا۔

وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے کتابیں اور ڈائریاں بیڈ پر رکھیں اور کمرے سے نکل آیا۔ اس کے قدم بے اختیار نور بانو کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ نور بانو بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ وہ دروازے میں رک گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ دوسری چارپائی بھی ہے' اور اس پر چادر اوڑھے کوئی سو رہا ہے۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ اس کا الجھا ہوا ذہن اور الجھا گیا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ اسے وہاں کھڑے کھڑے کئی لمحے گزر گئے ہیں۔ نور بانو کا رخ اسی طرف تھا۔ یعنی اس نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے اسے پوچھا بھی نہیں کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔

اس خیال نے اسے احساس دلایا کہ یہ کچھ اچھی صورتِ حال نہیں۔ اتنی رات کو اس کا یہاں آنا......نور بانو کیا سمجھے گی۔ اور اگر وہ اس سے پوچھے تو وہ کیا کہے گا۔ یہ کہ واقعی اس نے وہ الفاظ کہے تھے۔ اور جب وہ انکار کر دے گی تو......تو کتنی شرمندگی ہوگی۔

مگر اس سے پلٹا بھی نہیں گیا۔ پلٹنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

وہ بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی لیکن چند لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا رخ اس کی طرف ضرور ہے لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہوں میں خالی پن کا ایسا تاثر تھا' جیسے وہ اس کے پار دیکھ رہی ہو۔

وہ اس کے لیے پلٹ جانے کا بہت اچھا موقع تھا لیکن وہ تو ہلنے کے قابل نہیں تھا۔ بے بس

کھڑے رہنے کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر نجانے کتنی دیر کے بعد نور بانو کی محویت ٹوٹی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت سی چمکی' اور پھر بے یقینی جھلکنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے تاثر سے واضح تھا کہ جو کچھ دیکھ رہی ہے' اسے فریب نظر سمجھ رہی ہے۔

بے بس کھڑا عبدالحق کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

چند لمحوں میں نور بانو کو احساس ہو گیا کہ وہ فریب نظر نہیں ہے۔ اس نے بے اختیار دوسری چارپائی پر سوئی ہوئی زرینہ کو دیکھا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھی' جہاں عبدالحق بت بنا کھڑا تھا۔

''آپ...... آپ مجھے ڈانٹنے کے لیے آئے ہیں؟'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

عبدالحق کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ بس نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ کچھ مطمئن نظر آنے لگی۔ ''تو پھر؟''

''یہ کون سو رہا ہے آپ کے کمرے میں؟'' عبدالحق نے گڑبڑا کر پوچھا۔

نور بانو مسکرائی۔ ''زرینہ ہے۔''

''سو رہی ہے نا؟'' عبدالحق کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

نور بانو کی مسکراہٹ اور کشادہ ہو گئی۔ ''جی ہاں' گہری نیند سو رہی ہے۔ مگر آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کیوں آئے ہیں۔''

''وہ...... میں......'' عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ ''آپ...... آپ میرے کمرے میں آئی تھیں نا۔ مجھے چچا جی کی کتابیں بھی دی تھیں نا؟''

نور بانو کا ذہن الجھنے لگا۔ ''جی...... جی ہاں۔ آپ کو شک ہے کیا؟''

''جی نہیں۔'' عبدالحق نے کہا' پھر بے ساختہ اس کے منہ سے وہ بات نکل گئی۔ ''آپ نے آخر میں...... میرے دروازے پر رک کر...... پلٹ کر کچھ کہا تھا؟''

''جی ہاں۔ کیا آپ کو یاد نہیں۔'' نور بانو نے عجیب لہجے میں کہا۔

''کیا کہا تھا آپ نے؟''

''آپ چاہتے ہیں کہ میں وہ دہراؤں؟'' نور بانو کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''جی ہاں۔''

نور بانو کی نظریں جھک گئیں۔ ''کیوں؟''

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ مجھے وہم ہو گیا ہے۔''

''عجیب آدمی ہیں آپ۔'' نور بانو نے جھنجلا کر کہا۔ پھر ایک دم اس نے نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''آپ مجھے کم ہمت سمجھتے ہیں نا لیکن میں یہ بات کسی کے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں...... اتنی...... اتنی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب

بولئے' کچھ اور بھی سننا چاہتے ہیں۔ آپ؟''

''جی نہیں...... شکریہ۔ شب بخیر۔'' عبدالحق نے کہا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

نور بانو کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اپنے بستر پر چلی گئی۔

❀ ❀ ❀

عبدالحق سوچنے والا آدمی تھا اور سوچ رہا تھا!

ایک بات وہ یقین سے کہہ سکتا تھا۔ یہ اس کی زندگی میں آنے والی سب سے بڑی خوشی تھی۔ شاید سب سے بڑی اس لیے کہ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ خوشی اسے مل سکتی ہے۔ پہلی بار اس کی آواز میں قرأت سن کر اس کے دل میں عجیب سے جذبے جاگے تھے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس نے جان لیا تھا کہ وہ محبت ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے' اس کا نام کیا ہے اور وہ دیکھنے میں کیسی ہے۔ بس وہ یہ جانتا تھا کہ اسے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ اس محبت ہی کے سہارے وہ بڑی کٹھن آزمائشوں میں سرخرو ہوا تھا۔ وہ محبت نہ ہوتی تو وہ دہلی میں اس رات ریٹا پارسن کے ساتھ پستی میں گر چکا ہوتا۔ اس رات وہ جسم کے' نفس کے فتنوں سے پوری طرح واقف ہو گیا تھا لیکن وہ اسی محبت کی عظمت تھی کہ وہ نفس کے اس جال سے نکل آیا تھا...... محض روح پر لگنے والی چند خراشوں کے ساتھ۔ اور یہ محبت ہی تھی کہ جس کی وجہ سے اس نے اس رات کے بعد کبھی کسی لڑکی کو اس انداز میں نہیں دیکھا۔ اس کے جسم میں کبھی فتنے نہیں جاگے تھے۔ خواہشوں نے کبھی اسے بے چین نہیں کیا تھا۔

اس نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو بند آنکھوں کے پیچھے نور بانو کا سراپا لہرانے لگتا۔ یہ بھی نئی بات تھی۔ پہلے وہ اس بارے میں سوچتا تو اس کی آواز سماعت میں گونجتی۔ مگر اب آواز کی بجائے وہ اس کے سامنے مجسم ہو رہی تھی۔ اور یہی نہیں' اس تصور کو وہ بڑے اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

نور بانو کو وہ پہلے بھی دیکھتا رہا تھا۔ لیکن وہ اسے تصور میں کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے پاس حوالہ صرف آواز کا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس وقت وہ محبت یک طرفہ تھی۔ اسے حق نہیں تھا اسے دیکھنے کا۔ مگر اب نور بانو کے اظہار محبت نے اسے یہ حق عطا کر دیا تھا۔ اور ایسا ہوتے ہی آواز کہیں پیچھے چلی گئی تھی۔ اس وقت اسے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ آواز محض آواز نہیں تھی۔ اس آواز کا لباس تو قرأت تھی۔ مگر اب تو ہر چیز پر سراپا چھا گیا تھا۔ یہی نہیں' وہ جسمانی طور پر خود کو بے چین محسوس کر رہا تھا۔ ایک تشنگی سی تھی۔ جو جھنجلاہٹ جگا رہی تھی۔ جیسے آدمی کچھ کرنا چاہے اور کر نہ پائے۔ وہ اسے پوری طرح سمجھ نہیں رہا تھا۔

بار بار کوشش کے باوجود وہ نہ سو پایا تو جھنجلاہٹ اور بڑھ گئی۔

اچانک اسے ایک بہت بڑی خوشی یاد آئی۔ اور وہ بھی نور بانو ہی کے دم قدم سے تھی۔ جس رات وہ کوٹھے پر چلا گیا تھا' جہاں نور بانو سورہ الملک کی تلاوت کر رہی تھی۔ جہاں اس نے یکساں اور ہموار آسمان کا مشاہدہ کیا تھا...... اور جب اسے ساتوں آسمان نظر آئے تھے...... اور اس نے کلمہ پڑھا تھا۔ مگر وہاں اسے کیسی میٹھی' پیاری اور پُرسکون نیند آئی تھی' جیسے خوشی اور راحت اس کی روح میں سرایت کر گئی ہو...... اور وہ ایک لمحے میں بے خبر سو گیا تھا۔ وہ بے ہوشی یا غشی ہرگز نہیں تھی۔ بعد کی کیفیت نے یہ بات ثابت کر دی تھی۔

ایک اور بات تھی۔ قرآن پڑھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ قرآن پڑھنے میں بھی اسے بہت خوشی ملتی تھی۔ قرآن پڑھنے کے دوران نیند ہوا کے خنک اور خوش گوار جھونکوں کی طرح اسے جھولے جھلاتی تھی۔ اور قرآن پڑھنے کے بعد بھی اسے بہت گہری نیند آتی تھی۔

اور اب اسے یہ خوشی ملی تھی' جو اس کے خیال میں اب تک اس کی زندگی میں آنے والی سب سے بڑی خوشی تھی۔ یہ احساس کہ جس لڑکی کو وہ دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر چاہتا ہے' وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے' بلاشبہ بہت بڑی خوشی تھی۔ مگر اس خوشی میں پچھلے تجربات کے برعکس کیوں ہو رہا تھا۔ وہ نیند سے محروم کیوں ہو گیا تھا۔ اس کے اندر بے سکونی کیوں تھی۔ اسے کسی تشنگی کا...... کسی کمی کا ناقابل فہم احساس کیوں ستا رہا تھا۔

اس نے پھر آنکھیں موند لیں' اور نور بانو کا سراپا پھر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس تصور نے چند لمحے تو اسے خوشی دی۔ مگر پھر اس کے جسم میں اینٹھن ہونے لگی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ جب بھی پریشان ہوتا تھا' قرآن کا سہارا لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اٹھا' وضو کر کے آیا اور قرآن لے کر بیٹھ گیا۔ سورۃ النبا اس کے سامنے تھی...... عم یتسآ لون......

اور وہ ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ وہ قرآن میں کھو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ قرآن وہ بہت توجہ سے پڑھتا تھا...... سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔

وہ پڑھ رہا تھا۔ اللہ فرما رہا تھا کہ اس نے زمین کو بچھونا بنایا' اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں۔ یہ مضمون وہ کہیں اور بھی پڑھ چکا تھا۔ وہ تین دلیلوں میں سے تھیں۔ اللہ نے زمین کو ہموار کیا تھا' ورنہ اس پر گھر بنانا' رہنا' چلنا پھرنا ممکن نہ ہوتا۔ اور ایک جگہ فرمایا تھا کہ زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں کہ کہیں یہ تمہیں لے کر لڑھک نہ جائے۔ یعنی پہاڑوں کے ذریعے زمین کو متوازن کر دیا تھا۔

یہ بات عبدالحق کی سمجھ میں بہت اچھی طرح آتی تھی۔ کیونکہ قرآن میں کئی جگہ قیامت کا ذکر فرماتے ہوئے۔ اللہ نے پہاڑوں کے مٹ جانے کا ذکر فرمایا تھا۔ گویا قیامت کا ایک سبب زمین کے توازن کا خاتمہ بھی ہوگا۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ یعنی میخیں نہیں رہیں گی' اور زمین

اپنے ہر بوجھ کو لے کر لڑھک جائے گی۔

یہ آیات پڑھتے ہوئے اس پر ہمیشہ لرزہ چڑھ جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ کی قدرت کو پوری طرح وہ کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن وہ جتنی بھی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی ہے' وہ اسے لرزا دینے کے لیے ضرورت سے زیادہ ہے۔ شاید اس سے زیادہ سمجھ میں آ جائے تو وہ دہشت سے مر ہی جائے

اس نے اللہ کا شکر یہ ادا کیا کہ اسے قرآن پڑھنا نصیب ہوا۔ ورنہ اسے اللہ کی قدرت کا کیسے علم ہوتا۔ وہ تو قیامت سے بھی بے خبر ہوتا...... حساب کتاب' جزا و سزا وہ طویل دن' جس سے پیغمبر بھی گھبراتے ہیں۔ اور جب یہ سب اسے معلوم ہی نہ ہوتا تو وہ ڈرتا کیسے۔ اور اللہ انہی لوگوں کو تو بخشے گا' جو ڈرتے ہیں۔

اگلی آیت پر وہ ٹھٹک گیا...... اور تمہیں جوڑوں میں پیدا کیا!

اس بات کا اسے تجربہ تھا۔ ایک آیت آدمی دسیوں مرتبہ سرسری پڑھتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ اور ایک دن اچانک اس سے کوئی بات سمجھ میں آتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ اس نے پا لیا۔ وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ مگر کچھ وقت کے بعد وہ مفہوم اس کے ذہن میں محو ہو جاتا ہے' اور اسے پتا بھی نہیں چلتا۔ پھر کسی دن وہی آیت پڑھتے ہوئے ایک اور مفہوم اس پر واضح ہو جاتا ہے۔

عبدالحق نے سمجھ لیا تھا کہ اللہ کا یہ کلام رُوئے زمین پر حکمتوں کا منبع ہے۔ ایک ایک آیت میں' بلکہ ہر ہر لفظ میں ہر حرف میں سینکڑوں' ہزاروں حکمتیں پنہاں ہیں۔ ہر دور کے تمام انسان قیامت تک غور و فکر کرتے رہیں' سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ تو بھی اجتماعی طور پر ان حکمتوں کے عشر عشیر کو بھی نہ پا سکیں۔ یہی تو اس کے کلام اللہ ہونے کا ثبوت ہے۔ ورنہ تو عام کتابیں کتنی ہی پسند ہوں' چاہے بار بار پڑھ لی جائیں' لیکن بالآخر دل سے اتر جاتی ہیں۔ لیکن آدمی اس چیز کو تو کبھی ترک نہیں کرتا' جسے پوری طرح سمجھ نہ پائے۔ یہی وجہ ہے کہ جسے اللہ قرآن کی رغبت عطا فرما دے اور پڑھنے کی توفیق عطا فرما دے' وہ مرتے دم تک اسے پڑھنا نہیں چھوڑتا۔

تو اس وقت وہ اس آیت پر ٹھٹک گیا...... اور تمہیں جوڑوں میں پیدا کیا!

یہ بات صرف انسانوں کے لیے نہیں تھی۔ اللہ نے تمام جان داروں کو جوڑوں سے پیدا فرمایا تھا...... یہ اس کا نظام ہے۔ اس کے ذریعے یہ سلسلہ قیامت تک قائم رکھنا تھا۔ اس لیے تو طوفان سے پہلے اللہ نے حضرت نوحؑ کو حکم دیا تھا کہ ہر جان دار کے ایک ایک جوڑے کو اپنی کشتی پر سوار کر لیں۔ تاکہ وہ ناپید نہ ہوں۔

اس نے سوچا' اگر بائیس سال کی محرومی کے بعد اللہ نے میرے ماں باپ پر کرم نہ فرمایا ہوتا اور میں پیدا نہ ہوتا تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی نسل ناپید ہو چکی ہوتی۔ پھر اس نے مزید کرم فرمایا کہ مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا کہ آئندہ کے لیے نسل سیدھی ہو جائے۔

مگر یہ سوچتے ہوئے وہ اداس ہوگیا۔کاش...... کاش پتاجی مسلمان ہوتے۔

ذہن بھٹکنے لگا تھا۔اس نے اسے پھر اس آیت پر مرکوز کیا۔کیا اس کا مطلب ہے کہ اس نے تمام مردوں کے لیے کچھ خاص عورتوں کو مخصوص فرمادیا ہے۔جوڑوں میں پیدا فرمایا کا مطلب تو یہی ہے۔کوئی مرد کہیں ہوتا ہے اور عورت کہیں اور۔کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ کس کے لیے ہے۔لیکن اللہ کے مقرر کردہ وقت پر وہ دونوں مل جاتے ہیں۔شاید یہ طے ہوتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے نور بانو کو میرے لیے بنایا تھا۔کل تک مجھے اس کا علم نہیں تھا لیکن آج میں جان گیا ہوں کہ وہ میرے لیے ہے۔

اس خیال کے ساتھ ہی ذہن منتشر ہونے لگا۔وہ نور بانو کے بارے میں سوچنے لگا۔اس کا سراپا نگاہوں میں پھر گیا۔اس نے جلدی سے سر جھٹکا' اور اگلی آیت پڑھی۔

مگر اس کا دل اب بھی پیچھے ہی اٹکا تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ٹھاکروں کی گڑھی میں پیدا ہوا اور نور بانو دہلی میں۔وہ ہندو راجپوت گھرانے میں پیدا ہوا اور نور بانو مسلمان گھرانے میں۔کون سوچ سکتا تھا کہ اللہ نے انہیں ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے...... اور ظاہر ہے کہ اس کے ہندو ہوتے تو یہ جوڑ ناممکن تھا۔تو شاید اسی لیے وہ نواز دیا گیا۔

اس نے سوچا' اگر میں تعلیم کے لیے دہلی نہ جاتا...... اور دہلی جاتا' لیکن میرا قیام کہیں اور ہوتا تو کیا ہوتا، لیکن فوراً ہی اس کے اندر آواز اٹھی کہ یہ سب کچھ یونہی ہونا تھا۔یہ سب اللہ نے لکھ دیا تھا۔اور اگر یہ یوں نہ بھی ہوتا' تب بھی انجام کار ان دونوں کو ملنا ہی تھا۔یوں نہ ہوتا تو کسی اور طرح ہوتا۔

تو کیا یوں ہے کہ اللہ نے انسان کو دو حصوں میں بنایا ہے۔اور پھر انہیں الگ الگ پیدا فرمایا ہے۔ساتھ ہی ان کے ملنے کے لیے بھی ایک پروسس ترتیب دیا ہے۔اور ان کا ملنا دونوں کی تکمیل ہوتا ہے۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اسے ایک بھولی بسری خوشی یاد آئی۔بچپن سے وہ اسی طرح سوچتا اور کھوجتا آیا تھا۔مگر جب سے وہ مسلمان ہوا تھا' اسے اس طرح سوچنے اور کھوجنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔اسلام قبول کرتے ہی سفر کا حکم ملا تھا۔پھر زندگی کی دوسری مصروفیات ایسی شروع ہوئیں کہ وہ سب کچھ بھول ہی گیا۔لاہور میں وہ نت نئے مشاہدات میں گھرا رہا۔یہ البتہ بڑی بات تھی کہ قرآن وہ بہرحال باقاعدگی سے پڑھتا رہا...... اور نماز بھی۔قرآن کے بغیر تو اسے چین نہیں آتا تھا۔لیکن سوچنا اور غور کرنا وہ جیسے بھول ہی گیا تھا۔آج پہلے کی طرح سوچتے ہوئے اسے خوشی ہوئی۔اس راستے پر چل کر ہی تو اس نے ہدایت پائی تھی۔آج جیسے وہ پھر سے جی اٹھا تھا اس نے آگے کی تین آیات پڑھیں۔نیند کو باعثِ سکون بنایا۔رات کو پردہ پوش اور دن کو رزق کے لیے۔

اللہ اپنی نعمتوں کا بیان فرما رہا تھا۔نیند...... اللہ کی بہت بڑی نعمت۔دن بھر کا تھکا ہارا انسان

سوتا ہے تو نڈھال ہوتا ہے۔بعض اوقات تو انگلی ہلانے کی بھی سکت نہیں ہوتی اس میں۔اور نیند پوری کر کے اٹھتا ہے تو کیسا تازہ دم ہوتا ہے...... توانائی سے لبالب بھرا۔کارزارِ زندگی لڑنے کے لیے ایک بار پھر تیار۔اور اگر کوئی کسی وجہ سے محض دو رات نہ سو پائے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔سوچنے سمجھنے' فیصلہ کرنے کی قوت ختم' قوتِ عمل مفلوج...... آدمی کسی کام کا بھی نہیں رہتا۔اور رات کو پردہ پوش بنایا!

اندھیرا جو دن میں برا لگتا ہے۔کیونکہ اللہ نے دن کو معاش کے لیے بنایا۔دنیا کے کام کرنے ہوتے ہیں' جن کے لیے روشنی ضروری ہوتی ہے۔اندھیرا' جس سے آدمی ڈرتا ہے۔اندھیرا' جس میں ان جانے خوف چھپے ہوتے ہیں۔لیکن رات کو آرام کے وقت اس اندھیرے میں کتنا سکون ملتا ہے۔وہ خود روشنی میں کبھی سو ہی نہیں سکتا۔مکمل اندھیرے کے بغیر اسے نیند ہی نہیں آتی۔

رات پردہ پوش!

ایک دم اسے خیال آیا کہ رات بھی خلوت ہے۔اور محبت بھی خلوت کی چیز ہے۔گویا محبت کا رات سے خاص تعلق ہے۔اس خیال کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں اردو شاعری کا باب کھل گیا' جس میں ہجر اور وصال کی بڑی اہمیت تھی۔

اسے حیرت ہوئی اس نے محبت سمجھنے کے لیے اردو کا شاعری کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔لیکن وہ اس بات پر کبھی غور نہیں کر سکا تھا کہ ہجر اور وصل' دونوں ہی اردو شاعری میں رات سے منسلک ہیں۔ہجر کی فریاد ہوتی ہے تو شب ہجر کا تذکرہ ہوتا ہے۔اور وصل کی کیفیات بھی شب وصل کے حوالے سے بیان کی جاتی ہیں۔شاعری میں وصل کے حوالے سے ابتذال بھی ہے۔اردو کے استاد نے اسے محبت اور ہوس کا فرق سمجھاتے ہوئے یہ بات بتائی تھی۔اسے یاد تھا' انہوں نے حوالے میں اشعار بھی سنائے تھے۔دو شعر تو اسے اس وقت بھی یاد تھے......

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب
غم میں ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

[illegible] تو خالص لفنگا پن تھا...... کسی اوباش کا سا چیلنج......

اتنی اونچی بھی تو دیوار تیرے گھر کی نہیں
رات اندھیری کوئی آئے گی نہ برسات میں کیا!

پہلے کی طرح اس وقت بھی اس کی طبیعت مکدر ہوگئی۔

اردو کے استاد نے کہا تھا کہ وصل کوئی بری چیز نہیں۔برائی تو آدمی کے اندر ہوتی ہے مقدس عمل کو آدمی خراب کر دیتا ہے۔ہوس کو محبت کہہ کر اور گناہ کو وصل قرار دے کر۔ورنہ وصل تو محبت کی معراج ہے' اور ہجر اس معراج کی راہ گزر۔معصیت اور معصومیت میں پاتال اور آسمان جتنا بعد

اور فاصلہ ہے۔

اس نے سوچا...... لیکن گناہ اور وصل دونوں کے لیے ہے رات ہی۔ جسموں کے بازار بھی رات ہی کو سجتے ہیں۔ دن میں سوتے رہتے ہیں۔ ہوس پرست بھی رات ہی کے وقت بازاروں کا رخ کرتے ہیں۔

رات پردہ پوش!

اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے پتاجی اور ماتاجی کو کبھی ایک دوسرے کے بہت قریب دیکھا ہو۔ دن بھر پتاجی یا تو باہر ہوتے تھے' یا باہر دیوان خانے میں' جہاں وہ زمینوں کے معاملات نمٹاتے تھے۔ پھر رات کو وہ اپنے کمرے میں سوتے تھے' اور ماتاجی اس کے کمرے میں اس کے ساتھ سوتی تھیں۔ عبدالحق کو صرف ایک ایسا موقع یاد تھا' جب اس کو ماتاجی کے پتاجی کے کمرے میں جانے کا علم ہوا تھا۔ وہ شاید اس وقت پانچ چھ سال کا ہوگا۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تو ماتاجی اس کے پاس نہیں تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو ماتاجی کمرے سے نکل رہی تھیں۔ اس نے انہیں پکارا

"کیا بات ہے میرے چھوٹے ٹھاکر' آپ کیوں اٹھ گئے؟"

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" اس نے نندا سی آواز میں کہا۔

"تمہارے پتاجی کے پاس۔"

"کیوں؟"

"ان کی سیوا کرنی ہے۔"

اسے اب بھی یاد تھا۔ وہ سوال بہت کرتا تھا۔ "کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"پتی کی سیوا تو پتنی کا دھرم ہوتا ہے چھوٹے ٹھاکر۔"

"اور سیوا کیا ہوتی ہے؟"

"پتی کے پاؤں دبانا' سر میں تیل لگانا' ان کی تھکن دور کرنا۔"

"تو آپ روز سیوا کرتی ہیں پتاجی کی؟"

"تو اور کیا۔ میں نے کہا نا کہ یہ تو دھرم ہے میرا۔"

"وہ مجھے یہاں اکیلا چھوڑ جاتی ہیں۔"

ماتاجی اس کے پاس بیٹھیں اور اس کا سر سہلانے لگیں۔ "دیکھو چھوٹے ٹھاکر' دن رات تو میں آپ کے پاس ہوتی ہوں۔ آپ ہی کے ساتھ سوتی ہوں۔ ان کی سیوا کے لیے تھوڑے سے کو چلی جاتی ہوں' اور وہ بھی آپ کے سونے کے بعد۔ آپ کہتے ہیں تو نہیں جاؤں گی۔ پرنتو آپ کے پتاجی کے سر میں درد رہے گا۔ ٹانگوں میں پیڑ رہے گی......"

وہ تڑپ گیا۔ نہیں ماتاجی' آپ جائیں۔ روز جایا کریں۔ میری تو ایسے ہی آنکھ کھل گئی تھی۔

...و جاؤں گا۔"

ماتاجی چلی گئی تھیں' اور وہ واقعی چند منٹ میں سو گیا تھا۔

مگر اب اس چھوٹے سے حوالے سے بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ ماتاجی کے دیہانت کے بعد پتا...
...وب صورت کمرا اجڑ گیا تھا۔ وہ وہاں جاتے ہی نہیں تھے۔ وہ تو اس کے ساتھ سوتے تھے......
...ی کی جگہ لیٹ کر۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا۔ پتاجی عمر بھر کے ہجر سے دوچار تھے۔ ماتاجی کی جگہ لیٹ
...اید انہیں ان کی قربت کا احساس ہوتا ہوگا۔ شاید ہجر وصل میں بدل جاتا ہوگا۔ دوسری طرف وہ
...کے ہجر کے دکھ کو بانٹتے تھے۔

اور ماتاجی کے دیہانت کے چھ سات ماہ بعد وہ دہلی چلا گیا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا پتاجی کی
...ں کو۔ ان کا ہجر تو دہرا ہو گیا تھا۔ وہ دوبارہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ شاید اس کے کمرے
...نہیں اس کی یاد ستاتی ہوگی۔ جبکہ ان کے کمرے میں ماتاجی کی یادیں ہوں گی۔ مگر یہ لمحہ تھا کہ
ان سے روٹھ گئی تھی۔ پہلی بار وہ ٹھیک سے اس دن سوئے تھے' جب انہوں نے اسے اپنے
...ھ لیٹ کر سونے کو کہا تھا۔ اس رات اس سے لپٹ کر گہری نیند سو گئے تھے۔

تو اللہ نے دن کو معاش کے لیے بنایا اور رات کو آرام کے لیے...... نیند کے لیے دن کا وقت
...ی ذمہ داری پوری کرنا...... لوگوں کے حقوق ادا کرنا...... فرائض کی ادائیگی۔ اور رات...... نیند
آرام کا وقت خالصتاً آدمی کا اپنا ذاتی وقت۔ اور محبت بھی بہت ذاتی چیز ہے۔ تو اس کے لیے
...ت ہی کا وقت ہونا۔ رات آرام کا وقت! رات محبت کا وقت!

رات پردہ پوش!

اس کے ذہن میں رات کے حوالے سے سورۃ المزمل کی آیات آئیں' جن میں اللہ نے
...ہتائی فرمائی تھی کہ قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے۔ اس سے اگلی آیات میں تھا کہ رات
...واٹھنا نفس پر قابو رکھنے کے لیے اور قرآن پڑھنے کے لیے بہت ہی خوب ہے۔ جبکہ دن میں یقیناً
...ہاری بہت سی مصروفیات ہیں۔ اور ان آیات میں خطاب حضور ﷺ سے تھا

لیکن ذہن میں اب بھی خلش تھی۔ کچھ اور آیات تھیں' جو یاد آتے آتے رہ جاتی تھیں۔

قرآن کے معاملے میں عبدالحق کا ایک اور تجربہ تھا۔ اس میں اللہ کی رحمت بندے کے ساتھ
...وتی تھی۔ اب اسے جو آیات یاد آ رہی تھیں' وہ انہیں پڑھنا چاہتا تھا لیکن یہ یاد کرنا کہ وہ آیات کس
...ورۂ مبارکہ میں ہیں' آسان نہیں تھا۔ مگر ایسا بارہا ہوا تھا کہ اس کے دل میں ایک سورۂ کا نام ابھرا'
...ور اس نے کھول کر دیکھا تو واقعی وہ آیات اس سورۂ مبارکہ میں تھیں۔

وہ سوچتا تھا کہ کوئی اس دور میں بھی معجزے دیکھنا چاہے تو قرآن کا دامن تھام کر دیکھ لے۔
...یہ بھی تو معجزہ ہے کہ قرآن کو وہ لوگ بھی حفظ کر لیتے ہیں۔ جن کی مادری زبان عربی نہیں ہوتی۔ اس

امر پر اس کی حیرت بھی کم نہیں ہوتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا حافظہ بہت اچھا ہے لیکن وہ کسی درسی
کتاب کے دس بارہ صفحات پر مشتمل ایک باب کو بھی لفظ بہ لفظ یاد نہیں کر سکتا تھا...... وہ بھی اس
زبان میں' جسے وہ پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔ جس پر اسے قدرت حاصل تھی۔

سچ تو یہ کہ وہ بھی قرآن حفظ کرنا چاہتا تھا لیکن اسے ہمت نہیں ہوتی تھی۔

اس وقت بھی اللہ کی مدد اس کے لیے آ پہنچی۔ اس کے ذہن میں سورۂ ذاریت کا نام ابھ
اس نے اوراق پلٹے۔ سورۂ ذاریت کھول لی۔ اور واقعی وہاں وہ آیات موجود تھیں......

''البتہ متقی لوگ ہوں گے باغوں میں اور چشموں میں' لے رہے ہوں گے جو عطا فرمایا ہوگا
انہیں ان کے رب نے' اور اس کے بعد اللہ نے اس عنایت کا سبب اور ان بندوں کی وہ خصوصیات
بیان فرمائی تھیں' جو اس کی بارگاہ میں مقبول ہوئی ہیں۔ آگے اللہ فرماتا تھا۔' بلاشبہ یہ لوگ تھے اس
سے پہلے بہت اچھا اور معیاری کام کرنے والے تھے۔ یہ لوگ ایسے کہ کم ہی راتوں کو سویا کرتے
تھے۔ اور رات کے پچھلے پہروں میں یہ استغفار کیا کرتے تھے۔ اور ان کے مالوں میں حق مانگنے
والوں کا اور حاجت مندوں کا۔'

یعنی راتوں کو اپنی نیند اور آرام چھوڑ کر اللہ کی عبادت کرنا' قرآن پڑھنا اور استغفار کرنا اللہ
کی مہربانی کو پکارنا ہے۔

وہی رات!

رات پردہ پوش!

رات' نیند اور آرام۔ رات محبت اور عشق۔ رات ہجر اور وصال۔ رات خالص ذاتی وقت!

عبدالحق کو یاد آیا۔ تعلیم کے دوران ایک بار اس نے کتاب میں اللہ کے کسی برگزیدہ بندے
کی سوانح میں لکھا دیکھا کہ فلاں تاریخ کو ان کا وصال ہوا۔ یہ وہی عرصہ تھا' جس میں وہ عشق و محبت
کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا' اور اردو شاعری اس کے زیر مطالعہ تھی۔ یہ پڑھ کر اس کا ذہن الجھا تو اس
نے اردو کے استاد سے رجوع کیا' جو کہتے تھے کہ کوئی الجھن درپیش ہو تو مجھ سے کلاس کے باہر آ کر
بات کیا کرو۔

استاد اس کی بات سن کر مسکرائے۔' یہاں وصال کا مطلب انتقال ہے۔' انہوں نے کہا۔

''لیکن وصال اور انتقال میں تو بہت فرق ہے۔'' اس نے اعتراض کیا تھا۔

''یہ تصوف کی اصطلاح ہے۔ عشق حقیقی سے تعلق ہے اس کا۔'' استاد نے وضاحت کرتے
ہوئے کہا۔'' دیکھو' جو بندہ اپنے رب سے اور اس کے رسول ﷺ سے عشق کرتا ہے' اس کے لیے
یہ زندگی' دنیا میں یہ قیام درحقیقت ہجر ہے۔ اور موت اس کے لیے موت نہیں' اپنے محبوب کا وصل
ہے۔ وہ رب سے جا ملتا ہے' تو یہ تو وصال ہوا نا۔''

وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ اندر ہی اندر وہ اس جواب سے پھڑک گیا تھا لیکن پھر اس نے
اض کیا۔'' تو وہ محبوب سے ملنے کی آرزو پوری کرنے کے لیے خودکشی کیوں نہیں کر لیتے؟''

استاد مسکرائے۔'' وصل بہت بڑی نعمت ہے بیٹے' اور بڑی نعمتیں یونہی تو حاصل نہیں ہوتیں۔
و عشق کی کسوٹی ہے۔ ہجر ہی تو درجہ عشق کا تعین اور اس کی تصدیق کرتا ہے۔ محبوب ہجر میں مبتلا
کے عاشق کو جانچتا ہے۔ اب سوچو' اگر کوئی اللہ سے عشق کرتا ہے تو زندگی کو یعنی محبوب کے ہجر کو
ت تو تسلیم کرے گا نا۔ محبوب کی دی ہوئی کسی بھی چیز کو کوئی عاشق ٹھکرا نہیں سکتا' خواہ وہ ہجر ہی
وں نہ ہو۔ اس آزمائش سے سرخروئی کے ساتھ گزرنے پر ہی تو اسے انعام میں وصل ملے گا۔
ق تو بیٹے تپیا مانگتا ہے اور عشق کی تپیا ہجر ہے۔''

عبدالحق کو یاد تھا' یہ کہتے ہوئے استاد نے ایک شعر سنایا تھا......

یہ عشق نہیں آساں' بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے

اسے یاد تھا کہ وہ عشق حقیقی اور عشق مجازی میں بہت الجھتا تھا...... خاص طور پر شاعری کے
الے سے۔ اردو کے استاد کہتے تھے کہ جو شعر بے ساختہ کہا جاتا ہے۔ وہ الہامی ہوتا ہے۔ اس کا
ت یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک اس کی تشریح ہوتی ہے' اور شعر پڑھنے یا سننے والا اسے ایک بالکل
ف مفہوم میں لیتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک شعر سناتے تھے۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ

''اب کوئی اسے عشق مجازی کی طرف لے جائے' یا عشق حقیقی کی طرف۔'' استاد نے کہا تھا۔

عبدالحق نے خاصی دیر اس پر غور کیا تھا لیکن اسے تو وہ خالص رومانوی شعر لگا تھا۔ عشق حقیقی
کا تو اس پر گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہی بات اس نے استاد سے بھی کہی تھی۔

''اب اس طرح سے سوچو۔'' استاد نے کہا تھا۔'' تمام انسان پروانے ہیں' شمع یہ دنیا ہے
اور پروانے کی فطرت خالق کل نے ایسی بنائی ہے کہ وہ شمع کی طرف لپکتا تھا۔ روز ازل تو اسے نظر
ہی نہیں آتا۔''

اب عبدالحق سمجھ سکتا تھا۔ اللہ نے دنیا بنائی' اور بہت خوب صورت بنائی۔ متاع زیست عطا
فرمایا اور انسان کے دل میں اس کی محبت ڈال دی۔ پھر خود کو چھپاتے ہوئے اسے سب کچھ بتا دیا۔
یہ بھی کہ دنیا عارضی ہے۔ اور یہ بھی کہ جنت اس سے کروڑوں گنا خوبصورت اور نعمتوں والی
ہے' اور وہ اسے ملے گی' جو اس عارضی دنیا کی ترغیبات سے صرف نظر کر کے' بن دیکھے اللہ پر ایمان
لائے گا' اور اس کی اور اس کے پیغمبروں کی اطاعت کرے گا۔ مگر آدمی تو دنیا کی رنگینیوں میں ایسے

الجھتا ہے کہ اللہ سے یاد ہی نہیں رہتا‘ ویسے ہی جیسے پروانے شمع کی طرف لپکتے ہیں۔

واقعی...... یہ تو عشقِ حقیقی کا معاملہ ہے۔

مگر اسی لمحے اسے کچھ یاد آیا وہ شاک میں رہ گیا۔ ارے......اس رات ہیرا منڈی میں مغنیہ یہی شعر تو گا رہی تھی۔ اور پھر کیسے تکرار کر رہی تھی‘ جیسے چیلنج کر رہی ہو......اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ۔

اسی وقت اذان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ارے صبح ہوگئی۔ اس نے ہڑبڑا کر سوچا۔ پھر دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ ارے......آج میں تہجد سے محروم ہوگیا۔

اس کے اندر ایک جھنجلاہٹ سی ابھری۔ یہ سونا کیوں ضروری ہے تہجد کے لیے۔ جواب فوری طور پر اس کے اندر ابھرا۔ یہ فرض نماز نہیں ہے نادان‘ یہ نمازِ محبت ہے اور نہ سونا تو بہت آسان ہے۔ ہاں سونا‘ اور پھر نیند پوری نہ ہونے کے باوجود تھکے ہوئے جسم کے ساتھ اپنے رب سے خلوت میں......خصوصی ملاقات کے لیے اٹھنا اور تیار ہونا مشکل ہے‘ جبکہ ہوا کے جھونکے لوری سناتے ہوں اور تھپکیاں دیتے ہوں‘ تو جاگنا آسان نہیں ہوتا۔

یہی تو محبت کی نماز ہے!

❋ ❋ ❋

عبدالحق کو یہ احساس تو تھا کہ یہ اس پر ایک ایسی رات گزری ہے‘ جو زندگی کا رخ تبدیل کر دیتی ہے لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ کتنی زیادہ اور کیسی کیسی تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں۔ یہ بھید تو اس پر رفتہ رفتہ کھلتا تھا۔

پہلی تبدیلی کا احساس تو اسے فجر کی نماز میں ہی ہوگیا۔ نماز میں حضوری کی وہ کیفیت نہیں تھی‘ جو اس نماز کا خاصہ تھی۔ اب تو نماز میں اس کے تصور میں نور بانو کا سراپا لہرا رہا تھا۔

اسے بے چینی تو ہوئی لیکن اس نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کے خیال میں یہ وقتی تبدیلی تھی لیکن باقی نمازوں میں بھی یہی کیفیت رہی تو وہ پریشان ہوگیا۔

اگلے روز سے اس نے اس کیفیت سے لڑنا شروع کر دیا۔ یوں نماز کے دوران وہ ایک باطنی جنگ لڑنے لگا۔ تمام وقت وہ نور بانو کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا تھا لیکن وہ ضدی سراپا تھا کہ اس کے تصور سے چپکا رہتا۔

اُس روز وہ فجر کے بعد مولوی صاحب کے پاس رک گیا۔ اس نے سورۃ المزمل کی ان آیات کے حوالے سے بات کی۔ ”یہ رات کی عبادت کی کیا اہمیت ہے مولوی صاحب؟“

مہر علی صاحب نے چند لمحے سوچا‘ پھر بولے۔ ”دیکھو پتر‘ دن تو اللہ نے دنیا کے لیے بنایا ہے اور رات آرام کے لیے......“

”مگر نماز دن میں بھی تو پڑھی جاتی ہے۔“ عبدالحق نے اعتراض کیا۔

”وہ تو اللہ کی رحمت ہے۔ وہ اپنے کسی بندے کو بھی محروم نہیں رکھنا چاہتا۔ اس لیے دن میں بھی فرض کر دیں۔ اب یہ سمجھ لو کہ دن کی نماز تو ایسے ہی ہے‘ جیسے دنیا کے کام۔ جیسے رزق کے لیے کوشش کرنی ہے‘ ویسے ہی نماز بھی پڑھنی ہے۔ یہ اس کی رحمت کہ اس نے رات کی ابتدا میں بھی نماز فرض کر دی۔ تاکہ تم آرام کے لیے لیٹو‘ تب بھی تمہارے اعمال میں یہ لکھ لیا جائے کہ آرام سے پہلے بھی تم نے عبادت کی تھی۔ اور صبح کی نماز فرض بھی رحمت ہے کہ تم دنیاوی دن کا آغاز بھی عبادت سے کر رہے ہو۔ اور اسی لیے فرض نماز جماعت سے ہے۔ ورنہ تو اللہ کو وہ اعمال بھی ناپسند ہیں‘ جن میں دکھاوے کا شائبہ بھی ہو۔ تم نے غور نہیں کیا پتر کہ اجتماعی عبادت صرف فرض نماز ہے۔ باقی نماز تو گھر جا کر پڑھنا ہی بہتر ہے۔ تو دن کی نماز کو تو دنیا ہی کا کام سمجھو۔“

”تو دن میں نوافل پڑھے جا سکتے ؟“

”یہ بہت نازک سوال ہے پتر۔ پڑھ سکتے ہو‘ مگر اس صورت میں کہ تم پر تمہارے اہلِ خانہ کے‘ پڑوسیوں‘ رشتہ داروں اور بستی والوں کے جو حقوق ہیں‘ وہ تم نے احسن طریقے سے ادا کر دیے اور اپنے لیے حلال رزق بھی حاصل کر لیا۔“

”اور اس کے بغیر دن میں نوافل پڑھنے کا اجر نہیں۔“

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ دیکھو نا‘ دو باتیں ہیں اس میں۔ ایک تو تم کسی کی حق تلفی کر رہے ہو۔ دوسرے لوگ تمہیں دیکھیں گے تو اس عبادت کی بنیاد پر تمہیں عابد و زاہد اور متقی اور پرہیزگار سمجھنے لگیں گے۔ تو تم سمجھو نہ سمجھو‘ یہ دنیا دکھاوا ہوگا‘ جو اللہ کو پسند نہیں۔ اسی لیے رات کی عبادت کی بڑی فضیلت ہے۔ بھئی رات کی عبادت تو محبت ہے۔ تھکے ہوئے ہو۔ جی چاہتا ہے کہ بس لیٹو اور سو جاؤ۔ لیکن جا کر وضو کرتے ہو‘ پھر نماز پڑھتے ہو‘ قرآن پڑھتے ہو‘ ذکر و استغفار کرتے ہو‘ اس وقت میں جو خالص تمہارا اپنا ہے اور تمہیں دیکھنے والا کوئی نہیں۔ اس عبادت سے تم دنیا میں عزت اور شہرت نہیں کما رہے‘ صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کر رہے ہو۔

”اب دوسرے زاویے سے سوچو۔ اپنے محبوب سے تو ہر کوئی تنہائی میں ملنا چاہتا ہے۔ ربطِ خاص تو خلوت میں ہی ہے نا۔ جلوت میں تو رسوائی ہوتی ہے۔ اچھے عاشق تو رسوائی گوارا نہیں کرتے۔ محبوب کو بھی یہ اچھا نہیں لگتا۔ تو پتر تنہائی اور خلوت تو رات میں......رات کے اندھیرے میں ہے‘ جب کوئی تمہیں دیکھنے والا نہیں‘ سوائے تمہارے محبوب کے۔ سمجھ رہے ہو نا پتر؟“

رات پردہ پوش! عبدالحق نے دل میں سوچا۔ ”جی......میں سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے مولوی صاحب سے کہا۔

مہر علی صاحب نے گہری سانس لی۔ ”دیکھو پتر‘ انسان کی فطرت ایسی ہے کہ گناہ کی طرف

لپکتا ہے۔ اس کے لیے گناہ ہلکا ہے اور نیکی بھاری' اللہ گناہ کو پسند نہیں کرتا' لیکن بندے کی توبہ اسے بہت پسند ہے۔ لیکن بندے کے کھل کر اعلانیہ گناہ کرنے پر اللہ غضب ناک ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ڈھٹائی...... بلکہ اس سے بھی بہت آگے بڑھ کر اللہ کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ اور یاد رکھو' نیکی ہو یا گناہ' اللہ یہ پسند نہیں کرتا کہ بندہ اس پر گواہ بنائے۔ اور اللہ بہت کافی ہے گواہی کے لیے' وہ سمیع وبصیر ہے' علیم وخبیر ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔ گناہ کی تشہیر کی تو تم نے بغاوت کی' اعلانِ جنگ کیا۔ نیکی کی تشہیر کی تو نیک نامی اور عزت کی شکل میں صلہ وصول کرلیا۔ وہ رحیم وکریم اجر سے تو پھر بھی محروم نہیں کرے گا لیکن جو بے حساب اجر مل سکتا تھا' وہ تم نے کھو دیا۔ اور پتر' اللہ ستار العیوب ہے...... پردہ رکھنے والا۔ وہ تو گناہ گاروں کا بھی پردہ رکھتا ہے۔ اس نے رات بنائی' پردہ پوش۔ گناہ بھی چھپا لیتی ہے اور نیکی بھی۔ جبکہ معاف کرنے والا اور اجر دینے والا تو سب کچھ جانتا ہے۔ وہ نیکی' وہ عبادت' جس پر اس کے سوا کوئی گواہ نہیں' وہ تو عشق ہے۔ اور اس کے اجر کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ اور وہ ستار تو اپنے بندوں کے گناہ بھی بندوں پر عیاں نہیں کرتا۔ اب سوچو' رات نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔"

رات پردہ پوش ہے!

"اللہ نے جو کچھ بھی پیدا فرمایا' اس میں اتنے بھید ہیں کہ بندہ پوری عمر کھوجتا رہے تو بھی اس پر نہ کھلیں۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "رات کے بھیدوں کے بارے میں سوچتے رہا کرو پتر۔ اور اللہ سے پوچھا کرو۔"

عبدالحق کو میر کا ایک شعر یاد آگیا......

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا میر
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

❁ ❁ ❁

نادرہ کو اب رات سے خوف آتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے رات سے نفرت ہوگئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ رات کا سکون اور راحت وہ پیچھے ہندوستان میں ہی چھوڑ آئی ہے۔ پاکستان میں جو اس نے پہلی رات گزاری تھی' اس سے رات کی خوف ناکی کا آغاز ہوا تھا۔ اور اسی کے بعد اس نے کوئی رات سکون کی نہیں گزاری تھی۔ اور رات کی نیند کو تو وہ ترس ہی گئی تھی۔ شام ہوتے ہوتے اس کا خوف بڑھتا جاتا۔ اور سورج غروب ہونے کے بعد تو وہ اندر ہی اندر لرزتی رہتی تھی۔

دوسرے اسے شام کے بعد سج سنور کر کوٹھے پر بیٹھنے سے نفرت تھی۔ حالانکہ اسے کبھی بہت زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اسے ان لڑکیوں پر ترس آتا تھا' جو بعض اوقات گھنٹوں وہاں بیٹھی رہتی تھیں۔

کوٹھے پر وہ جتنی دیر بیٹھتی' سر جھکائے رہتی۔ نگاہ اٹھانا تو اس کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ وہ تو بس یہ سوچتی رہتی تھی کہ زمین دھنس جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس ذلت کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا' اور وہ اس کی مستحق بھی نہیں تھی۔

مگر اب اس میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ نظریں اٹھا کر دیکھتی تھی' اور جہاں تک نظر جا سکتی تھی' وہاں تک کا جائزہ لیتی تھی۔

اسے اپنی تبدیلی کا موہوم سا احساس تھا۔ کیونکہ بنیادی طور پر تسلسل کے باوجود اس کا وہ عمل غیر ارادی تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ باہر کے لوگ اس تبدیلی کو جان گئے ہیں' اور اس بارے میں تجسس بھی کرتے ہیں۔

سامنے پان کی دکان پر پان لگانے والے تارے نے دکان کے مالک سے کہا۔ "استاد...... پنچھی نے پنجرہ قبول کرلیا ہے۔"

منظور نے اسے دیکھا۔ "کس پنچھی کی بات کر رہا ہے بے؟"

"نرگس کی استاد' اور کس کی۔"

نرگس منظور کی کمزوری تھی۔ جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا' تبھی وہ اس پر دل وجان سے فدا ہوگیا تھا۔ حالانکہ تماش بینی اس کی فطرت میں نہیں تھی۔ پان کی یہ دکان تو اس کے لیے روزی کا ٹھیا تھا۔ دوسرے بہتات بھی آدمی کا دل ہرا کر دیتی ہے۔ وہاں دیکھنے کو تماش بینوں کے علاوہ چہروں اور جسموں کے سوا تھا ہی کیا۔ سو وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اور جگہ ایسی تھی کہ اس کا کام بہت چلتا تھا۔ سہ پہر سے وہ اور تارا پان لگانا شروع کرتے تھے۔ شام ڈھلتے ہی جب پہلا چراغ روشن ہوتا تو بازار میں رونق شروع ہو جاتی۔ ساتھ ہی اس کا کام اور رات گہری ہوتے ہوتے دوبارہ پان لگانے پڑ جاتے۔ ایسے میں فرصت کسے ہوتی کہ کسی کو دیکھے۔

لیکن ایک دن اتفاق سے اس کی نظر سامنے والے کوٹھے کی طرف اٹھی اور اس نے نرگس کو دیکھ لیا۔ وہ اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بازار کی لڑکی تو کہیں سے لگتی ہی نہیں تھی۔ اور وہ بہت خوب صورت اور تروتازہ تھی۔ سرخی اور غازے کی تو اس کے چہرے کو ضرورت ہی نہیں تھی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

وہ شام کی پہلی ساعت تھی۔ اس وقت دھندا ذرا ہلکا ہوتا تھا اور زور پکڑ رہا ہوتا تھا۔ اس لیے کچھ فرصت مل جاتی تھی۔ سو وہ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس لڑکی کی آنکھیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ تھی کہ نگاہیں اٹھا ہی نہیں رہی تھی۔

"او منظورے' کہاں کھویا ہوا ہے۔ میری سن ہی نہیں رہا۔" ایک گاہک نے اسے ٹوک دیا۔

گاہک کو نمٹایا ہی تھا کہ ایک اور گاہک آگیا۔ درمیان میں مہلت ملی تو اس نے کوٹھے کی

طرف دیکھا۔ مگر وہ موجود نہیں تھی۔

پھر تو وہ معمول بن گیا۔ شام کی فرصت میں وہ اسے دیکھتا رہتا۔ رات کی مصروفیت کا اسے غم نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ کوٹھے پر موجود ہی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن وہ اس کی آنکھیں نہیں دیکھ سکا۔ وہ نظریں اٹھاتی ہی نہیں تھی۔

منظور کو بھی ضد ہو گئی کہ وہ آنکھیں دیکھنی ہیں۔ لیکن شاید اسے بھی ضد تھی کہ وہ نظریں نہیں اٹھائے گی۔ پھر ایک دن اس نے نرگس کو اٹھتے اور جاتے دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ تو بہت خوبصورت ہے۔ اس دن وہ اس پر مر مٹا۔ لیکن آنکھوں کا خبط پھر بھی باقی رہا۔

ایک دن شام سے پہلے اچھو پان لینے کے لیے آیا تو منظور نے اس سے پوچھ لیا۔ اس سے پتا چلا کہ اس کا نام نرگس ہے۔

"خیر تو ہے؟" اچھو نے پوچھا۔ "تمہیں تو کبھی کسی میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔"

"بس اچھو میاں، دل آ گیا ہے اس پر۔"

"اپنی اوقات میں رہ کر سوچا کرو۔"

"ایسا کیا ہے اچھو میاں؟" منظور نے تنک کر کہا۔ "کوٹھے پر تو بیٹھی ہے نا؟"

"صرف اس لیے کہ نیلم بائی چاہتی ہے کہ اس کا دماغ نہ خراب ہو۔ ورنہ تو اس کے دو مستقل چاہنے والے ہیں۔ اور جانتے ہو؟ دونوں کیا دیتے ہیں۔ پانچ پانچ سو روپے۔"

منظور کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "بے وقوف بناتے ہو استاد۔"

"نہیں۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ پانچ سو روپے میں بھی وہ لوٹ کا مال ہے۔ اسے دیکھ کر تو نواب زادہ اشرف علی خان بھی کڑھتے ہیں۔ وہ تو پوری ریاست کے بدلے میں بھی سستی ہے۔"

منظور کی سمجھ میں بات آ نہیں رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "کڑھتے کیوں ہیں وہ نواب زادے؟"

"اس پر کہ کنکر کے پیچھے سب کچھ لٹا دیا۔ اور ککھر ہو گئے تو ہیرا نظر آ گیا۔ اب ہیرے کو چھونا بھی چاہیں تو چھو نہیں سکتے۔"

"یہ ہیں کون نواب زادہ۔ کیا نام ہے ان کا؟"

"اشرف علی خان۔ اور یہ نام ہے نہیں تھا۔ نواب کی اولاد تھے۔ باپ بہت کچھ چھوڑ کر مرے۔ دولت، حویلی، زمین جائیداد۔ بدقسمتی سے یہاں بازار میں آئے اور کسی کو دیکھ کر دل ہار بیٹھے تمہاری طرح۔ بس پھر کیا تھا، ایک مسکراہٹ کے لیے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے لگے۔ اور منظور دولت کتنی ہی ہو۔ لٹاؤ تو ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ سو وہ بھی خالی ہو گئے۔ خاندانی ہیرے جواہرات تو ویسے ہی محبوبہ کی نذر کر دیے تھے۔ مگر اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ طوائف کی تعریف یہ ہے

کہ تحفوں سے بھی نہیں بہلتی۔ دولت کا چڑھاوا بھی ضروری ہے۔ تبھی تو وہ کچھ دن کے لیے ہی سہی کسی ایک کی ہو کر بیٹھتی ہے۔ تو زمین جائیداد گروی ہوئی۔ پھر حویلی بھی رہن رکھنی پڑی۔ ایسے خالی ہوئے کہ رہنے کا ٹھکانہ بھی نہیں رہا۔ انہیں کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ کوٹھے پر آ کر بتایا تو محبوبہ نے منہ پھیر لیا۔ وصل کا دروازہ تو اسی دن بند ہو گیا۔ لیکن انہوں نے سوچا نہ سہی وصل، دیدار تو ہوتا رہے گا۔ سو اسی در کے کتے بن گئے۔ اب نرگس کو دیکھا تو سوچتے تھے کہ جتنا نیلم پر گنوایا، اللہ نے اس سو گناہ زیادہ بھی دیا ہوتا تو نرگس کی محض ایک مسکراہٹ پر قربان کر دیتے۔ وہ تو میاں منظور ہیرا ہے، ہیرا۔"

منظور حیرت سے وہ داستان سن رہا تھا۔ وہ چپ ہوئے تو بولا۔ "مگر تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو اچھو میاں؟"

اچھو میاں کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ مچلی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ "بہت نا سمجھ ہو میاں...... وہ میں ہی تو ہوں...... جب کا نواب زادہ اشرف علی خاں اور آج کل کا اچھو۔"

منظور سے تو کچھ دیر بولا ہی نہیں گیا۔ مگر آتشِ شوق بھڑک اٹھی تھی۔ پانچ سو روپے بہت بڑی رقم تھی لیکن وہ بھی گیا گزرا نہیں تھا۔ رات تک دس سے پندرہ سیر پان نکال لیتا تھا۔ بچت بھی سو سے کم نہیں ہوتی تھی۔ کبھی دو سو بھی ہو جاتی تھی۔ تو کیا وہ شوق کے لیے ایک بار پانچ سو بھی نہیں خرچ کر سکتا...... صرف ایک بار!

سو اس نے دل کڑا کر کے کہا۔ "اچھو میاں، میں بھی پانچ سو دوں گا۔ ایک بار مجھے اس سے ملوا دیں۔"

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ نیلم بائی نہیں مانے گی۔"

"کیوں نہیں مانے گی۔ بازار میں دکان لیے بیٹھی ہے۔ کھرے پیسے دوں گا۔"

"وہ عقل مند دکان دار ہے۔ اچھے مال کو باسی ہونے سے بھی تو بچانا ہوتا ہے۔ وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے برسوں فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ تبھی تو تیسرے گاہک کو آج تک قبول نہیں کیا اس نے۔"

منظور گڑگڑانے لگا، خوشامد کرنے لگا۔ خدا کے لیے نواب صاحب...... ایک بار، بس ایک بار۔"

اچھو میاں موم ہو گئے۔ "برسوں کے بعد کسی نے اتنی عزت دی ہے، جو میں بھول ہی چکا تھا۔ اس نوابی کی خاطر کوشش کروں گا۔ لیکن میاں، کام آسان نہیں ہے۔ میں وعدہ نہیں کر سکتا۔"

ایک ہفتہ گزر گیا۔ منظور میاں اچھو میاں سے روز پوچھتا۔ مگر وہ کہتے...... بات نہیں بنی میاں۔

پھر ایک دن وہ آئے تو بولے۔ "بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔ میاں اوور ٹائم کے لیے۔ یہ جو تھوڑی دیر وہ کوٹھے پر بیٹھتی ہے۔ یہ وقت ایک دن کے لیے تمہارا ہوگا۔ مگر میاں بس ایک گھنٹا ملے گا۔"

منظور تو نہال ہو گیا۔ "شکریہ نواب صاحب۔"

"مگر ہاں، پانچ سو میں نہیں مانی وہ۔ کہتی تھی، اصول توڑوں گی تو ریٹ بھی زیادہ ہوگا۔ ایک ہزار لے گی وہ۔"

منظور کا دل تو بیٹھ گیا۔ مگر پھر اس نے سوچا، زندگی میں ایک بار تو بیوی بچوں سے ہٹ کر اپنے لیے کچھ سوچا ہے۔ "ٹھیک ہے تو اب صاحب میں دوں گا۔"

"بس تو کل مغرب ہوتے ہی آ جانا۔"

اگلی شام منظور کسی سولہ سالہ عاشق کی طرح نیلم بائی کے کوٹھے پر پہنچا۔ نیلم بائی کو رقم دے کر وہ کمرے میں گیا، جہاں نرگس موجود تھی۔ اسے قریب سے دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ لڑکی تھی کہ فانوس۔ بس ایک چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی...... اس کے چہرے کی بے زاری!

"آپ مسکراتی نہیں؟" اس نے بات شروع کی۔ وہ بہت مرعوب ہو رہا تھا۔

"اس کا آپ سے کیا واسطہ۔ آپ اپنا مطلب پورا کریں۔" بڑی بے رخی سے جواب ملا۔

"اچھا آپ نگاہیں تو اٹھائیں۔ مجھے آپ کی آنکھیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"آنکھوں کی قیمت آپ نے ادا نہیں کی ہے۔"

"تو وہ بھی لے لیجیے۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ ابھی میرے پاس بہت کچھ ایسا ہے، جو برائے فروخت نہیں ہے۔"

وہ اصرار کرتا رہا۔ اور وہ سخت ہوتی گئی۔ آخر وہ جھنجلا گیا۔ ایک ہزار روپے اس کی کم از کم چھ ماہ کی کمائی تھے۔ اور یہاں گھاس ہی نہیں ڈالی جا رہی تھی۔ وہ تو محبت کرنے والے کی حیثیت سے آیا تھا۔ مگر یہاں اسے تماش بین بنایا جا رہا تھا۔

لیکن وہ تماش بین تھا نہیں۔ اپنی بھاری رقم وصول کرنے کی جھنجلائی ہوئی کوشش میں وہ تماش بین بن تو گیا۔ مگر تماش بینوں والی فطری جارحیت اس میں بھی نہیں تھی۔ اور دوسرا فریق عدم تعاون کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ خوب صورت لڑکی اس کے لیے تو برف کی سل ثابت ہو رہی تھی۔

تماش بین نہ ہونے کی وجہ سے منظور احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ اس نے اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی تو وہ بھی اسی احساس کے تحت۔ اس کا خیال تھا کہ ایک تو 'اوور ٹائم' ہونے کی وجہ سے نرگس جھنجلا رہی ہوگی۔ دوسرے اسے معلوم ہوگا کہ وہ سامنے پان کی دکان چلانے والا منظور ہے۔ اس لیے وہ اس کی تحقیر کر رہی ہے۔

وہ اپنی دکان پر پہنچا تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بری طرح لٹ گیا ہے۔ اتنی بھاری رقم خرچ کرنے کے بعد بھی اسے کچھ نہیں ملا۔ اسے تو عزت بھی نہیں ملی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ بات وہ نرگس سے کہتا تو جواب ملتا...... نادان ہو۔ عزت لینے اس کے پاس آئے ہو، جس کی اپنی

کوئی عزت نہیں......

مالی نقصان کا احساس تو خیر فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا، کوئی بات نہیں۔ چھ مہینے بعد ہی سہی، رقم تو پوری ہو جائے گی۔ وہ سمجھے گا کہ اس کو ایک ہزار روپے میں بہت اچھا سبق مل گیا ہے۔ بازار میں وہ روزی کے لیے بیٹھا ہے، تماش بین کے لیے نہیں۔ یہ تجربہ اسے ہمیشہ یاد رہے گا لیکن رہ رہ کر اسے ایک خیال ستاتا تھا۔ کاش اس نے وہ آنکھیں دیکھ لی ہوتیں۔ پھر اسے کوئی غم نہ ہوتا۔

اور اب اس نے دیکھا کہ نرگس کی نظریں اٹھی ہیں، اور وہ بھی ایسے کہ جھکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہیں۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ ان آنکھوں کو دیکھنے کی تو اسے آرزو تھی۔

فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ درمیان میں پتلی سی سڑک تھی، جس کے اس طرف وہ بیٹھا اور اُس طرف وہ کوٹھا تھا۔ روشنی کی بھی چکاچوند تھی لیکن نرگس دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بہرحال مسحور سا ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر نرگس نے سر گھمایا اور دکان کے برابر ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ یہ وہ لمحہ تھا، جب منظور نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔

وہ بہت خوب صورت شربتی آنکھیں تھیں۔ منظور کو لگا کہ اس کے ہزار روپے آج وصول ہوئے ہیں۔ اسی لمحے اس کے دل میں پھر آرزو جاگی کہ وہ ان آنکھوں کو سامنے بیٹھ کر دیکھے لیکن فوراً ہی وہ چوکنا ہو گیا۔ حماقت ایک ہی بار اچھی ہوتی ہے، وہ بھی صرف سبق سیکھنے کے لیے!

نرگس اب دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر منظور اسی کو دیکھتا رہا۔ وہ ان نگاہوں کے سفر کو سمجھ چکا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق چند لمحوں کے بعد وہ نظریں سفر کرتی ہوئی پھر ہوٹل پر آ رکیں۔ اور چند لمحے بعد پھر پہلی سمت گھوم گئیں۔

اتنی دیر میں منظور سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ "نہیں تارے، تیرا خیال غلط ہے۔" اس نے تارے سے کہا۔

پان لگانے میں منہمک تارے نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ "کون سا خیال استاد؟" وہ اتنی دیر میں اس بات کو بھول بھی چکا تھا۔

"پنچھی نے پنجرے کو اب بھی قبول نہیں کیا ہے۔"

"دیکھو تو استاد کیسے شوق سے بازار کی رونق کو دیکھ رہی ہے۔ پہلے تو نظر ہی نہیں اٹھاتی تھی۔"

"تو ابھی بچہ ہے تارے۔ اس کی نظروں میں شوق نہیں، تلاش ہے۔"

"تلاش! کیسی تلاش استاد؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ پر لگتا ہے کہ پنچھی کسی ایسے مہربان کو تلاش کر رہا ہے، جو اس کے خیال میں پنجرے کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ یہ آنکھیں رہائی کے خواب دیکھ رہی ہیں تارے۔"

اور تارا منظور کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

❁ ❁ ❁

"پتر عبدالحق! تم نے لاہور کا حال تو مجھے سنایا ہی نہیں۔" مولوی مہر علی نے کہا۔ وہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھے تھے۔

"میں تو خود آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کیا کہوں مولوی صاحب! وہاں تو میں نے ایک اور ہی دنیا دیکھی۔"

"دنیا کے تو اتنے رنگ ہیں پتر کہ آدمی دیکھے تو حیرت میں ڈوب جائے۔"

"مگر مجھے تو بس دکھ ہوا مولوی صاحب اور دکھ سے بڑھ کر مایوسی۔"

مولوی صاحب نے اس کے لہجے میں آزردگی سے اندازہ لگایا کہ اس کے دل پر بہت بوجھ ہے۔ "مجھے بتاؤ پتر۔"

پھر عبدالحق بولتا رہا اور وہ سنتے رہے۔ کئی بار ان کا جی چاہا' لیکن انہوں نے اسے درمیان میں نہیں ٹوکا۔

"تمہارا دکھ تو میری سمجھ میں آتا ہے پتر۔ پر مایوسی نہیں۔" اس کے خاموش ہونے کے بعد مولوی صاحب نے کہا۔

"میں نے مسلمانوں کا جو حال دیکھا ہے' اس میں مایوسی تو ہوتی ہے۔ جبکہ میں ایک نومسلم ہوں۔ میں برائی اور بھلائی کا فرق سمجھ سکتا ہوں' تو وہ کیوں نہیں سمجھتے' جو نسلوں سے ایمان پر ہیں۔ پیدا ہی مسلمان ہوئے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو پتر کہ مسلمان ہونا کامیابی کی ضمانت ہے۔" مولوی صاحب کے لہجے میں بڑی مانوس سی' مگر ہلکی سی سختی تھی۔ "اور کیا تم سمجھتے ہو کہ مسلمان ہونے سے بشریت ختم ہو جاتی ہے۔ کیا مسلمان کو دنیا سے اور دنیاوی سازو سامان سے محبت نہیں رہتی۔ کیا ترغیبات اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ کیا شیطان اسے نہیں بہکاتا' نہیں ورغلاتا۔ میرے پتر' وہ تو شاید سب سے زیادہ محنت ہی مسلمان پر کرتا ہے۔"

"مگر مولوی صاحب' مسلمان کے پاس تو روشنی ہے۔ رہنمائی کے لیے قرآن ہے اور سیرت رسول......"

"اسی لیے شیطان سب سے زیادہ محنت اسی پر کرتا ہے۔ اور وہ بھی ان مسلمانوں پر جو قرآن پڑھتے ہیں اور سمجھ کر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو سیرت بھی پڑھتے ہیں۔ اور اکثریت جو قرآن کھول کر بھی نہیں دیکھتی' وہ تو صرف سنے سنائے پر ہی عمل کرتی ہے۔ اور قرآن پڑھنے والوں کی اقلیت میں بھی اکثریت ان لوگوں کی ہے' جو صرف یہ سوچ کر پڑھتے ہیں کہ اس کا پڑھنا باعث برکت ہے۔ وہ سمجھتے بالکل نہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"[illegible] ...یی کی بات اچھی نہیں۔ مایو[illegible] لیے نہ[illegible] رہے۔ اب یہ سوچو کہ کفر

کیوں ہے۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ "میں نے جو کچھ دیکھا' اس سے مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا؟"

"یہ بتاؤ کہ تم مایوس کس سے ہوئے؟" جواب میں بھی سوال ہی آیا۔

"میں اپنے بہت سے مسلمان بھائیوں سے مایوس ہوا۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے' بہت سے ایسے مسلمان بھی دیکھے' جن سے تمہیں تقویت ملی؟"

"جی ہاں۔"

"تو مایوسی بے سبب ہو گئی نا۔ جب تم تک امید ہو' مایوسی نہیں ہونی چاہیے۔"

عبدالحق کے ذہن میں روشنی سی ہونے لگی۔ "جی ہاں' یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"بات اتنی سی نہیں ہے پتر عبدالحق۔ نیک بندہ' جو ہدایت پر ہو' ہر وقت خطرے میں رہتا ہے۔ شیطان بہت چپکے سے وار کرتا ہے۔ تم نے کہا کہ تم بہت سے مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر مایوس ہوئے۔ اس ایک بات میں خطرے کے کئی پہلو ہیں۔ ذرا سوچو...... غور کرو۔"

عبدالحق دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن کئی پہلو تو کجا' اس کی سمجھ میں ایک پہلو بھی نہیں آیا۔

"نہیں سمجھے نا۔ اب دیکھو' شیطان کیسے حملہ کرتا ہے۔ اب پہلا پہلو تو یہ ہے کہ تمہیں جن لوگوں سے مایوسی ہوئی' تم نے انہیں حقیر سمجھا اپنے مقابلے میں۔ تو گویا تو نے خود پر' اپنی اچھائی پر غرور کیا......"

عبدالحق تڑپ گیا۔ "میں پوری سچائی سے کہتا ہوں مولوی صاحب کہ یہ بات نہیں۔"

"انسان کی سچائی ادھوری ہوتی ہے پتر۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری طبیعت میں غرور نہیں' انکسار ہے۔ تم نے دین کی محبت کی وجہ سے ایسا سوچا۔ اب یہی تو شیطان کی عیاری ہے۔ وہ بندے کی نیکی کو بھی کمزوری بناتا' اور پھر اس پر حملہ کرتا ہے۔ وہ پاک صاف دودھ کے کڑھاؤ میں لیموں کی دو بوند ٹپکا دیتا ہے۔"

"میں نہیں سمجھا مولوی صاحب۔"

"تم نے اپنی سچائی کی حد تک کہا کہ تم نے غرور نہیں کیا لیکن پتر' سچ یہ ہے کہ تم اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ آدمی کے وجود میں نجانے کتنے تہ خانے ہوتے ہیں' جن سے وہ مرتے دم تک واقف رہتا ہے۔ ان تہ خانوں سے صرف وہ واقف ہے' جس نے ہمیں پیدا کیا' جو کہتا ہے' الا یعلم من خلق. کیا وہی نہ جانے' جس نے پیدا کیا۔ اور شیطان نیک در مضبوط بندوں میں چھپے انہی تہ خانوں کو تلاش کرتا رہتا ہے۔"

"تو میری بے خبری کے باوجود کیا اللہ مجھے گرفت کرے گا اس بات پر؟"

"یہ تو وہ جانے۔ وہ رحیم و کریم ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ابھی یہ غرور کا شائبہ ہے۔ لیکن

جب تم بار بار ایسا کرو گے تو کھلے غرور میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ عادی ہو جاؤ گے نا اس کے چپکے چپکے۔ پھر یہ تمہارے لیے قابل قبول ہو جائے گا۔ تمہاری شخصیت کا حصہ بن جائے گا۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ ہر پل چوکنے رہو۔ زندگی تو آپ ہی پل صراط ہے پتر۔ اپنی ہر سوچ اور ہر عمل پر کڑی نظر رکھو۔ اسے گہرائی میں سوچو۔ کوئی اچھا ایک دم سے برا نہیں ہوتا۔ رائی کے دانوں جیسی برائیاں ایک ایک دانہ کر کے گرتی ہیں۔

''اب ایسا پہلو دیکھو۔ اللہ نے فرمایا کہ ہر آدمی کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ کوئی کسی دوسرے کا ذمہ دار نہیں۔ حتیٰ کہ باپ بیٹے کا نہیں' اور بیٹا باپ کا نہیں۔ تو تم دوسروں کے گناہوں پر مایوس ہو کر کیا یہ اعلان کر رہے ہو کہ قیامت کے دن تم ان کے جواب دہ اور ذمہ دار ہو گے۔''

عبدالحق پر تھرتھری چڑھ گئی۔

''تیسرا پہلو یہ کہ وہ سب کچھ دیکھنے کے بعد کیا تم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ تم ان میں سے ہو سکتے تھے' لیکن اللہ کی رحمت اور ہدایت کی وجہ سے ان میں سے نہیں ہو؟ تمہیں اللہ نے ان اعمال سے بچالیا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بات میری سمجھ میں آ گئی لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر مایوسی تو ہوگی نا مولوی صاحب۔''

''پھر وہی مایوسی۔ ارے پتر' مایوسی تو کفر ہے۔''

''کیسے مولوی صاحب۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات۔''

مولوی صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ ''دیکھو پتر' امید اور مایوسی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جب تک امید ہے' مایوسی نہیں ہوگی۔ اور امید تو بندے کو صرف اللہ سے رکھنی ہوتی ہے نا۔ تو یہ امید دائمی ہے۔ اور امید ہے تو مایوسی کا سوال نہیں۔ اور مایوس ہوئے تو گویا امید چھوڑ دی۔ اور امید چھوڑ دی تو گویا اللہ کی رحمت کے منکر ہو گئے۔ تو یہ ہو گیا نا کفر۔ اب تم مایوس ہوئے تو تم نے یہ سمجھ لیا کہ ان لوگوں میں سے کوئی کبھی راہِ راست پر نہیں آئے گا۔ توبہ نہیں کرے گا' جس کے دروازے نزع کے وقت تک کھلے ہوتے ہیں۔ اللہ کسی بھی لمحے کسی کو ہدایت دے دے۔ اسے توبہ پسند ہے۔ وہ توبہ قبول کر لے تو بندے کے ساری عمر کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ وہ بچوں کی طرح معصوم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو کافر کو کافر نہیں کہنا چاہیے۔ کون جانے کہ اللہ کی رحمت سے اس کا خاتمہ ایمان پر ہو۔''

''آدمی خود سے بھی تو مایوس ہو سکتا ہے مولوی صاحب۔''

''پھر وہی بات۔ خود سے مایوس ہونے کا مطلب ہے کہ اس نے امید بھی خود سے رکھی تھی۔ اب غور کرو تو یہ شرک ہے۔ ارے بھئی۔ امید تو اچھائی بھلائی ہی کی ہوتی ہے۔ اور اچھائی بھلائی

صرف اللہ کی طرف سے۔ تم خود سے تو اچھے نہیں ہو گئے نا۔ اللہ نے اچھا بنایا ہے تمہیں۔ یاد رکھو' کسی بھی معاملے میں مایوسی کا آغاز ہوتے ہی دل کی گہرائیوں سے اللہ کو اصلاح کے لیے پکارو۔ مایوسی ختم ہو جائے گی۔ یہ تو حضور ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ سے زیادہ تو کسی کو انسانوں کی فلاح کی فکر نہیں ہوئی۔ سورہ کہف میں اللہ نے آپ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا...... کیا تم اس غم میں خود کو گھلا لو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ تو حضور ﷺ کا معمول تھا کہ رات بھر اُمت کے لیے استغفار اور دعائیں کرتے' اور تمام انسانیت کے لیے صراطِ مستقیم کی دعا فرماتے۔''

تو مایوسی تو حضور ﷺ کو بھی ہوتی تھی۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔ سورہ کہف کی یہ آیت مبارکہ اس کا ثبوت ہے۔ لیکن اسے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

''آپ ﷺ بدترین اذیت پر بھی کبھی نہیں روئے۔ لیکن انسانوں کے جہنم میں جلنے کا خیال فرماتے تو گھنٹوں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی۔ بلا تخصیص پوری انسانیت کے لیے ایسی دردمندی کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ لیکن اللہ نے آپ ﷺ کو بتا دیا کہ تمام انسان ایمان نہیں لائیں گے۔ سورۃ التکویر میں اللہ نے فرمایا کہ قرآن کل کائنات کے لیے نصیحت ہے تم میں سے جو چاہے' ایمان لے آئے۔ لیکن آگے خود ہی فرمایا کہ تم نہیں لا سکتے۔ الا یہ کہ اللہ چاہے۔ یہی مضمون سورۂ مدثر میں بھی ہے...... وما تذکرون اللّٰہ ان یشاء اللّٰہ۔

''لیکن سورہ عصر میں تو عام لوگوں کو بھی......''

''ہاں۔ مگر پہلے پیغمبروں کے لیے رہ نما آیات ذہن میں رکھو' جن سے کہا گیا کہ ان کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچانے کی ہے۔ اور پھر یہ بھی فرمایا...... لا اکراہ فی الدین۔ اور ہدایت تو اللہ کی طرف سے ہے ہی۔ پھر پتر عبدالحق' سورۂ عصر کو ہی دیکھو...... ترتیب تو دیکھو۔ خسارے سے محفوظ وہ ہوں گے' جو ایمان لائیں' نیک اعمال اور پھر نصیحت کریں۔ حضور ﷺ تو کتاب اللہ پر عامل تھے' آپ ﷺ تو مشرح تھے۔ عام آدمی کو تو پہلے ایمان سے اور پھر عمل سے گزرنا ہے۔ صرف قرآن پڑھنے سے بات نہیں بنتی۔ پڑھو' سمجھو اور عمل کرو۔ پھر نصیحت کرو ورنہ اللہ نے تو خود قرآن کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس سے بہتوں کو ہدایت ملتی ہے' اور بہت سے اس سے الٹا گمراہ ہوتے ہیں۔''

عبدالحق کو بڑی شدت سے بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ ''تو ہدایت کن لوگوں کو ملتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جن کے لیے قادرِ مطلق کی مرضی ہو۔ لیکن اس نے اشارہ دے دیا کہ ہدایت وہی پاتے ہیں' جو رجوع کرنے والے ہوں۔''

''ذرا اس بات کو بھی سمجھا دیجیے۔''

''یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے۔ آدمی کیسی ہی برائی میں مبتلا ہو' اللہ سے رجوع کرتا رہے۔

یعنی اس سے دعا کرے' بھلائی مانگے' برائی سے نجات مانگے' ہر ضرورت کے لیے اسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو وہ جب چاہے گا' اسے اپنی رحمت سے سیدھے راستے پر لے آئے گا۔ لیکن ذرا سوچو' اس کے لیے بھی بنیادی خوبی تو ایمان پر ہونا ہے۔ اللہ سے رجوع تو وہی کرے گا نا' جو اس کی ذات اور صفات پر کامل ایمان رکھتا ہو۔ تو پتر' جب بھی پریشان ہو' کسی معاملے میں مایوسی کی نوبت آئے' کوئی ضرورت ستائے' کسی خرابی میں پڑو تو اللہ سے رجوع کرو۔ وہ سمیع و بصیر ہے' علیم و خبیر ہے۔ اور ہاں' قرآن پڑھو تو اس سے ہدایت طلب کرو اور گمراہی سے اس کی پناہ چاہو۔"

❁ ··· ❁ ··· ❁

عبدالحق تو عجز کا آدمی تھا۔ مولوی صاحب کے منہ سے یہ سنتا کہ وہ غرور میں مبتلا ہوا' اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ تو خود کو عام لوگوں سے کم تر سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ وہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کا بیٹا تھا۔ اور اپنے ماں باپ کے لیے مغفرت کی دعا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ دوسرے جدی پشتی مسلمان تھے۔ یہ ایک طرح کا شدید احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی اس کے اندر موجود تھا۔

مگر مولوی صاحب کی یہ بات اس کے دل کو لگی کہ آدمی کو ہر پل اپنی تبدیلیوں سے اور شیطان کی کارروائیوں سے چوکنا رہنا چاہیے۔ اس کی روشنی میں اس نے سوچا کہ عین ممکن ہے' اس احساسِ کمتری اور محرومی کے تحت وہ دوسروں کو برائیوں میں مبتلا دیکھ کر بظاہر کڑھتا ہو' لیکن اندر ہی اندر خوش ہوتا ہو' سوچتا ہو کہ وہ ان سے بہتر ہے' جو ایمان پر پیدا ہوئے۔

ویسے وہ ان دنوں باطنی طور پر شدید جھنجلاہٹ شکار تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نور بانو کا تصور ہر وقت اس کے ذہن پر چھایا رہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں نماز میں حضوری سے بھی محروم ہو گیا تھا' اور قرآن پڑھنے میں بھی وہ بات نہیں رہی تھی۔ اگرچہ نور بانو کا تصور اسے بہت خوشی دیتا تھا۔ لیکن یہ احساس بھی رہتا تھا کہ کوئی بہت قیمتی چیز اس سے چھن رہی ہے۔

پھر اس دن ڈاکٹر صاحب اس سے زرینہ کے لیے اپنے بیٹے اکبر کا رشتہ مانگنے کے لیے آ گئے۔

"ہمارے لیے تو یہ بڑا اعزاز ہے ڈاکٹر صاحب۔" اس نے بڑے خلوص سے کہا۔ "لیکن مجھے اس سلسلے میں اماں سے بات کرنا ہو گی۔ اور پھر زرینہ کی مرضی بھی معلوم کرنا ضروری ہے۔ آپ برا نہ منایئے گا۔ میں آپ کو چند روز بعد جواب دے سکوں گا۔"

"ارے نہیں بیٹے' اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ دیکھو' ہم جو مانگ رہے ہیں' وہ ہمارا حق تو نہیں ہے۔ ہمیں مل جائے تو تمہارا ہم پر احسان......"

"بس آپ ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ بڑے ہیں۔ میں انشاء اللہ خود آپ کے پاس حاضر ہوں گا۔"

تو اب اسے زرینہ سے اس سلسلے میں پوچھنا تھا۔ دن بھر وہ سوچتا رہا کہ اس سے کیسے بات کرے' کیا کرے۔ یہ معاملہ وہ اماں پر چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زرینہ کا ماضی کسی کے علم میں آئے لیکن اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔

رات کا کھانا اس کے لیے بڑی راحت بن گیا تھا۔ وہ کھانا کم کھاتا اور نور بانو کو زیادہ دیکھتا۔ اور جب بھی وہ اسے دیکھتا تو وہ اسے اپنی ہی طرف متوجہ پاتا۔ اور وہ نظریں ملنے کے بعد بھی نظریں نہیں جھکاتی تھی۔ یہ بات بھی اسے اچھی لگتی تھی۔

کبھی کبھی اسے ڈر لگتا کہ یہ تبدیلی جو بالکل اچانک اور بہت تیزی سے آئی ہے' کہیں بری تو نہیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر وقت نور بانو کو دیکھتا رہے۔ ویسے تو وہ تمام وقت ہی تصور میں اس کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھی۔ لیکن حقیقت میں رُوبرو دیکھنے کی تو بات ہی اور تھی۔ اس لطف کا تو کوئی نعم البدل تھا ہی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دن بھر کوشش کرتا رہتا تھا کہ نور بانو سے سامنا ہو جائے۔ اور ایسا ہوتا بھی رہتا تھا۔

دیکھنے کا وہ لطف عجیب تھا۔ اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑنے لگتی تھی۔ ایک عجیب سا ہیجان اس پر طاری ہو جاتا تھا۔ اور وہ لطف اپنی جگہ۔ لیکن وہ نگاہوں سے دور ہوتی تو فوراً ہی اسے کسی کمی' کسی تشنگی کا احساس ستانے لگتا۔ اور وہ کمی' وہ تشنگی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اور سمجھ میں نہ آنے والی باتوں سے اسے الجھن ہوتی تھی۔ مگر وہ یہ بات کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا...... مولوی صاحب سے بھی نہیں۔

اس رات کھانے کے بعد سب لوگ چلے گئے اور وہ معمول کے مطابق اماں کے پاس بیٹھا رہا۔

"سنا ہے ڈاکٹر صاحب آئے تھے تیرے پاس؟ زرینہ کے رشتے ہی کے لیے آئے ہوں گے نا۔"

"جی اماں۔"

"تو تُو نے کیا کہا۔ سن پتر' ایسے رشتے قسمت سے ہی ملتے ہیں۔"

"پھر بھی اماں۔ زندگی تو اسے ہی گزارنی ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ اور وہ اماں کو اصل بات تو نہیں بتا سکتا تھا۔

"تو پھر دیر نہ کر۔ بات کر لے اس سے۔"

"جی اماں۔ آج ہی کر لوں گا۔"

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک لمحے کو نور بانو کے دروازے پر رکا۔ "زرینہ......" اس نے پکارا۔ "سو تو نہیں گئی تم؟"

اندر سے زرینہ لپکی ہوئی آئی۔ "جی بھائی۔"

''ذرا میرے کمرے میں آؤ۔ کچھ بات کرنی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

زرینہ کمرے میں گئی اور اپنی چادر اٹھائی۔ ''نجانے کیا بات ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔ لہجے میں تشویش تھی۔

نور بانو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''تو پریشان کیوں ہو رہی ہو؟''

''بڑی بے رخی سے بات کی ہے بھائی نے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔''

نور بانو مسکرائی۔ ''بے رخی نہیں' وہ گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ ایسی باتوں کا تجربہ کہاں ہے انہیں۔''

''کیسی بات؟''

''ارے پگلی' آج ڈاکٹر صاحب آئے تھے تمہارے رشتے کے لیے؟''

یہ سنتے ہی زرینہ کا چہرہ فق ہو گیا۔

''ارے یہ کیا؟'' نور بانو اٹھ بیٹھی۔ 'تم تو پیلی پڑ گئیں ایک دم۔''

''کچھ نہیں مجھے ڈرنے کی عادت ہو گئی ہے۔'' زرینہ نے کہا اور چادر لپیٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

❁.......❁.......❁

''آؤ زرینہ یہاں بیٹھو۔'' عبدالحق نے مسہری سے اٹھتے ہوئے کہا۔

زرینہ وہیں بیٹھ گئی۔ جہاں پہلے وہ بیٹھا تھا۔ عبدالحق اپنے لیے کرسی لایا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''جی بھائی' کیا بات ہے۔'' زرینہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''بات کیا' خوشخبری ہے۔ تمہارے لیے اسی بستی کے سب سے اچھے گھر سے رشتہ آیا ہے۔''

''جی بھائی' مجھے معلوم ہے۔''

عبدالحق نے چونک کر غور سے اسے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟ تمہیں پسند نہیں یہ رشتہ۔''

''یہ بات نہیں بھائی۔ لیکن میں کس قابل ہوں' یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں۔'' زرینہ نے کہا۔ پھر بولی۔ ''میں تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتی بھائی۔''

''یہ تو بڑی احمقانہ بات ہے۔ تم جو کچھ بھی تھیں' اب میری بہن ہو۔ اور ہر بھائی اپنی بہن کی شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی۔ مگر مجھے بہت ڈر لگتا ہے شادی سے۔''

''ارے بے وقوف۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔''

''اس بات سے تو اور زیادہ ڈرتی ہوں میں۔ میں ان کے قابل ہوں ہی نہیں۔''

''فضول بات ہے۔ تم مظلوم ہو' گناہ گار نہیں۔''

''یہ آپ سوچتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ دوسرے بھی اسی انداز میں سوچیں۔''

''مگر میری بہن' تم ساری زندگی یونہی تو نہیں گزار سکتیں۔'' عبدالحق نے بڑی شفقت سے کہا۔

زرینہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''دیکھیں بھائی' مجھے آپ سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں لیکن مجبوری ہے۔'' اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''یہ جو شادی نہیں کرنا چاہتی تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اور ہر وجہ اہم ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

''اچھا...... مجھے بتاؤ' میں کوئی حل نکال لوں گا۔'' عبدالحق نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''پہلی بات تو یہ کہ میری حقیقت جاننے کے بعد کوئی گیا گزرا گھرانہ بھی مجھے قبول نہیں کرے گا۔''

''تو ہم انہیں بتائیں گے ہی نہیں۔''

''مطلب یہ کہ ہم انہیں دھوکہ دیں گے۔''

عبدالحق سناٹے میں آ گیا۔ اس پہلو سے تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

''اب دوسری اور اس سے زیادہ اہم وجہ سن لیجیے۔ میں آپ کے لئے تکلیف' آزار اور ذلت کا سبب نہیں بننا چاہتی۔ آپ وہ ہیں' جو مجھے گناہوں کی دلدل سے نکال کر عزت کی روشنی میں لائے ہیں۔ مجھ جیسی لڑکی کو آپ نے بہن کا درجہ دیا۔ میں آپ کے لئے ذلت کا باعث نہیں بننا چاہتی۔''

عبدالحق نے غور سے اسے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں' چہرہ تمتما رہا تھا لیکن بات عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری شادی میرے لئے باعثِ ذلت ہو سکتی ہے۔ بھئی میری تو عزت ہے اس میں اور خوشی بھی۔''

زرینہ نے رخسار پر ڈھلک آنے والے آنسو پونچھ ڈالے۔ ''فرض کر لیجیے کہ ہم ان لوگوں کو یہ بات نہیں بتاتے۔ انہیں دھوکے میں رکھتے ہیں۔ یہ سوچیں کہ میں تو بازار میں روز نیلام ہوتی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ باقاعدہ رونے لگی۔ ''وہاں کوٹھے پر ہزاروں گزرنے والوں نے مجھے دیکھا ہو گا۔ اور سینکڑوں نے......'' اُس کی نظریں جھک گئیں۔ اُس سے بات پوری نہیں کی گئی۔ ''......اب ان میں سے کوئی شادی کے بعد مجھے دیکھے اور پہچان لے اور میری سسرال والوں کو بتا دے تو کیا وہ مجھے اپنے گھر میں رکھیں گے۔ ہرگز نہیں' اور اب تو میں عزت سے آپ کے گھر میں رہ رہی ہوں نا۔ اُس وقت رسوائی کے ساتھ آپ کے گھر واپس آؤں گی تو آپ کی ذلت اور رسوائی ہو گی نا۔ اور یہ میں نہیں چاہتی' اور ہونے بھی نہیں دوں گی۔ میں آپ کے پاس آؤں گی ہی نہیں۔ تو پھر میں کہاں بھٹکوں گی۔ کوئی ظالم مجھے پھر اسی جہنم میں پہنچا دے گا۔ نہیں بھائی' میں شادی کیسے کر سکتی ہوں۔''

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔" عبدالحق نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم پھر بھی میری عزت ہی رہو گی اور میں تمہیں پھولوں کی طرح رکھوں گا میری بہن۔"

"یہ تو آپ کی بڑائی ہے بھائی۔"

"تم مجھے یہ بتاؤ، میں انہیں کیا جواب دوں۔"

"انکار کر دیں۔"

"رشتے تو پھر بھی آتے رہیں گے۔ میں انکار کرتا رہوں گا تو اس پر باتیں نہیں بنیں گی؟"

"کاش...... کاش میں مر گئی ہوتی۔" زرینہ نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

"یہ تو ناشکرا پن ہے۔"

"تو آپ کیا چاہتے ہیں بھائی؟"

"میں ڈاکٹر صاحب کو انکار نہیں کرنا چاہتا۔"

"اور اب میں اپنی خاطر نہیں، آپ کی خاطر چاہتی ہوں کہ آپ انکار کر دیں۔"

"تم سمجھ رہی ہو کہ یہ مسئلے کا حل نہیں۔ رشتے تو آتے رہیں گے۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر اچانک زرینہ کی بات اس کی سمجھ میں آئی، اور اُس کی الجھن اور بڑھ گئی۔ "یہ بتاؤ کہ میں اپنی خاطر کیوں انکار کروں۔ میں کوئی مجبور ہوں۔"

"آپ ان شریف لوگوں کو دھوکہ دے سکیں گے؟" زرینہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

عبدالحق سن ہو کر رہ گیا۔ یہ تو واقعی بہت بری بات تھی۔ وہ یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔

"ایک یہ وجہ بھی ہے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

عبدالحق کو اچانک طرارہ آ گیا۔ "تو میں انہیں حقیقت بتا دوں گا۔"

"یہ میں نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"میں محسوس کر سکتی ہوں کہ ایسا سچ بولنا ایک بھائی کے لئے کتنا اذیت ناک ہو گا۔ آپ نے مجھے عزت دی، رشتے دیے، گھر دیا، میں آپ کو تکلیف، بلکہ ذلت کیسے دے سکتی ہوں۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ انکار کر دیں گے نا۔"

"نہیں بھائی۔ بات ان کے گھر سے نکل کر گاؤں میں بھی پھیل سکتی ہے۔ اس میں تو آپ کی بہت رسوائی ہو گی۔"

عبدالحق نے سوچا کہ مسئلہ واقعی بہت پیچیدہ ہے لیکن چند لمحے سوچنے کے بعد اسے اس خیال سے تقویت ہوئی کہ ڈاکٹر وسطی ایسے آدمی نہیں۔ ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے کہا۔ "یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ کہ اگر سب کچھ جاننے کے بعد بھی وہ یہ رشتہ چاہیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو

نہیں۔"

"نہیں بھائی، لیکن......"

"میں نے کہا نا، تم سب مجھ پر چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔ بس اللہ آپ کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کرائے۔ آپ کی عزت پر آنچ نہ آئے۔"

"تم بے فکر ہو جاؤ۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔"

"تو میں جاؤں بھائی؟"

"ہاں۔ اور پریشان نہ ہونا۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر زرینہ کو ایک چھوٹی سی خوشی ملی۔ نور بانو سو چکی تھی۔ وہ اُس کے سوال و جواب سے بچ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کا اپنے گھر آنا تو ڈاکٹر واسطی جیسے معزز آدمی کو بھی اپنے لئے ایک اعزاز ہی لگا۔ وہ کب کسی کے گھر جاتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا اُس کے پاس۔ وہ تو اُس کے سامنے عملاً بچھ گئے۔ "آیئے عبدالحق صاحب۔ آپ نے بڑی عزت بخشی ہمیں۔ غریب خانہ تو جگمگا گیا ہے......"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" عبدالحق نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ بتائیں، کیا خاطر کروں آپ کی۔ کیا لیں گے آپ؟"

"کچھ بھی نہیں۔ جو لینے آیا ہوں، وہ مل جائے تو عمر بھر آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

"آپ کے پاس اللہ کا دیا سبھی کچھ تو ہے۔ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"سب کچھ تو کسی کے پاس بھی نہیں ہوتا۔" عبدالحق نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تو کچھ فرمایئے تو۔"

"میں یہ بات چچی صاحبہ کی موجودگی میں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ میرے سامنے آنے میں حرج نہ سمجھیں تو......"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔" ڈاکٹر صاحب نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "آپ تو ہمارے لئے بیٹے جیسے ہیں۔" وہ اٹھے اور اندر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد وہ آئے تو انہوں نے کہا۔ "وہ آ رہی ہیں۔ چند منٹ لگیں گے۔"

وہ چند منٹ عبدالحق کے لئے بہت بھاری تھے۔ بار بار اُس کی ہمت جواب دے جاتی، جی چاہتا کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے۔

پھر طشتری پر لسی کا گلاس لیے وہ ادھیڑ عمر خاتون کمرے میں آئیں۔ عبدالحق جلدی سے اٹھ

کھڑا ہوا۔ انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دے کر طشتری کو تپائی پر رکھ دیا۔

"یہ ہیں ہماری بیگم صفیہ، اور تمہاری چچی۔" ڈاکٹر صاحب نے تعارف کرایا۔

صفیہ سامنے ہی بیٹھ گئیں۔ "ارے، تم تو ہمارے اصغر سے بھی چھوٹے ہو۔ میں تو تمہیں بہت بڑا سمجھتی تھی۔ لوگ تمہارے بارے میں باتیں ہی ایسی کرتے ہیں۔"

"آدمی عمر سے بڑا تھوڑا ہی ہوتا ہے بیگم۔ بڑائی تو اللہ کی دین ہے۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔

عبدالحق کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ بعض معاملات کے لئے وہ واقعی چھوٹا اور کم عمر ہے۔ اُس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

پھر صفیہ بیگم نے ہی اُس کی مشکل آسان کر دی۔ "ہم نے تم سے کچھ مانگا تھا بیٹے۔ تم شاید اسی کا جواب دینے آئے ہو۔"

"اور مجھے امید ہے کہ جواب مثبت ہی ہوگا۔" ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے ٹکڑا لگایا۔

عبدالحق کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ اب واپسی کا راستہ بھی نہیں تھا۔ اُس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔

"جی...... یہی بات ہے۔" اُس نے کہا۔ مگر اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی لگی۔ "بات یہ ہے کہ آپ لوگوں سے اچھا کوئی ہمیں مل نہیں سکتا۔ اس لئے انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......"

"اللہ کا شکر ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے کہا۔

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ مکمل حقائق آپ کے علم میں لے آؤں۔" اب عبدالحق کو بات کرنا اتنا مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ اسے تجربہ ہو رہا تھا کہ سنگین سچ بولنے سے پہلے بہت مشکل ہوتا ہے لیکن بولتے ہوئے آسان ہو جاتا ہے۔ "سب کچھ جاننے کے بعد آپ چاہیں تو خاموشی سے اس رشتے سے دستبردار ہو جائیں۔ اور اگر اس کے باوجود آپ یہ رشتہ مانگیں گے تو ہمیں منظور ہوگا۔" یہ کہہ کر اُس کے دل پر سے آدھا بوجھ ہٹ گیا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ زہر جیسا کڑوا سچ ابھی باقی ہے۔

"ہم تو حقائق جان کر بھی سوالی ہی رہیں گے۔" ڈاکٹر صاحب نے بڑے یقین سے کہا۔

"پہلے جان تو لیں کہ حقائق کیا ہیں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے ایک التجا کروں گا۔ رشتہ ہو یا نہ ہو، جو میں آپ کو بتاؤں گا، وہ ہمارے درمیان راز رہے گا۔ کیونکہ یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔"

"تو پھر ہماری بیگم صاحبہ کو کیوں شریک کیا۔" ڈاکٹر صاحب نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔ "جانتے نہیں کہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔"

"غلط۔ عورت کی گہرائی کا تو کبھی کوئی مرد اندازہ ہی نہیں لگا سکا۔" صفیہ بیگم نے انہیں چیلنج کیا۔ "کوئی عورت کوئی راز چھپانے پر آ جائے تو کسی کو اُس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی......"

"حتیٰ کہ خود کو بھی۔" ڈاکٹر صاحب نے شوخ لہجے میں کہا۔

اُس پُر مزاح گفتگو نے ماحول کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا لیکن عبدالحق جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہنے والا

ہے، وہ بہت بھاری اور سنگین ہے۔

"خیر...... تم بتاؤ نا بیٹے، کیا بات ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"جی...... وہ...... بات یہ ہے کہ زرینہ کو میں سگی بہن جیسا ہی سمجھتا ہوں لیکن خون کے رشتے سے وہ میری بہن نہیں ہے۔"

ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے۔ صفیہ بیگم بھی مسکرا دیں۔ "یہ بات تو ہم بھی سمجھتے ہیں بیٹے۔ بہنیں چانک تو نمودار نہیں ہوتیں۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "اور ہم تمہیں بھی سمجھتے ہیں۔ یہ بستی تم نے آباد کی۔ لٹے پٹے لوگوں کو زمین دی، پیسے سے ان کی مدد کی۔ تمہیں اللہ نے بڑائی دی ہے، بڑا دل دیا ہے۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ لاہور میں تمہیں زرینہ ملی، جو ہجرت کے دوران اپنے تمام رشتے کھو کر آئی۔ تم نے اسے بہن بنا لیا، اور ایک ماں اور ایک بہن بھی اسے دے دی۔ ہم بھی تمہاری اس نیکی میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اُس کے لئے کھوئے ہوئے ماں باپ کا نعم البدل ثابت ہوں گے...... انشاء اللہ۔"

"اور میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔" صفیہ بیگم بولیں۔ "وہ ہر لحاظ سے ہمیں پسند ہے۔ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن مجھے سب سے بڑی خوبی یہ لگی کہ وہ دکھی اور محروم لڑکی ہے۔ ہم اسے عزت اور خوشی دے کر اللہ کو خوش کریں گے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، میں اسے کہاں سے لایا ہوں؟" عبدالحق نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

"لاہور میں مہاجروں کے کسی کیمپ سے۔" انہوں نے بلا جھجک جواب دیا۔

"جی نہیں۔ میں اسے بازارِ حسن کے ایک کوٹھے سے لایا ہوں۔" عبدالحق نے کہا اور نظریں جھکا لیں۔ اب اس میں نظر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔

کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ وہ ایسا گہرا سناٹا تھا کہ عبدالحق کا دم گھٹنے لگا۔ اُس وقت وہ صرف آواز کو ترس رہا تھا۔ خواہ وہ ڈانٹ ڈپٹ ہو یا لعنت ملامت۔ کچھ تو ہو، یہ لوگ مجھے برا بھلا کیوں نہیں کہتے۔

اس کے بس میں ہوتا تو وہ اٹھ کر بغیر کچھ کہے چلا جاتا لیکن اس کا تو جسم ہی شل ہو گیا تھا۔

پھر سسکیوں کی آواز سن کر اُس سے نہیں رہا گیا، اس نے نظریں اٹھائیں تو صفیہ بیگم کا دکھ سے چیختا ہوا آنسوؤں سے تر چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنی چیخوں کو اندر ہی اندر گھونٹ رہی ہیں۔ پھر شاید ان کا ضبط جواب دے گیا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپا اور اٹھ کر لپکتے قدموں سے کمرے سے نکل گئیں۔

شرمندگی سے عبدالحق کا برا حال تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ اُس نے ان کے خواب چکنا چور کر دیے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں چلتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔" اُس نے

کہا۔ ''اگر آپ اسے راز رکھیں گے تو مجھ پر احسان ہوگا.....''

ڈاکٹر صاحب نے یوں چونک کر اسے دیکھا، جیسے وہاں اُس کی موجودگی سے ہی بے خبر رہے ہوں۔ مگر اب وہ اُس کی طرف متوجہ تھے۔

''......یہ میں اپنے لئے نہیں، زرینہ کی خاطر کہہ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی کچھ بھی کہے، زرینہ میری بہن ہے۔''

''بیٹھ جاؤ بیٹے۔ تم ابھی نہیں جاسکتے۔'' ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہارا راز صرف اسی صورت میں راز رہ سکتا ہے کہ تم ہمارے راز کو راز رکھو۔''

عبدالحق پھر بیٹھ گیا تھا۔ ''آپ کس راز کی بات کر رہے ہیں؟''

''بتاتا ہوں۔ آج تک کسی کو نہیں بتایا۔'' ڈاکٹر صاحب نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''ہماری ایک بیٹی بھی تھی۔ اسٹیشن کی طرف آرہے تھے کہ بلوائیوں نے حملہ کیا اور اسے اٹھا کر لے گئے۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا مرگئی۔ کل تک ہم ہر روز یہ خواہش کرتے تھے کہ کاش وہ مرگئی ہو۔ مگر آج سے ہم امید کریں گے کہ اسے کوئی عبدالحق مل گیا ہوگا۔''

صورتِ حال اتنی غیر متوقع تھی کہ عبدالحق سن ہو کر رہ گیا۔

اسی لمحے صفیہ بیگم کمرے میں واپس آئیں۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ انہوں نے منہ دھویا ہے۔ آنکھیں اب بھی متورم ہو رہی تھیں لیکن انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''تو بیٹے، اب ہم تم سے کچھ نہیں مانگتے۔'' انہوں نے اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اپنی بیٹی بھی کوئی کسی سے مانگتا ہے۔ وہ تو ہے ہی ہماری۔''

عبدالحق سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

''اور وعدہ کرو بیٹے کہ ہمارا راز، راز ہی رہے گا۔ ہماری بیٹی اور بہو کو کبھی رسوا نہ ہونے دینا۔'' ڈاکٹر صاحب بولے۔

''ارے...... یہ لسی نہیں پی تم نے۔'' صفیہ بیگم کے لہجے میں خفگی تھی۔

''جی چچی جان، اب پیوں گا سکون سے۔'' عبدالحق نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تو ہم کب آئیں تمہارے گھر؟''

''اپنے گھر آنے کے لئے کسی کو پوچھنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی۔'' عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق باطنی طور پر بہت پریشان، بہت منتشر تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ بہت بڑی باطنی شرمندگی سے دوچار تھا۔ نور بانو کے اعترافِ محبت نے اس کے لیے پنڈورا کا بکس کھول دیا تھا۔

بھی کم نہیں تھا کہ وہ ہر وقت اُس کے تصور پر چھائی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ نماز میں اور قرآن پاک کی تلاوت کے دوران بھی وہ کوشش کے باوجود اسے ذہن سے نہیں جھٹک پاتا تھا۔ اس کو بددیانتی کا احساس ستاتا رہتا تھا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ خوابوں کا سلسلہ شروع ہوگیا!

خواب وہ کم ہی دیکھتا تھا۔ اور خواب اُس نے جب بھی دیکھے تھے، ان میں معنویت ہوتی تھی۔ مگر یہ خواب مختلف تھے۔ ہر خواب میں نور بانو ہوتی تھی اور ہر خواب میں ان کے درمیان جسمانی قربت ہوتی تھی۔

جسمانی قربت کا عملی حوالہ اس کے پاس بس ایک ہی تھا...... ریٹا پارسن کے ساتھ وہ رات، جس میں ریٹا نے اسے دھوکے سے شراب پلا دی تھی۔ اُس قربت کی شرمندگی بھی اسے یاد تھی اور لذت اور سرمستی بھی۔ اس کے علاوہ وہ غیر عملی حوالہ بس اردو شاعری تھی۔

سو معمولی سے رد و بدل کے ساتھ وہ اس رات کو ہی دیکھتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ریٹا پارسن کی جگہ نور بانو ہوتی تھی۔ اور جس محبت نے اُس رات اسے گرنے سے بچالیا تھا، وہی خواب میں اسے بڑھاوا دیتی تھی۔ اور خواب سے آنکھ کھلتی تو وہ عجیب سرشاری کی کیفیت میں ہوتا۔ بعض اوقات تو وہ آنکھیں بند کر کے اس امید پر دوبارہ سونے کی کوشش کرتا کہ شاید خواب کا سلسلہ وہیں سے جڑ جائے لیکن پوری طرح سے جاگنے کے بعد اسے شرمندگی ہوتی۔ پہلی بار تو وہ شرمندگی بہت شدید تھی۔ مگر پھر وہ ہر خواب کے ساتھ بہ تدریج کم ہوتی گئی۔

ان خوابوں نے اُس کا انتشار اور بڑھا دیا۔ نماز اور تلاوتِ قرآن میں بے دھیانی بڑھتی جا رہی تھی۔

دن میں تو وقت کم ہی ملتا تھا۔ رات میں وہ بیٹھ کر اس مسئلے پر سوچتا، اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا۔ مگر بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہ محبت تو برسوں سے اس کے دل میں تھی۔ اسے اس محبت کا ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ اُس محبت میں بڑا سکون تھا، خوشی تھی، ٹھہراؤ تھا، عظمت تھی۔ اب یہ وہی محبت تھی۔ مگر یہ تبدیلی کیوں؟ اس کا کوئی سبب تو ہوگا۔ اب اسی محبت میں بے چینی کیوں ہے۔ اچھی نیند کیوں نہیں آتی۔ جسم میں اینٹھن کیوں ہوتی ہے۔ وجود میں نامعلوم فتنے سر اٹھاتے کیوں محسوس ہوتے ہیں۔ اور یہ خواب کیوں نظر آتے ہیں۔

اُسے دہلی کا وہ دن یاد آیا، جب ماں جی پہلی بار اُس کے سامنے آئی تھیں۔ وہ کرایہ واپس کرنے آئی تھیں مکان کا...... اور یہ بتانے کہ اب وہ اُس کا گھر ہے اور وہ ان کے خاندان کا فرد ہے۔ ورنہ وہ جو شوہر کے انتقال کے بعد گھر کے پشتینی ملازم بہادر علی کے سامنے بھی نہیں آئیں کہ وہ نامحرم اُس کے سامنے کیوں آئیں۔ وہ اسے بیٹا کہتی ہیں۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ تم جب چاہو، نیچے آؤ، میری بیٹیاں بھی تم سے پردہ نہیں کریں گی۔ اسے بہت اچھی طرح یاد تھا۔ پہلے تو وہ بہت

خوش ہوا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ اس لڑکی کو دیکھ سکے گا، جس سے وہ بن دیکھے محبت کرتا لیکن پھر اُس نے سوچا کہ یوں وہ ماں جی کی محبت پر پورا نہیں اُتر سکے گا۔ اس کے باوجود اس کے قدم خود بہ خود اٹھتے تھے اور وہ زینے کے ساتھ، والے دروازے پر پہنچ جاتا تھا۔

اب اسے یاد آیا کہ اس وقت اُس نے کیا سوچا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ طلب بہت طاقت ور چیز ہے، اور نفس کی ضرورت ہے۔ اور نفس کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اسے جتنا ملے، اُس کی طلب، اُس کے تقاضے اتنے ہی بڑھتے ہیں۔ جیسے شیر کو سدھانے کے لئے پہلے بھوکا رکھا جاتا ہے اور پھر ناپ تول کر دیا جاتا ہے، ویسا ہی، بلکہ اس سے بھی آگے کا معاملہ نفس کا ہے۔ اسے کمزور رکھنے میں ہی آخرت کی بہتری ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے بھوکا رکھا جائے، کمزور رکھا جائے۔ ہر پوری ہونے والی خواہش اسے طاقت دیتی ہے۔ اور ایک خواہش پوری ہونے پر وہ سینکڑوں مطالبے کرتا ہے۔ بلکہ انہیں پورا کرنے پر آدمی کو مجبور کر دیتا ہے۔

اسے حیرت ہوئی، یہ بات اُس نے اُس وقت سمجھی تھی، جب وہ مسلمان نہیں ہوا تھا۔

بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ طلب کی ہوس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہی اس کی بے چینی اور بے سکونی کا سبب تھا۔ اور اس کا حل یہ تھا کہ وہ اس سے پہلے کی طرح لڑے گا، اسے زیر کرے گا۔ اب تو وہ اُس وقت کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہے۔

مگر ماضی کا وہ حوالہ اسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا اُس نے اپنی محبت کی عظمت دیکھی تھی۔ طبعاً وہ حسن پرست تھا۔ اور کالج میں اس کی ہم جماعت لڑکیاں بہت حسین تھیں۔ نادرہ اسے سب سے حسین لگتی تھی۔ بہت وقار تھا اُس کے حسن میں۔ اس وقت بھی وہ اسے اپنے تصور میں دیکھ سکتا تھا۔ پھر ریٹا اور پشپا تھیں۔ اور اپنے اپنے انداز میں وہ سب اس پر ملتفت تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی اسے کسی ہیجان اور انتشار میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ بلکہ ریٹا کی تو عملی کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ پہلے ہی گرفتار محبت تھا...... ایک اَن دیکھی لڑکی کی محبت میں سرشار، جس کی اُس نے صرف آواز سنی تھی۔ اور اُس محبت نے اُس کے لئے ہر برائی کا راستہ روک دیا تھا۔ یہی محبت کی وہ عظمت تھی جس کا وہ قائل تھا۔ اس محبت میں کیسا سکون تھا...... صرف بے طلبی کی وجہ سے۔ وہ اس محبت کے جواب میں کچھ نہیں مانگتا تھا، محبت بھی نہیں، التفات بھی نہیں، حد یہ کہ دید بھی نہیں۔

اور اب یہ وہی محبت تھی کہ جو بے سکونی کا باعث بن گئی تھی!

کیا اس لئے کہ اُس نے اَن دیکھے محبوب کو دیکھ لیا ہے؟

نہیں۔ مدت سے وہ اُس کے سامنے تھی۔ اُس نے کبھی نظر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے کہ وہ اُسے بلند اور خود کو حقیر سمجھتا تھا۔ اسے اس سے کچھ چاہئے ہی نہیں تھا۔ اسے تو جدائی کا بھی [illegible] نہیں تھا۔ ورنہ وہ اُس کے چچا کو ڈھونڈنے لاہور کیوں جاتا۔

یہ بات طے تھی کہ فساد کی جڑ طلب تھی۔ نور بانو نے اُس کے ساتھ سفر کیا، یہاں آئی، دونوں ایک گھر میں رہے۔ بارہا سامنا بھی ہوا۔ لیکن اُس نے دیکھ کر بھی اسے نہیں دیکھا۔ وہ تصور میں اُس کا چہرہ کبھی نہیں دیکھ سکا۔ یعنی قربت کے باوجود طلب نہیں تھی۔

تو یہ فساد شروع کیسے ہوا؟ بے طلبی طلب میں کیسے تبدیل ہوئی؟ وجود میں ان فتنوں نے سر کیسے اٹھایا، جن کی موجودگی کا بھی اسے علم نہیں تھا یہ ہاتھ اس کو چھونے کی طلب میں کیوں کپکپاتے ہیں؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟

اب اتنا سوچنے کے بعد جواب بالکل واضح تھا۔ فساد کی جڑ نور بانو کا اظہار محبت تھا۔ اُس نے نور بانو کو جس بلند مسند پر بٹھایا ہوا تھا، وہاں وہ سر اٹھا کر آسمان تک کو دیکھ سکتا تھا لیکن اسے نہیں۔ اور جسے دیکھ نہ سکے، آدمی اُس کی طلب میں پاگل کیسے ہو سکتا ہے۔

لیکن اظہار محبت کے لئے نور بانو اس مسند سے اتر آئی...... اُس کے رُوبہ رُو کھڑی ہو گئی۔ وہ ہم رتبہ ہو گئے۔ غیر مشروط محبت کرنے والے کو جواب میں محبت ملے تو وہ کیا کرے گا۔ طلب ہی طلب!

اسے یاد آیا۔ اس رات ریٹا نے اُس سے محبت کے موضوع پر گفتگو کی تھی۔ وہ جس محبت کی بات کرتا تھا، ریٹا نے اسے آسمانی محبت قرار دیا تھا۔ اور وہ زمینی محبت کی بات کر رہی تھی۔ مرد اور عورت کی محبت۔ اُس نے کہا تھا۔ اس محبت کی بنیاد سیکس پر ہے۔ اس لئے تو شوہر اور بیوی کا رشتہ تخلیق کیا گیا ہے۔ اور اسی محبت سے نسلِ انسانی پھیلی ہے۔

تو میری آسمانی محبت زمینی محبت سے تبدیل ہو گئی ہے۔ اُس نے سوچا۔

اسی لمحے اسے تصور میں نور بانو کا سراپا نظر آیا...... اور اُس نے اسے لپٹا لیا!

اس بار اسے شرمندگی نہیں ہوئی، بلکہ وہ سرشاری میں ڈوب گیا۔ مگر فوراً ہی اسے خیال آ گیا کہ اسے تو طلب کے اس عفریت سے لڑنا، اسے زیر کرنا ہے ورنہ وہ اسی طرح نماز میں حضوری سے محروم رہے گا۔

❁ ❁ ❁

مغرب سے پہلے ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ گھٹا پوری طرح گھر کر آئی تھی۔ موسم کے تیور بہت سنگین تھے۔

نماز پڑھ کر نکلا تو عبدالحق شیڈ کی طرف چل دیا۔ اسے مینو کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ شیڈ سے کچھ دور تھا کہ بالکل اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اور وہ صرف بارش نہیں تھی۔ ہوا بارش سے بھی زیادہ تیز [illegible] تھی۔

عبدالحق بھیگنے سے بچنے کے لئے شیڈ کی طرف بھاگا لیکن اُس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسے تیز مخالف ہوا کا سامنا تھا۔ ایک قدم آگے بڑھانا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

وہ شیڈ کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ ایک بہت زوردار آواز سنائی دی۔ اس آواز کو پہچاننے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ تیز آندھی نے شیڈ کی ٹین کی چھت کو کم از کم جزوی طور پر اُڑا دیا ہے۔ اُس نے سر اٹھایا تو ایک دوسرے سے ہک کے ذریعے جڑے ہوئے متعدد ٹین اُڑتے نظر آئے اور کچھ آگے جا کر دھماکے سے گر گئے۔

اسی لمحے ایک زبردست کڑاکا ہوا۔ بجلی کا کوندا لہرایا، اور فوراً ہی معدوم نہیں ہوا۔ بلکہ کئی لمحوں تک فضا اس سے جگمگاتی رہی۔ کڑاکا اتنا شدید تھا کہ پیروں کے نیچے زمین واضح طور پر ہلتی محسوس ہوئی تھی۔

عبدالحق کو اس وقت صرف معصوم جانوروں کی فکر تھی...... خاص طور پر مینو کی۔ وہ بے چارے اس افتاد پر کیسے گھبرا رہے ہوں گے۔ اس کے باوجود اسے احساس ہوا کہ کڑاکے کے ساتھ ہی اُس نے ایک نسوانی چیخ بھی سنی تھی، جو کڑاکے میں دب کر رہ گئی تھی۔

وہ تیزی سے شیڈ میں داخل ہوا، جہاں گھپ اندھیرا تھا اور بارش کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ دو قدم ہی بڑھائے تھے کہ کوئی دوڑتا ہوا آیا اور اُس سے ٹکرا گیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے خود کو گرنے سے بچایا اور اضطراری طور پر ٹکرانے والے کو لپٹا لیا۔

اُس کی پشت پر ٹکرانے والے کے ہاتھوں کی گرفت بہت سخت تھی، جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی سہارا دینے والے کو پکڑتا ہے۔

ایک پل میں عبدالحق کو احساس ہو گیا کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔ اُس کا دل ایک بالکل نئے اور نامانوس انداز میں دھڑکا۔

''کک...... کون...... کک...... کون ہے......؟'' لڑکی خوف سے نڈھال تھی۔ اُس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ مگر اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

گھبرائی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہ آواز نامانوس لگی۔ لیکن اُس کے باوجود وہ اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ ''گھبرائیے نہیں نور بی بی، یہ میں ہوں...... عبدالحق۔''

یہ سنتے ہی سکون کی سانس کی آواز...... اور ڈھیلی ہوئی گرفت ایسی سخت ہو گئی کہ جیسے اب کبھی اس سے جدا ہی نہیں ہو گی۔

اسی لمحے دوبارہ کڑاکا ہوا، بجلی دوبارہ چمکی۔ عبدالحق نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ شیڈ کے اسی حصے میں تھے، جس کی چھت اُڑی تھی۔ تیز رفتار بارش انہیں بھگو رہی تھی، اور انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

نور بانو اور شدت سے اُس سے لپٹ گئی۔ اُس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا، وہ ایسی قربت تھی کہ عبدالحق کو نور بانو کا دل اپنے سینے میں دھڑ دھڑ کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

اُس نے سوچا کہ نور بانو کو لے کر شیڈ کے اس حصے میں چلا جائے، جہاں چھت ابھی موجود

ہے لیکن وہ ہل بھی نہیں سکا۔ وہ عجیب سی سحر زدگی تھی کہ اُس کا جسم جیسے پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔ مگر نہیں، مجسموں کی رگوں میں سرور اور بے خودی کب دوڑتی ہے۔

لمحے گزرتے گئے۔ وہ دونوں یونہی کھڑے بھیگتے رہے۔ ہوا کا زور تو ٹوٹ گیا تھا لیکن بارش بدستور ہو رہی تھی۔

دونوں نے ایک وقت میں ایک ہی بات سوچی۔ بارش کے ٹھنڈے پانی میں بھیگ کر بھی جسم اتنے گرم کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ کیا جادو ہے۔

عبدالحق تو صحرا کا رہنے والا تھا۔ سمجھ سکتا تھا، جانتا تھا کہ بارش کی ترسی ہوئی زمین پر جب پہلی بارش ہوتی ہے تو وہ حدت اگلنے لگتی ہے۔ اس پر ٹھنڈک کی رُت تو سیراب ہونے کے بعد ہی آتی ہے۔ لیکن نور بانو نہیں سمجھ سکتی تھی۔

پھر اچانک عبدالحق کو احساس ہوا کہ تصادم تو اتفاقی تھا۔ مگر جو کچھ اب ہو رہا ہے، وہ غلط ہے۔ دل تو چاہتا تھا کہ وقت ساکت ہو جائے اور وہ یونہی نور بانو کو بانہوں میں لئے کھڑا رہے۔ لیکن اس احساس نے کہ وہ گناہ کی حد میں داخل ہو چکا ہے، اسے لرزا دیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور ہوئی لیکن جواب میں نور بانو کے ہاتھوں کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ اُس نے نور بانو کو علیحدہ کرنا چاہا تو وہ اُس سے اور زیادہ لپٹ گئی۔ اسے دھکیل کر ہٹانا، دور کرنا اُس کے لئے ناممکن تھا۔

اندر سے تسلسل کے ساتھ ایک آواز ابھر رہی تھی...... یہ غلط ہے...... ممنوع ہے...... اللہ نے منع کیا ہے اس سے...... ہٹ جاؤ...... اور دھکیل دو اسے...... مگر دل کہہ رہا تھا کہ اسے جزو جاں کر لو...... ایک ہو جاؤ کہ یہی تکمیلِ بشر ہے۔

اندر کی آواز اسے بے چین کر رہی تھی، ڈرا رہی تھی۔ مگر دوسری طرف وہ ایسی سرمستی اور بے خودی کی کیفیت میں تھا، جو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، اور وہ اس کیفیت سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔ اس نے اندر کی آواز کو دلیل سے خاموش کرنے کی کوشش کی۔

لیکن ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی اس سے۔ ابھی یہ سب کچھ جائز نہیں۔ دور ہٹ جاؤ۔ دور ہٹا دو اسے۔

یہ محبت ہے، گناہ نہیں۔ اور ہم دونوں کی مرضی ایک دوسرے سے شادی کی ہے۔ ہم گناہ تو نہیں کر رہے ہیں۔

یہ گناہ ہی ہے۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹا دو اسے......

دل کی کمزور دلیل کے سامنے اندر کی آواز کمزور پڑتی گئی۔ عبدالحق نے تھوڑی تھام کر نور بانو

کا چہرہ اٹھایا، اور اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ ایسی قربت تھی کہ گھپ اندھیرے میں بھی وہ اس کے چہرے کے ہر نقش کو دیکھ سکتا تھا۔

رات پردہ پوش! اُس کے اندر کسی نے سرگوشی میں کہا۔

وہ جھکا اور بے تابانہ اس چہرے کو چومنے لگا۔ بارش کی طرح وہ اُس چہرے کو خال خال بھگو رہا تھا۔ مگر وہ اپنی اس کیفیت میں ایسا مدہوش تھا کہ اُسے نور بانو کی کیفیت کا احساس ہی نہیں تھا۔

نور بانو تھوڑی پر اُس کا ہاتھ لگتے ہی یوں بے خود ہوئی تھی کہ جسم کی ساری توانائی سمٹ کر اُس کے چہرے میں آ گئی تھی۔ اُس کی ٹانگیں اور اُس کا جسم ایسا ہو گیا تھا کہ عبدالحق اسے چھوڑ دیتا تو وہ زمین پر ڈھیر ہو جاتی۔ وہ تو جیسے اپنا وجود ہی کھو بیٹھی تھی۔ مگر اسے احساسِ زیاں نہیں تھا۔ بلکہ یہ سب ہو جانے کے اس عمل میں لذت اور بے خودی کے سوا کچھ نہیں تھا...... اور یہ احساس کہ اپنا ناتواں وجود اُس نے ایک طاقت ور وجود کے سپرد کر کے خود کو طاقت ور بنا لیا ہے۔ اب اس سہارے کے ساتھ وہ بہت کچھ ہے، اور اس سہارے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔

بارش کا زور بھی بہ تدریج ٹوٹ رہا تھا۔ بارش رکی تو عبدالحق کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گیا تھا۔ اُس نے بڑی نرمی سے نور بانو کو خود سے علیحدہ کیا۔

لمحے دبے پاؤں گزرتے رہے۔ عبدالحق سر جھکائے کھڑا تھا، جیسے اُس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ اور نور بانو بڑی مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ اُس کے بس میں ہوتا تو وہ گزرے ہوئے لمحوں کی گرفت سے کبھی آزاد نہ ہوتی۔

پھر نور بانو کو پریشانی کا احساس ہونے لگا۔ یہ خاموش کیوں کھڑے ہیں۔ بولتے کیوں نہیں۔ پھر اس کی سمجھ میں جیسے اچانک ہی بات آ گئی۔ اور غضب ہو گیا۔ یہ مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہے ہوں گے۔ میں تو گر گئی ان کی نظروں میں۔

ادھر عبدالحق کی یہ کیفیت تھی کہ ذہن صاف کی ہوئی سلیٹ جیسا ہو گیا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اور حافظے میں کوئی لفظ ہی نہیں تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے رُوبرو خاموش کھڑے رہے۔ عبدالحق کا شرمندگی سے برا حال تھا۔ وہ اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ مگر لفظوں تک پہنچنے میں اسے خاصی دیر لگی۔

بالآخر اُس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ ''نور بی بی...... مجھے معاف کر دیجئے۔''

نور بانو کو زبردست جھٹکا لگا۔ یہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ''جی...... جی...... آپ کیا......''

''[illegible] شرمندہ ہوں۔''

[illegible] سمجھ میں آئی، اس کی پریشانی دور ہو گئی۔ اُس نے سکون کا سانس لیا۔

[illegible]

''میں نے آپ کو بہت تکلیف پہنچائی۔'' عبدالحق اب گڑگڑا رہا تھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔'' نور بانو نے کہا۔

''آپ کو کتنا برا لگا ہوگا۔ مجھے......''

نور بانو نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا اور دروازے کی طرف لپکی...... لپکی کیا، لپکنے کی کوشش کی۔ کیونکہ شیڈ میں، جہاں وہ کھڑے تھے خاصا پانی جمع ہو چکا تھا۔ ان لمحوں میں اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

دروازے سے نکلتے نکلتے ایک خیال نے اُس کے قدم جکڑ لیے۔ اگر وہ اس وقت ایسے ہی نکل گئی تو شرمندگی کے زیرِ اثر عبدالحق شاید اس سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔ شاید وہ کبھی اس کا سامنا ہی نہیں کرے گا۔

وہ پلٹی اور عبدالحق کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے کسی مجسمے کی طرح کھڑا تھا۔ جسم میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ اسے اس پر ترس آنے لگا۔ اپنے باطن میں یہ بڑا آدمی اس وقت خود کو کتنا چھوٹا، کتنا حقیر سمجھ رہا ہوگا۔

حیا اپنی جگہ، لیکن اس وقت لب کشائی بہت ضروری تھی۔ محبت میں حقائق کو سمجھنا اور سمجھوتے کرنا وہ سیکھ چکی تھی۔ اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ چناں چہ اُس نے اسے پکارا۔ ''سنیے......''

عبدالحق نے نظریں اٹھائے بغیر مجرموں کے سے لہجے میں جواب دیا۔ ''جی نور بی بی۔''

''مجھے برا نہیں لگا۔ بلکہ اچھا لگا۔ اس لئے کہ اماں میری اور آپ کی شادی کا فیصلہ کر چکی ہیں۔'' نور بانو نے کہا اور اس سے پہلے کہ عبدالحق نظریں اٹھاتا، وہ گھر کی طرف چلی گئی۔

عبدالحق نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا کہ وہ سب اُس کا وہم تھا۔ مگر فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ اس اظہارِ محبت والی رات بھی اسے ایسا ہی لگا تھا۔ لیکن وہ وہم نہیں تھا۔

❁ ❁ ❁

زرینہ جیسے ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ عبدالحق نے سب کچھ اسے بتانے کے بعد کہا تھا۔ ''تمہاری شرط پوری ہو گئی۔ اب تو تمہیں کوئی اعتراض ہونا چاہئے نہ خوف۔''

''جی بھائی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسی لڑکی کو کیوں قبول کر رہے ہیں؟''

یہ بات عبدالحق اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ اُس نے رازداری کا وعدہ جو کیا تھا۔ ''سب اللہ کی رحمت ہے پگلی۔ اب اس کے بعد اگر مگر کرتا اور خوف زدہ ہونا ناشکرا پن ہوگا۔''

''آپ [illegible]ن ہیں نا بھابی؟''

''صرف مطمئن ہی نہیں، پوری [illegible] ہوں۔''

''تو پھر مجھے کیسا خوف۔''

اور اب زرینہ سوچ رہی تھی کہ واقعی اللہ کیسا کریم ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے وہ کوٹھے پر بیٹھی تھی اور ہر پل موت کی دعا مانگتی تھی، کیونکہ مرنا بھی اُس کے اختیار میں نہیں تھا۔ پھر یہ اللہ کے بھیجے ہوئے بھائی آئے، اور سب کچھ بدل گیا۔

اُس نے اکبر کو دیکھا تھا۔ وہ اسے اچھا لگا تھا۔ اور وہ بستی کا سب سے معزز گھرانہ تھا۔ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ اُس کی وہاں شادی ہو سکتی ہے۔ مگر سچ کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔

ایک اہم بات اس نے بھائی سے نہیں کہی تھی۔ وہ اسے اماں سے کہنی تھی۔ سو وہ اماں کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

اُس رات کھانے کے بعد عبدالحق معمول کے مطابق حمیدہ کے پاس بیٹھا تھا۔ ''آج تو زبردست بارش ہوئی۔'' حمیدہ نے کہا۔

عبدالحق کے دل میں چور تھا۔ اُس نے چونک کر حمیدہ کو دیکھا۔ کہیں اشارہ اُس کی طرف تو نہیں ہے۔ ''ہاں اماں، بڑی خطرناک بارش تھی۔'' وہ بولا

''خطرناک کیسی، بارش تو اللہ کی رحمت ہے پتر۔''

''وہ اماں...... دراصل...... اپنے شیڈ کی چھت کا ایک حصہ اُڑ گیا۔''

''ہاں، نور بانو نے مجھے بتایا تھا۔ وہ تو وہیں تھی اُس وقت۔ بھیگی ہوئی واپس آئی تھی۔''

''جی اماں۔''

''کیا تو بھی وہیں تھا اُس وقت؟''

''نہیں اماں۔ جب چھت اُڑی تو اُس وقت تو میں باہر تھا۔'' عبدالحق نے پوری سچائی سے کہا۔

''تُو وہاں نہ پہنچتا تو بچی بے چاری کا تو دم نکل جاتا ڈر کے مارے۔''

عبدالحق نے چپ سادھ لی۔ اب کچھ بولنا خطرناک ثابت ہوتا۔

''ڈنگر تو خیریت سے ہیں نا پتر۔''

عبدالحق نے موضوع تبدیل ہونے پر سکون کی سانس لی۔ ''جی اماں، ان کے سر پر جو چھت تھی، وہ محفوظ رہی۔'' اُس نے کہا۔

''اللہ کی شان ہے پتر۔''

چند لمحے خاموش رہی۔ پھر حمیدہ نے اچانک کہا۔ ''یہ تُو ہر وقت اُڑا اُڑا پھرتا ہے۔ اب تیرے پاؤں باندھنے پڑیں گے۔''

عبدالحق اس پر بری طرح بدکا۔ لگتا تھا، اماں کو کچھ معلوم ہے۔ دل اندر سے ملامت کرنے

لگا۔ مگر اس نے بڑی معصومیت سے حمیدہ سے پوچھا۔ ''ایسا کیا ہو گیا اماں؟''

''شادی کر دوں گی تیری تو پھر ٹک کر رہے گا میرے پاس۔''

عبدالحق کا دل بری طرح دھڑکا۔ وہ دل میں دعا کرنے لگا کہ آج یہ فیصلہ ہو ہی جائے شام کو جو کچھ ہوا تھا، اُس کے بعد یہ بہت ضروری تھا۔

''میں نے نور بانو سے بات کر لی ہے۔ تجھ سے تو پہلے ہی پوچھ لیا تھا۔''

''مگر اماں، پہلے تو زرینہ کی شادی کرنی ہے۔'' اُس نے کہا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ چالاک...... بلکہ مکار ہو گیا ہے۔

''زرینہ کہتی ہے پہلے تیری شادی ہو گی۔''

عبدالحق کا دل خوش ہو گیا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت نور بانو سے شادی کر لیتا۔ اندر کی شرمندگی مٹانے کی یہی واحد صورت تھی۔ تاہم اُس نے بڑی سنجیدگی سے معترضانہ انداز میں کہا۔

''اس کی کیا تُک ہے اماں؟''

''زرینہ ٹھیک کہتی ہے۔ تیری شادی کا ارمان ہے اسے بھی۔ وہ کیوں محروم رہے۔''

''تو وہ کون سا پردیس جائے گی۔ یہیں تو ہو گی۔'' عبدالحق کا مکاری کا احساس اور پکا ہو گیا۔

''ارے پگلے۔ شادی ہوئی تو لڑکی پرائی ہو گئی۔ پھر وہ بات کہاں۔ یہاں وہ آزادی سے تیری شادی میں شریک ہو گی۔ پھر تُو اور اُس کی بھابی مل کر اسے بدا کریں گے۔''

''لیکن اماں، ڈاکٹر صاحب جلدی چاہتے ہیں۔''

''اب جلدی کا مطلب کل تو نہیں ہے نا۔''

''میری شادی تو تم کل بھی کر سکتی ہو اماں۔'' عبدالحق نے بظاہر مذاق میں کہا۔ ''پھر ایک مہینے کے بعد زرینہ کی شادی۔''

''میرا بس چلتا تو کل ہی تیری شادی کر دیتی۔ پر یہ ممکن نہیں۔''

''کیوں اماں؟''

''تیری شادی میں رابعہ کا شریک ہونا تو ضروری ہے نا؟''

''ہاں۔ تو اس میں رکاوٹ کیا ہے؟''

''ارے...... بچہ ہونے والا ہے اُس کے ہاں۔ اب ایسے ہی وہ کیسے شریک ہو سکتی ہے؟''

عبدالحق کو منزل دور ہوتی نظر آئی۔ ''کیوں نہیں ہو سکتی اماں۔''

''اب تجھے کیسے سمجھاؤں۔ ایسے میں تو چلنا پھرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ ارے پگلے، وہ بھرے دنوں سے ہے۔''

''مطلب؟''

"کسی دن بھی بچہ ہوسکتا ہے اُس کے ہاں۔ پھر سوا مہینہ اور لگا۔ تو دو مہینے سے پہلے نہیں ہو سکتی تیری شادی۔"

عبدالحق کا دل بجھ گیا۔ احساسِ گناہ پھر ابھر آیا، جو اُس کی دانست میں صرف شادی سے مٹ سکتا تھا۔ مگر بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ رابعہ کے بغیر وہ شادی کیسے کرسکتا تھا۔

❋ ❋ ❋

زندگی میں پہلی بار عبدالحق اپنی طرف سے پریشان اور مضطرب تھا!

وہ اس کے لئے ایک نیا اور بے حد ناخوش گوار تجربہ تھا۔ خود سے ناخوش ہونا کتنی تکلیف دہ بات ہے، یہ وہ اب سمجھ رہا تھا۔ اور اب یہ بھی سمجھ میں آرہا تھا کہ خود سے خوش ہونا اور باطنی طمانیت کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس پر اس نعمت کی قدر نعمت کو کھونے کے بعد کھلی تھی۔

اس سے پہلے وہ خود سے ناخوش کبھی نہیں رہا تھا۔ ایک کمی کا احساس اسے ضرور ہوتا تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد زمین اس کے نام ہوئی تو کاغذات بنے۔ ان کاغذات میں اُس نے اپنا نام عبدالحق اور ولدیت ٹھاکر پرتاپ سنگھ لکھوائی۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور جب اُس نے میٹرک کیا تو وہ ٹھاکر اوتار سنگھ تھا۔ چنانچہ وہ سند اُس نے دوبارہ عبدالحق کے نام سے بنوائی۔ اس میں کوئی دشواری بھی نہیں ہوئی۔

البتہ ایک بات سے اس کا واسطہ تواتر کے ساتھ پڑا۔ جب بھی کاغذات کے حوالے سے کوئی کام ہوتا تو جس آدمی سے بھی واسطہ پڑتا، وہ حیرت سے کہتا...... ارے تمہارے والد ہندو تھے۔ یہ کہتے ہوئے کچھ لوگوں کے لہجے میں اُس کے لئے تضحیک بھی ہوتی لیکن حسن دین اور مسعود صاحب جیسے لوگوں کے لہجے میں ستائش اور خوشی ہوتی۔ تاہم کسی تضحیک کا اس پر کبھی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے کہتا...... جی میں نَومسلم ہوں۔ اس جواب میں خوبی یہ تھی کہ اسے یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ اُس کے پتا ہندو تھے۔ گویا مسلمان ہوتے ہی اس کے لئے پچھلے تمام معاملات بے معنی ہوگئے تھے۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ وہ عبدالحق ولد ٹھاکر پرتاپ سنگھ تھا۔

لیکن اسے ہلکا سا تاسف ضرور ہوتا تھا...... خود پر نہیں، تضحیک کرنے والوں پر۔ وہ اسے حقیر سمجھ رہے ہوتے تھے، صرف اس بنا پر کہ اللہ کی مہربانی سے وہ اہلِ ایمان میں پیدا ہوئے تھے۔ حالانکہ اس میں ان کے لئے فخر کی اور اس کے لئے شرم کی کوئی بات نہیں تھی۔ آدمی اپنے اختیار سے تو نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اللہ کے عطا کیے ہوئے کسی اعزاز پر کوئی اترائے تو یہ تو جہالت ہے۔ وہ تو سوچتا تھا کہ اس پر اللہ کی عنایت زیادہ بڑی ہے۔ وہ تو ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اللہ نے اسے رستہ دکھایا، ہدایت سے نوازا اور اسے قبولِ اسلام عطا فرمایا۔ اس سے ولدیت تو تبدیل نہیں ہوسکتی۔ بیٹا تو وہ اپنے باپ کا ہی کہلائے گا۔

تو جب بھی کسی نے ولدیت کے حوالے سے اُس کے ساتھ تضحیک کا رویہ اختیار کیا تو نہ ہی کبھی اسے کم تری کے احساس نے ستایا، اور نہ وہ کبھی ناخوش ہوا۔ ایک بات پر اسے افسوس ضرور ہوتا تھا کہ وہ اپنے پتاجی کے لئے مغفرت کی دعا نہیں کرسکتا اور اس افسوس کی بنیاد اُس کے دل میں پتاجی کی بے پناہ محبت تھی۔ اپنی ذات کے حوالے سے وہ کبھی ناخوش نہیں ہوا۔ کیونکہ اپنی ولدیت کے سلسلے میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس سلسلے میں اسے کوئی جواب دہی کرنی تھی۔ جواب دہی تو بندے کو اپنی کسی کوتاہی، کسی خطا، کسی گناہ کی کرنی ہوتی ہے۔

سو نَومسلم ہونا اُس کے لئے اللہ کی طرف سے اعزاز تھا، اور اُس نے اسے ہمیشہ اعزاز ہی سمجھا۔ خواہ کوئی مسلمان اُس کی تضحیک ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

پھر لاہور میں قیام کے دوران جو اُس نے جمیل جیسے کردار دیکھے، بازارِ حسن دیکھا، وہاں سڑکوں پر عورتوں کو مال قرار دیتے ہوئے دلال دیکھے، بازار میں پھرتے ہوئے، کوٹھوں پر جسم خریدتے ہوئے خریدار دیکھے تو وہ مایوس ہوا۔ ساتھ ہی اپنے اندر کہیں گہرائی میں اسے ایک بے حد کمینی خوشی کا احساس ہوا۔ وہ اسے سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اُس کے نتیجے میں ایک تبدیلی اُس میں رُونما ہوئی۔ اس کے بعد کوئی اس کی ولدیت کے حوالے سے اُس کی تضحیک کرتا تو وہ دل میں سوچتا......

یہاں میں نے وہ مسلم معاشرہ دیکھا ہے، جو بازارِ زنا کو ہیرا منڈی، شاہی بازار کو بازارِ حسن کہتا ہے۔ میں نے وہ پیدائشی مسلمان دیکھے ہیں، جن کا معاش ہی گناہ کی خرید و فروخت ہے، جو دو طرفہ گناہ کماتے ہیں۔ ایک طرف بے سہارا اور مجبور عورتوں کو کبھی دھوکے سے اور کبھی جبر سے بازار میں لا بٹھاتے ہیں تو دوسری طرف تھوڑی سی رقم کے حصول کے لئے مردوں کو گناہ کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اور نہ بھی کریں تو بھی ان عورتوں کے پاس آنے والے ہر گناہ گار کے گناہ میں حصہ دار بنتے ہیں۔ وہ سوچتا، یہاں میں نے پیدائشی مسلمان بھی دیکھے ہیں، جو اللہ کے لئے ناپسندیدہ ترین گناہوں میں سے ایک کی نیت لے کر بازار آتے ہیں اور گناہ میں لتھڑ کر بے فکری کے ساتھ جاتے ہیں۔ انہیں خیال نہیں آتا کہ وہ اللہ کو ناراض کررہے ہیں۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اُس کے انداز میں بے پناہ حقارت ہوتی۔ حالانکہ اس سے پہلے اُس نے رام گوپال جیسے لوگوں کے سوا کبھی کسی کو حقیر نہیں جانا تھا۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا کہ اس کی فطرت کے اعتبار سے یہ منفی تبدیلی ہے۔

ایک یہی نہیں، بے خبری کے عالم میں دوسرا نقصان اسے یہ ہوا تھا کہ اس کی فطری عاجزی اور انکساری میں کمی ہوئی تھی۔ وہ اپنی تحسین کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ لیکن اب نَومسلم ہونے کے حوالے سے، اپنی ولدیت کے حوالے سے خفیف سی تضحیک پر بھی وہ سوچتا، میں نَومسلم ان پیدائشی مسلمانوں سے بہتر ہوں کہ اللہ سے ڈرتا اور گناہوں سے بچتا ہوں۔

یہ تبدیلی اُس میں ایسے آئی تھی کہ اسے خود بھی پتا نہیں چلا تھا۔ شیطان ایسے ہی چپکے سے وار

کرتا ہے۔ بے خبری میں!

مگر اب عبدالحق پریشان اور مضطرب تھا...... کسی اور کے لئے نہیں، اپنے لئے۔ اسے رہ رہ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے ذاتی نقصان سے دوچار ہو گیا ہے۔ نماز میں اب بے لطفی تھی۔ وہ پہلے کی سی حضوری اور ارتکاز نہیں تھا، جس میں وہ واضح طور پر یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اللہ کے رُوبرو کھڑا ہے اور اللہ پاک اسے دیکھ رہے ہیں اور نماز میں وہ جو کچھ پڑھ رہا ہوتا، اُس کا مفہوم بھی اُس کے ذہن میں ہوتا۔ اکثر اس پر گریہ طاری ہو جاتا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے۔ وہ کیفیت اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ مگر اب وہ اس کیفیت سے محروم ہو گیا تھا۔

تلاوتِ قرآن کا بھی یہی حال تھا۔ پہلے وہ تو لفظوں سے آگے اللہ کی تسبیح کو، اس کی بشارت کو، آیت میں چھپے حکیمانہ حکمتوں کو سمجھ رہا ہوتا تھا۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ اب تو لفظوں سے آگے اسے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا...... اور لفظ بھی محض لفظ تھے۔

اور اس کی وجہ تھی نور بانو۔ یہ سب کچھ اُس رات نور بانو کے اظہارِ محبت سے شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ اُس کے تصور پر چھا گئی تھی۔ نماز میں بھی اور قرآن پڑھتے ہوئے بھی، اُس کا چہرہ، اُس کا سراپا اُس کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ مگر اب صورتِ حال بہت خراب ہو گئی تھی۔ بارش کی شام کے اُس واقعے کے بعد اُس کو جو حوالے میسر آئے تھے، وہ جسمانی اختلاط کے تھے۔ اور ان میں بڑی لذت تھی۔ نماز کے دوران وہ اس کے تصور پر چھا جاتے، اور وہ آلودگی کے احساس سے شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ مگر بار بار جھٹکنے کی کوشش کے باوجود وہ ان سے پیچھا نہیں چھڑا پاتا۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے تو پھر بھی جیسے تیسے گزارا ہو جاتا تھا۔ مگر خود نماز پڑھنے کے دوران تو صورتِ حال عبرت ناک ہوتی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس سورۃ کی قرأت کر رہا ہے۔ درمیان میں بھول جاتا تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بالآخر نئی سورۃ شروع کرنی پڑتی۔

ہر بار قرآن پڑھتے ہوئے اور نماز کے دوران شرمندگی اور ندامت قطرہ قطرہ اُس کے اندر گرتی اور جمع ہوتی رہی۔ ہوتے ہوتے اسے ایسا لگنے لگا کہ اس کے اندر شرمندگی کے سوا کچھ رہا ہی نہیں ہے۔ خود سے لڑتے لڑتے وہ تھک گیا تھا۔ وہ ہار رہا تھا، اور یہ احساس بہت اذیت دہ تھا۔

مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ شرمندگی اور ندامت ایک حد کو پہنچ کر بتدریج اپنی اہمیت کھوتے کھوتے معدوم ہو جائے گی۔ اس کی دانست میں اس مسئلے کا واحد حل نور بانو سے اُس کی شادی تھی۔ لیکن وہ بھی ابھی دور تھی۔

پھر ایک دن اُس نے سوچا، چلو...... دو تین مہینے بعد سہی۔ شادی ہو گی تو آپ ہی میری اصلاح ہو جائے گی۔

❀ ❀ ❀

مولوی مہر علی کو عبدالحق میں تبدیلی کا احساس ہو گیا تھا۔ پچھلی بار جو اس سے گفتگو ہوئی تھی تو انہیں پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ اس کی سوچ کسی حد تک منفی ہو گئی ہے۔ دوسرے وہ غرور کی حدود میں داخل ہو رہا ہے۔

انہیں اس باعمل نوجوان سے بہت محبت تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے کھلے دل سے دوسروں کی مدد کرتا تھا، ایسے کہ اسے اس بات کا خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ اُس نے کچھ کیا ہے۔ اتنی بے خبری کے عالم میں کی جانے والی نیکی کا تو بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ پھر وہ ایسا تو مسلم تھا، جسے کتاب اللہ سے عشق تھا۔

خود مولوی صاحب ایسے آدمی تھے، جو صرف قرآن کے حوالے سے زندگی کو سمجھنے، گزارنے اور عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولوی صاحب جانتے تھے کہ عبدالحق میں آنے والی وہ تبدیلی کوئی اچھی تبدیلی نہیں۔ بلکہ اس کی روک تھام نہیں کی گئی تو وہ اس کے لئے تباہ کن ثابت ہو گی۔

چناں چہ ایک دن انہوں نے عبدالحق کو نماز کے بعد روک لیا۔ "کیا بات ہے پتر؟ کچھ پریشان ہو آج کل؟" انہوں نے کہا۔

"نہیں مولوی صاحب، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟"

"پہلے تم نماز پڑھتے ہوئے گہرے سکون میں ہوتے تھے، پر اب بہت مضطرب ہوتے ہو۔ پہلے ہلتے ہی بھی نہیں تھے، اور اب پہلو بدلتے رہتے ہو۔"

عبدالحق کو تشویش ہوئی۔ جو کچھ اس پر گزر رہی ہے، وہ دوسروں کو نظر بھی آ رہی ہے۔ تاہم اُس نے سوچی سمجھی بے پروائی سے کہا۔ "ایسی کوئی خاص بات نہیں مولوی صاحب۔ بس آج کل نماز میں ارتکاز نہیں ہوتا۔"

مولوی صاحب نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ وہ اسے عام سی بات قرار دے رہا تھا۔ لیکن اُس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ اس کے لئے وہ بہت خاص بات ہے اور وہ اس پر پریشان بھی ہے۔

"یہ تو بہت خاص بات ہے پتر۔" انہوں نے دھیرے سے کہا۔

"اب مولوی صاحب، نماز کے دوران پریشانیوں اور تفکرات کی وجہ سے بے دھیانی تو عام سی بات ہے۔ سوچیں اور خیالات تو خود بہ خود ذہن پر چھا جاتے ہیں۔"

"ہاں پتر۔ اور اللہ اس پر معاف بھی فرما دیتا ہے۔ لیکن اللہ کی خاص عطا اور اس کے فضل کے بعد اس سے محرومی بہت خوف ناک بات ہوتی ہے۔" مولوی صاحب نے کہا اور گہری سانس لے کر اسے غور سے دیکھتے رہے۔

"میں سمجھا نہیں مولوی صاحب۔"

"دیکھو، گمراہی بہت بری چیز ہے لیکن ہدایت کے بعد گمراہی بہت خوف ناک ہے۔ ایمان کے بعد کفر اور شرک تباہی ہے۔ نیک اعمال کی محبت کے بعد ان سے بے رغبتی بدبختی ہے۔ اب نماز میں حضوری اور ارتکاز تو بندے کے لئے ناممکن ہے۔ اسی لئے تو معافی ہے۔ تو یوں سمجھو کہ کسی کو نماز میں حضوری اور ارتکاز میسر ہے تو وہ اس پر اللہ کی عنایت ہے۔ اور اُس کے چھن جانے کا مطلب اللہ کی ناراضی بھی ہوسکتا ہے۔ دیکھو نا، اللہ اپنی جس نعمت کو جب چاہے، واپس لے لے۔"

عبدالحق اندر سے تھرا کر رہ گیا۔ سچ مچ وہ اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ اور مولوی صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

"اللہ کی ناراضی کا کیسے پتا چلتا ہے مولوی صاحب؟"

"دل سے۔ دل سمجھ لیتا ہے۔ دل بتا دیتا ہے۔"

"مگر دل کی بات پر کوئی یقین کیسے کرے۔ دل جو کچھ کہتا ہے، اس کے پیچھے کوئی منطقی دلیل تو نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک کہتے ہو پتر۔" مولوی صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ کام تو دماغ کا ہے، عقل کا ہے۔ یہ دلیلیں ڈھونڈنا، جواز تلاش کرنا اور تجزیہ کرنا۔ لیکن پتر، دلیل تو ہر چیز کے حق میں مل جاتی ہے۔ وہ تو شرک اور کفر کو بھی جائز قرار دے دیتی ہے۔ اس لئے کہ عقل علم کی روشنی میں بات کرتی ہے اور اُس کا علم بہت محدود ہوتا ہے۔"

"تو پھر اللہ نے عقل کیوں دی ہے انسان کو؟"

"دنیا کے لئے دی ہے پتر۔ اور سمجھنے اور غور کرنے کے لئے دی ہے۔ اور عقل غلطی بھی کرتی ہے۔ تو دنیا کا نقصان ہو جائے تو بڑی بات نہیں۔ تم نے یہ غور نہیں کیا پتر عبدالحق کہ ایمان دل سے لانے کا حکم ہے۔ قرآن پڑھتے ہوئے کسی آیت میں چھپی کوئی حکمت، اس کا مفہوم دل پر اترتا ہے...... دماغ پر اور عقل پر نہیں۔ کیونکہ دل میں یقین ہوتا ہے اور دماغ اور عقل میں شکوک۔"

یہ وہ موضوع تھا، جو عبدالحق کو بہت محبوب و مرغوب تھا۔ پریشانی بھول بھال کر وہ اس میں کھو گیا۔ "لیکن مولوی صاحب، قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ زمین میں گھومو پھرو، غور کرو۔ تو یہ تو عقل کے لئے ہے نا۔"

"ہاں پتر۔ پر سب سے پہلے ہے دل سے ایمان لانا۔ اب ہم وہ ایمان لائے تو مسلم ہوئے۔ وہ سورۃ الحجرات میں ہے نا کہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے...... تو ان سے کہو کہ نہیں، تم ایمان نہیں لائے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ تو مسلم سے مومن کے درجے تک پہنچنا اُس کے بعد کا مرحلہ ہے۔ یہاں اس آیت پر سوچو، جس کا تم نے حوالہ دیا۔ زمین میں گھومو پھرو اور غور کرو۔ غور کرو گے تو اللہ کی قدرت کے لاکھوں پہلو تمہارے سامنے آئیں گے۔

ی اجڑی ہوئی بستی کو دیکھو گے تو دنیا کی بے ثباتی کو سمجھو گے۔ یعنی دلیل کے ساتھ تجزیہ کرو تو ان کی روشنی میں۔ اُس کے بغیر کرو گے تو بھٹک جاؤ گے۔ تو جب ایمان کی روشنی میں دیکھو گے تو یا کی بے ثباتی کو سمجھو گے۔ یعنی دلیل کے ساتھ تجزیہ کرو تو ایمان کی روشنی میں۔ اُس کے بغیر کرو ے تو بھٹک جاؤ گے۔ تو جب ایمان کی روشنی میں دیکھو گے اور سمجھو گے تو ایمان کی پختگی بڑھتی ے گی۔ اور دل کی روشنی بھی۔ پھر جب تم ایمان کی روشنی میں اللہ سے ڈرو گے، اس کے کامات بجالاؤ گے، ممنوعات اور مکروہات سے بچو گے اور نیک اعمال کرو گے تو بڑھتے بڑھتے کسی ی وقت اللہ کی رحمت سے ایمان تمہارے دل میں داخل ہو جائے گا اور تم مومن ہو جاؤ گے۔ تو یں سمجھو پتر کہ دل بادشاہ ہے، سپہ سالار ہے، اور عقل، دماغ اور دیگر حواس اس کی سپاہ ہیں۔ ان کا ام دل کے ایمان کی روشنی میں ایمان کی پختگی کے لئے دلائل و آثار جمع کرنا ہے۔"

"آپ نے کہا کہ اللہ کی ناراضی کا پتا دل کو چل جاتا ہے۔"

"ہاں...... اور اللہ کے راضی ہونے کا بھی۔"

"مگر مولوی صاحب، دل تو بغیر دلیل اور فہم کے چلتا ہے۔ وہ تو بس ایک پل میں فیصلہ کر لیتا ہے کہ بات درست ہے یا غلط، تو اُس کا فیصلہ درست ہونے کی تو کوئی ضمانت نہیں۔ اُس کا فیصلہ لط بھی تو ہو سکتا ہے۔ اور اُس کا نتیجہ گمراہی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو پتر۔ اس کے لئے قلب منیب درکار ہوتا ہے...... رجوع کرنے والا دل۔"

"اُس دن آپ نے کہا تھا کہ ہدایت ان لوگوں کے لئے ہے، جو رجوع کرنے والے ہوں۔" عبدالحق کو پچھلی گفتگو یاد آئی۔

"ہاں پتر، یہ مرحلے ہیں۔ بنیادی چیز یہ یقین ہے کہ اللہ موجود ہے۔ یقین میں نے اس لئے کہا کہ ایمان آگے کا مرحلہ ہے۔ اور اللہ کے وجود کا یقین کسی ایسے شخص کو بھی مل سکتا ہے، جو کافروں اور مشرکوں میں پیدا ہوا ہو......"

عبدالحق تھرا کر رہ گیا۔ اس کی مثال تو وہ خود تھا۔

"...... مگر سوچتا ہو، غور کرتا ہو اور اُس کی سمجھ میں آتا ہو کہ یہ سارا نظام، جس کے تحت دنیا چل رہی ہے، ایک زبردست ہستی کا قائم کیا ہوا ہے۔ تو وہ جب بھی کسی پریشانی میں ہو گا تو چاہے زبان سے نہ کرے، دل سے وہ اللہ سے رجوع کرے گا۔ یہ ہدایت کا آغاز ہے۔ دل میں روشنی میں پہلی کرن کا اترنا ہے۔ اور ہدایت مرحلہ وار ہوتی ہے۔ سوچو نا، حروف کی شناخت کے مرحلے میں موجود بچے کو تم کتاب تو نہیں پڑھوا سکتے۔ پہلے وہ حروف جوڑنا سیکھے گا اور پھر لفظ پڑھنا۔ ہاں، کسی پر اللہ کی خاص رحمت ہو تو وہ اور بات ہے......"

عبدالحق کو ایسا لگ رہا تھا کہ مولوی صاحب اُس کی کہانی سنا رہے ہیں۔ وہ اسی طرح سوچا

کرتا تھا اور مہان ہستی کا قائل ہوا تھا۔ نور بانو اُس کے لئے اتنی زیادہ محترم اسی حوالے سے تھی کہ نہ وہ اس کی آواز سن کر اس پر فدا ہوتا، نہ اسے عربی سیکھنے کا خیال آتا، اور وہ عربی نہ سیکھتا تو اُس رات وہ آیات اُس کی سمجھ میں کیسے آتیں، جو اُس کا ہاتھ تھام کر اسے ایمان کی طرف لے گئی تھیں۔

"تو پتر، رجوع کرنے والا بغیر یقین کے تو رجوع نہیں کرے گا۔ پھر اللہ کی رحمت سے رجوع کرنے کے نتیجے میں وہ ایمان تک پہنچے گا، اور سلسلہ جاری رہے گا تو ایمان میں اُس کے درجات بڑھتے جائیں گے۔ روشنی بڑھتی جائے گی، یہاں تک کہ دل پوری طرح روشن ہو جائے گا۔ یہ قلبِ منیب ہے۔ وہ دل جو صرف اللہ کی اطاعت کر کے قیامت کے روز اس کے دیدار کا امیدوار ہوتا ہے۔ اس دل کا اللہ سے رابطہ ہوتا ہے، اور وہ اس کے راضی اور ناراض ہونے سے ہر پل باخبر رہتا ہے۔ دل آدمی کے وجود میں اللہ کی نشریات وصول کرنے والا ریڈیو ہے۔ اب ہمیں یہ بتا دیا گیا کہ گناہوں کے نتیجے میں دل پر ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوتا ہے۔ اور آدمی مسلسل گناہ کرتا رہے تو وہ نقطہ پھیلتے پھیلتے پورے دل پر محیط ہو جاتا ہے۔ پھر اس دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اس تک صحیح بات بھی نہیں پہنچتی، الا یہ کہ اللہ چاہے۔"

بات عبدالحق کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ لیکن وہ اسے زیادہ بہتر طور پر سمجھنا چاہتا تھا۔ "پتا کیسے چلتا ہے مولوی صاحب۔ آپ اگر مجھ سے ناراض ہوں تو چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں، آپ کے چہرے سے اظہار ہو جائے گا۔ لیکن اللہ تو نظر نہیں آتا۔ وہ ہم سے کلام تو نہیں کرتا۔"

"دیکھو پتر عبدالحق، میں تو طالب علم ہوں۔ بس اپنا تجربہ تمہیں بتا سکتا ہوں۔" مولوی صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اللہ نے ہمارے وجود میں، ہمارے باطن میں بھی نشانیاں رکھی ہوئی ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ آنسو اللہ کی رضا کا مظہر ہوتے ہیں، خواہ وہ خوشی کے ہوں، شکر کے ہوں ندامت کے ہوں یا بے سبب ہوں۔ گریہ مجھے بتاتا ہے کہ میرا رب مجھ سے راضی ہے۔ یہ میں کسی دنیاوی، جسمانی یا قلبی تکلیف اور اذیت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ نماز پڑھتے ہوئے خوش قسمتی سے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے......"

یہ بھی عبدالحق کے تجربے میں تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ اللہ کے، بندے سے خوش ہونے کی دلیل ہے۔ اور اب تو وہ اس سے تقریباً محروم ہی ہو گیا تھا، اور اس کی کمی محسوس کر رہا تھا۔

"اور ناراضی کا کیسے پتا چلتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ ناراض ہوتا ہے تو بندہ گریہ سے محروم ہو جاتا ہے۔" مولوی صاحب نے سادگی سے کہا۔

عبدالحق لرز کر رہ گیا۔ تو کیا اللہ اس سے ناراض ہے۔

"اللہ آپ سے اپنی رضا کا اظہار فرماتا ہے تو دل نرم ہو جاتا ہے، جیسے پگھل رہا ہو، اور آپ بے اختیار رونے لگتے ہیں۔ اور وہ ناراضی ظاہر فرمائے تو دل سخت ہو جاتا ہے۔ آدمی غصے اور

جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو جاتا ہے، جو شیطانی اوصاف ہیں۔ نماز میں قرأت کرتے ہوئے میں کوئی آیت بھول جاؤں، جو مجھے پکی یاد تھی تو مجھے ندامت ہوتی ہے، بے بسی کے احساس سے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ میں اس سے پچھلی آیت کو بار بار دہراتا ہوں۔ اللہ خوش ہوتا ہے اور مجھے وہ آیت یاد آ جاتی ہے۔ دل کو سکون ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اسی صورت حال میں ایسا ہوتا ہے کہ مجھے اپنے بھولنے پر غصہ آتا ہے، جھنجلاہٹ ہوتی ہے، مجھے وہ آیت بار بار کوشش کرنے پر بھی یاد نہیں آتی۔ تنگ آ کر میں کوئی دوسری سورۃ پڑھ لیتا ہوں۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے ناراض ہے۔"

"لیکن پکی یاد ہوئی آیت آدمی بھول کیسے جاتا ہے؟" عبدالحق نے سوال کیا۔

"پہلے یہ سوچو کہ پورا قرآن آدمی کو یاد کیسے ہو جاتا ہے؟"

"وہ تو اللہ کی رحمت اور عنایت ہوتی ہے مولوی صاحب۔"

"میں پھر کہوں گا پتر کہ میں عالم نہیں، معمولی سا طالب علم ہوں۔ مجھے تو بھولنا بھی اللہ کی رحمت لگتی ہے۔"

"وہ کیسے مولوی صاحب؟"

"دیکھو، میں حافظِ قرآن ہوں۔ آدمی کسی خوبی پر مغرور بھی تو ہو سکتا ہے۔ تو اللہ مجھے چھوٹی سی ایک آیت بھلا دیتا ہے۔ تاکہ میں سوچوں کہ جو ملا ہے، وہ اُس کا فضل ہے۔ ورنہ میری تو ایک چھوٹی سی آیت یاد کرنے کی بھی بساط نہیں۔ تو یہ اللہ کی رحمت ہے ناکہ وہ مجھے غرور کی حد سے کھینچ کر عاجزی کے دائرے میں لے آتا ہے۔ ذرا سوچو پتر کہ تراویح پڑھانے والے کے پیچھے کئی کئی حافظ کیوں ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ حافظ ہے اور قرآن پڑھنے میں بھول نہیں سکتا۔"

"ذرا قلبِ منیب کی وضاحت بھی کر دیجئے۔"

"وہ تو بہت منور، بہت روشن دل ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اُس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ جنگل کے سب سے کمزور جانور کی طرح چوکنا ہوتا ہے، جسے کوئی بھی جانور نقصان پہنچا سکتا ہے۔ دماغ اس کا تابع ہوتا ہے۔ وہ معمولی سی آہٹ پر بھی چوکس ہو جاتا ہے۔ پتے کی سرسراہٹ پر بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ یہ وہ دل ہے کہ کوئی اس کی تعریف خلوص سے بھی کرے تو وہ اُس پر خوش ہونے کے بجائے الحمدللہ کہہ کر اس تعریف کو اسی کی طرف بھیج دیتا ہے، جس کے لئے ہر تعریف ہے۔ وہ ہر خیال، ہر سوچ کی طرف سے چوکس رہتا ہے کہ ان میں سے کوئی شیطان کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی چوکسی کا الٹ لفظ ہے غفلت۔ تم غفلت کو معمولی لفظ نہ سمجھنا پتر۔ غفلت دل کی روشنی کم کرتی ہے، اور اندھیرے کو بڑھاتی ہے۔ غافل دل کو شیطان کسی بھی وقت گمراہ کر دیتا ہے۔ اور یاد رکھو، شیطان سب سے زیادہ، روشن دلوں کی تاک میں رہتا ہے۔

"تو پتر، دل روشن ہو تو اللہ کی ناراضی کا فوراً ہی پتا چل جاتا ہے۔ اور بندہ فوراً ہی نادم ہو کر

اللہ سے رجوع کرتا ہے۔ توبہ کرتا ہے۔ یہ ہے قلبِ منیب۔ سورۃ قٓ میں اللہ فرماتا ہے: مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ ۔ جو ڈرتا رہا رحمان سے بن دیکھے اور آیا ہے دل گردیدہ لیے۔ تو یہ ہے قلبِ منیب۔"

عبدالحق سوچ رہا تھا...... اس سے بے خبر کہ مولوی صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔

"عبدالحق پتر، اب تم شادی کرلو۔" مولوی صاحب نے اچانک کہا۔

عبدالحق بری طرح چونکا۔ اس نے نظریں اٹھائیں، مگر گھبرا کر فوراً ہی جھکالیں۔ کیا مولوی صاحب جان گئے ہیں کہ میں......؟ آگے اس سے سوچا نہیں گیا۔ "یہ کیوں کہا آپ نے مولوی صاحب؟" اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نکاح میرے پیارے نبی ﷺ کی اہم ترین سنتوں میں سے ہے پتر۔ اور نیک بیوی اللہ کی اعلیٰ ترین نعمتوں میں سے ہے۔ نکاح حرام کو حلال کرتا ہے۔ جیسے تکبیر پڑھ کر ذبح کرنے سے پہلے گوشت آدمی پر حلال نہیں ہوتا، ویسے ہی نکاح کے بغیر عورت بھی مرد پر حلال نہیں ہوتی۔ اور پتر، ہر گناہ کی ایک ڈھال ہوتی ہے۔ تو زنا کی ڈھال نکاح ہے۔"

عبدالحق پر لرزہ طاری ہو گیا۔ "مگر مولوی صاحب، میں تو زنا کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"زیادہ تر گناہ آدمی بے سوچے سمجھے کرتا ہے پتر عبدالحق۔" مولوی صاحب نے شفقت سے کہا۔ "وہ تو جب دل بالکل ہی سیاہ ہو جائے تو آدمی سوچ سمجھ کر منصوبہ بنا کر گناہ کرتا ہے۔ لیکن عام آدمی تو بے خبری میں گناہ کرتا ہے، اور اکثر اوقات تو بعد میں بھی اس سے بے خبر ہی رہتا ہے کہ وہ جو کچھ اُس نے کیا، وہ گناہ تھا۔ اور مسلمان کو زنا کو عام پہلو سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ زنا تو ہر عضو کا ہوسکتا ہے، بلکہ ہوتا ہے۔ کسی کو بری نظر سے دیکھا تو یہ آنکھوں کا زنا ہے۔ زبان سے فحش بات حصولِ لذت کے لئے کہی تو یہ زبان کا زنا ہے۔ آگے خود سوچتے چلے جاؤ۔ سمجھ میں آجائے گا۔"

عبدالحق کا بہت برا حال تھا۔ اُس کا بس چلتا تو جادو کے زور پر وہاں سے غائب ہو جاتا۔

"لیکن مولوی صاحب، یہ کیسی ڈھال ہے۔ شادی کے بعد بھی تو لوگ زنا کی طرف چلے جاتے ہیں۔"

"وہ ان کی بدبختی ہے۔" مولوی صاحب نے آہ بھر کے کہا۔ "اور پتر، ڈھال تو بس دشمن کے وار روکنے کے لئے ہوتی ہے۔ ذرا سی چوک ہوئی تو دشمن نے جھکائی دے کر چرکا لگا دیا۔ ڈھال مکمل تحفظ تو نہیں۔"

"تو مکمل تحفظ تو ممکن ہی نہیں۔"

"ہاں...... مکمل تحفظ تو بندے کے اختیار میں ہے ہی نہیں۔ بچانے والا تو اللہ ہے۔ البتہ بندے کو زرہ پوش ہونا چاہئے۔"

"اور آدمی کی زرہ کیا ہوتی ہے؟"

"اللہ نے قرآن میں فرمایا تو ہے کہ بہترین لباس تقویٰ ہے۔ تو گناہوں کے مقابلے میں بندے کی زرہ تقویٰ ہے...... اللہ سے ہر پل ڈرنا، اور اس ڈر سے چوکنا رہنا کہ بے اختیار بھی گناہ سرزد نہ ہو۔"

"اور اس زرہ پر بھی چرکا لگ جائے تو؟"

"تو اس کے لئے توبہ کا رفو ہے۔ جس کے جسم پر تقویٰ کا لباس ہوگا، گناہ سرزد ہونے پر اُس کا دکھ بھی تو بہت شدید ہوگا۔ کیسے گڑگڑائے گا وہ، کیسے روئے گا۔ سچے دل سے۔ سچی توبہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ اور توبہ قبول ہوگی تو جسم پر، روح پر چرکے کا نشان بھی نہیں رہے گا، اور زرہ بھی پہلے جیسی بے داغ ہو جائے گی۔"

"لیکن تقویٰ اختیار کرنا تو بہت مشکل کام ہے مولوی صاحب۔"

"مشکل نہیں، بندے کے لئے تو ناممکن ہے۔ تقویٰ کے لئے بندے کو اللہ کی ذات پر، اور اُس کی اپنی بتائی ہوئی صفات پر کامل ایمان ہونا چاہئے۔"

"تو یہ ایمان تو ہر مسلمان کے پاس ہوتا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

مولوی صاحب نے پھر ایک گہری سانس لی۔ "یہ وہی بات ہے، جس کے لئے میں نے سورۃ الحجرات کی آیت مبارکہ کا حوالہ دیا تھا۔ ہم عام لوگوں نے مان لیا۔ لیکن مان لینا یقین کا سب سے نچلا درجہ ہے۔ کبھی آدمی یونہی، بغیر یقین کے بھی کوئی بات مان لیتا ہے۔ وہ یقین بھی نہیں ہوتا۔ کام یقین سے بھی نہیں چلتا۔ یہاں تو ایمان چاہئے...... ایمان۔ یقین دل میں داخل ہوا اور رچ بس جائے تو ایمان کی حد شروع ہوتی ہے۔ پھر بندہ جیسے جیسے اللہ کو خوش کرتا ہے تو اللہ اس کے ایمان کے درجات بلند فرماتا رہتا ہے۔ اب پتر، ہم مانتے ہیں نا کہ اللہ سمیع ہے۔ کیا بولتے وقت ہمیں ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ اللہ سن رہا ہے۔ ہم اسے بصیر مانتے ہیں۔ لیکن یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ وہ ہمیں ہر پل دیکھ رہا ہے۔ اگر ان صفات پر ہمارا ایمان ہو تو ڈر کے مارے بولنا ہی بھول جائیں۔ زمین پر قدم بھی پھونک پھونک کر رکھیں۔ نہیں پتر، ہم صرف مانتے ہیں، ایمان نہیں رکھتے۔ ہم الحمدللہ مسلم ہیں۔ ہماری زندگی کا مقصد مسلم سے مومن تک کی مسافت کو طے کرنا ہونا چاہئے۔ مگر ہم دنیا میں الجھ کر اپنے اس مقصد کو بھول جاتے ہیں۔ اور جب زیادہ الجھتے ہیں تو جو کچھ مانا تھا، اُس میں سے بھی بھولنا شروع کر دیتے ہیں، اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا۔"

عبدالحق نے ستائشی نظروں سے انہیں دیکھا۔ "لیکن مولوی صاحب، آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ آپ تو مومن ہیں......"

"نا پتر۔ میں مومن کہاں۔ ہاں اللہ سے ایمان اور تقویٰ مانگتا ہوں۔ سنو پتر، عالم بے عمل بھی تو ہوتا ہے۔ نا۔ سب کچھ جانتا ہے، دوسروں کو نصیحت کرتا ہے، پر خود عمل نہیں کرتا۔ اس لئے تو

اُس کی بات میں تاثیر نہیں ہوتی۔ سنو پتر، میرے پاس...... ہر انسان کے پاس جو بھی اچھا ہے، وہ اللہ کی عطا سے، اس کے فضل وکرم سے ہے۔ اس کا دیا ہوا ہے۔ اور جو کچھ میرا اپنا ہے، اُس کا میں حساب نہیں لگانا چاہتا۔ کیونکہ وہ سب برا ہے۔"

"تو مولوی صاحب، بندہ خود سے زرہ پوش نہیں ہوسکتا۔ اور ڈھال پوری طرح دفاع نہیں کرسکتی۔ پھر بندہ کیا کرے؟"

"ڈھال کے ساتھ اللہ کی رحمت اور مغفرت طلب کرتا رہے۔ میری بات سنو پتر، جن کے دلوں پر مہر لگ گئی ہو، ان کی اور بات ہے۔ پر عام بندہ جو بھی گناہ کرتا ہے، وہ غیر فطری نہیں ہوتا۔ سارا فساد نفس کا ہے۔ اور نفس ابتدا میں جو کچھ بھی مانگتا ہے، وہ فطری ہوتا ہے۔ ان ممنوعہ چیزوں میں نفس کے لئے کشش اللہ نے رکھی ہے۔ تو ڈھال کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ بندہ اپنے نفس کو پچھاڑ کر رکھے۔"

"لیکن کہتے ہیں کہ نفس بہت طاقت ور ہوتا ہے۔"

"شروع میں بندہ نفس سے طاقت ور ہوتا ہے۔ مگر وہ تقاضے کرتا رہتا ہے...... ہر ہر پل تقاضے۔ اور بندہ اُس کی معمولی سی طلب بھی پوری کردے تو اُس کی طاقت بہت بڑھتی ہے۔ اور تقاضوں پر تقاضے پورے کرتے چلے جاؤ تو نفس آقا بن جائے گا اور تم غلام۔ نفس کو ہوس ہوتی ہے۔ وہ سیر کبھی نہیں ہوتا۔ بیوی مل جائے تو اُس سے سیر ہوجاتا ہے اور غیر عورت کا تقاضا کرتا ہے۔ دولت مل جائے تو مزید دولت۔ وہ ہر وقت ھَل مِنْ مَزِید کی تکرار کرتا ہے۔ اور دیکھو، سورۃ قٓ میں اللہ نے فرمایا ہے کہ دوزخ بھی پوچھنے پر یہی کہے گی...... ھَلْ مِنْ مَزِید. کہنے کا مطلب یہ کہ نفس کو بھوکا رکھنا ضروری ہے۔ اسی سے یہ کمزوری میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اور وہ تمہیں پوری طرح زیر کرلے تو پھر غیر فطری اور غیر انسانی تقاضے بھی کرنے لگتا ہے، اور بندہ اُس کے سامنے عاجز اور مجبور ہوجاتا ہے۔"

"نجات تو تقویٰ میں ہے مولوی صاحب۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ بندہ تقویٰ کو نہیں پہنچ سکتا۔" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔ "تو پھر بندہ کیا کرے کہ اللہ اسے تقویٰ عطا فرمائے۔"

"اللہ سے کچھ بھی حاصل کرنے کے لئے بندے کے پاس ایک ہی راستہ ہوتا ہے...... یہ کہ وہ اللہ سے رجوع کرنے والا بنے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہدایت ان کے لئے ہے جو اللہ سے رجوع کرتے ہیں۔ اور سورۃ الفتح میں اللہ فرماتا ہے...... اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی، مزید عطا فرماتا ہے اللہ ان کو ہدایت اور عطا فرماتا ہے انہیں ان کے حصے کا تقویٰ۔ تو بندہ تسلسل کے ساتھ اپنے رب سے راجع رہے گا تو ہدایت بڑھتی رہے گی، اور ہدایت کی نسبت سے انہیں تقویٰ میں بھی حصہ ملتا رہے گا۔ تو پتر عبدالحق، بندے کی تو عافیت اس میں ہے کہ اللہ سے رجوع کرتا رہے......

نیکی میں بھی اور گناہوں کے بعد بھی۔"

اب عبدالحق اپنی طرف سے فکرمند تھا۔ اور وہ صورتِ حال کو جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ جھجک رہا تھا۔ "تو مولوی صاحب، اللہ نے کچھ عورتیں تو ہر شخص پر حرام کردی ہیں۔"

"ہاں...... رشتوں کے حوالے سے۔ جیسے ماں، بہن، خالہ، پھوپھی، سگی بھتیجی، سگی بھانجی۔ پھر وہ عورتیں جو باپ کے نکاح میں رہیں حرام ہیں۔ اب رہیں نامحرم عورتیں تو ان کے حلال ہونے کی واحد صورت نکاح ہے۔"

عبدالحق متذبذب تھا...... جھجک رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اُس کی کیفیت بھانپ لی۔

"علمی گفتگو میں کبھی نہ شرمایا کرو پتر۔ بندہ بات نہیں کرے گا تو جانے گا کیسے؟" وہ بولے۔

"لیکن ہاں، گناہ کے بارے میں کبھی کسی کو مت بتاؤ خواہ شرمندگی اور ندامت کے زیرِ اثر بتا رہے ہو۔ اللہ ستّار ہے۔ بندوں کا پردہ رکھتا ہے۔ اُس نے کسی کا باطن کسی پر نہیں کھولا۔ اور وہ معاف کرنے والا ہے۔ بڑے سے بڑا گناہ معاف کردیتا ہے۔ بندے کا عمل بس اُس کے اور اللہ کے درمیان رہنا چاہئے۔ وہ تو نیکی کی تشہیر بھی پسند نہیں کرتا۔ سب سے اجر والی نیکی تو اُس کے ہاں وہ ہے، جس کا علم صرف نیکی کرنے والے کو ہو یا اسے جس کے ساتھ نیکی کی گئی۔ اور وہ تو ہے ہی علیم و خبیر۔ تو وہ یہ کبھی پسند نہیں کرے گا کہ بندہ گناہ کی تشہیر کرے۔ گناہ پر گواہ بنائے۔ یہ بڑائی نہیں، برائی ہے۔" انہوں نے ایک لمحے کو توقف کیا۔ "مجھے لگتا ہے، تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔"

"جی، مولوی صاحب، میں یہ سوچتا ہوں کہ نسبت طے پانے کے بعد کا وقت بہت نازک ہوتا ہے۔" عبدالحق نے کہا، اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے کرے۔ لیکن بات کرنا بھی ضروری تھا۔ "اب کسی لڑکی کی منگنی ہوگئی کسی سے۔ اور دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں۔ تو مولوی صاحب، ان کے درمیان کشش تو ہوگی۔ اب اگر کسی دن وہ بہک جائیں لیکن زنا کے مرتکب ہونے سے بہرحال بچ جائیں تو کیا وہ گناہ گار ہوں گے؟"

"بالکل ہوں گے پتر، میں نے کہا نا کہ زنا تو ہر عضو کا ہوتا ہے۔ جو عورت جب تک آپ کے لئے حرام ہے تو آپ کے تمام اعضاء پر حرام ہے۔ البتہ درجوں کا فرق ہوتا ہے۔ اور اللہ غفور الرحیم ہے۔"

"لیکن ایسا ہے کہ ان دونوں کی کچھ عرصے بعد شادی ہونی ہے، اور ہو بھی جاتی ہے۔"

"سنو عبدالحق پتر، اللہ بہت بخشنے والا ہے۔ ہماری بے شمار چھوٹی چھوٹی خطائیں تو وہ ہر پل ایسے معاف کرتا رہتا ہے کہ ہمیں علم بھی نہیں ہوتا لیکن شریعت تو اپنی جگہ ہے۔ جو جس وقت حرام ہے، اُس وقت حرام ہے۔ بعد میں جب حلال ہوگا تو حلال ہوگا۔ لیکن میں پھر کہوں گا کہ اللہ غفور الرحیم ہے، اور بندے پر توبہ لازم ہے۔"

"لیکن مولوی صاحب، اگر بات بہت زیادہ نہیں بڑھی......اور انداز میں معصیت نہیں ہے تو......"

"چن پتر، چھوٹی چھوٹی لغزشیں ہی تو گناہ کا راستہ ہموار کرتی ہیں۔ جو آسان ہدف نہیں ہوتے، شیطان ان پر اسی انداز میں وار کرتا ہے۔ وہ انہیں بے خبری میں مبتلا کرتا ہے، انہیں تھپکتا ہے، معصیت کے نکتہ آغاز کو معصومیت پر محمول کرنے کا درس دیتا ہے۔ سنو پتر، عافیت ایک دائرے کی مانند ہے۔ لکیر کے باہر گناہ ہے اور گمراہی ہے۔ تو بندہ لکیر کے اندرونی حصے تک جو جا سکتا ہے نا۔ لیکن پتر عبدالحق، وہ بہت باریک لکیر ہوتی ہے۔ اللہ نے اس لکیر کے قریب جانے کو بھی منع فرمایا۔ کیوں؟ کوئی ہلکا سا دھکا دے...... یا آپ خود ہی لڑکھڑا جائیں، پاؤں پھسل جائے تو آپ تو گر گئے نا۔ آپ خود کو نہیں جانتے۔ اللہ سب جانتا ہے۔ آلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَق۔ تو جو بہت بڑے گناہ ہیں پتر، ان سے تو بہت دور رہنا چاہئے۔ ان کے قریب تو پھٹکنا ہی نہیں چاہئے۔

"اور ایک بات بتاؤں۔ اہمیت ہے تو صرف نکاح کی ہے۔ ارادے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ منگنی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ آزمائش بڑھ جاتی ہے بندوں کی۔ اب وجہ بھی بتا دوں۔ بندے کو تو اپنے اگلے پل کا بھی پتا نہیں ہوتا۔ کوئی منگنی کرتا ہے۔ کسی دن اتفاق سے قربت میسر آتی ہے، دونوں بھٹکتے ہیں اور توبہ بھی نہیں کرتے، اس خیال سے کہ ہماری تو شادی ہونے والی ہے۔ اب ان میں سے کوئی ایک خدانخواستہ مر جائے تو کتنا بڑا نقصان ہوا۔ مرنے والا توبہ کے بغیر ہی چلا گیا نا۔"

عبدالحق اندر ہی اندر بری طرح لرز رہا تھا۔

"اس سے بھی خطرناک بات۔ اگر وہ منگنی ہی ٹوٹ جائے، اور دونوں کی شادی کہیں اور ہو جائے تو خیانت کا جرم اپنی جگہ۔ ضمیر پر تو دونوں کے ہمیشہ بوجھ رہے گا۔ ایسے میں زندگی اچھی تو نہیں گزر سکتی۔ تو پتر، بندے کو اپنے اگلے پل کا پتا نہیں ہوتا۔ وہ کوئی چیز پیشگی کیسے وصول کر سکتا ہے۔ اور پتر، یاد رکھو، اللہ جس بندے پر مہربان ہو، وہ اسے بڑے بڑے گناہوں سے بچاتا رہتا ہے......"

"وہ کیسے مولوی صاحب؟" عبدالحق نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔

"بندے اور گناہ کے درمیان فاصلہ پیدا فرما کے...... فاصلہ بڑھا کے۔ رکاوٹیں کھڑی کر کے۔ اب جس بندے پر اللہ کی رحمت ہوگی، وہ اُس سے رجوع کرنے والا تو ہوگا۔ تھوڑا سا ڈرنے والا تو ہوگا۔ تو دو افراد کی تنہائی میں اللہ کسی تیسرے کو بھیج دے گا۔ یا بندے کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ یا اسے کسی حادثے کی خبر جھنجوڑ دے گی، اسے کہیں جانا پڑ جائے گا۔ وہ سب کچھ کرنے والا ہے۔ اس کے پاس اتنے طریقے ہیں کہ اس کی نعمتوں کی طرح ان کا شمار بھی ممکن نہیں۔"

مولوی صاحب چونکے۔ "تم نے مجھے اصل بات بھلا دی پتر۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جن پر اللہ کی نظرِ کرم ہوتی ہے، انہیں وہ بڑے بڑے گناہوں سے بچاتا رہتا ہے۔ لیکن ایسے بندے کے لئے

چھوٹی چھوٹی، بے ضرر نظر آنے والی خطائیں خطرناک ہوتی ہیں۔ ان سے بچنا بندے کی ذمہ داری ہے۔ وہ اسے بڑے گناہوں کی طرف لے جا سکتی ہیں۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی خطاؤں سے نہ بچے تو اللہ کی نظرِ کرم سے محروم ہو سکتا ہے۔ اور پتر چھوٹی چھوٹی خطاؤں کی طرف سے بے پروائی ایک طرح کا غرور ہے۔ اور غرور شیطان کا وصف ہے۔ جبکہ بندے کا وصف عاجزی ہے، جو اسے استغفار تک لے جاتا ہے۔ اور غرور اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ اسی کی وجہ سے تو شیطان راندۂ درگاہ ہوا تھا۔ تو پتر، بندے کو ڈھال کا بندوبست کرنا چاہئے اور اسے مضبوطی سے تھام کر شیطان کی طرف سے ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے۔"

"مولوی صاحب آپ نے فرمایا تھا کہ نیک بیوی اللہ کی اعلیٰ ترین نعمتوں میں سے ہے۔"

"ہاں عبدالحق پتر، بیوی کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اچھی ہو تو دنیا میں بھی جنت ہے اور آخرت میں بھی۔ کیونکہ وہ شوہر کو ترغیبات سے بچاتی ہے، اسے خوشی دیتی ہے۔ اور بُری بیوی تو فرمائشیں کر کر کے شوہر کو دنیا میں اور فکرِ معاش میں ایسا الجھاتی ہے۔ کہ وہ اللہ کی یاد سے غافل اور آخرت کی طرف سے بے فکر ہو جاتا ہے۔"

پہلی بار عبدالحق خوش ہوا۔ اللہ کی رحمت سے اسے ایسی بیوی مل رہی تھی، جو اُس کے ایمان لانے کا سبب بنی تھی، جس کی وجہ سے اُس کا قرآن سے تعلق قائم ہوا تھا۔ وہ بلاشبہ نیک اور صالح تھی۔

❁ ❁ ❁

برسات کا موسم تھا۔ لیکن صحرائی علاقوں میں بارش کم ہی ہوتی ہے۔ زیادہ تر گھٹائیں گھر کر آتی ہیں، جیسے برسے بغیر مانیں گی ہی نہیں۔ پھر کچھ دیر گرج کڑک سنا کر تتر بتر ہو جاتی ہیں۔ شاید اسی لئے صحرائی لوگوں سے بڑھ کر بارش کی خوشی کسی کو نہیں ہوتی۔

سو گھٹائیں گھر کر آئیں اور آم کے درختوں پر کوئلیں پی ہو پی ہو پکارنے لگیں تو حمیدہ بھی تڑپ کر اپنے کمرے سے نکل کر دالان میں آ گئی۔ اسے وہاں دیکھ کر کام کے لئے آنے والی شاداں جلدی سے اُس کے لئے کرسی لے آئی۔

حمیدہ وہاں بیٹھ گئی۔ "ارے...... یہ دونوں لڑکیاں کہاں ہیں میری۔" اس نے شاداں سے کہا۔ "انہیں بلا کر لا جلدی سے۔"

شاداں جا کر نور بانو اور زرینہ کو بلا لائی۔ "کیا بات ہے اماں؟" نور بانو نے پُرتشویش لہجے میں حمیدہ سے پوچھا۔

اتنی دیر میں پھوار پڑنے لگی تھی۔ "تم لوگ کیسی ہو۔ یہ موسم نہیں نظر آتا تمہیں؟" حمیدہ بولی۔

"تو کیا ہوا اماں۔ یہ تو موسم ہی برسات کا ہے۔" نور بانو نے بے ساختہ کہا اور اچانک ہی، اُس کے ذہن میں برسوں پرانی یاد تازہ ہو گئی۔ کبھی گلناز نے بھی ایسے ہی خوش ہو کر بارش کے

بارے میں بتایا تھا، اور اُس نے کتاب سے سر اٹھا کر اسے یہی جواب دیا تھا۔

لیکن اب وہ بات نہیں تھی۔ اُس کے دل میں اچانک ہی گدگدی سی ہونے لگی۔ اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ اُس کی دونوں بہنیں برسات سے اتنی خوش کیوں ہوتی تھیں۔ اور وہ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ وہ بارش سے خوش کیوں نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اس وقت اسے ایک عجیب سی نامعلوم سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا...... اور اس سے پہلے اسے بارش میں، شیڈ میں عبدالحق سے لپٹنا یاد آیا تھا۔

"تو کچھ ہوا ہی نہیں۔" حمیدہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "ارے بارش اللہ کی رحمت ہے۔ اب اس کوئل کو ہی دیکھ لو۔ کیسے کوک رہی ہے۔ اور تم دونوں اپنے کمرے میں منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔"

"نہیں اماں، مجھے تو بارش بہت اچھی لگتی ہے۔" زرینہ کہا۔

اتنی دیر میں شاداں ان دونوں کے لئے بھی کرسیاں لے آئی تھی۔ وہ دونوں بیٹھ گئیں۔

حمیدہ شاداں کی طرف مڑی۔ "شاداں...... جھولا لٹکانا آتا ہے تجھے؟"

"لو اماں، حد کر دی تم نے۔ اب کچھ دیر بعد کہو گی، پکوڑے تلنے بھی آتے ہیں تجھے۔" شاداں نے سخت برا مانتے ہوئے کہا۔

حمیدہ ہنسنے لگی۔ اسی وقت رابعہ بھی آ گئی۔ زرینہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آؤ بیٹھ بھابی۔"

"نہیں...... تم بیٹھی رہو۔"

"ارے بیٹھو بھابی۔ میں کرسی لے کر آتی ہوں۔"

"اگر تو نے دو منٹ میں جھولا نہیں لٹکا دیا تو میں پکوڑوں کے بارے میں بھی پوچھوں گی۔" حمیدہ نے شاداں کو چھیڑا۔

"ابھی لو اماں...... ایک منٹ میں۔" شاداں نے کہا اور فوراً ہی سرگرم ہو گئی۔

جھولا لٹکا دیا گیا تو زرینہ نے نور بانو سے کہا۔ "پہلے تم بیٹھو نور بانو۔"

نور بانو کبھی جھولے پر نہیں بیٹھی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ "نہیں پہلے تم بیٹھو۔"

"اللہ، میں تو جھول نہیں سکتی۔ اور ان دونوں کو دیکھو۔ جھولنے کے بجائے ایک دوسری کی خوشامد کر رہی ہیں۔" رابعہ نے حسرت سے کہا۔

"بیٹھو نا نور بانو۔" زرینہ نے اصرار کیا۔

نور بانو اداس ہو گئی تھی۔ وہاں گھر میں معاملہ برعکس ہوتا تھا۔ باجی اور گلنار میں بحث ہوتی تھی کہ پہلی باری کس کی۔ پھر باجی کہتی تھیں کہ وہ بڑی ہیں، اس لئے پہلے ان کی باری ہو گی۔ اور گلنار مان جاتی تھی۔ اور پھر باجی جو جھولا پکڑتی تھیں تو چھوڑتی ہی نہیں تھیں۔ تنگ آ کر گلنار انہیں پینگ دینا بند کر دیتی تھی۔ مگر وہ پیروں کے زور سے خود ہی اونچی اونچی پینگیں لیتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کا جی بھر جاتا تھا۔ اور جب وہ اترتیں تو گلنار جلدی سے جھولے پر بیٹھ کر ان سے

کہتی...... باجی، اب مجھے پینگ دیں نا۔ اور باجی کہتیں...... تم نے بھی تو مجھے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ میں تو نہیں دیتی پینگ۔ اور گلنار روٹھ کر کہتی...... واہ، ہمارے تو ہاتھ دکھ گئے پینگ دے دے کر۔ اور وہ فرماتی ہیں کہ پینگ ہی نہیں دی۔ مگر باجی اسے ستاتی رہتیں۔ پھر گلنار لڑتے لڑتے خوشامد پر آ جاتی...... اچھی باجی، بس وہ تین لمبی لمبی پینگیں دے دیں۔ پھر میں آپ سے نہیں کہوں گی۔ اور باجی ایسا کر بھی دیتیں۔ پھر گلنار اپنے ہی زور پر دیر تک جھولتی رہتی......

"کہاں کھو گئیں نور بانو۔ بیٹھو نا۔" زرینہ نے اسے چونکا دیا۔

وہ دہلی میں اپنے گھر کے آنگن سے اداس لوٹ آئی۔ اُس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"تم بیٹھو زرینہ، میں تمہیں پینگ دوں گی۔" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

زرینہ نے اسے غور سے دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئی۔ "گھر یاد آیا ہے نا؟ بچھڑے ہوئے یاد آئے ہیں نا؟"

نور بانو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "تم رو رہی ہو؟"

"نہیں تو...... پھوار آنکھوں میں چلی گئی ہو گی۔"

حمیدہ نے ان دونوں کی کیفیت دیکھ لی۔ "ناشکری کرتی ہو۔ ارے یہ بارش اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔" اُس نے بڑی محبت سے انہیں ڈانٹا۔

"اور یہ یادوں کا موسم بھی تو ہوتا ہے۔" زرینہ نے اتنے دھیرے سے کہا کہ صرف نور بانو ہی سن سکی۔

نور بانو کی ضد پر زرینہ کو پہلی باری لینا پڑی لیکن نور بانو کو بھی بیٹھنا ہی تھا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں پہلے کبھی جھولے پر نہیں بیٹھی۔" اُس نے کہا۔

"کمال کرتی ہو نور بانو۔ ارے میں تو کھڑے ہو کر بھی پینگ لے سکتی ہوں۔" زرینہ نے کہا اور عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔

نور بانو بیٹھی تو خوف سے اُس کا برا حال تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ گر جائے گی۔ اس نے دونوں طرف کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ بارش بھی اب تیز ہو گئی تھی۔ زرینہ بھی بھیگ گئی تھی۔

"ڈرو مت نور بانو۔ جھولے سے کوئی نہیں گرتا۔ سوائے اس کے جو ڈر کے مارے گر جائے۔ ڈر بہت بری چیز ہوتی ہے دھیے۔" حمیدہ نے اسے دلاسہ دیا۔

"اچھا زرینہ...... دھیرے دھیرے جھلانا۔" اُس نے خوشامدانہ لہجے میں زرینہ سے کہا۔

اور زرینہ واقعی بہت ہولے ہولے پینگ دے رہی تھی۔ جھولا باہر جاتا اور پھر دالان میں واپس آتا۔ بارش کا پانی جو نور بانو کے بدن کو لگا تو جیسے جادو ہو گیا۔ جسم میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی۔ آنکھوں میں دھنک کے ساتوں رنگ اُتر آئے۔ اداسی جیسے ڈھل گئی۔ اور ایک اور عجیب بات

ہوئی۔ آسمان پر اسے عبدالحق بالکل صاف دکھائی دیا۔ وہ باہیں کھولے کھڑا تھا، جیسے اسے بلا رہا ہو۔ وہ اس سے لپٹنے کو بے قرار ہو گئی۔ اداسی تو ڈھلی تھی۔ لیکن اس بار جیسے ہر خوف مٹ گیا۔ اسے اوپر جانا تھا...... عبدالحق سے لپٹنا تھا۔

''زور سے پینگ دو زرینہ۔''

زرینہ حیران ہوئی۔ مگر اُس نے زور بڑھا دیا۔

نور بانو آسمان سے قریب تر ہوئی، لیکن عبدالحق کو چھوئے بغیر واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

''اور زور سے زرینہ۔''

کوئل پکار رہی تھی...... پی ہو...... پی ہو...... اور نور بانو کا دل عبدالحق کو پکار رہا تھا۔ جبکہ عبدالحق کی باہیں اسے پکار رہی تھیں۔ ارے...... یہ برسات کا موسم پکار کا موسم ہوتا ہے۔ اُس نے حیرت اور مسرت سے سوچا۔ اور کوئی پاس ہو تو وصل کا موسم۔ اُس کے اندر سے کسی نے چپکے سے کہا۔

اب پینگیں ایسی تھیں کہ وہ سچ مچ جیسے آسمان کو چھو رہی تھی لیکن عبدالحق کو چھونے سے پہلے ہی جھولے کی واپسی کا سفر شروع ہو جاتا۔

''اور زور سے زرینہ...... اور زور سے۔''

وہ عجیب سا گہرا سحر تھا۔ حمیدہ نہ بولتی تو وہ کبھی نہ ٹوٹتا، اور وہ زمین آسمان کے درمیان جھولتی میں رہتی۔

''بس کرو نی کڑیو۔ اب آ کر گرما گرم پکوڑے کھالو چٹنی کے ساتھ۔'' حمیدہ نے انہیں پکارا۔

وہ دونوں دستر خوان کی طرف بڑھیں۔ شاداں نے وہیں دالان میں چٹائی بچھا دی تھی۔

''آپ لوگ کھاؤ جی۔ میں گرما گرم پکوڑے لاتی رہوں گی۔'' شاداں نے کہا۔

''یہاں ٹھیک رہے گا نا۔ بارش کے مزے بھی لیتی رہو۔'' حمیدہ بولی۔

نور بانو نے پہلا پکوڑا اٹھایا۔ مگر فوراً ہی رک گئی۔ ''مردانے میں تو بھجوا دیں اماں۔'' اُس نے بے ساختہ کہا۔

''تجھے بڑی فکر ہے ان کی۔ ارے پگلی، اس وقت تو وہ باہر ہوں گے۔ اب دوپہر کے کھانے کے لئے ہی آئیں گے۔'' حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

ایک پل کو نور بانو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ مگر اگلے ہی پل وہ دہلی میں اپنے گھر میں تھی۔ اس روز ایسے ہی موسم میں اماں نے آلو بھرے پراٹھے بنائے تھے اور باجی نے چٹنی پیسی تھی۔ وہ کھانے کے لئے بیٹھے تو باجی نے پہلے نوالے کو منہ میں لے جاتے ہوئے رک کر کہا تھا...... بوا پہلے چند پراٹھے اوپر دے آؤ نا۔ اور اماں نے کہا تھا...... اے بولا گئی ہو کیا۔ پتا بھی ہے کہ وہ لوگ گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ اور باجی کھسیا گئی تھیں۔

تو کیا ایسا ہے کہ وہ محبت کرنا اپنی مرحوم باجی سے سیکھ رہی ہے! وہ پھر اداس ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی اُس نے اداسی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ''اماں...... آلو تو موجود ہیں نا؟'' اُس نے پوچھا۔

''بہت ہیں دھیے۔ تُو کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''آج دوپہر کے کھانے کے لئے آلو بھرے پراٹھے بناؤں گی۔''

❁......❁......❁

اچھو میاں عجیب سی کیفیت میں چل رہے تھے۔ انہیں گردوپیش کا بھی احساس نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

نیلم بائی کے قحبہ خانے سے وہ بڑی افراتفری میں نکلے تھے۔ انہوں نے بس ایک ہی بات سوچی تھی کہ ذلت کے ساتھ، دھکے دے کر نکالے جانے سے بہتر ہے کہ وہ خود ہی رخصت ہو جائیں۔

وہ باہر نکل تو آئے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائیں گے۔ کوئی ٹھکانہ تھا ہی نہیں ان کا۔ دل و دماغ پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کچھ بجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

مگر چلتے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ان کے پاؤں دکھنے لگے۔ سانس بھی بے ترتیب ہو رہی تھی۔ ایسا کیوں؟ یہ بھی ان کے لئے ایک سوالیہ نشان تھا۔

وقت کا حساب انہیں یاد بھی نہیں تھا۔ نیلم بائی کے در پر کتنے برس گزرے تھے، انہیں یاد نہیں تھا۔ وہاں تو بس صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ والا معاملہ تھا۔ برسوں سے انہوں نے آئینہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ شیو بڑھ جاتی تو فٹ پاتھ پر حجاموں والی ایک کرسی رکھ کر بیٹھے بالے سے شیو بنوا لیتے۔ بالا بھی آئینہ رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ شیو تو اسے بنانی ہے، اور جب شیو بنوانے والے کا چہرہ اُس کے سامنے موجود ہے تو آئینے کی کیا ضرورت ہے۔

نواب زادہ اشرف علی خان سے اچھو میاں بننے کے بعد ان کے لئے وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ نہ انہیں وقت کا احساس تھا نہ اُس کی پرواہ۔ آدھی زندگی انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق اپنی حاکمیت کے ساتھ گزاری تھی۔ کوئی چیز ایسی نہیں تھی کہ جس کی انہوں نے خواہش کی ہو اور وہ انہیں ملی نہ ہو۔ وہ سیر ہو گئے تھے، اور اب وہ بڑی خوشی اس سیری کی، اُس حاکمیت کی قیمت چکا رہے تھے۔ دل میں اب کوئی خواہش تھی ہی نہیں۔ زندگی بس تین وقت کی روٹی تھی، اور کچھ نہیں۔

انہیں یاد تھا۔ جب سب کچھ بک گیا تو وہ آخری رقم جیب میں ڈال کر نیلم بائی کے کوٹھے پر آئے تھے۔ اور صبح جب ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا تو وہ نیلم بائی کے قدموں میں بیٹھ گئے تھے۔

''ارے نواب صاحب، مجھے کیوں گناہ گار کرتے ہیں آپ۔'' نیلم بائی نے تڑپ کر کہا تھا اور انہیں اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

''اب ہم نواب اشرف علی خاں نہیں رہے۔ نیلم۔ اب تم ہمارا کوئی اور نام رکھ دو۔''
نیلم بائی صورتِ حال کی سنگینی کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اچھو میاں کیسا رہے گا؟''

''جو تمہاری مرضی۔''

اور جب نیلم بائی کو صورتِ حال کا علم ہوا تو اُس نے نظریں پھیر لیں۔ ''تو پھر تمہارا ہمارا تعلق۔'' وہ ایک دم سے آپ سے تم پر آ گئی۔

''یہی تو ہم کہہ رہے ہیں۔ نوعیت بدل دو۔ مگر تعلق نہ توڑو۔ ہمیں اپنی ڈیوڑھی میں پڑا رہنے دو۔ دو وقت کی روٹی کے سوا کچھ نہیں چاہئے ہمیں۔''

''مگر کرو گے کیا؟ مفت کی روٹیاں توڑو گے؟''

''تمہاری ٹانگیں دبا دیا کریں گے۔ اور تم......''

نیلم بائی نے تیز لہجے میں بات کاٹ دی۔ ''یعنی شوق وہی رہیں گے تمہارے۔ شہد نہیں ملتا، نہ ملے۔ چھتے کو تو چھو لیں۔''

''تم نے بات پوری نہیں سنی نیلم۔ اور جو خدمت تم کہو گی، کریں گے۔''

''یہاں کوٹھے پر تو ایک ہی کام ہوتا ہے۔'' نیلم بائی نے تنک کر کہا۔ ''کمیشن بھی ہم اچھا دیتے ہیں۔''

اچھو میاں سب سوچ سمجھ کر آئے تھے۔ ذلتوں کے لئے تیار ہو کر۔ وہ پہلی آزمائش تھی۔ سو وہ اس ذلت کو پی گئے۔ ''نہیں بائی جی ہم یہ کام نہیں کریں گے ہم، اور ہتھیلی پہلے کبھی اوپر نہیں رکھی تھی، اب بھی نہیں رکھیں گے۔ پیسے تو اتنے دیکھے ہیں کہ اب ان کا ارمان بھی نہیں کہ دلالی کریں۔ چلو، تم سے کھانے کو بھی نہیں مانگیں گے۔ بس یہاں پڑا رہنے دو۔ اوپر کا جو کام کہو گی، کر دیں گے۔ سودا سلف۔ لا دیں گے۔''

طوائف کا دل بہت سخت ہوتا ہے۔ مگر نیلم بائی پسیج گئی۔ جانتی تھی کہ جب سے اسے دیکھا تو اشرف علی خاں پھر کسی اور کوٹھے پر نہیں گئے۔ وہ لاکھوں کے آدمی تھے، اور لاکھوں اسی پر لٹائے تھے۔ ''چلو ٹھیک ہے اچھو میاں۔ مگر یہ لہجے کی نوابی بھی نہیں چلے گی۔''

''معلوم ہے مجھے۔ اب آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی بائی جی۔''

یوں وہ اچھو میاں بن گئے۔ سب کچھ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر، حساب کتاب کے ساتھ قبول کیا تھا۔ پیسہ انہوں نے جہت دیکھا تھا، اور اُس کی عزت بھی دیکھی تھی۔ اب جب وہ خالی ہو گئے تھے تو یہ بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ جب عزت ہوتی تھی تو اب ذلت بھی ہو گی۔ اور عزت کے بعد ذلت اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔ انہوں نے سوچا، دنیا بہت بڑی ہے، ذلت کا رقبہ بھی زیادہ ہو گا۔ اور

جہاں ان کے آباؤ اجداد عزت کے ساتھ حکومت کرتے آئے تھے، وہاں ذلیل ہونے کا تصور ان کے لئے قابلِ قبول نہیں تھا۔ البتہ کوٹھا بہت محدود تھا۔ اور وہاں جاننے والے بھی نہیں تھے۔ اس سے مناسب جگہ کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

ایک بات اور تھی۔ اچھو میاں نے یہ سب کچھ اتنی آسانی سے اس لئے قبول کر لیا تھا کہ وہ عملِ مکافات کے قائل تھے۔ بھئی عیش بھی تو انہوں نے ہی کئے تھے...... اور بہت بے اعتدالی کے ساتھ، تو اُس کا نتیجہ بھی انہیں ہی بھگتنا تھا۔ تو کیوں نہ خوش دلی سے بھگتیں۔

وہ دن بھر کوٹھے کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے۔ رات کو کبھی کوئی گاہک پان، بوتل یا کوئی اور چیز منگواتا تو لا دیتے۔ کبھی کسی سے کچھ نہ مانگتے کوئی کچھ دیتا تو رکھ لیتے۔ نوٹ کبھی قبول نہ کرتے۔ چھٹے میں سے کوئی کچھ دیتا تو رکھ لیتے۔ شیو بنوانے کے سوا ان کی کوئی حاجت تھی ہی نہیں۔ کھانا بھی کبھی وہ منہ سے نہ مانگتے۔ دے دیا کسی نے تو کھا لیا۔ نہیں تو بھوکے ہی سو گئے۔ کھاتے جینے کے لئے تھے۔ اور دنیا کی ہر نعمت پا چکے تھے اس لئے اب آرزو کوئی نہیں رہی تھی۔

پھر ذلت کی اس زندگی میں، جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، ایک دن انہیں روشنی مل گئی۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ بہت گناہ گار ہیں۔ اور اللہ غفور الرحیم ہے۔ وہ تھرا گئے۔ کیا کچھ نہیں کیا تھا انہوں نے اللہ کی ہر ہر نافرمانی کی تھی۔ اس وقت سے استغفار ان کا مشغلہ بن گیا بولتے تو وہ بہت ہی کم تھے۔ چنانچہ استغفار کے لئے وقت ہی وقت تھا ان کے پاس۔

اس تبدیلی کے نتیجے میں ان کے اندر ایک انقلاب آیا۔ وہ سوچنے لگے۔ زندگی پر غور کرنے لگے...... پچھلی زندگی پر بھی اور موجودہ زندگی پر بھی۔ وہ سوچتے کہ ان کے پاس کیا کچھ تھا، اور وہ کیا کچھ کر سکتے تھے۔ اللہ نے سب کچھ دیا تھا۔ وہ شادی کرتے تو ان کے بچے ہوتے۔ باپ دادا کی نسل آگے بڑھتی پھر انہوں نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا۔ درمیان میں اگر انہیں ہوش آ جاتا اور وہ رک جاتے اور زندگی کا رخ تبدیل کر لیتے تو شاید وہ اللہ سے شرمندہ نہ ہوتے اور حاصل کیا ہوتا۔ شرابیوں اور زانیوں کی نسل آگے بڑھتی تو آخرت کا بوجھ بھی بڑھتا۔ اچھا ہوا کہ اللہ نے سب کچھ ختم کر دیا۔

مگر ان کے اندر کسی نے سختی سے اس بات کو رد کر دیا۔ یہ کیا بکواس ہے۔ اللہ نے کچھ نہیں کیا۔ سب کچھ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کیا۔ یہ تو اپنے کیے کا نتیجہ ہے۔ اللہ کے ہاں تو ابھی ان کو جواب دینا ہے۔ لہٰذا اس زندگی کی مہلت میں اُس کی فکر کرنی چاہئے۔

اس زندگی میں ہر ہر پل ان کے لئے سزا تھی۔ انہوں نے سوچا، اس سزا کو ہنسی خوشی سہتے ہوئے استغفار کرتے رہیں تو کون جانے کہ وہ غفور الرحیم دنیا کی اس سزا کو ان کے لئے کافی قرار دے کر انہیں بخش دے۔

ایک دن نیلم بائی نے انہیں بڑا ذلیل کیا۔ وہ اُس کی ٹانگیں دبا رہے تھے کہ اُس نے اچانک

ان کے زوردار لات رسید کی۔ وہ دور جا کر گرے۔ حیرت اور صدمے سے وہ سن ہو کر رہ گئے تھے۔
ذرا سنبھلے تو انہوں نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔ "ایسا کیا ہو گیا بائی جی؟"

"مجھ سے پوچھتے ہو کہ کیا ہو گیا۔ ارے مجھ پر ٹھرک جھاڑتے ہو تم۔"

"نہیں بائی جی، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ٹھرک تو محروموں کو ہوتی ہے۔ میں تو اپنے حصے کا ہر عیش حاصل کر کے سیر ہو چکا۔"

نیلم کو یہ بات اور بری لگی کہ وہ ماضی کا حوالہ دے رہے ہیں، اُسے جتا رہے ہیں کہ کبھی وہ ان کی جاگیر تھی۔ "سنو اچھو میاں، میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ نوابی اب نہیں چلے گی۔"

"تو ہے کہاں نوابی۔" اچھو میاں نے معصومیت سے کہا۔ "آپ کی ٹانگیں دبا رہے ہیں۔"

نیلم مصلحتاً غصے کو پی گئی۔ وہ کوٹھے کے محرم راز نہ ہوتے تو اسی وقت انہیں نکال دیتی۔

اچھو میاں کو نہ نیلم بائی کی بات بری لگی، نہ لات۔ وہ تو ان کے اعمال کی سزا تھی، جو انہیں خوش دلی سے برداشت کرنی تھی۔ کیا پتا، اس خوش دلی کے صلے میں اللہ انہیں بخش دے۔ مگر اُس روز سے وہ ٹانگیں دبانے میں محتاط ہو گئے۔

ایک دن نیلم بائی نے انہیں ڈانٹا۔ "یہ تمہارے ہاتھ گھٹنوں پر کیوں رک جاتے ہیں اچھو میاں۔"

"ڈرتا ہوں بائی جی کہ آپ اسے ٹھرک نہ سمجھ لیں۔"

"برا مان گئے اچھو میاں......"

"نہیں بائی جی، یہ تو اللہ سے میرا عہد ہے کہ کسی بات پر بھی برا نہیں مانوں گا۔ آپ چاہیں تو جوتے مار کر دیکھ لیں۔ اُف بھی نہیں کروں گا۔"

"اچھا......ٹھیک سے دباؤ۔ اب ایسا کبھی نہیں کہوں گی۔"

برسوں گزر گئے۔ نیلم بائی بھی نیلم نہیں رہی، نیلے کانچ کا بے وقعت ٹکڑا بن گئی۔ اب اُس کے لئے کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ محض نائیکہ تھی۔ ایک رات ٹانگیں دبواتے دبواتے وہ عورت بن گئی۔ اُس نے مطلب براری کی بات کی تو اچھو میاں بولے۔ "اب وہ سب کہاں بائی جی۔ اب تو جسم کے اندر برف کی ایک سل رکھی ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو اچھو میاں۔ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں بائی جی۔ لیکن کوٹھے پر پڑا رہے تو زنخا ضرور ہو جاتا ہے۔"

مگر نیلم نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ تو پاگل ہو رہی تھی۔ اور اس کی جارحیت کے دوران اچھو میاں کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے اندر تو ابھی بہت طوفان چھپے ہیں۔ انہوں نے دل میں گڑگڑا کر اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ، جس مردانگی نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے، وہ مجھ سے چھین لیجئے۔

اور اگلے ہی لمحے ان کی دعا قبول ہو گئی۔

جھنجھلائی ہوئی نیلم بائی نے چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھا کر ان سے کہا۔ "دفع ہو جاؤ اچھو میاں۔ اب تم کسی کام کے نہیں رہے۔"

اور وہ کوٹھے پر گزارے ہوئے برسوں میں پہلی خوشی تھی، جو اچھو میاں کو ملی۔ اس رات انہیں بہت اچھی نیند آئی۔

عروج کے بعد زوال ہمیشہ عبرت ناک ہوتا ہے۔ مگر اچھو میاں کا زوال بہت زیادہ عبرت ناک تھا۔ شاید اس لئے کہ انہیں اس کی کوئی پروا بھی نہیں تھی وہ تماش بینوں کے ہر حکم کی تعمیل کرتے، طوائفوں کی جھڑکیاں سنتے، اور مسکراتے رہتے۔ صرف اس لئے کہ بغیر کسی معقول وجہ کے انہیں یقین تھا کہ یہ ریاضت اللہ نے قبول فرمالی تو اُن کی بخشش ہو جائے گی۔ اور اس معاملے میں وہ اتنے مخلص تھے کہ بڑی سے بڑی بات بھی دل پر نہیں لیتے تھے۔ اسے اپنے اعمال کی سزا سمجھ کر خوش دلی سے قبول کر لیتے تھے۔

ایسے میں پچھتاوے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب انہوں نے پہلی بار نادرہ کو دیکھا تو انہیں پچھتاوا ہوا۔ وہ روشن چہرہ، کشادہ اور پاکیزہ پیشانی گواہی دے رہی تھی کہ اُس کا تعلق اچھے خاندان سے ہے، اور وہ خود بھی بہت اچھی ہے۔ بس بدقسمتی سے یہاں آ پھنسی ہے۔ انہوں نے حسرت سے کہا کہ کاش وہ ان کے عروج کے عرصے میں یہاں آئی ہوتی تو وہ چاہے لاکھوں خرچ کر دیتے، مگر اسے یہاں سے نکال کر لے جاتے۔ اور عمر بھر اسے اپنے دل سے لگا کر رکھتے۔

پھر وہ اُس کے کردار کے اور قائل ہو گئے۔ اس طرح کی لڑکیاں ابتدا میں بہت مزاحمت کرتی ہیں لیکن نادرہ نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے ہنسی خوشی سب کچھ قبول کر لیا اور نادرہ سے نرگس بھی بن گئی۔ اس پر نہ انہیں حیرت ہوئی، نہ مایوسی۔ اپنے حوالے سے وہ سمجھ سکتے تھے کہ ان کی طرح نادرہ کا بھی کوئی بڑا مقصد ہو گا۔ پھر وہ مقصد بھی اُن کی سمجھ میں آ گیا......ارجمند کا تحفظ! وہ اور شدت سے اُس کے قائل ہو گئے۔

وہ اپنی سوچوں سے اس وقت چونک کر نکلے، جب ان کی تھکی ہوئی ٹانگیں بالکل ہی جواب دے گئیں، اور وہ فٹ پاتھ پر گر گئے۔ انہوں نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ داتا دربار کے قریب تھے۔ اور اب ان میں اٹھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ وہ بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں۔ گزرے ہوئے برسوں کا انہیں پہلی بار احساس ہوا۔ کھاتے بھی وہ کم ہی تھے۔ اور بے شک وہ بازار کے دسیوں چکر لگاتے تھے لیکن فاصلہ زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ پہلی بار اتنا زیادہ چلے تھے تو گرنے کی نوبت آ گئی تھی۔

بیٹھے تو انہیں یاد آیا کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ارے...... برسوں کی ریاضت خاک میں ملا دی میں نے۔ یہ کیا کر دیا میں نے۔ نجات کا واحد دروازہ بند کر لیا خود پر۔ اور یہ ہوا کیوں...... صرف انا کی وجہ سے۔ جبکہ وہ مطمئن تھے کہ پچھلے برسوں میں انہوں نے انا تو کیا، اپنی عزتِ نفس کو بھی اپنے گناہوں کی صلیب پر کفارے کی غرض سے...... توبہ کی خاطر لٹکا دیا تھا۔ لیکن ثابت ہوا کہ انا اب بھی زندہ تھی۔

گزشتہ رات جو کچھ ہوا، وہ معمولی بات تھی۔ اس سے کہیں زیادہ بڑی ذلت اور توہین تو پچھلے برسوں میں وہ بار بار برداشت کر چکے تھے۔

اس رات شہناز کسی شادی کے مجرے میں جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس نے ہار منتخب کر کے گلے سے لگا کر دیکھا اور پھر انہیں پکارا۔ ''اچھو میاں، ذرا اس ہار کا کھٹکا لگا دو۔''

کھٹکا لگاتے ہوئے ان کی نگاہ بلا ارادہ بہکی...... اور بہکی ہی تھی کہ شہناز نے انہیں آڑے ہاتھوں لے لیا۔ ''کسی کام کے نہیں رہے بڑے میاں۔ اب آنکھیں ہی تو رہ گئی ہیں تمہارے پاس۔'' اُس نے نجانے کیا کیا کہا، مغلظات بھی بکیں۔

اُس وقت کے کسی لمحے میں اچھو میاں کے اندر دھماکہ ہو گیا تھا۔ مردانگی کے طعنے کو بہانہ بنا کر کچلی ہوئی انا سر اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اُس رات دروازے سے کچھ فاصلے پر بچھے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ کر وہ پوری رات جاگتے رہے۔ وہ بستر جو آٹے کی پرانی اور بوسیدہ بوری، اور میلی اور جھیر جھیر چادر اور اپنے ہاتھ کے تکیے پر مشتمل تھا، جو لاہور کی کڑکتی سردی اور قہر برساتی گرمی میں یکساں طور پر ان کی کفایت کرتا تھا۔ بوسیدہ کپڑے کا وہ گدا، جس سے ان کی ٹانگیں ہمیشہ باہر ہی رہتی تھیں۔ وہاں لیٹ کر انہوں نے سوچا بھی اور خود کو ٹٹولا بھی۔ اگر وہ مرد ہی نہ رہے ہے تو پھر استغفار کے ساتھ یہ نفس کشی تو رہی نہیں۔ تو کیا وہ لٹ گئے۔ لیکن جسم تسلی دے رہا تھا، گواہی دے رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ گواہی کافی نہیں ہے۔ انہیں ثبوت بھی پیش کرنا ہوگا۔

وہ ٹھیک سے سو نہیں سکے۔ وقفے وقفے سے سوتے تھے، پھر آنکھ کھل جاتی تھی۔ اور وہ نیند بھی ہذیانی تھی۔ ہر بار ان کی وحشت سوا ہو جاتی۔

صبح اذانوں کے بعد شہناز واپس آئی تو اُس وقت ان کا برا حال ہو چکا تھا۔ وحشت تو ان کی آسمان کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ برسوں کے کچلے ہوئے نفس نے سر اٹھایا تو شیطان کو ان پر پوری طرح سوار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس پر ستم یہ کہ نیند سے محرومی کی وجہ سے دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ شہناز گرتے ہی بے سدھ ہو کر سو جائے گی۔ اُس کے باوجود وہ خاصی دیر

انتظار کرتے رہے۔ شدتِ طلب سے ان کا جسم اندر تک سے لرز رہا تھا۔ شیطان خواہش بن کر ان پر مسلط ہو گیا تھا۔

بالآخر وہ اٹھے اور بے دھڑک خوابگاہ میں چلے گئے۔ ان کے ہاتھ پاؤں اب بھی لرز رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ شہناز کے لئے مسہری پر جگہ چھوڑی گئی ہوگی اور وہ بھی کونے کی۔ سو انہوں نے اپنی دانست میں چادر میں لپٹی ہوئی شہناز کو بانہوں پر اٹھایا اور تیزی سے اپنے نام نہاد بستر کی طرف لپکے۔ آج اسے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ ہم کتنے مرد ہیں، اور یہ بھی جان لے گی کہ ہم کہاں اور کیسے سوتے ہیں۔

انہیں احساس ہوا کہ وہ پھول جیسی ہلکی ہے۔ مگر نفس فوراً ہی پھول گیا۔ ہماری طاقت کے سامنے تو یہ پھول ہی ہے۔ انہوں نے سوچا۔ اس لمحے وہ دھیرے سے کسمسائی لیکن جاگی نہیں۔

انہوں نے لے جا کر اسے بوری پر پٹخا۔ پھر انہوں نے چادر ہٹائی اور اُس کا رخسار چبا ڈالا۔ وحشت کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا، ذہن کو اُس کا ادراک ہونے تک انہوں نے اُس کا رخسار چبا ڈالا تھا۔ اور ادراک ہونے کے بعد وہ بت بن کر رہ گئے۔ ارے...... یہ انہوں نے کیا کر دیا یہ وہ کس کو اٹھا لائے۔

اب وہ اُس کی چیخ کے اور اپنی ذلت اور تباہی کے منتظر تھے۔ لیکن وہاں تو آنکھوں میں گہرا خوف تھا۔ ہونٹ بے آواز لرز رہے تھے۔

شرمندگی اور خوف سے نڈھال، وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکے اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ یہ اندازہ کرنا ان کے لئے ناممکن تھا کہ ان کی شرمندگی بڑی ہے یا خوف۔

اور اب وہ سوچ رہے تھے کہ وہ کہاں جائیں گے اور کیا کریں گے۔ یہ دوسرا سوال بہت خوف ناک تھا۔ انہیں تو کچھ کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ تو اب زندگی کیسے گزرے گی۔

وہ اٹھے اور داتا دربار کی طرف چل دیئے۔ سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں آواز سنائی دی...... آؤ بھئی، لنگر آ گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اِدھر اُدھر سے لوگ جمع ہونے لگے اور قطار بن گئی۔

ارے...... دو وقت کی روٹی کوئی مسئلہ ہے۔ انہوں نے سوچا۔ یہاں تو ہر وقت لوگ موجود رہتے ہیں اور ہر وقت لنگر چلتا رہتا ہے۔ وہ خوامخواہ پریشان ہو رہے تھے۔ ان کا دل بڑا ہو گیا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اندر گئے۔ اندر فرش پر کتنے ہی لوگ انہیں بے خبر سوتے نظر آئے۔ لو ٹھکانا بھی موجود ہے۔ انہوں نے سوچا۔ بے شمار لوگ وہاں چل پھر رہے تھے۔ بہت سے مزار کی جالیوں پر سر لگائے کھڑے تھے۔ بہت سے ہاتھ اٹھائے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

وہ بھی گئے اور بلا ارادہ انہوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ مگر ہاتھ اٹھاتے ہی وہ گھبرا گئے۔ وہ پڑھیں گے کیا۔ عمر بھر میں سورۂ فاتحہ کے سوا انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ اور اب تو وہ بھی محو ہو گئی ہوگی۔

لیکن بسم اللہ پڑھتے ہی انہوں نے روانی سے سورۂ فاتحہ پڑھ ڈالی۔ اس کے بعد تو انہیں استغفر اللہ کے سوا کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ فاتحہ پڑھ کر وہ ذرا دور فرش پر آ بیٹھے۔ انہوں نے سوچا، اب وہ یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔ یہاں ان کی ہر ضرورت پوری ہوگی۔

نہیں...... تجھے واپس جانا ہوگا۔ اندر سے ایک آواز نے کہا۔

واپس جانے کے خیال سے وہ تھرا گئے۔ وہاں اب جو اُن کا حشر ہوگا، وہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ جبکہ یہاں سکون ہی سکون ہے۔

تو وہاں عزت تھی کب۔ وہاں تو پہلے بھی ذلت تھی۔ اندر کی آواز نے ڈپٹ کر کہا۔ تو وہاں کس امید پر بیٹھا تھا۔ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے مگر اب جو کیا ہے، وہ......

اس کا بھی سامنا کر۔ جو کیا ہے، اس کی سزا تو ملنی ہے۔ یہیں ہنسی خوشی قبول کرلے تو شاید اللہ کرم فرمادے۔ یہی تو آخری امید ہے تیری مگر یہاں بڑا سکون ہے۔ وہ منمنائے۔

لیکن ابھی یہاں کے لئے تیری منظوری نہیں۔ اندر کی آواز نے کہا۔ برسوں کا عذاب ہے تیرے سر پر۔ اُس سے کٹی ملے گی تو یہاں جگہ ملے گی۔ کیا برسوں کی ریاضت ضائع کردے گا۔

وہ تو ضائع ہوگئی۔ میں نے ضائع کردی۔ اور ریاضت بھی کیا تھی، اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹ رہا تھا میں۔

تو ابھی جو بو کر آیا ہے، اس کی فصل کون کاٹے گا۔ چل اٹھ یہاں سے۔ وہیں جا، جو تیرا مقام ہے۔

اس جھڑکی کا کوڑا روح پر پڑا تو وہ تڑپ کر اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

❁......❁......❁

نادرہ گہری نیند میں تھی۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے ہلا رہا ہے۔ پھر اُس کے چہرے پر قطرے ٹپکے تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔ ارجمند کا چہرہ اس کے سامنے تھا، اور وہ اُس کے ہی آنسو تھے، جو اُس کے چہرے پر ٹپکے تھے۔

لیکن ارجمند کے چہرے پر ایسا خوف تھا کہ وہ پہچانی نہیں جارہی تھی۔ نادرہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

"کیا ہوا میری گڑیا، کیا بات ہے؟"

ارجمند کے ہونٹ ہلے لیکن آواز ندارد تھی۔

وہاں دوسروں کی نیند خراب ہونے کا ڈر تھا۔ نادرہ نے ارجمند کو گود میں اٹھایا اور اسے بڑے ہال میں لے آئی۔ وہاں بٹھا کر اُس نے اسے غور سے دیکھا۔ "کیا بات ہے گڑیا، کیا ہوا......"

"وہ...... پھپھو...... وہ......"

ارجمند کی نظر اُس کے رخسار پر پڑی، وہاں دانتوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔ وہ دہل گئی۔ "یہ کیا ہوا ہے ارجمند؟"

"وہ...... پھپھو...... اچھو میاں......" ارجمند نے بہ مشکل کہا۔ اس کے آگے اُس سے بولا ہی نہیں گیا۔

نادرہ کے لیے اس سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ غصے سے کھول اٹھی۔ "کہاں ہیں اچھو میاں؟"

ارجمند کی زبان کافی دیر بعد کھلی۔ اس دوران نادرہ اس سے یہی بات پوچھتی رہی...... کہاں ہیں اچھو میاں؟

"وہ تو فوراً ہی دروازہ کھول کر بھاگ گئے تھے۔"

نادرہ جانے لگی تو ارجمند نے گھگھیا کر کہا۔ "مجھے اکیلا نہ چھوڑیں پھپھو۔"

نادرہ نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ اُس نے جا کر دیکھا۔ دروازہ واقعی کھلا ہوا تھا۔ واپس آتے ہوئے اُس نے سنگھار میز سے تبت سنو کی شیشی نکالی اور ارجمند کو لے کر دوبارہ ہال میں آگئی۔ ارجمند کو سامنے بٹھا کر اُس نے اُس کے رخسار کو چھو کر دیکھا۔ "بہت تکلیف ہو رہی ہے؟"

"نہیں پھپھو...... بہت تھوڑی۔ مگر مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

نادرہ کو اُس پر پیار آیا۔ اُس نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ اُس نے چھو کر دیکھا تھا۔ وہ زخم نہیں تھا، محض دانتوں کا نشان تھا۔ اُس نے اس پر تبت سنو لگائی۔ "ابھی ٹھیک ہوجائے گا۔ اب تم مجھے بتاؤ۔"

"میں مسہری پر تھی۔ پھر میری آنکھ کھلی تو اچھو میاں نے مجھے بھینچ دیا تھا۔ ان کا چہرہ بہت ڈراؤنا ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے یہاں کاٹا۔ پھر پیچھے ہٹ کر مجھے دیکھا۔ اور پھپھو، ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے ڈر گئے۔ پھر وہ اٹھے اور دروازہ کھول کر باہر بھاگ گئے۔ میں آپ کے پاس آگئی۔"

نادرہ سوچ میں پڑ گئی۔ غصے کو ایک طرف رکھنا ضروری تھا، ورنہ حقیقت کو سمجھنا ناممکن ہو جاتا۔ نیلم بائی نے اسے اچھو میاں کی کہانی سنائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کبھی وہ نواب اشرف علی خاں تھے۔ اور جب سب کچھ ختم ہوگیا تو وہ اچھو میاں بن کر اس کوٹھے ہی کے ہو رہے۔ اور اس بات کو بیس سال سے زیادہ ہوگئے تھے۔ یہ طے تھا کہ دنیا میں ان کا کوئی نہیں۔

نادرہ غصے سے کھول رہی تھی۔ وہ اگر ذلت کی یہ زندگی جی رہی تھی تو صرف ارجمند کے تحفظ کے لئے۔ ورنہ مرجانا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ اب ارجمند کے ساتھ ایسا ہوجائے، یہ وہ کیسے گوارا کرسکتی تھی۔

لیکن کوئی انجانی حس اسے بتا رہی تھی کہ وہ اندھا دھند مشتعل ہونے والی بات نہیں۔ یہ تو بہت آسان ہے کہ وہ نیلم بائی کو جگائے اور پھٹ پڑے مگر اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ اچھو میاں وہاں سے ذلیل کرکے نکال دیے جاتے۔ اور اس میں اُس کا نقصان تو ہوسکتا تھا، فائدہ نہیں۔

اسے محسوس ہوا کہ اسے بہت یک سوئی سے سوچ کر صورت حال کو سمجھنا ہوگا۔

پہلی بات تو یہ کہ اچھو میاں کبھی اسے برے نہیں لگے۔ بلکہ وہ اسے اچھے لگتے تھے۔ وہ تو جیسے کسی کہانی کا کردار تھے، جو حقیقی زندگی میں چلے آئے تھے...... اسی کی طرح۔ فرق یہ تھا کہ وہ گھسیٹ کر لائی گئی تھی، اور وہ اپنی خوشی سے آئے تھے۔

اچھو میاں نواب تھے۔ ہر نعمت انہیں میسر رہی تھی۔ پھر انہیں تماش بینی کی لت پڑی، اُس کے بعد وہ نیلم بائی پر عاشق ہوئے اور سب کچھ اس پر لٹا دیا اور جب کچھ نہیں رہا تو انہوں نے باہر کی وسیع دنیا کی ذلت برداشت کرنے کے بجائے اس کوٹھے کی محدود ذلت قبول کرلی۔

نادرہ نے کوٹھے پر بہت زیادہ وقت نہیں گزارا تھا لیکن سیکھا اور سمجھا بہت تھا۔ اُس نے جان لیا تھا کہ جب مرد کسی بھی طور اپنی خواہش پوری نہ کر پائیں تو اُن کے وجود کی تمام گندگی سمٹ کر اُن کی آنکھوں میں آجاتی ہے۔ اسی لئے تو اسے اچھو میاں پر حیرت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ اچھو میاں کی کہانی نیلم بائی نے گھڑی ہے۔ کیونکہ اچھو میاں کی نگاہوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اُس نے ان کی نظروں میں کبھی معمولی سا میلا پن بھی نہیں دیکھا تھا۔ انہیں کوئی طلب نہیں تھی۔ کبھی کسی سے کچھ لیتے نہیں تھے۔ کوئی کچھ منگواتا تو واپس آکر پورا حساب بتا کر اُس کے بچے ہوئے پیسے اسے دے دیتے۔ اور زیادہ تر اصرار کے باوجود بھی کچھ قبول نہ کرتے۔ کبھی قبول کرتے تو شاید صرف شیو بنوانے کے لئے۔ وہی ایک ضرورت تھی ان کی۔ اور نیلم سے تو انہوں نے کبھی کچھ لینا گوارا ہی نہیں کیا تھا۔ وہ تو نادرہ کو ایسا درویش لگتے تھے، جو دنیا تیاگ کر گندگی کے ڈھیر پر ایک کڑی تپسیا میں مصروف ہو۔

وہ کوٹھے پر کسی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے، جیسے کبھی حسن کی خریداری انہوں نے کی ہی نہ ہو۔ ہاں یہ بات نادرہ جانتی تھی کہ وہ اسے دیکھتے تھے۔ بڑے احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور وہ کسی سے بات نہیں کرتے تھے...... سوائے اس کے۔ اُس نے کبھی انہیں چپکے چپکے کسی کو دیکھتے تاکتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے تو ان کے انداز میں کھانے تک کے لئے رغبت نہیں دیکھی تھی...... وہ تو جیسے ہر خواہش چھوڑ بیٹھے تھے۔

تو پھر یہ واقعہ کیوں ہوا؟

یہ بھی کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی۔ مرد کیسا ہی ہو، کسی بھی حال میں ہو، ہوتا تو مرد ہی ہے۔ اور کچلا ہوا نفس آدمی کی بے پرواہی کے کسی لمحے میں سر اٹھانے کا موقع پا جائے تو اسے پوری طرح چھاپ بیٹھتا ہے۔ اچھو میاں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔

لیکن ارجمند ہی کیوں؟ سات سال کی بچی!

یہ سوچتے ہی اُس کا خون کھولنے لگا۔ اگر انہوں نے اُس کے ساتھ ایسا کیا ہوتا تو وہ بلا تردد

انہیں معاف کر دیتی۔ لیکن ارجمند!

اُس نے دماغ ٹھنڈا کر کے پھر معقولیت سے سوچنے کی کوشش کی۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے یقین ہو گیا کہ سب کچھ کسی غلط فہمی میں ہوا ہے۔ اچھو میاں کا آخری ردعمل اس کا ثبوت تھا۔ انہوں نے اندھا دھند ارجمند کے رخسار پر کاٹا۔ مگر جب اُس کا چہرہ دیکھا تو ڈر گئے، اور بھاگ گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے دانستہ ارجمند کو نہیں اٹھایا تھا۔

"گڑیا...... یاد کر کے بتاؤ، تم کیسے سو رہی تھیں؟" اُس نے ارجمند سے پوچھا۔

"کیسے کا مطلب پھپھو؟" ارجمند نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ اب اُس کا خوف قدرے کم ہو گیا تھا۔

"کچھ اوڑھا ہوا تھا تم نے؟"

"جی پھپھو، چادر اوڑھی ہوئی تھی۔"

"چہرہ کھلا ہوا تھا تمہارا؟"

"مجھے تو اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے پھپھو۔" ارجمند نے پرانی شکایت دہرائی۔ "میں تو پوری چادر میں چھپ جاتی ہوں۔"

بات صاف ہو گئی۔ اچھو میاں کسی اور کے دھوکے میں ارجمند کو اٹھا لے گئے تھے۔ انہیں غلط فہمی ہو گئی تھی۔

"تم سوئی کہاں تھیں...... اپنے بستر پر؟"

"ڈر کی وجہ سے میری آنکھ کھلی تھی پھپھو۔ آپ کے پلنگ پر جگہ نہیں تھی۔ مسہری پر جگہ خالی تھی۔ میں وہاں سو گئی تھی جا کر۔"

بات کچھ اور صاف ہو گئی۔ جب کوئی لڑکی رات بھر کے لئے جاتی تھی تو مسہری پر اُس کے لئے جگہ چھوڑ دی جاتی تھی۔ رات شہناز مجرے پر گئی تھی۔ وہ جگہ اس کے لئے تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اچھو میاں شہناز کو اٹھانے آئے تھے۔ تو پھر شہناز کہاں سوئی؟

اُس نے جا کر دیکھا۔ شہناز نیلم بائی کی مسہری پر اُس کے ساتھ سو رہی تھی۔

بات واضح ہو گئی۔ مگر ایک کمزور پہلو اب بھی موجود تھا۔ ارجمند چھوٹی بھی تھی اور اُس کا وزن بھی کم تھا۔ اچھو میاں کو یہ احساس کیوں نہیں ہوا کہ وہ شہناز نہیں ہو سکتی۔

پھر ذہن نے اس اعتراض کا جواب بھی دے دیا۔ خواہش وحشت کا روپ دھار لے تو آدمی کو کچھ ہوش نہیں رہتا۔ نہ دماغ کام کرتا ہے، نہ حواس اور اچھو میاں کی یہی کیفیت تھی۔ اور یہ کتنی بڑی بات تھی کہ ارجمند کو دیکھ کر ان کی وحشت ہوا ہو گئی۔ ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ اس معصوم کو ہی روند ڈالتے۔ اور وہ کتنے عزت دار آدمی ہیں کہ اسے دیکھ کر [illegible] سے پانی پانی ہو گئے۔ اور فرار ہو گئے۔

یہ تو ان کی اچھائی کی دلیل ہے۔

اس طرف سے مطمئن ہوئی تو اسے اچھو میاں کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ کہاں ہوں گے، کیا کر رہے ہوں گے۔ بیس سال سے دنیا سے بے تعلق ہیں، کیسے گزارا ہو گا ان کا۔ وہ دل میں بڑی سچائی سے ان کی واپسی کی دعا کرتی رہی۔

مگر ارجمند کو سمجھانا بھی ضروری تھا۔ اس نے کہا۔ ”گڑیا، میری جان، اس بارے میں کبھی کسی کو کچھ نہ بتانا۔“

”جی پھپھو۔ نہیں بتاؤں گی۔“ ارجمند نے کہا۔ ویسے بھی وہ کسی سے بات ہی کب کرتی تھی۔

”اور اچھو میاں کو نہ کبھی برا سمجھنا، نہ اُن سے ڈرنا۔“

”لیکن پھپھو، انہوں نے مجھے زمین پر اتنے زور سے پٹخا، اور کاٹا بھی۔“

”انہیں پتا تھوڑا ہی تھا کہ وہ تم ہو۔ دیکھو نا، تم تو چادر میں چھپی ہوئی تھیں۔“

”ہاں...... یہ تو ہے۔“

”اور گڑیا، وہ تو آپ سے پیار کرتے ہیں۔“

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ”پتا ہے پھپھو، یہاں کے لوگوں میں اچھو میاں کے سوا مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔“

بچوں کو قدرتی طور پر، اللہ کی طرف سے اچھوں بروں کی پہچان ہوتی ہے۔ نادرہ نے سوچا، اور مطمئن ہو گئی۔

نیلم بائی اٹھی تو ناشتے کی فکر میں اُس نے اچھو میاں کو پکارا۔ ”اچھو میاں تو گھر میں ہیں ہی نہیں۔“ نادرہ نے انہیں بتایا۔

”تم نے کہیں بھیجا ہے انہیں؟“

”نہیں۔ ہم تو جب اٹھے تو وہ گھر میں نہیں تھے۔“

”تم کب اٹھی تھیں؟“

”آج سویا ہی نہیں گیا۔ آٹھ بجے اٹھ گئی تھی میں۔“

نیلم بائی ہڑبڑا گئی۔ ”اور دروازے کا تالا؟“

”کھلا ہوا ہے۔ چابی تو اچھو میاں کے پاس ہی رہتی ہے نا۔“ نادرہ نے کہا۔ پھر بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ ”سنو بائی جی، میں بھاگنے والی ہوتی تو کب کی بھاگ چکی ہوتی۔“

”تم پر تو اعتبار ہے مجھے۔“ نیلم بائی نے کھسیا کر کہا۔ ”فکر تو دوسروں کی کرتی ہوں۔“ پھر اُس نے موضوع بدلا۔ ”مگر یہ اچھو کہاں چلا گیا۔ ایسے تو کبھی نہیں جاتا۔ اور اتنی دیر کے لئے تو کبھی گیا ہی نہیں کہیں۔“

نیلم بائی غصے میں بڑبڑاتی رہی، اچھو میاں کو برا بھلا کہتی رہی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُس کا لہجہ نرم ہوتا گیا۔ ایک گھنٹے میں تشویش ہر چیز پر غالب آ گئی۔ ”ارے، کچھ ہو نہ گیا ہو نامراد کو۔“

❀......❀......❀

اچھو میاں علاقے میں داخل ہوئے تو بری طرح نڈھال ہو چکے تھے۔ اب تو ایک قدم بھی اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ مگر علاقے میں پہنچتے ہی ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ نیلم بائی کے غیض و غضب کا تصور کیا تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور بات ہی ایسی تھی۔ نیلم بائی کہتی کہ میاں تم تو ہمیں کروڑوں کا نقصان پہنچانے والے تھے۔ جو نتھ ابھی ڈلی نہیں، اسے اتارنا۔ ارے ایسا ہی شوق چرایا تھا تو ہم کیا مر گئے تھے۔ اور محبت تو تم ہم سے ہی کرتے تھے نا۔ یہ جو کچھ کیا ہے، یہ تو ناقابلِ معافی ہے۔

یہ جو کچھ وہ سوچ رہے تھے، جانتے تھے کہ جو ہو گا، اس سے سوا ہو گا، اور بہت ہو گا۔ مگر پھر وہ ڈٹ گئے۔ جو کرو تو سزا سے مت بھاگو۔ اس کے لئے تیار رہو، پوری سزا بھگتو اور استغفار کرتے رہو۔ برسوں پہلے انہوں نے اصول اپنایا تھا۔ اور آج اُس کی تجدید کا دن تھا۔

کوٹھے میں گھسنے سے پہلے ایک فیصلہ انہوں نے کر لیا۔ سزا اپنی جگہ، لیکن اب بات دب کر نہیں کرنی۔ اللہ نے انہیں ٹھکانا دکھا دیا ہے ان کا۔ وہاں عافیت بھی ہو گی اور عزت کے ساتھ دو وقت کی روٹی بھی۔ وہاں سے دھکیل نہ دیے گئے ہوتے تو وہ وہیں کے ہو رہتے۔ وہ تو بس اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لئے لوٹے تھے۔ سزا کے بعد وہ آزاد ہوتے۔ پھر ڈر کاہے کا اور دبنا کیوں۔

تو اس کیفیت میں وہ کوٹھے میں داخل ہوئے۔

اندر گھستے ہی سب سے پہلے نادرہ سے سامنا ہوا، جس کے وہ اصل مجرم تھے۔ انہوں نے سوچ لیا کہ صفائی میں وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ جو کچھ بھی ہوا، جھیل لیں گے۔

لیکن جو کچھ ہوا، وہ ان کے خدشات کے برعکس تھا۔ ”آپ کہاں چلے گئے تھے اچھو میاں؟“ نادرہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ”پتا بھی ہے، آپ کی وجہ سے ہم ناشتے سے محروم بیٹھے ہیں۔“

فرطِ حیرت سے ان کا منہ کھلا، اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”اے ایسے [illegible] سے کیا بات کر رہی ہو اس سے۔“ دوسری طرف سے نیلم بائی نے نمودار ہوتے ہوئے نخوت سے کہا۔ پھر وہ اچھو میاں کی طرف بڑھی۔ ”مجھ سے بات کرو میاں۔ کہاں چلے گئے تھے صبح ہی صبح۔“

اچھو میاں کی سمجھ میں نادرہ کا رویہ نہیں آیا تھا۔ وہ تو خاص طور پر تعلق خاطر کا اظہار کر رہی تھی۔ تو کیا منھی ارجمند نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ بہر حال جس کے وہ مجرم تھے، وہ ان سے عزت سے بات کر رہی تھی تو وہ نیلم بائی کو کیوں خاطر میں لاتے۔ انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”کیوں، میں اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتا۔ کیا میں تمہارا زر خرید ہوں؟“

اب کے نیلم بائی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ بائیس برس میں اچھو میاں نے کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا تھا۔ ''تو کیا نہیں ہو؟'' اُس نے انہیں چیلنج کیا۔ ''مفت کی روٹیاں نہیں توڑتے ہو ہماری؟''

''اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کون مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔'' اچھو میاں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''تم یہ بتاؤ، ناشتہ بھی نصیب ہوا تمہیں ہمارے بغیر۔''

نیلم بائی روہانسی ہو گئی۔ ''نہیں ہوا۔ اس لئے تو دماغ الٹ رہا ہے۔''

''اور سنو بائی جی، یہ مفت کی روٹی کا طعنہ آئندہ نہ دینا۔ اس شہر میں اللہ کی رحمت سے کوئی بھوکا رہ ہی نہیں سکتا۔ خدا کی قسم، داتا دربار جا بیٹھو تو دس بار بھوک لگے تو دس بار عزت سے کھانے کو ملے۔ یہاں تمہارے در پر مجبوری میں نہیں بیٹھے ہیں۔ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔''

نیلم بائی دہل کر رہ گئی۔ بالا دستی کا بھرم ٹوٹ گیا تھا۔ ''تو دربار چلے گئے تھے۔'' اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''مگر واپس بھی آ گئے۔ آخر ہماری محبت کھینچ لائی نا تمہیں؟''

''کیوں محبت کو رسوا کرتی ہو نیلم بائی۔ محبت بازار میں دکانوں پر کہاں ملتی ہے۔ یہ کوئی خرید و فروخت کی جنس تھوڑا ہی ہے۔''

''تو پھر لوٹ کیوں آئے؟''

''ایک اور گناہ کی سزا بھگتنے کے لئے آئے ہیں۔ وہ بھگت لیں تو واپس چلے جائیں گے۔''

اچھو میاں نے نادرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر انہیں اُس کی آنکھوں میں غصہ تو کجا، معمولی سی شکایت بھی نظر نہیں آئی۔

''اچھا، یہ لو۔ جا کر ناشتے کا سامان تو لاؤ۔'' نیلم بائی نے ان کی طرف پیسے بڑھائے۔

''اب تو بالکل ہمت نہیں ہے چلنے کی۔ زندگی میں پہلی بار اتنا پیدل چلے ہیں۔''

''پھر نوابی یاد آنے لگی ہے کیا؟'' نیلم بائی نے طعنہ دیا۔

اچھو میاں وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے چپل اتار کر پیروں کے تلوے دکھائے۔ ''خود دیکھ لو بائی جی۔ چھالے پڑ گئے ہیں پاؤں میں اور ٹانگیں ایسے دکھ رہی ہیں، جیسے جسم سے الگ کوئی چیز ہوں۔''

بعض چھالے تو پھٹ بھی گئے تھے۔ نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نیلم بائی کا پتھر دل بھی قدرے نرم ہو گیا۔ ''تو اب کیا ہو گا۔ ہمت کر لو اچھو میاں۔''

''بالکل ہمت نہیں......''

اسی لمحے ارجمند آ گئی۔ ''آپ، کہاں چلے گئے تھے اچھو میاں۔ دیکھیں ہم نے تو ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا آپ کی وجہ سے'' اُس نے معصومیت سے کہا۔

اور اچھو میاں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اب تو ضرور جائیں گے۔ ہماری گڑیا بیٹی بھوکی ہے۔ لاؤ پیسے دو بائی جی۔''

''نہیں اچھو میاں، اس حال میں آپ کو نہیں جانے دوں گی میں۔'' نادرہ نے کہا۔ اچھو میاں نے جس طرح ارجمند کو گڑیا بیٹی کہا تھا، اس لہجے کی سچائی نے اُس کے دل کو چھو لیا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ جو ہوا، وہ غلط فہمی میں ہوا۔

''اپنی بیٹی کو بھوکا تو نہیں رہنے دیں گے ہم۔'' اچھو میاں دروازے کی طرف بڑھے۔ پھر اچانک وہ پلٹے۔ ''ایک بات کہوں۔'' انہوں نے نادرہ سے کہا۔ ''بٹیا کو میرے ساتھ بھیج دیجئے۔''

یہ سن کر ارجمند تو فوراً ہی سہم گئی لیکن نادرہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے دلاسہ دیا۔ ''جاؤ ارجمند۔ اچھو میاں تمہارے بابا جان کی طرح ہیں۔''

بابا جان کے حوالے نے ارجمند کو موم کر دیا۔ لیکن وہ دروازے کی طرف بڑھی تو نیلم بائی نے اسے روک دیا۔ ''نہیں اچھو میاں، تم اکیلے ہی جاؤ گے۔''

''کیوں؟ ارجمند تو پہلے بھی جاتی رہی ہے میرے ساتھ۔''

''اب مجھے تم پر اعتبار نہیں رہا۔''

''واہ......اس کوٹھے پر بیٹھا رہا تو قابلِ اعتبار تھا۔ داتا دربار ہو آیا تو ناقابلِ اعتبار ہو گیا۔''

''جانے دیجئے بوا۔''

''نہیں نرگس، یہ اس بچی کو اڑا لے جائے گا۔''

''سنو بوا، یہ میری بھتیجی ہے۔ اور اس کی فکر مجھے تم سے زیادہ ہے۔ مجھے اچھو میاں پر کبھی بے اعتباری نہیں ہوئی۔'' نادرہ نے سرد لہجے میں کہا۔ پھر وہ ارجمند کی طرف مڑی۔ ''جاؤ گڑیا، تم جاؤ اچھو میاں کے ساتھ۔''

نیلم بائی کو ممکن ہے، نادرہ کا انداز برا لگا ہو، لیکن اُس نے بہرحال ظاہر نہیں ہونے دیا۔

ارجمند ڈری ہوئی تھی اور اچھو میاں بھی اس کے خوف کو سمجھ رہے تھے۔ ان کے لئے تو یہ بھی خواب کی سی بات تھی کہ نادرہ نے اسے ان کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ اور وہ آ بھی گئی تھی۔

زینے سے اترتے اترتے وہ رکے۔ ''دیکھو بیٹی، ہم تمہارے لئے واقعی تمہارے بابا جان جیسے ہیں۔''

''تو پھر صبح آپ نے......''

''وہ غلط فہمی تھی بیٹا۔'' اچھو میاں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ آپ ہیں۔ تبھی تو شرمندہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔''

''پھپھو نے بھی یہی کہا تھا۔''

"اور انہوں نے بائی جی سے شکایت بھی نہیں کی ہماری۔"

"جی۔ اور مجھے بھی منع کر دیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ تو مجھ سے پیار کرتے ہیں۔"

"سچ کہہ رہی تھیں وہ۔ یہ نہیں پتا کہ انہوں نے یہ جانا کیسے۔ تم سمجھو گی نہیں بیٹا۔ پر ہم بتائیں گے ضرور۔ ہم اس قابل تھے ہی نہیں کہ ہمیں اولاد ملتی۔ اور بیٹی کے لائق تو ہم تھے ہی نہیں۔ لیکن ایسا ہوتا تو بالکل آپ کے جیسی بیٹی ہوتی ہماری۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

ارجمند نے ان کے آنسو پونچھے۔ "آپ روئیں نہیں اچھو میاں۔"

"اچھا چلو، اب بازار چلیں۔"

❋……❋……❋
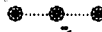
وہ اس کوٹھے پر اچھو میاں کی پہلی رات تھی، جس میں ان کے لئے قلبی طمانیت تھی۔ اور وہ پہلی رات تھی کہ وہ بے سدھ ہو کر سوئے۔ ایک تو وہ بہ مشکل چار گھنٹے سوتے تھے۔ اُس میں بھی کئی بار نیند اچٹتی تھی۔ اس نیند میں ان کے لئے آسودگی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جلدی اٹھ جاتے تھے۔ حالانکہ کوٹھے پر تو دن چڑھے تک سونے کا رواج ہوتا ہے۔ مگر انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ اُس کے نتیجے میں وہ دن بھر اونگھتے تھے۔

اُس رات وہ سوچتے رہے کہ کیسی عجیب بات ہے۔ عمر بھر کی گمراہی اور گناہوں کے بعد انہوں نے خود اپنی پسند سے اپنے لیے یہ ذلت قبول کی تھی۔ مگر اس بار ایک گناہ کے بدلے انہیں طمانیت اور خوشی ملی تھی۔

اب تو وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ بہ ظاہر کوٹھے پر پڑا رہنے کا فیصلہ اپنا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اللہ کی طرف سے تھا۔ ورنہ داتا دربار تو اس وقت بھی موجود تھا۔ مگر یہ کوٹھا ہی ان کے لئے عقوبت خانہ بنا دیا گیا تھا۔

اور اب اتنے برسوں کے بعد ان کے نفس نے پھر سر اٹھایا تھا تو اُس کے نتیجے میں انہیں ایک دوسرا در...... بہتر در دکھا دیا گیا تھا۔ ان کے دل کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ غیبی اشارہ ہے کہ وہ اپنی سزا کاٹ چکے۔ اس کے باوجود کوئی بات تھی کہ جس کی وجہ سے انہیں دربار میں ٹھہرنے نہیں دیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ کوٹھے پر واپس جانا ہی نہیں چاہتے تھے۔

اُس وقت انہوں نے سوچا تھا کہ شاید قدرت چاہتی ہے کہ وہ اس تازہ ترین گناہ کی سزا بھی بھگت کر دربار آئیں۔ اور انہیں یقین تھا کہ اس بار انہیں اتنی ذلت ملے گی کہ اُس کے سامنے کوٹھے پر پہلے گزرے ہوئے بائیس برس باعزت لگنے لگیں گے۔

لیکن وہ واپس آئے تو انہیں ذلت کی جگہ عزت ملی۔ پہلی بار نیلم بائی کو احساس ہوا کہ وہ مجبور اور بے دست و پا نہیں ہیں تو اُس کا انداز بدلا۔ اور دوسری طرف نادرہ اور ارجمند نے ان کی

شکایت بھی نہیں کی۔ تو شاید یوں ہے کہ اللہ نے اس بار انہیں فوراً ہی معاف کر دیا۔

تو پھر وہ کوٹھے پر کیوں واپس بھیجے گئے؟ ہاں، یہ طے تھا کہ وہ کوٹھے پر واپس بھیجے گئے ہیں۔ ورنہ وہ تو وہاں دربار سے نکلنے والے ہی نہیں تھے۔ وہ اس پر سوچتے رہے۔ پھر انہیں ایسا لگا کہ شاید یہاں کوٹھے پر کوئی کام ہے، جو قدرت ان سے لینا چاہتی ہے۔ وہ کام کیا ہے، یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ مگر ان کے دل کو یقین تھا کہ وہ کام پورا ہو جانے کے بعد وہ آزاد ہوں گے، اور باقی زندگی دربار میں گزار سکیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ قدرت ان کی رہنمائی کر رہی ہے اور آخر تک کرے گی۔

کوٹھے کی رونق ختم ہوئی تو وہاں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ اور وہ فوراً ہی سو گئے۔ وہ ایسی بے خبری کی لذت بھری نیند تھی، جسے وہ بھول چکے تھے۔ وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ خواب میں وہ کبوتروں کے ساتھ اُڑ رہے تھے...... داتا دربار کی فضاؤں میں۔ اور سوتے ہوئے بھی انہیں بے پناہ طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔

پھر وہ خواب بھی ٹوٹ گیا اور نیند بھی۔ کوئی انہیں جھنجھوڑ رہا تھا۔ مگر ان سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی تھیں۔ "کون...... کون ہے؟" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اٹھیں نا اچھو میاں۔ کیسے بے خبر سو رہے ہیں آپ۔"

"کک...... کون؟" ان کی آنکھ اب بھی نہیں کھلی۔ اور نیند کی وجہ سے زبان میں لکنت تھی۔

"میں ہوں نرگس۔"

اور ایک دم ان کی آنکھ کھل گئی۔ نادرہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ "تم میرے سامنے خود کو نرگس نہ کہا کرو۔ میرے لئے تو تم نادرہ ہی ہو۔ میں نرگس کو نہیں جانتا۔"

"اس وقت تو میں نرگس ہی ہوں اچھو میاں۔"

اچھو میاں نیند کی کیفیت سے نکلے تو پریشان ہو گئے۔ "کیا بات ہے نادرہ، خیریت تو ہے؟" انہوں نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آیئے۔ اور زور سے نہ بولئے گا۔"

اچھو میاں اٹھے اور اُس کے ساتھ چل دیے۔ نادرہ کا رخ بڑے ہال کی طرف تھا۔

ہال میں اندھیرا تھا چاندنی کے فرش پر شراب کی خالی بوتلوں، سگریٹ کے ٹوٹوں اور مسلے ہوئے پھولوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ انہیں دیوار کی طرف لے گئی، جہاں گاؤ تکیے بے ترتیب پڑے تھے۔ "یہاں بیٹھ جائیں۔"

اچھو میاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بیٹھ گئے۔

"آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھیں...... گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لیں۔"

اچھو میاں کی حیرت اور بڑھ گئی۔ "بات کیا ہے نادرہ؟"

نادرہ گئی، اُس نے ہال کا دروازہ بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی۔ پھر وہ واپس آئی اور ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

اچھو میاں نے محسوس کیا کہ وہ جھجک رہی ہے۔ ”کیا بات ہے نادرہ؟“

”عزت دار تو میں رہی نہیں۔ پھر بھی عزت سے ڈرتی ہوں۔ ہے نا عجیب بات۔“ نادرہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”بے عزتی کی آخری حد کو پہنچا دی گئی۔ پھر بھی عزت کی فکر کرتی ہوں۔“

”بات کیا ہے؟“

”آپ سے کچھ کہنا ہے، اور وہ کہنا آسان بھی نہیں لیکن ضروری بھی ہے اور میں نے زندگی میں کسی سے ایسی بات نہیں کی۔“

”نادرہ، میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ اسی لئے تو کہا کہ تم خود کو میرے سامنے نرگس نہ کہو۔ میں نے تمہیں کبھی نرگس نہیں کہا۔“

”لیکن اب سمجھیں گے بھی اور کہیں گے بھی۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ اچھو میاں نے بے حد یقین سے کہا۔ ”اب تو مجھ پر احسان ہے تمہارا۔ تم نے مجھے ذلت سے بچا لیا۔ اگر تم نیلم بائی سے میری شکایت کر دیتیں تو میرا جو حشر ہوتا، میں اُس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ رکے پھر اچانک پوچھا۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا نادرہ؟“

”اس لئے کہ میں آپ کی مجبوری سمجھ گئی تھی۔ آپ انسان ہیں، جو نفس کا غلام ہوتا ہے۔“

اچھو میاں نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”تو ایسا سمجھا تم نے۔ نفس کے جوش میں اندھا ہو کر میں نے ارجمند پر حملہ کیا؟“

”جی نہیں۔ یہ سمجھا ہوتا تو میں آپ کا پردہ نہیں رکھتی۔ مجھے معلوم تھا کہ جو کچھ ہوا، غلط فہمی میں ہوا۔ اور اسی وجہ سے آپ سے بات کر رہی ہوں، وہ پھر جھجکنے لگی۔ ”دیکھیے اچھو میاں، میں نے پہلے بھی کہا کہ میرے لئے یہ کہنا آسان نہیں۔ لیکن ضروری سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ آپ مرد ہیں۔ فطرت کے تقاضے کسی کو بھی نہیں بخشتے۔“ یہ کہتے کہتے اُس کی نظریں جھک گئیں اور آواز لرزنے لگی۔ ”میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ جس وقت بھی ضرورت محسوس کریں، میں آپ کے لئے حاضر ہوں۔ اور بات میرے اور آپ کے درمیان میں رہے گی۔“

اچھو میاں حیرت اور صدمے سے گنگ ہو کر رہ گئے۔

نادرہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ نظریں اٹھانے کی اُس میں ہمت بھی نہیں تھی۔ ذرا سے توقف کے بعد وہ بولی۔ ”دیکھیں نا، یہ سب کچھ مجھے بائی جی کی خاطر کرنا پڑتا ہے، اور ہر بار میں اپنے اندر مر جاتی ہوں۔ تو کیا آپ کی ضرورت پوری نہیں کر سکتی۔“

”میں شاید خوش فہمی میں مبتلا تھا نادرہ۔ وہ آج دور ہو گئی۔ تم نے یہ اتنی بڑی بات کہی تو یقیناً

تم نے......“

نادرہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”...... یہ اتنی بڑی بات کہہ کر میں کتنی چھوٹی ہو گئی۔“

”تم چھوٹی نہیں ہوئیں۔ تم تو اور بڑی ہو گئیں۔ لیکن میں جو زندگی کو کفارہ سمجھ کر گزار رہا تھا، تباہ ہو گیا۔ شاید نہیں، یقیناً جہنم ہی میرا مقدر ہے۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ شاید گناہ کبھی نہیں مٹتے۔“ اچھو میاں کے لہجے میں گہری مایوسی تھی۔

نادرہ نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔ ”میں نے...... میں نے الٹا آپ کو دکھی کر دیا۔“

”نہیں۔ تم نے تو ایثار کی حد کر دی۔ اس لئے تو میں نے کہا کہ تم اور بڑی ہو گئیں۔ اور دیکھا جائے تو فرق مجھے بھی نہیں پڑا۔ میں تو تھا ہی حقیر ترین۔ اور حقیر کیا ہوتا۔ بس ایک بھرم ٹوٹ گیا۔ خوش فہمی دور ہو گئی۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”میری آنکھوں میں دیکھو نادرہ۔ کیا ان میں تمہیں ہوس نظر آتی ہے۔“

”نہیں۔ اور آج ہی کیا، میں نے تو آپ کی آنکھوں میں کبھی طلب بھی نہیں دیکھی، ہوس تو بہت دور کی بات ہے۔ اور اچھو میاں، ایک ہوس ہی کی تو پہچان ہے مجھے۔ کیونکہ اس کے سوا کچھ اور دیکھا ہی نہیں میں نے۔ اسی لئے تو آپ کی فکر کر رہی ہوں۔ اسی لئے تو اتنی بڑی بات کہی ہے آپ سے، جو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

اچھو میاں کی آنکھوں میں طمانیت جھلکنے لگی۔ انہوں نے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور زیر لب بولے۔ ”اللہ کا شکر ہے۔“

”تو پھر یہ سب کیوں ہوا اچھو میاں؟“

اچھو میاں خلاؤں میں گھور رہے تھے، جیسے کچھ دیکھ رہے ہوں۔ پھر انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جب سب کچھ ختم ہو گیا اور میں نے آخری پونجی نیلم کے قدموں میں رکھ دی تو میں اپنے لئے سزا تجویز کر چکا تھا۔ جو نیلم میرے اشاروں پر ناچتی اور اٹھتی بیٹھتی تھی، میں نے اُس کی غلامی قبول کر لی۔ یہاں بائیس سال سے ہوں میں، اور ہر ایک کے ہر حکم کی تعمیل کرتا رہا ہوں۔ کبھی کسی کو کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ بس ایک دلالی نہیں کی۔ اور ذلت کو بے حسی کے ساتھ نہیں، احساس کے ساتھ ذلت سمجھ کر، اور محسوس کر کے قبول کیا۔ ہر ذلت روح کے لئے تازیانہ تھی۔ اور میں یہ سوچ کر قبول کرتا تھا کہ شاید کسی چھوٹے سے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔ شاید اس لئے مطمئن ہو گیا کہ نفس پوری طرح کچل دیا گیا ہے۔ لیکن پرسوں......“ انہوں نے شہناز کا واقعہ سنایا۔ پھر بولے۔ ”...... بس وہ چیلنج بن گیا مردانگی کے لئے۔ اور غصے اور ہوس میں ہوش و حواس جواب دے

جاتے ہیں۔اس لئے تو پتا نہیں چلا کہ شہناز کی جگہ ننھی بچی کو اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔اب سوچتے ہیں، ہاتھ کیوں نہیں ٹوٹ گئے میرے۔اسی لئے تو واپس چلا آیا سزا کے لئے۔ پر تم نے تو......اور اب اس وقت......'' ان سے کچھ کہا نہیں گیا۔وہ پھر رونے لگے نادرہ نے اپنے دوپٹے سے ان کے آنسو پونچھ دیے۔''اب آپ ایک وعدہ کریں مجھ سے۔''

''جو بھی کہو گی، مان لوں گا۔''

''آدمی بہت کمزور ہوتا ہے اچھو میاں۔آئندہ ایسا ہو تو وعدہ کریں کہ آپ میرے پاس چلے آئیں گے۔اس کے سوا کچھ نہیں کریں گے۔''

''اب ایسا ہو گا ہی نہیں۔'' اچھو میاں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔''اب تو ہم چوکنا ہو چکے ہیں۔''

''اس کے باوجود بھی کچھ ہو سکتا ہے۔آپ وعدہ کریں مجھ سے۔''

''چلو......تمہاری خوشی کی خاطر وعدہ کر لیتے ہیں۔''

''آپ نے یہاں بائیس سال گزار دیے۔آپ کو کبھی پچھتاوا نہیں ہوا؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''ہم تو یہاں گناہوں کے کفارے کے لئے عمر قید خوشی سے کاٹ رہے تھے۔پچھتاوے تو بہت تھے۔مگر انہیں اس چار دیواری سے باہر ہی چھوڑ آئے تھے۔ہاں مگر جب تمہیں دیکھا تو بڑی شدت سے پچھتاوا ہوا۔ہم بے بسی سے ہاتھ مَل کر رہ گئے۔''

نادرہ کو حیرت بھی ہوئی اور تجسس بھی۔''میری وجہ سے پچھتاوا؟''

''ہاں۔ہم نے سوچا، کاش ہمارے پاس ساری دنیا کی دولت ہوتی، اور وہ ہم نیلم کو دے کر تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاتے۔تمہیں عزت کی زندگی دینے کے لئے مشقت مزدوری کرتے۔مگر افسوس۔''

نادرہ سن ہو کر رہ گئی۔اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اب بھی کوئی اس کا اس طرح سے خیال کرنے والا دنیا میں ہے۔

اچھو میاں کو کچھ خیال آیا تو وہ بھڑک اُٹھے۔''ارے ہاں......ایک وضاحت کر دیں، اگر تم یقین کر سکو تو کر لینا۔''

''یقین کیوں نہیں کروں گی میں۔''

وہ کوئی جادوئی لمحہ تھا، جس میں اچھو میاں تبدیل ہوئے، کچھ اور بن گئے۔وہ تن کر بیٹھ گئے۔چہرے پر تمکنت چھا گئی، اور وہ بولے تو ان کے لہجے میں وقار اور دبدبہ تھا۔''نواب زادہ اشرف علی خان بہت بڑا گناہگار تھا۔لیکن ایک گناہ سے اسے اللہ نے بچائے رکھا۔اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، منافقت نہیں کی۔جب وہ نواب تھا تو مضبوط تھا۔اس لئے اس بات کی کوئی

اہمیت نہیں۔لیکن جب وہ اچھو میاں بن گیا، تب بھی اللہ نے اسے جھوٹ اور منافقت سے بچائے رکھا۔میں یہ وضاحت تمہیں یقین دلانے کے لئے کر رہا ہوں کہ جب تمہیں دیکھ کر مجھے پچھتاوا ہوا تو وہ نہ تو نواب اشرف علی خان کا پچھتاوا تھا، جو تماش بین اور حسن پرست تھا، اور نہ ہی وہ اچھو میاں کا پچھتاوا تھا، جو کچلا ہوا سہی، بہر حال مرد تھا۔اس پچھتاوے میں کوئی غرض، کوئی مطلب نہیں تھا۔ اور اُس کی وجہ یہ بھی نہیں تھی کہ تم بہت حسین تھیں۔میں تو بس تمہاری مدد کرنا، تمہارا محافظ بن کر تمہاری خدمت کرنا اور خیال رکھنا چاہتا تھا۔بہت خالص اور بہت بے غرض جذبہ تھا وہ۔''

نادرہ نے بڑے احترام سے ان کا ہاتھ تھام کر اوپر اٹھایا اور اسے چوم لیا۔''مجھے یقین ہے نواب صاحب۔''

اچھو میاں نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔''ایسا نہ کرو نادرہ۔یہ ہاتھ اس قابل نہیں۔''

''یہی ہاتھ تو اس قابل ہے۔''

''بس تم ایک احسان کرو مجھ پر۔'' اچھو میاں گڑگڑائے۔

''آپ حکم کریں نواب صاحب۔میں تعمیل کروں گی۔''

''میرے لئے اللہ سے دعا کرو کہ وہ میری زندگی میں ہی میری مغفرت کر کے مجھے بری کر دیں، پاک کر دیں۔''

نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''میں کیا دعا کروں۔میں تو خود گناہوں کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہوں۔''

''نہیں نادرہ، ایک تمہی تو پاک نظر آئی ہو مجھے۔تم تو زمین کی طرح ہو، جسے اللہ نے پاک صاف بنایا ہے۔اب کوئی زمین پر گندگی پھیلائے تو زمین کا کیا قصور۔وہ تو قیامت کے دن اللہ سے انصاف مانگے گی۔اور انصاف اسے ملے گا۔گندگی کرنے والے عذاب میں ہوں گے۔تم تو بہت پاک، بہت محترم ہو نادرہ۔وعدہ کرو کہ میرے لئے دعا کرتی رہو گی۔''

رندھے ہوئے گلے کی وجہ سے نادرہ کے لئے جواب دینا ممکن نہیں تھا۔وہ بے اختیار اقرار میں سر ہلاتی رہی۔کوٹھے پر آنے کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ خود کو تنہا محسوس نہیں کر رہی تھی۔یہ احساس بہت طمانیت خیز تھا کہ کمزور سہی، مگر اُس کا کوئی حلیف ہے۔

❁......❁......❁

مولوی صاحب سے گفتگو کے بعد عبدالحق پر سب کچھ واضح ہو گیا تھا، اور یہ اس کے نکتۂ نظر سے اور برا ہوا تھا۔کیونکہ صورتِ حال میں اس سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔اسے لگتا تھا کہ اس کا وجود ایک بوتل کی طرح تھا، جس میں ایک مہیب اور سرکش جن کو بند کر دیا گیا تھا۔اور اب کسی نے ڈھکنا کھول کر اس جن کو آزاد کر دیا تھا۔

دشواری یہ تھی کہ اب اس جن کو دوبارہ بوتل میں بند کرنے کی اُس کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔
صورتِ حال بدستور تھی۔ اُس کی نماز ارتکاز سے محروم تھی۔ قرآن پڑھنا محض آیات کو دہرانا تھا۔ تہجد سے وہ محروم ہو گیا تھا۔ وجہ وہی رات کا فساد تھا۔

مولوی صاحب سے گفتگو کے بعد اُس نے سب سے پہلے توجہ رات کے کھانے پر دی تھی، جس پر وہ سب یکجا ہوتے تھے۔ اُس نے سوچا تھا کہ کھانے کے دوران وہ نور بانو کی طرف ہرگز نہیں دیکھے گا۔

ابتدا میں وہ کامیاب رہا، لیکن کھانے کے اختتام سے ذرا پہلے وہ ہار گیا۔ اُس کی وہ نظر بے اختیار تھی اور ایسی ظالم کہ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ اور اس پر ستم یہ کہ اسے پتا چلا کہ نور بانو اسی کو دیکھ رہی ہے۔ اور دونوں کی نگاہوں کی وہ چوری ایسی ماہرانہ تھی کہ وہاں موجود کسی کو بھی اُس کا پتا نہیں چلا تھا۔

عبدالحق نے فوراً ہی نظر ہٹانے کی کوشش کی۔ یہ آسان نہیں تھا۔ پھر نور بانو کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی، اور بلاوا تھا۔ بہرحال ایک لمحے کی جدوجہد کے بعد اُس نے نگاہ ہٹالی۔ لیکن وہ محض ایک لمحے کی کامیابی تھی۔ اور دوسری نظر اس کے چوکنے پن کے باوجود اٹھی تھی۔ وہ اسے روک نہیں سکا تھا۔ اور نور بانو اس وقت بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ البتہ نگاہوں کا تاثر اس بار مختلف تھا۔ اس بار اُس کی نظروں میں شکایت تھی۔ پھر اس میں فتح مندی کی جھلک آئی، جیسے کہہ رہی ہو...... دیکھا، ہم سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتے تم۔

یوں وہ پہلی ہی رات ناکام ہو گیا۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کھانا کم کھاتا تھا اور نور بانو کو زیادہ دیکھتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ دوسری طرف بھی یہی حال ہے۔

وہ تو پھر بھی ہلکا معاملہ تھا۔ اپنے کمرے کی تنہائی اُس کے لئے سب سے بڑی آزمائش تھی۔ نیند اسے کم ہی آتی تھی۔ وہ تو بس بستر پر لیٹا نور بانو کو تصور میں دیکھتا اور اُس کے تصور سے کھیلتا رہتا تھا۔ اور نیند سے وہ ڈرنے بھی لگا تھا۔ اول تو وہ سوتا بہت دیر میں تھا۔ اور پھر سوتا تو خوابوں میں نور بانو آ جاتی۔ اور ان خوابوں میں لذت ہی لذت ہوتی تھی۔ پہلی بار اسے پتا چلا کہ خواب میں کتنی آزادی ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ خواب پر آدمی کا مواخذہ نہیں ہوتا۔

بہرحال ان خوابوں کی کیفیت ایسی ہوتی تھی کہ آنکھ کھلنے پر احساسِ زیاں ہوتا تھا...... یہ پچھتاوا کہ آنکھ کیوں کھل گئی۔ مگر اس پہلے احساسِ زیاں کے بعد دوسرا حقیقی احساسِ زیاں ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ آنکھ دیر سے کھلی ہے اور وہ فجر کی نماز قضا کر بیٹھا ہے۔ پہلی بار تو اس احساس سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کہ آنکھ کھلی ہے تو وہ چڑھی ہوئی دھوپ دیکھ رہا ہے۔

بہت غور کرنے والا، بہت سوچنے والا ہونے کے باوجود وہ یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ کسی فرض، کسی نیکی سے محرومی پر، کسی خطا پر ہونے والا وہ رنج اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا تحفہ ہوتا ہے۔

وہ دراصل توبہ کا کھلا ہوا دروازہ ہوتا ہے، اصلاحِ احوال کے لئے اللہ کی طرف سے تائید و ترغیب ہوتی ہے۔ وہ رنج آدمی کو خوابِ غفلت سے جھنجوڑنے کے لئے ہوتا ہے۔ آدمی اُس سے فائدہ نہ اٹھائے تو رنج بہ تدریج دھیما ہوتا جاتا ہے اور دل پر پڑا غفلت کا پردہ دبیز ہوتا جاتا ہے۔

بے بسی کا وہ احساس بہت شدید تھا۔ اسے کئی جہتوں میں لڑنا پڑ رہا تھا۔ لیکن بنیادی لڑائی نور بانو کے تصور سے تھی۔ نور بانو سے اُس کی شادی محض مہینے دو مہینے کی بات تھی۔ وہ ایک بار خطا کر بیٹھا تھا، اور اسے دہرانے سے بچنے کے لئے وہ اُس کا سامنا کرنے سے بھی بچنے لگا۔ اسی وجہ سے اُس نے رات کا کھانا سب کے ساتھ کھانا چھوڑ دیا۔ عذر مصروفیت کا تھا۔

مگر وہ اُس تصور کا کیا کرتا، جس کے پاس اب جسمانی لمس کے لذت بھرے حوالے موجود تھے۔ اُس نے خود کو اُس کی قربت تو کجا، دید سے بھی محروم کر لیا تو تصور بالکل ہی بے لگام ہو گیا۔

پہلی بار اسے پتا چلا کہ آدمی کتنا کمزور اور بے بس ہے۔ وہ جانتا تھا کہ غلطی پر ہے، لیکن سر توڑ کوشش کے باوجود اصلاح نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے اندر ہو رہا ہے، غلط ہے لیکن وہ اُس کے سامنے بند نہیں باندھ پا رہا تھا۔

مولوی صاحب کے کہنے کے مطابق اُس نے توبہ کا سہارا لیا۔ دل کی گہرائیوں سے وہ نادم تھا۔ اس لئے توبہ میں ارتکاز بھی تھا، اور خلوص بھی۔ لیکن عبرت ناک بات یہ ہوئی کہ توبہ کے فوراً بعد اس کا بے لگام تصور پھر میدان میں کودا اور اسے شرمسار کر گیا۔

پھر بھی وہ توبہ کرتا رہا۔ لیکن توبہ کا دورانیہ سکڑتا گیا اور بے لگام تصور کی دیدہ دلیری بڑھتی گئی۔ پھر نوبت یہاں تک آ گئی کہ توبہ کے دوران بھی تصور کی دیدہ دلیری کسی نقب زن کی طرح دراندازی کرنے لگی۔

اس مقام پر وہ بالکل مایوس ہو گیا۔ اسے لگا کہ جو توبہ وہ کر رہا ہے، کیے جا رہا ہے، وہ اس کے لئے الٹی شرمناک ہو گئی ہے۔ ادھر نماز اور قرآن کی تلاوت کے درمیان بھی یہی صورتِ حال نہ صرف قائم تھی، بلکہ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ قرآن کی تلاوت سے تو وہ گھبرانے اور کترانے لگا۔ نماز کا جہاں تک تعلق تھا، تو فجر کی نماز قضا ہونا تو معمول بن گیا تھا۔ البتہ آنکھ کھلتے ہی وہ پہلے وضو کرتا اور فجر کی قضا نماز پڑھتا۔ پھر ایک دن کسی کا کوئی کام آ پڑا تو فجر کی قضا نماز ظہر سے جا ملی۔ اور اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ غلط ہے۔ ہر روز وہ عہد کرتا کہ اگلے روز اپنے پرانے معمول کو جاری کرے گا لیکن اگلے روز پھر وہی کچھ ہوتا۔ ہر نماز میں اُس کے دھیان پر نور بانو چھائی رہتی اور وہ کسی مشین کی طرح رکوع و سجود ادا کرتا۔ ہر لمحے وہ لڑنے کی، نور بانو کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا، ارتکاز اور حضوری کے احساس کو بحال کرنے کی کوشش کرتا اور ہار جاتا۔ اس خلل کی وجہ سے وہ شرمندگی کے

مارے قرآن پڑھنے سے کترانے لگا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اس شرمندگی نے اسے دعا سے بھی محروم کر دیا۔ وہ سوچتا کہ اتنی آلودگی کے ساتھ میں اللہ کی بارگاہ میں التجا گزاری کا منہ ہی نہیں رکھتا۔

اسے احساس تھا کہ وہ ایک مسلسل اور مستقل نقصان سے دوچار ہے۔ ہر روز اُس کا خسارہ تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے، اور جاننے کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ آخر یہ خیال اس کے ذہن میں راسخ ہو گیا کہ اب نور بانو سے شادی ہی اسے بچا سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے قرار آ گیا۔ اُس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ دھیرے دھیرے شرمندگی ختم ہوتی گئی اور وہ بڑی حد تک مطمئن ہو گیا۔ خلش اب طویل وقفوں کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے اسے ستاتی تھی۔

ایک رات اسے پتاجی کی وہ کتابیں اور ڈائریاں نظر آئیں، جو نور بانو نے اسے دی تھیں۔ وہ خود اس کمرے میں آئی تھی، اور اس رات تو پنڈورا کا بکس کھلا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ ڈائریوں کے بارے میں نور بانو نے کچھ کہا تھا...... کوئی تبصرہ کیا تھا۔ اور وہ بہت اہم تھا۔ لیکن ذہن پر بہت زور دینے پر بھی اسے وہ بات یاد نہیں آئی۔ اسے تو بس اس رات کی ایک ہی بات یاد تھی...... شاید آپ اس کے بعد مجھے کبھی اچھی لڑکی نہ سمجھیں۔ لیکن میں پھر بھی کہوں گی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی...... اتنی...... اتنی زیادہ کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بس وہی ایک بات یاد تھی اسے۔ اور اُس وقت اسے وہ فریب سماعت لگا تھا۔ اور وہ اُس کی تصدیق کے لئے اُس کے کمرے کی طرف دوڑ گیا تھا۔

اور تصدیق کے بعد سے اب تک وہ ایک سحر میں الجھا ہوا تھا۔

وہ ذہن پر زور دیتا رہا۔ لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ نور بانو نے پتاجی کی ڈائریوں پر کیا تبصرہ کیا تھا۔ بس اسے اتنا احساس تھا کہ وہ بہت اہم بات تھی۔ لیکن نور بانو کے اظہار محبت کے نتیجے میں دب گئی تھی۔

بے بسی سے اُس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے۔ وہ بڑبڑایا۔ کیا حافظے سے بھی محروم ہو گیا میں؟

پھر اچانک اُس کے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا، اور اُس کے کانوں میں نور بانو کی آواز گونجی۔ وہ معذرت کر رہی تھی کہ ان ڈائریوں میں بہت ذاتی باتیں تحریر تھیں، اور اسے وہ ڈائریاں نہیں پڑھنی چاہئے تھیں۔

اور اُس نے کہا تھا...... کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کو اجازت دی تھی نا......

تو اس ڈائری میں ذاتی باتیں تھیں پتاجی کی! تو ڈائری میں تو ہوتی ہی ذاتی باتیں ہیں۔ اس میں کیا اہم بات ہے؟ اس کے بعد بھی کچھ کہا تھا نور بانو نے۔ کیا کہا تھا......؟ کیا کہا تھا......؟

نور بانو کی آواز اُس کی سماعت میں پھر گونجی...... ان ڈائریوں میں ایک اتنی بڑی خوشی ہے

آپ کے لئے کہ جو آپ کے گمان میں بھی نہیں ہو سکتی، پھر اُس نے اس کے لئے پیشگی مبارک باد دی تھی۔ اور اُس نے کہا تھا...... وضاحت نہیں کریں گی آپ۔ اس پر نور بانو نے کہا تھا...... جی نہیں خود پڑھ کر جو خوشی ہو گی آپ کو وہ بہت...... بہت بڑی ہو گی۔ اور میں اسے خراب کرنا نہیں چاہتی۔

اُس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ بہت بڑی خوش خبری، اور اُس نے پلٹ کر ان ڈائریوں پر دوسری نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ کیسی بے حسی اور ذلت میں گرفتار ہو گیا ہے وہ۔ اسے خود پر شرم آنے لگی۔ اتنی بڑی بات وہ بھول گیا، اور اسے تجسس بھی نہیں ہوا! وہ کیسا احسان فراموش بیٹا ہے کہ جس باپ نے اس کی خاطر جان دے دی، اسے اس کے متعلق ایک نامعلوم اور بہت بڑی خوش خبری کو جاننے کا شوق بھی نہیں ہوا۔ وہ اتنی بڑی بات بھول گیا۔

بہر حال اب وہ تجسس سے بے حال ہو گیا تھا۔ وہ میز کی طرف گیا، جہاں کتابیں رکھی تھیں۔ کتابوں میں ایک نسخہ قرآن پاک کا تھا اردو ترجمے کے ساتھ۔ ایک کتاب تھی احکامِ الٰہی، ایک کتاب قیامت کے بارے میں تھی۔ ایک سیرتِ طیبہ پر تھی۔

اس نے سوچا' کتابوں کا وہ پھر کبھی جائزہ لے گا۔ یہ سوچ کر اس نے دونوں ڈائریاں اٹھا لیں۔ نور بانو نے کہا تھا کہ ان میں اس کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے' ایسی کہ جو اس کے گمان میں بھی نہیں ہو سکتی۔ اور اس وقت اسے خوش خبری کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اپنے معاملات کی طرف سے اس کی مایوسی بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔

اپنے بستر پر نیم دراز ہو کر اس نے ایک ڈائری کھولی۔

ڈائری کھولنے سے پہلے اس نے ایک بات سوچی تھی...... وہ یہ کہ ایک راج پوت کو اور وہ بھی حاکم راج پوت...... اسے ڈائری لکھنے کی کیا ضرورت۔ تو ڈائری کھولتے ہی اسے اس بات کا جواب مل گیا۔ وہ ڈائری درحقیقت اس کی اپنی زندگی کی کتاب تھی...... ایسی کتاب' جس کے بعض ابواب پتاجی کسی کو بھی نہیں سنا سکتے تھے۔

اس نے پڑھنا شروع کیا' اور اس میں کھو گیا۔

اس ڈائری میں بہت کچھ تو ایسا تھا جو وہ جانتا تھا' یا جان گیا تھا۔ اور اب ڈائری اس کی تائید کر رہی تھی۔ جیسے یہ بات کہ وہ جس حالت میں پیدا ہوا تھا' اس میں اسے ختنہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات دائی راجو اور شانتا کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔

وہ ڈائری کیا تھی' حیرت کدہ تھی۔ اس کی پیدائش والے دن پتاجی بے اختیار گاؤں سے باہر چلے گئے تھے۔ جبکہ گاؤں میں اس کی پیدائش کا جشن منایا جا رہا تھا' اور حویلی مہمانوں سے بھری تھی۔ اور وہاں وہ لوگ اس بزرگ سے ملے تھے...... وہی بزرگ جو اس کے قبولِ اسلام والی رات دہلی میں ماں جی کے گھر آئے تھے' اور انہوں نے ہی اس کا نام رکھا تھا۔ پتاجی کی ڈائری گواہی

دے رہی تھی کہ انہوں نے ٹھاکروں کی گڑھی کے بارے میں کہا تھا کہ وہ نہیں رہے گی' اور گاؤں دوبارہ آباد ہوگا تو اس کا نام حق نگر ہوگا۔

اور کیسی عجیب بات ہے کہ ان کی بات سچ ثابت ہوئی۔ اب ٹھاکروں کی گڑھی اور اس کے گردونوح کے تمام گاؤں ایک ہیں' اور اس پورے علاقے کا نام حق نگر۔

پھر پنڈت روپ سہائے' جنہوں نے اس کی جنم کنڈلی بنائی تھی اور اس کا نام اوتار سنگھ رکھا تھا۔ بعد میں وہ اپنے گرو رام دیال کو لے کر آئے تھے۔ پتاجی نے اس سلسلے میں ان کی کہی ہوئی ہر بات لکھی تھی۔ انہوں نے تو ایک طرح سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اوتار سنگھ' ٹھاکر پرتاپ سنگھ اور ٹھاکرانی رنجیتا کا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان دونوں کی کنڈلی میں اولاد تھی ہی نہیں۔

وہ ڈائری زندگی کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اس کے لیے پتاجی کی غیر معمولی بے پایاں محبت کی گواہ تھی۔ ماتاجی کے دیہانت کے بعد وہ دہلی چلا گیا تو پتاجی کی زندگی کیسی ویران ہوگئی۔ کتنے اکیلے' کتنے دکھی' کتنے بوجھل تھے وہ۔

پھر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے یاد تھا کہ اس سال پتاجی دہلی آئے تھے۔ یہ وہ عرصہ تھا' جب اس نے نور بانو کی آواز سنی تھی' وراس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ ایسا گم تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ پتاجی نے بہ غور اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے' اور اس سے نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔

اسے حیرت ہوئی کہ پتاجی نے دو دن میں اسے پوری طرح بھانپ لیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ محبت کا چکر ہے۔ لیکن اس کی نظریں کسی کی جستجو میں بے قرار نہیں تھیں' اس پر انہیں الجھن تھی۔ بہرحال یہ بات انہوں نے سمجھ لی کہ وہ اس آواز کو سننے کے لیے کوٹھے پر آتا ہے اور ایسا بے سدھ ہو کر اس آواز کو سنتا ہے۔ اور وہ جانتے تھے کہ یہ قرآن پڑھا جا رہا ہے۔

یہ سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ جو آواز اور کلام بالآخر اسے اسلام کی طرف لے گیا تھا' اس نے اس کے پتاجی کو قرآن کے مطالعے کی طرف راغب کیا تھا۔

دراصل پتاجی اس کے معاملے میں دو مختلف ہستیوں کی وجہ سے سپردگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ دونوں ہستیاں ایک دوسرے کی ضد تھیں' لیکن ایک دوسرے کی تائید بھی کر رہی تھیں۔ ان جانا بزرگ اور پنڈت روپ سہائے۔ بزرگ نے تو تنبیہہ کے ساتھ انہیں جتا دیا تھا کہ مرضی نومولود بچے کی چلی گی۔ ورنہ دینے والا اپنی نعمت واپس بھی لے سکتا ہے۔ اور پنڈت روپ سہائے نے کہا تھا...... چھوٹے ٹھاکر اپنا بھاگیہ آپ لکھیں گے۔ اور دودھ والے معاملے میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے واضح طور پر اس بات کی سچائی کو سمجھ لیا تھا۔

پتاجی نے لکھا تھا کہ انہوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ ان کے بیٹے کا مسلمانوں سے کوئی نامعلوم مگر بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تو مسلمانوں سے ان کی انسیت شروع

ہوئی۔ پھر ان کے دل میں مسلمانوں کو اور اسلام کو سمجھنے کی لگن پیدا ہوئی۔ یہ بات بھی وہ ذہنی طور پر قبول کر چکے تھے کہ ان کا بیٹا بالآخر کسی مسلمان لڑکی سے شادی کرے گا۔

ڈائری بتاتی تھی کہ جس شام انہوں نے اوتار سنگھ کو از خود فراموشی کی کیفیت میں قرآن کی تلاوت سنتے دیکھا تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قرآن کے ذریعے اسلام کو اور مسلمانوں کو سمجھیں گے۔

وہ اپنے ایک کلاس فیلو امان اللہ سے ملے۔ اس نے مشورہ دیا کہ قرآن سے پہلے وہ سیرت پڑھیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے مزید چند کتابیں تجویز کیں۔ اور ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اس پر عمل کیا۔

ٹھاکر نے لکھا تھا کہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت پڑھنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ افسانہ ہے۔ ایسا تو منش ہو ہی نہیں سکتا اور اگر وہ ایسے تھے تو پھر دنیا میں کوئی ان کے سوا ایسا نہیں کہ اس کی پوجا کی جائے۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ اَن دیکھے اللہ کے سوا کوئی عبادت کا سزاوار نہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کے ماننے والے ایسے ہی ہیں۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرح مسلمان نے نہ کبھی ان کی کوئی مورتی اور نہ ہی کوئی تصویر بنائی۔ وہ جیسے بھی ہوں' اور اپنے اوتار سے کتنی ہی محبت کریں' عبادت وہ اَن دیکھے اللہ کی ہی کرتے ہیں۔ سجدہ صرف اسی کو کرتے ہیں۔

ڈائری بتاتی تھی کہ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ٹھاکر پرتاپ سنگھ قرآن کی طرف متوجہ ہوا لیکن وہ کوشش کے باوجود جم کر نہیں پڑھ پاتا تھا' اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ پھر ایک دن اچانک ایک صفحہ کھل کر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا اور اس کی نظریں خود بخود ایک آیت پر جم گئیں۔

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سورۃ الملک کی وہی آیات تھیں' جنہیں سن کر وہ ایمان لایا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے!

ڈائری کے مطابق ٹھاکر پرتاپ سنگھ ان آیات کی صداقت جانچنے کے لیے کھلے آسمان کے نیچے چلا گیا تھا۔ پھر اس نے میلوں چلنے کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ...... اس نے خود لکھا تھا۔ ''میں اپنی دھن میں بہت دور نکل آیا تھا۔ مگر آسمان کی مرکزی حد سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی۔ میرے پاؤں شل ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ دیر تک مجھ سے اٹھا بھی نہیں گیا۔ اب مجھے اتنی دور پیچھے جانا تھا۔

''میں نے بہت غور کیا اور کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میں دنیا کے کسی بھی ملک چلا جاؤں' آسمان کا مرکز میرے سر کے عین اوپر ہی رہے گا۔ اس کا مطلب؟ آسمان کی وسعت نامعلوم ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آسمان کے مرکز کی وسعت اتنی ہے کہ پوری زمین بس اس کے نیچے ہے۔ میں کہیں بھی کھڑا ہو کر دیکھوں' خود کو اس مرکز کے عین نیچے پاؤں گا۔''

عبدالحق پر ہیبت طاری ہوگئی۔ یہ آسمان کے مرکز والا نکتہ تو وہ بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔ اور اس

کے پتاجی نے سمجھ لیا تھا۔ کاش...... میرے پتاجی مسلمان ہوتے! اس نے بڑی حسرت سے سوچا۔

'میرے لیے تو سوچ کے دروازے کھل گئے' ٹھاکر نے ڈائری میں لکھا تھا۔ سائنس داں کہتے ہیں کہ آسمان فریبِ نظر ہے۔ کوئی مجھ سے کہے تو میں کہوں' پہلے ایک چھوٹا سا...... بہت چھوٹا سا ہی فریبِ نظر پیدا کر کے دکھاؤ تو مانوں۔ فریب تو اسے کہتے ہیں' جسے بالآخر دور ہونا ہوتا ہے۔ یہ کیسا فریبِ نظر ہے کہ ہزاروں برسوں سے انسانوں کے سروں پر قائم ہے...... نسل در نسل' اور کبھی دور نہیں ہوا۔

'میں پہلے ہی سے جانتا اور مانتا تھا کہ میرا بیٹا میرے لیے مبارک ہے۔ لیکن اتنا مبارک ہے' میں نے نہیں سوچا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرے اندر اندھیرا تھا' جو دھیرے دھیرے چھٹ رہا ہے' اور روشنی بڑھ رہی ہے......'

عبدالحق ڈائری پڑھتا رہا' جس میں اس کے باپ کے تجربات اور مشاہدات تھے...... بلکہ انکشافات بھی تھے۔ وہ پڑھتا اور حیران ہوتا رہا اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کی گھر سے دوری کے دوران پتاجی دنیا تیاگ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اس کی جدائی میں مطالعے میں دل لگایا تھا...... اور مطالعہ بھی وہ' جو اسی عرصے میں وہ خود کرتا رہا تھا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ باپ اور بیٹا ایک ہی وقت میں تلاشِ حق میں مصروفِ کار تھے۔ تاریخیں پلٹتی رہیں۔ ایک ڈائری ختم ہوئی اور دوسری شروع ہو گئی۔ کہانی انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ فیصلہ کن سال یعنی ۱۹۵۶ء شروع ہو چکا تھا۔ عبدالحق کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے ادراک ہو چکا تھا کہ ان صفحات میں کوئی بہت بڑی حقیقت افشا ہونے والی ہے۔

اس ڈائری میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی ذاتی کیفیات بھی تھیں اور مطالعے پر تبصرہ بھی۔ سورۃ الملک کی ان آیات کے بعد اس کی سمجھ میں قرآن میں سے کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن اس نے پڑھنا نہیں چھوڑا تھا۔

پھر وصال دین گاؤں واپس آ گیا۔ اس کے امتحان ہو چکے تھے۔ جبکہ اوتار سنگھ کے امتحان ابھی شروع بھی نہیں ہوئے تھے۔

ٹھاکر نے اپنی ڈائری میں وصال دین کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا' جو ہر روز باقاعدگی سے اس کے پاس آتا تھا' تاکہ اسے اوتار سنگھ کی اتنی کمی محسوس نہ ہو۔ اور وہ اوتار سنگھ کی طرح اس کے پاؤں بھی دباتا تھا۔

آگے' ڈائری اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ ٹھاکر بیٹے کے [illegible] ایک دن گن رہا تھا۔ مطالعے کا' اور خاص طور پر قرآن کا سہارا نہ ہوتا تو شاید وہ انتظار اسے پاگل ہی کر دیتا۔

عبدالحق کی بے تابی بڑھ گئی تھی۔ تاریخیں بتاتی تھیں کہ اب وہ اپنے باپ کے آخری ایام کی

روداد پڑھ رہا ہے۔ وہ تاریخ قریب آ رہی تھی' جب وہ گاؤں واپس آیا تھا اور اپنے دم توڑتے باپ سے چند لمحوں کے لیے ملا تھا۔

لیکن اس سے پہلے ہی ڈائری میں سنسنی کا آغاز ہو گیا۔ اور وہ سنسنی ایسی تھی کہ پتاجی کا خط بھی اس کی گواہی دے رہا تھا۔ ان کی تحریر پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی وجہ ان کے ہاتھوں کی لرزش ہے۔ انہوں نے لکھا تھا......

''آج مجھے روشنی مل گئی ہے۔ سچ جھوٹ مجھ پر کھل گیا۔ آج میں قرآن پڑھنے بیٹھا تو جیسے خود بہ خود ورق اُڑے اور ایک صفحہ میرے سامنے کھل گیا۔ اور میری نظر اس عبارت پر پڑی...... کیا کبھی غور کیا تم نے کہ یہ نطفہ جو ڈالتے ہو تم' کیا تم پیدا کرتے ہو بچہ یا ہم ہیں پیدا کرنے والے؟ میں ہر روز بے بسی محسوس کرتا تھا کہ قرآن میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن میں پڑھنا نہیں چھوڑتا تھا۔ ہر روز نئے سرے سے کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔ آسمان والی عبارت کے بعد میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس کتاب میں بڑے بڑے بھید ہیں۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے' مجھے کوشش کرتے رہنا ہے۔

'مگر آج جو یہ صفحہ کھلا اور عبارت نظر میں آئی' اُسے تو میں خوب سمجھ سکتا تھا۔ رنجیتا سے شادی کے بائیس سال میں اولاد سے محروم رہا تھا۔ جبکہ یہ مجھ میں کمی تھی نہ رنجیتا میں۔ اور میں نے کیا کیا جتن نہ کیے' کہاں کہاں نہ گئے ہم' کس کس کے چرنوں میں جھکے۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ یہ پڑھ کر پہلی بار میری سمجھ میں آیا کہ ایک قدرتی سسٹم تو موجود ہے۔ ملاپ کے عمل کے نتیجے میں ایک نظام کے تحت جسموں سے مادے خارج ہوتے ہیں۔ سائنس کہتی ہے کہ انہی کے کیمیاوی عمل کا نتیجہ اولاد ہوتی ہے۔ مگر قرآن اصل حقیقت سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ مادے کا اخراج تو ہر بار' ہر موقعے پر ہوتا ہے۔ لیکن اصل چیز نطفہ ہے۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اس پر آدمی کا کوئی اختیار نہیں۔ وہ اللہ دیتا ہے' اور بے شک وہی بچہ پیدا کرتا ہے۔ کون بدبخت اس آیت سے انکار کر سکتا ہے۔ یہی تو نہیں کر سکتا۔

''اور یہ پڑھنے کے بعد مجھ پر لرزہ چڑھ گیا۔ میں نے اور رنجیتا نے آخری منت پیپل کے درخت کے سامنے مانی تھی' اور اس کے بعد ہم دونوں نے ایک ہی وقت میں خوش خبری کا ایک ہی خواب دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد پیپل کا درخت جل گیا تھا اور ہم مایوس ہو گئے تھے۔ اور اس کے بعد ہی اوتار سنگھ رنجیتا کی کوکھ میں آیا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اوپر والے نے یہی بات تو سمجھائی تھی ہمیں۔ پر ہم نے نہیں سمجھی۔ اب مجھے رنجیتا پر افسوس ہوتا ہے۔ میں نے تو آج یہ بات سمجھ لی' پر وہ بے چاری تو محروم رہ گئی۔

'میں نے جائزہ لیا۔ وہ سورۃ الواقعہ کی 58ویں آیت تھی۔ میں اس پر غور کرتا رہا۔ میری سمجھ میں آیا کہ یہ آیت مکمل ہے اور دونوں رخ سے حقیقت ہے۔ میں نے دونوں رخ دیکھے تھے۔ میں

نے بائیس سال ہر ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھی تھی' لیکن اولاد سے محروم رہا تھا۔ یہاں تک کہ اوپر والے نے مجھے نواز دیا۔ اور کالج میں میرا ایک انگریز دوست تھا' جس کے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ تعلقات تھے۔ وہ دونوں ہر طرح کی احتیاط کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بغیر شادی کے وہ بچہ نہیں چاہتے تھے۔ مگر ان کی ہر احتیاط دھری رہ گئی۔ اور جب حمل ٹھہر گیا تو انہوں نے اسے مٹانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ کیا دیسی ٹوٹکے اور کیا انگریزی دوائیں' انہوں نے کچھ نہیں چھوڑا لیکن وہ ناکام رہے۔ بچہ پیدا ہو کر رہا۔

'آسمان والی بات کے بعد مجھے یقین آ گیا تھا لیکن اب تو میں بڑی سے بڑی سوگند کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اللہ ہی سب کچھ ہے' اور یہ اس کا سچا کلام ہے' جسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ اور میں اسے مانتا ہوں اور اس کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔

'میرے لیے تو یہ ایک دلیل ہی کافی تھی۔ مگر آگے اور دلیلیں تھیں۔ انہیں پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ایسی دلیلوں کے ہوتے ہوئے بھی منش کیوں اندھیروں میں سر ٹکراتا پھرتا ہے۔'

'اسی سورۃ میں 63 سے 67 تک کی عبارت میں سب سے مہان اللہ کہتا ہے کہ تم زمین میں بیج ڈالتے ہو اور سمجھتے ہو کہ کھیتی تم اگاتے ہو لیکن نہیں۔ کھیتی ہم اگاتے ہیں۔ ہم چاہیں تو اسے بھس بنا کر رکھ دیں اور تم سر پیٹتے رہ جاؤ اور اپنی تباہی پر روؤ اور اپنے نصیب کو کوسو۔ اسے پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ ہم زمین دار اور کسان لوگ تو اس بات کو خوب سمجھتے ہیں' پر شاید سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پاتے۔ میں نے تو کھڑی فصلیں تباہ ہوتے دیکھی ہیں' بارش نہ ہونے اور بارش بہت زیادہ ہونے سے بھی۔ اور کبھی کسی کھیت میں اتنے ہی بیج سے دس من کی فصل ہوتے دیکھی ہے۔ اور کبھی بیس من بھی دیکھا ہے۔ کسانوں کے چہرے میری نگاہوں میں پھرتے ہیں' کبھی ہنسی خوشی لگان دیتے ہوئے اور کبھی رو کر فریاد اور معذرت کرتے ہوئے کہ مالک' اس بار پتا نہیں کیا ہو گیا' فصل ہی اچھی نہیں ہوئی۔ پورا لگان دے دیں تو کھائیں گے کیا۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی بالی گندم سے لدی کیوں ہوتی ہے اور کوئی بالکل خالی ہوتی ہے۔ بے شک اوپر والا مہان ہے۔

'پھر آگے 68 سے 70 تک کی عبارت میں ایک اور نشانی بتائی...... بہت بڑی نشانی۔ میٹھا پانی جو بڑی نعمت ہے۔ صحرائی لوگوں سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات۔ وہ کہتا ہے یہ پانی ہم نے نازل کیا ہے یا تم نے؟ وہ کہتا ہے' ہم چاہیں تو بنا دیں اسے نمکین...... سخت نمکین تو پھر تم شکر گزار کیوں نہیں ہوتے؟

'اب یہ تو سب جانتے ہیں' کیا ہندو' کیا مسلمان اور کیا عیسائی کہ ہم پانی نہیں برساتے۔ بارش نہ ہو تو ہم رو رو کر پرارتھنا کرتے ہیں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ میٹھا پانی تو دھرتی پر کبھی تھا ہی نہیں۔ ساگر کے سوا یہاں کیا تھا۔ اوپر والے نے یہ اتنا زبردست پلانٹ لگایا۔ کھارے پانی کو میٹھا

کرنے کا پلانٹ۔ تبخیر کے عمل سے کھاری پانی بادل بنا۔ بادل اُڑے۔ اس کے منظور کردہ مقام پر پہنچے اور بارش کر دی۔ میٹھے پانی کی سپلائی آ گئی ہے جی۔ بارش سے تالاب بنے' ندی نالے اور دریا بنے۔ کچھ پانی اس کے حکم سے دھرتی میں اتر گیا۔ بعد میں کبھی وہ چشموں کی شکل میں پھوٹا اور کہیں ہم نے کھدائی کر کے کنویں بنا لیے۔ پانی کی فطرت اس نے ایسی میل ملاپ والی بنائی کہ اکیلا نہیں رہتا۔ جمع ہوتا ہے۔ قطرہ بھی ہو تو دوسرے اور پھر تیسرے قطرے کی طرف لپکتا ہے' چاہے کہیں بھی ہو۔ پانی کی یہ فطرت نہ ہوتی تو ہمارے لیے مسئلہ بنتا۔

'لیکن یہ سب کچھ بارش کے دم سے ہے۔ لمبے عرصے تک بارش نہ ہو تو کنویں' چشمے' ندی نالے' یہاں تک کہ دریا بھی سوکھ جاتے ہیں۔ یہ عبارت پڑھ کر میری تو سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ کبھی بارش روک کر وہ منش کو جتاتا ہے کہ اس کا احسان مانے۔ وہ چاہے تو میٹھا پانی ختم ہو جائے۔ بادلوں کے سسٹم میں وہ تبدیلی کر دے اور وہ پانی کے ساتھ نمک بھی اٹھانے لگیں تو میٹھا پانی کہاں سے آئے۔ اور مل جاتا ہے تو منش کو اس کی اہمیت کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن نہ ملے تو اسے پتا چلے کہ پانی کے بغیر زندگی ہی ممکن نہیں۔ پھر وہ آخر میں کہتا ہے کہ تم' شکر گزار کیوں نہیں ہوتے۔ واقعی' شکر گزاری کیا' ہم تو سوچتے بھی نہیں۔ مگر میں نے اب جان لیا' مان لیا اور میں شکر گزار ہوں۔

"پھر اگلی عبارت میں آگ کا درخت بیان کیا ہے۔ ایسے کسی درخت کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں نے سمجھ لیا ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ ہے' وہ سچ ہے اور حقیقت ہے' خواہ ہمیں نظر آئے یا نہ آئے۔ اور آگ کے فائدے تو میں بھی جانتا ہوں۔ مگر یہ آگ یاد دہانی کے لیے ہے...... نرک کی یاد دہانی کے لیے۔ یہ پڑھ کر پہلی بار میں نے نرک کے بارے میں سوچا۔ مجھ پر تو تھرتھری چڑھ گئی۔ میں چھوٹا سا تھا تو ایک بار میری انگلی جل گئی تھی۔ اس کی تکلیف مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں روتا تھا اس تکلیف سے۔ حیرت ہے' ہمیں نرک کا خیال کیوں نہیں آتا۔ وہ آگ تو بہت...... بہت بڑی اور شدید ہو گی اور مسلسل جلانے والی۔ جبکہ ایک سیکنڈ میں جلنے والی انگلی کی تکلیف مجھے کئی دن تک رلاتی رہی تھی۔ تو نرک میں کیا ہو گا۔ یہ تو میں کبھی سوچتا ہی نہیں تھا۔ شاید کوئی بھی نہیں سوچتا۔ مگر دنیا میں معمولی سی تکلیف پر تڑپ جانے والوں کو سوچنا بھی چاہیے' اور ڈرنا بھی چاہیے۔ میں تو اب یاد رکھوں گا' اور ڈرتا رہوں گا۔

'پھر آگے 79 کی عبارت میں اس کتاب کے پاک ہونے کا اور بڑائی کا تذکرہ تھا اور لکھا تھا کہ اسے وہ چھوئیں جو پاک صاف ہوں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ آئندہ میں اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے خوب اچھی طرح نہایا کروں گا۔

'پھر 84 سے 87 تک کی عبارت میں ایک اور بڑی نشانی تھی۔ پہلے تو اوپر والے نے بتایا کہ پیدا صرف اسی کا کام ہے۔ اب وہ بتا رہا تھا کہ موت پر بھی صرف اسی کا اختیار ہے۔ وہ کہتا ہے

کہ مرنے والے کا آخری وقت آ جاتا ہے اور ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ جان اس کے حلق تک آ گئی ہے۔ ہم اسے تو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اوپر والا ہمیں نظر نہیں آتا۔ اور وہ بتاتا ہے کہ وہ ہم سے زیادہ اس مرنے والے کے قریب ہوتا ہے۔ لیکن ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ وہ حاکم ہے اور ہم محکوم ہیں۔ وہ چیلنج کرتا ہے کہ اگر ہم یہ بات نہیں مانتے تو پھر مرنے والے کو بچا کیوں نہیں لیتے۔ اس کی آتما کو لوٹا کیوں نہیں لیتے۔

'مجھے رنجیتا کی موت اور اپنی بے بسی یاد آ گئی۔ میں سو جتن کر کے بھی اسے نہیں بچا سکا۔ دنیا میں کوئی کسی کو نہیں بچا سکا۔ اور کوئی ایسا نہیں' جسے موت نہ آئی ہو۔ تو میں نے مان لیا کہ وہ حاکم ہے اور میں محکوم۔ تو پھر مجھے اس کی ایسی ہی تابع داری کرنی چاہیے' جیسی میری رعیت میری کرتی ہے اور وہ میں کروں گا۔'

عبدالحق ایسے بیٹھا تھا' جیسے سانس لینا بھی بھول گیا ہو۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ پتاجی تو اس سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ وہ اس وقت جہاں تھے' وہ اب بھی وہاں نہیں پہنچ سکا تھا۔ آسمان کی جس نشانی کے بارے میں وہ سن کر ایمان لے آیا تھا' پتاجی اس کی تصدیق کے لیے کئی میل پیدل چلے تھے۔ ان کا یقین تو اس کے یقین سے بہت بڑا ہو گا۔

اسے باپ پر رشک آنے لگا۔ انہوں نے اللہ کی کتنی نشانیون کو دیکھا اور سمجھا تھا۔ سورۃ الواقعہ کی یہ آیات بارہا اس کی نظر سے گزری تھیں لیکن اس نے غور نہیں کیا تھا۔ جبکہ پتاجی نے ان پر غور کیا اور ان کی سچائی کو دل سے تسلیم کیا تھا۔

کاش پتاجی مسلمان ہوتے! اس نے حسرت سے سوچا۔ پھر وہ اگلے اندراج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

'آج میں بہت اچھی طرح نہا کر اس کتاب کو پڑھنے بیٹھا تو مجھے ایسا لگا کہ اس میں سے بہت ٹھنڈی روشنی نکل کر آنکھوں کے راستے میرے دل میں جا رہی ہے۔ دل میں ٹھنڈک اور روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔

'میں نے پھر وہی کچھ پڑھا جو کل پڑھا تھا۔ اس کے بعد میں نے کتاب رکھ دی اور سوچتا رہا۔ ایک یقین میرے اندر' میرے وجود کی اندرونی دیواروں سے پھوٹ رہا تھا اور پورے وجود میں پھیل رہا تھا۔ یہ کہ اس دنیا صرف سچ وہی ہے جو اس کتاب میں لکھا ہے۔ جو کچھ اس کتاب والا کہتا ہے' بس وہی سچ ہے۔ میں نے سر اوپر اٹھا کر کہا...... اے کتاب والے' میں تجھے نہیں دیکھ سکتا' لیکن تُو مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں تجھے نہیں جان سکتا' لیکن مجھے تیرے سوا کوئی پوری طرح نہیں جان سکتا۔ میں نے پڑھا' جانا اور مان لیا کہ تیری بات کے سوا کچھ سچ نہیں۔ اب میں تیرا ہوں...... صرف تیرا' تجھ اکیلے کا۔

'اس سے جو مجھے سکون ہوا' وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک تشنگی کا احساس بھی تھا' جیسے

سب کچھ نامکمل ہے۔ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے۔ میں اس پر سوچتا رہا اور میری سمجھ میں آیا کہ مجھے آگے بڑھنا ہو گا۔ میں خود سے نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے کوئی سمجھانے والا' کوئی استاد چاہیے۔ مجھے جمال دین کا خیال آیا۔ لیکن نہیں' مجھے معلوم ہے' وہ میری مدد نہیں کر سکتا۔

پھر اچانک مجھے اوتار سنگھ کے مولوی صاحب کا خیال آیا۔ میں نے سوچا' میں ان سے بات کروں گا اور سیکھوں گا۔ ابھی دو تین دن میں ہی وہ آنے والے ہیں۔ بس پھر یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میرے دل کو پورا سکون آ جائے گا۔'

تو پتاجی تقریباً مسلمان ہو چکے تھے۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔ کاش پتاجی مسلمان ہو گئے ہوتے۔

وہ اگلے اندراج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

'وہ لوگ بس آنے والے ہیں۔ آج نہیں تو کل ضرور آ جائیں گے۔ ایسا انتظار میں نے کبھی نہیں کیا۔ میں اپنے پتر کی صورت دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہوں...... بے قرار ہو رہا ہوں۔ اور مجھے مولوی صاحب کا بھی بڑی شدت سے انتظار ہے عجیب بات ہے۔ میں پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنے پتر سے ملنے کی خواہش زیادہ ہے یا مولوی صاحب سے ملنے کی۔ بیٹا تو مجھے جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اس وقت مولوی صاحب سے اکیلے میں ملنا اور ان سے بات کرنا مجھے زندگی کا سب سے اہم کام لگ رہا تھا۔

'آج میں نے پھر وہ سورۃ شروع سے آخر تک پڑھی' جس میں آسمان والی نشانی تھی۔ اس کی آخری عبارت نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کتاب والے نے کہا...... کیا تم نے سوچا کہ اگر تمہارا پانی خشک ہو جائے تو کون ہے جو تمہارے لیے چشمے کا پانی لائے۔

'میں جانتا ہوں کہ پانی سے زندگی ہے۔ شاید اسی لیے زمین پر خشکی سے زیادہ پانی ہے۔ لوگ اس کی قدر نہیں سمجھتے۔ لیکن ہم صحرائی لوگ خوب جانتے ہیں۔ میں پڑھا لکھا ہوں' سائنس میں مجھے دل چسپی تھی۔ اس لیے کتاب والے کے پانی کے فلٹر پلانٹ کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔

'یہ عبارت پڑھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ ایک دن ایسا ضرور آتا ہے' جب زمین پر پانی نہیں رہے گا۔ ویسے دیکھیں تو زمین پر پانی کی کمی نہیں۔ قطبین پر جو برف جمی ہے' وہ بہت زیادہ ہے۔ اتنی کہ پگھل جائے تو شاید ساری دنیا ڈوب جائے۔ میں سوچتا ہوں' شاید وہ کتاب والے نے ہنگامی صورت حال کے لیے ذخیرہ کر رکھا ہے۔

'میں سوچتا رہا کہ وہ بھی سوکھ جائے گا۔ اس پر سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ برسوں سے میرا مشاہدہ ہے کہ ہر آنے والے سال پچھلے سال سے زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ اور سمندر اتنی بڑی چیز ہے کہ گرمی سے خشک نہیں ہو سکتا۔

'میں نے سوچا' حقیقت تو صرف کتاب والا جانتا ہے۔ مگر نجانے کیسے مجھے یقین ہو گیا کہ

آخر وقت ایسا میں ضرور ہوگا کہ بہت کثرت سے بھونچال آئیں گے' اور بہت شدید گرمی پڑے گی۔ اب بھونچال بہت شدید ہو تو زمین میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ اور سمندر بھی تو زمین پر ہی ہیں۔ اگر اس زمین پر بہت شدید بھونچال آئے' جس پر کوئی سمندر ہو' اور بڑی بڑی دراڑیں پڑیں' اور اگر کتاب والے کی مرضی ہو اور سمندروں کا پانی زمین میں اتر جائے تو پانی تو ختم ہو جائے گا نا۔ اور گرمی بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ کیونکہ میرے خیال میں سورج کی گرمی کو سمندر ہی کم کر کے قابل برداشت بناتا ہے۔ اور جب سمندر خشک ہوں گے تو گرمی بڑھے گی پھر وہ برف پگھلے گی اور کچھ عرصہ اس سے کام چلے گا۔ پھر شاید پانی کا وجود ہی نہیں رہے گا۔

'یہ سب سوچتے ہوئے مجھ پر لرزہ چڑھنے لگا۔ کتاب والے اللہ کا سوال میرے ذہن میں ابھرا...... کون ہے جو تمہارے لیے چشمے کا پانی لائے؟ میں نے جان لیا' مان لیا کہ کوئی نہیں لاسکتا اس کے سوا۔ لوگ پانی کی تلاش میں کھدائی کریں گے تو بھی کھارا پانی ہی نکلے گا۔ جب سمندر ہی دھرتی میں اتر جائیں تو میٹھے پانی کا کیا کام۔

''یہ سب میرا قیاس تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں قیاس کرنے والا آدمی تو نہیں تھا۔ مگر پھر میری سمجھ میں آیا کہ قیاس سے پہلے میں نے غور کیا۔ پھر اپنی کم علمی کی وجہ سے قیاس کیا۔

'ایک بات طے ہوگئی۔ میں اللہ پر ایمان لے آیا ہوں۔ اور اس کی مہربانی ہے۔ اس نے مجھے بیٹا دیا تو ایسا کہ وہ مسلمانی کی حالت میں پیدا ہوا۔ پھر اس نے دودھ مسلمان عورت کا پیا۔ اس کے بعد میں نے خود دیکھا کہ وہ دہلی میں قرآن کو کیسا بے خود ہو کر سن رہا تھا۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا...... بزرگ اور جیوتشی دونوں نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اس کی مرضی چلے گی۔ تو شاید اللہ نے بیٹا دیتے ہی میرے لیے اس بھلائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

'اب تو بس میں بے چینی سے اپنے پتر اور مولوی صاحب کے آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کس کا انتظار زیادہ ہے......' اس کے بعد صرف دو اندراج تھے۔ عبدالحق نے ان میں سے پہلا اندراج بار بار پڑھا۔ وہ واقعی اس کے لیے بہت بڑی خوشی خبری تھی...... بہت بڑی' جیسے دل کی سب سے بڑی مراد اسے بن مانگے مل گئی ہو۔

اس نے بڑی حسرت سے سوچا' کاش میں ان لوگوں کے ساتھ ہی آ گیا ہوتا۔ کاش وہ سب کچھ میرے سامنے ہوا ہوتا۔ لیکن اس کی سمجھ میں آ گیا۔ ہر کام کا وقت اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ اگر وہ آ گیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ شاید وہ بھی مسلمان ہو جاتا۔ اور شاید شہید بھی۔ لیکن اللہ نے اس کے قبول اسلام کے لیے وقت اور مقام کچھ اور رکھا تھا۔ اور اسے زندہ بھی رہنا تھا۔ جو کچھ ہوا' اللہ کے حکم سے اس کے مقررہ وقت پر ہوا۔ اس میں حسرت کرنا بھی ناشکرا پن ہے۔ جبکہ یہ مقام شکر ہے۔

وہ اندراج اس کا دن کا تھا' جب مولوی صاحب گاؤں پہنچے تھے۔ وہ اکیلے ہی تھے۔ رکھو اور رنجنا ماسٹر جی کی بیماری کی وجہ سے نہیں آ سکے تھے۔ اللہ کو ان کی زندگی بھی منظور تھی۔ اندراج کے مطابق پتا جی مولوی صاحب کو اکیلا دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ پھر مولوی صاحب نے انہیں ماسٹر جی کی علالت اور اس کے پروگرام کے بارے میں بتایا تو وہ تردد کے باوجود مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے لکھا تھا...... شاید یہ اچھا ہی ہوا اب میں مولوی صاحب سے اکیلے میں بات کر سکوں گا۔ کون جانے' اوتار سنگھ موجود ہوتا تو میری راہ کی رکاوٹ بن جاتا۔ اب وہ آئے گا تو میں اسے سب کچھ بتا دوں گا۔

عبدالحق نے وہ پورا اندراج کئی بار پڑھا۔ اس تاسف کو مٹانے کی کہ وہ اس روز وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ صورت اس کے پاس موجود تھی کہ وہ اپنے تصور میں وہ سب کچھ دیکھے اور سنے جو اس روز ہوا اور کہا گیا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ تصور کے پردے پر فلم چلنے لگی۔ سماعت میں آوازیں گونجنے لگیں......

ٹھاکر پرتاپ سنگھ بہت بے تاب تھا۔ وہ ایسی بے تابی تھی کہ اس رات وہ وصال دین کی پرخلوص موجودگی کو بھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وصال دین آیا تو اس نے کہا۔ ''پتر وصال دین' ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانو گے؟''

وصال دین نے گھبرا کر کہا۔ ''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں آپ کی کسی بات کا برا کیسے مان سکتا ہوں۔''

''تو پتر' آج مجھے ایک بہت ضروری کام کرنا ہے۔ آج تم چلے جاؤ۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وصال دین نے کہا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو وہ بولا۔ ''بھائی...... میرا مطلب ہے' چھوٹے ٹھاکر نہیں آئے۔''

''نہیں پتر وہ میلا دیکھنے چلا گیا ہے۔ شاید کل آئے۔''

وصال دین کے چہرے پر ایک پل مایوسی کا تاثر ابھرا۔ مگر وہ فوراً ہی چلا گیا۔

رات کے کھانے کے بعد ٹھاکر مولوی صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ''کون ہے؟ آ جاؤ۔'' مولوی صاحب نے پکارا وہ کمرے میں داخل ہوا۔ مولوی صاحب بستر پر دراز تھے۔ اسے دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ''آپ ٹھاکر جی......؟''

''مولوی صاحب' مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔'' ٹھاکر نے کہا۔

''تو آپ مجھے بلا لیتے۔''

''نہیں مولوی صاحب' کام تو مجھے ہے اس لیے مجھے ہی آپ کے پاس آنا تھا۔''

''آپ بیٹھیے نا۔ فرمائیے' میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے۔''

"میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مولوی صاحب۔"

مولوی صاحب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

"میں آپ کے پاس مدد کے لیے آیا ہوں مولوی صاحب۔"

مولوی صاحب چونکے۔ "کیا آپ کو پورا یقین ہے؟" ان کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس فیصلے کی کوئی جذباتی وجہ ہے یا کوئی دنیاوی غرض؟"

ٹھاکر نے مولوی صاحب کو حیرت سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر عجیب سا جلال تھا اور لہجے میں دبدبہ۔ "جی نہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔"

"کچھ جانتے بھی ہیں آپ؟"

"زیادہ نہیں۔ بس اتنا ہے کہ میں نے قرآن میں ایسی واضح نشانیاں پڑھی ہیں، جنہیں کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ انہیں پڑھنے کے بعد کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔"

"مثلاً؟"

ٹھاکر نے انہیں سورۃ الملک کی اس آیات اور اپنے کھوج کے بارے میں بھی بتایا۔ پھر سورۃ الواقعہ کی آیات کے بارے میں بتایا۔ مولوی صاحب بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ ان کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ "میں تین دن سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ ان آیات کو پڑھنے کے بعد مجھ سے کسی طرح صبر نہیں ہو رہا تھا۔" اس نے آخر میں کہا۔

"اور جو ایمان پر پیدا ہوئے، وہ اس کتاب کو کھول کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کرتے۔ گھر میں خیر و برکت کے لیے طاق پر سجا کر رکھ دیتے ہیں اور جب یاد آئے تو چوم کر، آنکھوں سے لگا کر دوبارہ وہیں رکھ دیتے ہیں۔" مولوی صاحب نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "نہیں جانتے، نہیں سمجھتے بدنصیب کہ ایمان کے بعد ہر پل تجدید ایمان کی اور ایمان کو طاقت دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور قرآن اس کا واحد ذریعہ ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" ٹھاکر کے لہجے میں الجھن تھی۔

"کچھ نہیں۔ آپ پر اللہ نے رحمت فرمائی ہے۔ یہ بتائیں، آپ اللہ کو واحد اور احد مانتے ہیں۔ اس جیسا کوئی نہیں۔ نہ وہ کسی سے ہے اور نہ کوئی اس سے، اس نے سب کچھ پیدا کیا اور اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ یہ پوری کائنات اس نے بنائی۔"

"جی مولوی صاحب، میں نے جان لیا اور مان لیا۔"

"اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجے اور صحیفے اتارے۔ ان سب پیغمبروں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان ہے آپ کا۔"

"میں قرآن اور حضرت محمد ﷺ کے سوا کسی کے بارے میں نہیں جانتا۔ لیکن اللہ کا حکم ہے تو پہلے سے میں ان سب پر ایمان لاتا ہوں۔"

"سبحان اللہ، تب تو آپ پہلے ہی مسلم ہیں۔ اچھا، آپ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو مخصوص عمر عطا فرمائی ہے۔ مقررہ وقت پر اسے مرجانا ہے۔"

"جی، مجھے یقین ہے اس پر۔"

"اور یہ کہ ایک مقررہ وقت پر، جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ قیامت کا دن ہوگا۔ اس دن آدم علیہ السلام سے لے کر آخر تک پیدا ہونے والے تمام انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اور اعمال کا حساب ہوگا اور جنت دوزخ کا فیصلہ ہوگا۔"

"اللہ فرماتا ہے تو میں بالکل مانتا ہوں۔"

مولوی صاحب مسکرائے۔ "تو پڑھیے میرے ساتھ......"

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے کلمہ پڑھا۔ مولوی صاحب نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔ "مبارک ہو۔ اللہ نے آپ کو سیدھا راستہ دکھا دیا۔ آج سے آپ میرے، اور ہر مسلمان کے بھائی ہیں۔ مگر اب آپ کو نام تبدیل کرنا ہوگا۔"

"آپ ہی بتائیں۔"

مولوی صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔ "اللہ نے خاص عنایت کی۔ اپنے کلام کے ذریعے براہ راست آپ کو ہدایت دی۔ میرے نزدیک تو عبداللہ سے بہتر آپ کا کوئی نام نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا مطلب کیا ہے؟"

"اللہ کا بندہ۔"

"وہ تو میں ہوں۔" ٹھاکر مسکرایا۔ "بس اب میرا یہی نام ہے۔"

"آپ کو مبارک ہو۔"

ٹھاکر عبداللہ پریشان نظر آنے لگا۔ "میں ایک بات سے پریشان ہوں مولوی صاحب۔ قیامت کے دن جب حساب کتاب ہوگا تو میرے پاس گناہ بہت زیادہ ہوں گے اور اچھے عمل بہت کم۔ دیکھیں نا، میں تو عمر کے آخری حصے میں ہوں۔ پوری عمر تو گمراہی میں گزری۔ اب وقت تھوڑا ہے میرے پاس۔ اس میں کیا کر سکتا ہوں۔"

مولوی صاحب مسکرائے۔ "واقعی، اللہ نے آپ کو ایمان دیا ہے۔ فوراً ہی آخرت کی فکر کرنے لگے آپ...... مگر ابھی آپ اللہ کو نہیں جانتے۔ اس کی رحمت ایسی ہے کہ پوری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کی مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ ایسا بخشنے والا ہے کہ بندے کے گناہوں کا ڈھیر ہمالیہ کے پہاڑ سے بھی اونچا ہو تو اسے معاف کر دے۔ اور وہ ایسا پاک کرنے والا ہے کہ بندے کی توبہ

قبول کرے تو اسے معصوم بچے کی طرح پاک صاف کر دے۔ آج جس لمحے آپ اس پر ایمان لائے۔ اس سے پہلے کے تمام گناہ معاف کرنے کا اس کا وعدہ ہے۔ آج آپ نوزائیدہ بچے کی طرح پاک اور معصوم ہو گئے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" عبداللہ نے دھیرے سے کہا۔ لیکن وہ اب بھی متردد تھا۔ "پھر بھی مولوی صاحب، نیک عمل تو ضروری ہیں۔ آپ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں، جو اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہو۔ پوری زندگی کی تلافی تو بہر حال نہیں ہو سکتی۔ مگر قیامت کے دن کم از کم میں خالی ہاتھ تو نہ ہوں۔"

مولوی صاحب نے کہا۔ "ایک عمل ایسا ہے جو کئی زندگیوں کے نیک اعمال پر بھاری ہو سکتا ہے۔ وہ ہے جہاد۔ جہاد اللہ سے اپنی جان کا سودا کرنا ہے۔ اس کی راہ میں جان و مال سے لڑنا ہے۔ اس میں موت آ جائے تو شہادت کا رتبہ ملتا ہے۔ اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔"

"تو آپ گواہ رہیں مولوی صاحب، میں نے اللہ سے اپنی جان کا سودا کر لیا۔" ٹھاکر عبداللہ کے لہجے میں کامل یقین تھا۔

"اللہ مبارک کرے اور آپ کو استقامت عطا فرمائے۔"

"آپ مجھے نماز پڑھنا سکھائیں گے؟"

"جی...... میں صبح آپ کو نماز کے لیے اٹھا دوں گا۔"

"آپ کا شکریہ مولوی صاحب۔ میں نے آپ کو نیند کے وقت میں زحمت دی......"

"زحمت کیسی۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے۔" مولوی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے تو آپ کے ذریعے اللہ نے بہت بڑی سعادت عطا فرمائی شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا ہے۔"

عبدالحق چونکا۔ تصور کے پردے سے وہ منظر غائب ہو گیا، آوازیں معدوم ہو گئیں۔ باپ کی ڈائری اس کے سامنے تھی۔ وہ پڑھنے لگا......

آج پھر نیند نہیں آ رہی ہے۔ لیکن آج اس کی وجہ مختلف ہے۔ یہ نیند خوشی کی وجہ سے اڑی ہے۔ اتنا خوش تو بس میں اوتار سنگھ کی پیدائش پر ہوا تھا۔ اور اس رات بھی میں سو نہیں سکا تھا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔

اور ایک خوشی بھی آج ملنے والی ہے۔ آج شاید اوتار سنگھ بھی آ جائے۔ مگر اب میں کچھ پریشان ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ جب میں اسلام قبول کرنے کی خبر اسے سناؤں گا تو اس کا کیا ردعمل ہو گا۔ کیا پتا، وہ مجھ سے اختلاف کرے۔ کون جانے، وہ مجھے چھوڑ ہی دے۔ اور میں اس بڑھاپے میں منتوں مرادوں والے اکلوتے بیٹے سے محروم ہو جاؤں۔

'مگر ایک بات سے مجھے حوصلہ ہوتا ہے۔ اوتار سنگھ مجھے غیر معمولی حالات میں ملا تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد جو واقعات پیش آئے، وہ بھی غیر معمولی تھے۔ بلکہ شاید یوں ہے کہ یہ ایمان کی

دولت بھی مجھے اس کی وجہ سے ملی ہے۔ اس کا رجحان تو شروع ہی سے اسلام کی طرف تھا۔ مسلمان عورت کا دودھ پینے کی ضد، پھر اس کا عربی سیکھنا۔ ارے...... مولوی صاحب بھی تو مجھے اسی کی وجہ سے ملے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اس خبر سے ناراض نہیں، بلکہ خوش ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔

'لیکن ایسا نہیں ہوا تو بھی کوئی بات نہیں۔ میں اللہ کی خاطر اس بیٹے کو بھی چھوڑ دوں گا، جو میرے لیے وجہ زندگی ہے۔ اور اسے چھوڑ دوں گا تو سانس لینے کے سوا سبھی کو چھوڑ دوں گا۔ میں کسی لمبے سفر پر نکل جاؤں گا، اور کہیں نہیں رکوں گا، ابھی نہیں رکوں گا۔

'مجھے لگتا ہے کہ اب نیند نہیں آئے گی۔ نماز کے لیے میں ہی مولوی صاحب کو جگاؤں گا۔ اور نماز کے بعد میں دعا کروں گا کہ اوتار سنگھ بھی مسلمان ہو جائے' عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بے شک وہ اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی، جو اس کے خواب و خیال میں نہیں تھی۔

خوشی اور شکر کے ان آنسوؤں کو نہ وہ روکنا چاہتا تھا اور نہ پونچھنا چاہتا تھا۔ یہ تو ناشکرا پن ہوتا۔ پھر آنسو رکے تو وہ ڈائری کے آخری اندراج کی طرف متوجہ ہوا۔

'آج میں وقت سے پہلے ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے پتر پر قربان ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس کے بعد میں کبھی ڈائری نہیں لکھ سکوں گا۔

'ابھی کچھ دیر پہلے کیدار ناتھ کے پتر دو مرتبہ مجھ سے ملنے آئے۔ وہ جے پور سے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے چھوٹے ٹھاکر کی جان کو خطرہ ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے وجہ بتائی۔ اور وہ وجہ سن کر میرا دل خوش ہو گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اوتار سنگھ نے جے پور کے بڑے مندر کے تمام بت توڑ ڈالے ہیں۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ اس میں کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں۔ تب میرا جی چاہا کہ میں ہنسوں بڑی مشکل سے میں اپنی مسکراہٹ دبا سکا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ہم دونوں کو منزل ملنے والی ہے۔

"میں نے انہیں بتایا کہ اوتار سنگھ تو ابھی واپس ہی نہیں آیا۔ انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جے پور سے بڑی تعداد میں مشتعل لوگ ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا ہم ان سے مقابلے کی تیاری کریں گے اور لڑیں گے۔

'میں نے گاؤں کے تمام لوگوں کو بلوا لیا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ میری آخری آزمائش ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ گاؤں والوں سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ انہیں بتا دوں گا کہ اوتار سنگھ پر کیا الزام ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد بڑی تعداد میں لوگ میرا ساتھ چھوڑ دیں گے لیکن ضرورت پڑی تو میں تن تنہا لڑوں گا اور آخری سانس تک لڑوں گا۔

'اگر میں نے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ اپنے مسلمان ہونے کی خبر سب سے پہلے اوتار سنگھ کو سناؤں گا' تو آج گاؤں والوں کے سامنے اعلان کر دیتا۔ مجھے خوشی ہے کہ رات میں نے اللہ سے اپنی جان کا سودا کیا اور اس سے اگلے دن ہی مجھے جہاد کا موقع دے دیا۔ اپنے دل کی بات میں جانتا ہوں۔ میں اپنے بیٹے کے دفاع کے لیے نہیں لڑوں گا۔ میں اللہ کی راہ میں لڑوں گا۔' اور جان دے دوں گا۔ بس میری دعا ہے کہ اللہ اس موت کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے۔

'مجھے اس بات کا افسوس ہے۔ میں نے اپنے بارے میں جو سوچا تھا اور فیصلہ کیا تھا' اب مجھے اس بات پر عمل کرنے کی مہلت نہیں مل سکے گی۔ صرف اس لیے کہ اوتار سنگھ واپس نہیں آ سکا۔ مگر ساتھ ہی مجھے دو باتوں کی وجہ سے اوتار سنگھ کے نہ آنے خوشی ہے ایک تو یہ کہ وہ آتا تو میری لڑائی میں ذاتی غرض شامل ہو جاتی۔ دوسرے یہ کہ اب میری نسل آگے بڑھ سکے گی۔ اور اللہ نے چاہا تو اوتار سنگھ بھی مسلمان ہو جائے گا اور جس سیدھے راستے پر اللہ نے مجھے ڈالا ہے' میری نسلیں اس پر آگے بڑھیں گی۔

'جس دن اوتار پیدا ہوا تھا' مجذوب نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔ آج وہ بات مجھے رہ رہ کر یاد آ رہی ہے۔ مجذوب نے کہا تھا...... جان دے دینا اس کے لیے' پھر تیرا کھوٹا سکہ بھی اشرفی کے مول چل جائے گا۔ آج مجھے لگ رہا ہے کہ وہ بات پوری ہوگی۔ اور یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرا کھوٹا سکہ اشرفی کے مول چل چکا ہے۔

'اب گاؤں کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ میں ڈائری بند کرتا ہوں۔'

اس کے بعد ڈائری کے صفحات سادہ تھے۔

عبدالحق ہاتھ میں ڈائری لیے دیر تک ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ ذہن میں خیالات کی ایسی یلغار تھی کہ وہ کچھ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان خیالات کو کیسے ترتیب دے اور کیسے مرتب انداز میں سوچے۔ دماغ اس وقت ایک ایسے بڑے گھر کی طرح تھا' جہاں سب کچھ بکھرا ہوا' کوئی ترتیب نہ ہو اور گھر کا مالک اسے سنوارنے کا ارادہ کرنے کے بعد اس بے ترتیبی کو دیکھ کر یہ سوچ رہا ہو کہ شروع کہاں سے کرے۔

اس بے بسی میں اسے نماز کا خیال آ گیا۔ اسے تو شکر کے نفل پڑھنے تھے۔

❀......❀......❀
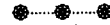
وہ یقیناً مبارک خبر تھی۔ کافی عرصے کے بعد اس نے وقت پر فجر کی نماز پڑھی تھی۔ اور وہ ایسا خوش تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتا دے۔ کم از کم اماں کو تو وہ یہ خبر سنانا چاہتا تھا لیکن اسے لگتا تھا کہ ابھی اسے ذاتی طور پر ایک بیٹے کی حیثیت سے اس پر سوچنا ہے۔

نماز کے بعد ذہن میں انتشار بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ سکون

سے سوچنا چاہتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اسے اپنی یادوں کو کریدنا ہے۔ کچھ اہم باتیں ہیں' جو وقت پر نہیں سمجھ سکا تھا۔

اسے یاد آیا کہ وہ چھٹیوں میں گھر آیا تو ایک رات پتاجی کے کمرے میں گیا۔ وہ بیٹھے ڈائری میں کچھ لکھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انہوں نے قلم روکا اور ڈائری ایک طرف رکھ دی۔

تو پتاجی کا صراط مستقیم کا سفر اس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

پھر وہ رات' جب مٹی ہٹانے کے بعد حویلی برآمد ہوئی تھی' اور نور بانو نے پتاجی کی کتابوں اور ڈائریوں کو دیکھ کر حیرت سے کہا تھا کہ یہ سب تو دینی کتابیں ہیں۔ اور اس نے حیرت سے دیکھا تھا تو ان کتابوں میں اسے قرآن پاک کا ایک مترجم نسخہ بھی نظر آیا تھا۔

اور نور بانو نے براہ راست اس سے پوچھا تھا...... کیا آپ کے والد مسلمان تھے؟ اور اس نے بے خبری کا اظہار کیا تھا۔ اور اماں نے کہا تھا...... میں نے تو ان میں بہت ساری باتیں اچھے مسلمانوں والی دیکھی تھیں۔

اب وہ سوچ رہا تھا...... نور بانو نے ٹھیک کہا' وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا' غافل اور بے خبر آدمی ہے۔ پتاجی کی کتابوں میں قرآن پاک کا ہونا ایسی غیر معمولی بات تھی کہ اسے اس معاملے میں تجسس کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس نے تو اتنے طویل عرصے تک ان کتابوں کی خبر بھی نہیں لی۔ بلکہ وہ اسے یاد تک نہیں آئیں۔

خیر...... یہ اس غفلت کی سزا ہے کہ یہ خوشی موجود تھی اور وہ اتنے عرصے اس سے محروم رہا۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ اسے یہ خوشی مل گئی۔ اور یہ سزا ہے کہ وہ عبداللہ کا بیٹا ہونے کے باوجود اپنے باپ کا نام ہٹا کر اوتار سنگھ لکھتا رہا۔

شرمندگی اور دکھ نے اسے بے حال کر دیا۔ اپنی بے پروائی اور خود پرستی میں گم ہو کر کیسی محرومی کمائی تھی اس نے۔

اب پچھتانے کا کیا حاصل۔ اس نے سوچا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ پتاجی سے آخری ملاقات بہت اہم تھی۔ اس اہمیت کا احساس تو اسے ہمیشہ رہا تھا۔ لیکن وہ کبھی اسے سمجھ نہیں پایا تھا۔ مگر اب جبکہ اس پر یہ بات کھل چکی تھی کہ پتاجی مسلمان ہو گئے تھے' تو شاید وہ بہت سی ایسی باتیں سمجھ سکتا تھا' جو پہلے نہیں سمجھ سکا تھا۔

پتاجی کے ساتھ گزرے ہوئے آخری لمحے آج بھی اسے تمام ترین جزئیات کے ساتھ یاد تھے۔ خون بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ بلکہ وہ تو شاید اسی کے انتظار میں جی رہے تھے۔ ان میں بات کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ لیکن وہ اس سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتے تھے...... اور وہ انہوں نے ٹوٹے لفظوں میں کی تھیں۔

پتاجی نے کہا تھا کہ وہ بچیں گے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کا سب کچھ اسی کا ہے۔ پھر لال آندھی کے آثار دیکھ کر انہوں نے اسے نکل جانے پر اصرار کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا' دہلی جا کر پڑھو۔

پھر انہوں نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا جے پور میں بت واقعی اس نے ہی توڑے تھے۔ اور وہ مرتے ہوئے باپ کو دکھ میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اعتراف کر لیا تھا لیکن اس کے لیے پتاجی کا ردِعمل حیرت انگیز تھا۔ وہ خفا نہیں ہوئے تھے' بلکہ خوش ہوئے تھے۔ اس وقت وہ اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ اتنے خوش ہوئے تھے کہ انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

اب وہ یہ بات سمجھ سکتا تھا۔ ڈائری نے بھید کھول دیا تھا۔ ایک نومسلم باپ کو پتا چلے کہ اس کے غیر مسلم بیٹے نے بت ڈھائے ہیں تو وہ کتنا خوش ہوگا۔ یہ بات وہ اب سمجھ سکتا تھا۔

پھر پتاجی نے کہا تھا کہ وہ اسے ایک بڑی بات بتانا چاہتے تھے لیکن اب ان کے پاس مہلت نہیں ہے۔ کل تک وہ اس بات پر متاسف تھا کہ وہ بڑی بات اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔ لیکن آج ڈائری نے وہ بات بھی اسے بتا دی تھی۔ اور واقعی بڑی بات تھی۔ پتاجی اسے بتاتے کہ وہ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اور وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر اس کا ردعمل منفی ہوا تو وہ اپنے عزیز از جان بیٹے کو اللہ کی خاطر چھوڑ کر چلے جائیں گے' اور تنہائی کی زندگی گزاریں گے۔ اگر انہیں موقع ملا ہوتا تو وہ اسے اس بات پر خوش دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔

پھر پتاجی نے ٹوٹے لفظوں میں کہا تھا...... جلانا نہیں' دفن کرنا۔ اور اس نے سمجھا تھا کہ یہ بات انہوں نے چاچاجی اور ویرجی کے لیے کہی ہے۔ مگر اب وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے لیے کہہ رہے ہیں۔

اس وقت وہ بہرحال نہیں سمجھ سکا تھا۔ آندھی نہ آتی اور اسے موقع ملتا تو وہ یقیناً ان کی چتا کو آگ دیتا...... ماسٹرجی کی طرح اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ لال آندھی اللہ کی رحمت تھی۔ اللہ نے اپنے ایمان لانے والے بندے کو دنیا میں بھی آگ میں جلنے کی رسوائی سے بچا لیتا تھا' اور انشاءاللہ قیامت کے دن بھی اسے آگ سے بچا لے گا۔ اللہ نے خود اپنے نومسلم بندے کی تدفین کا بندوبست کر دیا تھا۔

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے آنسو پونچھ دیے۔ اب صرف آخری لمحہ بچا تھا' جو اہم ترین تھا۔ اس لمحے میں ان کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ وہ اس لمحے انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں کی جنبش اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کیں' اور تصور میں وہ جیتا جاگتا منظر اس کے سامنے تھا۔ بے آواز ہلتے ہوئے وہ ہونٹ!

ایک خیال کے تحت وہ اٹھا اور سنگھار میز کے آئینے کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے

عکس پر نظریں جمائیں اور کلمہ پڑھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ اس نے کئی بار کلمہ پڑھا اور اپنے ہونٹوں کی جنبش کو ذہن نشیں کرتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں اور پتاجی کے آخری لمحے کا تصور کیا۔

شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ آخری معما بھی حل ہو گیا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اس کے پتاجی نے مرتے وقت آخری کام یہ کیا تھا کہ کلمہ پڑھا تھا۔

اب ڈھکا چھپا کچھ نہیں تھا۔ سب کچھ کھلی کتاب کی طرح تھا۔ اس کے پتاجی مسلمان مرے تھے اور یہ بات صرف اس کے اپنے یقین کی نہیں تھی۔ دستاویزی ثبوت بھی موجود تھے۔ وہ پوری دنیا پر ثابت کر سکتا تھا۔

اس بار وہ رویا تو کھل کر رویا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ دکھ میں لپٹی ہوئی وہ خوب صورت خوشی اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھی۔

اور جب طوفان تھما تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ تمام کاغذات میں اپنی ولدیت درست لکھوائے گا۔ ڈائری کی موجودگی میں یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بس اسے لاہور جا کر مسعود صاحب سے ملنا تھا۔

لیکن سب سے پہلے اسے یہ خوش خبری اماں کو' اور پھر زبیر اور رابعہ کو سنانی تھی۔

❁......❁......❁

ٹھاکر عبدالحق کی ڈائری سے عبدالحق کو دہرا فائدہ ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ اسے بہت بڑی خوشی ملی تھی۔ دوسری نوربانو سے شادی کی خواہش کا تعلق کہیں پیچھے چلا گیا تھا۔ اس پر اپنی ولدیت درست کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔

چنانچہ وہ حمیدہ سے اجازت لے کر لاہور چلا گیا۔

لاہور میں بھی اسے ایک یہی کام نہیں تھا۔ اسے مسعود صاحب کا قرض بھی اتارنا تھا۔ دوسرے اس نے سوچا تھا کہ ایک کار بھی خریدنی ہے۔ اس سہولت کی اب اسے ضرورت تھی۔

مسعود صاحب واقعی اسے دل سے چاہتے تھے۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ اب وہ کیمپ میں نہیں تھے۔ ملٹری اکنامک ڈویژن میں بہت اہم عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ان کی وجہ سے عبدالحق کا کام بہت آسان ہو گیا۔ ٹھاکر عبداللہ کی ڈائری کے متعلقہ صفحات کی نقول تیار کی گئیں اور مسعود صاحب نے ان پر تصدیقی دستخط ثبت کر دیے۔ اس کے بعد تمام کاغذات دوبارہ تیار ہوئے۔ یوں عبدالحق کی ہر دستاویز پر اس کی ولدیت کے آگے عبداللہ کا نام لکھ دیا گیا۔

اب وہ عبدالحق ابن عبداللہ تھا!

اس کا قیام اس بار مسعود صاحب کے گھر پر تھا۔ ان کے اصرار کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔ لیکن دن میں وہ کیمپ ضرور جاتا تھا۔ اور کبھی وہ پرانے انداز لاہور کی سیر بھی ضرور کرتا تھا۔

ایک بار وہ افضال صاحب سے ملاقات کے لیے بھی گیا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ان کی ذہنی حالت اور بگڑ گئی تھی۔

اس شام مسعود صاحب نے اس سے کہا۔ ''لو بھئی' تمہارے تو سب کام ہو گئے۔''

''سب کہاں ہو گئے چچا جان۔'' اس نے کہا۔ یہ چچا جان بھی مسعود صاحب کا اصرار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ سر میں بڑی اجنبیت ہے۔

''تو مجھے بتاؤ نا۔''

اس نے کار کے متعلق بات کی۔ اور اگلے دن اسے کار بھی مل گئی۔ ایک دن میں کاغذی کاروائی بھی مکمل ہو گئی۔

''اب مجھے ایک ڈرائیور بھی چاہیے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اس کی تم فکر ہی نہ کرو۔ میں نے پہلے ہی سے دیکھ رکھا ہے۔''

یوں عبدالحق کی ملاقات یعقوب سے ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے کام میں طاق تھا۔ بیس سال کسی بڑے انگریز افسر کی ڈرائیوری کر چکا تھا۔ ہر طرح کی گاڑی چلا سکتا تھا۔ اور سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ انگریزوں کا عاشق تھا۔ اس حد تک کہ اپنا نام وہ یعقوب کی جگہ جیکب بتاتا تھا۔

''اتنا اچھا نام ہے تمہارا' تو اسے بگاڑتے کیوں ہو؟'' عبدالحق نے اس سے کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے اس بات سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ وہ خود تو نام کی اہمیت بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کی دو پشتیں پرانے نام چھوڑ کر نئے اور اچھے ناموں کی طرف آئی تھیں۔

''یہ بگاڑ کہاں ہے سر جی۔ اردو میں یعقوب ہے تو انگریزی میں جیکب۔''

''اردو میں نہیں' عربی میں۔'' عبدالحق نے تصحیح کی۔ ''یہ نام تو قرآن میں آیا ہے' اور ایک بہت بڑے پیغمبر کا ہے۔ ایسے پیغمبر کا جن کی اولاد میں نبوت چلتی رہی۔ وہ اسرائیل تھے' اور ان کی نسبت سے بنی اسرائیل کہلاتے ہیں۔''

''تو سر جی' اس پیغمبر کو انگریزی میں جیکب کہتے ہیں۔''

''تمہارے لیے انگریزی عربی کے مقابلے میں قابل قبول ہے؟'' عبدالحق کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

یعقوب کو اس کے صدمے کا احساس ہوا تو دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا۔ ''توبہ سر جی' میری توبہ۔ عربی تو سر جی اللہ اور رسول کی زبان ہے۔ پر مجھے آتی نہیں ہے نا۔''

''اور انگریزی آتی ہے تمہیں؟''

یعقوب نے سینہ پھلا لیا۔ ''بیس سال خدمت کی ہے گورے صاحب کی۔ پڑھے لکھوں سے

اچھی کٹ پھٹ کر لیتا ہوں انگریزی میں۔''

عبدالحق کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس نے بوتل میں قید جن کو آزاد کر کے بڑی مصیبت مول لی ہے۔ اسے بہرحال دکھ ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کچھ بھی ہو' میں تو تمہیں یعقوب ہی کہوں گا۔''

''مجھے برا نہیں لگے گا سر جی۔'' یعقوب نے گویا مروت سے کام لیا۔

اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو مسعود صاحب بولے۔ ''ابھی تو تم سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کر پایا ہوں میں۔ یہ بتاؤ لاہور آنے کا پروگرام کب کا ہے۔''

''وہ تو شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ممکن ہوگا۔ یہ بتائیں' آپ نے میرے لیے کیا سوچا ہے؟''

''پہلے تو تم یونیورسٹی میں داخلہ لو گے' بی اے کرو گے۔ پھر مقابلے کے امتحان میں بیٹھو گے۔''

''اور کامیاب نہیں ہوا تو؟''

''مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔ خیر یہ بعد کی بات ہے۔ یہ بتاؤ' اپنے بنگلے پر نہیں جاؤ گے۔''

''اب تو میں گھر جانے کو بے چین ہو رہا ہوں۔ چچا جان۔''

''دیکھتے تو دل خوش ہو جاتا تمہارا۔ میں نے مالی کا بندوبست کر دیا تھا۔ اب باغیچے کو دیکھو گے تو دیکھتے رہ جاؤ گے۔''

''اگلی بار سہی۔''

''ایسا نہ کرو' شادی سے پہلے ایک بار سب لوگوں کو بنگلہ دکھانے کے لیے لے آؤ۔ اس میں ایک سہولت اور ہوگی۔ شادی کے معاملات اور ضروریات تم عورتوں سے زیادہ بہتر طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ خواتین یہاں خریداری بھی کر لیں گی۔''

یہ بات عبدالحق کے دل کو لگی۔ اس نے وعدہ کر لیا۔

❁......❁......❁
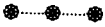
اصل میں وہ گاڑی کی وجہ سے زیادہ بے تاب ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اماں گاڑی میں بیٹھیں گی تو انہیں کتنی خوشی ہوگی۔ ان کے لیے تو وہ انوکھی بات ہوگی۔ اور نور بانو......!

کئی دن بعد اسے نور بانو کا خیال آیا تھا۔ اور خیال آیا تو اس کی بے تابی اور بڑھ گئی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اُڑ کر پہنچ جاتا۔ اپنی گاڑی میں بھی وہ سفر اسے لمبا لگ رہا تھا۔ اسے خیال نہیں آیا کہ گاڑی کی وجہ سے وہ کتنی زحمتوں سے بچ گیا ہے۔

گھر پہنچتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس بار تھکن بالکل نہیں ہوئی ہے۔ شاید ایسا گاڑی کی خوشی کی وجہ سے تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ گھر پہنچتے ہی اماں کو اور سب لوگوں کو سیر کے لیے لے کر نکلے گا۔

''لیکن وہاں تو نقشہ ہی کچھ اور تھا!

کبھی اللہ کی رحمت ہو تو خوشیاں بھی یوں پیہم اور مسلسل آتی ہیں کہ لگتا ہے' قطار لگائے کھڑی

ہے' اور اب دروازے سے اندر آنے کو بے تاب ہو رہی ہیں۔

اس افرا تفری میں وہ اماں سے یہ کیسے کہتا کہ وہ اس کے ساتھ چلیں۔ اماں تو مصلے پر بیٹھی دعا کر رہی تھیں۔

چند گھنٹے بعد حق نگر کی فضا میں پہلے نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز ابھری۔ حق نگر نام کے قصبے میں' اور پاکستان کے بعد اس علاقے میں وہ پہلی ولادت تھی۔

زبیر بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ عبدالحق کے پاس آیا۔ ''صاحب مبارک ہو۔ بیٹا ہوا ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔ اللہ' اسے سب کے لیے مبارک کرے۔'' عبدالحق نے دل کی گہرائی سے کہا۔ وہ اس کے لیے بہت بڑی خوشی تھی۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کی پیدائش پر بابا جی کتنے خوش ہوئے ہوں گے۔ ''تم نے دیکھا اسے؟ کیسا ہے وہ؟ کس کی صورت ہے؟'' اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا دیکھا صاحب۔ میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ اسے سب سے پہلے آپ دیکھیں گے۔ اور آپ ہی اس کے کانوں میں اذان دیں گے۔ اور آپ ہی اس کا نام رکھیں گے۔ پہلے وہ آپ کا ہے' بعد میں ہمارا۔''

عبدالحق کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وفاداری کا یہ کیسا اٹوٹ رشتہ تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ محبت اور وفاداری مل کر کیسے دو آتشہ ہو جاتی ہیں۔

وہ زبیر کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف گیا۔ حمیدہ' زرینہ اور نور بانو دروازے پر کھڑی تھیں۔ ''آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں اماں؟ اندر چلیں نا۔'' اس نے حمیدہ سے کہا۔

''نا پتر' پہلے تو اُس کے کان میں اذان دے پھر ہم اندر آئیں گے۔ اور اسے دیکھیں گے۔''

اور اس کے مسلسل اصرار کے باوجود حمیدہ نہ مانی تو وہ اندر چلا گیا۔ پہلے اس کی نظر رابعہ پر پڑی۔ وہ بے سدھ سو رہی تھی' جیسے کوئی شدید تھکن کے بعد سوتا ہے۔ اور اس کے چہرے پر سکون ہی نہیں' عجیب سا نور بھی تھا۔

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ زبیر پیچھے کھڑا تھا۔ ''کیا بات ہے۔ آگے کیوں نہیں آتے تم؟'' اس نے کہا۔

''آپ اس کے کان میں اذان دیں تو میں آگے آؤں۔ میں اس سے پہلے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔''

عجیب محبت ہے' عجیب وفاداری ہے' عجیب منطق ہے۔ عبدالحق کچھ جھنجلایا۔ مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ اس نے رابعہ کے پہلو میں لیٹے ہوئے ننھے سے بچے کو دیکھا' جو ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

''میں اسے کیسے اٹھاؤں۔ یہ تو اتنا سا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اتنا نازک سا ہے یہ۔''

''کوئی بات نہیں صاحب۔ اٹھائیں گے تو سیکھ جائیں گے۔ اچھا ہے' مشق ہو جائے گی۔'' زبیر بولا۔

عبدالحق شرما گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی احتیاط سے کپڑے میں اچھی طرح لپٹے ہوئے بچے کو اٹھایا اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ ابھی یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کس سے ملتا ہے۔ وہ تو بڑے کچے نقوش تھے' جیسے گیلی مٹی سے بنے ہوئے برتن سوکھنے سے پہلے ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اسے بتایا تھا کہ بچے کے کانوں میں اذان کیسے دی جاتی ہے۔ اس نے بچے کے کان سے ہونٹ ملائے۔ اور دھیمی آواز میں اذان دینے لگا' انداز ایسا تھا کہ کوئی تلقین کر رہا ہو۔

پھر اس نے بچے کی پیشانی اور دونوں رخساروں کو چوما۔ اور زبیر کو پکارا۔ ''اب تو آ جاؤ زبیر بھائی۔''

زبیر آگے آیا تو اس نے بچے کو اس کی گود میں دیا۔ زبیر چند لمحے بچے کی صورت دیکھتا رہا' پھر اس کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہنے لگے۔ ''الحمدللہ' میرا بچہ مسلمان ہے۔''

''الحمدللہ۔''

حمیدہ بھی دونوں لڑکیوں کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔ وہ تینوں بچے کے ساتھ مصروف ہو گئیں۔ سب بہت خوش تھے۔

''اب آپ اس کا نام رکھ دیں صاحب۔''

''ابھی...... اسی وقت۔''

زبیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عبدالحق سوچتا رہا۔ ایسے کیسے نام رکھا جا سکتا ہے۔ اس نے بے بسی سے سوچا۔ مگر اس لمحے اس کے ذہن میں ایک نام آ گیا۔ ''تو اس کا نام ساجد ہے...... ساجد زبیر۔ اور یہ انشاءاللہ اپنے رب کے حضور بہت سجدے کرنے والا ہوگا۔''

''یہ آپ کا مجھ پر ایک اور احسان ہے صاحب۔''

''اچھا' اب چلو۔ مٹھائی کا بندوبست کرنا ہے۔ پورے علاقے میں مٹھائی تقسیم کریں گے ہم۔''

❁......❁......❁

خوشی کے ہر نئے کھلنے والے دروازے کے پیچھے ایک نئی خوشی کا دروازہ تھا۔ ننھا ساجد عبدالحق کے لیے حیران کن حد تک بہت بڑی خوشی تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے زندگی میں کبھی کوئی بچہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا بچہ تھا' اور اسے پہلی ہی نظر میں اس سے محبت ہو گئی تھی۔

وہ اس کے لیے خاص طور پر وقت نکالتا۔ اس کی نزاکت سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس لیے وہ اسے گود میں تو نہیں اٹھاتا تھا۔ البتہ وہ تمام وقت بیٹھ کر اسے تکتا رہتا۔

تو یہ ہے نئی زندگی کا آغاز' اللہ کا کرم۔ وہ سوچتا۔ اسے پتاجی کی ڈائری کے حوالے سے سورۃ الواقعہ کی آیت یاد آئی۔ تم نے اسے پیدا کیا ہے یا ہم ہیں پیدا کرنے والے۔

اور ساجد کے حوالے سے وہ پہلی بار پروردگار کا مفہوم سمجھ رہا تھا...... پالنے والا۔ پہلے پیدا کرنے والا اور پھر پالنے کی صفت بھی صرف اللہ کی ہے۔ وہ نہ پالے تو کوئی بچہ بڑا نہیں ہو سکتا۔

وہ اس ننھے سے بچے کو دیکھتا۔ اسے احساس ہوتا کہ یہ بچہ کتنا بے بس ہے۔ ہاتھ پاؤں چلانے' رونے' مسکراہٹ' اور پیشاب پاخانہ کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی تکلیف' اپنی کوئی ضرورت بتا نہیں سکتا۔ پھر بھی اس کی سب ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔

ادھر اسے رابعہ پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ وہ نجانے کیسے بچے کی ہر ضرورت سمجھ لیتی تھی۔

"یہ کیوں رو رہا ہے؟" وہ پوچھتا

"اسے بھوک لگی ہے۔" رابعہ کہتی۔ "میں ابھی اسے دودھ پلا کر لاتی ہوں صاحب۔"

پھر عبدالحق کو بچے کی طمانیت بھری آواز سنائی دیتی' جس سے خوشی چھلک رہی ہوتی' اور رونا موقوف ہو چکا ہوتا۔

عبدالحق نے سوچا' شاید بچے صرف بھوک کے اظہار کے لیے روتے ہیں لیکن ایک دن اس کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ اس روز ننھا ساجد بلک کر رو رہا تھا۔ "آپا...... اسے دودھ پلا دو نا۔"

رابعہ بچے کے پاس آئی۔ چند لمحے کے بعد اس نے کہا۔ "یہ بھوک کا رونا نہیں ہے صاحب۔ اسے کوئی تکلیف ہے۔"

عبدالحق یہ سن کر تڑپ گیا۔ "تو چلو' ڈاکٹر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔ "نہیں صاحب' اسے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر وہ بچے کے جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر جیسے کچھ جانچنے لگی۔ پیٹ پر دباؤ پڑتے ہی بچہ خاموش ہو گیا۔ "پتا چل گیا صاحب' اس کے پیٹ میں درد ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

"دیکھیں نا' پیٹ پر دباؤ ڈالنے سے اسے آرام ملا اور یہ چپ ہو گیا۔"

"تو اب ڈاکٹر صاحب......"

"ارے نہیں صاحب' ابھی اسے پھکی دوں گی اور یہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمہیں یہ سب کیسے پتا چل جاتا ہے آپا کہ یہ کب کس وجہ سے رو رہا ہے۔"

رابعہ شرما گئی۔ "یہ تو مجھے پتا نہیں بھائی۔ بس دل کو نجانے کیسے پتا چل جاتا ہے۔"

دل سب کچھ جانتا ہے۔ عبدالحق نے سوچا دل ہی تو حق شناس ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ رجوع کرنے والا دل ہو۔ اور بچے کے معاملے میں ماں سے زیادہ سچا دل کس کا ہو سکتا ہے۔ اور اس کا دل رجوع کرنے والا نہ ہی ہو' تو بھی اللہ اس پر حکومت آتا اتارتا ہے۔ کیونکہ وہ پروردگار ہے' اور بچے کو پالنا اور بڑا کرنا اس نے اپنے ذمے لیا ہے۔

عبدالحق ساجد کو دیکھتا اور پھر اپنے بارے میں سوچتا۔ میں بھی ایسا ہی رہا ہوں گا۔ بے بس اور لاچار' اپنی کوئی ضرورت پوری کرنا تو کیا' اس کے بارے میں کسی کو بتانے کے قابل بھی نہیں ہوں گا۔ پھر میں بڑا ہوا۔ میں نے چلنا سیکھا۔ بولنا سیکھا۔ اللہ بہ تدریج مجھے طاقت عطا فرماتا رہا۔ میرا قد' میرا جسم' میرے تمام اعضا تناسب کے ساتھ بڑھاتا رہا۔ اب میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ یہ کتنا بڑا کرم ہے اس کا۔

ساجد کا عقیقہ بھی بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

اب عبدالحق کو ایک اور خوشی کا کھلا ہوا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اب نور بانو سے اس کی شادی کچھ ہی دنوں کی بات تھی۔ یہ خیال آتے ہی نور بانو کے تصور کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جڑ گیا۔ لیکن ساجد سے اس کا تعلق پھر بھی قائم رہا۔ وہ اس کے لیے خاص طور سے وقت نکالتا تھا۔ رابعہ بچے کو دودھ پلا کر اس کے کمرے میں لاتی اور اس کے پاس چھوڑ کر چلی جاتی۔ وہ بیٹھا بچے کو تکتا اور سوچتا رہتا۔ اس کے حوالے سے زندگی کو اور اللہ کی عنایات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا۔

وہ سوچتا کہ انسان اور درخت میں کتنی مماثلت ہے...... بلکہ فصلوں میں بھی۔ دونوں کا آغاز بیج سے ہوتا ہے۔ پھر دونوں ننھے سے کلے کی طرح اگتے ہیں۔ ذرا سی ہوا' غذا میں ذرا سی کمی سے مرجھا جانے والے۔ ان کی نگہ داشت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور بے شک پالنے والا تو اللہ ہے۔ اس کی مرضی ہو گی تو کلا اور بچہ دونوں بڑے ہوں گے۔ کلا تناور درخت بن جائے گا اور بچہ جوان مرد۔ اللہ نے سسٹم بنایا نظام قائم کیا۔ نہ براہ راست درخت پیدا فرمایا اور نہ جوان مرد اور عورت۔ تو بے بسی کے اس عرصے میں نگہ داشت کے لیے اس منتظم اور مسبب الاسباب نے ماں باپ کو اور کسان کو یہ ذمہ داری سونپی۔ اور یہاں کیونکہ صرف فرض شناسی کافی نہیں تھی' اس لیے اپنی جناب سے محبت سونپی۔ اللہ ودود ہے۔ محبت کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ اس محبت کا بقدر ضرورت ایک حصہ اس نے ماں کو اور باپ کو اور کسان کو ودیعت فرما دیا۔

بہ قدر ضرورت!

تو سب سے زیادہ محبت ماں کو ملی۔ نرمی ہی نرمی' گداز ہی گداز۔ کیونکہ ہمہ وقت اسے بچے کی نگہداشت' اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا تھا۔ اس کی آغوش کی محبت بھری حدت سے بچے کو زندگی کی توانائی ملتی تھی۔ تو ماں بچے کے لیے صرف اور صرف محبت بن گئی۔ اور باپ کو اس کی مادی

ضرورتوں کے وسائل فراہم کرتا تھے۔ اس کو محبت بہت عملی نوعیت کی ملی' اور اس میں سختی بھی تھی۔ کیونکہ بچے کے بڑے ہونے پر تربیت اس کی ذمہ داری تھی۔ ماں کو تو صرف لاڈ پیار کرنا تھا۔ باپ کو تربیت بھی کرنی تھی' اور بچے کو سیدھے راستے پر چلانا بھی تھا۔

عبدالحق کو اپنے پتاجی کی محبت یاد آئی۔ اس نے سوچا' باپ کی محبت ماں کی محبت سے بہت تھوڑی ہی کم ہوتی ہوگی۔ فرق ضرورت کے مطابق بنیادی نوعیت کا تھا۔ ماتاجی اسے بہت لبھ کر پیار کرتی تھیں' کھل کر محبت کا اظہار کرتی تھیں۔ جبکہ پتاجی محبت شدید کرتے تھے لیکن اظہار کم کرتے تھے۔ پھر ایک رات انہوں نے محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ ماتاجی کے دیہانت کے بعد انہیں اس کے لیے ماں کی محبت بھی مل گئی تھی۔

یہ طے ہے کہ محبت اللہ کی صفت اور اللہ کا احسان ہے۔ وہ اپنی مخلوقات سے جتنی محبت کرتا ہے' اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زمین پر ماں کی اولاد سے محبت اللہ کی محبت کا محض پرتو ہے۔

دہلی میں اردو کے استاد نے یہی بات کہی تھی۔ محبت کسی کی بھی ہو اور کسی سے بھی ہو' اللہ کی عطا ہوتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ محبت کو ہر پل جانچنا چاہیے۔ کیونکہ محبت کا دھوکہ بہت عام ہے۔ بعض اوقات تو محبت کرنے والے کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے' محبت نہیں ہے۔ محبت بے غرض ہوتی ہے۔ اس کا مدعا صرف محبت کرنا ہوتا ہے...... غیر مشروط طور پر۔ بعض لوگ ہوس کو محبت کا نام دے کر رسوا کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ نادانستگی میں ایسا کرتے ہیں۔

اور مولوی صاحب نے کہا تھا کہ شیطان کا خاص کام ہر اچھی چیز میں' ہر نیک عمل میں خرابی پیدا کرنا اور خلل ڈالنا ہوتا ہے۔ اور اس کے طریقے بے حد متنوع ہوتے ہیں۔ وہ عبادت میں بھی خلل ڈالتا ہے۔ کبھی عبادت کے دوران فاسد خیالات ذہن میں ڈال کر' اور کبھی عبادت کے غرور میں مبتلا کر کے۔ ایسا ہی محبت کے ساتھ ہے۔ وہ اللہ کی دی ہوئی محبت کو بھی خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آدمی کو روح سے جسم کی طرف لے جا کر' یہاں تک کہ محبت محبت نہیں رہتی' ہوس ہو جاتی ہے۔ انہوں نے صلاحیتوں کے سلسلے میں بھی مثالیں دی تھیں۔ اللہ نے کسی کو بہت اچھی آواز' بہت اچھا لحن دیا۔ شیطان اسے قرآن کی قرأت سے ہٹا کر گانے بجانے کی طرف لے گیا۔ کسی کو شہ زوری عطا فرمائی کہ وہ حق کی خاطر ظلم سے لڑے اور شیطان نے اسے بندگان خدا پر ظلم کرنے پر لگا دیا۔ کسی کو لکھنے کی صلاحیت دی کہ وہ اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائے' اور شیطان نے اسے فحاشی لکھنے پر لگا دیا۔

مولوی صاحب کہتے تھے کہ بندے کو ہر لمحے شیطان کی طرف سے چوکنا رہنا چاہیے' اور پل پل خود سے باخبر رہنا چاہیے۔ بچانے والا تو اللہ ہے لیکن اللہ ان بندوں کی خاص طور پر حفاظت

فرماتا ہے' جو ہر وقت چوکنا رہیں۔

عبدالحق نور بانو کے لیے اپنی محبت کو بہت پہلے جانچ چکا تھا۔ وہ اللہ کی دی ہوئی سچی محبت تھی۔ اب اس میں جو تبدیلی آئی تھی' وہ اس کے نزدیک فطری تھی۔ لیکن وہ اس امکان کو رد نہیں کر سکتا تھا کہ شیطان اس میں دخل دے رہا ہے۔ شیطان تو اس کی نماز میں بھی خلل پیدا کر رہا تھا' اور وہ خلل بھی صرف نور بانو کے حوالے سے تھا۔

گویا نور بانو اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی!

یہ سوچتے ہوئے اس نے سکون کا سانس لیا۔ اب یہ مسئلہ حل ہونے ہی والا تھا۔ شادی ہی اس مسئلے کا حل تھی۔

مگر اسے مولوی صاحب کی ایک بات سے بہت ڈر لگتا تھا۔ انہوں نے کہا تھا' محبت اللہ کی عطا ہے اور ہوس شیطان کا فساد دونوں میں فرق کرنا کچھ دشوار نہیں۔ لیکن محبت کی طرف سے بھی محتاط رہنا چاہیے۔ جو محبت آدمی کو خدا کی یاد اور اس کے خوف سے غافل کر دے' وہ اچھی ہو ہی نہیں سکتی۔ ماں بھی اگر اولاد کو بغاوت کرتے دیکھے اور اسے اس سے نہ روک پائے تو اس پر ترک محبت لازم ہے۔ نہیں تو وہ اللہ کے آگے جواب دہ ہوگی۔ اللہ سے انکار کرنے پر تو سب رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کی' اور ابراہیم علیہ السلام اور ان کی والد کی مثال ہر وقت سامنے رکھی جائے۔ اور نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویاں بھی مثال ہیں۔

عبدالحق جھرجھری لے کر رہ گیا!

❁......❁......❁

وہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی!

اچھو میاں کی بے معنی اور بے مصرف زندگی کو بالکل اچانک ایک مفہوم' ایک مقصد مل گیا تھا۔ وہ اسی پر سوچتے اور حیران ہوتے۔ پہلی بار انہیں اللہ کا اور اس کی رحمت کا ادراک ہوا تھا۔

ان کی زندگی میں اللہ کے نام کا کوئی خانہ کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے۔ عیش میں پرورش ہوئی۔ زندگی محض ایک تفریح تھی۔ دوست کوئی نہیں تھا۔ مصاحب بے شمار تھے۔ تعریف اور خوشامد کے سوا ان کے کان میں کوئی بات نہیں پڑتی تھی۔ 16 سال کی عمر میں ماں اور باپ دونوں سے محروم ہو گئے۔ لیکن انہیں کسی کمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ہر خواہش پوری کرنے والی اور عزت کرانے والی دولت جوان کے پاس تھی۔ بلکہ اماں جان کی موت کے بعد تو وہ مادر پدر آزاد ہو گئے۔

دوست نما مصاحبوں نے انہیں تماش بینی کی لت لگا دی۔ صرف بارہ سال میں اپنی تمام دولت بازار میں جھونک کر وہ قلاش ہوئے۔ سب مصاحب ساتھ چھوڑ گئے۔ عزت نہیں رہی' اور وہ

نیلم بائی کے کوٹھے پر پڑ رہے۔

اب اس بات کو بھی بائیس سال۔ یعنی زندگی کے پچاس سال گزر گئے۔

مگر اب ان کی زندگی میں اللہ آ گیا۔ وہ سوچتے اور حیران ہوتے۔ کیسا سنگین جرم سرزد ہوا تھا ان سے۔ ان کے اس عمل میں کوئی مثبت پہلو نہیں تھا لیکن اس کے نتائج ششدر کر دینے والی حد تک مثبت نکلے تھے۔ اسی پر تو وہ اللہ کے قائل ہوئے تھے۔

وہ اپنے جرم کے نتائج سے ڈر کر بھاگے تھے' اور انہیں ایک ایسا ٹھکانا بھی مل گیا تھا' جہاں وہ پہلے کی نسبت ہزار گنا عزت کے ساتھ پوری زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن کوئی طاقت انہیں دوبارہ کوٹھے پر کھینچ لائی تھی۔ وہ اپنے جرم کی بدترین سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے لیکن وہاں انہیں ملا گیا' انعام......اور بہت بڑا انعام!

نادرہ کی وہ پہلے ہی سے عزت کرتے تھے۔ لیکن ان کے اس جرم سے درگزر کر کے تو اس نے ان کا دل ہی جیت لیا تھا۔ وہیں سے انہیں اللہ کا خیال آیا تھا۔ اس مظلوم لڑکی کے درگزر سے انہوں نے اللہ کی مغفرت کو سمجھا تھا۔ انہوں نے سوچا' اگر انسان ...... اللہ کی مخلوق ایسے معاف کرنے والی ہے' تو اللہ کیسا معاف کرنے والا ہوگا۔ بلکہ پھر انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ نادرہ کا درگزر بھی اللہ کی رحمت کی وجہ سے ہے' اور اللہ کی مغفرت کا مظہر ہے۔

پھر جو اگلی صبح ہوا' اس کے بعد وہ جیسے نادرہ کے غلام ہو گئے۔ وہ بائیس برس سے کوٹھے پر تھے لیکن اپنے طور پر وہ آزاد تھے۔ غلامی انہوں نے قبول نہیں کی تھی۔ چاہے کوئی کچھ بھی سمجھے' انہوں نے اپنے اندر کی عزت اور وقار کو بچانے کے لیے بے غیرتی اور بے وقاری کی یہ زندگی اپنی مرضی سے قبول کی تھی۔ اور اپنے اندر کی اس عزت اور وقار کو بس وہی جانتے تھے۔ کوٹھے پر وہ غلامی انہوں نے اپنی مرضی سے قبول کی تھی۔ سوا اپنے تئیں وہ آزاد تھے۔ جبھی تو وہ اس دن نیلم بائی کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

مگر نادرہ نے انہیں خرید لیا تھا۔ اور اللہ نے انہیں اپنی رحمت اور مغفرت کا قائل کر لیا تھا۔

اس واقعے کے بعد وہ یہ بات کیسے نہ سمجھتے کہ عزت اور ندامت اللہ کے اختیار میں ہے' اور وہ جسے چاہے' دے دیتا ہے۔ ان جیسے ذلیل کو ایک ذلت ناک جرم کے بعد نہ صرف بے غیرتی سے بچایا تھا۔ بلکہ الٹا عزت عطا فرما دی تھی۔

سو انہوں نے بنیادی طور پر اللہ کی غلامی کا اعتراف کیا' اور نادرہ کے احسان کے صلے میں خود کو اس کا اور ارجمند کا سرپرست مقرر کیا تھا۔ محبت کی انہیں پہچان تھی۔ ماں باپ کے بعد پہلی بار انہیں محبت ملی تھی۔

آزادی کی نعمت کے ادراک کے بعد وہ قید آسان نہیں تھی۔ بار بار ان کا جی چاہتا کہ وہ بس

داتا دربار جائیں اور وہیں کے ہو رہیں لیکن زندگی میں پہلی بار کسی نے ان پر احسان کیا تھا۔ اور پہلی بار کسی کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ ساری عمر اپنی ذات کا مرکز وہ خود رہے تھے۔ بڑی خودغرض زندگی گزاری تھی انہوں نے۔ اب اس کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ وہ نادرہ اور ارجمند کو یہاں چھوڑ کر کیسے نکل سکتے تھے۔

جب کوٹھے سے نکل بھاگنے کی خواہش زور کرتی تو وہ خود کو روکتے...... سوچتے کہ اگر اماں جان دو چار سال اور جی لیتیں تو ان کی شادی یقیناً کرا تیں۔ اور شادی ہوتی اور اللہ نے انہیں بیٹی دی ہوتی تو وہ نادرہ جیسی ہوتی تو وہ اس بیٹی کو یہاں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔

اس پر ان میں ایک امنگ پیدا ہوئی۔ وہ نادرہ اور ارجمند کو لے کر بھی تو یہاں سے جا سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ تھا کہ لے کر جائیں گے کہاں؟ داتا دربار ان کے لیے تو ٹھیک تھا۔ لیکن بیٹیوں کو گھر کی چار دیواری ہی راس آتی ہے۔ پہلے ان کے لیے گھر کا بندوبست کرنا ہوگا۔ مگر کیسے؟ جواب تھا' محنت مزدوری کر کے۔

وہ اس کمرے کی طرف چلے گئے' جہاں نادرہ ارجمند کو قرآن پڑھا رہی تھی۔

نادرہ نے ان کی بات سنی اور ارجمند کو چھٹی دے دی۔ ''تم جا کر یہ دوہراؤ بیٹا' ہم نواب صاحب سے کچھ بات کر لیں۔''

ارجمند خاموشی سے دور جا بیٹھی اور پڑھنے لگی۔

''یہ آسان نہیں ہے نواب صاحب۔'' نادرہ نے ان سے کہا۔ اب اکیلے میں وہ انہیں نواب صاحب کہتی تھی۔ ''ایسا ہوتا تو میں جان پر کھیل کر بھی یہاں سے نکل جاتی۔ مرنا بھی میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''

''تو رکاوٹ کیا ہے؟''

''دیکھیے نواب صاحب' میں تو تباہ ہو چکی۔ اس کا غم نہیں کہ تقدیر میں یہی لکھا تھا لیکن اللہ کی رحمت سے اگر میں ارجمند کو بچانے میں کامیاب ہو گئی تو میری بربادی کا ازالہ ہو جائے گا۔''

''تو اس کے لیے بھی یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔''

''آپ سمجھ نہیں رہے ہیں نواب صاحب۔'' نادرہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں باہر سے اندر آئی ہوں تو باہر کی ایک جھلک دیکھ آئی ہوں۔ اور وہ بڑی ڈراؤنی تھی۔ میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ باہر کیا کچھ ہوتا ہے' اور کتنا کچھ ہو سکتا ہے۔''

''مگر جب تم اکیلی تھیں' اور اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''آپ مجھے ایک گھر دے سکتے ہیں۔ لیکن دوسروں سے عزت نہیں دلوا سکتے مجھے۔ میں تو رسوائی کا شکار ہوں۔ اس شہر میں کتنے لوگ ہوں گے جو اس کوٹھے کے حوالے سے مجھے جانتے

ہوں گے۔ وہ تو مجھے وہی درجہ دیں گے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ دنیا کے لیے اب میں ہمیشہ ایک طوائف ہی رہوں گی۔ تو میرے ساتھ رہنے میں ارجمند کو بھی عزت نہیں مل سکتی۔"

اچھو میاں کے لیے سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔ جو نادرہ کی صورت حال تھی' وہی ان کی بھی تھی۔ وہ محنت مزدوری کر کے عزت سے رہنا چاہیں' مگر اس شہر کے بے شمار لوگ ایسے ہیں' جن کے لیے وہ پان بیڑی سگریٹ' بلکہ شراب بھی لاتے رہے ہیں۔ وہ جب بھی اور جہاں بھی انہیں دیکھیں گے تو انہیں اسی مقام پر رکھیں گے۔ وہ کبھی ان کی عزت نہیں کریں گے۔

اچھو میاں کو کبھی عزت کی پروا نہیں رہی تھی۔ اب ہوئی تو ان پر یہ راز کھلا کہ بدن پر گندگی لگ جائے تو اسے دھویا' صاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ساکھ پر جو داغ لگ گیا' وہ عمر بھر کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ معاف کر دیتا ہے لیکن اس کے بندے کبھی معاف نہیں کرتے۔

انہیں احساس بھی ہوا کہ نادرہ ان سے زیادہ سمجھ دار' بلکہ عقل مند ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ ارجمند کے لیے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" انہوں نے سب کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

نادرہ نے تاسف سے سر ہلا دیا۔ "بظاہر تو ایسا ہی ہے لیکن میں اللہ سے ہر وقت دعا کرتی ہوں اس کے لیے۔"

"مگر کوئی امکان بھی ہے تمہارے سامنے۔"

"بس مجھے لگتا ہے کہ اللہ کے حکم سے کوئی رحمت کا فرشتہ آئے گا اور میں ارجمند کو اسے دے دوں گی۔ اس کے بعد میں یہ نہیں چاہوں گی کہ میرا یا میری بدنصیبی کا سایہ بھی اس پر پڑے۔"

"مگر تم تو یہاں اجنبی ہو۔ ہندوستان سے آئی ہو۔ یہاں تمہارا کوئی جاننے والا بھی نہیں۔"

"اللہ مسبب الاسباب ہے نواب صاحب۔" نادرہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میرا دل کچھ اچھا ہی ہوگا۔ مگر مجھے بوا سے بنا کر رکھنی چاہیے۔ اور آپ بھی ایسا کریں۔ بوا کو آپ کے اور ہمارے تعلق کی گہرائی کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

اچھو میاں نے سوچا' بات معقول ہے۔ اب وہ خیال رکھیں گے۔ ساتھ ہی انہیں ایک اور خیال آیا۔ وہ داتا دربار جائیں تو دھل کر پاک ہو کر کیوں نہ جائیں۔ ساتھ کچھ اچھا لے کر جائیں۔ انہوں نے نادرہ سے کہا۔ "بیٹا' ایک احسان کرو گی مجھ پر۔"

نادرہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ پہلی بار انہوں نے اسے بیٹا کہا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ پردیس میں' اس کسمپرسی کے عالم میں اللہ نے اسے ایک رشتہ عطا فرمایا۔ پھر مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ ضرور کرم کرے گا۔ "بیٹی کہتے ہیں اور احسان کی بات کرتے ہیں۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "اب تو آپ حکم کریں۔"

"مجھے قرآن پڑھنا سکھا دو۔"

"یہ تو سعادت ہوگی میرے لیے۔ میں تو سوتی ہی فجر پڑھ کر ہوں۔ آپ صبح سویرے اٹھیں۔ میں آپ کو قرآن بھی پڑھاؤں گی۔ اور نماز بھی سکھاؤں گی۔ آپ تو باہر جا کر جماعت سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مجھے تو پانچوں نمازیں نصیب ہی نہیں ہوتیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "لیکن بوا کو پتا نہ چلنے دیجیے گا۔"

اچھو میاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ کوٹھے پر بالکل نئے معمولات کا آغاز تھا!

❁......❁......❁

رابعہ کو چالیس دن ہو گئے تو اس کا نارمل زندگی کا آغاز ہو گیا۔ حمیدہ نے اسی دن عبدالحق کو بلایا۔ "اب تمہاری اور نور بانو کی شادی کی تاریخ رکھنی ہے۔"

عبدالحق اندر سے خوش ہو گیا۔ "جو تمہاری مرضی اماں۔"

"اور اس کے ایک ماہ بعد کی تاریخ ڈاکٹر صاحب کو دے دیں گے۔"

"ٹھیک ہے اماں لیکن میں اس سے پہلے تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

"تو دکھا دے پتر۔"

"ایسے نہیں۔ اس کے لیے ہمیں سفر کرنا ہوگا۔"

"کہاں جانا ہے۔"

"لاہور۔" عبدالحق نے کہا۔ "پر تم فکر نہ کرو اماں میں نے گاڑی بھی لے لی ہے۔"

حمیدہ کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن اس نے کہا۔ "زبیر اور رابعہ بھی چلیں گے نا؟"

"ہاں اماں۔ کیوں نہیں۔"

"اور نور بانو......اور زرینہ؟"

"وہ بھی چلیں گی۔" عبدالحق نے کہا۔ "لاہور لے جانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان کی شادی کے لیے جو کچھ خریدنا ہے' وہاں تمہاری مرضی سے خرید لیا جائے۔ اور وہ دونوں بھی خریداری میں شریک ہوں۔"

"بس تو تاریخ وہاں سے واپسی پر طے کریں گے۔" حمیدہ نے فیصلہ سنایا۔

"ٹھیک ہے اماں۔" عبدالحق نے کہا۔ وہ خوش تھا کہ نور بانو کے ساتھ ایک اور سفر کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

پک اپ اس نے یہی سوچ کر خریدی تھی کہ پوری فیملی اس میں سفر کر سکتی تھی۔

پہلے تو گاڑی ہی حمیدہ کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ بلکہ حمیدہ کیا' سبھی بہت خوش

ہوئے تھے۔ حمیدہ بار بار کہتی......اللہ' سفر اتنا آسان بھی ہوسکتا ہے۔

لیکن سفر بہر حال طویل تھا۔ حمیدہ کو تھکن ہوئی تو زرینہ درمیانی نشست سے پچھلی نشست پر زبیر اور رابعہ کے ساتھ جا بیٹھی اور حمیدہ نور بانو کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

راستے میں ایک جگہ رک کر انہوں نے کھانا کھایا' جو وہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہوٹل کی چائے پی' اور کچھ دیر آرام کیا۔ پھر دوبارہ سفر شروع ہوا۔ اب ان کی منزل لاہور تھی۔

کھانے کے بعد عبدالحق نے حمیدہ کو مسعود صاحب کے اور ان کی عنایات کے بارے میں بتایا۔ ”میں انہیں چچا جان کہتا ہوں اماں۔“ اس نے کہا۔ ”اور یہ سمجھ لیجئے کہ وہ بھی ہمارے لیے گھر کے لوگوں جیسے ہیں۔“

”ٹھیک ہے پتر۔ اللہ اسی طرح لوگوں کو لوگوں سے ملاتا ہے۔“ حمیدہ نے کہا۔ ”پر تُو مجھے کچھ دکھانے کی بات کر رہا تھا۔“

عبدالحق مسکرایا۔ ”ایک تو یہی گاڑی تھی اماں' جس میں تم سفر کر رہی ہو۔ دوسری چیز لاہور میں ہے۔ وہ تم دیکھ لوگی۔“

”کچھ بتا تو سہی۔“

”بتانے میں وہ مزہ نہیں اماں' جو دیکھنے میں آئے گا۔ خود ہی دیکھ لینا۔“

لاہور میں عبدالحق کا جی چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو سب سے پہلے اپنے بنگلے پر لے جائے۔ لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ پہلے مسعود صاحب کے ہاں حاضری دینی ضروری تھی۔

اور مسعود صاحب کو پتا چلا کہ وہ سیدھے وہاں آئے ہیں تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

”تم نے میرا مان بڑھا دیا بیٹے۔“ انہوں نے عبدالحق سے کہا۔ ”مجھے احساس ہے کہ تم ان لوگوں کو بنگلا دکھانے کے لیے بے تاب ہو رہے ہوگے۔“

”بنگلا کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا چچا جان۔ اور بنگلا خود کیا ہے' وہ تو آپ کے دم سے ہے۔“

مسعود صاحب نے محبت سے اسے لپٹا لیا۔

ذرا سی دیر میں سب لوگ گھل مل گئے۔ لگتا تھا کہ برسوں کی جان پہچان ہے۔ مسعود صاحب کی بیگم اور ان کے بچے بھی بہت خلیق تھے زرینہ سے تو وہ لوگ پہلے ہی سے واقف تھے۔

مسعود صاحب حمیدہ کو باجی کہہ رہے تھے۔

یہ لوگ شام کو پہنچے تھے۔ رات کا کھانا بہت پُر تکلف تھا۔ کھانے کے بعد عبدالحق نے مسعود ہ [illegible] سے اجازت چاہی تو وہ بولے۔ ”نہیں بیٹے۔ رات تو تم یہیں قیام کرو۔ صبح ناشتے کے بعد [illegible]“

جو حکم آپ کا۔“ عبدالحق نے خوش ہو کر کہا۔

”میں تمہاری بے تابی کو سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ تاخیر بھی تمہاری بہتری کے لیے ہے۔“

اور اگلے روز وہ بہتری بھی عبدالحق کی سمجھ میں آگئی۔ بنگلے پر تمام انتظامات مکمل تھے۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اور نوکروں نے بنگلے کو اچھی طرح سے جھاڑ پونچھ ڈالا تھا۔

”آج رات کا کھانا آپ لوگ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔“ عبدالحق نے چپکے سے مسعود صاحب سے کہا۔

”یہ زیادتی ہوگی۔ ابھی بچوں کی تھکن پوری اتری نہیں ہے' اور تم ان پر یہ بوجھ لاد رہے ہو۔“

”رات کی نیند لے کر سب تازہ دم ہو چکے ہیں چچا جان۔“ عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اور اگر کچھ تھکن رہ بھی گئی ہے تو وہ آپ کا تحفہ دیکھ کر دور ہو جائے گی۔“

”یہ تو تمہاری محبت ہے کہ اپنی ملکیت کو میرا تحفہ کہہ رہے ہو۔“

”آیئے گا ضرور۔“

❁......❁......❁

عبدالحق نے گاڑی بنگلے کی سامنے رکوائی اور پلٹ کر پیچھے حمیدہ کو دیکھا۔ ”اس بنگلے کو دیکھیں اماں۔ کیسا لگ رہا ہے؟“

حمیدہ نے سر گھما کر جائزہ لیا۔ ”اسے بنگلہ کہتے ہیں پتر۔ یہ محل ہے محل۔“

”اگر یہ تمہیں مل جائے تو؟“

”میرے لیے تو محل اور جھونپڑی برابر ہے پتر۔ ہاں' یہ تجھے مل جائے تو بہت خوشی ہوگی مجھے۔“

”اندر سے چل کر دیکھیں اماں؟“ عبدالحق نے کہا۔ ”کیا پتا' اندر سے ایسا نہ ہو۔“

”پتا نہیں کس کا ہو۔“

”ارے نہیں اماں' ابھی تو یہ خالی پڑا ہے۔ مسعود صاحب کے ایک دوست کا ہے۔ ہم اندر جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ بولو اماں' دیکھنا ہے؟“

”دیکھ سکوں تو کیوں نہ دیکھوں۔“ حمیدہ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

عبدالحق کے اشارے پر یعقوب نے ہارن دیا۔ چند لمحے بعد گیٹ کھول دیا گیا۔ گاڑی اندر پورچ کی طرف بڑھی۔ صادق گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ”یہ شاید ہمیں روکنا چاہتا ہے پتر۔“ حمیدہ نے معصومیت سے کہا۔

”ابھی دیکھ لینا اماں۔“

اور گاڑی رکتے ہی صادق نے عبدالحق کو سلام کیا۔ عبدالحق نیچے اترا۔ ”سب ٹھیک ہے نا؟“ اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

”بنگلا آئینے کی طرف چمکا دیا ہے صاحب۔ ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔“

یعقوب نے اتر کر دروازہ کھولا اور سب لوگ نیچے اتر آئے۔ صادق اپنے بیوی بچوں کو بلانے کے لیے سرونٹ کوارٹر کی طرف دوڑ گیا۔ عبدالحق حمیدہ کی طرف مڑا۔ ''آؤ اندر چلیں اماں۔''

لیکن حمیدہ تو سحر زدہ سی لان کو دیکھ رہی تھی۔ اور ایک حمیدہ ہی کیا' سبھی لوگ لان کو مبہوت سے دیکھ رہے تھے۔ عبدالحق نے لان کی طرف دیکھا تو خود بھی دیکھتا ہی رہ گیا۔

لان کی تو شکل بدل ہی گئی تھی۔ ہر طرف لہلاتی ہوئی گھاس نظر آ رہی تھی۔ سلیقے سے بنی ہوئی کیاریوں میں رنگا رنگ پھول چھب دکھا رہے تھے۔ اور ایک مالی پائپ ہاتھ میں لیے پانی دے رہا تھا۔

صادق اپنی بیوی کے ساتھ آ گیا تھا۔ صادق نے آواز لگائی۔ ''رمضان' ادھر آ جا۔ صاحب آئے ہیں۔''

رمضان نے پائپ رکھا اور ان کی طرف چلا آیا۔ ''تم نے تو کمال کر دیا رمضان۔'' عبدالحق نے اسے کہا۔ ''اتنا خوبصورت بنا دیا ہے باغیچے کو۔''

''آپ کو اچھا لگا صاحب۔ میری محنت وصول ہو گئی۔ مگر صاحب اس میں میری خوشی بھی ہے۔ مجھے زمین سے اور پھولوں پودوں سے محبت ہے۔''

''ٹھیک ہے' تم جاؤ۔'' عبدالحق نے اسے کہا۔ پھر وہ حمیدہ کی طرف مڑا۔ ''اب اندر چلیں اماں۔''

''ارے...... یہاں تو جھولے بھی لگے ہیں...... اور اتنے اچھے۔'' حمیدہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

عبدالحق کو جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اسے بنگلا دکھانے کی بے تابی ہو رہی تھی' اور یہاں سب لان میں الجھے ہوئے تھے۔ ''اماں' اب اندر چلیں۔'' اس نے حمیدہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''ہم یہاں کچھ دیر نہیں بیٹھ سکتے پتر؟'' حمیدہ نے کہا۔

''ہاں بھائی' ہمیں جھولا بھی جھولنا ہے۔'' زرینہ بولی۔

''شام کو بیٹھیں گے لان میں۔ پھر جو جی چاہے کر لینا۔ ابھی تو دھوپ ہے یہاں۔'' عبدالحق نے کہا اور چپکے سے نور بانو کی طرف دیکھا جو گم صم تھی' جیسے کسی سحر میں ہو۔

''شام کو ہم یہاں کہاں ہوں گے۔'' حمیدہ نے حسرت سے کہا۔

''کیوں نہیں اماں۔ تم کہو تو ہم تین چار دن یہیں رک جائیں۔''

''نا پتر' کسی پرائے گھر میں مجھے نہیں رکنا۔ پرائے محل سے اپنی کٹیا بھلی۔''

''اچھا چلو' شام تک تو رک جانا۔ شام کو اس باغیچے میں بہت اچھا لگے گا۔ اب اندر چلو۔ بنگلا تو دیکھ لو۔''

کوئی بھی لان چھوڑ کر جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ بس عبدالحق کے لحاظ میں وہ کھلے صدر دروازے سے بنگلے میں داخل ہوئے۔ تب انہیں پتا چلا کہ وہاں لان جیسی بے شمار حیرتیں ان کی منتظر ہیں۔

وہ حیرت سے ایک ایک کمرا دیکھتے پھرے۔ وہاں کی آرائش بھی ان کے لیے حیران کن تھی۔ ہر چیز خوب صورت' سب کچھ آرام دہ۔ اور کچن دیکھ کر تو رابعہ' زرینہ کی چیخیں نکل گئیں۔

''اتنا بڑا باورچی خانہ!'' زرینہ چلائی۔ ''پر یہ چولہے تو اوپر ہیں...... اور عجیب ہیں۔''

''لیکن اس طرح پکانے میں تھکن بھی نہیں ہوگی۔'' نور بانو نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

''پر یہ الماریاں کیسی ہیں؟'' رابعہ نے سوال اٹھایا۔

''ان میں مسالے اور ساری چیزیں رکھی جاتی ہوں گی۔'' نور بانو بولی۔

عبدالحق کو اس کی فراست پر خوشی ہوئی۔

ایک بیڈ روم دیکھتے ہوئے عبدالحق نے حمیدہ سے کہا۔ ''اماں' یہ تمہارا کمرا ہو تو کیسا لگے؟''

''میرا اپنا کمرا بہت اچھا ہے پتر۔ میں کسی اور کی چیز پر کیوں نظر رکھوں۔''

عبدالحق نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس مسکرا دیا۔

حمیدہ نے کمرے سے ملحق باتھ روم دیکھا تو پوچھا۔ ''یہ کمرے میں دوسرا کمرا کیسا ہے؟''

''یہ غسل خانہ ہے اماں...... اور سنڈاس۔''

حمیدہ نے ٹائل لگے اس کمرے کو حیرت سے دیکھا' اور بے یقینی سے بولی۔ ''غسل خانہ...... اور سنڈاس۔''

''ہاں اماں!'' عبدالحق نے اسے شاور کھول کر دکھایا۔ ''بس اس کے نیچے کھڑے ہوئے اور نہا لیے۔ اور یہ ٹب ہے' اس میں پانی بھرا اور لیٹ گئے۔ ہے نا آرام ہی آرام۔ اور اماں' سردی ہو تو گرم پانی بھی آئے گا نل میں۔''

زندگی بھر کی تمام حیرتیں سمٹ کر حمیدہ کی آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ ''بہت خوبصورت ہے پتر۔ پر یہ تو بتا' اتنے صاف ستھرے غسل خانے میں سنڈاس کا کیا کام۔ اور سنڈاس ہے کہاں۔''

عبدالحق نے اسے کموڈ دکھایا۔ ''یہ ہے' اس پر کرسی کی طرح بیٹھتے ہیں۔''

''پر اس کا فائدہ؟''

''جب تم بوڑھی ہو گی اماں' اور خدانخواستہ سنڈاس پر بیٹھتے ہوئے جھکنا مشکل ہو گا تو......''

''بوڑھی تو میں اب بھی ہوں پگلے۔ اور سنڈاس پر بیٹھتے ہوئے مجھے تکلیف بھی ہوتی ہے۔ ہڈیاں کڑکڑاتی ہیں میری۔'' حمیدہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''پتر! اتنے صاف ستھرے غسل خانے میں گندگی......''

''صفائی کا خیال رکھیں تو گندگی کیسے ہوگی۔ اب کوئی خیال نہ رکھے تو اور بات ہے۔'' عبدالحق نے کموڈ کا ڈھکنا اٹھایا۔ ''ایسے بیٹھتے ہوئے' اپنی ضرورت پوری کی' خود کو صاف کیا اور یہ بٹن دبا دیا۔'' اس نے فلش کا بٹن دبایا۔ ''پریشر سے پانی آیا اور گندگی بہا کر لے گیا۔''

حمیدہ متاثر تو ہوئی۔لیکن اسے اعتراض بھی تھا۔"آدمی جہاں سوتا ہو وہیں گندگی......"

"میں نے کہا نا اماں' صفائی کا خیال رکھا جائے تو گندگی ہوگی ہی نہیں۔"

"پتر بدبو تو ہوگی پتر۔"

"گندگی فوراً بہا دی جائے تو بدبو کیسی۔" عبدالحق نے کہا۔"اور اس کے باوجود خوشبو دار جراثیم کش دواؤں سے اس کی دھلائی ہوتی ہے۔اور پھر یہ اسپرے۔"اس نے اسپرے کر کے دکھایا۔باتھ روم میں بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔

حمیدہ بہت متاثر ہوئی۔"تو ٹھیک کہتا ہے پتر۔پر میرے لیے تو یہ نیا اور عجیب ہی ہے۔"

"استعمال کرو گی تو دو دن میں ہی عادی ہو جاؤ گی۔"

"مجھے کون سا رہنا ہے یہاں۔"

عبدالحق پھر مسکرایا۔باقی سب لوگ دلچسپی سے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔

عبدالحق نے سرونٹ کوارٹر دکھائے۔"اچھے لوگ ہوں گے۔نوکروں کا بھی خیال رکھا ہے۔"حمیدہ نے تبصرہ کیا۔

عبدالحق آخر میں انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔"اب بیٹھیں' کچھ دیر آرام کر لیں۔کوئی لیٹنا چاہے تو بیڈ روم میں چلا جائے۔"

حمیدہ صوفے پر بیٹھی تو حیران ہوئی۔"یہ کرسی تو پتر' لگتا ہے کہ مجھے ہڑپ کر رہی ہے۔"اس نے کہا۔

"ہڑپ تو نہیں کرے گی۔" عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔"البتہ جھولا جھولنے کا احساس ہوگا۔اچھا نہیں لگ رہا اماں؟"

"بہت اچھا لگ رہا ہے پتر۔"

"اب خوشخبری سن لو اماں۔یہ تمہارا گھر ہے۔میں نے خریدا ہے۔"

وہاں سناٹا چھا گیا۔وہ سب حیرت اور مسرت سے گنگ ہو گئے تھے۔

پھر سب سے پہلے اس خاموشی کو زرینہ نے توڑا۔وہ اٹھ کر عبدالحق کے پاس آئی' اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے دونوں گھٹنوں کو تھام لیا۔"آپ کو بہت مبارک ہو بھائی۔اللہ اس گھر کو آپ کے لیے آباد کرے اور اسے خوشیوں سے بھر دے۔"

وہ بولی تو جیسے سب کی زبان کھل گئی۔سب مبارکباد دے رہے تھے۔بس نور بانو چپکے چپکے مسکرائے جا رہی تھی۔

عبدالحق نے کہا۔"آپ سب کو مبارک ہو۔ارے بھئی یہ گھر آپ سب کا ہے۔"

❁.....❁.....❁

یہ جاننے کے بعد کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں' وہاں ماحول ہی بدل گیا۔نور بانو اور زرینہ لان میں جانے کو مچل رہی تھیں۔اور تو اور' رابعہ بھی جھولے پر بیٹھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

"اب گھر تمہارا ہے تو صبر سے کام لو۔باغیچے میں تو جب چاہو' جا سکتی ہو۔پر پہلے کھانے کا کچھ کرو۔"

اور اس وقت کے کھانے کی تو کوئی بات نہیں۔البتہ رات کے کھانے پر میں نے چچا جان کو بلایا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

اور اسی وقت مسعود صاحب کا ڈرائیور ان لوگوں کے لیے کھانا لے کر آ گیا۔

کھانے کے بعد لوگ کچھ دیر کے لیے لان میں چلے گئے۔حمیدہ کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی۔عبدالحق اس کے پاس رک گیا تھا۔

سب سے پہلے رابعہ جھولے پر بیٹھی۔وہ جھولا بھی عجیب تھا۔وہ تو ایک طرح کا گدے دار پلنگ تھا' جس کے تین طرف دیواریں تھیں۔"آئیں آپ نور بی بی' آپ بھی آ جائیں۔" رابعہ نے پکارا۔

نور بانو کچھ جھجکی لیکن پھر جھولے پر جا بیٹھی۔وہ تو بہت آرام دہ نشست تھی۔کہاں وہ لکڑی کا تختہ اور کہاں یہ نرم و دبیز اُڑتا ہوا بستر۔اس کا تو لطف ہی کچھ اور تھا۔

زرینہ پینگیں دے رہی تھی۔

نور بانو پچھلے تجربے سے اس تجربے کا موازنہ کر رہی تھی۔وہاں کے مقابلے میں یہاں آسمان کی وسعت زیادہ تھی۔اور ہر بار ایسا لگتا تھا کہ جھولے کی قوسی اُڑان اسے سرو کے درختوں کی طرف لے جا رہی ہے۔ہر بار ایسا لگتا کہ وہ ہاتھ بڑھائے تو ان درختوں کو چھو سکتی ہے۔حالانکہ درخت کافی دور تھے۔

پھر اسے احساس ہوا کہ یہاں سب کچھ اچھا ہے۔لیکن کوئی کمی ہے۔کچھ ایسا جو وہاں تھا' یہاں نہیں ہے۔اگلے ہی لمحے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ فرق صرف موسم کا ہے......اندر کے موسم کا بھی اور باہر کے موسم کا بھی۔اور شاید بارش ہو جائے تو اندر کی وہی کیفیت لوٹ آئے۔وہاں تو افق پر اسے عبدالحق نظر آ رہا تھا' اور وہ اسے چھونے کے لیے لپک رہی تھی......اور تیز......اور تیز!

اور یہاں سرو کے درخت تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اتریں' تاکہ زرینہ بھی جھول لے لیکن زرینہ نے ایک منٹ بعد ہی جھولا رکوا دیا۔پھر وہ نیچے اتر آئی۔

"کیا ہوا زرینہ؟"

"بھئی میرے لیے تو وہی تختے والا جھولا اچھا ہے۔" زرینہ نے دوسرے دو جھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' جو عام جھولے تھے۔

"کیوں؟"

"اس کھٹولے کی وہ اڑان کہاں۔" زرینہ نے کہا۔ "وہ تو آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ واپس چلی آئیں۔ رات کے کھانے کی فکر جو کرنی تھی۔

رات کے کھانے کی ذمہ داری نور بانو نے قبول کی۔ کچن کی کیبنٹ کا جائزہ لیا گیا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی...... گوشت اور سبزی ترکاری کے سوا۔

"جو کچھ چاہیے' مجھے لکھ کر دے دیں۔" عبدالحق نے نور بانو سے کہا۔ "صادق یعقوب کے ساتھ جا کر لے آئے گا۔"

نور بانو نے فہرست تیار کر کے دے دی۔

⊛......⊛......⊛

رات کے کھانے پر نور بانو کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ مسعود صاحب کی بیگم نے کہا۔ "ایسا کھانا ہم نے کبھی نہیں کھایا۔"

مسعود صاحب کی بچیاں نور بانو کے پیچھے پڑ گئیں کہ وہ انہیں ایسا ہی کھانا پکانا سکھائے۔

"اب چار دن میں تو یہ ممکن نہیں۔" نور بانو نے بے بسی سے کہا۔

"ان چار دنوں کے لیے کون کہہ رہا ہے۔" مسعود صاحب کی بڑی بیٹی رضوانہ نے کہا۔ "یہ تو خریداری میں ہی گزر جائیں گے۔"

"اور کیا۔ ہم تو بعد کی بات کر رہے ہیں۔ جب آپ یہاں رہنے کے لیے آ جائیں گی۔" چھوٹی بیٹی شاہانہ بولی۔

نور بانو کی سمجھ نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ بات سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔ وہ خاموش ہی رہی۔

مسعود صاحب نے عبدالحق سے کہا۔ "لان میں چلو بھئی۔ مجھے تو چہل قدمی کرنی پڑے گی۔ کھانا حلق تک بھر لیا ہے۔ تھا ہی اتنے مزے کا۔"

"چلیے۔"

وہ دونوں چلے گئے۔

حمیدہ نے بچیوں سے پوچھا۔ "نور بانو یہاں رہنے کے لیے آئے گی؟"

"آپ بھی آئیں گے۔" رضوانہ نے کہا۔ "عبدالحق بھائی نے آپ کو نہیں بتایا؟"

"کچھ بات تو کی تھی۔ میں سمجھ نہیں پائی۔"

باہر لان میں چہل قدمی کے دوران عبدالحق نے مسعود صاحب سے کہا۔ "اب اماں سے لاہور آنے کی بات آپ ہی کریں۔"

"ضرور کروں گا۔ غرض ہی میری ہے تو بات اور کون کرے گا۔"

"آپ کی غرض کیسی۔ بھلا تو میرا ہے؟"

"ملک اور قوم کی غرض میری غرض ہے۔ اور بیٹے' تم تو میرے لحاظ میں راضی ہوئے۔"

"ایسی تو بات نہیں چچا جان۔"

"نہیں بیٹے' میں جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔ تم آزاد آدمی' ملازمت کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ دیکھو نا' نوکری تو نوکری ہے۔ اس میں جواب دہ بھی ہونا پڑتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں تمہیں تمہارے مقام سے نیچے لا رہا ہوں۔ اور تم ایثار کرو گے...... اپنے ملک و قوم کی خاطر۔"

چہل قدمی کے بعد وہ لوگ اندر گئے۔ "اب چلنا نہیں ہے کیا؟" مسعود صاحب کی بیگم نے ان سے کہا۔

"چلتے ہیں۔ پہلے میں باجی سے بات کر لوں۔ کہاں ہیں وہ؟"

"اپنے کمرے میں۔ آئیے' میں لے چلوں آپ کو۔" زرینہ نے ان سے کہا۔

نور بانو کے ذہن میں پھر اندیشے سرسرانے لگے۔ اس نے رضوانہ اور شاہانہ کو غور سے دیکھا۔ وہ دونوں ہی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ اور اسے یہ معلوم تھا کہ لاہور میں قیام کے دوران عبدالحق ان لوگوں کے بہت قریب رہا ہے۔ بلکہ یہ بنگلہ بھی عبدالحق کے پیسے سے ضرور خریدا گیا تھا۔ مگر دلوایا مسعود صاحب نے ہی تھا۔ اور اب لاہور آ کر رہنے کی بات مسعود صاحب نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی عبدالحق میں دلچسپی لی ہو گی۔

تو اب کیا وہ اماں سے اپنی کسی بچی کے رشتے کی بات کریں گے؟

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اسی پرانے انداز میں سوچ رہی ہے۔ اس نے اس سوچ کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی مگر خود کار سوچ پر کب کسی کا اختیار رہتا ہے۔ اس نے دھیان تو ہٹا لیا لیکن وہ سوچ کسی کیل کی طرح اس کے دماغ میں چبھتی رہی۔

پھر اسے خیال آیا کہ اب ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو اس کے پاس اعتماد تھا۔ عبدالحق براہ راست اس کے لیے اپنی محبت کا اعتراف کر چکا ہے...... اور وہ بھی عملی طور پر۔ دوسری طرف اماں اسے بہو بنانا چاہتی ہیں۔ مسعود صاحب نے ایسی کوئی بات کی بھی تو وہ انہیں کہہ دیں گی کہ عبدالحق کی شادی پہلے ہی سے طے ہے۔

پھر بھی وہ عبدالحق کو غور سے دیکھتی رہی' جو وہیں بیٹھا تھا۔ اسے اطمینان ہوا کہ عبدالحق ان میں سے کسی کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھا۔

پھر اس نے دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ ان کے انداز میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اصولاً اس کے بعد اسے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اسے دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مطمئن ہو جانا شاید اس کی فطرت میں ہی نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد مسعود صاحب حمیدہ کے کمرے سے آئے تو بہت خوش نظر آ رہے تھے۔
''چلیں بھئی۔'' انہوں نے اپنی بیگم سے کہا۔
سب لوگ اٹھ گئے۔ عبدالحق انہیں رخصت کرنے کے لیے باہر تک گیا۔ نور بانو حمیدہ کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ مسعود صاحب کا خوش خوش واپس آنا اس کے لیے باعثِ تشویش تھا۔

⊛......⊛......⊛

حمیدہ نے حیرت سے نور بانو کی دیکھا۔ ''تُو کیوں آ گئی دھیے؟ پورے دن کی تھکن ہے۔ اب سو جا کر۔''
''ایسی تھکن بھی نہیں ہے اماں۔ میں نے سوچا' آپ کی آنکھوں میں دوا ہی ڈال دوں' اور ٹانگیں بھی دبا دوں۔''
آنکھوں میں دوا ڈالنے کے بعد پاؤں دباتے ہوئے نور بانو نے اچانک پوچھا۔ ''مسعود صاحب آپ سے کیا بات کرنے آئے تھے اماں؟''
حمیدہ نے چونک کر غور سے اسے دیکھا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تُو کیوں پریشان ہوتی ہے؟''
''نہیں اماں مجھے پریشانی تو کوئی نہیں۔''
''تُو کبھی نہیں بدلے گی۔ کتنا سمجھایا تھا میں نے تجھے۔ دیکھ' اچھے لوگوں کو اچھے لوگ ہی ملتے ہیں۔ سب غرض کے بندے نہیں ہوتے دنیا میں۔ اور یاد رکھ' اچھے لوگوں کے بارے میں بدگمانی کرنے سے آدمی کو آپ ہی نقصان ہوتا ہے۔ ہر بار تھوڑا سا برا ہو جاتا ہے وہ۔''
نور بانو روہانسی ہو گئی۔ ''میں نے تو کوئی بدگمانی نہیں کی اماں۔''
''جانے دے اس بات کو۔ میں سب سمجھتی ہوں۔'' حمیدہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''وہ سب عبدالحق کے سلسلے میں اجازت لینے آئے تھے۔ یہ ان کی بھی بڑائی ہے اور عبدالحق کی بھی۔ ورنہ مردوں کے معاملات میں عورتوں کا کیا دخل۔ اور میں تو دنیا کو سمجھتی بھی نہیں۔ بس اپنے عبدالحق سے پیار کرتی ہوں' اور اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔''
''کیسی اجازت اماں؟'' نور بانو نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی۔
''عبدالحق نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد لاہور میں رہنا چاہتا ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''
''لیکن کیوں اماں؟''
''مسعود صاحب عبدالحق کو بڑا افسر بنانا چاہتے ہیں۔''
''تو یہ تو نوکری ہوئی اماں۔ انہیں کیا ضرورت ہے نوکری کی۔''

''میں نے بھی یہی کہا تھا۔ پر وہ بولے کہ یہاں پڑھے لکھے' سچے اور دیانت دار لوگوں کی کمی ہے۔ اور ملک اور قوم کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اس میں قوم کا فائدہ ہے۔ ملک کی خدمت ہے۔ عبدالحق دوسروں کی فکر کرتا ہے' غیروں کے بھی کام آتا ہے۔ انہیں اس کی یہ خوبی اچھی لگی۔''
''لیکن اماں......''
حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''دیکھ نور بانو' میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھایا تھا۔ شک اور بدگمانی محبت کو خراب کر دیتے ہیں۔ تُو ایسی ہی رہی تو خود بھی دکھی ہو گی اور عبدالحق کو بھی پریشان کرے گی۔ یاد رکھ' مرد آزاد ہوتے ہیں۔ ان کی آدھی زندگی گھر سے باہر گزرتی ہے۔ عورت اپنی محبت اور خدمت گزاری کو مرد کے پاؤں کی زنجیر بنا سکتی ہے۔ اور ایک بات بتاؤں تجھے۔ محبت کسی پر قبضہ کر کے بیٹھنے کا نام نہیں۔ محبت کو صرف دینے کی غرض ہوتی ہے۔ جواب میں کچھ مل جائے تو اسے احسان سمجھنا چاہیے' حق نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تجھے سب کچھ ملنے والا ہے۔ پر تُو پھر بھی نہیں بدلی۔ یہ ناشکرا پن ہے۔ یہ گھر جس میں ہم بیٹھے ہیں' کتنا خوبصورت ہے۔ اور یہ تیرا گھر ہے۔ نہ تُو خواب میں بھی سوچ سکتی تھی اس گھر کا اور نہ میں۔ تو اس پر شکر ادا کرنا چاہیے۔ تُو الٹا ناشکرا پن کرتی ہے۔ یاد رکھ نور بانو' میں ماں بن کر تجھے سمجھاتی ہوں۔ میری یہ بات یاد رکھنا' آدمی جس چیز پر اللہ کا شکر ادا کرے' اللہ اسے بڑھاتا ہے۔ اور ناشکرا پن کرے تو جب چاہے' اس سے محروم کر دیتا ہے......''
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی......

⊛......⊛......⊛

مسعود صاحب کو رخصت کر کے عبدالحق لان میں سنگِ مرمر کی بنچ پر جا بیٹھا۔ وہاں اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس گھر میں رہنے کا خیال ہی بہت خوش کن تھا۔ یہ تو اللہ کی طرف سے اسے بڑی نعمت ملی تھی۔
پھر وہ نور بانو سے اپنی شادی کے بارے میں سوچنے لگا' اور اس میں ایسا گم ہوا کہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ ایسے میں بالکل اچانک مینو کا خیال آ گیا۔ ارے...... آج تو مینو کو دانہ بھی نہیں دیا۔ وہ یہ سوچ کر اٹھا کہ ابھی شیڈ میں جا کر اس زیادتی کا ازالہ کرے گا۔ اور اٹھتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ تو لاہور میں ہے...... مینو سے سینکڑوں میل دور!
وہ تڑپ گیا۔ معصوم اور بے زبان جانور' اور وہ بھی وہ جسے آپ نے قربانی کے لیے پالا ہو' اس کے ساتھ زیادتی۔ یہ تو اللہ کو ناراض کرنے والی بات ہے۔
اور وہ لوگ یہاں کم از کم چار پانچ دن کے لیے آئے ہیں۔ تو کیا اتنے دن مینو بھوکا رہے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے خود پر بہت شدید غصہ آیا۔ وہ یہ پروگرام بنا کر چلا اور مینو کا خیال بھی

نہیں آیا......مینو جو اس کی طرف سے اللہ کے لیے تحفہ ہے۔ اس نے تو غیر ذمہ داری اور غفلت کی حد کر دی۔

وہ سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ اس کے سوا کوئی حل نہیں تھا کہ وہ اماں کو خریداری کے لیے رقم دے کر اسی وقت واپس چلا جائے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا بنگلے میں داخل ہوا اور سیدھا اماں کے کمرے کی طرف گیا۔ اندر نور بانو بھی موجود تھی اور اماں کے پاؤں دبا رہی تھی اس نے دروازے پر دستک دی۔

❁......❁......❁

حمیدہ کو دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے نور بانو سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''عبدالحق ہیں۔'' نور بانو نے دبی آواز میں کہا۔ پھر بلند آواز میں بولی۔ ''آ جائیے نا۔''

عبدالحق آیا اور حمیدہ کے پاس بیٹھ گیا۔ ''اماں! مجھے اسی وقت واپس جانا ہے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' حمیدہ کے بولنے سے پہلے ہی نور بانو بول اٹھی۔

''مجھے خود پر شرم آ رہی ہے۔ مجھے مینو کا خیال کیوں نہیں آیا۔''

یہ سن کر نور بانو سن ہو کر رہ گئی۔ لیکن حمیدہ اس بات کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے کہا۔ ''اتنے لوگ ہیں۔ زبیر کے جانوروں کا خیال رکھنے والے نوکر بھی ہیں وہاں۔ وہ مینو کا چار دن خیال نہیں رکھ سکتے۔''

''نہیں اماں۔ وہ میرے علاوہ کسی کے ہاتھ سے کچھ کھاتا ہی نہیں۔''

''تو اتنے دن جو تُو لاہور رہا تو کیا وہ بھوکا تھا۔'' حمیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔

عبدالحق نے بے بسی سے نور بانو کی طرف دیکھا۔ ''وہ اماں مجھ سے مانوس ہو گیا تھا۔''

نور بانو نے دبے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ واقعی' وہ کسی کے ہاتھ سے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ چار دن تو وہ بھوکا رہا۔ اسے دیکھ کر رونا آ رہا تھا مجھے۔''

''پر تجھ سے کیسے مانوس ہو گیا؟''

اب اس بات کا جواب نور بانو کیا دیتی۔ ''پتا نہیں اماں۔ اللہ کا کرم تھا۔''

''ارے......جانور ہے وہ۔ بھوک لگے گی تو کسی سے بھی مانوس ہو جائے گا۔''

''نہیں اماں۔ وہ مر جائے گا۔'' عبدالحق نے تڑپ کر کہا۔ ''مجھے ابھی جانا ہو گا۔''

''بس تو پھر ہم سب واپس چلیں گے۔'' حمیدہ نے فیصلہ سنایا۔

نور بانو اسی دوران خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔ ذرا سی دیر میں سب لوگ وہاں آ گئے۔

مسئلہ معلوم ہونے کے بعد رابعہ نے کہا۔ ''صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں۔ مینو کچھ نہیں کھائے گا کسی کے ہاتھ سے۔ میں دیکھ چکی ہوں۔ وہ تو مرنے کے قریب ہو گیا تھا۔ پھر نور بی بی

نے پتا نہیں کیا جادو کر دیا۔''

وہاں جو بحث چھڑ گئی۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا تھا۔ وہ سب عبدالحق کے بغیر رکنے پر آمادہ نہیں تھے' سب واپس جانے کو تیار تھے' اور یہ عبدالحق کو گوارا نہیں تھا۔ اور اکیلے عبدالحق کا جانا ان میں سے کسی کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

وہ بند گلی تھی!

پھر زرینہ کو ہی وہاں امکان کا روزن نظر آیا۔ ''ایک صورت ہے بھائی۔'' اس نے کہا۔

سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''آپ اپنے ڈرائیور کو بھیج کر مینو کو یہاں منگوا لیں۔''

''یعقوب مینو کے لیے اجنبی ہے۔ مینو اس کے قابو میں نہیں آئے گا۔''

روزن کھلتا ہے تو روشنی بھی ہوتی ہے۔ زبیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ فکر نہ کریں صاحب میں جاؤں گا یعقوب کے ساتھ۔ اور بس یہ گیا اور وہ آیا۔ آپ اب بالکل پریشان نہ ہوں۔''

عبدالحق نے احتجاج کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی ایک نہ چلی فیصلہ ہو چکا تھا۔

زبیر اسی وقت یعقوب کے ساتھ گاڑی میں حق نگر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اپنی گاڑی کی افادیت عبدالحق پر کھل گئی تھی۔

ننھا ساجد بھوک سے رویا تو رابعہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''تو نے کہا تھا پتر کہ یہ بنگلہ کسی انگریز کا تھا' اور تُو نے سامان سمیت خریدا ہے؟'' حمیدہ نے عبدالحق سے پوچھا۔

''جی اماں۔''

''تو یہ چادریں' یہ کمبل......میں تو نہیں اوڑھوں گی۔''

عبدالحق مسکرایا۔ ''یہ سب چچا جان نے خریدا ہے' بالکل نیا ہے۔ ایک دن انہوں نے اصرار کر کے اپنے گھر ہمیں اسی لیے ٹھہرایا تھا کہ یہ سب چیزیں مہیا کر دی جائیں۔ آپ بے فکری سے استعمال کریں اماں۔''

حمیدہ مطمئن ہو گئی۔ ''اب تم لوگ جا کر سو جاؤ۔ آدھی رات ہو گئی ہے۔''

وہ اٹھنے لگا تو زرینہ کو خیال آیا۔ ''ایک مسئلہ ہے بھائی۔ صبح حاجت کے وقت اماں کو پریشانی ہو گی۔''

حمیدہ اچھل پڑی۔ ''سچ ہے دھیے۔ مجھ سے تو نہیں بیٹھا جائے گا اس پر۔''

''ایسی کوئی بات نہیں اماں۔ یہ آسان بھی ہے اور آرام دہ بھی۔ میں ابھی اس کا طریقہ بتاتا ہوں آپ لوگوں کو۔''

عملی مظاہرے کے بعد حمیدہ خاصی مطمئن ہو گئی۔ پھر بھی عبدالحق نے زرینہ سے کہا۔ ''تم

صبح اماں کے پاس آجانا۔ کہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ تم تو پوری طرح سمجھ گئی ہونا۔"

"جی بھائی۔"

اس دوران نور بانو کو یہ خیال ستاتا رہا کہ وہ پیچھے رہ گئی ہے۔ اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے کہ وہ یہاں موجود ہی نہیں تھی۔ کاش اماں کی اس پریشانی کی فکر اس نے کر لی ہوتی۔

❁……❁……❁

پانچ دن گزار کر وہ حق نگر واپس ہوئے۔ وہ دن ان سبھوں کے لیے یادگار تھے۔ مسعود صاحب کی بچیاں ہر روز آ جاتی تھیں' اور حمیدہ رابعہ' نور بانو اور زرینہ ان کے ساتھ بازار چلی جاتی تھیں۔ بازار دیکھ کر حمیدہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ بہرحال انہوں نے شادیوں کے لیے ہر ضروری چیز خرید لی تھی۔

واپسی کے سفر میں زبیر ان کے ساتھ نہیں تھا۔ سامان اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ گاڑی میں گنجائش نہیں تھی۔ یہ طے پایا کہ زبیر سامان لے کر لاری کے ذریعے حق نگر پہنچے گا۔

لیکن گاڑی میں ایک مسافر بڑھ گیا تھا...... مینو۔ زبیر اگلے روز مینو کو لاہور لے کر آیا تھا تو مالک اور جانور کا ملن دیکھ کر سبھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ عبدالحق نے تو اس صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ مینو کی بھوک پیاس اس کے لیے بوجھ تھی۔

مینو عبدالحق کو دیکھ کر ایسا بے قرار ہوا تھا کہ کبھی اس کے ہاتھ چاٹتا اور کبھی اس کو ہلکی سی ٹکر مارتا۔ اور عبدالحق کی آنکھوں میں نمی سوکھ نہیں پا رہی تھی۔

مینو کو اپنے ہاتھ سے کھلا کر عبدالحق کو قرار آیا تھا۔ اس کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ مینو کے قیام کا بندوبست ایک خالی سرونٹ کوارٹر میں کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔

❁……❁……❁
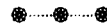
اپنے گھر میں پہلی صبح حمیدہ کو لاہور کا بنگلا بڑی شدت سے یاد آیا!

وہ حاجت کے لیے گئی تو پہلی بار اسے پریشانی ہوئی۔ اس نے دل میں تسلیم کیا کہ کموڈ واقعی اس کے لیے بہت آرام دہ تھا۔ پہلی بار یہاں بیٹھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔

اس رات کھانے کے بعد سب لوگ چلے گئے اور صرف عبدالحق رہ گیا تو اس نے شادی کی بات شروع کی۔ "دیکھو پتر! اب چار دن بعد رمضان کا مہینہ شروع ہو رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں' عید کے چوتھے دن تیری شادی ہو جائے۔"

عبدالحق خوش ہو گیا۔ "جو تمہاری مرضی اماں!"

"اور بقر عید کی کوئی تاریخ ڈاکٹر صاحب کو دے دیتے ہیں زرینہ کے لیے۔"

"ٹھیک ہے اماں۔"

حمیدہ خاموش ہو گئی۔ عبدالحق نے کچھ محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے' لیکن جھجک رہی ہے۔ "کوئی بات ہے اماں؟" اس نے پوچھا۔

"ہے ایک بات پر شاید تجھے بری لگے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو اماں۔ تمہاری بات تو حکم ہے میرے لیے۔ برا لگنے کا کیا سوال۔"

"اس بات سے اور ڈر لگتا ہے۔ میں کچھ کہوں اور تُو اپنے دل کی مرضی کے خلاف اسے حکم بنا لے۔ یہ تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"اچھا بتاؤ تو اماں۔" عبدالحق جھنجلانے لگا۔

"پہلے تُو ایک وعدہ کر۔ میری سنے گا ضرور۔ لیکن اپنے دل کی کرے گا۔"

"ٹھیک ہے اماں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

حمیدہ نے گہری سانس لی۔ "دیکھو پتر' نور بانو میرے لیے بیٹیوں جیسی ہے۔ میں نے ہی اسے تیرے لیے پسند بھی کیا تھا۔ مجھے وہ اپنی بیٹی جیسی لگتی ہے۔ مجھے تو اللہ نے بیٹی دی نہیں۔ مگر میں اس سے اسی طرح پیار کرتی ہوں۔"

عبدالحق کو اس تمہید سے خوف آنے لگا۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے۔

"پتر تُو تو میرا اصلی بیٹا ہے...... میرا پتر۔ دودھ پلایا ہے تجھے میں نے۔ تجھ سے بڑھ کر تو میں کسی کو نہیں سمجھ سکتی۔ اور ہر ماں کا ارمان ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا کامیاب رہے' خوش رہے۔ کبھی پریشان نہ ہو۔ اس کی زندگی میں کبھی دکھ نہ آئے۔ نور بانو میں ایک بڑی خرابی ہے۔ میں اسے سمجھاتی بھی رہتی ہوں اور دعا بھی کرتی ہوں کہ وہ دور ہو جائے۔"

"کچھ بتاؤ تو اماں۔"

"دیکھ پتر' آدمی کی زندگی میں عورت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اچھی بیوی آدمی کے لیے جنت کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ اور بیوی بری ہو تو اپنے مرد کو جہنم کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ اس دنیا میں آدمی کی جنت بھی اس کا گھر ہے اور جہنم بھی۔"

مولوی صاحب نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی تھی۔ عبدالحق ویسے بھی اماں کی فراست کا قائل تھا۔ مگر یہ طویل ہوتی ہوئی تمہید اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کسی آزمائش میں نہ پڑ جائے۔ وہ نور بانو سے ایسی محبت کرتا تھا' جو زندگی کی محبت سے بھی بڑی ہوتی ہے اور اس سے جسمانی رابطے کے بعد تو وہ اس کی ذمہ داری بن گئی تھی۔

"نور بانو کی فطرت میں شک اور بدگمانی بہت ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ شکل و صورت میں خود کو کم سمجھتی ہے۔ اب پتر' شک اور بدگمانی کرنے والا خود بھی عذاب میں رہتا ہے اور دوسرے

کو بھی عذاب میں رکھتا ہے۔ پہلے میں سوچتی تھی کہ شاید تجھ سے شادی ہونے کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا بھی' اور یقین بھی دلا دیا کہ تیری شادی اسی سے ہوگی۔ میرا خیال تھا...... اور اس نے بھی کہا تھا کہ اب یہ چیز ختم ہو جائے گی۔ مگر وہ اب بھی ویسی ہے پتر۔ زرینہ آئی تو وہ زرینہ سے چڑنے لگی۔ اور ابھی اس نے ڈاکٹر صاحب کی بچیوں کے بارے میں بھی ایسا سوچا۔ اگر وہ ایسی ہی رہی تو پتر آگے تجھے ستائے گی۔''

عبدالحق کے دل کا بوجھ ہٹ گیا اور وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ ''تم فکر نہ کرو اماں۔ یہ تو محبت کی وجہ سے ہے۔''

''نا پتر' محبت میں تو آدمی کا دل بڑا ہو جاتا ہے۔ تنگ نہیں ہوتا۔ محبت کسی پر قبضہ کرنا تھوڑی ہے۔''

''میری محبت ملے گی اسے تو یہ خرابی دور ہو جائے گی اماں۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا۔ اب میں خاص طور پر خیال رکھوں گا۔''

حمیدہ پہلے سے جانتی تھی کہ عبدالحق نور بانو سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ اسے ہر حال میں قبول کر سکتا ہے۔ اب اللہ کرے کہ ہر حال میں خوش بھی رہے۔ بہر حال اس کے دل کا بوجھ ہٹ گیا۔ اس نے بیٹے کو خبردار کر دیا تھا۔ اپنا حق ادا کر دیا تھا۔ ''بس ایک بات تجھ سے اور پوچھنی ہے پتر۔'' اس نے کہا۔

''پوچھو اماں؟''

''سچ سچ بتانا۔''

''میں کبھی جھوٹ بولتا ہوں اماں؟''

''بولتا تو نہیں۔ پر نور بانو ہی کی خاطر بول چکا ہے۔ اس کے چاچا کی حقیقت تو نہیں بتائی نا اسے تُو نے۔ تو جھوٹ ہی بولا نا کہ وہ تجھے نہیں ملے۔'' عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔

''وہ تو مجبوری تھی اماں۔ تم بھی سمجھ سکتی ہو۔''

''ہاں میں سمجھتی ہوں کہ تُو نور بانو کی خاطر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ مجھ سے وعدہ کر کہ مجھے سچا جواب دے گا۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں اماں۔''

تجھے نور بانو کیسی لگتی ہے...... کتنی خوب صورت لگتی ہے؟''

عبدالحق نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کر کے نور بانو کا تصور کیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے شعور کی کامل سچائی کے ساتھ کہا۔ ''مجھے وہ بہت خوب صورت لگتی ہے اماں۔ ان سے خوب صورت دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں' کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔''

''لیکن پتر' وہ خوب صورت بالکل نہیں ہے۔ اس کی تو صورت شکل بہت معمولی سی ہے۔''

''میں ایک بات بتاؤں اماں۔ میرا یقین کرو' میں نے بہت ...... بہت حسین لڑکیاں بھی دیکھی ہیں لیکن نور بانو ان سب سے کہیں زیادہ حسین ہے۔''

یہ کہہ کر عبدالحق نے غور سے حمیدہ کو دیکھا اسے امید تھی کہ اب اس کے چہرے پر اطمینان نظر آئے گا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ وہ تو اور زیادہ فکر مند لگ رہی تھی۔

''یہ تو اچھی بات نہیں پتر۔ جس سے محبت کی جاتی ہے' اس کی خرابیوں کو تو سوچ سمجھ کر قبول کیا جاتا ہے۔ ذرا سوچ کہ صحرا کی ریت کو تُو دریا سمجھ کر اس سے محبت کرتا ہے۔ پر جب تو پانی پینا چاہے گا تو وہ پانی تو نہیں ہو گی نا۔ پھر مایوسی ہو گی نا۔ نور بانو تجھے ویسی ہی نظر آنی چاہیے' جیسی ہے۔''

''پتا نہیں اماں۔ شاید اللہ نے مجھے اس کے لیے نظر ہی ایسی دی ہے۔'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

''اور کسی وقت نظر ٹھیک ہو گئی تو۔''

''تم بھی دعا کرو اماں' اور میں بھی دعا کروں گا کہ ایسا کبھی نہ ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوا تب بھی میری محبت کم نہیں ہو گی۔ اماں' میں نے اسے دیکھ کر اس سے محبت نہیں کی تھی۔ میں نے تو اس کی آواز میں قرآن کی تلاوت سن کر اس سے محبت کی تھی' اور وہ بھی اس وقت جب میں ٹھاکر اوتار سنگھ تھا۔ اور اماں' اس کی تلاوت سن کر ہی تو میں ایمان لایا تھا۔ اس کی وجہ سے میں عبدالحق ہوں۔''

''نا پتر' ایسا نہیں کہتے۔ ایمان تو اللہ کے فضل سے ملتا ہے۔ سبب کوئی بھی ہو۔ تجھے تو اللہ پہلے ہی سے ایمان کے راستے پر چلا رہا تھا۔ ورنہ تُو ننھا سا بچہ جان پر کھیل کر میرے دودھ کے لیے ضد کیوں کرتا۔''

''پھر بھی اماں' وسیلے کی بھی تو اہمیت ہوتی ہے۔''

حمیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ بولی۔ ''تو اب جا پتر۔ میں تیرے لیے ہمیشہ دعا کروں گی۔''

❁......❁......❁

پنجرے میں آنے والے نئے پرندوں کو پنجرے سے مانوس ہونے میں بہت وقت لگتا ہے اور اس سے پہلے وہ رہائی کی بھرپور کوشش کرتے ہیں!

خانم بھی کوٹھے پر آنے والا نیا پنچھی تھی۔ نام تو اس کا فریدہ تھا۔ لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے اس کے نام سے پکارے۔ اس کا اصرار تھا کہ اسے خانم ہی کہا جائے۔ نرگس بننے والی نادرہ اس بات کو سمجھ سکتی تھی۔

خانم نے وہاں کسی کو دوست بنایا تو وہ نادرہ ہی تھی۔ جب بھی موقع ملتا تو وہ دونوں باتیں کرتیں۔ ارجمند کو بھی خانم بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اکثر ان کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سنتی۔

خانم بہت خوب صورت اور شیریں لہجے میں باتیں کرتی تھی۔ ''تم ہندوستانی تو نہیں لگتیں؟'' ایک دن نادرہ نے کہا۔

''نہیں۔ میں ایرانی ہوں۔'' خانم نے کہا۔

''تو یہاں کیسے آگئیں؟''

''محبت لے آئی۔'' خانم نے گہری سانس لے کر کہا۔

نادرہ کو احساس ہوا کہ وہ بھی کوئی کہانی ہے۔ ''کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''آغا ہندوستانی تھے۔'' خانم نے کہا۔ ''وہ تجارت کے سلسلے میں اصفہان آئے تھے۔ وہاں میں نے انہیں دیکھا اور مجھے پہلی نظر میں ان سے محبت ہوگئی۔ میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔''

''پھر؟''

''میں اس وقت صرف 17 سال کی تھی اور اتنی خوب صورت تھی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔''

''تصور کی کیا ضرورت ہے۔'' نادرہ نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''تم میرے سامنے ہو۔ اور اس وقت بھی ایسی حسین ہو کہ تم پر نظر ٹھہرتی ہی نہیں۔''

''نہیں' اُس وقت تو میں پری تھی' پری۔'' خانم نے سرد آہ بھر کے کہا۔ ''آغا مجھے رد نہیں کر سکتے تھے لیکن بھلے آدمی تھے۔ بولے...... تمہارا میرا کیا جوڑ۔ تم سے تو بڑے میرے بچے ہیں۔ میں تم پر ظلم نہیں کرسکتا۔ مگر میں تو محبت میں اندھی ہو رہی تھی۔ سمجھ نہیں سکی کہ میں واقعی اپنے ساتھ ظلم کر رہی ہوں۔ میں تو ان کے پیچھے پڑ گئی کہ ان سے شادی کروں گی یا جان دے دوں گی......''

''تم سے بڑے بچے تھے ان کے!'' نادرہ نے حیرت سے کہا۔ ''تو ان کی عمر کیا ہوگی۔''

''ساٹھ کے لگ بھگ تھے۔''

''تو تمہیں ان سے محبت کیسے ہوگئی!''

''محبت کا عمر سے' مذہب سے' ذات پات سے اور طبقے سے کیا تصادم۔ محبت تو کسی کو بھی کسی سے بھی وقت ہوسکتی ہے۔ اور یہ تو انہوں نے ہی بتایا تھا کہ وہ ساٹھ سال کے ہیں۔ ورنہ وہ لگتے تو جوان تھے۔ اور اتنے وجیہہ کہ ان جیسا کوئی میں نے آج تک نہیں دیکھا مگر محبت کے لیے وجاہت کی بھی شرط نہیں۔ بس ہوگئی تو ہوگئی۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' نادرہ نے آہ بھر کے کہا' اور دل میں سوچا محبت تو اسے بھی ہوگئی تھی اوتار سنگھ سے۔ ''خیر...... پھر کیا ہوا؟''

''اب آغا میرے حسن کے سامنے ٹک تو نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے شادی کر لی اور مجھے اپنے ساتھ الہ آباد لے گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ واقعی ان کا سب سے چھوٹا بیٹا بھی مجھ سے بڑا تھا۔

''ان کی بیوی بچوں نے تمہیں قبول کر لیا؟''

''نہیں۔ مگر مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ آغا کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے الگ گھر لے کر دیا۔ بڑی عزت اور آسائش کے ساتھ رکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھ پر جان دیتے تھے۔''

''پھر ہوا کیا؟''

اس کے بعد وہ عام سی کہانی تھی۔ پانچ سال بعد آغا چل بسے۔ ان کا بڑا بیٹا خانم کے پاس آیا۔ اس نے خانم سے کہا کہ وہ اس کے حصے کا ترکہ دے کر اسے کسی کے ساتھ اصفہان واپس بھیج رہا ہے۔ اور اس کا لہجہ ایسا فیصلہ کن تھا کہ خانم کچھ بھی نہ کرسکی۔

بعد میں پتا چلا کہ سب دھوکہ تھا۔ وہ شخص بردہ فروش تھا۔ اس نے خانم سے سب کچھ چھین لیا۔ شاید وہ سب کچھ آغا کے بیٹے سے پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ پھر اس نے خانم کو بیچ دیا۔ اور وہ لاہور آگئی۔

نیلم بائی کے پاس آنے سے پہلے وہ ایک اور کوٹھے پر تھی۔ وہ ہمیشہ فرار ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ اسی لیے نائیکہ نے اسے نیلم بائی کے پاس فروخت کر کے اپنی جان چھڑالی۔ ''تم دیکھنا' میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔ میں رکنے والی نہیں۔''

''مگر جاؤ گی کہاں؟''

''کہیں بھی۔ دنیا بہت بڑی ہے۔''

نادرہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ دنیا بہت چھوٹی ہے۔ اس سے زیادہ لٹو گی تم' اور کہیں پناہ بھی نہیں ملے گی۔ ٹھکانا بھی میسر نہیں ہوگا۔''

''تم مجھے پڑھا رہی ہو۔ تم تو مجھ سے چھوٹی ہو۔''

''لیکن بہت کچھ دیکھ چکی ہوں۔ سنو خانم' ہمیں دنیا میں کہیں عزت نہیں مل سکتی۔ ہم جس گھر میں بھی جائیں گے' وہ ہمارے لیے کوٹھا ہی بن جائے گا۔ پامال ہونا تو ہمارا مقصد ہے۔ سو کوٹھوں پر پامال ہونے سے بہتر ہے کہ ایک کوٹھے پر ہزار بار پامال ہو جائیں۔''

''یہ تمہارا نظریہ ہے۔ میرے حلق سے نہیں اترے گا۔'' خانم نے بے پروائی سے کہا۔

''باہر تمہارے حق میں ہر شخص شکاری ہوگا۔''

''دیکھا جائے گا۔''

''آپ انہیں آغا کیوں کہتی تھیں؟'' ارجمند نے اچانک ہی خانم سے پوچھ لیا۔

نادرہ بری طرح چونکی۔ ''ارے گڑیا' تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔''

ارجمند نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''بتایئے نا۔'' اس نے خانم سے کہا۔

''آقا سمجھتی ہونا؟'' خانم نے اس سے پوچھا۔

''جی...... مالک کو کہتے ہیں۔'' ارجمند نے کہا۔

''تو فارسی میں آقا کو آغا کہتے ہیں۔''

خانم نے فرار ہونے کا خیال ترک نہیں کیا تھا۔ اور نادرہ اس کی واحد رازدار تھی۔ اس نے ایسے وقت میں فیصلہ کیا' جب نیلم بائی اور لڑکیاں سو رہی ہوں۔ اور وہ خالی ہاتھ بھی فرار ہونا نہیں چاہتی تھی۔

نادرہ کے لیے وہ بڑی عجیب کشمکش تھی۔ خانم کسی طرح اس کی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ باہر کی زندگی اس کوٹھے کی زندگی سے ہزاروں گنا بھیانک ہوگی۔

بالآخر اس نے نیلم بائی کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

''تو تم میری ایسی وفادار ہو؟'' سب کچھ سننے کے بعد نیلم بائی نے نادرہ سے پوچھا۔

''جی نہیں۔ میں نے تو خانم کی بہتری کے خیال سے آپ کو مطلع کیا ہے۔''

مجھے تمہارا سچ بھی اچھا لگا نرگس۔ میں تو تمہیں بری لگتی ہوں گی۔ مجھ سے وفاداری کیسی۔ مجھے تم شروع ہی سے اچھی لگی تھیں۔ تم عقل مند ہو' پڑھی لکھی ہو۔ سب کچھ سمجھتی ہو۔ لیکن افسوس کہ تم مجھے نہیں سمجھ سکیں۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''چھوڑو اس بات کو مجھے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔''

اگلے روز خانم زیورات کی پوٹلی لے کر باہر نکلی۔ مگر زینے سے اترتے ہی اسے کوٹھے کے دلال کاسو نے دبوچ لیا' اور گھسیٹتا ہوا اوپر لے آیا' جہاں نیلم بائی موجود تھی۔ نادرہ کی مخبری کی وجہ سے وہ پہلے جاگ چکی تھی لیکن سوتی بن رہی تھی۔

''لو سنبھالو بائی اس حرام زادی کو۔'' کاسو نے خانم کے تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''کہو تو یہیں زندہ گاڑ دوں سالی کو۔''

''نہیں کاسو تو جا۔''

''تو تم نے مجھے بے خبر سمجھا تھا۔'' نیلم بائی نے خانم سے کہا۔

''دوستوں نے دغا کی ہے' ورنہ تمہیں تو پتا بھی نہیں چلتا۔'' خانم نے نادرہ کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''دغا نہیں کی' نادرہ نے بھلا کیا تیرے ساتھ۔ پر یہ تو بتا کہ تُو چوری کر کے بھاگ رہی تھی۔''

''چوری کیسی ... مال تمہارا ... ان سب لڑکیوں کی کمائی ہے' جو تم سمیٹ کر بیٹھی ہو۔ کیا

دیتی ہو تم انہیں۔''

حیرت انگیز طور پر نیلم بائی پُرسکون تھی۔ ''کیا نہیں دیتی۔ زیور' کپڑا جو مانگیں ملتا ہے۔ اپنی مرضی کا کھاتی ہیں۔ اور بتاؤں' سب سے بڑی چیز کیا دیتی ہوں میں۔ عزت تو نہ میرے لیے ہے' نہ تم میں سے کسی کے لیے۔ اس کے باوجود میں تھوڑی سی سہی' لیکن عزت بھی دلاتی ہوں۔ ایک چھت کی عزت تو ہے نا تمہارے پاس۔ اور کوئی گاہک میری کسی لڑکی کو ذلیل نہیں کرسکتا۔ زیادتی نہیں کرسکتا اس کے ساتھ۔''

''اسے عزت کہتی ہو تم؟'' خانم نے حقارت سے کہا۔

''ہم ذلت میں گرے لوگوں کے لیے عزت اتنی بھی بہت ہے۔'' نیلم بائی کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ ''میں اگر لڑکیوں کو بھاگنے سے روکتی ہوں تو صرف ان کے بھلے کے لیے۔ یہ بات صرف نرگس نے سمجھی۔ آج سب لڑکیوں کے سامنے کہتی ہوں' جو چاہے' یہاں سے چلی جائے۔ میں نہیں روکتی۔ پر ایک شرط ہے۔ سال دو سال میں عزت کی زندگی نہ ملے تو اسی کوٹھے پر واپس چلی آنا۔''

وہاں سناٹا چھا گیا۔ نادرہ بھی حیران تھی۔

''تیرے لیے اس کوٹھے پر عزت نہیں ہے' اور باہر ہے' تو جا اور اپنے حصے کی عزت حاصل کر لے۔'' نیلم بائی نے خانم سے کہا۔ ''اور یہ زیورات لے کر جا رہی تھی نا' جا او نے پونے بیچتی اور زحمت بھی ہوتی تجھے۔ تو میں اس زحمت اور نقصان سے بچا رہی ہوں تجھے۔ یہ لے' ہزار روپے ہیں یہ۔'' اس نے نوٹوں کی گڈیاں خانم کے آگے پھینک دیں۔ ''جا...... اور دیکھ کہ باہر کتنی عزت ملتی ہے تجھے۔ جسم فروشی تو مجبوری ہے ہماری۔ پیشہ ہے ہمارا۔ اور اس کی ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ مجھے بھی کسی نے یہاں لا کر بٹھایا تھا۔ میں بھی تم جیسی ہی تھی۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔ ''میں بھی بھاگنا چاہتی تھی اور بھاگی بھی۔ پر باہر جا کر سمجھ میں آیا کہ جسم فروشی کا مطلب ہے' جسم بیچنا۔ مگر باہر لوگ مفت میں لوٹ لیتے ہیں۔ ساتھ میں ٹھوکر بھی مارتے ہیں اور دل بھر جائے تو مفت کا مال دوستوں میں بھی بانٹتے ہیں۔ یہ عزت ملتی ہے سمجھیں...... یہ ہے ہماری عزت اور میرے کوٹھے پر کوئی میری کسی لڑکی سے بدتہذیبی بھی کرے تو میں اسے پٹواتی بھی ہوں' اور اٹھوا کر نیچے پھنکوا بھی دیتی ہوں۔ اور ضرورت پڑے تو تھانے میں بند بھی کروا دیتی ہوں۔ جسم فروشی تو مجبوری ہے۔ مگر جو عزت تمہیں مل سکتی ہے' میں تمہیں دلواتی ہوں۔ میں ان عزت داروں کو ذلیل بھی کرتی ہوں' جنہوں نے ہمیں ذلت اور بے آبروئی دی۔ اب تُو یہ نوٹ اٹھا اور جہاں دل چاہے چلی جا۔ دروازہ کھلا ہے' اور تُو میری طرف سے آزاد ہے' کبھی مدد کی ضرورت ہو تو واپس آ جانا۔ رات کو یہ دروازہ سب کے لیے کھلا ہوتا ہے۔''

خانم نے نوٹ اٹھائے اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''ارے سن۔'' نیلم بائی نے پکارا۔
''اپنے کپڑے تو لے جا۔ کیا اسی ایک جوڑے سے بھٹکتی پھرے گی۔'' پھر وہ دوسری لڑکیوں کی طرف مڑی۔ ''تم میں سے جو بھی جانا چاہے' چلی جائے۔ اور میں خالی ہاتھ بھی نہیں بھیجوں گی کسی کو۔ تمہاری ہی کمائی ہے' تمہیں ہی دوں گی۔''
تمام لڑکیاں پلٹ کر کمروں کی طرف چلی گئیں۔
''مجھے یہاں کے کپڑے بھی نہیں چاہیں۔'' خانم نے نخوت سے کہا۔
''میری ہر بات یاد رکھنا۔''
اور خانم چلی گئی۔
نیلم بائی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ نادرہ نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ ''چلو بوا' اپنے کمرے میں چلو۔''
وہ اسے اس کے کمرے میں لے گئی۔ کٹورے میں پانی لا کر دیا۔ ''ایسا کیا ہو گیا بوا؟''
''کچھ بھی نہیں نرگس۔ بس پرانے زخم ہرے ہو گئے۔''
''اب بس بھی کرو۔''
''کیسے بس کروں۔ برسوں کے رکے ہوئے آنسو ہیں۔ ایسے خشک تھوڑی ہوں گے۔''
نادرہ اسے تھپکتی رہی۔ اس وقت اسے اس عورت پر ترس آ رہا تھا' جو ظالم بھی تھی اور مظلوم بھی۔

❁......❁......❁

رمضان المبارک بہت طاقت ور مہینہ ہے۔ اللہ کی رحمت کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا ہو تو آدمی اس مہینے میں دیکھے۔ جو متوجہ نہ ہو اسے بھی اللہ کی رحمت اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔
یہ بات عبدالحق نے مولوی صاحب سے کی تو وہ مسکرائے۔ ''عبدالحق پتر' اللہ کی ہر رحمت بڑی ہوتی ہے۔ بندہ نہیں جان سکتا کہ کون سی رحمت کتنی بڑی ہے۔ پر بندے کی فطرت ہے۔ وہ قیاس تو کرتا ہے۔ میں بھی کرتا ہوں۔ تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ نے سب سے بڑی رحمت فرمائی کہ انسانوں کو ہدایت کے لیے پیغمبر مبعوث فرمائے۔ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ اس نے سورۃ الملک میں فرمایا نا کہ...... الا یعلم من خلق. جس نے پیدا کیا' وہ ہی نہ جانے! وہ جانتا ہے کہ کون بدبختی پر اڑا رہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ بدبختی پر اڑے رہنے والے اس کے پیغمبروں کو جھٹلائیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان نہیں لانے والے کسی طور پر ایمان نہیں لائیں گے' خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ مگر رحمت کا تقاضا تھا کہ ان پر اتمام حجت کیا جائے۔ پیغمبروں کو تو اللہ کے قانون کے مطابق رخصت ہو جانا تھا۔ اب کوئی قیامت کے دن اپنی صفائی میں کہے کہ میرے رب' میں تو تیرے پیغمبر کے وصال کے بعد پیدا ہوا تھا۔ یا کوئی کہے کہ پیغمبر کی فلاں بات مجھے بھول

گئی تھی۔ تو اس حجت کے سلسلے کو تمام کرنے کے لیے اللہ نے صحیفے نازل فرمائے۔ اپنے پیغمبروں کو سند اور اپنے بندوں کو تحریری ہدایت سے نوازا۔ بدبختوں نے ان کتابوں میں بھی ترمیم اور تحریف کر ڈالی۔ مفاد کے خلاف جو بات ہوئی' اسے چھپا لیا' یا حذف ہی کر دیا۔ اور اپنے مطلب کی کوئی بات اس میں نہ پائی تو اسے شامل کر دیا۔
''اتمام حجت کا وہ سلسلہ عہد بہ عہد تھا۔ اصل اتمام حجت تو بعد میں ہونا تھا...... قیامت تک کے لیے تو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ دین مکمل فرما دیا۔ شریعت مکمل فرما دی۔ اور اپنی آخری کتاب' حتمی سند جاری کر کے ہمیشہ کے لیے حجت تمام کر دی۔
''اور قرآن کے معاملے میں اللہ نے صرف نزول نہیں فرمایا۔ آخری کتاب تھی' قیامت تک کے لیے تھی۔ اس لیے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرمایا۔ اور اسے جھٹلانے والوں کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے انہیں ایسا واضح چیلنج بھی کر دیا' جس پر پورا نہ اترنے کے بعد انکار کرنے والے کے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ چیلنج تھا کہ اگر یہ اللہ کا کلام نہیں' بشری کلام ہے۔ تو تم بھی بشر ہو۔ اس کلام کے جیسی ایک سورۃ بنا کر لے آؤ' چلو' ایک آیت ہی بنا کر لے آؤ۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ اُس دور میں بڑے بڑے اہل زبان اور قادر الکلام شاعر تھے۔ لیکن کوئی اس بے مثل کلام کی مثال نہیں لا سکا۔ اللہ کا چیلنج سچا ہے۔ قیامت تک کوئی نہیں قبول کر سکے گا۔''
عبدالحق بیٹھا سنتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ مولوی صاحب بات کرتے ہوئے بھٹکتے نہیں۔ اس لیے وہ تحمل سے سن رہا تھا۔
''تو پتر' میرے خیال میں قرآن اللہ کی سب سے بڑی رحمتوں میں سے ہے۔ اور یہ قیامت تک انسان کے ساتھ رہے گی۔ یہ معجزہ ہے۔ تاریخ کو دیکھو۔ بغداد کی تباہی ہوئی۔ کتب خانے جلا دیے گئے۔ کتنے ہی علوم ناپید ہو گئے۔ لیکن چاہے دنیا بھر کے کتب خانے جلا دیے جائیں' اللہ کا وعدہ ہے کہ قرآن موجود رہے گا۔ کیسے؟ دنیا میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں۔ تو قرآن بھی محفوظ ہے۔''
''درست ہے مولوی صاحب۔ لیکن رمضان......''
'وہی بتا رہا ہوں پتر۔ صحیفے اللہ کی بڑی رحمتوں میں سے ہیں۔ تاریخ ابن کثیر میں ابوزر دمشقی کی عبداللہ بن صالح اور معاویہ بن صالح کے حوالے سے روایت ہے کہ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ماہ رمضان المبارک کی چھ راتیں گزرنے کے بعد نازل ہوئی۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر رمضان المبارک کی بارہ راتیں گزرنے کے بعد نازل ہوئی۔ انجیل حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر ماہ رمضان المبارک کی اٹھارہ راتیں گزرنے کے بعد نازل ہوئی۔ اور قرآن حضرت محمد ﷺ پر ماہ رمضان المبارک کی چوبیس راتیں گزرنے کے بعد نازل ہوا۔ تو پتر' یہ اللہ کی رحمت کا خاص مہینہ ہے نا۔ مسجد کا حال دیکھ رہے ہو اس ماہ میں عام دنوں میں تین صفیں مشکل سے پوری

ہوتی ہیں۔ اور آج کل مسجد کے باہر بھی صفیں بچھانی پڑ رہی ہیں۔ پتر! گیارہ مہینے کے محروم بھی اس مہینے اللہ کے دامن سے لپٹ جاتے ہیں۔ انہیں بھی اللہ اس ماہ مبارک میں اپنی رحمت سے نوازتا اور آخرت کے لیے زادِ راہ عطا فرماتا ہے۔ یہ انسانوں اور بالخصوص مسلمانوں پر اس کی رحمت کا خاص مہینہ ہے۔"

یہ تو واقعی بڑی واضح دلیل تھی۔ اپنی چاروں کتابیں اللہ نے ماہ رمضان میں نازل فرمائیں۔ یعنی اس مہینے میں اللہ کی خاص رحمت ہوتی ہے۔ اور عبدالحق تو ذاتی طور پر اس رحمت کا مشاہدہ کر چکا تھا۔

اسے اس کا تجربہ تھا۔ اسے تو سب کچھ ملا ہی اسی مہینے میں تھا۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا کہ رمضان کا چاند طلوع ہوا تو اللہ نے اس پر رحمت کے دروازے کھول دیے۔ رمضان کی پہلی شب میں ہی اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور اسلام قبول کرتے ہی اس نے پورے روزے رکھے تھے۔

یہ رمضان بھی اس کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا۔ اس کے کھوئے ہوئے شب و روز نہ صرف لوٹ آئے۔ بلکہ اور سج سنور گئے۔ اسے اپنا کھویا ہوا ارتکاز واپس مل گیا۔ نماز میں حضوری کی کیفیت واپس آ گئی۔ قرآن دل میں اترنے لگا۔

کیوں نہ اترے۔ یہ مہینہ ہی نزولِ قرآن کا ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

اس عرصے میں کبھی بیٹھے بیٹھے اسے محض ایک لمحے کے لیے نور بانو کا خیال آتا' اور فوراً ہی معدوم ہو جاتا۔ ارتکاز کے گہرے پانی میں تصور کا کوئی کام نہیں تھا۔ وہ نور بانو کا تصور کیا کرتا' اسے تو وہاں اپنا عکس ہی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اور پھر یہ اطمینان بھی تھا کہ جدائی کے بس چند روز ہی رہ گئے ہیں۔

پھر ایک دن مولوی صاحب نے اس سے کہا۔ "پتر عبدالحق' اس بار تم اعتکاف میں بیٹھو۔"

عبدالحق نے یہ لفظ سنا تو تھا لیکن اس کے بارے میں جانتا کچھ نہیں تھا۔ اس نے مولوی صاحب سے اس بارے میں پوچھا۔

"اعتکاف آخری عشرے کا ہوتا ہے۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "بیسویں روزے کی افطار کے ساتھ بندہ اعتکاف کی نیت سے مسجد میں مقیم ہو جاتا ہے' اور پھر عید کا چاند ہونے کے بعد اعتکاف سے باہر آتا ہے۔ اس دوران وہ اللہ کا مہمان ہوتا ہے۔"

"مگر اس میں کرنا کیا ہوتا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں' اور بہت کچھ۔ اصل میں تو وہ ساری دنیا سے کٹ کر اللہ کا ہو رہتا ہے' جو کہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہ بات تو اللہ نے قرآن میں کئی جگہ فرمائی ہے کہ سب سے کٹ کر' یکسو ہو کر اللہ کے ہو رہو۔ اور یہ بات اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی فر... کہ وہ

ایسے ہی تھے۔"

"پھر بھی مولوی صاحب' کرنا کیا ہوتا ہے اعتکاف میں؟"

"صرف اللہ کا ہو رہنا ہے۔ دنیا سے کنارہ کر لو۔ دنیا کے مسائل کو بھول جاؤ اور صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اب سب سے کٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ دین کی کوئی ضروری بات کسی سے پوچھنی ہے تو پوچھ لو۔ ورنہ غیر ضروری طور پر کسی سے بات بھی نہیں کرو۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے۔" عبدالحق نے خوش ہو کر کہا۔ "لیکن مجھے تو نماز کے سوا کچھ آتا بھی نہیں ہے۔"

"سب کچھ آتا ہے تمہیں۔ تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "ایک تو رمضان مہینہ ہی نزولِ قرآن کا ہے۔ کہتے ہیں' اس میں قرآن پر توجہ دو تو اللہ فہمِ قرآن عطا فرماتا ہے۔ پھر یہ آخری عشرہ! قرآن کا نزول اسی عشرے ہی میں شروع ہوا تھا۔"

"کب شروع ہوا تھا؟"

"یہ تو اللہ نے نہیں بتایا۔ بس یہ یقینی ہے کہ اس عشرے میں جو پانچ طاق راتیں ہیں' ان میں سے کسی ایک رات میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا...... یعنی ۲۱ ویں' ۲۳ ویں' ۲۵ ویں' ۲۷ ویں اور ۲۹ ویں شب میں سے کوئی شبِ قدر ہے۔"

"اللہ نے صاف صاف کیوں نہیں بتا دیا؟"

"اپنی مصلحت وہ آپ جانے۔ ہمیں تو بس ماننا ہے۔ اب بندے کی فطرت میں غور کرنا بھی ہے۔ تو ایمان کی بات یہ ہے کہ اللہ سراپا رحمت ہے اور بندوں کی بہتری چاہتا ہے۔ تو اس کو چھپانے میں بھی بندوں کی بہتری ہے۔"

"مجھے بھی سمجھائیے۔"

مولوی صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ "دیکھو' قرآن پاک ہمیں بتاتا ہے کہ شب بیداری کی بڑی اہمیت ہے۔ شب بیداری اللہ کو بہت پسند اور اس کی بارگاہ میں بہت مقبول ہے۔ اور یہ عام راتوں کی بات ہے۔ خاص راتوں میں بیداری کی مقبولیت اور اجر بہت بڑھ جاتا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ یہ بات جاننے کے باوجود بھی ہم شب بیداری کتنی کرتے ہیں؟"

عبدالحق شرمسار ہو گیا۔ شب بیداری تو بہت دور کی بات ہے۔ وہ تو نور بانو کی محبت میں' اس کے تصور میں اپنی راتیں سیاہ کرتا رہا تھا...... رائیگاں...... بلکہ الٹا گناہ گار۔

"میں تو اس معاملے میں صفر ہوں مولوی صاحب۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔

"ہم عام بات کر رہے ہیں پتر۔ اللہ کے خاص بندوں کی اور بات ہے۔ ہم عام بندے تو بس نمازوں کی پابندی کر لیتے ہیں۔ شب بیداری کا اعزاز کسے نصیب ہوتا ہے۔ اب سوچو کہ یہ

مہینہ رحمت والا ہے۔ اس میں اللہ کی رحمت اور فضل وکرم سے بے نمازی بھی پنج وقت نمازی ہو جاتے ہیں۔ تو اللہ نے شب قدر کی فضیلت سے آگاہ کر کے ہم عام بندوں کے لیے اس اعزاز کو پانے کا سامان کر دیا۔ ہم عام لوگوں میں سے ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ شب قدر میں پوری رات اللہ کی بارگاہ میں رکوع وسجود کرے گا اور حاضری لگائے گا۔ اور ایسا ہوتا بھی ہے۔

''اب رحمت والے رب نے اپنی رحمت کو اور بڑھا دیا۔ شب قدر کی ترغیب دے کر' شوق دلا کر اس نے شب قدر کو چھپا لیا۔ اس نے کہا کہ آخری عشرے کی پانچ راتوں میں کوئی ایک شب قدر ہے۔ سو اسے ان پانچ طاق راتوں میں تلاش کرو۔

''تو اب ہم کیا کریں گے؟ ان پانچ راتوں میں دنیا سے کٹ کر اللہ کے ہو کر رہ جائیں گے۔ پانچ راتوں میں قیام کریں گے تو ہمارا اجر بھی تو پانچ گنا ہو جائے گا یہ اس کی رحمت ہے نا۔ جو بندہ ایک رات جاگنے والا نہیں' وہ اسے پانچ راتیں دے رہا ہے۔''

''لیکن مولوی صاحب' شب قدر تو ایک ہی ہو گی نا؟'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''ٹھیک کہتے ہو پتر۔ لیکن میں نے کہا نا کہ اللہ کے ہاں تو عام رات کا بھی بڑا اجر ہے۔ اگر تم نے پانچوں راتوں میں قیام کیا تو ایک شب قدر تو تمہیں ملی نا' جس کا اجر بہت بڑا ہے۔ اور چار عام راتیں سمجھ لو۔ اجر تو ان کا بھی بڑا ہے۔ اور تمہیں تو مفت میں ملیں نا۔ پھر پتر' یہ بہر حال عام راتیں نہیں۔ ماہ نزول قرآن کے آخری عشرے کی راتیں ہیں یہ۔ ان کا اجر عام راتوں سے تو بہت زیادہ ہو گا۔

''پھر اللہ کی رحمت ایسی ہے پتر کہ گناہ کی سزا مقرر ہے۔ مگر وہ قدرت والا چاہے تو معاف کر دے۔ اور نیکی کا اجر مقرر ہے...... مگر کم از کم گناہ کی سزا تو وہ وہی دے گا جو مقرر ہے۔ اس سے زیادہ ہر گز نہیں۔ لیکن نیکی کا اجر وہ کم از کم تو دے گا ہی۔ پر چاہے تو ستر گنا زیادہ دے اور چاہے تو سات سو گنا زیادہ دے۔ اور چاہے تو ہمارے تصور سے بھی کہیں بڑھ کر دے۔ تو یہ بندے کے اخلاص اور اللہ کی رحمت پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو ہمیں پانچوں راتوں کا اجر شب قدر کے حساب سے دے۔ اور کون جانے کہ اجر میں اللہ کی طرف ذوق شب بیداری مل جائے۔''

بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ عبدالحق نے دل میں سوچا۔ کیسی بات ہے کہ گناہ کی سزا بھی مقرر ہے اور نیکی کا اجر بھی۔ لیکن وہ غفور الرحیم سزا کبھی بڑھا کر نہیں دیتا اور اجر کبھی گھٹا کر نہیں دیتا۔ سزا میں کمی بھی کر دیتا ہے اور خوش ہو کر معاف بھی کر دیتا ہے۔ لیکن بندے سے ناراض ہو' تب بھی اس کا اجر کم نہیں کرتا۔ اور خوش ہو تو اجر بے حساب کر دیتا ہے۔

بے شک اس کی رحمت نے پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے!

❀......❀......❀

نادرہ کو وہ کوٹھا جہنم کا ایک حصہ لگتا تھا لیکن سال میں چالیس دن ایسے آتے تھے کہ وہ یہاں

بھی خوش رہتی تھی۔ ان میں تیس دن رمضان کے ہوتے تھے اور دس دن محرم کے۔ اس عرصے میں تو اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ کوٹھے کا کاروبار چلانے والی نائیکہ بھی عورت ہی ہوتی ہے۔

شعبان کی 29 کو نادرہ بڑے شوق سے کوٹھے پر جاتی تھی' خود کو دکھانے کے لیے نہیں' بلکہ چاند دیکھنے کے لیے۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا ہوتا تھا اور وہ سراپا دعا ہوتی تھی' اللہ میاں' آج چاند ہو جائے۔ اور چاند نظر نہ آتا تو وہ دل گرفتہ سی واپس آتی۔ وہ سوچتی' اب گناہ کی ایک اور تاریک رات گزارنی ہو گی۔

اسے بچپن یاد آیا۔ انتیس کے چاند کی کتنی خوشی ہوتی تھی۔ مگر اس وقت 29 کا چاند اس لیے اچھا لگتا تھا کہ عید میں ایک دن کا فاصلہ کم ہو جاتا تھا۔ اس وقت اصل اہمیت عید کے چاند کی تھی۔ 29 رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو بچے کیسے اداس ہو جاتے ہیں کہ عید ایک دن کے لیے دور ہو گئی۔

تو جب کوٹھے پر وہ پہلی بار چاند دیکھنے کے لیے گئی تو اس کی وہی کیفیت تھی...... بچوں والی۔ لیکن جب اس نے کوٹھے پر ایک سال سے زیادہ وقت گزار لیا تو وہ بالکل بدل گئی۔ چاند دیکھنے کے لیے تو وہ اب بھی جاتی تھی۔ لیکن 29 کا چاند اب اسے برا لگتا تھا۔

اور اس کی بہت معقول وجہ بھی تھی!

29 شعبان کو وہ کوٹھے پر جاتی تو باہر بازار کی وہی روز والی کیفیت ہوتی تھی۔ وہی چھل پہل' جس سے اسے نفرت تھی۔ پان' دودھ اور شربت کی دکانوں پر وہی ہجوم' وہی اٹھتی ہوئی' کپڑوں کے آر پار جاتی اور جسم کو چھیدتی ہوئی نظریں۔ اس کا دل ایسا گھبراتا کہ جی چاہتا' پلٹ کر بھاگ جائے۔ لیکن چاند کی دید کی اپنی اہمیت ہے۔ اس کی قیمت کتنی ہی ہو' ادا کی جا سکتی ہے۔

پھر چند لمحوں میں وہ باہر کا سب کچھ بھول جاتی۔ اس کی نگاہیں چاند کی تلاش میں افق کو ٹٹولنے لگتیں۔ دل کی دھڑکنوں میں بس یہ دعا ہوتی کہ آج چاند ہو جائے۔

قانون قدرت ہے کہ 29 کا چاند آسمان پر زیادہ دیر نہیں رہتا۔ اسے پتا چل جاتا کہ چاند نہیں ہوا' اور اب وہ ہو گا بھی نہیں۔ پھر بھی وہ کسی معجزے کی امید میں افق کو تکتی رہتی۔ یہاں تک کہ اندر سے کسی گاہک کا بلاوا آ جاتا۔ اور وہ رات اس کی زندگی کی سب سے اذیت دہ رات بن جاتی۔

کہتے ہیں' دنیا کے بیشتر لوگ چاند کے معاملے میں عمر بھر بچے ہی رہتے ہیں' کبھی بڑے نہیں ہوتے۔ لیکن وہ اپنے بارے میں سوچتی کہ وقت نے کس طرح اسے بڑا بنا دیا ہے۔ اس کے رویے صرف ایک سال کے عرصے میں بالکل الٹ گئے ہیں۔ رمضان کا چاند 29 شعبان کو دیکھنے کے لیے وہ ڈرتے ڈرتے کوٹھے پر جاتی۔ لیکن تیس کا چاند ہوتا تو وہ مغرب کی نماز میں ہوتی' مگر اس کا دل کوٹھے پر ہوتا۔ وہ بے تابی سے نماز پڑھتی کہ جلدی سے جائے اور چاند دیکھے۔ وجہ یہ تھی کہ تیس کا چاند حتمی ہوتا ہے۔ کوٹھے پر جا کر دیکھو تو لگتا ہے کہ دنیا پُرسکون ہو گئی ہے۔ ہر طرف سناٹا ہوتا۔

سب دکانیں بند ہوتیں۔ تماش بینوں کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ وہ چاند دیکھ کر بڑے سکون سے دعا مانگتی' اور دیر تک وہاں بیٹھی رہتی۔

اور 29 رمضان کو پورے دن اس پر ہول طاری رہتا...... یا اللہ' کہیں چاند نہ ہو جائے۔ اس روز اس میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ جا کر چاند دیکھے۔ بلکہ عید کا چاند تو وہ دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اپنے حصے کے عید کے چاند تمام کے تمام وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اب عید کا چاند اس کے لیے ایسا ہی تھا' جیسے قربانی کے بکرے کے لیے بقر عید کا چاند' بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ بکرے کو دس بارہ دن کی مہلت ملتی ہے چاند کے بعد' اسے تو دس بارہ منٹ بھی نہیں ملتے تھے۔ "چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" نیلم بائی چلاتی۔ "پورے دن چیختی رہی ہوں کہ چاند ہو جائے گا۔ پر میری سنتا کون ہے۔"

پہلی بار اس نے نیلم بائی سے کہا تھا۔ "اتنا اچھا مہینہ گزارنے کے بعد تین دن تو ملنے جائیں ہمیں۔"

"چاند نظر آتے ہی شیطان آزاد ہو جاتا ہے۔" نیلم بائی نے کہا۔ "عید سے زیادہ شوق سے تو لوگ چاند رات مناتے ہیں۔"

"پر بوا' ہمارا بھی تو عید منانے کا حق ہے۔"

"یہاں عید منانے کا حق صرف گناہ گاروں کو ہے۔ ہم تو لوگوں کی خوشی کی چیز ہیں۔"

نیلم کے لہجے میں عجیب سی سوگواری تھی۔

خوشی کی چیز یعنی آلہ تفریح! نادرہ نے دل میں سوچا تھا۔

سو اس بار بھی وہ 29 کا چاند دیکھنے اسی کیفیت میں گئی...... گھبرائی گھبرائی سی' ہولتی ہوئی۔ مگر اسے خوشی بھی اتنی ہی بڑی ملی۔

"وہ رہا۔" نیچے کسی نے نعرہ لگایا۔ "چاند ہو گیا۔"

یہ بھی ہر سال ہوتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو بے وقوف بناتے تھے۔ اور چاند دیکھنے کی اہمیت نہ جانے کیسی ہے کہ بے وقوف بننے کے قوی امکان کے باوجود لوگ چاند دکھانے والے کے گرد جمع ہو جاتے...... کہاں ہے چاند؟ اور چاند دکھانے والا کہتا...... یہ میری انگلی کی سیدھ میں دیکھ...... وہ بادل کا ٹکڑا ہے نا۔ اب میری انگلی کے ساتھ ساتھ دیکھو۔ اور پھر وہ انگلی قوسی حرکت کرتی کسی کوٹھے پر کھڑی لڑکی کی طرف آ کر رک جاتی...... وہ رہا چاند۔ اور سب قہقہے لگاتے۔

ابے یہ تو چودھویں کا چاند ہے۔ کوئی کہتا' گرہن دکھا رہا ہے ہمیں۔

مگر اس بار ایسا کچھ نہیں ہوا۔ چاند دکھانے والے کی انگلی ساکت تھی۔ "وہ دیکھو......"

اور لوگ اس انگلی کی سیدھ میں دیکھ رہے تھے۔ کسی نے کہا۔ "ابے بے وقوف بنا رہا ہے۔"

"نہیں' خدا کی قسم...... بالکل صاف نظر آ رہا ہے۔"

نادرہ ایسی باتوں پر توجہ نہیں دیتی تھی لیکن دکھانے والے کے لہجے میں ایسی سنجیدگی تھی کہ اس نے اس کی انگلی کے اشارے کو مدنظر رکھتے ہوئے افق پر دیکھا...... اور اس کے دل میں ننھی سی موتیے کی کلی کھل گئی۔ اتنا باریک چاند کہ اس پر حیرت ہو کہ نظر کیسے آ گیا۔

اسی وقت نیچے سے ایک اور آواز ابھری۔ "ہاں...... وہ رہا۔"

"کہاں ہے...... کہاں ہے......؟" ہیجانی آوازیں ابھریں۔

پھر اور لوگوں نے بھی چاند لیا۔ اوپر نادرہ اب دعا مانگ رہی تھی۔ "اے اللہ...... میری ارجمند کو کسی آبرو والے گھر میں پہنچا دیجئے۔ اس کے نصیب اچھے کر دیجئے۔ عزت سے زندگی گزارے۔ محبت اور سچی خوشیاں پائے۔ اور میرے اللہ' اس کے بعد مجھے کوئی چاند نہ دکھائیے۔"

"ارے...... یہ کہاں غائب ہو گیا؟" نیچے کوئی چلایا۔

نادرہ نے دعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیرا' اور دوبارہ افق کی طرف دیکھا۔ مگر چاند نظر نہیں آیا۔

یہ 29 کا چاند ہوتا ہی عجیب ہے...... اتنا باریک اور موہوم کہ جیسے فریب نظر ہو۔ ایک جھپ دکھائی اور غائب۔ لیکن ایمان افروز ایسا کہ اس کی ایک جھپ میں ایسا یقین ہوتا ہے کہ نگاہ سے اس کے اوجھل ہو جانے پر بھی متزلزل نہیں ہوتا۔ ورنہ تو آدمی کی فطرت ایسی ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ مگر 29 کے چاند کو ایک بار دیکھ کر اس کے اوجھل ہو جانے پر بھی آدمی کبھی شک نہیں کرتا۔ کیسی رحمت ہے اللہ کی۔

پھر اسے چاند دوبارہ نظر آ گیا...... ننھا سا ہلال۔ اب یہ ہر روز بڑا ہو گا...... موتیے کی کلی کی طرح۔ پھر پھول کی طرح کھل جائے گا' پورا ہو جائے گا۔ پھر گھٹنا شروع ہو گا...... اور گھٹتے گھٹتے غائب ہو جائے گا۔ اس عرصے میں آزادی ہی آزادی۔

پھر نیا چاند طلوع ہو گا...... لوگوں کے لیے عید کا پیغام اور اس کے لیے دوبارہ روح فرسا قید!

اس نے اداسی کو ذہن سے جھٹکا۔ ابھی وہ دن ایک ماہ دور ہے۔ اس کی فکر میں گھلنے کا کیا حاصل۔ اس ایک ماہ سے استفادہ کیا جائے۔

اتنی دیر میں نیچے دکانیں بند ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ بس کریانے کی' حلوائی کی اور دودھ دہی کی دکانیں کھلی رہ گئیں۔ اور خلاف معمول قصائی نے دکان کھول لی۔ جبکہ عام دنوں میں وہ دن میں ہی گوشت نمٹا کر دکان بند کر دیتا تھا۔

نادرہ اس مہینے کے بارے میں سوچنے لگی نجانے کیوں اسے لگتا تھا کہ اس بار کا رمضان اس کی زندگی کا سب سے اہم مہینہ ہے۔ کچھ ہونے والا ہے' اور اچھا ہونے والا ہے۔

ایک اچھا کام تو وہ یہاں عام دنوں میں بھی کرتی تھی...... قرآن پڑھانا۔ اور اب تو

اچھو میاں بھی قرآن پڑھ رہے تھے۔ بلکہ اس کے لیے وہ عجوبہ بن گئے تھے۔ جس رفتار سے وہ پڑھ رہے تھے، وہ حیران کن تھی۔ لگتا تھا کہ کچھ ہی دن میں وہ ارجمند کے برابر آ جائیں گے۔

''آپ کہتے ہیں کہ آپ نے پہلے کبھی قرآن پڑھا ہی نہیں۔'' ایک دن اس نے ان سے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو یہ تو سچ ہے۔''

''میں نے کسی کو اتنی جلدی اتنا اچھا پڑھتے نہیں دیکھا۔ آپ تو آگے کا سبق بھی خود ہی نکال لیتے ہیں۔''

اچھو میاں چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بے بسی سے بولے۔ ''کیسے بیان کروں۔ سمجھ سکتا ہوں لیکن سمجھانا مشکل ہے۔'' پھر انہوں نے سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھا۔ ''جب میرے سامنے قرآن کا کوئی صفحہ کھلتا ہے تو یہاں کچھ پگھلتا ہے...... با قاعدہ پگھلتا ہے...... اور...... اور نجانے کیسے مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں کیا لکھا ہے۔ میری زبان خود بہ خود حرکت کرتی ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ مجھے پورا یقین ہوتا ہے کہ میں جو پڑھ رہا ہوں، وہ ٹھیک ہے۔''

''کمال ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

اچھو میاں پھر سوچنے لگے۔ ''میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔ جس کا قرآن ہے، وہی مجھے پڑھاتا ہے۔''

بات آئی گئی ہو گئی۔ دو تین دن بعد نادرہ نے سورہ رحمٰن شروع کی تو ابتدا ہی میں اٹک گئی۔

الرحمن ۔ علم القرآن۔ خود بہ خود اس کی نظر ترجمے پر گئی۔ اللہ نے جو بہت مہربان ہے، قرآن سکھایا۔

خوف اور ہیبت سے اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ واقعی...... وہ اچھو میاں کو قرآن پڑھا رہا ہے۔

اس نے آگے پڑھا۔ خلق الانسان ۔ علمہ البیان ۔ پیدا فرمایا انسان کو۔ سکھایا اسے بولنا۔

اس پر لرزہ چڑھ گیا۔ ارے...... یہ تو ہم کبھی سوچتے ہی نہیں۔ اگر ہمیں بولنا نہ آتا تو کیا ہوتا۔

ایک وقت تھا کہ انسان کو بولنا نہیں آتا تھا۔ تب وہ اشاروں کی زبان میں باتیں کرتا تھا۔ یعنی اسے لفظوں کا پتا ہی نہیں تھا۔ ایسے میں نہ وہ پڑھ سکتا تھا، نہ سمجھ سکتا تھا۔ اللہ نے کتنی نعمت عطا فرمائی، رحمت فرمائی انسان پر۔ کیسی آسانی عطا فرمائی۔ ہم تو اس پر شکر بھی ادا نہیں کرتے، جیسے یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔

اس سے کچھ آگے بھی تو سوچ۔ اس کے اندر کسی نے کہا۔ لفظ عطا فرمائے۔ بولنا سکھایا۔ پھر لکھنا پڑھنا سکھایا۔ پھر قرآن اتارا۔ یعنی محبت تمام کر دی۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے رب

مجھے تو تیری پسند اور ناپسند کا علم ہی نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تُو نے اس کام کا حکم دیا اور اس کام کو منع فرمایا۔ تب تو وہ اس پر بھی پکڑ لے گا کہ تُو نے جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ میرے کلام کو پڑھ کر سمجھا کیوں نہیں۔ تُو تو منہ پھیرنے والا بھی ہے۔ ایک اور جرم!

نادرہ نے فیصلہ کیا کہ اب وہ قرآن کو صرف پڑھے گی نہیں، سمجھنے کی کوشش بھی کرے گی۔ مہلت تو اسے مل گئی ہے ایک ماہ کی۔

پھر اسے نواب اشرف علی خاں کا خیال آیا۔ کیسی رحمت...... نظرِ عنایت ہوئی ہے ان پر۔ اور کہاں ہوئی ہے! اللہ کی شان اچانک اسے یاد آیا کہ اسے ان کی تراویح پڑھنے کی تاکید کرنی ہے۔

اور اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ وہ آ گئے۔

''بیٹا...... کچھ منگانا ہو تو بتاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

''عشاء کی نماز اور تراویح کے لیے۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا تراویح کا؟''

اچھو میاں مسکرائے۔ ''اب مسجد جائیں گے تو معلومات تو بڑھیں گی۔ کل ہی تو امام صاحب نے بتایا تھا نماز کے بعد۔''

نادرہ کو خوشی ہوئی۔ اس نے انہیں غور سے دیکھا تو اسے کچھ یاد آ گیا۔ کب سے وہ یہی دو جوڑے گھس رہے تھے۔ ایک پہنتے اور دوسرا دھو لیتے۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس نے پہلے ہی سے ان کے لیے سوچ رکھا تھا۔ کپڑا منگوا کر ان کے لیے تین کُرتے اور تین پاجامے سی دیے تھے۔ کُرتے سیدھی کلیوں والے تھے۔ جی تو چاہا کہ کڑھائی کرے۔ مگر کڑھائی صرف رمضان میں ہی ممکن تھی۔

اب اس وقت وہ ایک جوڑا پہن سکتے تھے۔ باقی دو جوڑوں میں ایک جمعۃ الوداع کے لیے اور دوسرا عید کے لیے تھا۔ ان پر وہ روزوں میں کڑھائی کر سکتی تھی۔

''اس حال میں جا رہے ہیں آپ۔''

''اللہ کے دربار میں کپڑوں کی کیا اہمیت۔ جبکہ آدمی اندر سے گندا ہو۔'' وہ اداس ہو گئے۔

''فضول بات نہ کریں آپ؟'' اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''میں نے کپڑے سی رکھے ہیں آپ کے لیے وہ پہن کر جائیں۔''

اس نے جب بنیان کے ساتھ وہ جوڑا اچھو میاں کو دیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تم نے اتنی فکر کی ہماری۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ اللہ نے سچ مچ ہمیں بیٹی دے دی ہے۔''

''آپ کو ٹھیک ہی لگتا ہے۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

اور نواب اشرف علی خان نئے کپڑے پہن کر پہلی بار تراویح کے لیے نکلے۔ وہ بہت خوش

تھے۔

❀……❀……❀

عبدالحق کو لگتا تھا کہ آدمی زندگی میں ہر نئے موڑ پر' کسی کی آمد کے موقع پر خود کو دریافت کرتا ہے' اور حیران ہوتا ہے کہ ارے' یہ چیز مجھ میں پہلے سے موجود تھی۔ مگر میں بے خبر تھا۔

ننھے ساجد نے اس کی زندگی میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے اندر چھپی ایک بہت بڑی محبت سے روشناس کرایا تھا...... بچوں کی محبت!

اس محبت کا وہ اس سے پہلے کبھی اندازہ نہیں کر سکا تھا' کر بھی نہیں سکتا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ وہ ساجد کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

بڑھتے ہوئے بچے کا مشاہدہ بھی اس کے لیے عجیب تجربہ تھا۔ ساجد اب دو ماہ کا ہو چکا تھا۔ بہ ظاہر تو وہ بڑا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کی جسمانی حرکات میں نمایاں فرق پیدا ہوا تھا۔ پہلے نظر جما کر نہیں دیکھ پاتا تھا۔ اب نظریں جما کر دیکھتا تھا۔

ایک نمایاں ترین تبدیلی اس کی قوتِ اظہار تھی۔ ابتدا میں وہ بالکل بے بس تھا۔ مگر اب اپنے انداز میں وہ ہر بات کا اظہار کرتا تھا۔ اس کا بھوک کی وجہ سے رونا اور طرح کا تھا' اور کسی شکایت پر رونا اور طرح کا تھا۔ خوشی کے اظہار میں وہ بڑی شدت سے ہاتھ پاؤں ہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ آوازیں بھی تھیں۔ ہر وقت وہ غوں غاں کرتا رہتا۔ کبھی قلقاری مار کر ہنس دیتا۔

عبدالحق نے دو اوقات اس کے لیے مخصوص کر دیے تھے۔ ایک ظہر سے پہلے اور دوسرا عشاء کے بعد۔ اب وہ بڑے اعتماد سے اسے پنگھوڑے سے اٹھا کر گود میں لے لیتا تھا۔ بعض اوقات تو سب لوگ اس کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ وہ گھر بھر کا کھلونا تھا۔

عبدالحق کو ساجد سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ ان اوقات کے علاوہ بھی وہ رابعہ اور زبیر کے کمرے میں چلا جاتا۔ ساجد کو گود میں لینا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ مقررہ اوقات میں تو رابعہ اور کبھی زبیر پنگھوڑے سمیت بچے کو لا کر اس کے کمرے میں چھوڑ جاتے۔

پھر ایک دن ساجد نے پہلی بار عبدالحق کی گود میں پیشاب کر دیا۔ اس وقت سب لوگ وہاں موجود تھے۔ رابعہ کا تو شرمندگی اور غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس نے بچے کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ بچہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا۔

"پاگل ہو گئی ہے رابعہ۔" حمیدہ نے اسے ڈانٹا۔ "ننھا سا بچہ ہے۔ وہ کیا سمجھے گا تیری بات۔"

اور عبدالحق نے کہا۔ "کوئی بات نہیں آپا۔ میں نماز سے پہلے غسل کر لوں گا۔ یہ تو اور فائدہ ہے۔"

"ارے واہ' تو کیا ہر نماز سے پہلے غسل کریں گے۔" رابعہ بولی اور دوبارہ بچے کو ڈانٹنے لگی۔ "ساجد صاحب پر پیشاب کر دیا تُو نے آئندہ کیا تو مار لگاؤں گی۔"

حمیدہ نے پھر اسے ٹوکا۔ "یہ کیا بے وقوفی ہے رابعہ۔"

"نہیں اماں۔ ابھی ڈانٹیں گے تو سمجھنے لگے گا۔ اسے پتا ہونا چاہیے کہ صاحب کون ہیں۔"

لیکن ننھا بچہ ابھی کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بار بار عبدالحق کی گود میں پیشاب کرتا۔ عبدالحق دن میں کئی کئی بار غسل کرنے لگا۔ ایک دن حمیدہ نے کہا۔ "یہ عبدالحق کتنا پیار کرتا ہے بچوں سے۔ اپنے بچے ہوں گے تو کیا حال ہوگا اس کا۔"

عبدالحق نے دیکھا کہ ننھے بچے کے اپنے معمولات تھے۔ رابعہ بارہ بجے بچے کو اس کے کمرے میں چھوڑ جاتی۔ پھر وقتاً فوقتاً آ کر اسے دیکھتی رہتی۔ بچہ اس دوران عبدالحق کی توتلی آواز کی باتیں سنتے ہوئے اس تکتا' ہاتھ پاؤں چلاتا' جوابی غوں غاں کرتا۔ ایک بجے کے قریب وہ تیزی سے ہاتھ پاؤں چلاتا۔ پھر رونے لگتا۔ اسے چپ کرانے کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی۔ ایک دن اتفاق سے عبدالحق نے بہلانے کے لیے اسے گود میں لیا تو بھید کھلا کہ وہ اس کی گود میں آنے کے لیے رو رہا ہے۔

اس نے بچے کو کندھے سے لگایا اور ٹہلنے لگا۔ مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ اسے احساس ہوا کہ بچہ سو گیا ہے۔

پھر رات عشاء کے بعد بھی یہی ہوا۔ اب میں بچے کے اشاروں کی زبان سمجھنے لگا ہوں۔ عبدالحق نے خوشی سے سوچا۔

پھر اس پر ایک اور انکشاف ہوا۔ بچے کے اندر کوئی گھڑی نصب تھی۔ اس کا وقت کا حساب پکا تھا۔ اس کا پتا ایسے چلا کہ بڑھتے ہوئے دن کی وجہ سے نمازوں کے اوقات بھی تبدیل ہو رہے تھے۔ عشاء کی نماز پندرہ منٹ آگے چلی گئی۔

اس دن وہ نماز پڑھ کر آیا تو اپنے کمرے کی طرف سے اسے ساجد کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اسے حیرت ہوئی' کیونکہ رابعہ اس کے آنے کے بعد ساجد کو لاتی تھی۔

وہ کمرے میں بچے کے پاس گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ساجد خاموش ہو گیا اور خوشی سے ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔

"میرے آنے سے پہلے اسے کیوں لے آئیں آپا؟" اس نے رابعہ سے کہا۔

"پتا نہیں صاحب۔ یہ اچانک رونے لگا۔ کسی طرح چپ نہیں ہوا۔ میں یہاں کمرے میں لائی تو یہاں آتے ہی چپ ہو گیا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا...... شاید آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ آپ نظر نہیں آئے تو دوبارہ رونے لگا۔ ابھی آپ کو دیکھتے ہی چپ ہو گیا۔"

پھر روز یہی ہونے لگا۔ اور ایک دن عبدالحق کی سمجھ میں آ گیا۔ بچہ تو اپنے مقررہ وقت پر اس کے پاس آنے کو مچلتا تھا لیکن نماز کا وقت آگے ہو جانے کی وجہ سے وہ خود نماز میں ہوتا تھا۔

ایک دن سب اس کے کمرے میں جمع تھے۔ اس نے حمیدہ سے کہا۔ ''اماں' یہ ہم لوگوں کو پہچاننا کب شروع کرے گا۔''

''اب تو پہچاننے لگا ہوگا۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''بچہ سب سے پہلے ماں کو' اور پھر باپ کو پہچانتا ہے۔''

''نہیں اماں میرے بیٹے نے سب سے پہلے صاحب کو پہچانا ہے۔''

''کیوں بھئی؟''

''میری اور رابعہ کی وفاداری اور محبت بھی تو اسے ملی ہوگی۔''

حمیدہ نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ محض دل آزاری سے بچنے کے لیے اس نے اختلاف نہیں کیا۔

لیکن رمضان کی پہلی ہی رات زبیر کی بات سچ ثابت ہو گئی!

نماز کے بدلتے ہوئے اوقات سے تو ننھے ساجد نے خودکار مطابقت پیدا کر لی تھی لیکن تراویح کی وجہ سے گھنٹے سوا گھنٹے کا فرق پڑ گیا تھا' جو اس کے لیے بہت بڑا تھا۔ اس کا تو سونے کا وقت بھی نکل گیا اور عبدالحق واپس نہیں آیا۔

عبدالحق کو گھر میں گھستے ہی احساس ہو گیا۔ وہاں عجیب سا سناٹا تھا۔ جبکہ اسے ڈر تھا کہ ساجد رو رہا ہوگا۔

کمرے میں سب لوگ موجود تھے۔ مگر عبدالحق کی نظر ساجد پر پڑی' جو ٹکٹکی باندھے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی نظریں ملیں' اور عبدالحق نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ ساجد کی آنکھوں میں نیند اور نقاہت تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ زبردستی جاگ رہا ہے...... ضد میں۔ پھر عبدالحق سے نظریں ملیں تو اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

عبدالحق تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ساجد مخصوص انداز میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ عبدالحق نے جلدی سے اسے گود میں اٹھا کر کندھے سے لگایا۔ ''یہ رویا تو نہیں؟'' اس نے رابعہ سے پوچھا۔

رابعہ سے بولا ہی نہیں گیا۔ وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔

''اس نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا تھا بھائی۔'' زرینہ نے کہا۔ ''چپ تو اس وقت ہوا' جب رونے کی طاقت ہی نہیں رہی اس میں۔''

''مجھے تیرا رونا یاد آ گیا پتر' جب تُو میرے دودھ کی ضد میں رو رہا تھا۔ اور پھر نڈھال ہو گیا تھا۔ رونے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔'' حمیدہ نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''آج میں

زبیر کی بات مان گئی یہ ساجد سب سے زیادہ تجھے پہچانتا ہے' سب سے زیادہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''میں اس سے معذرت کر لوں۔'' یہ کہہ کر عبدالحق نے ساجد کو کندھے سے ہٹا کر ہاتھوں پر لیا اور اس کے چہرے کو دیکھا لیکن نیند سے لڑنے والا بچہ شاید اس کے کندھے سے لگتے ہی سو گیا تھا۔

ننھے ساجد کو اپنی نیند اور عبدالحق کے اس نئے نظام الاوقات کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں دو ہفتے لگے۔ مگر فوراً ہی عبدالحق کے سامنے ایک اور سوال سر اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اعتکاف میں بیٹھے گا تو ساجد کا کیا ہوگا؟

''ہاں پتر' یہ تو ہے۔'' حمیدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

نور بانو پہلے ہی سے یہ سوچ کر ہول رہی تھی کہ دس دن کے لیے عبدالحق کی دید سے محروم ہو جائے گی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ چپکے سے عبدالحق کو منع کر دے لیکن ہمت نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب اسے سخت غصہ آیا اور سبکی کا احساس بھی ہوا کہ عبدالحق نے اس کی تو کوئی پروا نہیں کی' اور بچے کے لیے فکرمند ہو رہا ہے۔ اس بچے سے اسے ویسے بھی چڑ ہو گئی تھی۔

زبیر اور رابعہ یوں سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے ان کے بچے سے کوئی خطا ہو گئی ہو۔

''میں سوچتا ہوں کہ اس سال اعتکاف میں نہ بیٹھوں۔'' عبدالحق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''اگلے سال بیٹھ جاؤں گا۔''

نور بانو کی برداشت جواب دے گئی۔ ''کمال کرتے ہیں آپ۔ اتنی سی بات کے لیے اعتکاف چھوڑ دیں گے۔''

''دیکھو نا۔ چھوٹا سا بچہ ہے۔ لیکن اپنے مقررہ وقت کو جانتا پہچانتا ہے۔ اس میں چند منٹ کی دیر ہو جائے تو تڑپ کر روتا ہے' تکلیف اٹھاتا ہے۔ دس دن میری صورت نہیں دیکھے گا تو نجانے کیا حال ہوگا اس کا۔''

زبیر اور رابعہ کے چہرے پر کھسیاہٹ تھی اور حمیدہ کے چہرے پر غصہ۔

لیکن نور بانو کو اس وقت کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''کچھ بھی نہیں ہوگا اسے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''ننھا سا بچہ ہے۔ الٹا اسے فائدہ ہی ہوگا۔ بگڑی ہوئی عادتیں ٹھیک ہو جائیں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں سفاکی آ گئی۔

''نور بانو۔'' حمیدہ نے تنبیہی لہجے میں اسے پکارا۔ اس کی نگاہوں میں تنبیہہ تھی۔

''ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں اماں۔ اتنا چھوٹا سا بچہ کچھ سمجھتا تو نہیں ہے نا۔''

''بچے سب کچھ سمجھتے ہیں۔ بس ظاہر نہیں کر سکتے۔ بولتے نہیں ہیں نا۔ پر اشاروں میں' جسم

کی حرکت سے سب کچھ بتا دیتے ہیں۔"

عبدالحق دم بہ خود بیٹھا تھا۔ اسے حمیدہ کی اس روز کی بات یاد آئی' بلکہ سمجھ میں بھی آ گئی۔ اور اسے شاک لگا۔ کیا کوئی اتنے چھوٹے سے بچے سے بھی رقابت محسوس کر سکتا ہے۔

ایک لمحے کو اسے یہ بات بہت سنگین لگی لیکن پھر اگلے ہی لمحے اس نے سوچا' شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہاں سنگین خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر اسے رابعہ نے توڑا۔ "نور بی بی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ساجد چھوٹا سا بچہ ہے۔ بچے ضد کرتے ہیں تو انہیں بہلا لیا جاتا ہے۔ ہمیں بہلانا بھی تو سیکھنا چاہیے۔ اور بچے کی عادتیں ویسے بھی بگاڑنی نہیں چاہئیں۔"

عبدالحق کو احساس ہوا کہ رابعہ کو نور بانو کی بچے کے بگاڑ والی بات سے تکلیف ہوئی ہے۔ اب وہ وفادار لوگ تھے...... مالک کے حکم پر اُف بھی نہ کرنے والے۔ شکایت کیا کرتے۔ لیکن اب رابعہ ماں بھی تھی۔ شاید اس وجہ سے اس کے لہجے میں شکایت در آئی تھی۔

"آپ اعتکاف میں ضرور بیٹھیں صاحب" زبیر نے عاجزی سے کہا۔ "اس میں تو ہم سب کی بھلائی ہے۔"

عبدالحق کو ان دونوں پر بہت پیار آیا۔ انہوں نے اس کا راستہ آسان کر دیا تھا۔ نور بانو کی مداخلت کے ساتھ ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ نور بانو کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ وہ تو اسی وقت اعتکاف میں بیٹھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں کی یہی مرضی ہے تو میں اعتکاف میں بیٹھوں گا۔ اللہ مالک ہے۔"

لیکن اس کے ذہن میں ایک پیچیدہ اور سنگین سوال سر ابھار رہا تھا۔ اگر کبھی اماں کے حکم اور نور بانو کی خواہش میں تصادم ہوا تو اس کا ردعمل کیا ہو گا۔

مگر اس سوال کی پیچیدگی اور سنگینی ایک پل میں ختم ہو گئی۔ اس نے دل میں کہا...... اللہ کے حکم کے بعد بس اماں کا حکم ہے۔ اماں کے حکم کے سامنے کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

❀......❀......❀

نادرہ جانتی تھی کہ ماہِ رمضان میں وقت کے پر لگ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خوش گوار وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے۔ اور رمضان کے مہینے سے زیادہ خوش گوار کوئی وقت ہوتا ہی نہیں۔

مگر اس بار وقت کی رفتار اور تیز تھی۔ کام بھی تو بڑھ گئے تھے۔ ارجمند اور اچھو میاں کو قرآن پڑھانے میں وہ زیادہ وقت دیتی۔ پھر اسے ارجمند کے عید کے کپڑے بھی سینے تھے۔ اس کے علاوہ افطار کا پورا اہتمام بھی کرنا پڑتا تھا۔ دوسری لڑکیاں تو اسے ماہِ آزادی کے طور پر منا رہی تھیں۔ جیسے سال بھر کی تھکن اتار رہی ہوں۔

پھر اس روز اس نے ارجمند کو دیکھا' جو اپنی ڈرائنگ کی کاپی لیے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے پاس چلی گئی۔ "کیا کر رہی ہو گڑیا؟" اس نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

ارجمند نے جلدی سے کاپی بند کر دی۔ "کچھ نہیں پھپھو۔ ڈرائنگ بنا رہی ہوں۔"

"ہمیں بھی دکھاؤ۔"

"نہیں پھپھو۔" ارجمند نے صاف انکار کر دیا۔

"تم ہمیں منع بھی کر سکتی ہو کسی چیز کے لیے۔" نادرہ نے دل گرفتگی سے کہا۔ "کچھ چھپا بھی سکتی ہو ہم سے۔"

ارجمند نے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھیں تو جیسے اس کا دل پگھل گیا۔ ایک لمحے میں بابا' امی' دادا' دادی...... سب لوگ یاد آ گئے۔ اس کی اپنی آنکھیں بھر آئیں' اور وہ نادرہ سے لپٹ گئی۔ "پھپھو...... میں آپ کو کبھی خفا کر سکتی ہوں بھلا۔" اس نے کاپی نادرہ کی طرف بڑھا دی۔ لیکن انداز میں جھجک تھی۔

"نہیں...... رہنے دو۔"

"اب آپ نہیں دیکھیں گی تو میں سمجھوں گی کہ آپ مجھ سے خفا ہیں۔"

"تم سے میں کیسے خفا ہو سکتی ہوں پگلی۔" نادرہ نے اسے تھپتھپایا۔ "تم نہیں جانتیں...... اور شاید سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ لیکن میں تو جیتی ہی تمہاری خاطر ہوں۔"

ارجمند سمجھی تو واقعی کچھ نہیں لیکن اس کے حافظے پر وہ آواز' وہ لہجہ اور ایک ایک لفظ ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ "تو پھر دیکھیں نا آپ...... کو میری قسم۔"

نادرہ نے کاپی کھول کر دیکھی' اور حیران رہ گئی۔ وہ ٹھاکر اوتار سنگھ کی تصویر تھی۔ پہلے کے مقابلے میں ڈرائنگ سے اور بہتر ہو گئی تھی۔ اور تصویر اب سوفی صد اوتار سنگھ کی تھی۔ کہیں سرِ مُو بھی فرق نہیں تھا۔

اس نے کاپی کے ورق الٹے' اس کی حیرت بڑھ گئی۔ اس کاپی میں کوئی اور تصویر تھی ہی نہیں۔ ہر تصویر اوتار سنگھ کی تھی۔ "ڈرائنگ تو بہت اچھی ہو گئی ہے تمہاری۔ اب میں تمہیں ولایتی اسکیچ بک اور بہت اچھے کلر منگا کر دوں گی۔"

"سچ پھپھو؟" ارجمند کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

"ہاں' وہ تمہارا عید کا تحفہ ہو گا۔" نادرہ نے کہا۔ "لیکن گڑیا' تم یہی ایک تصویر کیوں بناتی ہو؟"

"اب میں کوئی اور تصویر بنا ہی نہیں سکتی۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں پھپھو۔ شاید اس لیے کہ ان سے میری شادی ہو گی۔"

نادرہ نے فیصلہ کیا کہ اب اپنی بچی کو سمجھانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔ "میں نے تمہیں اسی وقت بتا دیا تھا کہ میں انہیں جانتی ہوں۔ یہ کالج میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔"

"جی پھپھو! آپ نے بتایا تھا۔"

"اور میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ ہندو ہیں۔"

"ہو سکتا ہے پھپھو! یہ وہ نہ ہوں' کوئی اور ہوں۔"

"یہ ناممکن ہے گڑیا کہ ہو بہو ایک جیسے دو آدمی دنیا میں۔"

"اگر یہ وہی ہیں تو پھر آپ کی یہ بات غلط ہے کہ وہ ہندو ہیں۔ میں جانتی ہوں' وہ مسلمان ہیں۔"

اس کے اعتماد نے نادرہ کو حیران کر دیا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے اللہ میاں نے بتایا ہے۔"

نادرہ وحشت زدہ ہو گئی۔ کیا بچی دیوانگی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ "بیٹا! نہ اللہ میاں کو کوئی دیکھ سکتا ہے' نہ وہ کسی سے بات کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"دیکھا تو میں نے بھی نہیں پھپھو۔ لیکن وہ مجھ سے بات کرتے ہیں۔"

"کیسے؟ کیسی ہے ان کی آواز؟"

"میرے دل سے آتی ہے ان کی آواز۔ اور بالکل میرے جیسی آواز ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"انہوں نے خود مجھے بتایا۔"

نادرہ جھنجھلا گئی۔ "وہی تو میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ کیسے بتایا انہوں نے؟"

"میں بہت دعا کرتی ہوں نا پھپھو۔ ایک دن میں نے شکایت کی کہ آپ مجھے جواب نہیں دیتے۔ تو اللہ میاں نے مجھے بتایا کہ میں تمہارے دل میں رہتا ہوں' اور وہیں سے تمہیں جواب بھی دیتا ہوں۔ اور پھپھو! وہ میری جیسی آواز تھی۔ انہوں نے کہا' جب تک تم بچی اور پاک صاف رہو گی' جھوٹ نہیں بولو گی اور میرا کہنا مانتی رہو گی' میں تمہارے دل میں رہوں گا۔ اور بدل گئیں تو چلا جاؤں گا۔"

نادرہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ چھوٹی سی بچی کیسی باتیں کر رہی ہے..... ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہیں کہ کیا کہہ رہی ہے لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ سچی ہے۔ "تم دعا کیا کرتی ہو گڑیا؟"

"میں کہتی ہوں' میں ایسے کسی آدمی سے شادی نہیں کروں گی' جیسے آپ سے شادی کرنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ میں اللہ میاں سے کہتی ہوں کہ وہ جو شہزادے جیسے ہیں' وہ مجھے اچھے لگے۔ مجھے بس ان سے ہی شادی کرنی ہے۔ آپ ان سے میری شادی کرا دیں۔"

نادرہ کا دل بری طرح بجھ گیا۔ "میں تو مجبور ہوں گڑیا۔ مجھے بھی وہ لوگ اچھے تو نہیں لگتے۔"

ارجمند نے اس کا ہاتھ تھام کر تھپ تھپایا۔ "میں جانتی ہوں پھپھو! آپ مجبور ہیں۔ اس لیے تو اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ مجھے مجبور نہ بننے دیں۔ مجھے تو بس وہی شہزادہ چاہیے۔"

"پھر تمہیں کیا جواب دیا اللہ نے۔"

"انہوں نے کہا' پاک صاف رہو' سچ بولو اور کہنا مانو۔ وہ تمہیں مل جائیں گے۔ پھر آپ نے کہا کہ وہ ہندو ہیں' تو میں نے اللہ میاں سے کہا کہ آپ انہیں مسلمان کر دیں۔ میں ہندو سے تو شادی نہیں کر سکتی۔ تو انہوں نے کہا' ایسا کبھی نہ سوچنا۔ وہ مسلمان ہیں' اور بہت اچھے مسلمان ہیں۔"

نادرہ نے گہری سانس لی۔ بچی کو سمجھانا بہت ضروری تھا۔ "دیکھو گڑیا! اللہ سے دعا کیا کرو' ان سے باتیں کیا کرو۔ لیکن ایک بات یاد رکھو۔ ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ خواب اچھے ہوتے ہیں۔ اچھے خواب دیکھنے چاہئیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہم جو خواب دیکھیں' وہ پورا بھی ہو جائے۔ خواب پورا نہ ہو تو بعد میں بہت دکھ ہوتا ہے۔"

"مگر مجھے معلوم ہے پھپھو کہ ایسا ہی ہو گا۔ خود اللہ میاں نے مجھے بتایا ہے۔"

نادرہ پریشان ہو گئی کہ اب کیا کرے۔ اللہ پر اس کے یقین کو متزلزل کرنا تو ظلم تھا۔ ذرا سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ "دیکھو گڑیا! ابھی تم چھوٹی سی بچی ہو۔ اتنی چھوٹی بچیوں کی شادی تو نہیں ہوتی۔"

"تو پھپھو! میں ہمیشہ بچی تو نہیں رہوں گی۔ بڑی بھی تو ہوں گی۔"

"مگر وہ تمہارا شہزادہ تو اب بھی میرے جتنا بڑا ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ میں بڑی ہوں گی تو وہ چھوٹے تو نہیں ہو جائیں گے۔ بڑے ہی رہیں گے۔"

نادرہ کو اس کی معصوم منطق پر ہنسی آ گئی۔ "چھوٹے تو نہیں ہوں گے۔ مگر بوڑھے ہو جائیں گے۔"

"نہیں پھپھو! مجھے معلوم ہے' وہ بوڑھے نہیں ہوں گے۔" ارجمند نے کہا۔ پھر کچھ سوچنے لگی۔ "اور ہو بھی جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"جوان لڑکیوں کی بوڑھے لوگوں سے شادی اچھی نہیں ہوتی۔" نادرہ نے کہا۔

"ایک بات بتاؤں پھپھو۔" ارجمند اچانک بولی۔ "اللہ میاں نے مجھے بتایا ہے کہ مجھ سے شادی کے بعد وہ بڑے ہوں گے۔ میں انہیں بڑا بناؤں گی تو پھپھو! اس کا تو مطلب ہے کہ ابھی وہ چھوٹے ہیں۔"

"بھئی عجیب باتیں کرتی ہو تم۔ تم نے دیکھا تو ہے کہ وہ کتنے بڑے ہیں۔ مگر گڑیا' ذرا سوچو۔ وہ یہاں کہیں آ گئے۔ اتفاق سے تم نے انہیں دیکھ لیا اور انہیں چن بھی لیا۔ اب ضروری نہیں کہ وہ دوبارہ کبھی اس طرف آئیں بھی۔" دل میں اس نے کہا کہ اچھے لوگ یہاں آتے بھی نہیں۔

''نہیں پھپھو وہ آئیں گے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ دیکھیں نا اللہ میاں جھوٹ تو نہیں بولتے۔''

نادرہ کو تھرتھری چڑھ گئی۔ اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔ ''اچھا' یہ بتاؤ' تم انہیں کہا کیا کرو گی؟ چچا' ماموں یا بھائی جان؟''

''جی نہیں۔ میں تو انہیں آغا جی کہا کروں گی۔''

نادرہ دہل کر رہ گئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ ارجمند' خانم کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتی تھی۔ اس سے شہ ملی ہے اسے۔ اس نے سوچا' بات بڑھائے گی تو معصوم بچی نجانے اور کیا کیا کہے۔

''اچھا' باتیں ختم۔ اب تم قرآن پڑھنے کے لیے بیٹھ جاؤ۔''

''جی پھپھو۔''

❁......❁......❁

نادرہ کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بار کا رمضان اس کے لیے بہت اہم ہے۔ کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا اسے۔ اس کی ایک نشانی تو اچھو میاں ہی تھے۔ اور اب ارجمند کی یہ باتیں۔ وہ اسے بچے کی بڑ قرار دے رہی تھی لیکن اس کے اندر کوئی حس اسے بتا رہی تھی کہ پس پردہ کچھ ہو رہا ہے...... بلکہ بہت کچھ ہو رہا ہے۔

اس شام افطار کے بعد نیلم بائی نے چپکے سے اس سے کہا۔ ''نرگس! رات کو میرے پاس آنا۔ مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

نادرہ کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔ مگر اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

عشاء کے بعد وہ نیلم بائی کے کمرے میں گئی۔ نیلم بائی مسہری پر لیٹی تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ ''دروازہ بند کر دو نرگس!'' اس نے کہا۔

حیران نادرہ نے دروازہ بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی۔ لیکن اندر ہی اندر وہ ڈر رہی تھی۔

''اب یہاں آ کر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔''

وہ اس کے پاس جا بیٹھی۔ ''کیا بات ہے بوا؟''

''بہت ضروری بات ہے' جو صرف تم سے کر سکتی ہوں میں۔''

نادرہ نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

'میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گی۔ سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگلا رمضان میں نہیں دیکھ سکوں گی۔''

نادرہ کے لیے وہ بہت بڑا شاک تھا۔ ''اللہ نہ کرے بوا۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔''

''میں جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔'' نیلم بائی نے زور دے کر کہا۔ ''میں سب کے لیے اتنی

قابلِ نفرت ہوں کہ مجھے بھی کوئی غور سے دیکھتا ہی نہیں ورنہ سب کو نظر آ جاتا۔'' یہ کہہ کر چپکے چپکے رونے لگی۔

''ارے نہیں بوا۔ ایسی کیا بات ہے۔'' نادرہ نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا لیکن جب اس نے نیلم کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو اسے ماننا پڑا کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ کم از کم اس حد تک کہ اسے غور سے کوئی دیکھتا نہیں ہو گا۔

نادرہ ہمیشہ حیران ہوتی تھی کہ نیلم بائی چہرے پر اتنا کریم پاؤڈر کیوں تھوپتی ہے۔ مگر اس وقت جو اسے غور سے دیکھا تو پوری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اسے نیلم بائی پر ترس آنے لگا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو اس کی بیماری کا علم ہو۔ اس لیے وہ میک اپ کرتی تھی۔

اس وقت بھی وہ میک اپ کیے ہوئے تھی۔ لیکن غور سے دیکھنے پر نادرہ کو اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے' اندر دھنسے ہوئے گال اور جلد کی کرختگی اور بے رونقی صاف نظر آ گئی۔ اور اس نے ہونٹوں پر سرخی نہیں لگائی تھی۔ چنانچہ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے ہونٹ سفید ہو رہے ہیں۔ عام دنوں میں پان کی وجہ سے بھی سرخی کا تاثر بڑھ جاتا تھا۔

نادرہ کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بیمار ہے' اور اس کی بیماری یقیناً سنگین نوعیت کی ہے۔

''ٹھیک ہے بوا۔ یہ تو میں مانتی ہوں کہ تم بیمار ہو۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن تم نے اتنی بڑی بات کیوں کہی کہ تم اگلا رمضان نہیں دیکھ سکو گی۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''اور علاج بھی نہیں کرا رہی ہو؟''

''علاج تو تین سال سے چل رہا ہے۔''

''علاج کس کا ہو رہا ہے؟''

''پہلے تو صرف حکیم جی کا تھا۔ پھر میں اسپتال بھی جانے لگی۔ مگر انگریزی دواؤں سے کچھ فائدہ نہیں۔ حکیم جی کی دوا طاقت دیتی ہے۔ اس پر چلتی رہی ہوں میں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ اب وقت قریب آ گیا ہے۔''

''پھر وہی بات بوا۔'' نادرہ نے محبت اسے ڈپٹا۔ ''یہ تو بتاؤ بیماری کیا ہے تمہیں۔''

''میں نے اس پر بات کرنے کے لیے تمہیں نہیں بلایا ہے۔'' نیلم بائی نے خشک لہجے میں کہا۔ ''وہ تو ڈاکٹر اور حکیم جانیں۔ میں اور تم اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے مرنے کا شوق نہیں۔ کسی کو بھی نہیں ہوتا۔ مجھے تم سے کچھ اور باتیں کرنی ہیں...... بہت ضروری۔ اس کوٹھے کے متعلق۔''

نادرہ متوحش ہو گئی۔ ''کوٹھے کے متعلق؟''

''ہاں۔ یہ کہ میرے بعد کوٹھے کا کیا ہوگا۔''

''کمال کرتی ہو بوا۔ مر رہی ہو اور فکر کوٹھے کی۔'' نادرہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ارے تم مر گئیں تو کوٹھا ختم ہو جائے گا۔''

''یہی تو نہیں ہوتا۔'' نیلم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''وہ کہتے ہیں نا کہ آدمی مر جاتا ہے۔ پر دنیا میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ دنیا کا کاروبار پہلے کی طرح چلتا رہتا ہے۔ یہ بات کوٹھے کے لیے سب سے زیادہ سچی ہے۔ طوائف مر جاتی ہے' نائیکہ مر جاتی ہے۔ مگر کوٹھا کبھی ختم نہیں ہوتا۔ تم کیا سمجھ رہی ہو کہ میں مر جاؤں گی' اور تمام لڑکیاں جہاں جی چاہے' چلی جائیں گی۔ یہ کوٹھا ختم ہو جائے گا۔''

''میں تو یہی سمجھ رہی تھی بوا۔''

''غلط سمجھ رہی تھیں۔ یہ کوٹھا جائیداد ہے۔ ہزاروں روپیہ ہے میرے پاس۔ زیورات الگ ہیں۔''

''اور تمہارا کوئی نہیں؟''

نیلم نے افسردگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کوئی اولاد بھی نہیں؟''

نیلم بائی چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''بہت پہلے ایک بچی پیدا ہوئی تھی میرے ہاں۔ میں نے فوراً ہی اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اسے ختم کر دیا تھا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم یہ بات۔''

نادرہ دہل کر رہ گئی۔ اس لمحے اسے اس عورت سے ایسی نفرت محسوس ہوئی کہ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ''تم کتنی ظالم ہو بوا؟''

''مجبور سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہوتا۔ بچی اولاد کو ترکے میں گناہ کون دینا چاہتا ہے۔''

''اور اب اس سے پریشان ہو کہ ترکے کا کیا ہوگا۔'' نادرہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اپنے لیے پریشان نہیں ہوں۔ مرنے والے کو صرف آخرت کی فکر ہوتی ہے۔ میں ان لڑکیوں کے لیے پریشان ہوں' جو میری ذمہ داری ہیں۔ اگر میں یہ سب کچھ یونہی چھوڑ کر مر جاؤں تو پتا ہے' کیا ہوگا۔'' نیلم نے کہا۔ چند لمحے وہ خاموش رہی' جیسے نادرہ کے تبصرے کی منتظر ہو۔ پھر اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ ''یہاں مار کٹائی ہوگی۔ لوگ کتے کی طرح لڑیں گے مال پر۔ پھر جو جس کے ہاتھ لگا' وہ لے کر جہاں سینگ سمائے' نکل جائیں گے۔ ہر لڑکی اس مال پر عزت کی زندگی گزارنا چاہے گی۔ لیکن مال بھی گنوائے گی اور رہے گی بھی طوائف کی طوائف۔ بلکہ اور پختہ ہو جائے گی۔ اور اس کوٹھے پر کوئی بھی اثر و رسوخ والا قابض ہو جائے گا۔ یا پھر یہ سرکاری تحویل میں چلا جائے گا اور کسی کو الاٹ کر دیا جائے گا۔ لیکن ہر حال میں رہے گا یہ کوٹھا ہی۔ جیسے

طوائف کی حیثیت کبھی نہیں بدلتی' ویسے ہی کوٹھا بھی ہمیشہ کوٹھا ہی رہتا ہے۔''

نادرہ کے ذہن میں دلدل کا خیال آیا۔ ایک ڈوب گیا تو اس کی جگہ دوسرا تختے تختے دلدل میں کھڑا ہوا۔ ''مگر مر جانے والے کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے بوا۔ تمہیں اس سے کیا۔ جو ہو سو ہو۔''

''یہ تم کہاں سمجھ سکتی ہو ابھی۔''

''دیکھو بوا۔ اب تو میں بھی طوائف ہوں۔ اور موت طوائف کو بھی آتی ہے نا۔ یہ بتاؤ' ایسی صورت حال میں لوگ کیا کرتے ہیں۔''

''کوٹھا لڑکیوں سمیت بیچ دیا جاتا ہے۔''

''تمہارے پاس مال تو پہلے ہی بہت ہے۔ کوٹھا بیچ کر اور مال آئے گا۔ تو تم کیا اسے قبر میں لے جاؤ گی اپنے ساتھ۔'' نادرہ کو کہتے ہی احساس ہو گیا کہ اس نے بڑی سخت بات کہہ دی ہے۔

لیکن نیلم بائی مسکرا دی۔ ''یہی بات تو مجھے پسند ہے تیری۔ کھری اور سچی ہے تُو۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میں بتاتی ہوں۔ میں اس مال میں سے کچھ لڑکیوں کو دوں گی۔ لیکن بیشتر کی تجارت کروں گی۔''

''مرنے کے بعد تجارت!''

''ہاں۔ ایک حصہ داتا دربار کے لیے دوں گی۔ دوسرا حصہ مسجدوں کی نذر کروں گی۔ مولوی صاحب کہتے تھے...... اللہ کہتا ہے' مجھ سے تجارت کرو۔ میرے جیسا نفع دینے والا کوئی اور نہیں۔''

''چھی چھی' حرام مال اور اللہ سے تجارت۔''

''دیکھ نرگس۔ بندے نہ جانتے ہیں' نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ سب جانتا ہے۔ میں نیلم بائی کیوں ہوں' اسے معلوم ہے۔ کہتے ہیں' طوائف ماں کے پیٹ سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ پر دنیا میں پہلی بار طوائف ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کی تو میں قسم کھا سکتی ہوں۔ ہزاروں سال پہلے کسی نے کسی عورت کو پہلی بار طوائف بنایا ہوگا۔ اور اب بھی بنایا ہی جاتا ہے۔ اور طوائف سے عورت بننے کی اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کوشش پر سزائیں بھی دی جاتی ہیں۔ تُو بھی نرگس اپنی مرضی سے نہیں بنی۔ اور تجھے نرگس میں نے بنایا۔ تجھے کوئی پہلے نرگس بنا کر میرے پاس لایا تھا۔ اور بیچ کر گیا تھا اور میں نے کبھی اس مال کی' زر و جواہر کی آرزو نہیں کی تھی۔ مگر رنگ تو چڑھتا ہے نا آدمی پر۔ گندگی میں رہے تو آدمی بگڑتا تو ہے۔ میں بھی بہت خراب ہو گئی۔ اب یہ فیصلہ اللہ کرے گا کہ میں کتنی قصوروار ہوں اس میں۔ کسی اور کو تو حق نہیں ہے۔ اس فیصلے کا۔ اب تو بتا کہ میرے پاس حلال کمانے کا کوئی ذریعہ ہے؟ اب میرے پاس حلال کا مال نہیں' اور میرے دل میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا شوق ہے تو میں کیا کروں۔ میرے پاس حرام کا مال ہے تو میں وہ خرچ نہیں کر سکتی اللہ کی راہ میں۔ وہ مالک ہے۔ چاہے تو قبول کر لے۔ میں تو ایک بات جانتی

ہوں۔ ایک وہی تو ہے' جو ناپاک کو پاک کر دے۔ تو کیا میں اس سے امید نہ رکھوں؟''

نادرہ تھرا کر رہ گئی۔ واقعی کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ کون کتنا اچھا ہے' اور کون کتنا برا۔

''میرے لیے نیکی کے راستے کب سے بند ہیں۔ مجھے تو جہنم میں جانا ہی ہے۔ مگر یہ تو نہیں کہ ٹوٹی پھوٹی کوشش کرنا بھی چھوڑ دوں۔ کون جانے...... کون جانے......'' نیلم نے چھوٹا سا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

نادرہ کے وجود میں مایوسی تیر گئی تھی۔ ''تم نے مجھے کیوں بلایا ہے بوا؟''

''مجھے تیری مدد چاہیے۔''

''کوٹھا بیچنے میں میری مدد کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں کوٹھا بیچنا ہی نہیں چاہتی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ یہ میری لڑکیوں پر ظلم ہوگا۔'' نیلم بائی نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد جلدی سے بولی۔ ''مجھے برا' سنگ دل اور ظالم سمجھنا قدرتی بات ہے لیکن میں جانتی ہوں۔ بازار میں میرے جیسی کوئی نائیکہ ہوتی تو میں کوٹھا دے دیتی۔ اب میں کسی کو یہ کوٹھا بیچ دوں تو لڑکیوں پر میری قدر کھلے گی۔ پھر وہ کہیں گی...... ظلم تو ہم پر اب کیا ہے بائی نے۔'' وہ پھر ایک لمحے کو رکی۔ ''تجھے تو یہی لگے گا کہ میں اپنے منہ آپ میاں مٹھو بن رہی ہوں......''

''نہیں بوا' میں یہ بات سمجھتی ہوں۔''

''یہی خوبی تو تیری اچھی لگتی ہے۔ ورنہ خوب صورت لڑکیوں کے پاس دماغ کہاں ہوتا ہے۔ تُو پڑھی لکھی ہے' سمجھ دار ہے۔ تجھے خانم یاد ہے نا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے نا۔ کتنے دن چلے اس کے دس ہزار۔ اور اب کہاں بیٹھی ہے وہ؟''

نادرہ بری طرح چونکی۔ ''کیا ہوا اسے؟''

''سمن کے کوٹھے پر پڑی ہے۔ کبھی ملے تو کہنا' اب بھاگ کر دکھائے ذرا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''سارے جہان کی خبر رکھتی ہوں میں۔ خیر...... چھوڑ ان باتوں کو۔ میں تو مرنے والی ہوں۔ میرے لیے آسان یہی تھا کہ کوٹھا بیچ دیتی لیکن اس میں میری لڑکیوں کے لیے برائی ہے۔''

''تو تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں سب کچھ تیرے نام کرنا چاہتی ہوں۔ تُو میری جگہ لے لے۔''

نادرہ کے لیے بہت بڑی حیرت تھی۔ اسے سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ ''بوا' تم مجھے جانتی بھی ہو؟'' اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''ہاں' جانتی ہوں۔'' نیلم بائی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''جانتی ہوں کہ تُو کیا کرنا چاہے گی۔ اور میں تجھے یہ بھی بتاؤں گی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ پڑھی لکھی اور سمجھ دار تو ہے تُو۔ لیکن دنیا تو نہیں دیکھی ہے تُو نے۔''

''تو مجھے بتاؤ کہ میں کیا کرنا چاہوں گی۔'' نادرہ کو یقین نہیں تھا کہ نیلم سچ کہہ رہی ہے۔

''تیرے دماغ میں بہت اچھے اچھے خیال ہوں گے۔'' نیلم بائی نے کہا۔ ''تُو سوچے گی کہ یہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی ہے۔ دولت بھی ہے۔ اسے گھر سمجھ کر تم سب یہاں عزت سے رہ سکتی ہو۔ تُو یہ بھی سوچے گی کہ ان لڑکیوں کو کوئی ہنر بھی دیا جا سکتا ہے' جیسے سلائی کڑھائی۔ اب میں تجھے بتاتی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔ کوٹھا ہمیشہ کوٹھا ہی رہتا ہے۔ اس جگہ مسجد نہیں بن سکتی' جیسے قبرستان میں پھل دار درخت کبھی نہیں اُگے۔ میں جو یہاں بیٹھی ہوں تو صرف اس لیے کہ میرے پیچھے بہت طاقت ور لوگ ہیں۔ کوئی جاگیر دار ہے تو کوئی بہت بڑا افسر' وہ نہ ہوتے تو یہ پولیس ہی ہمیں نوچ کر کھا جاتی۔ ان کی وجہ سے پولیس ہماری غلام ہے۔ یہ ہماری اور کوٹھے کی حفاظت کرنے والے غنڈے بھی انہی کے ہیں۔ ہمارے کوٹھے کی ساکھ انہی کے دم سے ہے۔''

''انہیں تم سے کیا دلچسپی ہے؟''

''دنیا مطلب کی ہے۔ ان کا ہم سے کام نکلتا ہے۔ اور ہمارا ان سے۔ وہ سب بڑے اور شوقین لوگ ہیں۔ کوئی محفل سجائیں تو لڑکیاں ہمارے ہاں سے جاتی ہیں۔ وہ حاکم لوگ ہیں' اور ہم رعایا ہیں ان کی۔ اب تُو یہ سوچ کہ بادشاہ کبھی رعایا سے محروم ہونا پسند کرے گا۔ کیا وہ یہ چاہے گا کہ رعایا آزاد ہو جائے۔ ارے بادشاہت تو ہے ہی رعایا کے دم سے۔ اس بازار میں کوٹھا کبھی گھر نہیں بن سکتا۔ وہ ایسا کبھی ہونے نہیں دیں گے۔ یہ صدیوں کا قائم نظام ہے۔''

''مگر وہ کیسے روکیں گے؟''

''طاقت سے۔ غنڈے ان کے' پولیس ان کی' قانون ان کا۔ ہم تو ان کے بغیر کمزور اور بے بس ہیں۔ میں یہاں کوٹھا نہ چلاؤں تو وہ مجھے ہٹا دیں گے یہاں سے۔ مجھ پر کیس بنا دیں گے۔ میں رُلتی پھروں گی۔ اور وہ میری جگہ کسی اور کو لا کر بٹھا دیں گے۔''

''مگر یہ تو تمہاری ملکیت ہے۔''

''سمجھنے کی کوشش کر نرگس۔ ابھی یہاں ڈاکو گھس آئیں اور سب کچھ لوٹ کر لے جائیں تو؟ اور مجھ سے زبردستی کاغذ پر دستخط کرا لیں تو کیا میں انکار کر سکتی ہوں؟ میں یہ سب کچھ بیچ کر نکل جانا چاہوں تو مجھے لٹنے میں کیا دیر لگے گی۔ سن نرگس' نظام بنانے والے تبدیلی نہیں آنے دیتے۔ آدمی نظام سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔''

نادرہ کا سر چکرا گیا۔ باتیں اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ کیسی دنیا ہے۔

"وہ ہمارے سرپرست ہیں۔ سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیں تو ایک معمولی سا پولیس والا تیری ایسی بے عزتی کر سکتا ہے کہ اس کے سامنے کوٹھے پر بیٹھنا' جسم فروشی کرنا تجھے نہایت عزت کا کام لگے گا۔"

نادرہ کی سمجھ یہ بات پوری طرح آ گئی۔ "میں جانتی ہوں کہ تجھے ارجمند کی فکر ہے۔ لیکن کوئی موقع ملا تو ٹو اسے اس جہنم سے نکال سکتی ہے۔ دوسرے تجھے جسم فروشی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ٹو اپنی مرضی چلا سکے گی۔ کوئی تجھ سے زبردستی نہیں کر سکتا۔ ہاں' سرپرستوں کی بات اور ہے۔ ان کو بھی انکار نہ کرنا۔ ورنہ سب کچھ کھو دے گی۔ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ اب بول۔"

فائدہ تو واقعی بڑا تھا۔ اس کی روحانی اذیت بہرحال کم ہو جاتی۔ اور ارجمند کے معاملے میں فی الوقت تو وہ بے اختیار تھی۔ اس صورت میں اسے اختیار بھی مل جاتا۔ وہ سب کچھ سمجھتی تھی۔ جانتی تھی کہ اب دنیا میں کہیں اسے عزت نہیں مل سکتی۔ لیکن ارجمند کے لیے بہت روشن امکان تھا' اور اس کے لیے وہ دعا بھی بہت کرتی تھی۔ اس وقت اس کی سمجھ میں ایک اہم بات بھی آ گئی۔ اسے ارجمند کو بہت چھپا کر رکھنا تھا۔ ویسے بھی وہ اسے کسی کے سامنے نہیں آنے دیتی تھی۔ اب اس نے فیصلہ کیا کہ ارجمند کو باہر بالکل بھی نہیں جانے دے گی۔ کبھی اللہ کی مہربانی سے ارجمند کو اس جہنم سے نکلنا نصیب ہوا تو نہ صرف یہ کہ وہ پاک صاف ہو۔ بلکہ باہر کوئی اسے پہچاننے والا بھی نہ ہو۔ وہ اس کے لیے اس کوٹھے کا کوئی حوالہ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

"کس سوچ میں پڑ گئی ٹو؟"

نادرہ نے وہ آواز سنی ہی نہیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ارجمند نہ ہوتی تو وہ یقیناً بہت پہلے ہی خودکشی کر چکی ہوتی۔ بے شک خودکشی حرام ہے۔ لیکن اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ بندوں کی مجبوریوں سے باخبر ہے۔ اور ویسے بھی دو ناگزیر برائیوں میں سے چھوٹی برائی کو منتخب کیا جاتا ہے۔ حرام کاری کی زندگی سے حرام موت بہرحال بہتر ہے۔ نیلم بائی کی پیشکش دلدل میں اترنے کے مترادف تھی۔ طوائف سے نائیکہ کے درجے پر یہ ترقی اسے اچھی تو نہیں لگی تھی لیکن اس میں بہرحال فائدہ تھا۔ ارجمند کے لیے اس میں واضح طور پر بہتری تھی۔

اس نے اس پہلو پر بھی سوچا کہ وہ انکار کر دے اس صورت میں کوٹھا جس کے پاس ہوگا' اس کی نظر ارجمند پر لازمی پڑے گی۔ لڑکیوں کو بڑا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اور وہ بے اختیار ہو گئی تو اسے نہ بچا سکے گی۔

یعنی اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ اور اس میں ہی فائدہ تھا۔ عام تماش بینوں سے وہ خود کو بچا سکے گی۔ رہی سرپرستوں کی بات' تو وہ کبھی کبھی کی ہوتی ہے' اور عقل مندی سے کام لے کر انہیں ٹالا بھی جا سکتا ہے۔ اور ارجمند کے نکلتے ہی وہ اپنا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔ اور اپنے لیے اس کا فیصلہ پہلے سے طے شدہ ہے...... موت! اور سچ تو یہ ہے کہ وہ تو اس دن ترین میں ہی

مر گئی تھی۔ ارجمند کو یہاں سے نکال کر وہ بہرحال سکون سے مر سکے گی۔

تو نیلم بائی کی پیش کش قبول کرنا اس کی مجبوری ہے......

"ٹو کہاں کھو گئی نرگس؟"

اس بار نیلم بائی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے چونک کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا تجھے۔ میری بات سن بھی رہی ہے یا نہیں۔"

"سن بھی رہی ہوں بوا' اور سمجھ بھی رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "بلکہ اسی پر غور کر رہی تھی۔"

"تو کیا فیصلہ کیا ٹو نے؟"

"یہ بہت بڑا بوجھ ہے بوا...... میری بساط سے بہت بڑا۔ لیکن یہ بات بھی سمجھتی ہوں کہ تم ہم سب کے لیے بہت اچھی ہو' اور تم جیسا کوئی اور ہمیں نہیں ملے گا۔ دوسری لڑکیاں بے شک نہ سمجھتی ہوں' میں جانتی بھی ہوں اور سمجھتی بھی ہوں۔"

نیلم نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ "میں تجھے پہلے دن ہی سمجھ گئی تھی کہ عقل مند بھی ہے اور حقیقت پسند بھی۔ ٹو نے مزاحمت نہیں کی۔ پہلے ہی دن سمجھ لیا کہ بات میری یا اس کوٹھے کی نہیں۔ اب تو کسی کام کی نہیں رہی۔ تو بے کار مزاحمت کا کیا فائدہ۔"

"بڑی ذمہ داری ہے بوا۔ لیکن قبول کرنے کے سوا کوئی راستہ بھی میرے سامنے نہیں۔"

نیلم مسکرائی۔ "لیکن میری کچھ شرطیں ہیں۔"

نادرہ چونکی۔ "لو...... شرطیں کہاں سے آ گئیں۔"

"میں نے کہا نا کہ میں تجھے پہلے دن ہی سمجھ گئی تھی۔ میں تجھے پوری طرح سمجھتی ہوں۔ ٹو نے یہاں مزاحمت نہیں کی تو صرف ارجمند کی خاطر۔ ٹو یہاں زندہ رہی تو صرف ارجمند کی خاطر۔ ورنہ ٹو خودکشی کر لیتی۔ یہ اور بات ہے کہ میں کرنے نہیں دیتی۔ میری تجھ پر گہری نظر تھی۔" نیلم سانس لینے کے لیے رکی۔ پھر دوبارہ گویا ہوئی۔ "اب ٹو میری پیشکش قبول کر رہی ہے تو صرف ارجمند کی خاطر۔"

"تو اس میں کیا برائی ہے...... قبول تو کر رہی ہوں نا۔"

"مجھے دور تک دیکھنا ہے' اور تجھے ارجمند سے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں جانتی ہوں کہ جس دن تو نے ارجمند کو محفوظ ہاتھوں میں دے دیا' اس دن کے بعد ٹو ایک پل بھی اس قید کو قبول نہیں کرے گی۔ تجھے دوسری لڑکیوں کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔"

"اس کوٹھے سے نکل جانا میرے مسئلے کا حل نہیں ہے بوا۔ ایسا ہوتا تو میں نے نکلنے کی کوشش تو کی ہوتی۔" نادرہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اور جس دن خانم یہاں سے گئی ہے' اس روز تم نے سب کو پیشکش کی تھی۔ میں اس دن ہی قبول کر لیتی۔"

"میں نے کہا نا کہ میں تجھے جانتی ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ اس کوٹھے سے باہر تیرے لیے ایک اور کوٹھا...... بہت بڑا کوٹھا' جس میں نہ دروازہ ہے' نہ چاردیواری۔ یہ ایک روندنے والا ہے تو وہاں ہزار ہیں۔ مجھے یہ ڈر نہیں ہے کہ تُو ارجمند کے محفوظ ہوجانے کے بعد یہ کوٹھا چھوڑ کر چلی جائے گی لیکن ارجمند کے جانے کے بعد......"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو بوا۔ ارجمند کا یہاں سے نکلنا کوئی آسان ہے کیا۔" نادرہ نے یاس بھرے لہجے میں کہا۔ "جبکہ میرا تو اس دنیا میں کوئی جاننے پوچھنے والا بھی نہیں بچا۔ کون آئے گا اسے بچانے۔"

"ظاہر میں تو ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ لیکن میں دعاؤں کی تاثیر جانتی ہوں۔ گندگی میں بڑے پاک صاف اور بے بس آدمی کی دعا اللہ کے ہاں بہت جلدی قبول ہوتی ہے' اور ضرور قبول ہوتی ہے۔"

نادرہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ کاش ایسا ہی ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔ "اللہ جانے بوا۔ لیکن اللہ کی مہربانی سے ایسا ہوا تو بھی میں اپنی زندگی میں کوٹھے سے باہر قدم نہیں رکھوں گی۔"

"مجھے تیری بات پر یقین ہے۔" نیلم نے کہا۔ "لیکن اللہ کو گواہ بنا کر ایک وعدہ تجھے مجھ سے کرنا ہوگا۔"

"بولو بوا۔" نادرہ نے آہستہ سے کہا۔ اسے عجیب سا احساس ہورہا تھا' جیسے نیلم بائی اسے آر پار دیکھ رہی ہو۔

"یہ کہ تو اپنی جان نہیں لے گی کبھی۔ خودکشی نہیں کرے گی۔"

نادرہ سناٹے میں آگئی۔ کتنی تیز اور خطرناک عورت ہے یہ نیلم بائی۔ کیسے جانتی ہے اسے۔ پوری طرح سے واقف ہے۔ کیسے اس نے جان لیا کہ ارجمند کے نکلتے ہی وہ کیا کرے گی۔ اور یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نیلم یہ بات سمجھ لے گی۔ اس لیے اب فوری طور پر اس کے پاس کہنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے۔

نیلم اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "کیا ہوا؟ کچھ بولتی کیوں نہیں؟"

نادرہ خاموش رہی۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں اس کے پاس۔

"تو مجھے مجبوراً کوٹھا بیچنا پڑے گا۔" نیلم نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔" نادرہ بولی۔

"نہیں نرگس' میں سب کچھ تجھے سونپ رہی ہوں...... پورے اختیار کے ساتھ۔ تو ایسے تو نہیں سونپوں گی۔ پہلے میری شرط پوری کر۔ اللہ کو گواہ بنا کر مجھ سے وعدہ کر کہ تُو نہ کبھی کوٹھا چھوڑ کر جائے گی اور نہ ہی خودکشی کرے گی۔"

"اور میں وعدہ کر کے مکر جاؤں تو کیا کرلو گی؟"

"ایسا ہوگا ہی نہیں۔ تو اللہ کو گواہ بنا کر جھوٹا وعدہ نہیں کرسکتی۔"

"ہم جہاں بیٹھے ہیں بوا' یہاں اللہ کا کتنا خیال کیا جاتا ہے' کتنا لحاظ رکھا جاتا ہے۔" نادرہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کوئی نہ رکھے تُو تو پھر بھی رکھتی ہے نا۔ تُو تو یہاں بھی قرآن پڑھتی اور پڑھاتی ہے۔"

"ارجمند مجبوری ہے بوا۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کرسکتی ہوں۔ جھوٹا وعدہ بھی کرسکتی ہوں۔"

"جھوٹا وعدہ کرنے والے اتنا جھجکتے سوچتے نہیں۔ جھوٹا وعدہ کرنا ہوتا تو تُو فوراً ہی کہہ دیتی کہ مجھے منظور ہے۔"

نادرہ کے دل کو ماننا پڑا کہ نیلم بائی کو آدمی کی پکی پہچان ہے۔ وہ اب بھی سوچ رہی تھی۔ اس کی دعائیں اپنی جگہ' لیکن بہ ظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ ارجمند کو یہاں سے نکال پائے گی۔ اور اگر وہ نکال پائی تو کوٹھے کی سب سے بڑی اتھارٹی ہونے کے ناتے اس کے تحفظ کے لیے تو کچھ کرسکے گی...... نہیں بہت کچھ کرسکے گی۔ لیکن کوٹھا کسی اور کے اختیار میں گیا...... تو جو کوئی بھی ہوا' نیلم بائی سے ہزاروں گنا بدتر ہوگا' تب تو وہ ارجمند کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکے گی۔ بلکہ اپنے اختیار کی وجہ سے تو وہ خود کو بھی بچا سکے گی۔

اس کے باوجود وہ سودا مہنگا لگ رہا تھا۔ وہ تو عمر قید کی سزا تھی...... اور نیلم بائی جیسا متوقع انجام!

نیلم بائی اس کے فیصلے کی منتظر تھی' وہ غور سے اس کے چہرے پر نظر جمائے اس کے پل پل بدلتے رنگ دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ جانتی تھی' فیصلے میں جتنی دیر لگے گی' فیصلہ اتنا ہی مستحکم ہوگا' اور اس کے حق میں ہوگا۔

نادرہ تولتی رہی...... بار بار تولتی رہی۔ لیکن ہر بار ترازو کا وہی پلڑا جھک رہا تھا۔ نیلم کی بات نہ ماننے کی صورت میں جو کچھ ہوسکتا تھا' اس کے مقابلے میں عمر قید بھی بہت ہلکی تھی۔

پھر اس نے سوچا کہ ظاہری امکانات اپنی جگہ' اصل فیصلہ تو اللہ کا ہے۔ بہتری کا یہ راستہ بھی اس نے نکالا ہے۔ اس پر قدم رکھنا چاہیے۔ آگے بھی بہتری ہی ہوگی۔ اور پھر دعا کا حق تو اسے حاصل ہے۔

اس نے گہری سانس لے کر نظریں اٹھائیں اور نیلم بائی کو دیکھا۔ "ٹھیک ہے بوا۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر وعدہ کرتی ہوں کہ نہ کبھی کوٹھا چھوڑ کر جاؤں گی اور نہ اپنی جان لوں گی۔"

نیلم مسکرائی۔ "اللہ اس فیصلے کو تیرے اور ارجمند کے لیے مبارک کرے' عید کے بعد میں وکیل کو بلوا کر کاغذات تیار کراؤں گی۔ تاکہ سب کچھ قانونی ہوجائے۔ پھر یہ سب کچھ میری موجودگی میں بھی تیرا ہوگا۔" اس نے گہری سانس لی اور پھر بولی۔ "اب شاید میں سکون سے

مر سکوں گی۔"

⁂

وہ اعتکاف میں عبدالحق کا پہلا دن تھا!

مولوی مہر علی اس کے رہنما تھے۔ اس کے لیے دو طرف چادریں تان کر ایک گوشے میں حجرہ سا بنا دیا گیا تھا۔ دو طرف مسجد کی دیواریں تھیں۔ خود مولوی صاحب مخالف سمت میں بیٹھے تھے۔

رات کو مولوی صاحب نے اسے تفسیر ابن کثیر لا کر دی۔ "اس دوران تم اس کا مطالعہ کرو' انشاءاللہ تمہارے لیے فہم اور علم کے دروازے کھل جائیں گے۔ یاد رکھو کہ رُوئے زمین پر قرآن تمام علوم کا منبع ہے۔"

"جزاک اللہ مولوی صاحب۔" عبدالحق نے کہا۔ "ایک بات بتائیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اعتکاف بے شمار پابندیوں کا نام ہے۔"

"روزہ بھی بے شمار پابندیوں کا نام ہے۔ ہے کہ نہیں۔" مولوی صاحب نے جواب دیا۔ "الگ الگ شمار کریں گے تو تب بہت سی چیزیں بھول سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے سادہ سی ایک بات ہی کافی ہے۔ رمضان تزکیۂ نفس کے لیے ہے۔ مختصراً یوں کہہ لو کہ نفس کے ہر تقاضے اور مطالبے کو اللہ کی خوشی کی خاطر روک دینا روزہ ہے۔ تو جن کا نفس بے لگام ہو' ان کے لیے روزہ زیادہ سخت ہے۔ اب ایک بات اور کہوں۔ رمضان کا مہینہ آدمی کے لیے بہ تدریج ذاتی اصلاح اور نفس کو زیر کرنے کا مہینہ ہے۔ یہ ٹھہراؤ کا متقاضی ہے۔ عید کا چاند نظر آتے ہی نفس کو لاڈلے بچے کی طرح آزاد چھوڑ دیا تو کیا فائدہ۔ جو پابندیاں تیس دن میں قبول کرو' انہیں آگے بھی لے جاؤ۔ ہر بار نفس کی کم از کم ایک طلب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تو اصلاح کا عمل جاری ہو جائے گا۔ اللہ نے نفس کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے قلب' جسم اور روح کو پہنچنے والے نقصانات کے ازالے کا موقع فراہم کرنے کے لیے یہ بابرکت مہینہ عطا فرمایا ہے۔ روزے اور فاقے میں بہت فرق ہے۔ فاقہ مجبوری ہے' اور روزہ اللہ کی رضا کے لیے ہے۔ سو فاقے میں کمزوری ہے اور روزے میں طاقت۔ تو تیس دن میں نفس پر جتنا قابو پایا' اگر رمضان کے جاتے ہی خود کو آزاد کر دیا تو فائدہ محدود ہو گیا۔ اور اگر ایک برائی پر بھی مستقل طور پر قابو پا لیا تو فائدہ ہے۔ زندگی اپنی برائیوں سے لڑنے کا نام ہے۔ اس لڑائی سے خوش ہو کر اللہ بندے کی برائیاں دور کرنے میں مدد فرماتا ہے۔ اور انعام کے طور پر نیکیاں عطا فرماتا ہے۔ اور یہ رمضان کا مہینہ اس کام کے لیے خاص ہے۔ اللہ کی رحمت اس مہینے میں موسلا دھار برستی ہے۔

"اور جیسے ہر چیز کا ایک ست ہوتا ہے...... ماحصل...... جو ہر خاص۔ تو رمضان کا ست یہ آخری عشرہ ہے کہ اس عشرے میں وہ پانچ مبارک راتیں ہیں' جو تمام راتوں سے افضل ہیں۔ ان

پانچ راتوں میں وہ ایک مبارک رات ہے' جسے اللہ نے قرآن میں ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا ہے۔ جو شخص ذرا سا بھی علم رکھتا ہے' وہ ان راتوں کو کبھی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن دنیا بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ہزار پا ہے' جو آدمی کے وجود کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی کام' کوئی بھی ضرورت آدمی کو لاحق ہو کر اسے اللہ کی راہ سے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اس سے کامیابی سے لڑ بھی لے تو اس کی یک سوئی میں فرق پڑتا ہے۔ اور یک سوئی کی بڑی اہمیت ہے۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توصیف فرمائی ہے کہ وہ ساری دنیا سے کٹ کر یک سوئی کے ساتھ اس کے ہو رہے۔ اور یہ اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

"اب یہاں اعتکاف کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ قرآن میں ذکر ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس راتوں کے لیے کوہ طور پر طلب فرمایا۔ آپ اپنے اور امت کے تمام معاملات اور ذمہ داریاں ہارون علیہ السلام کو سونپ کر چلے گئے۔ اب سوچو' وہ اعتکاف ہی تو تھا۔ سب کچھ چھوڑ کر' بھول کر' یک سو ہو کر اللہ سے لو لگانا۔

"ہم عام بندوں کے لیے نماز اللہ کی رحمت ہے۔ وہ نماز میں ہم پر توجہ فرماتا ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ سمیع و بصیر وہ خبیر' علیم وہ بذات الصدور ہماری طرف متوجہ ہے۔ دنیاوی اصولوں میں بادشاہ کے حضور بے دھیانی اور بے توجہی گستاخی ہے' جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ اور نماز میں تو ہم بادشاہوں کے بادشاہ' کائنات کے واحد اور احد مالک کے رُوبرو ہوتے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں دنیا گھسی ہوتی ہے' دماغ میں دنیا کے مسائل کلبلا رہے ہوتے ہیں۔ ہم اللہ کی حمد و ثنا کر رہے ہوتے ہیں نماز میں' لیکن ہمارے قلب و ذہن میں اللہ کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ مگر وہ رحمٰن رحیم و کریم ہے۔ اس گستاخی پر نہ صرف درگزر فرماتا ہے۔ بلکہ چاہے تو وہ ٹوٹی پھوٹی نماز اپنی بارگاہ میں قبول بھی فرما لیتا ہے۔

"تو پتر' ہم عام بندوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہوں' رکوع و سجود و قعود میں ہوں تو دنیا سے کٹے ہوئے اور ایک سو ہوں۔ لیکن ہم یک سوئی کی اہمیت نہیں سمجھتے ہاں' دنیا کے لیے یک سو ہو جاتے ہیں۔ تو دنیا سے کٹ کر یک سو ہونے اور اللہ کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی تربیت کا نام ہے اعتکاف۔

"اعتکاف ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی۔ اب باطن کا حال تو صرف اللہ جانتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ظاہری اعتکاف تبلیغ کے لیے ہے کہ لوگ دیکھیں' اس کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کی طرف راغب ہوں۔"

عبدالحق سحر زدہ سا سن رہا تھا۔ "مولوی صاحب' ظاہری اعتکاف کیا ہے؟"

"دیکھو پتر' اللہ تو ہر جگہ موجود ہے نا۔ آپ ہزاروں کے مجمع میں بھی یکسو ہو کر اس کے

ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو بہت بعد کے مرحلے ہیں' اور اللہ جسے چاہے' نواز دے۔ رب سے ملنے کا مزہ تو خلوت میں ہی ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ آپ کے لیے جلوت بنا دے۔ تو آپ گھر کا عیش و آرام چھوڑ کر اس دن کے لیے مسجد کے اس گوشے میں آجاتے ہیں' سب کچھ بھول کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے کلام کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوتے ہیں تو صرف اس کے لیے عبادت کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔ آپ اس گوشے سے نکلتے ہیں تو چہرے کو ڈھانپتے ہیں۔ کیوں؟ تاکہ لوگوں کی نظریں آپ کے چہرے پر نہ پڑیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ آپ اپنے رب کی خلوت میں ہیں۔ وہ آپ کو دیکھتا ہے تو آپ کے چہرے کو کائنات کا سب سے حسین رنگ ملتا ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ لوگوں کی نظریں اس رنگ کے پختہ ہونے سے پہلے آپ پر پڑیں اور وہ رنگ خراب ہو۔ آپ کسی سے بات نہیں کرتے کہ آپ کی یکسوئی متاثر نہ ہو۔ آپ بغیر ضرورت کے اپنے اس گوشے سے باہر نہیں نکلتے۔ یہ ظاہری اعتکاف ہے۔"

"لیکن مولوی صاحب' میں اور آپ بھی تو باتیں کر رہے ہیں؟" عبدالحق نے اعتراض کیا۔

"محفل اللہ کے ذکر کی ہو تو وہ بھی خلوت ہوتی ہے۔ محفل میں شریک ہر یک سو شخص کے لیے خلوت ہوتی ہے۔ ہاں' مجھے اور تمہیں دنیا کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ مجبوری ہو تو اور بات ہے۔ اللہ سب جانتا ہے اور وہ معاف کرنے والا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ اپنے گھر والوں کے لیے دن کی ضرورتیں بہم پہنچاؤ' پھر اعتکاف کے لیے آؤ۔ تاکہ دنیا کا تم پر کوئی قرض نہ ہو۔"

"اب رات کو آپ نے پہلی طاق رات گزاری۔ آپ گھر میں تو اتنے یکسو ہو کر یہ رات نہیں گزار سکتے تھے نا پتر۔ یہاں اس گوشے میں رات بس آپ تھے اور آپ کا رب۔ اللہ آپ کے اعمال قبول فرمائے اور ان میں اضافہ فرمائے۔ یہاں آپ اللہ کے مہمان ہیں۔ گھر کے کسی آدمی یا کسی بھی فرد سے دس پندرہ منٹ بات کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ کی ہر دھڑکن' ہر سانس' ہر بات صرف اور صرف اللہ کے لیے ہو۔"

عبدالحق پُرسکون ہو گیا۔ ویسے بھی اللہ کی رحمت تھی کہ اسے یہاں آنے کے بعد نور بانو کی یاد بھی نہیں آئی تھی۔

مولوی صاحب نے اسے صلوٰۃ التسبیح سکھائی اور اس کی فضیلت کے بارے میں بتایا۔ یہ نماز پڑھ کر اسے احساس ہوا کہ ارتکاز کے لیے یہ نماز نہایت مؤثر اور مبارک ہے۔

شام کو زبیر اس کے لیے افطاری لے کر آیا۔ نماز کے بعد عبدالحق نے اسے افطاری کے لیے ساتھ بٹھا لیا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ زبیر کچھ پریشان ہے۔ مولوی صاحب بھی ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

"کیا بات ہے زبیر بھائی' کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" عبدالحق نے پوچھا۔

"کچھ نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔"

لیکن مولوی صاحب نے بھی دیکھ لیا کہ زبیر کے چہرے پر ہوائیاں بھی اُڑ رہی ہیں۔ "کوئی پریشانی کی بات ہے خدانخواستہ تو بتاؤ۔" انہوں نے بھی کہا۔

"کوئی بات نہیں مولوی صاحب۔"

لیکن عبدالحق خود پریشان ہو گیا۔ "تم نہیں بتاؤ گے زبیر بھائی تو میں پریشان ہو جاؤں گا۔ جبکہ یہاں یکسوئی ضروری ہے۔"

زبیر اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ مولوی صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ "پتر عبدالحق ٹھیک کہہ رہا ہے زبیر۔ اس کی یکسوئی میں خلل پڑے گا۔ جو بات بھی ہے کُھل کر بتا دو۔"

"وہ ساجد مسئلہ بن گیا ہے صاحب۔" زبیر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

عبدالحق تو تڑپ گیا۔ "کیا ہوا اسے؟"

"وہی بگڑی ہوئی عادتیں صاحب۔" زبیر کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔ "رات میں تراویح پڑھ کر گیا تو وہ جاگ رہا تھا۔ آپ کی راہ تک رہا تھا۔ بہت بہلانے کی کوشش کی۔ سب نے ہی جتن کر لیے۔ پر وہ نہیں سویا۔ دو بجے رات مجبور ہو کر سویا۔ صبح اپنے وقت پر اٹھ گیا۔ دوپہر کو پھر اپنے وقت پر وہی حال ہوا اس کا۔ ہم آپ کے کمرے میں بھی نہیں لے گئے اسے کہ شاید اس طرح بھول جائے۔ پر وہ تو بری طرح ہاتھ پاؤں چلا کر جیسے ضد کر رہا تھا وہاں جانے کی۔ میں گود میں لے کر ٹہلتا رہا۔ پر وہ تو بس روئے جا رہا تھا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔"

"ایک ہی دن میں کمزور ہو گیا ہے صاحب۔" زبیر نے کہا۔ پھر جلدی سے اسے دلاسہ دیا۔ "مگر آپ فکر نہ کریں صاحب۔ نا سمجھ بچہ ہے دو تین دن میں سنبھل جائے گا۔"

مولوی صاحب کچھ سمجھے' کچھ نہیں سمجھے۔ "مسئلہ کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں مولوی صاحب۔ غلطی میری ہے۔" عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔ "پہلی بار کسی بچے کو دیکھا تھا۔ اچھا لگا۔ اپنی خود غرضی میں اسے اپنا عادی بنا دیا......"

"ایسے نہیں کہتے صاحب۔" زبیر نے تڑپ کر کہا۔

"نا پتر' ایسے نہیں کہتے۔" مولوی صاحب نے بھی عبدالحق کو ٹوکا۔ "یہ تو ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سنت ہے۔ حضور ﷺ بچوں سے محبت فرمایا کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی دل جوئی کرتے۔ اپنے نواسوں کا گھوڑا بنتے......"

عبدالحق کو تایا جی اور چاچا جمال دین کا خیال آ گیا۔

"......ان کی نماز میں دخل اندازی بھی گوارا کر لیا کرتے تھے۔" مولوی صاحب نے اپنی

بات پوری کی۔ پھر بولے۔ ''خیر...... مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ۔'' عبدالحق نے انہیں اپنے ساتھ ساجد کے معمولات کے بارے میں بتایا۔

''تم نے ظلم کیا پتر عبدالحق۔ اتنا چھوٹا بچہ ہے وہ' جسے سمجھایا بھی نہیں جا سکتا۔ تمہیں اعتکاف میں بیٹھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' مولوی صاحب بولے۔

''میں نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن......'' عبدالحق کہتے کہتے رک گیا۔ اب مولوی صاحب کو کیا بتاتا کہ اس بات پر نور بانو نے کیا کہا تھا۔ اسے تو حیرت اس بات پر تھی کہ مولوی صاحب برعکس بات کر رہے ہیں۔ ''میں اس کی خاطر اعتکاف چھوڑ دیتا۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''میں نے کہا نا پتر کہ اعتکاف دکھاوا نہیں۔ اس میں یکسوئی چاہیے۔ یاد ہے' میں نے کہا تھا کہ گھر کی سب ضرورتیں پوری کر کے آدمی اعتکاف میں بیٹھے۔ اب یہ بھی تو ضرورت ہی ہے گھر کی۔''

''مگر مولوی صاحب' اعتکاف تو عبادت ہے......''

''یہ بات سمجھ لو پتر کہ اعتکاف فرض کفایہ ہے۔ علاقے سے ایک دو آدمی بیٹھ جائیں تو پورے علاقے کی کفایت کرتے ہیں۔ ہر فرد پر فرض لازم نہیں ہے یہ۔ اور پھر عبادت کی بات کرتے ہو تو اللہ کی مہربانی کا یہ عالم ہے کہ بندہ اللہ کو پیش نظر اور مقدم رکھے تو اس کا ہر کام عبادت ہے۔ اپنے گھر کی ضرورت پوری کرنے کے لیے رزق حلال کی جستجو کا ہر لحہ مقبول ترین عبادت ہے۔ اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرنا عبادت ہے۔ بیمار بھائی کی عیادت کو جاؤ تو اٹھنے والا ہر قدم عبادت ہے۔ کسی سے اللہ کو خوش کرنے کی خاطر محبت کرو تو عبادت ہے۔ بنیادی بات بس اللہ سے تعلق کی ہے۔''

''تو اب کیا کیا جائے؟'' عبدالحق نے کہا

''کچھ بھی نہیں صاحب۔ جیسے عادتیں بگڑی تھیں' ٹھیک بھی ہو جائیں گی۔'' زبیر نے جلدی سے کہا۔

''کمزور ہو جائے گا۔ خدانخواستہ کہیں......''

''تم اس عذر کی بنیاد پر اعتکاف سے نکل بھی سکتے ہو پتر۔''

''کیا یہ ممکن ہے؟''

مولوی صاحب کو عبدالحق کی ہچکچاہٹ کا احساس ہو گیا۔ اور وہ اسے سمجھ سکتے تھے۔ وہ اس کا پہلا اعتکاف تھا' اور وہ اس سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف اسے زبیر کا اور بچے کا خیال بھی تھا۔ وہ عجیب گومگو کی کیفیت میں ہوگا۔ ''ہاں پتر' ممکن ہے۔ اگر بچے کو کسی بڑے نقصان کا ڈر ہو تو پھر تم اعتکاف جاری نہیں رکھ سکتے......''

''مگر ایسی کوئی بات نہیں مولوی صاحب۔'' زبیر تڑپ کر بولا۔

''لیکن اب پتر عبدالحق کا دل تو بچے میں ہی اٹکا رہے گا نا۔''

عبدالحق نے تائید میں سر ہلایا۔ یہ بات سو فی صد سچی تھی۔

مولوی صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ''ایک صورت اور ہے۔ تم نے بتایا کہ تمہارا بچہ دو مخصوص وقتوں میں پتر عبدالحق کا عادی ہے۔'' انہوں نے زبیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''تو ان دو وقتوں میں تم بچے کو پتر عبدالحق سے ملوانے کے لیے یہاں لا سکتے ہو۔ یوں بچہ بھی خوش رہے گا۔ اور پتر عبدالحق کے اعتکاف میں بھی خلل نہیں پڑے گا۔''

''لیکن مولوی صاحب' صاحب تو یہاں تو اللہ کی خاطر......''

''یہ بھی عبادت ہی ہو گی زبیر پتر۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''اور کون جانے' اللہ کے ہاں اس کا اجر پورے اعتکاف سے بھی بڑھ کر ملے۔ خلق خدا کے کام آنا' اس کا خیال رکھنا بھی بہت بڑی عبادت ہے۔''

''لیکن مولوی صاحب' چھوٹا بچہ ہے۔ پیشاب پاخانہ بھی کر سکتا ہے۔''

مولوی صاحب نے صرف ایک پل سوچا۔ ''پیشاب پاخانہ کرا کے لاؤ تو انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اپنے گھر کی پاکی کا وہ خود خیال رکھتا ہے۔ ہاں' ہمیں اپنے طور پر احتیاط کرنی چاہیے۔ روئی سب کچھ جذب کر لیتی ہے۔ اس کے لیے روئی کے دبیز پوتڑے بنوالو۔ پھر کچھ ہوا بھی تو زیادہ سے زیادہ پتر عبدالحق کے کپڑے خراب ہوں گے۔''

''وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں غسل کر کے کپڑے بدل لوں گا۔'' عبدالحق نے جلدی سے کہا۔

''بس تو تم تراویح کے بعد بچے کو لے آنا۔ پتر عبدالحق مسجد کے صحن میں چلے جانا تم۔''

زبیر بھی ہچکچا رہا تھا۔ اس نے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے مولوی صاحب۔''

❁......❁......❁

گھر کا عجیب حال تھا۔ رابعہ اور زرینہ تو بچے کو سنبھالنے میں لگی تھیں۔ نور بانو البتہ ان سے الگ تھلگ تھی۔

پھر زبیر کپڑا اور روئی لے کر آیا تو ننھے ساجد کی اعتکاف میں عبدالحق سے ملاقات کا اہتمام شروع ہو گیا۔ حمیدہ کے چہرے پر رونق آ گئی۔

یہ کام اس نے اپنے ذمے لے لیا۔

''کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی اماں؟''

''ارے نہیں۔ جیسے سینہ بند تیار کیا جاتا ہے...... دو طرف کپڑا اور درمیان میں روئی۔ پھر اس

میں ڈورے ڈال دیے جاتے ہیں ویسے ہی میں ساجد کے لیے پوتڑے بنادوں گی۔" حمیدہ نے کہا۔"تُو تراویح پڑھ کر آئے گا تو انشااللہ تیرا بچہ تیار ملے گا۔"

حمیدہ نے حساب کتاب سے کپڑے میں سے دو برابر کے ٹکڑے کاٹے۔ پھر ان کے درمیان روئی کی تہیں جمانے لگی۔

"میں بھی کاٹوں اماں؟" نوربانو نے پوچھا۔

"نہیں......اس کی ضرورت نہیں۔"

نوربانو کچھ کھسیا گئی۔ وجہ تو وہ جانتی تھی' پھر بھی اس نے حمیدہ سے پوچھا۔"تم مجھ سے ناراض ہو اماں؟"

"تو اور کیا خوش ہوں۔ یہ سب تیری وجہ سے ہی تو ہو رہا ہے۔ بچے کی جان کے لالے پڑ گئے۔"

"میرا کیا قصور ہے اماں۔" نوربانو نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تو اور کس کا قصور ہے۔" حمیدہ جھنجلا گئی۔"میں تو اسے روک رہی تھی اعتکاف سے۔ تُو ہی اچھل کر بیچ میں آ گئی تھی۔ عبدالحق نے خود بھی یہی فیصلہ کیا تھا۔ تُو نے کہا' اس بچے کے لیے اعتکاف چھوڑ دیں گے آپ......"

"تو اماں' میں نے ان کے بھلے کے لیے کہا تھا......"

"جانتی ہوں میں۔" حمیدہ کے لہجے میں حقارت تھی۔"تیری وجہ سے وہ اعتکاف میں بیٹھنے سے بچتا تو تُو خوش ہوتی۔ حوصلہ افزائی کرتی اس کی۔ اور کہا کیا تھا تُو نے...... اچھا ہی ہے۔ الٹا فائدہ ہوگا۔ بگڑی ہوئی عادتیں ٹھیک ہو جائیں گی بچے کی۔ تجھے تو احساس ہی نہیں ہوا۔ زبیر اور رابعہ کا دل کیسا دکھا ہوگا۔"

"میں نے یہ سوچ کر تو نہیں کہا تھا۔"

"یہ اور برا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تیرا دل بہت سخت ہے۔ بہت ظالم ہے تُو۔ تجھے کیسے کیسے سمجھایا میں نے۔ تجھے اعتماد دیا' حوصلہ سکھایا پر تیرے دل کی تنگی جانے والی نہیں لگتی مجھے۔"

"اب میں کیا کروں اماں۔" نوربانو نے بے بسی سے کہا۔"ان کے اور میرے بیچ کوئی آئے' یہ مجھے گوارا نہیں۔"

"تو پھر ایک بات دھیان سے سن لے میری۔ تُو اسے خوشیاں کم اور دکھ زیادہ دے گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے اماں۔"

"دیکھو' ساجد سے عبدالحق کی محبت دیکھ کر تیری سمجھ میں نہیں آتا کہ بچوں سے بے تحاشہ محبت اس کی فطرت میں ہے۔ اگر وہ زبیر کے بچے سے اتنا پیار کرتا ہے تو اپنے بچے سے کتنا پیار کرے

گا۔ پھر تُو کیا کرے گی۔ اپنے بچے سے حسد کرے گی۔ سوچے گی کہ وہ اس کے اور تیرے بیچ آ گیا ہے۔ اسے کس طرح ہٹایا جائے۔"

نوربانو سناٹے میں آ گئی۔ بات تو سولہ آنے سچی تھی۔ وہ عبدالحق کو کسی کے ساتھ بانٹنا نہیں چاہتی تھی۔

"میں نے ہمیشہ تجھے بیٹی سمجھا۔ تجھے پسند بھی میں نے کیا۔ تجھے سمجھایا بھی۔ پر یہ جو آگ تیرے اندر جلتی ہے' تُو اسے بجھانا ہی نہیں چاہتی۔ اور تُو اس آگ میں جلے تو مجھے پروا نہیں۔ تیری اپنی کرنی ہے یہ۔ پر اس میں عبدالحق کو جلائے' یہ مجھے گوارا نہیں۔"

"تو تم میری اور ان کی شادی روک دو گی؟" نوربانو کے لہجے میں چیلنج تھا۔

"میں روکنا نہیں چاہتی۔ ورنہ روک بھی دیتی۔"

"ایک بات میں بھی تم کو بتا دوں اماں۔" نوربانو نے سرد لہجے میں کہا۔"اب میرے اور ان کے بیچ میں تم بھی نہیں آ سکتیں۔"

حمیدہ نے آخری ڈورا ڈال کر پوتڑے کو ایک طرف رکھا اور نوربانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔"تجھ جیسے لوگوں کے لیے کسی کو ضرورت نہیں نوربانو کہ تجھے نقصان پہنچائیں۔ اس کے لیے تُو آپ ہی بہت کافی ہے۔ تُو خود ہی اپنی بدنصیبی کا سامان ہے۔ اب بھی دیکھ کہ اس وقت تُو نے اللہ کی دی ہوئی ماں کو کھو دیا۔ خدا کی قسم' میری سگی بیٹی بھی ہوتی تو اس بات پر میں اسے چھوڑ دیتی۔ عبدالحق میرے لیے بیٹا ہی نہیں' دنیا کی نعمت سے بڑھ کر ہے۔ اور تُو نے جو اتنی بڑی بات کہی تو اس کا مطلب ہے کہ تُو عبدالحق کو جانتی ہی نہیں۔ ارے وہ کیسی ہی پر جان دیتا ہو تجھ پر۔ میں حکم دوں تو وہ خود شادی سے منع کر دے۔"

نوربانو ایک دم سہم گئی۔"مجھے معاف کر دو اماں۔ نہ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے۔"

"جنہیں خود پر اعتماد نہیں ہوتا وہ بزدل بھی ہوتے ہیں۔" حمیدہ نے کہا۔"ڈر گئی نا۔ لیکن ڈر مت۔ میں یہ شادی نہیں رکواؤں گی۔ لیکن اب میں تجھے بیٹی بھی نہیں سمجھوں گی۔ شادی تو عبدالحق سے تیری ہوگی۔ مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ تیرے اندر کی آگ سے عبدالحق کو کبھی نہیں جلنے دوں گی میں۔ وہ وقت نہ آنے دینا۔ ورنہ تجھے معلوم ہو جائے گا کہ عبدالحق کتنا فرماں بردار بیٹا ہے۔"

نوربانو کو احساس ہو گیا کہ بے اعتمادی کے بعد حد سے بڑی ہوئی خود اعتمادی میں وہ بہت بھاری غلطی کر بیٹھی ہے لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر اور منہ سے نکلی ہوئی بات کبھی واپس نہیں آتی۔

تاہم اس کا خوف اور بے یقینی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس عالم میں اس نے ایک اور بہت بڑا فیصلہ کر لیا!

❁.....❁.....❁

عبدالحق کو دور سے ہی ساجد کی آواز سنائی دی۔ اس نے سمجھ لیا کہ زبیر آ رہا ہے۔ رونے کی آواز ہر لحہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت مسجد کے صحن میں تھا' اور مولوی صاحب اس کے ساتھ تھے۔

بچہ ایسے رو رہا تھا کہ لگتا تھا' کسی قیمت پر چپ نہیں ہوگا۔

زبیر مسجد میں داخل ہوا اور ہچکچاتے قدموں کے ساتھ عبدالحق اور مولوی صاحب کی طرف بڑھا۔ ان دونوں کے چہرے سامنے سے تو کھلے ہوئے تھے لیکن اطراف میں انہوں نے کپڑا ڈال رکھا تھا۔

بچہ زبیر کے کندھے سے لگا' اب بھی روئے جا رہا تھا۔ زبیر نے اسے موڑا اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لے ساجد' دیکھ میں تجھے صاحب کے پاس لے آیا۔ اب تو چپ ہو جا۔''

وہاں روشنی بھی بہت کم تھی۔ بچے نے سامنے دیکھا بھی نہیں۔ اسے رونے سے فرصت ہی نہیں تھی۔ لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ اور ٹکر ٹکر عبدالحق کو دیکھنے لگا۔

پھر وہ اتنی تیزی سے اس کی طرف لپکا کہ زبیر چوکنا نہ ہوتا تو وہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ہوتا۔

''سنبھالیں صاحب۔'' زبیر نے گھبرا کر کہا۔

عبدالحق نے گود میں بچے کو لیا۔ اب وہ بچے کو غور سے اور بچہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور زبیر اور مولوی صاحب انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ ایسے ساکت لمحے تھے کہ لگتا تھا' وقت ٹھہر گیا ہے۔

پھر بچے کا چہرہ جیسے تڑخنے لگا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ عبدالحق کو صاف پتہ چل گیا کہ اس رونے میں شکایت پنہاں ہے۔

''کیوں روتے ہو۔ چپ ہو جاؤ۔'' عبدالحق نے بڑے دلار سے کہا۔

اور ایسا لگا ننھے ساجد نے جیسے اس کی بات سمجھ لی۔ اس کا رونا تھمنے میں کچھ دیر لگی۔ لیکن وہ بہرحال چپ ہو گیا۔

عبدالحق کی اپنی کیفیت بھی عجیب تھی۔ یہ محبت کا عجیب معصوم اور بے غرض روپ اس نے دیکھا تھا۔ ''اب تم اتنے چھوٹے سے ہو کہ کچھ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ آدمی کبھی مجبور بھی ہوتا ہے۔ بلکہ آدمی تو مجبور ہی ہے۔ مگر تم آزاد ہو۔ کیونکہ ابھی مجبوری سمجھ نہیں سکتے۔ اسی لیے ضد کرتے ہو۔ اور ضد پوری نہ ہو تو اور ضد کرتے ہو۔'' وہ بے اختیار اس ناسمجھ بچے سے باتیں کر رہا تھا۔ اب اسے زبیر اور مولوی صاحب کی موجودگی کا احساس بھی نہیں تھا۔

اور ننھا ساجد بڑی یکسوئی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے جیسے پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں گہرا ارتکاز تھا...... اور تفہیم بھی۔

''تمہیں سمجھنا چاہیے کہ کبھی کوئی ملنے والی چیز بھی نہیں ملتی آدمی کو۔''

زبیر اور مولوی صاحب دم بخود وہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

پھر ایک تبدیلی آئی۔ بچہ بولنے لگا۔ بولنا تو خیر اسے نہیں کہا جا سکتا۔ بس وہ بے معنی آوازیں نکال رہا تھا...... مگر تسلسل سے اور درمیان میں توقف بھی کرتا تھا' جیسے گفتگو میں توقف ہوتا ہے۔

''اب تم مجھ سے ملنے مسجد میں بھی آ گئے ہو۔ حالانکہ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' عبدالحق اپنی کیفیت میں کہہ جا رہا تھا۔

ساجد نے جواب میں کچھ غوں غاں کی۔

''مگر اب اس بات کا خیال رکھنا کہ یہاں پیشاب نہیں کرنا ہے۔''

ساجد نے پھر غوں غاں کی' جیسے اس کی بات کا جواب دے رہا ہو۔

''فکر نہ کریں صاحب!'' زبیر نے جلدی سے کہا۔ ''اس نے کچھ کھایا پیا ہی نہیں پورے دن اور پھر اماں کہہ رہی تھیں کہ یہ کچھ کرے گا بھی تو اندر ہی جذب ہو جائے گا۔''

''تو تم نے روزے بھی رکھنے شروع کر دیے ابھی سے۔'' عبدالحق نے کہا۔

بچہ قلقاری مار کر ہنسا۔

عبدالحق نے اسے کندھے سے لگانا چاہا۔ مگر بچے نے باقاعدہ مزاحمت کی۔ وہ عبدالحق کا چہرہ دیکھنے پر مصر تھا۔ مولوی صاحب کے کہنے پر عبدالحق بیٹھ گیا اور بچے کو گود میں لٹا لیا۔

اب دونوں کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

پھر ذرا دیر بعد بچے کی آنکھیں مندنے لگیں۔ وہ آنکھیں کھلی رکھنے کے لیے کچھ دیر نیند سے لڑتا رہا۔ مگر بالآخر ہار گیا۔ اور بے سدھ ہو کر سو گیا۔

''لایئے صاحب' اب میں اسے لے جاؤں۔'' زبیر نے کہا۔

''نہیں زبیر بھائی۔ اب یہ آ گیا ہے تو اس کا قرض ضرور ادا کروں گا۔'' عبدالحق نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے بچے کو کندھے سے لگایا اور مسجد کے صحن میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

''تم خوش نصیب ہو زبیر۔'' مولوی صاحب نے زبیر سے کہا۔ ''ایک تو اس بچے کا نام ساجد ہے۔ پھر یہ اتنا سا مسجد میں آیا ہے' اور آتا رہے گا۔ تو اس کا انشااللہ مسجد سے گہرا تعلق رہے گا۔ انشااللہ اسے ذوقِ عبادت ملے گا اللہ سے۔''

ذرا دیر بعد عبدالحق نے بچے کو واپس زبیر کی گود میں دے دیا۔ پھر وہ مولوی صاحب کی طرف مڑا۔ ''اب مولوی صاحب کل......''

''تم نے بتایا تھا کہ یہ دو وقت تمہارا عادی ہے؟'' مولوی صاحب نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"تو کل بارہ بجے بچے کو یہاں لے آنا۔ ظہر سے پہلے واپس چلا جائے گا۔ اور پھر رات کو تراویح کے بعد۔"

"جو حکم مولوی صاحب۔"

زبیر بچے کو لے کر چلا گیا۔ "میں سمجھا تھا کہ زبیر بڑھا کر بتا رہا تھا۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "لوگ محبت کرنے میں ایسا ہی کرتے ہیں نا۔ لیکن پتر عبدالحق یہ بچہ تمہارے لیے سب کچھ چھوڑے بیٹھا تھا۔ تم بہت خوش نصیب ہو پتر۔"

عبدالحق کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"چلو...... اب چل کر قرآن کی سیر کریں۔"

عبدالحق ان کے ساتھ مسجد میں چلا گیا۔

❁......❁......❁

مسجد میں جو گزری تھی، وہ زبیر رابعہ کو سنا رہا تھا۔ رابعہ کی آنکھیں نم تھیں۔

"اور یہ باقاعدہ باتیں کر رہا تھا صاحب سے۔ بس لفظ نہیں تھے۔ غوں غاں کر رہا تھا۔"

رابعہ نے جھک کر پہلو میں لیٹے ہوئے ساجد کی پیشانی چوم لی۔ "بہت محبت کرتا ہے یہ ہمارے صاحب سے۔"

"صاحب بھی بہت محبت کرتے ہیں اس سے۔" زبیر نے جلدی سے کہا۔

"پتا ہے مجھے۔ پر زبیر، نور بی بی کو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ آج تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ سب مل کر ساجد کی عادتیں خراب کر رہے ہیں۔ اسے بڑے ہو کر نقصان ہوگا۔"

"ابھی وہ نہیں چاہتیں کہ صاحب کسی اور کو توجہ دیں۔ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائیں گی۔" زبیر نے بے پروائی سے کہا۔

"نہیں زبیر۔ شادی کے بعد تو وہ صاحب پر قبضہ ہی کر لیں گی۔" رابعہ نے کہا۔

"تُو تو پگلی ہے رابعہ۔"

"نہیں زبیر، عورت سے زیادہ عورت کو کون سمجھ سکتا۔ یہ قبضہ کرنے کی بیماری ہے، جو بڑھتی جاتی ہے۔ دیکھ لینا، وہ تو صاحب کے سائے سے بھی جلا کریں گی۔"

"تو ہمیں اس سے کیا۔"

"ساجد نشانہ بنے گا...... اور اس کی وجہ سے ہم بھی۔"

"تُو فکر نہ کر۔ ایک بات بتا۔ ہمارے لیے صاحب بڑے ہیں یا نور بی بی؟"

"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" رابعہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "نور بی بی تو صاحب کے دم سے ہیں۔ ہمارا تو سب کچھ صاحب ہی ہیں۔"

"بس تو پھر کیا ہے۔ جو بھی ہوگا، صاحب کی خاطر سہہ لیں گے۔ اور پھر صاحب تو لاہور چلے جائیں گے۔"

"ہاں...... یہ تو ہے۔" رابعہ اداس ہو گئی۔ پھر وہ چونکی۔ "ارے...... میرا بچہ کب سے بھوکا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ساجد کو جھنجھوڑا۔ مگر وہ اتنی نیند میں تھا کہ کوشش کے باوجود بھی نہیں اٹھا۔

"سوتے میں ہی دودھ پلانے کی کوشش کر۔"

"نہیں پیتا۔ پہلے بھی کوشش کی تھی۔"

"اب شاید پی لے۔ صاحب سے مل کر خوش خوش سویا ہے۔ بھوکا بھی ہے۔ تُو کوشش تو کر۔"

رابعہ نے کروٹ بدلی اور سوتے ہوئے ساجد کو دودھ پلانے کی کوشش کی۔ اسے ساجد کے ردعمل پر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، وہ سو رہا تھا۔ مگر پھر بھی چُسر چُسر دودھ پی رہا تھا۔

"سنو جی، یہ دودھ پی رہا ہے۔" اس نے پلٹے بغیر زبیر کو خوش خبری سنائی۔

"اللہ کا شکر ہے۔"

"پر کل کیا ہوگا؟"

"آج گزری ہی نہیں اور تُو نے کل کی فکر شروع کر دی۔" زبیر نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ "کل سے صاحب کی واپسی تک یہ دن میں دو بار مسجد جایا کرے گا...... ظہر سے پہلے اور عشاء کے بعد۔"

❁......❁......❁

نور بانو کے سینے میں ایسی آگ بھڑک رہی تھی، جو لگتا تھا کہ اس کے وجود کو جلا کر راکھ کر دے گی!

وہ پہلے سے جانتی تھی کہ یہ آگ اس کے اندر موجود ہے، اور کبھی کبھی کسی موقع پر...... جب وہ عبدالحق کو کسی کے قریب ہوتے یا کسی کو عبدالحق کے قریب ہوتے دیکھتی ہے تو وہ آگ بری طرح بھڑک اٹھتی ہے۔ اور اس آگ میں سب سے پہلے اس کے ہوش و حواس جلتے تھے۔

لیکن جیسا آج ہوا، پہلے کبھی نہیں ہوا تھا!

ننھے ساجد کو عبدالحق سے ملوانے کے لیے مسجد لے جانے کا جو اجتماعی اہتمام کیا گیا، اس نے اس کے اندر کی آگ کو بہت زیادہ بھڑکا دیا تھا۔ سبھی خوش تھے اور اپنے اپنے طور پر اس تیاری میں حصہ لے رہے تھے۔ اور وہ خود پر نہایت جبر کر کے خاموش تھی۔ جانتی تھی کہ زبان کھلی تو نہایت زہریلی کوئی بات زبان سے نکلے گی۔

اس کے اندر کی اس آگ سے حمیدہ پوری طرح واقف تھی۔ اس نے تو بہت پہلے اس آگ کو سمجھ لیا تھا۔ ایک ماں کی طرح اسے خود اعتمادی دینے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس سے وعدہ بھی کیا تھا

کہ عبدالحق کی شادی اس کے سوا کسی سے نہیں ہونے دے گی۔ اور اس نے کیا بھی یہی تھا۔
نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ نور بانو نے نہایت سختی سے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ پہلے ہی سے مجھ سے محبت کرتے تھے اور پھر برسات کی اس شام شیڈ میں جو کچھ ہوا...... نہیں، یہ شادی اماں نہیں کرا رہی ہیں۔ یہ عبدالحق خود کر رہے ہیں، اماں کا کوئی احسان نہیں مجھ پر۔ اور ابھی چند گھنٹے پہلے تو اماں سے اس کی اچھی خاصی تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ اماں نے اسے ایک چیلنج دیا تھا، اور اس نے ڈر جانے کے باوجود علانیہ طور پر تو نہیں' بڑی خاموشی سے اسے قبول کر لیا تھا۔
اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ احسان فراموش اور خود غرض ثابت ہو رہی ہے...... بلکہ بیوقوف بھی، جو اپنے خیر خواہ کو اپنا دشمن بنا لے، اس سے بڑھ کر تو کوئی بے وقوف ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر وہ کیا کرتی مجبور تھی۔ وہ آگ بھڑکتی تھی تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی تھی۔ اس نے ٹھنڈے دل سے سوچنے کی کوشش کی کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ عبدالحق اس کے مقابلے میں کسی سے رائی برابر بھی محبت کرے، یہ اسے گوارا نہیں۔ عبدالحق پر کسی کا تسلط تو کجا، معمولی سا حق بھی اسے قبول نہیں۔ اس اعتبار سے اس کی سب سے بڑی دشمن تو حمیدہ ہی تھی جو کہتی تھی کہ میں دکھا دوں گی کہ عبدالحق کتنا فرماں بردار بیٹا ہے۔
اُس نے سوچا' شادی کے بعد اس سے نمٹ لے گی، وہ ایسا کرے گی کہ عبدالحق اس کی بات سے انکار ہی نہ کر سکے۔ برسات کی اس شام شیڈ میں ہونے والے اُس واقعے نے جبلی طور پر اسے سمجھا دیا تھا کہ اس کے لیے جسمانی قربت ہی مکمل فتح کا راستہ ہے۔ وہ اسے عادی بنا دے گی، اور پھر جب ضرورت پڑی، اسی ہتھیار کو استعمال کرے گی۔ پھر وہ دکھائے گی کہ عبدالحق کیسا مطیع شوہر ہے۔
مگر اس وقت تو مسئلہ ساجد تھا۔ عبدالحق پر حق تو صرف اسی کا تھا، اور وہ اس کے لیے ترس رہی تھی۔ جبکہ ساجد کو اتنے اہتمام سے تیار کر کے عبدالحق سے ملوانے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ اس خیال نے اس کے اندر ایسی آگ بھڑکائی تھی کہ اسے اپنا وجود پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ بزدل ہے۔ پہل نہیں کر پاتی۔ اس نے سوچا اور یہ سچ ہے کہ وہ عبدالحق کو اعتکاف میں بیٹھنے سے روکنا چاہتی تھی لیکن کم ہمتی کی وجہ سے کہہ نہ سکی۔ یہاں تک کہ خود عبدالحق نے ساجد کی وجہ سے اعتکاف سے دست برداری کا خیال ظاہر کر دیا۔ اب اس میں بھی خواہش تو اُس کی ہی پوری ہو رہی تھی لیکن نام تو ساجد کا ہو رہا تھا۔ اور یہ اسے گوارا نہیں تھا چنانچہ اس نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ اگرچہ حمیدہ نے اس کی حمایت کی تھی۔ اور عبدالحق کے عمل سے ثابت ہو گیا تھا کہ اس نے حمیدہ کی بات پر اس کی بات کو فوقیت دی۔
لیکن یہ خوشی اس حقیقت کے سامنے ہیچ تھی کہ اس وقت وہ تو عبدالحق کی دید کے لیے ترس

رہی ہے' اور ساجد مسجد میں عبدالحق کی گود میں کھیل رہا ہے' ناز برداریاں کروا رہا ہے۔ اس خیال سے تو اس کے اندر ایسی آگ بھڑکی تھی کہ اس کے لیے سکون و قرار ناممکن ہو گیا تھا۔
ایسے میں نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ زرینہ نے سونے سے پہلے اس سے معمول کے مطابق اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے چڑچڑے پن سے گھبرا کر خاموش ہو گئی، پھر وہ سو بھی گئی۔ لیکن نور بانو جاگتی رہی۔
اسے یاد آیا' حمیدہ نے کہا تھا' اگر عبدالحق زبیر کے بچے سے اتنا پیار کرتا ہے تو اپنے بچے سے کیسا کرے گا۔ پھر تُو کیا کرے گی۔ اور اب وہ بڑی سنجیدگی سے اس سوال پر غور کر رہی تھی۔
کیا وہ اپنے بچے کی اپنے اور عبدالحق کے درمیان مداخلت گوارا کر سکتی ہے۔ تجربہ تو اسے نہیں تھا۔ وہ بس قیاس ہی کر سکتی تھی۔ وہ اپنے بچے سے محبت کر سکتی تھی۔ اسے وقت دے سکتی تھی لیکن عبدالحق کی اسی پر توجہ وہ گوارا نہیں کر سکتی تھی۔
تو پھر وہ اس وقت کیا کرے گی؟
اور جواب فوراً ہی اس کے ذہن میں آ گیا۔ جس وقت حمیدہ نے یہ بات اس سے کہی تھی' اس پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ اس لمحے اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت وہ دیوانگی کا فیصلہ تھا۔ مگر اب وہ ہوش و حواس میں اس کی توثیق کر رہی تھی۔
اسے اولاد نہیں چاہیے!
ایک لمحے کو اسے ڈر لگا۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے مسجد میں اعتکاف میں بیٹھے عبدالحق کی گود میں کھیلتے ہوئے ساجد کا تصور کیا تو جیسے اس کا اندر دھڑ دھڑ جلنے لگا۔
نہیں چاہیے مجھے اولاد۔ اس کے اندر سے ایک تند آواز ابھری۔
وہ اٹھی اور دیکھا زرینہ سو چکی تھی۔ وہ کمرے سے نکلی اور اس نے جا کر وضو کیا۔ واپس آ کر اس نے جائے نماز بچھائی اور دو رکعت نماز نفل برائے قضائے حاجت کی نیت کر لی۔
بہت خشوع و خضوع سے اس نے وہ نماز ادا کی۔ سلام پھیرنے کے بعد اُس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اللہ کے حضور اپنی حاجت پیش کی۔ اے اللہ! آپ قدرت والے ہیں۔ میں آپ سے مانگتی ہوں۔ مجھے اولاد کبھی بھی نہیں دیجئے گا...... کبھی بھی نہیں۔
دعا کرتے ہوئے ایک لمحے کو اس کا دل تھرتھرایا...... یہ کیسی دعا کر رہی ہے وہ، مگر پھر اس کی آنکھوں کے سامنے عبدالحق کی گود میں ساجد کا تصور لہرایا۔ سماعت میں حمیدہ کی آواز گونجی...... اپنے بچے سے وہ کیسی محبت کرے گا۔
اس نے جھٹ اپنی دعا دہرائی اور چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر لیے۔

جاء نماز سمیٹتے ہوئے اس نے سوچا کہ رمضان میں ہر رات وہ اس حاجت کے لیے دو نفل پڑھ کر دعا کرے گی۔

❀.....❀.....❀

اچھو میاں بھی اعتکاف میں بیٹھ گئے تھے!

نادرہ نے سوچا کہ وہ خود انہیں یہ راہ دکھائے گی لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اچھو میاں خود ہی بہت تیزی سے سیکھ رہے تھے، ہر روز مسجد جانے والے اور باقاعدگی سے تراویح پڑھنے والے اچھو میاں کو اعتکاف کے بارے میں پتا بھی چل گیا تھا' اور انہوں نے اعتکاف میں بیٹھنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

انہوں نے تین چار دن پہلے ہی نادرہ کو مطلع کر دیا کہ وہ اعتکاف میں بیٹھیں گے۔ نادرہ نے خوشی سے سوچا کہ اللہ میاں کیسے ایک پل میں آدمی کی کایا پلٹ کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف نیلم بائی نے باقاعدہ اپنی حیثیت نادرہ کو سونپ دی تھی۔ اس نے تمام لڑکیوں اور دلالوں کو بتا دیا تھا کہ اب انہیں نادرہ کا ہر حکم ماننا ہوگا۔ اور کوئی مسئلہ ہو تو وہ بھی نادرہ کے سامنے رکھا جائے۔

نادرہ نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن علیحدہ میں نیلم بائی سے کہا۔ ''بوا...... میں تو بہت سی باتوں کو سمجھتی ہی نہیں ہوں۔ میں کوئی فیصلہ کیسے کر سکوں گی؟''

''جو معاملہ نہ سمجھ پاؤ' اس میں مجھ سے مشورہ کر لینا۔'' نیلم نے سادگی سے کہا۔

اچھو میاں اعتکاف میں جانے لگے تو نادرہ نے جمعتہ الوداع اور عید والے جوڑے بھی انہیں دیئے۔ ''عید کے لیے میں آپ کے نئے کپڑے سی دوں گی۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔''

''ضرورت ہے۔'' نادرہ نے کہا۔ ''اچھا یہ بتائیں' آپ اعتکاف میں کریں گے کیا؟''

''توبہ کروں گا اور اللہ سے دنیا اور آخرت کی بہتری مانگوں گا۔''

''میرے لیے بھی دعا کیجئے گا۔''

''تمہارے اور ارجمند کے لیے خود سے زیادہ دعا کروں گا۔''

ان کے جانے کے بعد نادرہ نے کاسو کو بلوا لیا۔ کاسو آیا تو حیران تھا۔ ''کیا بات ہے بائی؟''

اپنے لیے وہ لفظ نادرہ کو اچھا نہیں لگا۔ لیکن بہرحال وہ اُس کے لیے طاقت کا مظہر تھا۔

''اچھو میاں اعتکاف میں بیٹھے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔''

''اور نو لاکھ چوہے کھانے والی بلی کو روزہ بھی نصیب نہیں۔'' نادرہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''کاسو' اچھا یہی ہے کہ تُو تمیز سے بات کرنا سیکھ لے۔ اس بازار میں طوائف مشکل سے ملتی ہے۔ لیکن تجھ جیسے تو ٹکے میں چار ملتے ہیں۔''

کاسو ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ ''تم تو برا مان گئیں بائی جی۔ اب اچھو میاں مسجد میں جا بیٹھے تو مجھے کیا۔ یہ کہو کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''تجھے ہر روز اچھو میاں کو سحری اور افطاری پہنچانی ہوگی۔''

کاسو کا تو دم ہی نکل گیا۔ ''لو...... بڈھا میری نیند کا دشمن ہو گیا'۔ وہ بڑبڑایا۔

''کچھ کہا تُو نے؟''

''کچھ نہیں بائی جی۔ میں کہہ رہا ہوں کہ جو حکم تمہارا۔ میں آ جاؤں گا۔''

رمضان کے وہ آخری دس دن نادرہ کے لیے بڑی مصروفیت کے تھے۔ اسے ارجمند اور اچھو میاں کے لیے کپڑے بھی سینے تھے۔ پھر رمضان کی اپنی مصروفیات بھی ہوتی ہیں۔ مگر رات تو اس کی اپنی ہوتی تھی۔ اور رات کو وہ اللہ سے باتیں ضرور کرتی تھی۔

نیلم بائی سے عہد کرنے کے بعد سے وہ بہت بے چین اور بوجھل تھی۔ وہ فیصلہ اس کے لیے بوجھ نہیں تھا۔ جتنی بار بھی اس نے اس کے بارے میں سوچا' وہ اسی نتیجے پر پہنچی کہ اس کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کرتی اور نیلم بائی کوئی روایتی قدم اٹھاتی تو وہ اس کے اپنے لیے بھی سختی کا موجب ہوتا اور ارجمند کے لیے تو نہایت مخدوش ثابت ہو سکتا تھا۔ جبکہ اس فیصلے میں دونوں کے لیے بہتری تھی۔ اس کے لیے اس اعتبار سے کہ وہ محکوم نہ رہتی۔ وہ آزاد ہوتی اور بڑی حد تک گناہ آلود راتوں سے بچ سکتی تھی۔ اور ارجمند کے لیے تو بہتری ہی تھی۔ وہ اسے مکمل تحفظ فراہم کر سکتی تھی۔ بس بوجھ یہ تھا کہ اللہ کی رحمت سے ارجمند کے یہاں سے نکلنے کا سامان ہو جاتا' تب بھی اس کے لیے آزادی نہیں تھی۔

اس کی آزادی صرف موت میں تھی۔ لیکن وہ عہد کر چکی تھی کہ نہ کوٹھا چھوڑے گی' نہ خودکشی کرے گی۔

ارجمند کے لیے وہ قلب اور روح کی گہرائیوں سے کسی معجزے کی دعا کرتی تھی۔ اللہ کسی کو معتبر بنا کر بھیج دے' جو اسے یہاں سے نکال کر لے جائے' اور اسے ہر طرح سے عزت کی زندگی دے۔ ارجمند کی پچھلی بار کی باتوں سے اسے خوف آیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ پاگل پن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ کہنا کہ اللہ میاں اس سے باتیں کرتے ہیں اور وہ ان کی آواز سنتی ہے' یہ کوئی نفسیاتی مرض ہی ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف اس کم عمری میں اس نے اوتار سنگھ کو اپنے دل کا روگ بنا لیا تھا۔ خیر...... اچھی زندگی ملے تو ٹھیک ہو جائے گی وہ۔

سو وہ رات کی تنہائی اور تاریکی میں گڑگڑا کر اللہ سے ارجمند کی بہتری کے لیے دعائیں کرتی

رہتی، مگر اس کی تسلی نہ ہوتی۔ اور آخر میں وہ تڑپ کر اپنے لیے دعا کرتی...... اے اللہ! ارجمند کو یہاں سے نکالنے کے بعد مجھے بھی یہاں نہ رہنے دینا۔ مجھے موت دے دینا میرے رب۔ کیونکہ میں خود سے تو یہاں سے نکل نہیں سکتی۔ اور مجبوری ختم ہونے کے بعد میں یہاں ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتی۔

مجھے موت دے دینا میرے اللہ!

اسے خیال آتا کہ یہ وہ برا کر رہی ہے۔ کہیں اللہ ناراض نہ ہو جائے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ اللہ نے آدمی کو موت کی آرزو کرنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر وہ سوچتی کہ اللہ عالم الغیب ہے۔ سب جانتا ہے۔ اپنے بندوں کی ہر حالت، ان کی مجبوریوں سے واقف ہے۔ انسانوں پر ایسا وقت بھی تو آتا ہوگا، جب دنیا اور آخرت...... دونوں کی بہتری کے لیے اس کی موت ناگزیر ہو جائے۔ ایسے میں آدمی موت کی آرزو کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔

اور اس کے دل کو یقین تھا کہ وہ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہے!

❁......❁......❁
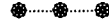
عید کا چاند نظر آ گیا تھا!

مولوی صاحب عبدالحق کو چھوڑنے کے لیے مسجد سے باہر آئے۔ زبیر بھی ان کے ساتھ تھا۔

"ان شاء اللہ تعالیٰ، اللہ تمہارا اعتکاف قبول فرمائے گا۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "اور اللہ تمہیں ذوقِ علم اور ذوقِ عبادت عطا فرمائے گا۔ اللہ تمہیں بہت آگے لے جائے گا...... بلندی کی طرف۔"

"اللہ آپ کو جزائے عظیم عطا فرمائے۔ آپ سے میں بہت کچھ سیکھتا ہوں۔ یہ راہ بھی آپ نے ہی بھائی تھی۔" یہ کہتے ہوئے عبدالحق کو نور بانو کا خیال آ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ نور بانو نے فیصلہ کن لہجے میں مداخلت نہ کی ہوتی تو وہ اعتکاف میں بیٹھتا ہی نہیں۔

"تم پر اللہ بہت مہربان ہے پتر۔ اب دیکھو اس اعتکاف میں بھی ایک ظاہری چیز تو تم کو مل گئی۔ باطن کا حال تو اللہ جانتا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"دس دن شیو نہیں کیا تم نے، تو داڑھی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔" مولوی صاحب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک تو اعتکاف کا نور اور پھر یہ جھلک۔ داڑھی تم پر بہت اچھی لگے گی پتر۔ میری مانو تو اب شیو نہ کرنا۔ خط بنوا لینا۔"

عبدالحق کو کچھ اچنبھا سا ہوا۔ داڑھی رکھنے کا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ "داڑھی رکھ لوں"۔ اس نے بے ساختہ حیرت سے کہا۔

"ہاں پتر، یہ تو فطری چیز ہے۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سنت ہے۔ ہم آپ ﷺ سے محبت کرتے ہیں تو آپ ﷺ کی پیروی بھی کریں گے نا۔ آپ ﷺ کی طرح بننے کی کوشش بھی کریں گے نا...... ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی۔ باطنی طور پر پیروی دشوار ہے۔ تو پہلے ظاہری سنت اپنائیں گے جو آسان ہے، تو اللہ باطن کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے گا۔"

"میں سمجھ گیا مولوی صاحب۔ ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔"

"جاؤ پتر، صبح عید کی نماز کے بعد ملیں گے۔"

عبدالحق زبیر کے ساتھ گھر کی طرف چل دیا۔ نور بانو کا خیال آنے کے بعد سے اب وہ اس کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ ایسے میں اسے ایک خیال نے دہلا دیا۔ وہ دس دن کے لیے دنیا سے...... ہر محبت اور تعلق سے کٹ کر اللہ کا ہو رہا تھا۔ اللہ کی عنایت تھی کہ ان دس دنوں میں اسے کسی کا خیال نہیں آیا لیکن باہر آتے ہی پھر وہی دنیا۔

مولوی صاحب نے رمضان کے بارے میں کہا تھا کہ یہ مہینہ اللہ کی رحمت ہے۔ ہر شخص کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ لیکن آدمی کو چاہیے کہ رمضان کے بعد بھی معمولات کو قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ یہ نہیں کہ عید کا چاند ہوتے ہی پہلے جیسا ہو جائے۔ تو اعتکاف تو اور بڑی رحمت تھا۔ مگر وہ اعتکاف سے نکلتے ہی پہلے جیسا ہو گیا تھا۔

اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ دنیا کی محبت تو اللہ نے خود ہی آدمی کے دل میں ڈالی ہے۔ تو یہ فطری ہے کہ آدمی دنیا کی طرف لپکتا ہے۔ اور اللہ نے آدمی کو دنیا ترک کرنے کے لیے کہا بھی نہیں۔

لیکن یہی تو آزمائش ہے۔ اس کے اندر کسی نے کہا۔ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون سا بندہ دنیا میں رہ کر دنیا سے محبت کرتے ہوئے بھی اسے...... اللہ کو اپنی پہلی ترجیح سمجھتا ہے۔ اور کون ہے جو اسے غیر اہم سمجھ کر بھلا دیتا ہے۔ کون ہے جو دنیا کی محبت پر اسے فوقیت دیتا ہے۔

مگر وہ اس پر سوچ نہیں سکا۔ کیونکہ وہ گھر پہنچ گیا تھا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے سوچا کہ سب سے پہلے وہ اماں سے ملے گا...... انہیں دیکھے گا...... اس کا خیال تھا کہ سب لوگ دروازے پر موجود ہوں گے اور اس کے منتظر ہوں گے لیکن اسے مایوسی ہوئی۔

تاہم وہ آگے بڑھا تو نور بانو سے سامنا ہو گیا۔ "السلام علیکم"۔ نور بانو نے کہا۔

"وعلیکم السلام"۔ اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ وہ اماں سے پہلے کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"اعتکاف مبارک ہو آپ کو۔" نور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"جی شکریہ"۔ اس نے کہا اور اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"صاحب! آپ چلیں۔ میں ابھی آتا ہوں"۔ زبیر اجازت لے کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

وہ اماں کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ نماز میں تھیں۔ اس کے دل کی شکایت دور ہو گئی۔ وہ ایک طرف بیٹھ کر اماں کے سلام پھیرنے کا انتظار کرنے لگا ان کے سلام پھیرتے ہی وہ ان کے قدموں میں جا بیٹھا۔ انہوں نے اسے چھوٹے سے بچے کی طرح لپٹا لیا اور اس کے چہرے کو بوسوں سے بھگو دیا۔

اتنی دیر میں سب لوگ آ گئے۔ ساجد رابعہ کی گود میں تھا۔ اسے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ عبدالحق نے اسے گود میں لے لیا۔ سب اسے مبارک باد دے رہے تھے۔

"اللہ گھر کیسا سونا ہو گیا تھا آپ کے بغیر بھائی!" زرینہ نے کہا۔ "کیسا یاد کرتے تھے ہم سب آپ کو۔ کتنی کمی محسوس ہوتی تھی آپ کی۔"

"میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن مجھے تو کوئی اپنا منتظر نہیں ملا۔ میں تو سمجھا تھا' سب دروازے پر موجود ہوں گے۔"

"میں تو موجود تھی وہاں"۔ نور بانو نے جلدی سے کہا۔ "اور میں نے آپ کو مبارک باد بھی دی تھی۔"

زرینہ کا چہرہ ستا گیا۔ "سب کا یہی حال تھا بھائی۔ آپ کی ایک جھلک دیکھنے کو تڑپ رہے تھے۔ سب سے پہلا حق تو اماں کا تھا۔ اس لیے دل چاہنے پر بھی ہم نے یہ بدتمیزی نہیں کی۔ اب اتنی دیر سے ہم کمرے کے باہر کھڑے تھے کہ آپ اماں سے مل لیں اچھی طرح۔"

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ "میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔"

"اور مجھے بھی آنا چاہیے تھا تیرے استقبال کے لیے۔" حمیدہ نے کہا۔

"کیوں شرمندہ کرتی ہو اماں۔ میں تمہارے لیے تو نہیں کہہ رہا تھا۔" عبدالحق اور کھسیا گیا۔

"اچھا...... اب کھانا لگاؤ جلدی سے"۔ حمیدہ نے کہا۔

کھانا لگایا گیا اور کھایا گیا۔ کھانے کے بعد چائے کے دوران حمیدہ عبدالحق کو بہت غور سے دیکھتی رہی۔ "کیسا نور آ گیا ہے۔ میرے پتر کے چہرے پر" اس نے کہا۔ "آخر اللہ کے پاس تنہائی میں وقت گزار کے آیا ہے۔ ہاں پتر' تجھ پر داڑھی بہت ہی لگ رہی ہے۔ بس اب تو داڑھی رکھ لے۔"

"یہی سوچا ہے اماں۔ مولوی صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے۔" عبدالحق نے کہا۔

❀ ❀ ❀

شادی میں تین چار دن رہ گئے ہوں' اور جبکہ شادی بھی من پسند آدمی سے ہو رہی ہو تو لڑکیوں کی نیند اُڑ ہی جاتی ہے۔ نور بانو کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی لیکن اس کا سبب مستقبل کے سپنے نہیں تھے۔ وہ اپنے اندر کی آگ میں جل رہی تھی۔

وہ ایسی لڑکی تھی کہ رقابت برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اور یہاں صورت حال یہ تھی کہ رقیبوں کی ایک قطار تھی۔ سب سے بڑی تو حمیدہ تھی' جو اسے چیلنج بھی دے چکی تھی۔ اور کھلم کھلا نہ سہی' دل میں نور بانو نے اس چیلنج کو قبول بھی کر لیا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ خوف زدہ بھی تھی۔ ماں سے بڑا درجہ تو کسی کا نہیں ہوتا' اور حمیدہ سچ مچ عبدالحق کی ماں تھی۔ اس نے اسے دودھ پلایا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو نور بانو؟" دوسرے پلنگ پر لیٹی ہوئی زرینہ نے اسے چونکا دیا۔

"اس پر غور کر رہی ہوں کہ کتنی بدتمیز ہو گئی ہوں میں۔"

"کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟"

"تمہی نے تو کہا ہے۔"

"میں نے کہا؟" زرینہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تو سوچے سمجھے بغیر کہا ہو گا۔" نور بانو نے بے پروائی سے کہا۔

"میں نے کب ایسا......" زرینہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ نور بانو کس حوالے سے بات کر رہی ہے۔ "اللہ...... بڑی بدگمان ہو تم۔ میں تو اپنی اور دوسرے لوگوں کی صفائی پیش کر رہی تھی۔ تمہارا تو خیال بھی نہیں تھا مجھے۔ اور جو میں نے کہا تھا' وہ سچ تھا۔"

"مطلب تو یہی نکلتا ہے نا اس بات کا۔ میں نے اماں کو نظر انداز کر کے پہل کی تو بدتمیزی کی۔"

"نہیں۔ اب تمہارا اور بھائی کا تعلق تو مختلف ہے۔ تمہارا تو حق تھا وہ۔ جو تم نے سمجھا' وہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

نور بانو ایک دم نرم ہو گئی۔ "سچ کہہ رہی ہو تم؟ وہ میرا حق تھا؟"

"تو اور کیا۔ میاں بیوی جیسا تعلق تو کوئی اور نہیں ہوتا۔"

"اور ماں؟"

"وہ اپنی جگہ ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ترین رشتے ہیں۔ ماں بہو کو بیٹی سمجھے اور بیٹی ساس کو ماں' تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ دونوں ہی کا تعلق اٹوٹ ہوتا ہے۔ ان میں تصادم نہیں ہونا چاہیے۔"

"مجھے معاف کر دینا زرینہ۔ میں نے بدگمانی کی۔"

"کوئی بات نہیں نور بانو۔"

زرینہ سوگئی۔ لیکن نور بانو کو نیند نہیں آئی۔ وہ سوچے جارہی تھی۔ حمیدہ اس کے لیے رقیب بن گئی تھی۔ اگر اس نے اسے موقع دیا تو وہ آگے بڑھے گی۔ اس کی پیش قدمی کو پہلے ہی روک دینا بہتر ہے۔ لیکن کیسے؟

دوسری طرف اور بھی بہت لوگ تھے۔ زرینہ تھی' اور بعد میں زرینہ کے حوالے سے اکبر' ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی بھی ہوں گے۔ پھر زبیر اور رابعہ بھی تھے۔ اور سب سے بڑھ کر ننھا ساجد۔ اسے کچھ تو کرنا ہوگا۔

اسے لاہور والے بنگلے کا خیال آگیا۔ واقعی...... اس نے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے کتنی بڑی نعمت ہے۔ اور شادی کے بعد وہ لوگ وہاں چلے جائیں گے۔ زبیر اور رابعہ تو جا ہی نہیں سکتے۔ زرینہ بھی یہاں رہے گی...... اپنے سسرال میں...... بس ایک اماں رہ گئیں۔ تو اتنے لوگوں کے بغیر وہ ایسی بڑی قوت نہیں رہیں گی۔

وہ کچھ مطمئن ہوگئی۔ لیکن پہلا سوال اپنی جگہ تھا۔ اسے حمیدہ کی قوت کو ایسے کم کرنا تھا کہ خود حمیدہ کو بھی اس کا احساس ہو جائے۔ اصل میں تو وہی اس کی حریف تھی۔ ویسے تو وہ عبدالحق کو کسی کے ساتھ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بانٹ سکتی تھی۔

وہ بے چین تھی۔ کوئی اہم بات تھی' جو یاد آتے آتے پھسل جاتی تھی۔ ذہن اسے گرفت میں نہیں لے پاتا تھا۔ اور وہ بات اس کی حمیدہ کے خلاف جنگی حکمتِ عملی سے تعلق رکھتی تھی۔

ایسی کوئی بات کتنا ہی یاد کرنے کی کوشش کرو' نہیں یاد آتی۔ ایسے میں اس طرف سے دھیان ہٹا لینا بہتر ہوتا ہے۔ سو اس نے بھی یہی کیا۔ اس نے اس پہلی بات کو یاد کیا' جس نے پہلی بار اسے حوصلہ دیا تھا۔ ورنہ وہ تو حمیدہ سے مقابلے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بلکہ اس سے پہلے تو اس نے حمیدہ سے تصادم کا سوچا بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو اس کی سب سے بڑی حلیف تھی۔

اس ایک بے ساختہ بات نے اس پر اپنے اندر کے کتنے ہی بھید کھول دیے تھے۔ اور اس کا سبب ساجد ہی بنا تھا۔ ساجد کے خیال سے عبدالحق نے اپنا اعتکاف منسوخ کرنے کا ارادہ کیا تھا' اور حمیدہ نے اس کی تائید کی تھی۔ اور اس نے بے ساختہ فیصلہ سنایا تھا کہ اتنی سی بات کے لیے اعتکاف نہیں چھوڑنا چاہیے۔

اور اس مرحلے پر یہ بات اس پر کھل گئی تھی کہ عبدالحق اس کی بات کبھی نہیں ٹال سکتا۔ حمیدہ کی تائید اس کے فیصلے کے سامنے غیر مؤثر ہوگئی تھی' اور عبدالحق نے اس کی بات پر عمل کیا تھا۔

مگر برا یہ ہوا کہ وہ بات حمیدہ پر بھی کھل گئی' اور حمیدہ نے اسے جتا بھی دیا' بلکہ چیلنج بھی کر دیا۔

اب آگے کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے نور بانو کو اپنی اس بالادستی کی کم از کم ایک بار تصدیق ضرور کرنی تھی۔ تاکہ یہ پتا چل جائے کہ وہ پہلی کامیابی اتفاقی اور اضطراری نہیں تھی۔

اب اس تصدیق کے لیے کیا کیا جائے۔ ایک بات اس نے سوچی تھی ایسی' اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ لیکن وہ ذہن سے پھسل گئی تھی۔ اتنا اسے یاد تھا کہ وہ آج ہی کی بات ہے۔ حمیدہ نے عبدالحق سے کچھ کہا تھا اور عبدالحق اس کے لیے آمادہ تھا۔ اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ وہ عبدالحق کو اس سے روکے گی۔ یوں اسے عبدالحق پر اپنے اثر و نفوذ کا اندازہ ہو جائے گا۔

پھر اچانک ہی وہ بات اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لہرا گئی!

وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بات تو اسے عبدالحق سے اسی وقت کرنا تھی۔ اس نے زرینہ کی طرف دیکھا۔ بظاہر تو وہ گہری نیند سو رہی تھی پھر بھی اپنی تسلی کے لیے اس نے زرینہ کو ہولے سے تین چار بار آواز دی۔ مگر وہ واقعی سو رہی تھی۔

وہ اٹھی اور کمرے سے نکل آئی!

❁......❁......❁

دستک کی آواز نے عبدالحق کو چونکا دیا۔ وہ بڑی دبی دبی سی' سہمی سہمی سی دستک تھی۔ اس کا دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا' ہو نہ ہو' یہ تو نور بانو ہی ہے۔

وہ اٹھا' دروازے کی طرف گیا' چٹخنی گرائی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے دل نے سچ کہا تھا۔ وہ نور بانو ہی تھی۔ ”آپ یہاں...... اس وقت! خیریت تو ہے؟“

”کیوں...... میں آپ سے مل نہیں سکتی۔ میں آپ کی ہونے والی بیوی ہوں۔“ نور بانو نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ”میں کسی بھی وقت مل سکتی ہوں۔ میں تو آپ کے کمرے میں بھی آسکتی ہوں۔“

عبدالحق گھبرا گیا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن اب بس چار دن کی تو بات ہے۔ کسی پر کوئی غلط تاثر کیوں چھوڑا جائے۔“

”میاں بیوی کے رشتے میں دوسرے لوگوں کے تاثر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کوئی کچھ بھی سمجھے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

عبدالحق خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں سوال تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ نور بانو کے چہرے پر سختی کتنی بری لگتی ہے۔ درشت لہجہ بھی اس پر نہیں سجتا۔ شاید جارحیت اس کے مزاج سے مناسبت ہی نہیں رکھتی۔

اچانک نور بانو کے چہرے سے سختی دور ہوگئی اور اس کی جگہ نرمی نے لے لی۔ ”میں آپ سے ایک بہت اہم بات کرنے آئی ہوں۔“

”جی فرمائیے۔ میں منتظر ہوں۔“

”ہمارے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اچھے لگیں۔“ نور بانو نے کہا۔

''دوسروں کو چاہے اچھا لگے یا برا۔ ہمارے اچھے لگنے کی اصل اہمیت ایک دوسرے کے لیے ہے۔''

عبدالحق کی سمجھ میں اس کی بات تو آ رہی تھی لیکن اس بات کا اصل مقصد وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ''یہ درست ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اور ہمیں اپنی پسند ناپسند سے زیادہ ایک دوسرے کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا ہوگا۔''

عبدالحق کا ذہن الجھنے لگا۔ یہ تمہید اسے خطرناک لگ رہی تھی۔ تاہم اس نے کہا۔ ''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔''

''تو میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں لیکن داڑھی میں مجھے اچھے نہیں لگے آپ۔''

عبدالحق کو شاک لگا۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی داڑھی ہے کہاں میری۔''

''مگر مجھے اسی سے اندازہ ہو گیا ہے کہ داڑھی میں آپ اتنے اچھے نہیں لگیں گے۔''

عبدالحق رسول اللہ ﷺ کی سنت کا حوالہ دینا چاہتا تھا لیکن اس نے خود کو بروقت روک لیا۔ اس وقت نور بانو ضدی کیفیت میں معلوم ہو رہی تھی۔ ایسے میں وہ کچھ سن اور سمجھ نہیں سکتی تھی۔ بلا وجہ وہ گناہ گار ہوتی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کا یہ تحفظ اس کی ذمہ داری ہے۔ ''آپ نے قبل از وقت رائے قائم کر لی ہے۔''

''اگر میں بعد میں یہ بات کہتی اور آپ داڑھی منڈواتے تو گناہ گار ہوتے۔'' نور بانو نے دلیل دی۔

واقعی ...... یہ بات تو سچ ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ اس کے باوجود وہ اندر ہی اندر جھنجلا رہا تھا۔ ''لیکن نور بانو......''

نور بانو نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''سنیں، آپ ابھی جوان ہیں۔ داڑھی رکھنے کو تو عمر پڑی ہے۔''

عبدالحق اس کے جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا حضور ﷺ نے بڑھاپے میں داڑھی رکھی تھی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اتنے دعوے سے یہ کیسے کہہ رہی ہے کہ داڑھی رکھنے کو تو عمر پڑی ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے اس کے پاس کہ وہ جوانی میں نہیں مر جائے گا۔ وہ تو اس لمحے بھی مر سکتا ہے۔ موت تو اللہ کا حکم ہے۔ اس کا وقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔

مگر اس نے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ نور بانو ضد میں بحث کرتی، اور اسے نقصان ہی ہوتا۔ یہ وہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ ''ٹھیک ہے...... اب آپ جا کر آرام کریں۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں

کہا۔

نور بانو پلٹی اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر دروازہ بند کر کے اندر چلا آیا۔ بستر پر بیٹھ کر وہ اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ نور بانو کی بات میں معقولیت بھی تھی اور وہ اسے غیر معقول بھی لگ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں جو حاکمیت تھی، وہ اسے ناگوار گزری تھی۔ مگر اس نے سوچا کہ محبت آدمی کو اختیار بھی تو دیتی ہے۔ اس کے باوجود اس کے اندر جھنجلاہٹ سی بھر گئی تھی۔

وہ سوچتا رہا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک اس کی زندگی کا مقصد اللہ کو تلاش کرنا، اسے پہچاننا، اور اس سے محبت کرنا تھا۔ درمیان میں اپنی آواز کے حوالے سے نور بانو آ گئی تھی، اور اسے اس آواز سے محبت ہو گئی تھی۔ جبکہ اس نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس محبت سے بھی اسے فیض پہنچا تھا ایک طرف تو اس کی وجہ سے اس نے عربی سیکھی، اور دوسری طرف یہ حوصلہ بھی ملا کے بن دیکھے اگر وہ کسی انسان سے محبت کر سکتا ہے تو اللہ سے کیوں نہیں کر سکتا۔ جبکہ انسان تو غلط بھی نکل سکتا ہے۔ اور اللہ تو حق ہی حق ہے، سراپا رحمت، نور کا منبع۔ نور بانو اس کے لیے محترم تھی کہ اس کی آواز میں سورۃ الملک کی قرأت سنتے ہوئے اللہ نے اسے نوازا تھا۔

پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی رگوں میں راج پوتوں کا گرم خون دوڑتا ہے۔

اس نے سوچا، بے شک یہ بیوی کا حق ہے کہ وہ اپنے شوہر سے ویسا ہونے کی فرمائش کرے، جیسے وہ اسے اچھا لگتا ہے لیکن اگر اس کی فرمائش سنتِ رسول ﷺ کی راہ میں رکاوٹ ہو تو کیا کیا جائے۔

جواب فوراً اس کے اندر سے ابھرا۔ نور بانو سے کہنا چاہیے کہ ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ فی الحال اسے روک دیا جائے۔ پھر جب داڑھی پوری ہو جائے تو نور بانو فیصلہ کرے کہ وہ اسے اچھا لگ رہا ہے کہ نہیں۔ اگر وہ داڑھی سے اسے اچھا نہ لگے تو شادی نہ کرے۔ کیونکہ شادی تو اس سے کرنی چاہیے جو اچھا لگتا ہو۔

حل تو یہی ایک تھا اس مسئلے کا اور بالکل درست تھا۔

لیکن محبت آدمی کو بے بسی اور عاجزی کی حد تک نرم کر دیتی ہے۔ وہ نور بانو سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کا دل ٹوٹ جاتا۔ اور پھر بات صرف محبت کی نہیں تھی۔ کچھ اور عوامل بھی تھے۔ محبت سے ہٹ کر دیکھا جائے تو بھی نور بانو اسے بہت مظلوم، بہت کمزور لگتی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جس نے اپنی آنکھوں سے اپنے لوگوں پر قیامت ٹوٹتے دیکھی، سب کو ختم ہوتے دیکھا۔ جس کے وجود نے خوف کی آخری حد دیکھی۔ جس کا اپنا کوئی نہیں رہا۔ اس کی دل جوئی کرنا تو اللہ کو خوش کرنا [illegible] کا دل دُکھا تو اللہ ناخوش ہوگا۔

[illegible] سچ اور بھی تھا...... شیڈ میں برسات کی اس شام ان کا جسمانی رابطہ! وہ تو ایک طرح

کا کمٹمنٹ تھا۔اب اگر وہ داڑھی کے مسئلے پر نور بانو سے اس طرح بات کرے اور بالآخر وہ داڑھی میں اسے ناپسند کرے اور شادی نہ ہو تو جسم کا وہ رابطہ گناہ بن کر ہمیشہ دونوں کے ساتھ رہے گا۔
نہیں......اس شادی سے تو وہ کسی طرح پیچھے نہیں ہو سکتا۔

وہ بوجھل دل کے ساتھ اٹھا اور شیو کا سامان لے آیا۔اس نے آئینے میں اپنے عکس کا تنقیدی جائزہ لیا۔وہ برا تو ہرگز نہیں لگ رہا تھا بلکہ پہلے سے اچھا لگ رہا تھا۔شاید خود کو......کم از کم خود کو۔ کیونکہ نور بانو کو تو وہ اچھا نہیں لگا تھا۔

اس نے شیو شروع کیا۔لیکن دس دن کی بڑھی ہوئی داڑھی آسان نہیں ہوتی' جبکہ آدمی شیو بھی نیم دلی سے کر رہا ہو۔اس کے نتیجے میں اس کے چہرے پر چھوٹے چھوٹے کئی چرکے لگ گئے اور شیو کے بعد جو اس نے آئینے میں دیکھا تو گھبرا کر اپنے عکس سے نظریں چرالیں۔شیو اس نے پہلی بار تو نہیں کیا تھا لیکن اپنا چہرہ اسے اتنا بدنما اور برا کبھی نہیں لگا تھا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا' جیسے وہ کسی متاع عزیز سے محروم ہو گیا ہے۔دل دکھ رہا تھا۔پھر آنسوؤں کے چند قطرے اس کے رخساروں سے گزرتے ہوئے اس کے دامن پر آگرے۔

تب اسے پتا چلا کہ وہ تو رو رہا ہے!

❁....❁....❁

عید کا چاند نظر آیا اور شیطان آزاد ہو گیا!

وہ رونقیں بحال ہو گئیں' جن سے نادرہ کا دل گھبراتا تھا' جن کے مقابلے میں ویرانیاں اور سناٹے اسے اچھے لگتے تھے۔سب دکانیں کھل گئیں۔ہار پھول والوں کی دکانوں پر سب سے زیادہ رونق تھی۔

نادرہ نے نیلم بائی سے کہہ دیا کہ دو تین دن وہ کسی کو نہیں ملے گی۔آنے والوں کو کسی طرح ٹال دیا جائے۔

خلاف توقع نیلم بائی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔''میں تجھے اچھی طرح سمجھتی ہوں نرگس!'' اس نے ناصحانہ انداز میں کہا۔''میں تو اپنی زندگی میں ہی سب کچھ تجھے سونپ رہی ہوں۔تُو اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہو گی۔البتہ میں مشورہ ضرور دیا کروں گی ضرورت پر۔مانے نہ مانے' تیری مرضی۔''

''میرے سر آنکھوں پر بوا......میں یہاں کی زندگی کو پوری طرح جانتی سمجھتی کب ہوں۔'' نادرہ نے کہا۔

''تو پھر غور سے میری بات سن۔دلدل سے ایسے ایک دم کوئی نہیں نکل سکتا۔تیرے کچھ خاص گاہک بھی ہیں۔انہیں ایک دم سے چھوڑنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ورنہ وہ اوچھی حرکتوں پر اتر آئیں گے۔تجھے ہر قدم پھونک پھونک کر پیچھے ہٹانا ہوگا۔ان سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب میں

تجھے بتاؤں گی' لیکن رفتہ رفتہ عمل کرنا ہوگا۔''

نیلم کہتی رہی اور نادرہ بڑے غور سے سنتی رہی۔

''اور دو ایک نئی' اور بہت خوبصورت لڑکیاں مل جائیں تو کام آسان ہو جائے گا۔اس کے علاوہ کوٹھے کی تمام لڑکیاں کو ساتھ ملانا ہوگا کہ وہ اپنی زبان بند رکھیں۔اس کے علاوہ بھڑووں کا منہ بھی بند کرنا ہوگا۔''

بات نادرہ کی سمجھ میں آرہی تھی۔پہلی بار اس نے سوچا کہ نیلم بائی بہت عقل مند عورت ہے۔

''لیکن بڑے افسروں اور اثر و رسوخ والے لوگوں کو نہیں ٹالا جا سکتا۔''

''اس کی بھی کوئی ترکیب تو ہو گی بوا۔''

''تُو نے میری بات سنی ہی نہیں''۔ نیلم نے تلخ لہجے میں کہا۔''میں نے کہا نا کہ دلدل سے ایک دم کوئی نہیں نکل سکتا۔اور تُو چاہتی ہے کہ ایک دم پاک ہو جائے۔'' پھر اس نے گہری سانس لی۔''تجھ میں کوئی بات ہے' جو مجھے اچھی لگتی ہے۔یا شاید سامنے کھڑی موت نے میرے کس بل نکال دیے ہیں۔ورنہ میں سیدھے سیدھے یہ کوٹھا کسی کو بیچ دیتی۔''

نادرہ ڈر گئی۔''بوا میرے ساتھ نیکی کرو گی تو ان شاء اللہ تمہارے کام آئے گی۔مجھے نجات دلاؤ گی تو میں عمر بھر تمہاری نجات کے لیے دعا کروں گی۔اور ان شاء اللہ اس کے صلے میں اللہ تمہیں نجات دے گا۔''

نیلم کی آنکھ میں آنسو آگئے۔''کون جانے۔ویسے تو اللہ کی رحمت اور مغفرت بہت وسیع ہے۔''

''مجھے کچھ بتاؤ نا بوا' کچھ کرو نا۔'' نادرہ گڑگڑائی۔

''ہے تو ایک ترکیب لیکن کوٹھے کی بدنامی ہوتی ہے اس میں۔''

''تو کوٹھا نیک نام بھی ہوتا ہے بوا''۔ نادرہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

''نہ سہی......لیکن ہر دکان کی طرح اس کی بھی ساکھ تو ہوتی ہے۔اور پھر اس میں تیری بھی بدنامی ہے۔''

''اب مجھے اس کی کیا پروا بوا۔''

نیلم کچھ سوچتی اور ہچکچاتی رہی۔اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔پھر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔''تو سن' بھانت بھانت کے مرد کوٹھوں پر آتے جاتے ہیں۔اب اس سے بڑی قربت تو کوئی اور ہوتی نہیں۔اب آدمی دس جگہ جائے گا تو کہیں سے کوئی بیماری اٹھا لائے گا اور اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔پھر وہ اس بیماری کو ادھر اُدھر بانٹتا پھرے گا۔ایسی بیماریاں بہت موذی' بہت خوفناک ہوتی ہیں۔یہ بدکاروں کے لیے اللہ کا عذاب ہے۔اور معاملہ وہی انڈے

اور مرغی والا ہے کہ پہلے انڈا آیا یا مرغی؟ کسی کو نہیں پتا چلتا کہ کون کس کو کیا دے گیا ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ روگ ہے زندگی بھر کا۔ صحت کو گھن لگ جاتا ہے۔ جسم تباہ ہو جاتا ہے آدمی کا۔"

ٹھیک طرح سے نہ سمجھنے کے باوجود نادرہ کو تھرتھری چڑھ گئی۔

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ نکاح اللہ کی رحمت ہے' بہت بڑی نعمت ہے۔" نیلم نے کہا۔ "ہر جگہ منہ مارتے پھرنے کا شوق تباہ کر دیتا ہے آدمی کو۔ دنیا بھی گئی، اللہ بھی خفا اور آخرت بھی خراب۔"

"پر بوا...... میرے مسئلے سے اس کا کیا تعلق۔"

"کسی طوائف کے بارے میں یہ بات پھیل جائے کہ وہ اس بیماری میں گرفتار ہے تو لوگ اس کی طرف رخ بھی نہیں کرتے۔"

اب بات نادرہ کی سمجھ میں آئی۔ اس نے غور سے نیلم کو دیکھا۔ لیکن کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

مگر نیلم نے اس کی بات سمجھ لی تھی۔ "ہاں نرگس' میں خود اس مرض کا شکار ہوں۔"

نادرہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

"تجھے یا کسی کو بھی مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بیماری صرف جسمانی قربت کے نتیجے میں لگتی ہے۔"

"تو یہ ہوگا کیسے۔"

"بہت آسانی سے۔ ان لڑکیوں کے لیے منہ بند رکھنا تو ناممکن ہے۔ لیکن انہیں ایسا کچھ پتا چل جائے تو یہ سب کو بتاتی پھریں گی۔ میں صرف ایک لڑکی سے یہ بات کہہ دوں تو اسی دن سب کو معلوم ہو جائے گا۔ بلکہ گاہکوں کو بھی پتا چل جائے گا۔"

"تو بوا' یہ کام کر دو نا۔"

"سوچ لے۔ پھر تجھے اچھوت بنا کر رکھ دیں گے یہ سب۔"

"مجھے منظور ہے بوا۔"

"پھر تیرے ساتھ لڑکیوں میں سے بھی کوئی نہیں سوئے گی۔ تجھے میرے کمرے میں میرے ساتھ سونا ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے بوا۔ تمہارا احسان ہوگا مجھ پر' یہ احسان کیسے اتار پاؤں گی میں۔"

"میرے لیے دعا کر دے۔"

"ہر سانس تمہارے لیے دعا کروں گی بوا۔"

نیلم نے ذرا دیر بعد ہی بہت سرسری انداز میں یہ خبر چمپا کو دے دی۔ پھر سلیم صاحب نرگس کے لیے تڑپتے ہوئے آئے تو اس نے ان سے کہا۔ "مجبوری ہے سلیم میاں' نرگس تو ابھی چار پانچ

دن نہیں مل سکے گی تمہیں۔"

"تو کچھ کر بائی' آج تو چاند رات ہے۔"

"تو چمپا کو بلوا دیتی ہوں۔"

یوں اسٹیج پوری طرح تیار ہو گیا۔

ادھر اچھو میاں اعتکاف سے نکل کر آئے تو نادرہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایسا نورانی چہرہ ہو گیا تھا ان کا کہ نظر ہی نہیں پڑتی تھی۔ اس پر سفید داڑھی۔

"اب آپ کو یہاں واپس آنا اچھا تو نہیں لگ سکتا۔" اس نے اداسی سے کہا۔

"نہیں نادرہ' ہے تو یہ کوٹھا ہی۔ مگر جب تک تم اور ارجمند یہاں موجود ہو' یہ میرے لیے گھر ہی ہے۔" اچھو میاں نے کہا۔

"آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ بس اب داڑھی رکھ لیجیے۔"

"دل تو یہی چاہتا ہے لیکن یہاں رہتے ہوئے تو یہ ممکن نہیں۔"

"ابھی تو اسے گھر کہہ رہے تھے آپ۔"

"نہیں نادرہ' یہاں داڑھی رکھ کر پیارے نبی ﷺ کی سنت کی بے حرمتی تو نہیں کر سکتا میں۔"

نادرہ لاجواب ہو گئی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔

❁.....❁.....❁

عید کی نماز پڑھ کر عبدالحق سیدھا حمیدہ کے کمرے میں سلام کرنے کے لیے گیا۔ حمیدہ کو وہ کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ اس نے اسے لپٹا کر خوب پیار کیا۔ پیار کرتے ہوئے اس کی سمجھ میں وہ تبدیلی آ گئی۔ اسے جھٹکا لگا۔

"عید مبارک اماں۔"

"خیر مبارک پتر۔ تیری تو یہ خاص عید ہے۔"

وہ شادی کی طرف اشارہ تھا۔ عبدالحق شرما گیا۔

اتنی دیر میں رابعہ اس کے اور حمیدہ کے لیے شیر لے آئی۔ دسترخوان بچھا دیا گیا۔ عبدالحق نے اسے عیدی دی۔ وہ انکار کرتی رہی لیکن حمیدہ کے اصرار پر لینی ہی پڑی۔

عبدالحق نے شیر نکالتے ہوئے اچانک ہاتھ کھینچ لیا۔ "زبیر بھائی کو تو بلاؤ۔ اور ہاں' میرے شہزادے کو بھی لاؤ۔" اس کا اشارہ ساجد کی طرف تھا۔

زبیر اور ساجد کے آنے سے پہلے زرینہ آ گئی۔ "عید مبارک بھائی۔"

عبدالحق نے اسے عیدی دی۔ پھر وہ متوقع نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔

"وہ نہیں آئیں گی بھائی!" زرینہ نے شوخ لہجے میں کہا۔ "دیکھیں نا' اب تین دن رہ گئے

ہیں شادی میں۔ صبر کریں تھوڑا۔"

"تُو نے کہا تھا نور بانو سے آنے کا۔" حمیدہ نے زرینہ سے پوچھا۔

"جی اماں۔ پر وہ کہنے لگیں۔ مجھے شرم آتی ہے۔ میں بعد میں آؤں گی۔"

"بری بات ہے۔ اب یہ تو گھر کا معاملہ ہے۔ جا تُو بلا کر لا اسے۔ بھلے دو منٹ کے لیے سہی۔ اس سے کہنا' مجھے سلام کرنے تو آنا ہی ہے نا۔"

"لے نا پتر!" حمیدہ نے سویوں کی طرف اشارہ کیا۔

"زبیر بھائی تو آ جائیں۔"

حمیدہ کو اس کا یہ رکھ رکھاؤ ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔

پھر زبیر آ گیا۔ عبدالحق نے پہلے شیر نکال کر حمیدہ کو دیا' پھر زبیر کو اور پھر اپنے لیے نکالا۔ ایک منٹ بعد اسے خیال آیا تو اس نے زبیر سے کہا۔ "ساجد نہیں آیا۔"

"وہ رابعہ اسے تیار کر رہی ہے۔"

پھر زرینہ کے ساتھ نور بانو بھی آ گئی۔ وہ سچ مچ بری طرح شرما رہی تھی۔ ادھر عبدالحق کا بھی برا حال تھا۔ اس سے نظریں اٹھائی ہی نہیں جا رہی تھیں۔

نور بانو نے حمیدہ کو سلام کیا' عید کی مبارک باد دی۔ حمیدہ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔

"یہاں اور لوگ بھی بیٹھے ہیں دھیے۔"

نور بانو نے سر جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا۔ "آپ سب کو عید مبارک۔"

"اور تُو نور بانو کو عید کی مبارک باد دینا بھول گیا پتر۔" حمیدہ نے عبدالحق سے کہا۔

"عید مبارک نور بانو!" عبدالحق نے بہ مشکل کہا۔

حمیدہ کے اصرار کے باوجود نور بانو نے شیر نہیں لیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس وقت کچھ بھی نہیں کھا سکتی تھی۔ البتہ اسے وہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ کن انکھیوں سے عبدالحق کو دیکھے لیکن ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

پھر رابعہ ساجد کو لے کر آ گئی۔ اس نے ساجد کو عبدالحق کی گود میں دے دیا۔

عبدالحق نے گود میں لے کر ساجد کو پیار کیا۔ "پہلی عید مبارک میرے ننھے شہزادے۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔

نجانے کیوں' زبیر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

عبدالحق نے چمچے سے تھوڑا سا شیر ننھے ساجد کے منہ میں ڈالا۔ وہ باقاعدہ چٹخارے لینے لگا۔

"مجھے یاد رکھنا ساجد۔" عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہیں زندگی کا پہلا شیر خرما میں نے دیا ہے۔"

اچانک نور بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں جا رہی ہوں اماں" پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئی۔

حمیدہ جانتی تھی' اور وہ اس کا سبب سمجھ سکتی تھی۔ وہ غور سے عبدالحق کو دیکھتی رہی' جو ہر بات سے بے خبر ساجد سے باتیں کیے جا رہا تھا غور سے دیکھتے ہوئے حمیدہ کو عبدالحق کے چہرے پر وہ چھوٹے چھوٹے چرکوں کے نشان نظر آئے۔

اسے یاد تھا۔ رات اس نے عبدالحق کو داڑھی رکھنے کو کہا تھا' اور وہ تیار تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مولوی صاحب نے بھی یہی بات کی تھی۔ پھر وہ سونے سے پہلے بھی اس کے پاس آیا تھا۔ اس وقت تک اس نے داڑھی نہیں بنائی تھی۔

تو پھر یہ کیا ہوا؟ کیا اس نے آدھی رات کو داڑھی مونڈی۔ یقیناً..... تبھی تو چرکے بھی لگے ہیں۔ اور پھر دس دن داڑھی نہ بنانے کی وجہ سے بال زیادہ بھی ہو گئے ہوں گے اور سخت بھی۔

لیکن کیوں؟ تھوڑی سی دیر میں یہ تبدیلی کیوں آئی؟ اور بات فوراً ہی حمیدہ کی سمجھ میں آ گئی۔

جب اس نے عبدالحق سے داڑھی رکھنے کو کہا تو نور بانو بھی وہاں موجود تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے رات کو عبدالحق سے اسی سلسلے میں بات کی' اور عبدالحق نے اسی وقت داڑھی مونڈ لی۔

پیغام بہت صاف تھا۔ اور حمیدہ بہت جہاں دیدہ عورت تھی۔ نور بانو اسے جتا رہی تھی کہ عبدالحق وہی کرے گا' جو وہ چاہے گی۔ حمیدہ کو نہ ایک لمحے تک کے لیے دکھ ہوا اور نہ ہی کوئی احساسِ شکست۔ لوگ اپنی محبوب بیویوں کی بات مانتے آئے ہیں۔ اسے اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے نزدیک بنیادی بات یہ تھی کہ بیوی شوہر کی خیر خواہ ہو۔ اس کی دنیا اور آخرت کی بہتری ملحوظ رکھے۔

حمیدہ ان پڑھ تھی۔ لیکن زندگی کو سمجھنے کے لیے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اس نے طویل عمر گزاری تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ دنیا میں دو ہی طرح کی عورتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کے دل اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ پوری کائنات ان میں سما جائے اور پھر بھی خالی جگہ موجود رہے۔ دوسری وہ جو اللہ کے دیے ہوئے وسیع دل کو خود ہی تنگ کر لیتی ہیں۔ وہ جو صرف خود سے محبت کرتی ہیں۔ اپنی محبت سے آدمی کا دل تنگ ہو جاتا ہے۔ لبالب ہو جاتا ہے' اور دل میں کسی اور کی محبت کے لیے ذرا سی جگہ بھی نہیں بچتی۔ ایسی عورتیں دنیا میں کسی کو کچھ بھی نہیں دے سکتی' نہ اپنے شوہر کو اور نہ اپنی اولاد کو۔ ایسی عورتوں کے شوہر بہت بدنصیب ہوتے ہیں۔

اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے عبدالحق کے لیے اچھی بیوی کا انتخاب نہیں کیا۔ نور بانو کبھی نہیں سدھرے گی۔ اس کے دل کی تنگی کبھی دور نہیں ہوگی۔ اور اس سے عبدالحق کو نقصان ہوگا۔ مگر اب وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ معاملات ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ اب وہ دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور اب اسے اللہ سے اپنے لیے لمبی عمر مانگنی ہوگی۔ ایک وہی تو ہے جو بہ وقتِ ضرورت نور بانو کے سامنے

کھڑی ہو سکے گی۔

اسے رنج ہو رہا تھا۔ نور بانو کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ داڑھی کے معاملے میں اس نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کے نزدیک اپنی بے معنی اور احمقانہ ضد کے مقابلے میں عبدالحق کے دین اور آخرت کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔

ہائے...... یہ اس نے کیا کر دیا۔ عبدالحق کو کس کے پلے باندھ رہی ہے وہ......

''اماں' میں چلوں۔ باہر لوگوں سے بھی عید ملنی ہے۔''

عبدالحق کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں عبدالحق کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں ایسی منہمک تھی کہ سب لوگ چلے گئے اور اسے پتا نہیں چلا۔

''چلے جانا پتر۔ پر پہلے مجھے یہ تو بتا دے کہ تُو نے داڑھی کیوں مونڈ دی۔''

عبدالحق کھسیا گیا۔ ''بڑھا ہوا شیو تو اچھا نہیں لگتا اماں۔ داڑھی ابھی پوری طرح آئی نہیں تھی۔ اور چار دن بعد شادی تھی۔ میں نے سوچا' ایسے درمیان میں تو اچھا نہیں لگوں گا۔ داڑھی تو بعد میں بھی رکھ سکتا ہوں۔ اس لیے صاف کر لی۔''

''آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ پوری داڑھی تو کبھی نہیں اُگتی۔ یہ درمیان کے دن تو گزارنے ہی پڑتے ہیں' جن میں آدمی عجیب سا لگتا ہے۔'' حمیدہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''پر ابھی تو اماں...... شادی کی وجہ سے......''

''میں یہ کہہ رہی ہوں پتر کہ جب آدمی داڑھی رکھتا ہے تو ایسا ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو شروع میں اچھا نہیں لگتا۔ اور ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔''

''نہیں اماں۔ میں نے تو بس یہ سوچا یہ وقت مناسب نہیں۔''

''اللہ تجھے حوصلہ دے۔ جا پتر' باہر لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔''

❁......❁......❁
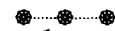
عید کے چوتھے دن وکیل نے کاغذی کارروائی مکمل کر دی۔ اب نادرہ عرف نرگس اس کوٹھے اور جائیداد کی مالک تھی۔

''لے نرگس' میں نے اپنی زندگی میں ہی تجھے سب کچھ سونپ دیا۔ اب تو چاہے تو مجھے نکال دے۔'' نیلم نے نادرہ سے کہا۔

''تم مجھے جانتی ہو بوا۔ ورنہ اتنا بھروسہ کیوں کرتیں مجھ پر۔''

''زندگی اس بازار میں گزری ہے۔'' نیلم نے آہ بھر کر کہا۔ ''اعتبار اور بھروسہ تو میں خود پر بھی نہیں کرتی۔ مجبوری ہے۔ زندگی نے یہی سکھایا ہے مجھے۔ سب کچھ تجھے سونپ دیا...... نقدی اور زیورات کے سوا۔''

''مجھے ان میں دلچسپی ہی کب ہے۔ مجھے تو اس جائیداد میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔''

''جانتی ہوں۔ پھر بھی احتیاط کی۔ اپنی طاقت کے لیے بھی کچھ تو پاس ہونا چاہیے۔''

''میرے نزدیک تو سب کچھ اب بھی تمہارا ہی ہے بوا۔''

نیلم نے موضوع بدلا۔ ''ارے ہاں' تیری خبر تو بہت تیزی سے پھیل گئی۔ کل وہ سلیم صاحب آئے تھے تیرے، میں نے کہا' نرگس کی طبیعت اب ٹھیک ہے' بلواؤں۔ کہنے لگے۔ نہیں بائی' وہ اب دل سے اتر گئی ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے بوا۔''

''اور تو اور' افسروں تک بھی بات پہنچ گئی۔ یہ لڑکیاں بڑی حرام زادی ہیں۔ پیٹ میں بات نہیں رکتی ان کے۔ خیر اچھا ہی ہے۔ طوائف کے پیٹ میں کچھ رکنا بھی نہیں چاہیے۔''

''اللہ کا شکر ہے بوا' اور ان لڑکیوں کا احسان ہے مجھ پر۔''

''ہاں بوا۔ اور ایک بات میں بھی بتاؤں۔ رات مجھے نیچے فرش پر سونا پڑا۔''

''ارے...... وہ کیوں؟''

''چمپا مجھ سے کہنے لگی کہ تم اب کوٹھے کی مالک ہو۔ یہاں سونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا' مالک ہوں تو میری مرضی۔ جہاں چاہوں' سوؤں۔ اس پر وہ بولی۔ تاکہ ہمیں بھی بیماری لگا دو۔ نا بھئی نا' اب تم جا کر بائی جی کے کمرے میں سویا کرو۔ ورنہ میں سب کو بتا دوں گی۔ اور اس نے مجھے اوپر سونے ہی نہیں دیا۔''

''کم بختوں کو عقل تو ہے ہی نہیں۔'' نیلم نے ظالمانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''جہاں سے بیماری لگتی ہے' وہاں تو شوق سے جائیں گی۔ اور جہاں سے لگتی نہیں' وہاں احتیاط کریں گی۔'' پھر وہ ایک لمحے خاموش رہی اور غور سے نادرہ کو دیکھتی رہی۔ ''اس پر تو دل دکھا ہوگا تیرا۔''

نادرہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''میں تو الٹا خوش ہوئی بوا۔ مجھے تو نجات مل رہی ہے لعنت سے۔''

''تو اب تُو کیا کرے گی۔''

''وہی کروں گی بوا جو تم نے کہا تھا۔ تمہارے ساتھ سویا کروں گی۔''

''اچھا ہے۔ میں تنہائی میں بہت گھبراتی تھی۔ پر ایک بات تو بتا۔ تجھے میرے ساتھ سوتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا۔''

''اگر یہ ایسے لگنے والی بیماری ہوتی بوا تو بھی میں اس لعنت پر اسے ترجیح دیتی۔ تم نہیں جانتیں بوا' میری روح پر کیسا بوجھ ہوتا تھا۔ اب میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔''

''میں جانتی ہوں...... سمجھ سکتی ہوں۔''

''ایک اجازت چاہیے بوا'' نادرہ نے اچانک کہا۔

"اب بھی تجھے مجھ سے اجازت چاہیے ہوگی۔"

نادرہ نے سنی اَن سنی کر کے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ ارجمند بھی یہیں سویا کرے...... ہمارے ساتھ۔"

نیلم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "مجھ سے اجازت مانگ رہی ہے۔ ارے تُو تو مجھے اس کمرے سے بھی نکال سکتی ہے...... اور کوٹھے سے بھی۔"

نادرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "تم جانتی ہو بوا کہ میں ایسی نہیں ہوں۔"

"اچھا۔ اب دل چھوٹا نہ کر۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے مجھے تو اچھا لگے گا۔ میرے لیے تو یہ گھر ہو جائے گا پہلی بار۔"

"وہ تم افسروں کا کچھ بتا رہی تھی۔"

"عید رات کو بھٹی صاحب کے ہاں محفل سجتی ہے نا' وہاں اپنی لڑکیاں گئی تھیں۔ تیرے بارے میں پوچھا تو بدبختوں نے بیماری والی بات بتا دی یہ افسر لوگ تو زیادہ ہی ڈرتے ہیں...... اشراف سمجھتے ہیں نا خود کو۔ تو اگلے روز چیمہ صاحب آئے تھے میرے پاس۔ میں نے کہا...... حضور' میں تو ہمیشہ خیال رکھتی ہوں آپ لوگوں کا۔ اسی لیے روک دیا نرگس کو۔ بڑے شکرگزار ہوئے۔ اس پر بھی خوش ہوئے کہ میں نے تجھے سب کچھ سونپ دیا...... کہنے لگے' نرگس سے کہنا' کبھی کوئی مسئلہ ہو تو ہم حاضر ہیں۔"

نادرہ نے سکون کی سانس لی اور دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے گندگی میں بھی صفائی کا اہتمام کیا۔

"پر یہ لوگ ہیں بڑے کمینے۔" نیلم نے کہا۔ "چیمہ کہنے لگا کہ بھٹی صاحب نے بڑا پریشان کیا ہوا ہے آج کل۔ کچھ زیادہ ہی دماغ چڑھ رہا ہے۔ جی میں تو آتا ہے کہ نرگس کو ان کے پاس بھجوا دوں۔ زندگی بھر روتے رہیں بیٹھ کر۔ میں نے کہا' رکاوٹ کیا ہے۔ کہو تو بھیج دوں۔ نرگس تو فارغ ہی ہے آج کل۔ تو بولا کہ آخر میں نقصان تو اپنا ہی ہے۔ قہقہہ لگا کر بولا...... ہم سب ہم پیالہ وہم نوالہ ہیں آخر۔ اسے کچھ ہوا تو دوسرے برتن خراب کرے گا نا۔ اور پھر کسی برتن سے ہمیں بھی وہی بیماری لگ گئی تو۔ میں نے کہا' ہو بڑے سیانے تم۔"

نادرہ نے خود بڑے اہتمام سے اس کمرے کی نئی سیٹنگ کی۔ مدتوں کے بعد اسے جیسے گھر میسر آیا تھا۔ ابتدا میں وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں نیلم مزاحم نہ ہو۔ مگر یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئی کہ نیلم تو الٹا خوش ہو رہی ہے۔ بلکہ وہ اسے مشورے ہی دے رہی تھی۔

اس رات نادرہ نے ارجمند سے کہا۔ "اب تم میرے ساتھ سویا کرو گی۔"

"ہر رات؟" ارجمند نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہر رات۔"

"اب آپ کی شادی کا کیا ہوگا؟"

"اب ہماری شادی کبھی نہیں ہوگی۔"

"کیوں پھپھو؟"

"سب لوگوں نے ہمیں ناپسند کر دیا ہے نا۔"

"وہ تو خود اچھے نہیں تھے پھپھو۔ میں کراؤں گی آپ کی شادی۔"

"اپنے شہزادے سے۔"

"نہیں پھپھو!" ارجمند برا مان گئی۔ "میں دیکھوں گی۔ دنیا میں شہزادوں کی کمی تو نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ لیکن ہمیں اب ایسی پروا نہیں۔"

"تو اب یہ ہمارا کمرہ ہے۔"

"ہاں...... ہمارا اور بوا کا۔"

نیلم اس وقت کمرے میں نہیں تھی۔ ارجمند نے ناک چڑھا کر کہا۔ "بوا کا کیوں؟"

"دیکھو گڑیا۔ کمرا تو یہ اصل میں بوا کا ہی ہے۔ ان کی مہربانی کہ انہوں نے ہمیں جگہ دے دی۔ تو ہمیں ان کا احسان ماننا چاہیے' ان کی عزت کرنی چاہیے۔ اب دیکھو نا' تم ترستی تھیں میرے ساتھ سونے کو۔ اب روز سویا کرو گی میرے ساتھ۔ تو یہ بوا کی مہربانی ہے نا۔ اب تم ان سے کبھی بدتمیزی نہ کرنا۔ عزت سے بات کرنا ان سے۔"

"ٹھیک ہے پھپھو!" ارجمند نے کہا۔ پھر کچھ خیال آیا تو پوچھا۔ "آپ مجھے کہانی بھی سنایا کریں گی۔"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"تب تو میں بوا کی بہت عزت کروں گی۔"

مگر جب رات ہوئی' اور نادرہ نے ارجمند کو کہانی سنانا شروع کی تو وہ کہانی مکمل ہونے سے پہلے ہی سو گئی۔ مہینوں بعد پھپھو سے لپٹ کر سونے کی حسرت جو پوری ہوئی تھی۔

وہ ان کے لیے ایک بالکل نئے معمول کا آغاز تھا!

❁......❁......❁

وہ عبدالحق کی زندگی کا ایک ایسا دن تھا' جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا!

اس نے تو وہ پورا دن ایسے گزارا تھا' جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔ حالانکہ وہ تعبیر ملنے کا دن تھا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ اور اس کی خوشی میں علاقے کے سب لوگ شریک تھے۔

مگر اب وہ وقت آ گیا تھا کہ اس کی خوشی میں شریک سب لوگ درجہ بہ درجہ رخصت ہوتے

گئے تھے اور اب اسے اکیلے ہی اپنی منزل کی طرف بڑھنا تھا۔

اس کا کمرا آج سے اس کا کمرا نہیں تھا۔ اب اس میں نور بانو بھی اس کی شریک تھی۔ اور آج تو وہ حجلۂ عروسی تھا۔ اسے بڑے اہتمام سے سجایا گیا تھا۔

حمیدہ، رابعہ اور شہناز اس کے ساتھ دروازے تک آئیں۔ "میں نے پانی کا جگ اور گلاس بھی اندر رکھ دیا ہے صاحب، اور دودھ بھی۔ بھول نہ جانا۔" رابعہ نے کہا۔

عبدالحق سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ اس کا حلق بری طرح خشک ہو رہا تھا اور دل عجیب طرح دھڑک رہا تھا۔

"جا پتر، آج سے تیری نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ اللہ مبارک کرے۔" حمیدہ نے دعا دی۔

"تم بھی آؤ نا اماں۔" عبدالحق کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"پگلا کہیں کا۔" حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا پتر، اب ہم جا رہے ہیں۔ تُو بھی آرام کر۔"

وہ تینوں واپس چلی گئیں۔ عبدالحق انہیں واپس جاتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پلٹ کر اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ وہ جیسے اس کی قسمت کا دروازہ تھا۔ ابھی ایک لمحے میں ...... اس کے آگے بڑھ کر پٹ پر دباؤ ڈالنے کی دیر ہے۔ اس کی قسمت کھل جائے گی۔

وہ چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

اندر کا نقشہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ آرائش کی خاطر مسہری کو دیوار کے پاس سے ہٹا کر کمرے کے درمیان لے آیا گیا تھا۔ مسہری کے چاروں طرف پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ مسہری پر پھولوں کی سیج تھی۔ اور سیج پر ...... وہ ایک سرخ چھوٹی سی، گول سی گٹھری تھی۔

اس کا دل اس زور سے دھڑکا کہ وہ خود بھی ہڑبڑا گیا۔

وہ بڑے اشتیاق سے مسہری کی طرف بڑھا۔ لڑیوں کے درمیان سے اس نے نور بانو کو دیکھا۔ نور بانو کو تو کیا دیکھتا، وہ اس لمبے سے گھونگٹ کے پار دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جس میں سے جھلکتی ہوئی چاندنی نظر آ رہی تھی۔ نور بانو کا سر اپنے گھٹنوں پر جھکا تھا۔

"دروازہ تو بند کر دیں۔" گھونگٹ میں سے آواز ابھری۔

"آپ کی نظریں جھکی ہوئی ہیں۔" اس نے حیرت سے کہا۔ "آپ نے کیسے دیکھ لیا کہ دروازہ بند نہیں ہے۔"

"صرف نظریں جھکی ہوئی نہیں ہیں۔ بلکہ میری آنکھیں بھی بند ہیں۔" نور بانو نے شوخ لہجے میں کہا۔ "مجھے نظر کچھ نہیں آ رہا ہے لیکن سنائی تو سب کچھ دے رہا ہے۔"

"تو آپ نے ایسا کیا سنا کہ آپ کو دروازہ کھلا ہونے کا پتا چل گیا۔"

"مجھے ایسے پتا چلا کہ میرے کانوں نے کچھ نہیں سنا ......" وہی شوخ آواز، وہی لہجہ ......

"میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھیں نا، مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں سنائی دی نا۔ اس سے مجھے پتا چل گیا کے دروازہ کھلا ہے۔ اب آپ دروازہ بند کر دیں نا۔" یہ کہتے ہوئے لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ شامل ہو گئی۔

عبدالحق نے جا کر دروازہ بند کیا، چٹخنی چڑھائی اور واپس آ کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ "گھونگٹ تو اٹھائیں۔ میں اپنے چاند کو دیکھوں تو"۔ اس نے فرمائش کی۔

"یہ آپ کا کام ہے، میرا نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کر لیتا ہوں۔" عبدالحق نے گھونگٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

"ایسے نہیں۔ پہلے ہماری منہ دکھائی تو دیں۔"

عبدالحق کو حمیدہ کی بات یاد آ گئی۔ اس نے شیروانی کی جیب سے مخمل کی ڈبیہ نکالی، اسے کھول کر انگوٹھی برآمد کی اور جھٹ سے نور بانو کی انگلی میں پہنا دی۔ "یہ لیجیے ...... اب تو ٹھیک ہے۔"

اس نے گھونگٹ اٹھایا اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔

اس سکوت سے گھبرا کر نور بانو نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہا ہے۔ "کیا ہو گیا آپ کو؟"

"اتنا حسین رُوئے زمین پر کوئی ہو ہی نہیں سکتا ...... آپ کے سوا۔" عبدالحق نے مسحور لہجے میں کہا۔

وہ الفاظ نہیں تھے، نور بانو کے لیے آبِ حیات تھا۔ وہ ابتدا سے جانتی تھی کہ وہ اوسط سے کم تر شکل و صورت کی لڑکی ہے۔ مگر عبدالحق کے لہجے میں ایسی سچائی تھی کہ آئینہ دیکھنے کو دل مچلنے لگا۔

"آپ بنا رہے ہیں مجھے۔" اس نے بڑے ناز سے کہا۔

"خدا کی قسم، سچ کہہ رہا ہوں۔"

نور بانو کی سماعت میں اپنی امی کی آواز گونجی ...... نکاح ایسی رحمت ہے کہ اللہ دلہنوں پر آسمان سے نور اتارتے ہیں۔ اسے دلہن بن کر تو گدھی بھی پری ہو جاتی ہے۔ اور میں بہرحال قبول صورت تو ہوں نور بانو نے دل میں کہا۔ بدصورت تو کبھی نہیں تھی میں۔

لیکن عبدالحق لاکھ بار بھی اس کی تعریف کرتا تو اس کے لیے کم تھا۔ "آپ کو خوبصورت لگتی ہوں میں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم" اس نے کہا۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ سے حسین کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"میری باجی کو دیکھ لیتے تو کیا حال ہوتا آپ کا۔ بے ہوش ہی ہو جاتے شاید۔"

"آپ کی باجی؟"

"ہاں...... میری بڑی بہن حور بانو۔ جو آپ سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ میں نے ان جیسا حسین کوئی نہیں دیکھا۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو تمہیں دیکھ رہا ہوں اور حیران ہو رہا ہوں۔"

"آپ بھی تو ان سے محبت کرتے تھے۔" نور بانو کی یادوں کی راکھ میں ایک چنگاری نے سر اٹھایا۔

"میں؟ اور ان سے محبت؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا تھا۔"

"آپ کوٹھے پر آتے تھے۔ دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ باجی آنگن سے آپ کو دیکھتی رہتی تھی۔ تو آپ بھی انہیں دیکھتے ہوں گے۔"

"میں نے کبھی نیچے نہیں دیکھا۔" عبدالحق نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "میں ایسا کبھی نہیں رہا۔ کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں میرے ساتھ۔ اور ان میں بہت آزاد خیال انگریز لڑکیاں بھی تھیں۔ انہوں نے مجھے ورغلانے کی کوشش بھی کی لیکن میں ایسا نہیں تھا۔ مجھے محبت اور ہوس کی تمیز تھی۔ میں محبت کو بہت اعلیٰ وارفع جذبہ سمجھتا ہوں۔"

"تو پھر آپ کوٹھے پر کیوں آتے تھے؟"

"پہلی بار میں وہاں گیا تو پڑھنے ہی کی غرض سے گیا' کیونکہ وہ امتحان کا عرصہ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ وہ مغرب سے پہلے کا وقت تھا۔ مگر میں پڑھ نہ سکا۔ پہلے ہی دن میں نے وہ آواز سنی اور مجھے اس سے محبت ہو گئی......"

"آواز سے؟"

"آواز سے بھی اور صاحب آواز سے بھی اور جو پڑھا جا رہا تھا اس سے بھی۔" عبدالحق نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ عربی زبان ہے' اور قرآن پاک پڑھا جا رہا ہے۔"

"ایسے کیسے محبت ہو سکتی ہے آواز سے؟"

"پتا نہیں۔ میری تو سمجھ میں بس یہی آیا کہ محبت اللہ کی عطا ہوتی ہے۔"

"عجیب محبت ہے...... دیکھے بغیر۔"

"دیکھے بغیر تو اللہ کو بھی ماننا ہوتا ہے نا۔ اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ اور اسے عجیب محبت نہ کہو۔ وہ محبت سچی اور طاقت ور محبت تھی۔ جب مجھے ویر جی سے پتا چلا کہ وہ عربی زبان ہے تو میں نے عربی پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ مولوی صاحب مجھے عربی پڑھانے لگے۔ بہرحال میں ہر شام کوٹھے

پر پہنچ جاتا تھا۔ وہ آواز سننے کے لیے۔"

بھید کھل رہے تھے۔ باجی نے اسے دکھایا تھا...... ایک باریش آدمی یٰسین شریف کی تلاوت کر رہا تھا' اور ٹھاکر اوتار سنگھ سر جھکائے سن رہا تھا۔ وہ پورا منظر اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔

لیکن راکھ سے چنگاریاں بھی سر اٹھا رہی تھیں۔ "تو آپ کو اُس آواز سے محبت ہو گئی تھی...... اور آواز والی سے بھی؟" نور بانو نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"تو وہ تو میری باجی کی آواز تھی جناب!" نور بانو نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"ناممکن۔ میں کروڑوں آوازوں میں سے اس آواز کو شناخت کر سکتا تھا۔ وہ تمہاری آواز تھی۔"

"ہم تینوں بہنیں اس وقت میں قرآن پڑھتی تھیں۔"

"وہ آواز تمہاری تھی۔ بہرحال امتحان ختم ہونے تک وہ معمول جاری رہا۔ پھر میں مولوی صاحب کو گرمیوں کی چھٹیوں میں ساتھ لے کر گاؤں چلا گیا۔ وہاں میں نے بہت تیزی سے عربی سیکھی۔ میں نے سوچا تھا کہ واپس آکر سنوں گا تو شاید سمجھ سکوں گا کہ کیا پڑھا جا رہا ہے۔ مگر وہ میرے مقدر میں نہیں تھا۔ واپس آنے کے بعد میں ہر روز کوٹھے پر گیا۔ مگر میں نے وہ آواز پھر کبھی نہیں سنی۔"

وقت کے حوالے سے نور بانو کو بھی بہت کچھ یاد آنے لگا۔ جس عرصے میں اوپر والے گاؤں گئے ہوئے تھے' اماں نے انہیں پڑھانے کے لیے استانی جی کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور استانی جی عصر کے بعد آتی تھیں اور مغرب کے بعد واپس جاتی تھیں۔ اس کی وجہ سے تینوں بہنوں کا عصر اور مغرب کے درمیان قرآن پڑھنے کا معمول موقوف ہو گیا تھا۔

لیکن نور بانو کے لیے یہ یقین بہت اہم تھا کہ عبدالحق کو جس آواز سے محبت ہوئی' وہ باجی کی نہیں' اس کی تھی۔ اب یہ یقین کیسے حاصل کیا جائے باجی تو مرنے کے بعد بھی اس کے دل کا کانٹا بنی ہوئی تھیں۔ "میں کیسے مان لوں کہ وہ آواز میری تھی۔"

"میری بات غور سے سنو۔ وہ آواز تو آج تک میری روح میں اتری ہوئی ہے' سماعت میں محفوظ ہے۔ محرومی کے باوجود ہر روز میں اس آواز کو سنتا تھا۔ اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ تم تین بہنوں میں سے کس کی آواز ہے۔ میں بس اس آواز والی سے سچی محبت کرتا تھا۔ میں نے خود کو جانچا بھی اس سلسلے میں۔ میں نے تصور میں بدصورت ترین لڑکی کو اس آواز کے ساتھ دیکھا' اور میری محبت کم نہیں ہوئی۔ پھر مجھے اپنی محبت پر یقین ہو گیا۔"

نور بانو کو اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

"پھر وہ سانحہ ہوا۔ تمہاری دونوں بہنیں شہید ہو گئیں۔" عبدالحق اپنی کہے جا رہا تھا۔ "تب میں نے سوچا شاید آواز والی انہی میں سے ایک تھی۔ پھر میں نے رمضان کی اس مبارک چاند رات

کو وہ آواز سنی۔ یاد ہے تمہیں۔ تم سورۃ الملک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ آواز پہچان کر ہی تو میں بے خود ہوا تھا۔ ورنہ میں ایسے بے محابا اوپر آ سکتا تھا بھلا۔ کبھی ایسا کیا تھا میں نے۔"

نور بانو نے دل میں تائید کی۔ اسے عبدالحق کی وہ از خود رفتگی آج بھی یاد تھی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

"اور اسی آواز کی ڈور تھام کر میں نے حق کی گواہی دی۔ وہ تم ہی تھیں نور بانو تمہیں اللہ نے میرے لیے محفوظ رکھا تھا۔ تمہارا مجھ پر احسان ہے۔ مجھے اسلام تمہارے ذریعے سے ملا۔ میں برسوں سے تم سے محبت کرتا ہوں۔ نور بانو۔"

خوشی اور فخر سے نور بانو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرا عبدالحق سے رشتہ بالا دستی کا ہے۔ اس نے سوچا۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں جھمکا کا سا ہوا' اور بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گئی۔ "میں نے مان لیا۔ یقین کر لیا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "حیرت ہے کہ مجھے پہلے کیوں یاد نہیں آیا۔ واقعی' تینوں بہنوں میں صرف میں تھی' جو بلند آواز میں قرأت کرتی تھی۔ باجی کی آواز تو گھر میں بھی مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ صرف میری آواز کوٹھے تک جا سکتی تھی اور ہاں' جن دنوں کی آپ بات کر رہے ہیں' ان دنوں باجی کا قرآن پڑھنے میں دل کہاں لگتا تھا۔ وہ قرآن پڑھنے کی بجائے وضو کے بہانے بار بار جا کر آپ کو دیکھتی تھیں۔ سچ کہتے ہیں آپ۔"

عبدالحق خوش ہو گیا۔ "تم بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں نور بانو؟"

"جی ہاں۔ لیکن اس سے زیادہ میں نفرت کرتی تھی آپ سے۔"

عبدالحق کو جھٹکا لگا۔ "محبت سے زیادہ نفرت! لیکن کیوں؟"

"اس پر کہ مجھے ایک ہندو سے محبت کیوں ہوئی۔ میں چڑتی تھی آپ سے..... شدید نفرت کرتی تھی۔ اس لیے کہ آپ کی محبت کو ختم نہیں کر پاتی تھی۔"

"تو یہ تو تمہاری دین داری ہے اور خوفِ خدا کا ثبوت ہے۔"

نور بانو نے امی اور باجی کے یقین کے بارے میں اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا' جنہیں یقین تھا کہ وہ مسلمان ہو جائے گا۔ جنہیں یقین تھا کہ ہندو ہونے کے باوجود وہ مشرک نہیں ہے۔ یہ سب بتا کر وہ اپنی پوزیشن کمزور کیوں کرتی۔

"اچھا..... آج تم مجھے پھر سورۃ الملک سناؤ اسی طرح۔" عبدالحق نے فرمائش کی۔

نور بانو جھنجلا گئی۔ اس رات میں ایسی فرمائش! عجیب غیر رومانی آدمی ہے یہ۔ مگر بہ ظاہر اس نے خوش دلی سے کہا۔ "اس وقت کیسے سنا سکتی ہوں میں۔"

"کیوں..... کیا رکاوٹ ہے؟"

"دیکھیں نا' مجھے یاد تو نہیں ہے قرآن۔ حفظ تو نہیں کیا ہے میں نے۔"

"تو قرآن یہاں موجود ہے نا۔"

"وضو تو کرنا ہو گا مجھے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد وضو کر کے سنا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ایک بات بتائیں۔" نور بانو نے اچانک کہا۔ "امی نے آپ کو نیچے آنے کی اجازت دے دی تھی۔ پھر آپ کبھی نیچے کیوں نہیں آئے۔"

"میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اگر آ گیا ہوتا تو میں اس وقت اس طرح تمہارے پاس نہ ہوتا۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"ماں جی کو میں بھی سچ مچ ماں ہی سمجھتا تھا۔" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ "انہوں نے مجھے اجازت دی کہ میں جب چاہوں' نیچے آ سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وہاں کوئی مجھ سے پردہ نہیں کرے گا۔ انہوں نے بڑا مان دیا مجھے۔ اب ان کا بیٹا ہونے کے ناتے میں ان کی بیٹیوں کا بھائی ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان میں کوئی ایک وہ ہے' جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ نیچے آتا تو مجھے اس محبت سے دستبردار ہونا پڑتا۔ ورنہ ماں جی کے اعتماد کا خون ہوتا۔ مجھے نہ یہ گوارا تھا اور نہ وہ۔ تو بہتر یہی تھا کہ میں دور ہی رہوں۔"

اس لمحے نور بانو کو شدت سے اس پر پیار آیا..... کیسا سچا اور کھرا آدمی تھا وہ اور وہ اسے کتنا برا سمجھتی تھی۔ "اچھا ہی ہوا کے آپ نیچے نہیں آئے۔" اس نے کہا۔ "ورنہ باجی کو دیکھتے تو ان سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔"

عبدالحق نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "ایک بات کہوں۔ تم شاید محبت کو سمجھتی ہی نہیں ہو۔ حسین لڑکیاں تو میرے کالج میں بھی بہت تھیں۔ مگر میرے لیے صورت' شکل اور جسم کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مجھے تو قرآن پڑھنے والی اس آواز سے محبت ہوئی تھی۔ اب وہ جیسی بھی ہوتی' وہ مجھے پوری دنیا سے بڑھ کر محبوب ہوتی..... اور ہے۔"

"آپ نے باجی کو نہیں دیکھا کبھی؟"

"کیسے دیکھتا۔ میں کبھی نیچے آیا ہی نہیں۔ اور مجھے لڑکیوں کو دیکھنے کا شوق بھی نہیں رہا۔"

"مگر اس قیامت کی رات آپ نیچے..... ہمارے گھر آئے تھے۔" نور بانو نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"قیامت بھی کہہ رہی ہو اور پھر پوچھتی ہو کہ میں نے تمہاری بہنوں کو دیکھا تھا یا نہیں۔" عبدالحق نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "قیامت کے دن کوئی کسی کو دیکھ سکے گا بھلا۔ اس رات میں پہنچا تو وہاں صرف لاشیں تھیں..... اچھوتی' اَن دیکھی معصوم لڑکیوں کی برہنہ لاشیں۔ میں انہیں دیکھ سکتا تھا بھلا۔ میں نے بس لاشوں پر چادریں ڈالیں۔ پھر سسکیوں کی آوازیں سن کر تمہیں تلاش کرنے لگا۔ اور سوچو' تم تو زندہ تھیں۔ تمہیں میں اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اوپر لے گیا لیکن دیکھا تو میں نے

تمہیں بھی نہیں۔ تم وہاں ہمارے ساتھ رہیں۔ پھر ساتھ سفر کیا...... بے پردہ‘ پھر یہاں ہمارے ساتھ رہیں۔ میں نے تو کبھی تمہیں نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں نے تو تمہیں پہلی بار اس رات دیکھا‘ جب میں تمہارے چچا جان کی تلاش میں ناکام ہو کر لاہور سے واپس آیا اور تم نے میری خبر لی۔“

”سنیں، میرا کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔ پھر بھی آپ مجھے معاف کر دیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک بار پھر میں یہ بات بتا دوں کہ دنیا کی حسین ترین لڑکی بھی آپ جیسی حسین نہیں ہو سکتی۔ یہ بات میں کہہ رہا ہوں حالانکہ آپ دنیا کی بدصورت ترین لڑکی ہوتیں‘ تب بھی مجھے اتنی ہی محبوب ہوتیں۔ اور سنیں‘ ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔“

”اتنے یقین سے نہ کہیں یہ بات۔“ نور بانو نے شوخ لہجے میں کہا۔ ”چچا جان کے معاملے میں جھوٹ بول چکے ہیں آپ؟“

”اللہ معاف کرے‘ لیکن وہ بھی آپ ہی کی بہتری کے لیے تھا۔“

”میری بہتری کے لیے مجھے دنیا کی حسین ترین لڑکی بھی تو بنا سکتے ہیں آپ۔“

”نہیں۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ چاہے تم اس پر یقین نہ کرو۔“

نور بانو کو اس کے لہجے میں ہلکی سی خفگی محسوس ہوئی۔ ”میں آپ کو دنیا کا سب سے سچا اور اچھا انسان سمجھتی ہوں جناب!“ اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”بہت بہت شکریہ۔“

عبدالحق مسہری سے اترنے لگا تو نور بانو نے بے ساختہ کہا۔ ”ارے...... ارے...... کہاں چلے آپ؟“

”وضو کر کے آؤں۔ شکر کے دو نفل تو ادا کر لوں۔ اتنی بڑی نعمت دی ہے مجھے اللہ نے۔“ عبدالحق نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نور بانو پھر جھنجلا گئی۔ کیا تنہائی اور خلوت کبھی نہیں ملے گی مجھے۔ کچھ نہیں تو اللہ میاں ہی بیچ میں آ جائیں گے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ ڈری بھی۔ لیکن اس وقت عبدالحق کا دور جانا اسے گوارا نہیں تھا۔ ”جلدی کیا ہے۔ نفل تو مجھے بھی ادا کرنے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”تو آ جاؤ۔ تم بھی وضو کر لو۔“

”ابھی ذرا دیر میں کر لیں گے۔ دو باتیں تو کر لیں۔ ایک بات مجھے پوچھنی ہے آپ سے۔“

عبدالحق پھر اس کے قریب ہو گیا۔ ”پوچھو۔“

”شرم آتی ہے مجھے۔ کیسے پوچھوں؟“ نور بانو نے نظریں جھکا لیں۔

”اب مجھ سے کیسی شرم۔ اب تو میں تمہارا ہوں اور تم میری ہو۔“

”واقعی؟“ نور بانو نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کبھی مجھے بے شرم تو

نہیں سمجھیں گے؟“

”کبھی بھی نہیں۔ کسی حال میں بھی نہیں۔“

”یہ بتائیں‘ اس دن شیڈ میں آپ نے مجھے لپٹایا تو آپ کو میں کیسی لگی؟“ نور بانو نے پوچھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ لمس کیا تھا‘ ایک دھماکہ تھا جو عبدالحق کے وجود میں ہوا۔ پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ”ابھی بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ اس کی آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔ اس نے بتی بجھا دی اور نور بانو کو لپٹا لیا۔ اس لمحے اس نے سمجھا...... رات پردہ پوش!

”میری بات کا جواب نہیں دیا آپ نے۔“ نور بانو نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

”پہلے تمہیں دریافت تو کر لوں‘ پھر جواب بھی دے دوں گا۔“

اور نجانے کتنی دیر بعد‘ جب وہ دونوں بے سدھ لیٹے تھے تو نور بانو نے اپنا سوال دہرایا۔

”تم پوری کائنات ہو...... اسرار سے بھری۔ میں ساری عمر تمہیں کھوجتا رہوں گا لیکن شاید پوری طرح سمجھ نہیں سکوں گا۔“ عبدالحق نے نیند بھری آواز میں کہا۔ اور اس کے چند ہی لمحوں کے بعد وہ بے خبر سو چکا تھا۔

نور بانو اب بھی جاگ رہی تھی۔ وہ احساسِ طمانیت سے سرشار تھی۔ یافت کے سفر کے دوران عبدالحق مسلسل زیرلب کچھ کہتا رہا تھا۔ اس نے سننے کی کوشش کی‘ اور بالآخر سن لیا۔ وہ ہر بڑھتے قدم کے ساتھ‘ ہر مرحلے پر وارفتہ لہجے میں ایک ہی بات کہتا رہا تھا۔ خدا کی قسم‘ تم سے حسین کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ کیسی حسین ہو تم...... حسین اور پُراسرار!

نور بانو نے سمجھ لیا تھا کہ عبدالحق کو ساری عمر اپنا مطیع بنائے رکھنے کے لیے اس کے پاس دو ہتھیار ہیں...... ایک تو یہ احسان کہ عبدالحق کو راہِ ہدایت اس کی آواز کے حوالے سے ملی تھی...... پہلے قدم سے لے کر منزل تک۔ اور دوسرا ہتھیار اس کا جسم تھا‘ جو عبدالحق کو مسحور کر دیتا تھا۔ اسے عمر بھر اس کی شادابی کا خیال رکھنا تھا۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ بھی سو گئی!

عبدالحق کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کے پردے پر منعکس ہوتی دھوپ نے اسے بتا دیا کہ دن چڑھ چکا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظر سوتی ہوئی نور بانو کی بے ترتیبی پر پڑی تو اس نے جلدی سے چادر برابر کر دی۔

وہ بیٹھ کر سوچتا رہا۔ دل میں اداسی اور تاسف قطرہ قطرہ گر رہا تھا...... ٹپ ٹپ ٹپ! یہ کیا ہو گیا؟ دل میں پچھتاوے نے ڈنک چبھویا۔ کیا کیا سوچا تھا میں نے۔ یہ کیا ہو گیا!

❀......❀......❀